کالا جادو



پہلی اشاعت	......	دسمبر1995ء
تعداد	......	چھ ہزار
دوسری اشاعت	......	اپریل1998ء
تعداد	......	تین ہزار
تیسری اشاعت	......	مارچ2000ء
تعداد	......	تین ہزار

طابع: قادر پرنٹرز، سیفی ہاؤس، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ، کراچی

قیمت .... ایک سو پچاسی روپے (Rs. 185/-)



اخبار جہاں پبلی کیشنز
آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون:- 2637111-19

پیش لفظ

اخبار جہاں پبلی کیشنز کی اب تک گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ ساری کتابیں وہ ہیں جو پاکستان کے اس سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ میں سلسلہ وار شائع ہو کر بے حد مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ”کالا جادو“ بھی انہی مقبول سلسلوں میں سے ایک ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1995ء میں طبع ہوا تھا۔ اب اس مقبول کتاب کا تیسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، اس سے ”کالا جادو“ کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

کالا جادو ایک منفی علم ہے جسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً جنتر منتر، افسوں، ٹونا، اثر اور سحر وغیرہ۔ کالے جادو کی حقیقت دنیا کی ہر قوم اور ہر خطے میں تسلیم کی گئی ہے اور اقوام عالم میں یہ کئی روپ میں موجود ہے۔ دراصل روز اول ہی سے انسان نے اپنے آپ کو خوف و خطر میں گھرا ہوا پایا۔ چنانچہ اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے اس نے طرح طرح کے اقدام کیے۔ اجتماعی زندگی کو اپنایا، چار دیواری اور مکان کا سہارا لیا۔ جسمانی، روحانی اور نفسیاتی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف علاج دریافت کیے۔ یہی نہیں بلکہ بے رحم و سرکش اور پراسرار مخلوق سے محفوظ رہنے کی خاطر جادو ٹونے اور جنتر منتر بھی ایجاد کیے۔ اصل میں وہ وقت اور حالات کو اپنے تصورات اور مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتا تھا۔ اپنی کامیابی کے لیے فوری اور آسان راستے کا متلاشی تھا اور اسی لیے نام نہاد جادو ٹونے کے چکر میں اپنی دولت برباد کرنے لگا۔

”کالا جادو“ ایک ایسے نوجوان کی داستان ہے جو راتوں رات امیر بن کر دولت کی ریل پیل میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن اس ہوس زر میں ایک شیطان صفت آدمی کے چنگل میں پھنس جاتا ہے جو اسے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ انکار کی صورت میں وہ قاتل بن جاتا ہے، پھانسی کے تختے تک جا پہنچتا ہے اور پھر کسی طرح پھانسی سے بچ جاتا ہے تو والدین سے محروم ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یوں اس کی زندگی میں مصائب کا ایک طویل سلسلہ چل نکلتا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی کسی اور دنیا میں لے جاتا ہے۔

ایم اے راحت کی یہ دلکش اور پر تجسس تخلیق آپ کو برسوں یاد رہے گی۔

(میر جاوید رحمٰن)

مجھے اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لئے آسان راستوں کی تلاش تھی اور میرے جیسے کئی ساتھی میرے گرد اکھٹے ہوگئے تھے ہم دوسروں کی محنت پر گزارہ کرتے تھے اور ہم سے محبت کرنے والے، ہمیں چاہنے والے، ہمیں ہماری ضرورت کے لئے دیتے تھے۔ ریس، سٹہ، فلیش، ہر طرح کی شرطیں، ہمارا ذریعۂ آمدنی تھیں اور ہم انہی میں کمال حاصل کرنے میں کوشاں تھے اس کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے تھے، رفیق کہتا۔

"کچھ ہونا چاہئے استاد ...... کوئی لمبا ہاتھ لگ جائے تو پوبارہ ہوجائیں۔"

"لمبا ہاتھ کہاں سے لگے گا۔"

"کوشش تو کرنا چاہئے۔"

"مشکل ہے، بہروپئے ہزاروں ہیں کام کا کوئی نہیں ملتا۔"

"یار کوئی چلّہ وغیرہ کیا جائے جس سے سٹے اور گھوڑے کا نمبر معلوم ہوجایا کرے۔"

"آسان نہیں ہے۔ عمل الٹا بھی ہوجاتا ہے اور پھر ایسا الٹا کرتا ہے کہ کبھی سیدھے نہیں ہوپاتے۔"

میں ایک قصائی کی دکان سے گوشت خرید رہا تھا دست کا گوشت تھا قصائی نے بڑی ہڈی سے گوشت صاف کیا اور پھر ہڈی کو بغدا مار کر توڑا اور ایک طرف ڈال دیا۔ یہ عمل میں نے بیشتر قصائیوں کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس دن پوچھے بغیر نہ رہ سکا......!

"شیخ جی ایک بات بتایئے۔ آپ لوگ اس ہڈی کو توڑ کر کیوں پھینک دیتے ہیں جبکہ دوسری ہڈیوں کے ساتھ آپ ایسا نہیں کرتے۔"

"میاں جی باپ دادے کی روایت ہووے ہے یہ ثابت ہڈی سفلی عمل کرنے والوں کے کام آوے بزرگوں کا کہنا ہے کہ اسے ہمیشہ توڑ کر پھینکنا چاہئے۔"

"اس سے سفلی عمل ہوتا.............؟"

"یہی سنا ہے جی.............!"

سفلی عمل کیسے ہوتا ہے اور یہ ہڈی کہاں استعمال ہوتی ہے اس بارے میں تو کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ذہن بھٹک گیا تھا۔ دوستوں سے تذکرہ کیا تو انہیں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ایک جاننے والے بزرگ سے ملاقات ہوئی اور ان سے یہی سوال کیا تو وہ بولے۔

"ہاں میاں گندے علم تو ہوتے ہیں ایمان کھونے میں کتنی دیر لگے ہے مگر مسلمان بچے ہو ایسی باتوں کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے۔"

سنا اور کان سے اڑا دیا۔ کسی سفلی عمل والے کی تلاش شروع کر دی۔ میرا شہر بڑا خوبصورت تھا، زندگی سے بھرپور چھوٹی بڑی عمارتوں، بازاروں اور صنعتوں سے سجا ہوا، مشرق میں لہلہاتے کھیت حد نگاہ تک چلے گئے تھے۔ مغرب میں نگاہ کی حد سے خوبصورت پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ریس کورس کا میدان اسی سمت تھا اور اسی طرف سے پیر پھاگن کے مزار کا راستہ تھا۔ ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کا مشاہدہ میرا دلچسپ مشغلہ تھا اور اکثر عام دنوں میں بھی اس طرف نکل آتا تھا اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا دیر تک اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑوں کی ناز برداری دیکھتا رہا پھر یونہی آوارہ گردی کرتا ہوا ٹیلوں کی طرف نکل گیا۔ خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا دور دور تک کسی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر آواز پیدا کر رہے تھے کافی دور نکل آیا پھر ایک طرف نظر اٹھی اور ٹھٹھک کر رہ گیا وہ انسان ہی تھا بہت چھوٹے قد کا مالک، سوکھا بدن، گھٹا ہوا سر، اوپری بدن برہنہ، نچلے جسم پر چھوٹی سی دھوتی بندھی ہوئی، گلے میں جنیئو پڑا ہوا، آنکھیں بند کئے ہوئے ایک نکیلے پتھر پر ایک پاؤں سے کھڑا ہوا تھا دور سے اس کا چہرہ صاف نہیں نظر آ رہا تھا دلچسپی پیدا ہو گئی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا مکروہ سی شکل تھی بندر کی طرح ابھری ہوئی پیشانی، سانولا رنگ، میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے اپنا اٹھا ہوا پاؤں نیچے رکھ لیا اطراف میں ایک عجیب سی چراند پھیلی ہوئی تھی جو بدبودار تھی وہ مجھے دیکھنے لگا چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سے شیطانی چمک پھیلی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر مسکرایا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بھی شطنت لئے ہوئے تھی، نجانے کیوں مجھے اپنے بدن میں کچھ جھرجھری سی محسوس ہوئی، ریڑھ کی ہڈی میں ایک شدید سرد لہر دوڑ گئی تھی۔

"کاہے رے چھورا، کاہے ٹکر ٹکر دیکھے ہے۔" اس کی باریک سی آواز ابھری، جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ لگتی تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے سنبھل کر کہا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"جو کوئی بھی ہیں .... ہیں تیرے کام کے" ۔ اس نے مخصوص آواز میں جواب دیا۔

"سادھو ہو............" میں نے اس کے حلیے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے کا لگ رہے ہیں۔" اس نے پوچھا اور میرے ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔ ہو سکتا ہے یہ سادھو میرے کام آ جائے، ذہن میں وہ تمام گندے خیالات جاگ اٹھے تھے، جن کے تصور میں دن رات سرگرداں رہتا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری تلاش تھی۔"

وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے دو پتھروں کے پاس پہنچ گیا اور ایک پتھر کی طرف اشارہ

کر کے اس نے کہا............ "بیٹھ جا" ۔ اور میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "تو کا ہماری تلاش تھی تو ہم بھی تیرے ہی لئے یہاں آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا اور وہ خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ "تجھے ہماری تلاش کاہے تھی بھائی؟ کوئی بات تو ہووے گی نا تیرے دل میں۔"

"تم سادھو ہو، مجھے سٹے وغیرہ کا نمبر بتا سکتے ہو، یہ بتا سکتے ہو کہ اب کی ریس میں کون کون سے گھوڑے اول آئیں گے۔؟"

وہ اس طرح ہنس پڑا، جیسے اسے مجھ سے اسی سوال کی توقع تھی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا............ "اگر ہم تجھے ایک گھوڑے اور ایک سٹے کا نمبر بتا دیں تو تیرا کا بھلا ہوئی ہے۔ ارے کام کرو سو پکا، اگر تجھے زندگی بھر گھوڑے اور سٹے کا نمبر معلوم ہوتا رہے تو کا برا ہوئی رے، پر بٹوا، ہر کام کو کرنے کے لئے پہلے محنت کرنا پڑتی ہے۔"

میرے دل میں دلچسپی اور تجسس پیدا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے کیا محنت کرنا پڑے گی؟"

"ایک علم ہووے ہے، جسے تو اگر سیکھ لے تو ای سمجھ لے کہ دولت تیرے پیروں میں ڈھیر لگی ہو گی۔"

میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ یہ تصور تو نجانے کب سے میرے سینے میں پل رہا تھا کہ ایسی کوئی قوت مجھے مل جائے، جس سے میں دنیا کا امیر ترین آدمی بن جاؤں، میں نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

"اگر تم میرا یہ کام کر دو سادھو بابا تو میں زندگی بھر تمہارے قدموں میں رہوں گا۔"

"اپنا کام تجھے خود ہی کرنا ہووے گا بٹوا، بس ای سمجھ لو کہ ہم تیری مدد کریں گے۔"

"تو بس یوں سمجھ لو کہ میں آج سے تمہارا چیلا۔" وہ پھر اسی انداز میں ہنسنے لگا، پھر بولا............ "مگر ایک بات پکی کرنی ہو گی تجھے، جو ہم کہیں گے وہ کرے گا۔ نہیں تو تیرا نقصان ہو جائے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم کہو گے وہی کروں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، ابھی ہم کئی دن یہاں رہیں گے تو کسی اور کو ہمارے بارے میں مت بتانا ورنہ ہمیں پتہ چل جائے گا اور پھر ہم تجھے یہاں نا ہی ملیں گے۔"

"نہیں بتاؤں گا۔"

"تو پھر سن، ایک ہڈی لانی ہو گی تجھے، عمل کرنے کے لئے، وہ ہڈی جناور کے بازو میں ہووے ہے، ثابت لانی پڑے گی، کہیں سے ٹوٹی پھوٹی نہ ہو۔"

مجھے ایک دم شیخ جی کی بات یاد آ گئی تھی اور اس وقت اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"کیا تم سفلی عمل کرو گے سادھو بابا؟"

"اب تو ہمارے کان مت کھا............ جو کچھ ہم کریں گے وہ تیری آنکھوں کے سامنے ہی ہو گا۔ پر ایک بات پھر کہیں تجھ سے۔ بات کریو تو سو پکی، ہم کچی بات کرنے والے کو چھوڑتے نہیں ہیں۔"

"میں بھی پکی بات کرتا ہوں سادھو بابا............ نام کیا ہے تمہارا؟"

"بس رے جو نام تو نے رکھ لیا وہی ہے، یہ ہڈی تو کب لائے گا؟"

"کل ہی"۔

"تو ٹھیک ہے کل ادھر آجائیو، ہم انتظار کریں گے۔ بس اب جا۔" میں خاموشی سے پتھر سے اٹھ گیا اور گردن جھکا کر واپس چل پڑا۔ ۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پاؤں لرز رہے تھے، ایک طرف ہلکا سا خوف بھی دل میں تھا اور دوسری طرف بے پناہ مسرت کا احساس بھی۔ واقعی اگر کوئی مجھے ایسی مستقل قوت حاصل ہو جائے تو پھر دنیا دیکھے گی کہ میں کیا بن گیا ہوں۔ خصوصی طور پر اس بات کو دل میں چھپائے رکھا اور اس بات کے منصوبے بناتا رہا کہ ہڈی کے حصول کے لئے کیا کرنا چاہئے اور ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی۔ چنانچہ دوسرے دن گوشت مارکیٹ گیا اور اچھی خاصی مہنگی قیمت پر جانور کا پورا دست حاصل کر لیا۔ ، کیونکہ قصائی ہڈی توڑے بغیر نہ دیتا اور بات عام ہو جاتی۔ اس کے بعد اسے کاغذ میں لپیٹ کر کندھے پر رکھے ہوئے اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ ٹیلے کے قریب بیٹھ گیا اور پہلے سے ساتھ لائی ہوئی تیز دھار چھری کی مدد سے اس ہڈی سے گوشت صاف کرنے لگا۔ یہ کام مشکل ترین تھا اور اسے صاف کرتے ہوئے طبیعت جھک ہو گئی تھی لیکن لگن کام کر رہی تھی اور بڑی مشکل سے وہ صحیح سالم ہڈی نکالنے میں کامیاب ہوا اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ اور گوشت پر جھپٹا مارنے کے لئے نیچی پروازیں کر رہی تھیں، کئی بار انہیں بھی اڑانا پڑا۔ جب صاف ستھری ہڈی نکل آئی اور میں تھک کر پسینہ پسینہ ہو گیا تو اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے وہاں سے دور ہو گیا۔

میرے ہٹتے ہی چیلوں کے غول گوشت پر جھپٹے مارنے لگے تھے۔ میں برق رفتاری سے اسی جانب جا رہا تھا جہاں سادھو مجھے ملا تھا۔ وہ اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرایا جیسے اسے میرے آنے کا یقین ہو اور پھر اس نے بڑی چاہت سے وہ ہڈی اپنے ہاتھ میں لے لی، دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے، آنکھیں سورج پر گاڑھ دیں اور نجانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ دیر تک اسی عمل میں مصروف رہا اور اس کے بعد اس نے وہ ہڈی ایک پتھر پر رکھ دی اور مجھ سے بولا۔

"اب تو کل شام ڈھلے ہمارے پاس آنا، پرسوں جمعرات ہے نا؟"

"ہاں"۔

"کل ضرور آ جانا، ورنہ پھر تجھے ایک ہفتے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کس وقت آؤں میں تمہارے پاس؟"

"کوئی چھ بجے۔" اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ بولا۔ "جا اب بھاگ جا۔ زیادہ دیر رکنا اچھا نہیں ہو گا"۔ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کام بننے ہی والا ہے۔ یار دوستوں سے ملاقات بھی ہوئی لیکن یہ کوئی بتانے والی بات نہیں تھی، ویسے بھی مجھے اس کے لئے منع کر دیا گیا تھا۔ اگر انہیں بتا دیتا تو وہ سب بھی سادھو بابا کی طرف دوڑ پڑتے، لیکن بڑی بے چینی رہی تھی اور بڑا تجسس تھا۔ دوسرا دن بھی نجانے کس طرح کاٹا۔ تیار ہوا اور جیسے ہی ساڑھے چار بجے، گھر سے نکل آیا۔ سادھو بابا کا خیال دل میں تھا۔ ۔ وقت گزارتا رہا اور مقررہ وقت پر وہاں جا پہنچا۔

سادھو کے سامنے اس وقت نجانے کیا الا بلا رکھی ہوئی تھی ایک طرف چھوٹی چھوٹی لکڑیاں آپس میں جوڑ کر رکھی گئی تھیں اور ان میں مدھم مدھم آگ سلگ رہی تھی۔ وہی چراند اور بدبو فضاء میں پھیلی ہوئی تھی، جو پہلے دن میں نے محسوس کی تھی، ایک عجیب سا طلسمی ماحول تھا۔ بوڑھے سادھو نے مجھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنا کام کر لیا ہے۔ اب تیرا کام باقی ہے۔"

"مجھے بتاؤ سادھو بابا مجھے کیا کرنا ہے؟"

"پہلے وعدہ کر میں جو کہوں گا وہ تو ضرور کرے گا۔"

"یہ وعدہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں بابا جی۔"

"تو پھر رک ...." سادھو نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر عقب کے پہاڑی ٹیلے کے پیچھے پہنچ گیا وہاں سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نجانے کس چیز سے بنا ہوا ایک بدہئیت انسانی شکل کا پتلا تھا۔ اس نے یہ پتلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے لباس میں چھپا لے"۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا بڑی کراہیت کا احساس ہوا۔ پتلا لجلجا اور بدبودار تھا اس میں عجیب سی ٹھنڈک تھی۔ لیکن میں نے کسی بات پر توجہ نہیں دی، سادھو نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تو یہاں سے پیر پھاگن کے مجار پر جائے گا۔ سیڑھیاں طے کر کے اوپر جانا اور قبر کے پیچھے جو تین طاق بنے ہوئے ہیں ان میں سے بیچ کے طاق میں یہ پتلا رکھ دینا۔ بس یہی تیرا کام ہے بعد میں سب ہمارا کام ہو گا اور تیرے مجے ہی مجے ہوں گے۔"

"پیر پھاگن کے مزار پر؟" میں نے سہم کر کہا۔ دل کے کسی گوشے میں کچھ ایمان باقی تھا۔ پیر پھاگن سے بچپن سے عقیدت تھی اور ساری آوارگیوں کے باوجود ان کا احترام دل میں تھا۔ اس کی وجہ شاید اس مزار سے منسوب کہانیاں تھیں۔

"ای کام اب تجھے کرنا ہے۔ اس سے منہ موڑے گا تو ای دنیا تو ہارا واسطے نرکھ بن جائے گی، جا جلدی کر نئیں تو رات ہو جائے گی۔"

میں لرزتے قدموں سے واپس مڑا دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر پیر پھاگن کے مزار کا معاملہ نہ ہوتا تو میں خوشی سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا مگر نہ جانے کیوں دل کو ایک جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی غلیظ اور ناپاک شے اس مقدس جگہ لے جا رہا ہوں۔ کچھ دور جا کر میں نے گردن موڑی مگر بوڑھا وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ناپاک پتلا مجھے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دور چل کر ایک اور عجیب احساس ہوا پتلے میں انسانی جسم جیسی حرارت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور شاید یہ میرے خوف کا تخلیق کردہ احساس تھا کہ وہ پتلا مجھے اپنے سینے کے قریب کلبلاتا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں جان پڑ گئی ہو۔ خوف و دہشت کی سرد لہریں میرے بدن میں دوڑنے لگیں مگر میں اسے لباس میں سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ مزار تک کا فاصلہ نہ جانے کس طرح طے کیا تھا۔ مزار ایک ٹیلے پر تھا اور وہاں تک جانے کے لئے ٹیلے پر انیس سیڑھیاں تراشی گئی تھیں۔ میں نے لرزتے قدموں سے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اوپر خاموشی چھائی ہوئی تھی چونکہ یہ مزار شہر سے بالکل باہر تھا اور یہاں زیادہ لوگ نہیں آتے تھے۔ ہاں جمعرات کو یہاں رونق ہوتی تھی اور کافی لوگ نذر نیاز کرنے آجاتے تھے عام دنوں میں بس چند مجاور یا ملنگ یہاں موجود ہوتے تھے۔

میں سہما سمٹا سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ دماغ میرا ایک ہیجانی کیفیت کا شکار تھا اور بدن میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ پاؤں مسلسل اوپر اٹھ رہے تھے اور میں بلندی پر پہنچتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ایک انوکھا احساس ہوا یہ انیس سیڑھیاں تو اب تک طے ہو جانی چاہئے تھیں۔ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ مزار اتنا ا[illegible] نظر آیا کہ ہوش اڑ گئے۔ یہ انیس سیڑھیاں انیس سو سیڑھیاں بن گئی تھیں۔ خوف کے عالم میں

پلٹ کر نیچے دیکھا تو جان سی نکل گئی۔ زمین سیکڑوں فٹ نیچے نظر آ رہی تھی۔ بدن پر شدید کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں یہ کیا ہوگیا۔ یہ سب کیسے ہوگیا۔ بیشمار بار اس مزار پر آیا تھا مگر یہ اتنا اونچا تو نہیں تھا اوپر نظر ڈالتا تو سیڑھیاں آسمان میں گم نظر آتیں، نیچے دیکھتا تو خوف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

"ہمت کر، ہمت کر چڑھتا جا۔ پہنچ جائے گا۔" میرے کانوں میں وہی منحوس باریک سی آواز ابھری اور میں اچھل پڑا۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی۔ پھر اس کا مخرج علم میں آ گیا۔ میرے سینے کے قریب لباس میں پوشیدہ پتلا بول رہا تھا۔ رہی سہی کسر پوری ہوگئی۔ میرے حلق سے کئی دہشت بھری چیخیں بلند ہوئیں اور میں پلٹ کر نیچے بھاگا۔ میرے سینے کے قریب شدید ہلچل پیدا ہوگئی۔ پُتلے کے ننھے نوکیلے ہاتھ میرے سینے میں چبھ رہے تھے وہ مجھے روکنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اس کی چبھتی ہوئی باریک آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"او پاپی........ او مورکھ، کیا کرے ہے۔ ارے تیرا ستیاناس، بنا بنایا کام بگاڑے دے رہا ہے۔ ارے سنبھل، رک۔ ڈرنے کی جرورت نا ہے ہمت سے چل اوپر پہنچ جائے گا۔" مگر میرے قدم نہ رک پائے تھے۔ مزید حیرتناک بات یہ ہوئی تھی کہ پہلے مجھے زمین جتنی نیچے نظر آ رہی تھی اب اتنی نیچے نہ رہی تھی۔ میں آخری سیڑھی عبور کر رہا تھا کہ پاؤں لڑکھڑائے اور میں بری طرح نیچے گرا، نیچے پتھریلی زمین تھی۔ سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور آنکھوں میں سورج اتر آیا پھر گہری تاریکی چھا گئی۔ نہ جانے کب تک یہ کیفیت رہی تھی۔ ہوش آیا تو ماموں ریاض کی آواز سنائی دی۔

"کیسی طبیعت ہے مسعود۔ کیا حال ہے بیٹے؟" میری آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ کچھ صاف نہیں نظر آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت دور ہوئی۔ والدہ کا چہرہ نظر آیا اور پھر ان کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔

"مسعود بیٹے۔ آنکھیں کھولو، کیسی طبیعت ہے بیٹے؟" دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں گزرے ہوئے واقعات یاد تھے وہ خوفناک لمحات پوری طرح ذہن میں تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ سینے پر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ موجود نہیں تھا دل کو قرار سا ہوا۔ میں نے ماموں ریاض کو دیکھا، والدہ کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن ماموں ریاض نے جلدی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں نہیں، لیٹے رہو۔ بہت کمزور ہوگئے ہو لیٹے رہو۔ کیسی طبیعت ہے۔" میں نے کہنا چاہا کہ ٹھیک ہوں مگر منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی دوبارہ کوشش کی مگر گلا بھنچا ہوا تھا آواز نہ نکل سکی۔

"چائے لے آؤں۔" والدہ نے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب نے یہی کہا تھا۔ آپ لے آئیے۔" ماموں ریاض بولے اور والدہ اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ میں اپنے گھر میں تھا، اپنے کمرے میں تھا نہ جانے یہ سب کیسے ہوا تھا اور میری آواز۔ میری آواز کو کیا ہوگیا تھا۔ ماموں ریاض نے کہا۔ "بولو مسعود میاں کیا ہوا تھا۔ پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے۔ وہاں بےہوش کیسے ہوگئے تھے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ پورے دو دن کے بعد ہوش میں آئے ہو سخت بخار میں پھنک رہے تھے وہاں مزار کے مجاوروں نے تمہیں بےہوش پڑے پایا تھا۔ اتفاق سے میرے ایک شناسا حیدر علی مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے ہوئے تھے تمہیں جانتے تھے وہی تمہیں یہاں تک لائے

تھے۔ کیا واقعہ ہوا تھا کچھ بتاؤ تو سہی۔"

میں نے بولنے کے لئے زور لگایا مگر آواز کسی طرح نہ نکل سکی اور میرے چہرے پر بےبسی پھیل گئی۔ ماموں ریاض کو شاید احساس ہوگیا تھا ان کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ اتنی دیر میں والدہ چائے لے آئی تھیں۔ ماموں ریاض بولے۔ "یہ بول نہیں پا رہا باجی۔"

"ہیں........؟" والدہ متوحش لہجے میں بولیں۔

"ہاں یوں لگ رہا ہے جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن آواز نہ نکل رہی ہو۔"

"کیا ہوگیا میرے بچے کو........ الٰہی خیر۔ کیا ہوگیا اسے؟" والدہ صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"حوصلہ رکھیں باجی۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اٹھو مسعود میاں چائے پی لو۔ بدن میں جان آئے گی۔" مجھے اٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ ماموں میاں نے چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگائی مگر منہ ہی نہ کھل سکا۔ لاکھ کوشش کی مگر ہونٹ ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ماموں ریاض اب بےحد پریشان نظر آنے لگے پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"چمچہ لے آئیے۔ شاید منہ کھولنے میں دقت ہو رہی ہے۔" تمام جتن کر لئے گئے مگر میرا منہ نہ کھلا، والد صاحب بھی آ گئے مجھ پر تبصرے ہوتے رہے۔ والد صاحب کے ایماء پر مجھے کاغذ تھما دیا گیا تاکہ میں لکھ کر کچھ بتانے کی کوشش کروں لیکن میری انگلیاں اکڑ گئیں۔ قلم پر گرفت ہی قائم نہ ہو سکی۔ شام کو کئی ڈاکٹر آئے، میرے معائنے ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ میں غذا اور پانی سے محروم ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسپتال میں داخل کر دیا جائے ہو سکتا ہے فالج کا اثر ہو۔ سب لوگ میرے سامنے یہ باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے دن مجھے ایک اسپتال میں داخل کیا جائے گا۔

رات ہوگئی اہل خاندان کی پریشانی کا مجھے پورا احساس تھا دل میں سخت شرمندہ تھا کہ مصیبت خود مول لی ہے۔ دوسرے بھی پریشان ہوئے اور اپنی جان پر بن گئی۔ آدھی رات تک سب میرے قریب رہے پھر مجھے نیند آ گئی تو مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا مگر رات کا وقت تھا۔ وولٹیج زیادہ ہونے کی وجہ سے اس زیرو کے بلب کی روشنی تیز ہوگئی تھی۔ پہلے میری نگاہ چھت پر پڑی جہاں ایک غیر معمولی طور پر بڑی مکڑی چپکی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی اور ہیبتناک مکڑی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خاص طور سے اس کی آنکھیں۔ وہ سرخ آنکھیں مٹر کے دانوں کے برابر تھیں۔ اور مجھے گھور رہی تھیں۔ میرے بدن میں خوف و دہشت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے اس بھیانک مکڑی کو دیکھتا رہا۔ اچانک اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور اپنے بدن کے لیس دار مادے کا ایک تار چھوڑتی ہوئی وہ اس کے سہارے نیچے اترنے لگی۔ اس کا نشانہ میرا سینہ تھا۔ دہشت سے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا مکڑی میرے سینے پر اتر گئی اور یہ دیکھ کر میری سانس رکنے لگی کہ اس کا چہرہ بوڑھے سادھو کا چہرہ تھا۔ بدن مکڑی کا تھا اور اس کا ہلکا سا وزن مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بوڑھے سادھو کی وہی منمناتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

"تو نے وعدہ خلافی کی ہے مورکھ۔"

"مم........ میں نے........ میں نے........" میرے منہ سے نکلا اور اپنی آواز کھل جانے پر

مجھے سخت حیرت ہوئی۔

”تجھ سے پہلے ہی کہا تھا میں نے، مجھ سے کام لینا ہے تو ہمت کرنا ہوگی۔ پہلے میرا کام کرنا ہوگا اس کے بعد سنسار میں تیرے لئے اتنا کچھ ہوگا کہ تجھ سے سنبھالے نہ سنبھالا جائے گا۔ دولت تیرے سامنے کوڑے کے ڈھیر کی طرح پڑی ہوگی تو منہ سے جو بات نکالے گا پوری ہوگی اب بھی میں تجھ سے یہی کہتا ہوں۔ پُتلا وہاں پہنچا دے جہاں میں چاہتا ہوں تیرا کام ختم ہوجائے گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو۔“

”آخر تو کون ہے؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

”میں تیری خوش بختی ہوں مورکھ۔ میرا یہ کام ایک مسلمان ہی کر سکتا تھا۔ وہ مسلمان جو خود میرے پاس آئے، مجھ سے کچھ لینا چاہے تو نہیں جانتا کہ پُتلا وہاں پہنچ گیا تو مجھے کیا مل جائے گا۔ اور تو خود ہی تو آیا تھا۔ میرے پاس مجھ سے اپنا کام کروانے تو نے ہڈی لا کر دی تھی مجھے۔“

”مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں ایک پاک بزرگ کے مزار پر تیری نجاست نہیں لے جا سکتا اور پھر تجھے بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرے مزار پر جانے کے راستے بند ہوگئے تھے۔ سیڑھیاں اتنی زیادہ ہوگئی تھیں کہ میں اوپر پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔“

”بھول ہے تیری۔ تو نے نو سیڑھیاں چڑھی تھیں دس باقی رہ گئی تھیں۔ بس تیری آنکھوں کو دھوکا دیا تھا میاں جی نے، تھوڑی سی کوشش کر کے اوپر جا سکتا تھا یہ ہمت تو کرنی ہے تجھے۔“

”نہیں سادھو، میں یہ کام نہیں کروں گا۔“

”اب یہ نہیں ہوسکتا بالک۔ یہ تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ سن بالک، میں تجھے تین دن دیتا ہوں۔ ان تین دنوں میں، میں تجھے سمجھاؤں گا اور اگر پھر بھی تیری سمجھ میں نہیں آیا تو تو وہ دیکھے گا جو دیکھ نہ پائے گا۔ خون کے آنسو روئے گا تو اور تیرے آنسو پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ جا ٹھیک ہے سمجھ میں آجائے گا تو اسی جگہ میرے پاس آجانا اور نہ سمجھ میں آئے تو............“ مکڑی میرے سینے سے اٹھ گئی وہ اسی تار کے ذریعے اوپر جا رہی تھی میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ چھت سے چپک گئی تھی پھر اس کا جسم چھوٹا ہونے لگا اور پھر وہ ایک ننھا سا دھبّہ بن کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ یہ دھبّہ کھسکنے لگا۔ پھر ایک جگہ دیوار سے اتر کر کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔ خوف و دہشت اب میرے لئے بے معنی ہوگئے تھے جو کچھ نگاہوں سے گزر چکا تھا وہ خود میرے لئے ناقابل یقین تھا لیکن قصور میرا ہی تھا اتنا بے عقل نہیں تھا کہ اچھا برا نہ سمجھتا۔ لالچ نے آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اور کالے جادو کا سہارا لے کر تقدیر بنانے کی کوشش کی تھی۔ کسی سے کچھ کہتا بھی تو کیا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اب تک شاید اس کالے جادو کے زیر اثر تھا اور اب اس سے آزاد ہو گیا تھا۔ بدن کو ایسی شدید نقاہت کا احساس ہوا کہ پورے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ زبان تالو سے چپک گئی کیونکہ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے نیچے نہیں اترا تھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ دے رہے تھے۔ پہلے جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی اب نہیں تھی، گھر والے بیچارے تھک کر سوگئے تھے، عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا، نجانے کس طرح دیواریں پکڑ پکڑ کر باورچی خانے تک جا پہنچا۔ روشنی جلائی اور اس کے بعد کھانے پینے کی اشیاء تلاش کرنے لگا۔ کھانا تیار ضرور کیا گیا تھا لیکن جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ گھر والے بیچارے خود اپنی پریشانیوں کا شکار رہے تھے کوئی کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ میں نے خود ہی پانی پینے کی بجائے کھانے پینے کی کچھ چیزیں نکالیں اور انہیں کھانے میں مصروف

ہوگیا۔ غالباً باورچی کھانے میں ہونے والی روشنی اور پھر برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ نے دوسرے لوگوں کو بھی جگا دیا۔ والد صاحب، ان کے پیچھے والدہ اور والدہ کے عقب میں ریاض ماموں باورچی خانے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ حیران کن منظر دیکھا اور پریشان ہونے کی بجائے خوش ہوگئے۔ والدہ کے منہ سے آواز نکلی۔

”الٰہی تیرا شکر ہے۔ الٰہی تیرا شکر ہے۔ بھوک لگ رہی ہے میرے بچے، تو پیچھے ہٹ میں تجھے کھانا دیتی ہوں۔“

”نہیں امی میں نے کھانا کھالیا ہے۔ بس ایک گلاس پانی دے دیجئے۔“ میں نے کہا اور ان سب کے زرد چہرے خوشی سے کھل گئے۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی اور اس سے ایک سال چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ دونوں شاید نہیں جاگے تھے۔ لیکن باقی تینوں افراد میرے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مجھے بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ لے گئے۔ والدہ نے اپنے کمرے کا بستر درست کیا، ایک طرف جائے نماز بچھی ہوئی تھی اس کا کونا موڑ دیا گیا تھا اور اس پر تسبیح بھی رکھی ہوئی تھی۔ غالباً والدہ جاگ رہی تھی اور میرے لئے دعائیں کر رہی تھیں۔ والد صاحب مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے کہا۔

”بیٹے اب کیسی طبیعت ہے؟ اب تو تم بول سکتے ہونا، ہاتھ پاؤں بھی ٹھیک ہیں؟“

”جی ابو............“

”مگر بیٹے کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا تھا؟“

یہ بات تو میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ ان لوگوں کو اپنی اس گندی حرکت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے خاموشی ہی اختیار کی تو ریاض ماموں بولے۔ ”رہنے دیجئے بھائی جان، یہ بالکل صحت مند ہوجائے تو ہم اس سے پوچھ لیں گے، دماغ پر زور ڈالنا مناسب نہیں ہے، تم یوں کرو مسعود میاں یہیں سوجاؤ باجی کے بستر پر، کسی قسم کی کوئی گرانی تو محسوس نہیں کر رہے؟“

”نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ تو یاد ہوگا کہ تم پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے۔“ والد صاحب نے پوچھا۔ شدید تجسّس انہیں بےچین کر رہا تھا۔ مگر ماموں ریاض نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”بھائی جان خدا کے لئے ابھی یہ تمام باتیں رہنے دیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی مشکل سے صورتحال درست ہوئی ہے۔“ والد صاحب خاموش ہوگئے۔ ماموں ریاض ہمارے ساتھ ہی ہمارے گھر میں رہتے تھے۔ نانا نانی مر چکے تھے۔ ان کی بھی بس یہ ایک بہن تھیں جو میری والدہ تھیں۔ مجھ سے بس چند سال ہی بڑے تھے۔ بڑے باہمت اور مخلص آدمی تھے، لیکن میں نے انہیں بھی اپنی کارستانیوں کی ہوا نہیں لگنے دی تھی، بہرطور مجھے افسوس تھا کہ میری غلط حرکت کی وجہ سے ان لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ دوسرے دن والد صاحب بھی دفتر نہیں گئے۔ ماموں ریاض نے بھی چھٹی کرلی تھی۔ بہن اور بھائی بھی گھر ہی میں تھے اور سب خوش نظر آرہے تھے۔ میری جسمانی کیفیت بالکل اعتدال پر تھی، بس دل کی دھڑکنیں تیز تھیں اور یہ خوف بار بار دل کو دہلا رہا تھا کہ کہیں وہ منحوس جادوگر کوئی ایسا عمل نہ کرے جس کی وجہ سے ان لوگوں کو دوبارہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بڑا ہی پچھتاوا تھا دل کو، کہ اپنی ایک غلط حرکت کی وجہ سے پورے گھر کے لئے مصیبت مول لے بیٹھا۔

دن پرسکون گزر گیا۔ پر رات خوفناک تھی۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے کمرے میں نہ سوؤں لیکن ان

لوگوں سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ پورا دن چونکہ بہتر گزرا تھا اس لئے اب وہ لوگ بھی مطمئن ہوگئے تھے۔ بس قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ البتہ جب آنکھیں بند ہوئیں تو خوابوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایسے ایسے بھیانک خواب نظر آرہے تھے کہ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ کبھی میں خود کو ایک ویران کھنڈر میں دیکھتا جس کی دیواریں ٹوٹی پھوٹی ہوتیں۔ میں فرش پر لیٹا ہوتا اور چھت سے اینٹیں نکل کر نیچے گر رہی ہوتیں۔ میں اس خوفناک منظر سے دہشت زدہ ہوکر اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک ستون کا سہارا لینے کے لئے اسے پکڑا لیکن اچانک ستون نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی پھر بہت سی انسانی آوازیں مجھے سنائی دیں اور میں جاگ گیا۔ آوازیں درحقیقت باہر سے آرہی تھیں میں حیران سا ہوکر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد صحن میں کھڑے ہوئے ہیں، تیز روشنی ہورہی ہے اور سامنے باتھ روم کے قریب ایک بڑے تھال میں کوئی چیز رکھی ہوئی ہے جو سب کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ میں آگے بڑھا تو وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ والدہ صاحبہ دل پکڑے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں۔ ماموں ریاض بھی سہمے سہمے سے نظر آرہے تھے۔ اس تھال میں میں نے دو کالے بکروں کے کٹے ہوئے سر اور ایک بڑی سی کلیجی رکھی ہوئی دیکھی۔ اس کے چاروں طرف خون کے دھبے بکھرے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے پریشان لہجے میں کہا۔ "خدا جانے کیا ہے یہ سب۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، یہ کہاں سے آیا؟ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا اب بتاؤ کیا کریں ان چیزوں کا؟"

"خخ۔ خدا کے لئے، یہ تو سفلی کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ہمارے لئے کچھ کرا رہا ہے، مگر کون، بھلا ہمارا کون دشمن پیدا ہوگیا۔ دنیا میں کسی سے جھگڑا نہیں ہے ہمارا۔ الٰہی خیر یہ ہمارے گھر کو کیا ہورہا ہے۔" والدہ صاحبہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ بہن بھائی بھی سہمے ہوئے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے ماموں ریاض سے کہا۔

"میاں ریاض ہمت کرنا ہوگی۔ میں اٹھاتا ہوں ان چیزوں کو۔ خاموشی سے باہر پھینک دیں۔ پڑوسیوں کو خبر ہوگئی تو نجانے کیا قیاس آرائیاں کریں گے۔" ماموں ریاض بہت باہمت تھے فوراً ہی آگے بڑھ کر وہ تھال اٹھالیا، والد صاحب نے دروازہ کھولا اور رات کی تاریکی میں دونوں باہر نکل گئے۔ میری زبان پر تالا لگا ہوا تھا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نجانے کیوں زبان خاموش تھی۔

جاگتی راتیں تو اب مقدر بن گئی تھیں۔ اس پرسکون گھر میں مصیبت کا بیج تو میں نے بویا تھا ایک خبیث سفلی عمل کے ماہر کو میں نے اپنا گھر دکھا دیا تھا اس نے جو کچھ کہا تھا اس کا پہلا نمونہ پیش کر دیا تھا۔ گھر والے انہیں یاد کر رہے تھے۔ جنہیں کبھی ان کے ہاتھوں تکلیف پہنچی تھی مگر ایسا کوئی یاد نہیں آرہا تھا۔ سب مصیبت کا شکار تھے اور میرا دل رو رہا تھا۔ کیونکہ ان کی مصیبت کا باعث میں تھا۔ میں نے اس گندگی کو پورے ہوش و حواس کے عالم میں مزار پر پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اب میں کسی کو کیا بتاتا۔ وہ بیچارے خود بھی کوئی فیصلہ نہ کرپائے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری کیفیت خراب ہوتی جارہی تھی۔ بہن بھائی سہمے ہوئے تھے۔ ماموں ریاض اور والد صاحب سخت پریشان تھے۔ دوسری رات بھی بھیانک تھی۔ رات بھر ہماری چھت پر دھما چوکڑی مچی رہی بلیوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ آواز در و دیوار سے بلند ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ ماموں ریاض، والد صاحب اور میرا چھوٹا بھائی اختر، ڈنڈے لئے چھت پر اور صحن میں بھاگتے پھرے مگر ایک بھی بلی نظر نہیں آئی تھی۔ صبح کو ایک اور دہشت ناک

واقعہ پیش آیا۔ چھوٹی بہن شمسہ غسل خانے میں غسل کرنے گئی تو اس کی دلدوز چیخوں سے سب کے کلیجے دہل گئے اور تو کوئی اس کے پاس نہ جاسکا والدہ غسل خانے میں داخل ہوگئیں۔ شمسہ بے ہوش ہوکر غسل خانے میں گر پڑی تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نجانے کس طرح والدہ صاحبہ نے اسے چادر میں لپیٹا اور اسے بستر پر لایا گیا مگر وہ بالکل زخمی نہیں تھی بلکہ خون کی پھواریں شاور سے نکلی تھیں۔ دوسرے نلوں کو چیک کیا گیا سب کی ٹونٹیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ بقول شخصے ہمارے گھر میں تازہ تازہ سرخ خون کے دریا بہہ گئے تھے۔ ماموں ریاض اوور ہیڈ ٹینک کی طرف بھاگے مگر ٹینک میں شفاف پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بعد میں نلوں کی ٹونٹیاں بھی صاف پانی اگلنے لگیں۔ مگر وہ خون اپنی جگہ ایک مستحکم حیثیت رکھتا تھا کیونکہ جہاں وہ گرا تھا اپنی خاصیت کے مطابق جمتا جارہا تھا، والدہ صاحبہ حواس باختہ ہوگئیں۔ شمسہ کو مشکل سے ہوش آیا تھا اور اس نے یہی بتایا کہ جونہی اس نے شاور کھولا اس سے خون کی دھاریں ابل پڑیں۔ غرض اس گھر میں پریشانیوں کے سوا کچھ نہ رہا میں سکتے کے عالم میں تھا مجھے خاص طور سے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی جارہی تھی کیونکہ وہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے تھے مگر یہ میں ہی جانتا تھا کہ یہ بیماری ان سب کے لئے میں خود خرید کر لایا ہوں۔ والدہ صاحب نے کہا۔

"یہ گھر چھوڑ دو، خدا کے لئے یہ گھر فوراً چھوڑ دو، یہاں کچھ ہوگیا ہے۔ ہم سب کسی خوفناک مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے ہم کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔"

"مگر ہم کہاں جائیں۔" والد صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جنگل میں جاکر پڑے رہیں گے۔ آہ کون دشمن ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔" والدہ صاحبہ روتے ہوئے بولیں، والد صاحب اور ماموں میاں کے درمیان بڑی یگانگت تھی سالے بہنوئی ایک جان دو قالب تھے جو کچھ بھی کرتے تھے آپس کے مشورے سے کرتے تھے والد صاحب بولے۔

"کبھی خواب میں بھی ان فضولیات کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مگر آخر کیا کہوں ان واقعات کے بارے میں۔ تمہاری کیا رائے ہے ریاض میاں؟"

"میں خود حیران ہوں بھائی جان لیکن ایک بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں یہ سب کچھ شروع اسی دن سے ہوا ہے۔" ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

"کیا بتا سکتے ہو مسعود میاں۔ تم خود بھی ذہن دوڑاؤ۔ اگر کوئی اشارہ مل جائے تو۔ تم اس دن پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے، وہاں بے ہوش کیسے ہوگئے تھے۔" میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہوگیا، مگر ساتھ ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی کا ہاتھ گلے پر آپڑا ہو۔ میرے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، آنکھیں حلقوں سے ابھر آئیں اور میں اپنا گلا پکڑ کر تڑپنے لگا۔ وہ نادیدہ قوت میری گردن دبا رہی تھی ایک بار پھر ہنگامہ ہوگیا۔ میری حالت غیر ہوگئی تھی۔ لینے کے دینے پڑ گئے، وہ اپنے اس سوال سے تائب ہوگئے تھے۔ رات گئے میری حالت بحال ہوسکی تھی۔

پریشانیوں کے دن پریشانیوں کی راتیں سارا کاروبار بند ہوگیا تھا کوئی ڈیوٹی پر نہیں جاتا تھا میں بھی گوشہ نشین ہوگیا تھا اس دوران میں نے کچھ تجربات بھی کئے تھے۔ مثلاً اپنے اوپر بیتنے والے تمام واقعات کاغذ پر لکھنے کی کوشش کی، قلم میں سیاہی غائب ہوگئی، کئی نئے بال پوائنٹ آزمائے مگر کسی نے چل کر نہ دیا۔

دوسری بار انگلیاں اکڑ گئیں. تیسری بار آنکھوں سے روشنی غائب ہوگئی۔ خوفزدہ ہو کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی تھی یوں بھی تین دن گزرنے کے بعد ایک دم پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو حیرانی کا باعث ہوتی لیکن گھر والوں کے حواس غائب تھے۔ بہن بھائی کو پڑھنے نہیں بھیجا جا رہا تھا کہ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔ ماموں اور والد دفتر نہیں جا رہے تھے کہ گھر میں کچھ نہ ہو جائے۔ اس صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماموں ریاض نے کہا۔

"بھائی جان آپ کو حکیم سعد اللہ یاد ہیں؟"

"ایں ہیں" والد صاحب چونک پڑے پھر کسی قدر پرجوش لہجے میں بولے۔ "بھئی خوب یاد آئے وہ تمہیں۔ واقعی اس وقت وہ ہمارے بہترین مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔" حکیم سعد اللہ مجھے بھی یاد تھے۔ ایک دین دار بزرگ جن سے ہماری قدیم شناسائی تھی۔ پہلے حکمت کرتے تھے تجربے کے ساتھ ساتھ روحانیت بھی تھی۔ بیٹے جوان ہو کر عمدہ ملازمتوں پر لگ گئے تو مطب ختم کر دیا مگر اب بھی فی سبیل اللہ خاص ضرورت مندوں کا علاج مفت کیا کرتے تھے۔ کافی عمر تھی بھنوؤں کے بال بھی سفید ہوگئے تھے۔ مگر کمر سیدھی تھی، بینائی درست تھی، دانت بتیس موجود تھے۔ چہرے پر صحت کی سرخی تھی ان کا بڑھاپا قابل رشک تھا۔

شام کو چھ بجے ہم حکیم صاحب کے ہاں روانہ ہوگئے۔ بہت خوبصورت مکان بنا ہوا تھا جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بیٹوں کی بیویاں، پوتے پوتیاں ان کا کمرہ الگ تھلگ تھا۔ جہاں ان کی ساری کائنات سجی ہوئی تھی۔ والد صاحب کا نام سن کر وہ خود ہی باہر نکل آئے۔

"اخاہ۔ بڑے بڑے لوگ آئے ہیں بھئی، محفوظ احمد بڑے بے مروت انسان ہو بخدا کئی دن سے بہت یاد آرہے تھے میں نے نعیم اللہ سے کہا تھا کہ کسی وقت خبر لیں تمہاری، کہاں غائب ہو۔ آؤ، اندر آؤ۔" انہوں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئے مگر وہ آگے بڑھ کر رکے۔ چونک کر باری باری ہم تینوں کی شکلیں دیکھتے رہے پھر بولے۔ "کوئی اور ہے تمہارے ساتھ؟"

"جی نہیں کیوں؟" والد صاحب نے پوچھا۔

"ایں .... نہیں۔" وہ کسی قدر الجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ "آؤ ....!" پھر وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ فرید .... فرید میاں ....؟" انہوں نے کسی کو آواز دی۔ نو سال کا ایک بچہ اندرونی دروازے سے داخل ہوگیا۔ "میاں باہر دیکھنا کوئی آیا ہے کیا؟"

"جی بہتر نانا میاں۔" بچے نے جواب دیا اور باہر نکل گیا کچھ دیر کے بعد اس نے آکر بتایا کہ کوئی نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے گردن جھٹک کر کہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ اور چائے کے لئے کہہ دو۔" بچے کے جانے کے بعد وہ مسکرا بولے۔ "یہ پراسرار آمد باپ بیٹے اور سالے کی خالی از علت نہیں ہوسکتی کوئی کام ہے مجھ سے۔"

"جی سعد اللہ صاحب!"

"میاں بے دھڑک بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

"بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں ہم لوگ سعد اللہ صاحب۔"

"اللہ رحم کرے کیا بات ہے؟" والد صاحب نے پوری تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ سعد اللہ

صاحب پوری توجہ سے سب کچھ سن رہے تھے۔ آخر تک تمام تفصیل جاننے کے بعد والد صاحب نے کہا۔

"ان کی والدہ کہہ رہی ہیں کہ گھر چھوڑ دیا جائے۔ اگر میں گھر کرائے پر ...." سعد اللہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش کر دیا وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے چاروں طرف پھونکیں ماریں اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"نہیں میاں یہ بیکار بات ہے۔ اٹھو صاحب زادے ادھر آؤ۔" میں خاموشی سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیوں کی طرف سے سیدھے کئے اور پھر انہیں ناک کے قریب کر کے سونگھنے لگے۔ پھر انہوں نے ناک سکوڑ کر جھٹکے سے میرے ہاتھ پیچھے ہٹا دیئے اور بولے۔

"جاؤ بیٹھو۔" میں خاموشی سے اپنی جگہ جا بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے یہی عمل ماموں ریاض اور والد صاحب کے ساتھ دہرایا اس وقت انہوں نے کسی ناگواری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ بولے۔ "نہیں میاں گھر وغیرہ چھوڑنے سے کچھ نہیں ہوگا البتہ انہیں چھوڑ جاؤ۔ آج رات یہ ہمارے مہمان رہیں گے۔ صبح کو انہیں لے جانا کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

"نہیں حکیم صاحب حرج بھلا کیا ہوگا۔" والد صاحب نے کہا اسی وقت ایک نوکر چائے لے آیا تھا حکیم صاحب ہنس کر بولے۔

"چلو میاں کھاؤ پیو پھر مذاکرات ہوجائیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں رہو آرام سے، گھر چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔"

چائے کے بعد ماموں میاں اور والد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے انہیں وہیں سے خدا حافظ کہا اور پھر مجھ سے بولے۔ "جوتے اتار کر آرام سے بیٹھ جاؤ مسعود میاں۔ رات کو بات کریں گے۔ کچھ پڑھو گے ویسے تمہیں یہاں اپنے مطلب کی کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ مجبوری ہے آرام سے بیٹھو کوئی تکلف مت کرو۔"

"جی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ ایک خاص بات میں نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ حکیم صاحب اس کے بعد اس کمرے سے گئے نہیں تھے۔ ایک بار بچہ انہیں کسی کام سے بلانے آیا تو انہوں نے کہا۔

"ہم آ نہیں سکتے شکیل میاں ساڑھے آٹھ بجے دو آدمیوں کا کھانا بھجوا دینا اس سے پہلے مت آنا۔" پھر وہ جائے نماز پر جا بیٹھے تھے۔ وقت مشکل سے گزر رہا تھا ہم نے ساتھ کھانا کھایا پھر میں حکیم صاحب کی ہدایت پر وہیں ایک دیوان پر لیٹ گیا۔ ساڑھے دس بجے حکیم صاحب اٹھے انہوں نے پورے کمرے کے تین چکر لگائے اور پھر مجھ سے بولے۔ "اٹھو میاں بیٹھ جاؤ۔" میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ حکیم صاحب مجھ سے کچھ فاصلے پر میری طرف پشت کر کے بیٹھ گئے پھر انہوں نے کہا۔ "جو کچھ کہو گے سچ کہو گے وعدہ کرو۔"

"جی سچ کہوں گا۔"

"کہو وعدہ کرتا ہوں۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"ہوں۔ کیا قصہ تھا۔"

"میں ریس کھیلتا ہوں. جوا کھیلتا ہوں کوئی ایسا عمل کرنا چاہتا تھا جس سے مجھے کوئی پراسرار قوت

حاصل ہو جائے"

"یہی میرا اندازہ تھا۔ خیر آگے کہو۔" انہوں نے کہا اور میری زبان چل پڑی۔ میں نے انہیں سادھو کے ملنے کا واقعہ، ہڈی کا حصول، اس کے بعد اس شیطان کا حکم، پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیاں، وہاں سے گرنے کا واقعہ اور پھر بعد کے سارے واقعات سنا ڈالے۔ میرا دل دہشت سے کانپ رہا تھا اس سے پہلے میں نے جب بھی یہ داستان دہرانے کی کوشش کی تھی میرے اعضاء نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا اور میری بری حالت ہو گئی تھی لیکن اس وقت میری زبان نے میرا ساتھ دیا تھا میرے اندر خوشی کی لہر بیدار ہو رہی تھیں۔

"اس کا حلیہ تو بتاؤ ذرا۔" حکیم صاحب بولے۔

"قد بہت چھوٹا تھا، سر گنجا تھا اوپری بدن ننگا اور گلے میں جنیو........" دفعتہً میری زبان رک گئی۔ کمرے کا منظر بیحد پراسرار تھا۔ سامنے کی دیوار پر میرا اور حکیم صاحب کا سایہ پڑ رہا تھا اور میری نگاہ کئی بار ان سایوں پر پڑ چکی تھی لیکن اچانک ہی مجھے ایک تیسرا سایہ متحرک نظر آیا۔ یہ ایک پتلی سی رسی کا سایہ تھا جو ہل رہی تھی اور اس کے سرے سے کوئی پھیلی پھیلی چیز بندھی ہوئی تھی رسی تیزی سے لمبی ہوتی جا رہی تھی لٹکی ہوئی شے میرے چہرے کے عین سامنے پہنچ گئی۔ آہ........ وہ ایک بہت بڑی مکڑی تھی۔ اس کی آنکھیں مٹر کے دانوں کے برابر اور گہری سرخ تھیں اور........ اور........ وہ میرے چہرے کے عین سامنے جھول رہی تھی........!

دہشت سے میرا لہو میری رگوں میں منجمد ہو گیا، میں نے چیخنے کی کوشش کی تو میرا گلا بھنچ گیا، زبان اس طرح اکڑ گئی کہ میں اسے جنبش نہ دے پایا۔ حکیم سعد اللہ میری اس کیفیت سے بے نیاز میری طرف پشت کیے شاید میرے آگے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اپنے بدن کے لیس دار مادے سے بنے ہوئے تار میں جھومتی ہوئی مکڑی میرے چہرے کے سامنے آ کر رک گئی تھی۔ اور میں اس کا ننھا سا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہی منحوس سادھو تھا کوئی اور اسے دور سے دیکھتا تو وہ مکڑی کے سوا کچھ نظر نہ آتا لیکن میں اس کے چہرے کو پہچانتا تھا وہ شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا میرے کانوں میں حکیم سعد اللہ کی آواز ابھری۔

"بولتے رہو میاں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ایک بار پھر پوری قوت صرف کر کے بولنا چاہا لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا، البتہ مکڑی نے اپنی آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا تھا پہلے تو میں کچھ نہیں سمجھ پایا مگر دوسری بار مکڑی نے اپنی منحوس آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا تب میری نگاہ پیتل کے اس ڈھائی فٹ لمبے گلدان پر پڑی جو مجھ سے دو گز کے فاصلے پر رکھا ہوا تھا اس میں صبح کے باسی پھول سجے ہوئے تھے۔ سعد اللہ صاحب نے پھر کہا۔

"مسعود میاں مجھے اس کا پورا حلیہ بتاؤ میں اس کا نقشہ بنا رہا ہوں تمہاری طرف رخ نہیں کر سکتا۔" سادھو نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں چمک بے پناہ ہو گئی تھی اور دو سرخ لکیریں میری پیشانی کی ہڈی میں جیسے سوراخ کرنے لگی تھیں میں درد و کرب سے بے چین ہو گیا۔ اس وقت پیتل کا گلدان اپنی جگہ سے بلند ہو کر فضا میں پرواز کرتا ہوا خود بخود مجھ تک آ گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ کر سعد اللہ صاحب کو اس خطرے سے آگاہ کر دوں جو انہیں پیش آنے والا تھا مگر آہ یہ کرنا میرے بس میں نہیں تھا میرے اعضاء اب میرے قبضے میں نہیں تھے، میرا ذہن طلسمی روشنیوں میں جکڑتا جا رہا تھا جو میرے دماغ

میں داخل ہو چکی تھیں، میرے قدم میرے نہ چاہنے کے باوجود سعد اللہ صاحب کی طرف بڑھ رہے تھے، میرا رواں رواں فریاد کر رہا تھا مگر میں بے بس تھا، میرے ہاتھ سر سے بلند ہو چکے تھے۔ سعد اللہ صاحب میری مسلسل خاموشی سے پریشان ہو گئے تھے انہوں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"میاں کچھ منہ سے تو بولو تم نے ہماری ساری محنت۔" یہ کہہ کر انہوں نے پہلو بدلا اور رخ تبدیل کر لیا مگر میں ان کے بالکل نزدیک تھا میرے ہاتھ بلند ہو کر جھک چکے تھے اور کوئی تین کلو وزنی گلدان ان کے سر کا نشانہ لے چکا تھا البتہ رخ اچانک تبدیل ہونے سے ان کا سر پہلی ضرب سے بچ گیا اور گلدان ان کے شانے پر پڑا۔ حکیم صاحب کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی، میرا ہاتھ دوبارہ بلند ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے بے اختیار سر کا دفاع کرتے ہوئے کلائی سامنے کر دی اور گلدان کی ضرب سے ان کی کلائی چکنا چور ہو گئی۔ اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخے تھے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے دروازے کی طرف دوڑ لگائی تھی مگر میرے قدموں نے ایک لمبی زقند بھری اور میں دوبارہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ حکیم صاحب کافی زور سے دروازے سے ٹکرائے تھے اور ایک زور دار دھماکہ ہوا ہوگا۔ مگر میں ہر احساس سے بے نیاز انہیں ہلاک کرنے کے درپے تھا۔ حکیم صاحب نے دروازے کا سہارا لے کر اٹھنا چاہا مگر اس بار گلدان ان کے سر پر پڑا تھا، ضعیف اور کمزور آدمی تھے۔ ہائے کی ایک مدھم سی آواز ان کے ہونٹوں سے خارج ہوئی اور اس کے بعد وہ بے سدھ ہو گئے۔ لیکن میرے ہاتھ نہیں رکے، گلدان کی مسلسل ضربیں، میں ان کے جسم کے مختلف حصوں پر لگا رہا تھا اور ان کے اہل خاندان نے ان کی چیخیں اور اندر ہونے والی دھما چوکڑی سن لی تھی چنانچہ سب دروازے پر آ گئے اور باہر سے دروازہ پیٹا جا رہا تھا، پھر اس پر زور دار ضربیں پڑنے لگیں اور اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے اس منحوس مکڑی کو دیکھا مگر اب اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ باہر سے لگنے والی ضربوں سے دروازے کی چٹخنی کے اسکرو اکھڑ گئے اور بہت سے لوگ بھرا مار کر اندر داخل ہو گئے ان میں عورتیں بچے اور دو جوان آدمی بھی تھے جو شاید حکیم صاحب کے بیٹے تھے، پھر سب بھیانک آوازوں میں چیخنے لگے، انہوں نے حکیم صاحب کا کچلا ہوا جسم دیکھ لیا تھا نہ جانے کیا کیا آوازیں سنائی دے رہی تھیں کون کیا کہہ رہا تھا، میرے حواس قابو میں ہی نہ تھے دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا شاید مجھے مارا بھی جا رہا تھا مگر بدن کو چوٹ لگنے کا احساس بھی نہیں تھا، پھر میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔

ہوش آیا تو اسپتال کے ایک بستر پر تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے، دیر تک سمجھ میں نہیں آیا ہوش و حواس جاگے تو جسم کے مختلف حصوں میں درد ہونے لگا، آہستہ آہستہ گزرا ہوا وقت یاد آیا اور ایک ایک چیز یاد آ گئی۔ میں وحشت زدہ انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا اس منحوس غلیظ جانور نے میرے ہاتھوں حکیم سعد اللہ جیسے نیک انسان کو قتل کروا دیا تھا۔ آہ........ اس کے بعد کیا ہوا تھا، وہ صحیح طور پر اب یاد نہیں آ رہا تھا، بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا پھر دروازہ تھوڑا سا کھلا، کسی نے جھانک کر اندر دیکھا اور فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد پھر کھلا اور ایک زبردست جسامت کا مالک پولیس آفیسر کمرے میں داخل ہو گیا اس کے پیچھے چند کانسٹیبل تھے اور اس کے بعد ایک ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ، پولیس آفیسر نے پُر رعب لہجے میں کہا۔

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب معائنہ کیجئے اس کا ہم اسے لے جانا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"بس ہوش میں آ جانے کا انتظار تھا جسم پر کوئی ایسی چوٹ نہیں ہے جس کا باقاعدہ علاج کیا جائے پھر بھی

میں دیکھے لیتا ہوں۔ " اس نے آلہ لگا کر میرے دل کی دھڑکنوں کا معائنہ کیا جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولا اور میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے انچارج صاحب، بالکل ٹھیک ہے، تندرست آدمی ہے کوئی بات نہیں اسے آپ لے جاسکتے ہیں۔"

انسپکٹر نے اپنے ساتھی کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں، میں ششدر تھا، خوف سے میرا دل بند ہوا جارہا تھا، ہونٹ خشک ہورہے تھے ہوش و حواس اس وقت بالکل بحال تھے، سوائے جسم کے کچھ حصوں کے درد کے اور کوئی کمی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ انسپکٹر نے مجھے گردن سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چل اوئے آگے بڑھ"۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ کسی سے کچھ کہنے کے لئے الفاظ بھی نہیں تھے میرے پاس، بے چارگی کے انداز میں کمرے کے دروازے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر دل حلق میں آگیا کہ باہر سب ہی موجود تھے۔ ماموں ریاض، والد صاحب اور والدہ چھوٹی بہن اور بھائی سب کے چہرے اس طرح مرجھائے ہوئے تھے جیسے ان پر خزاں آگئی ہو۔ والدہ صاحب مجھے دیکھ کر پچھاڑیں کھانے لگیں، والد صاحب نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا، چھوٹی بہن دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور بولی۔

"بھائی جان ...... بھائی جان ......" لیکن انسپکٹر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بی بی، خود کو سنبھالے رکھو، قریب آنے کی اجازت نہیں ہے، یہ مجرم ہے، یہ قاتل ہے، اس سے دور رہو۔"

بہن نجانے کیا کیا کہنے لگی، میرے کان ایک بار پھر سنسنانے لگے تھے، والد صاحب بیچارے چہرے سے ہاتھ ہی نہ ہٹا پارہے تھے، ماموں ریاض نے البتہ ہمت کر کے میرے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرنا مسعود میاں ہم تمہاری ضمانت کرانے کی بھرپور کوششیں کررہے ہیں بالکل فکر مت کرنا ہم زندہ ہیں جو کچھ بھی بن پڑے گا ہم سے، ہم تمہارے لئے ضرور کریں گے۔" ماموں ریاض کہتے رہے لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ ماں اور بہن کی کیفیت دیکھ کر دل پھٹا جارہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر ماں سے لپٹ جاؤں، ان کی آوازیں کانوں میں گرم سیسے کی مانند اتر رہی تھیں، چھوٹا بھائی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا ہر شخص کی ایسی کیفیت تھی کہ تصور کرتا تو سینہ پھٹ جاتا پھر وہ سب پیچھے رہ گئے، ماں کی آوازیں اب بھی میرے کانوں میں آرہی تھیں۔

"بچالو .... بچالو میرے بچے کو بچالو .... وہ بے قصور ہے بے گناہ ہے۔" مجھے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور باقی سب لوگ پیچھے رہ گئے، اب میں انسپکٹر کے رحم و کرم پر تھا، کچھ دیر کے بعد ہم تھانے پہنچ گئے اور مجھے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا، انسپکٹر چلا گیا اور میں لاک اپ میں زمین پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائے گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ اب اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ اس بھیانک صورتحال کو نہیں سمجھ پاتا۔ میں نے ایک قتل کیا تھا اور بڑی وحشت اور درندگی کے عالم میں کیا تھا۔ حکیم سعد اللہ میرے ہاتھوں مارے گئے تھے، اگر میں کسی سے کہتا کہ انہیں قتل کرنے والا میں نہیں تھا تو لوگ ہنسنے کے علاوہ کچھ نہ کرتے، چنانچہ ایسی باتیں کرنا ہی حماقت تھی۔

دروازے کے سامنے موجود پہرہ دینے والا سنتری مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا میں نے گردن جھکالی اور آنکھیں بند کرلیں۔ دن گزر گیا غالباً میں پچھلی ساری رات بے ہوش رہا تھا اور اس

وقت دن کے تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تھے بہرحال شام ہوگئی، رات کو مجھے سلاخوں کے پیچھے سے روٹی اور سالن دیا گیا اور پانی کا ایک گلاس۔ ایک کانسٹیبل ہی نے یہ چیزیں رکھی تھیں اور خاموشی سے واپس مڑ گیا تھا، میں دن بھر کا بھوکا پیاسا تھا لیکن ان چیزوں کی طرف رخ کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا بس طرح طرح کے خیالات جی میں آرہے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ خاص طور سے ماں کی حالت سے میں بہت دل گرفتہ تھا، میری ماں میرے غم میں مرہی جائے گی.......... آہ کیا یہ سب میرا ہی قصور ہے؟ کیا میں ایک ناگہانی مصیبت میں نہیں پھنس گیا ہوں۔ ؟ لیکن اگر پس منظر میں نگاہ دوڑاتا تو سچ مچ سارا قصور اپنا ہی نظر آتا تھا وہی ساری چیزیں ذہن میں آجاتی تھیں، کائنات میں بسنے والے محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے اگر میری طرح سے ہر شخص ان آسان راستوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے تو کاروبار حیات معطل ہوجائے۔ یہ سب غیر فطری تھا ناجائز تھا اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے انحراف تھا اور اسی انحراف کی مجھے سزا ملی تھی، تھا تو میں اسی سزا کا مستحق اور اب بعد میں پچھتانے سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہوگیا پہرہ دینے والے سنتری نے جب کافی دیر بعد کھانا اسی طرح رکھے ہوئے دیکھا تو چہرے پر ہمدردی سجائے میرے پاس پہنچ گیا۔

"کھالے بابو کھالے .... برا کام کرتے ہوئے کچھ نہیں سوچتے تم لوگ .... جنون میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہو کہ اللہ کی بنائی ہوئی زندگی کو ختم کر دیتے ہو اور بعد میں پچھتاتے ہو .... کھانا تو تجھے کھانا ہی پڑے گا۔ آج نہ سہی کل کھائے گا یہ پیٹ کب پیچھا چھوڑتا ہے۔" میں نے اداس نگاہوں سے سنتری کو دیکھا حالات سے بے خبر انسان اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا تھا پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

"بھائی اس وقت بھوک نہیں ہے، بعد میں کھالوں گا۔"

"تیری مرضی ہے مگر تو نے ایسا کیوں کیا۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے گناہوں کی سزا ہے۔"

"ہاں اللہ سے ہمیشہ توبہ کرنی چاہئے۔" سنتری نے کہا، کھانا اسی طرح رکھا رہا، رات ہوگئی اور میں زمین پر کمبل بچھا کر لیٹ گیا، آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں سر دے کر خیالات کی دنیا میں کھو گیا، کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا ظاہر ہے جو کچھ ہوا تھا اس میں میرا عمل بھی برابر شامل تھا اگر سوچ کا انداز یہ نہ ہوتا تو شاید یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔ نیند البتہ فراخدل ہے اس نے اپنی آغوش مجھ سے نہیں چھینی تھی اور رات کے کسی حصے میں میری آنکھوں میں آبسی تھی اور اس کی مہربانی نے سوچوں کے دکھ سے نکال دیا اور اسوقت جاگا جب سورج کی کرنیں چاروں طرف پھیل چکی تھیں اور ایک روشن دن نکل آیا تھا لیکن یہ روشن دن بڑا تکلیف دہ محسوس ہوا۔ آہ کاش اتنی طویل نیند آجائے کہ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

دن کے ساڑھے بارہ بجے ہونگے جب میں نے ماموں ریاض کو دیکھا کالے کوٹ میں ملبوس ایک صاحب کے ساتھ لاک اپ کے دروازے کی طرف آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں کھڑا ہوگیا، ماموں ریاض بہت خوش مزاج انسان تھے ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے عادی، کبھی ان کے چہرے پر سنجیدگی دیکھی ہی نہیں گئی تھی۔ سوائے ان پچھلے چند دنوں کے جب سے میں اس عذاب کا شکار ہوا تھا لیکن اس وقت تو ان کی صورت دیکھی نہ جارہی تھی جیسے اچانک بوڑھے ہوگئے ہوں، لڑکھڑاتے قدموں سے میرے قریب آئے، کالے کوٹ والے صاحب نے کہا۔

"کہو میاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی، مارا پیٹا تو نہیں کسی نے تمہیں..........؟"

"نہیں" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہوں، میرا نام ضمیر الدین ہے اور میں تمہارا وکیل ہوں، دیکھو میاں مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وکیل نے کہا۔

"مسعود میاں، ہم تمہاری ضمانت کی کوششیں کر رہے ہیں وکیل صاحب کو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔" میں نے عجیب سی نگاہوں سے ماموں کو دیکھا اور اپنے ذہن کو ٹٹولا زبان پر کوئی بوجھ نہیں تھا، دماغ آزاد تھا یعنی جو چاہوں کہہ سکتا ہوں لیکن اب اس کیفیت سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ جو کچھ ہو چکا تھا وہ ہی اتنا تھا کہ کسی خوشی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا، میں نے بمشکل تمام کہا۔ "میرا کچھ کہنا بے معنی ہے ماموں صاحب۔ میں نے عالم ہوش میں یہ سب کچھ نہیں کیا۔"

"تمہاری کیفیت کیا تھی۔" ماموں ریاض نے پوچھا۔

"بس ہوش و حواس نہیں تھے، آپ کو اس کا اندازہ ہے۔" میں مختصراً کہا۔

"یہ دورے تم پر کب سے پڑ رہے ہیں۔؟" وکیل صاحب نے کہا۔

"یہ دورے نہیں ہوتے۔"

"تمہیں یہ دورے پڑتے ہیں۔ تمہیں اپنا ذہن تاریک لگتا ہے ہاتھ پاؤں بے قابو ہو جاتے ہیں پھر تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا اور یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ تم کیا کر رہے ہو، سمجھ رہے ہو نا میری بات!" وکیل صاحب بولے اور میں نہ سمجھنے والے انداز میں وکیل صاحب کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ بولے "یہاں کسی نے تمہارا بیان لیا ہے۔"

"نہیں!"

"گڈ.......... یہ بہت اچھا ہوا۔ تمہیں بیان میں یہی کچھ کہنا ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔"

"جی!" میں نے کہا اور وکیل صاحب مجھے بتانے لگے کہ مجھے کیا بیان دینا ہے۔ میں خاموشی سے گردن ہلاتا گیا۔ پھر یہ دونوں چلے گئے۔ چلتے ہوئے ماموں ریاض نے مجھے پرسکون رہنے کی تلقین کی۔ میں ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا وہ میرے سامنے خود کو سنبھال رہے تھے لیکن گھر میں کیا کہرام مچا ہوگا میں جانتا تھا۔

ڈھائی بجے کے قریب مجھے لاک اپ سے نکالا گیا اور انچارج صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہاں میں نے حکیم سعد اللہ کے بڑے بیٹے کو بھی دیکھا تھا جو خود گورنمنٹ افسر تھے میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔ پولیس انسپکٹر نے کڑک کر کہا۔

"سیدھا کھڑا ہو۔ یا لگواؤں چار ڈنڈے۔" میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر نے مجھے چند گالیاں سنا کر اپنے نیک کام کا آغاز کیا پھر بولا۔ "اوئے کیا موت پڑی تھی تجھ پر، کیا دشمنی تھی سعد اللہ جیسے اللہ والے سے تجھے"

"مجھے ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"پھر تو جنگلی کیوں بن گیا؟"

"میں نہیں جانتا صاحب، کچھ دن سے میں بیمار ہوں، اچانک میرا دماغ بھاری ہو جاتا ہے، پھر مجھے ہوش نہیں رہتا۔ ایسی کیفیت کئی بار ہوئی میرے والد صاحب کے حکیم صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے وہ مجھے ان کے پاس علاج کے لئے لے گئے تھے، حکیم صاحب نے مجھے دیکھا اور میرے والد صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ان کے پاس چھوڑ جائیں۔ حکیم صاحب کے گھر سے معلوم کیا جا سکتا ہے انہوں نے ہمارے

لئے چائے منگوائی تھی پھر رات کا کھانا انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھلایا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے میری نبض دیکھتے رہے تھے دو بار انہوں نے مجھے دواؤں کی پڑیاں بھی کھلائی تھیں۔ پھر رات کو میری وہی کیفیت ہو گئی اور اس کے بعد اسپتال میں ہوش آیا۔"

پولیس انسپکٹر نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر سعد اللہ کے بیٹے نعیم اللہ کو.......... پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ تو کیس ہی بدل گیا نعیم اللہ صاحب.........."

"جھوٹ بکتا ہے یہ بدمعاش۔ اس نے میرے ابا کو دیوانوں کی طرح مارا ہے سارے بدن کی ہڈیاں توڑ دی تھیں بدبخت نے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا میرا نام بھی نعیم اللہ ہے، اسے پھانسی نہ دلوائی تو نام نہیں۔" نعیم اللہ نے غیظ کے عالم میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں جی، ہم اس سے اصل بات پوچھ لیں گے۔" انسپکٹر نے محرر سے بیان لکھنے کو منع کر دیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا۔ "مخدوم خاں اسے بند کر دو رات کو نو بجے ڈرائنگ روم میں لے آنا۔" مجھے دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ شام کو پانچ بجے ماموں ریاض پھر آئے اور میرے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھ سے صورتحال پوچھی تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ میں تو ڈرائنگ روم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن وہ سمجھ گئے تھے چنانچہ فوراً ہی چلے گئے وہ دوبارہ نہیں آئے۔ البتہ رات کو نو بجے ایک اور کمرے میں لایا گیا تھا۔ انسپکٹر صاحب کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ ہنستے ہوئے بولے۔

"اوئے اصل بات اگل دے شہزادے، ورنہ یہ ڈرائنگ روم دیکھا ہے نا۔ بڑے بڑوں کی زبان کھل جاتی ہے یہاں، او یار بشیر دو چار نشان بنا دے اس کے منہ پر وہ نعیم اللہ بھی سرکاری افسر ہے، اصل بات کیا تھی شہزادے۔"

"میں نے آپ سے ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا جناب۔"

"عدالت میں بھی یہی بیان دے گا؟"

"جو سچ ہے ہر جگہ بتاؤں گا۔"

"او جیتا رہ شیر، مگر سن، کل جب نعیم اللہ آئے یا اس کے گھر کا کوئی بندہ آئے تو یہی ظاہر کرنا جیسے تیری ٹھیک ٹھاک پھینٹی لگی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے دو چار آوازیں بھی نکال لینا۔ چلو بھئی اس کا بیان لکھواؤ۔"

محرر نے میرا بیان لکھ لیا مگر انسپکٹر صاحب کی یہ مہربانی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی البتہ دوسرے دن حقیقت واضح ہو گئی ڈرائنگ روم کا عذاب روکنے کے لئے ماموں صاحب نے دس ہزار خرچ کئے تھے۔ اس دن سعد اللہ کے دوسرے صاحبزادے فہیم اللہ صاحب آئے تھے اور مجھے ان کے سامنے بلایا گیا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔

"جوڑ جوڑ توڑ دیا ہے ہم نے اس کا مگر اس کا کہنا ہے کہ اس نے ہوش کے عالم میں یہ سب نہیں کیا۔"

"مار پیٹ سے کوئی فائدہ نہیں انسپکٹر صاحب، قانون اسے بھرپور سزا دے گا۔ آپ اسے آئندہ نہ ماریں۔" پھر عدالت سے میرا مزید چند روز کا ریمانڈ لیا گیا۔ قتل اور وہ بھی ایسے وحشیانہ قتل کے ملزم کی ضمانت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا البتہ تھانے کے چند روز قیام میں انسپکٹر صاحب نے ماموں کی خوب کھال اتاری اس کے بعد مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ اس دوران میری ذہنی کیفیت نارمل رہی تھی۔ میں نے اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں بھی سوچا تھا یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر تباہ

کر دیا ہے میرا گناہ مجھ تک ہی رہتا تو میں خوشی سے سب کچھ برداشت کر لیتا مگر سب لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اب وہ لوگ مجھے بچانے کی کوشش میں روپیہ پانی کی طرح بہائیں گے اور نتیجہ جو ہو گا وہ سامنے تھا دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن اس سادھو کے بارے میں، میں نے زبان بند رکھی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے کسی کو اس بارے میں بتا دیا تو وہ بھی اس گندی روح کا شکار ہو جائے گا۔ میرا مستقبل کسی حد تک میرے سامنے آ چکا تھا۔ زندگی کا خاتمہ. اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جیل کی کوٹھری کی پہلی رات بڑی اذیت ناک تھی۔ رات کے نو بجے ایک اور قیدی کو اس کوٹھری میں بھیج دیا گیا جہاں میں تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو صورت سے ہی غنڈہ نظر آتا تھا۔ اس نے بس ایک نگاہ مجھے دیکھا تھا اور پھر خاموشی سے اپنا کمبل لے کر ایک گوشے میں جا پڑا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے خراٹے ابھرنے لگے تھے وقت گزرتا گیا۔ لاک اپ میں بھی نیند آنے لگی تھی پھر وہاں کے لوگوں کا رویہ بھی برا نہیں تھا لیکن یہاں نیند اڑ گئی تھی، رات نہ جانے کتنی بیت گئی۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پہرہ دینے والے سنتریوں کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ساتھی قیدی کے خراٹے دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ جب یہ خراٹے ناقابل برداشت ہو گئے تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"بھائی یہ خراٹے بند کرو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" خراٹے رک گئے ساتھ ہی قیدی نے چہرے سے کمبل ہٹا دیا۔ وہ اپنی چمکدار سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مکروہ شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آہ......وہ......وہی ناپاک سادھو تھا۔ پیلے مدقوق بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اس نے کمبل ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا حالانکہ پہلے میں نے اس قیدی کو دیکھا تھا وہ یہ نہ تھا۔ میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنسنے لگا، پھر اس کی کریہہ آواز ابھری۔

"کہو میاں جی، دماغ ٹھکانے آیا. یا نہیں۔"

"تم..........ذلیل کتے، شیطان، یہاں بھی آ مرے۔" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ ہنستا رہا بولا۔ "ہم کہاں ناہیں جا سکتے میاں جی۔ پر لگے ہیں لیکن تمہاری دم ابھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہے۔"

"تو نے آخر، تو نے آخر میری زندگی کیوں برباد کر دی۔ ذلیل سادھو، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔"

"اک جرا سا کام کہا تھا، تم سے، ہمارا کام کر دو سب ٹھیک ہو جائے گا اب بھی کچھ نہ بگڑا میاں جی ہماری بات مان لو۔ ہمیں پھاگن دوار پہنچا دو۔ بھگوان کی سوگند سب ٹھیک ہو جائے گا!"

"تو غلیظ ناپاک کتے، اس پاک مزار پر جا کر کیا کرے گا؟"

"یہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا میاں جی، تم بس ہمارا کام کر دو اور پھر مزے کرو ایسے عیش کرو گے کہ جیون بھر دعائیں دو گے ہمیں۔"

"خدا کی قسم، اپنے ماں باپ کی قسم، مجھے کچھ بھی ہو جائے، میں تیرے ناپاک وجود کو اس پاک جگہ کبھی نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔"

"تو پھر ہم بھی تمہیں بتا دیں میاں جی، ایسا حال کر دیں گے تمہارا ہم کہ موت بھی تم سے گھبرائے گی جو کہیں وہ کر کے دکھائیں گے!"

"غلیظ ناپاک کتے، میں تجھے فنا کر دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے اچک کر اس کی گردن پکڑ لی اور اس کے منہ سے دلدوز چیخیں نکلنے لگیں۔ مجھ پر جنون سوار تھا مجھے باہر سنتریوں کی چیخ و پکار بھی نہیں سنائی دی وہ اندر گھس، آئے تھے اسے میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے مگر

اس میں ناکام تھے پھر شاید میرے سر پر ضربیں لگائی گئی تھیں اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کب ہوش آیا تھا۔ سر پھوڑا بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار تاریکی چھا جاتی تھی بری طرح چکر آ رہے تھے جی مالش کر رہا تھا۔ تھا بھی کہیں اور. حواس کسی قدر قابو میں آئے تو محسوس کیا کہ کسی بستر پر ہوں اور پیروں میں فولادی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ گزرے لمحات یاد آنے لگے سب کچھ یاد آ گیا نہ جانے اس کے بعد کیا ہوا تھا بعد میں تمام صورتحال علم میں آ گئی اور اسے معلوم کر کے کیا بتاؤں کہ اندرونی کیفیت کیا ہوئی۔ وہ قیدی میرے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا جس کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ مجھ پر ایک اور قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ جیل کے حکام سخت پریشانی میں گرفتار ہو گئے تھے اور بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ سنتری نے میرے سر پر زوردار ضربیں لگا کر قیدی کو مجھ سے چھڑایا تھا مگر اس وقت تک اس کا دم نکل چکا تھا۔ میرا سر بری طرح پھٹا ہوا تھا اور جیل کے اسپتال میں میرا علاج ہو رہا تھا۔ ہر آنکھ میں میرے لئے نفرت تھی کئی دن تک جیل اور پولیس کے حکام میں گھرا رہا۔ ڈاکٹر تک مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کسی کے دل میں میرے لئے ہمدردی نہیں تھی۔ پھر میرا بیان لیا گیا ایک پولیس افسر نے پوچھا۔ "غلام خان کو تم کب سے جانتے تھے؟"

"کون غلام خان"؟

"جسے تم نے قتل کر دیا"۔

"میں کسی غلام خان کو نہیں جانتا۔"

"پھر تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"اس سے پہلے کتنے قتل کئے ہیں؟"

"بیکار باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔" میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا سر کی دکھن ناقابل برداشت تھی اور پھر یہاں موجود تمام لوگوں کے ناخوشگوار رویے نے بیحد بددل کر رکھا تھا۔ ایک نظر بھی ایسی نہیں تھی جس میں میرے لئے ہمدردی کے آثار ہوتے اس کیفیت نے جو بےزاری دل و دماغ پر طاری کر رکھی تھی اس کے تحت اس کے علاوہ اور کیا جوابات دے سکتا تھا، پولیس افسر نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوش و حواس تو اس طرح درست ہوں گے تمہارے کہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھو گے، تم نے دو قتل کئے ہیں، دو بے گناہوں کو قتل کیا ہے تم نے۔ تمہارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔" میں نے تلخ نگاہوں سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور کہا۔ "میرا جو انجام ہو رہا ہے پولیس آفیسر، وہ شاید بہت اچھا ہے۔"

"تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔" اس نے کہا اور میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پولیس آفیسر مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا اور میں نے اسے الٹے سیدھے ہی جوابات دیئے۔ . وہ دانت پیستا رہا تھا اور اس کے بعد اٹھ کر چلا گیا تھا۔ بہرطور اسپتال میں تقریباً ایک ہفتے رہنا پڑا تھا. بیڑیوں اور ہتھکڑیوں نے الگ ناک میں دم کر دیا تھا۔ پولیس کے جوان ہر وقت میرے کمرے کے سامنے رہا کرتے تھے ڈاکٹر بھی آتا تو پولیس کی نگرانی میں، مجھے خطرناک اور جنونی قاتل قرار دیا گیا تھا، کوئی میرا درد نہیں جانتا تھا. کوئی میرے دل کی پکار نہیں سن سکتا تھا. میرا دل چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ جو ہوا ہے اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ لیکن اب تو جان بوجھ کر بھی کسی کو کچھ بتانے

لو جی نہیں چاہتا تھا، بس عجیب سی کیفیت تھی۔ بہت ہی عجیب۔

اس بار جس کوٹھری میں پہنچایا گیا تھا اس میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا، کوٹھری کی کھردری زمین پر لیٹتے ہوئے میں نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا، جو کچھ ہوا تھا اور اس قیدی کو ہلاک کرنے کی جو وجہ تھی، وہ میں نے اب تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا بھی تو کون یقین کرتا، یہ کہانی تو صرف ایک شخص نے سنی تھی اور وہ کسی اور کو سنانے کے لئے زندہ نہیں رہ گیا تھا۔ بے چارے حکیم سعد اللہ...... ان کا تصور ذہن میں آتا تو دل بری طرح دکھنے لگتا تھا۔ ایک نیک آدمی کا یہ انجام جو میرے ہاتھوں ہوا تھا باعث خوشی تو نہیں ہوسکتا تھا، آہ منحوس سادھو، کہاں سے تو میری زندگی میں شامل ہوگیا، کیا قصور ہے میرا، کیا کیا ہے میں نے......

بس یہی تمام احساسات دل میں رہتے تھے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا تھا۔ پھر تقریباً اس واقعہ کے چودہ دن بعد ماموں ریاض میرے پاس آئے، پولیس کے جوان مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں لئے ہوئے جب ملاقات کی جگہ پہنچے تو میں نے دور ہی سے ماموں ریاض کو دیکھ لیا، میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں، کوئی بھی تو کچھ نہیں جانتا تھا میرے بارے میں، ماموں ریاض بے چارے پہلے ہی کی مانند پریشان حال نظر آرہے تھے، عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے، میری بھی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے تھے، ماموں ریاض کی محبتوں کو میں جانتا تھا، ایک طرح سے وہ ماموں کی بجائے بڑے بھائی ہی کی حیثیت رکھتے تھے۔ والد صاحب کا رویہ بھی ان کے ساتھ اپنی اولاد جیسا ہی تھا، ماموں مجھے جتنا چاہتے تھے، میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے......

”کیا ہوگیا تجھے، تجھے کیا ہوگیا مسعود، کیا کر ڈالا تو نے یہ سب کچھ میرے بچے، کیا کر ڈالا تو نے، کوئی وجہ بھی تو ہو ان ساری باتوں کی، آہ کیا نحوست نازل ہوگئی ہے ہمارے گھر پر......“

”ابا اور امی کا کیا ہے حال ہے ماموں صاحب......“

”سب زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہے ہیں، سارا کیا دھرا چوپٹ ہوگیا ہے۔ بھائی صاحب بستر سے لگ گئے ہیں باجی کا ذہنی توازن خراب ہوتا جارہا ہے۔ وہ یہاں آنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں تجھے یہ باتیں نہ بتاتا، مگر کیا کروں، مجبوری ہے، بتانا بھی ضروری ہے......“

”ایک بات کہوں ماموں صاحب، یقین کرلیں گے......“

”کہو مسعود، کہو میرے بیٹے......“ ماموں صاحب نے درد بھرے انداز میں کہا۔

”ان تمام باتوں میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ماموں صاحب، میں بے گناہ ہوں ماموں صاحب، جو مجھ پر طاری ہوجاتا ہے وہی مجھ سے یہ سب کچھ کرا رہا ہے۔ میں اتنا برا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ میرے گناہوں کی سزا ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماموں صاحب کہ ان دونوں افراد کو میں نے ہوش و حواس کے عالم میں قتل نہیں کیا......“

”آہ یہ بات ہم ایک ایک سے کہتے پھرتے ہیں مگر کوئی نہیں مانتا اور اس دوسرے قتل کے بعد تو وکیل ضمیر الدین صاحب بھی بددل ہوگئے ہیں وہ تو یہ کیس ہی لڑنے کے لئے تیار نہیں، بس کچھ سفارشیں ہیں اور کچھ تعلقات جن کی وجہ سے وہ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ آئیں گے تمہارے پاس تم سے بات کریں گے، دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔“ ماموں صاحب کے الفاظ سے مایوسی ٹپک رہی تھی میں بھی خاموش تھا۔ میں نے کہا۔

”آپ ماموں صاحب آپ میری جگہ گھر کا نظام سنبھالئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اب مجھے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکے گا، گھر کی بہت سی ذمہ داریاں آپ پر آپڑی ہیں۔ ماموں صاحب لیکن ایک بات

دل میں لے کر جائیے۔ امی اور ابا سے بھی یہی کہہ دیجئے گا کہ میں بے گناہ ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے عالم ہوش میں نہیں کیا۔ میں آپ سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں“۔ ماموں ریاض بری طرح رو پڑے تھے، بس اتنا ہی موقع مل سکا تھا ہم لوگوں کو بات کرنے کا۔ ویسے بھی میں ایک ناپسندیدہ مجرم تھا اور میری وجہ سے جیل حکام کو سخت عذاب میں گرفتار ہونا پڑا تھا اس لئے میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختیاں تھیں، سنتریوں نے ماموں صاحب کو شانوں سے پکڑ کر باہر دھکیلتے ہوئے کہا......

”چلو بھئی وقت ختم ہوگیا گھر نہ بناؤ اسے اپنا۔“ وہ لوگ ماموں صاحب کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور میں جالی کے پیچھے کھڑا بے بسی کی نگاہوں سے اپنے پیارے ماموں کی یہ بے عزتی دیکھتا رہا، جی چاہ رہا تھا کہ سر ٹکرا ٹکرا کر مرجاؤں، مگر شاید یہ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا، سر کے زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے، اگر کوئی اور مجرم ہوتا تو اسے شاید ابھی اسپتال میں ہی رکھا جاتا لیکن ڈاکٹر بھی مجھ سے خوفزدہ تھے، یہاں تک کہ اب تو جیل کے سنتری تک میری سلاخوں کے پاس سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے اور دور ہی دور سے مجھے دیکھتے تھے یا رک کر ایسی نگاہوں سے مجھے تکتے تھے جیسے میں ابھی سلاخیں توڑ کر ان پر حملہ آور ہوجاؤں گا۔ کسی انسان کی بےقدری اس کے لئے کس قدر دلدوز ہوسکتی ہے اس کا اندازہ کوئی صاحب دل ہی لگا سکتا ہے۔ بےبسی کے دن بے کسی کی راتیں، جیل کی تاریک کوٹھری، تنہائی اور نفرت بھری نگاہیں، یہ ساری چیزیں اب میری لئے تھیں اور میں اپنے گناہ کو کم نہیں سمجھتا تھا کیوں میں نے لالچ میں آکر زندگی کو اصول کے دھارے سے ہٹایا تھا اور بےاصولی اپنا لی تھی، جادو سیکھ کر یا سفلی علم کا سہارا لے کر میں اپنے مستقبل کو بنانا چاہتا تھا، آہ یہ گناہ میرا تھا اور اس کی سزا بیحد طویل تھی، بیحد طویل، کئی بار رو رو کر خدا سے دعا مانگی تھی، توبہ کی تھی، لیکن شاید میں اپنے جرم کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا مجھے اپنے گناہ کا پوری طرح احساس نہیں تھا، میرے لئے ابھی بہت طویل سزا تھی۔ پھر دوسری کہانیاں جاری ہوگئیں۔ ماموں ریاض بےپناہ پیسہ خرچ کر رہے تھے، عدالت میں میرا چالان پیش کر دیا گیا مجھ پر دوہرے قتل کا جرم تھا، حکیم سعد اللہ کا قتل اور اس کے بعد ایک قیدی غلام خان کا قتل، البتہ میرے وکیل ضمیر الدین صاحب نے اپنی مرضی کے خلاف میری بہت زیادہ مدد کی تھی۔ انہوں نے غالباً کچھ ایسے دلائل پیش کئے تھے کہ جن کی بناء پر مجھے پاگل اور خبطی قرار دے دیا جائے۔ لیکن وکیل سرکار۔ انہی لوگوں میں سے تھا جو مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اس نے جج صاحب سے میرے دماغی معائنے کا مطالبہ کیا اور جج صاحب نے حکم دیا کہ اعلیٰ قسم کے دماغی اسپتال سے میرا معائنہ کرایا جائے اور رپورٹ آئندہ پیشی پر ان کے سامنے پیش کی جائے، یہ سب کچھ بھی ہوا، میرا دماغی معائنہ کرایا گیا۔ پولیس کے جوانوں کی نگرانی میں مجھے اسپتال لے جایا گیا، تقریباً پانچ دن وہاں صرف ہوئے، میرا دماغی معائنہ کیا گیا۔ طرح طرح کے ایکسرے، مختلف طریقوں سے دماغی تجزیے، عاجز آچکا تھا ان تمام باتوں سے لیکن جی رہا تھا۔ پھر پیشی ہوئی اور میرے دماغی معائنے کی رپورٹ پیش کر دی گئی اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ جج صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا جو یہ تھا کہ میں دماغی طور پر ایک تندرست آدمی ہوں اور میرے دماغ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس کے بعد پانچ ساعتیں اور ہوئیں اور پھر مجھے اس دنیا سے رخصتی کا پروانہ دے دیا گیا۔ سزائے موت ہوگئی تھی مجھے، غالباً سب ہی کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا، عدالتی کارروائی کے دوران جس دن فیصلہ سنایا جانے والا تھا، ماموں ریاض کے ساتھ والد صاحب بھی تھے، وہیں بے ہوش ہوگئے اور ماموں ریاض انہیں سنبھالنے لگے۔ میرے لئے دن کا تعین بھی کر دیا گیا اور اس بار مجھے جیل کی جس کوٹھری میں پہنچایا گیا وہ بہت ہی زیادہ تنگ و تاریک تھی وہاں وحشتوں کا راج تھا۔ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہوچکا تھا اور یہ بڑی عجیب

بات تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا، زندگی کب ختم ہوگی یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن کیسی انوکھی بات ہے کہ میں جانتا تھا کہ فلاں دن فلاں وقت مجھے اس دنیا سے رخصت کر دیا جائے گا۔ ان دنوں سوچیں بہت زیادہ جامع نہیں تھیں، بس اڑے اڑے خیالات تھے اور ماضی کی کہانیاں یہ غالباً تیسرے دن کی بات ہے، میرا بھائی بہن اور ماموں ریاض مجھ سے ملاقات کے لئے پہنچے سب کے سب زار قطار رو رہے تھے میں نے غصے میں کہا۔ " آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں، میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ آپ میں سے کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔ کیوں یہاں آئے ہیں، چلے جائیے چلے جائیے۔ "

"بھائی جان" ۔ میری بہن بلک بلک کر رو پڑی اور میں نے اسے خونی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

"میں کسی کا بھائی جان نہیں ہوں میرا اب اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے جاؤ اگر مجھ سے اپنا کوئی رشتہ ہی سمجھتے ہو تو میرا صرف ایک کام کر دینا وہ یہ کہ اماں اور ابا کا خیال رکھنا۔ " میں نے ان لوگوں سے منہ موڑ لیا اور وہ سب روتے اور بلکتے چلے گئے میں تو اب ان لوگوں میں سے تھا جن سے دنیا چھین لی جاتی ہے اور اب تو مجھے ساری باتیں بیکار لگتی تھیں۔ میں رات کو زمین پر لیٹ گیا۔ دوسرے دن پھانسی کی سزا دی جانی تھی مجھے، غور کرتا رہا، سنتری مجھے عبادت کی تلقین کرتے رہے، آج پہلی بار میں نے ان کی آنکھوں میں ہمدردی کے آثار دیکھے تھے۔ ایک سنتری نے مجھ سے کہا۔ "بابو عبادت کرو، اللہ کے حضور جا رہے ہو، جو کچھ کر کے جا رہے ہو، وہ اچھا نہیں تھا لیکن توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ " میں نے اسے کرخت نگاہوں سے دیکھا اور دوسری طرف رخ کر لیا، صبح قریب آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اعصاب میں ایک کھنچاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا، ذہن میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ سنتری آئے انہوں نے مجھے کوٹھری سے نکالا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور مجھے شانوں سے پکڑ کر لے چلے۔ ایک ایک قدم منوں وزنی لگ رہا تھا ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گہرا گڑھا ہے جس میں، میں جا گروں گا شانوں پر شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ پھر دفعتہً کسی نے میری گردن پر گدگدی کی اور میں چونک پڑا۔ سنتری مجھ سے دور تھے، پھر یہ کون ہے، عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی پھریوں لگا جیسے سر پر کوئی چیز چل رہی ہے لیکن بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے اسے ٹٹول نہ سکا تب ہی میرے کانوں میں آواز ابھری ....

"میں ہوں میاں جی، پہچانا۔ " اور میں نے اسے پہچان لیا، بھلا اسے نہ پہچانتا وہی منحوس آواز۔ میرے ساتھ چلنے والے سنتری اگر غور کرتے تو میرے سر پر بیٹھی مکڑی کو دیکھ سکتے تھے۔ "نہیں میاں جی، یہ سسرے ہمیں نا دیکھ سکتے۔ "

"اب کیا ہے۔ ؟ " میں نے پوچھا۔

"مجا آ رہا ہے میاں جی کہ نا۔ " اس کی آواز سنائی دی اور پھر باریک سا ٹمٹماتا ہوا قہقہہ۔ میں بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا۔ "پھانسی ہو جائے گی اب تمہیں ٹھور مر جاؤ گے۔ دیکھا تم سے کہا تھا نا ہم نے۔ " میں خاموشی سے قدم بڑھاتا گیا۔ "جندگی بڑھیا ہے یا موت میاں جی۔ بولو جینا چاہو ہو یا مرنا؟ "

میرے ذہن میں چھناکہ سا ہوا تھا، میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "اب بھی زندہ رہنے کا کوئی امکان ہے؟ "

"کیوں نا ہے ہم جو ہیں۔ "

"اب تو کیا کر لے گا اب میری موت کتنی دور ہے؟ " میں نے کہا اور وہ پھر اپنی مکروہ آواز میں ہنسا۔

"تم بات تو کرو میاں جی۔ ہم کا کریں گے یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو گا۔ " اس نے کہا۔

"کیا بات کروں؟ "

"ہمارا کام کرو گے؟ دیکھو میاں جی تمہارا راستہ کوئی نا روکے گا تم وہاں جا سکو ہو جہاں ہمیں جانا ہے آنکھیں بند کر کے چڑھتے چلے جانا پھاگن دوار اور پھر ہمیں وہاں رکھ دینا اس کے بعد دیکھنا مجا جندگی کا۔ "

"مگر وہ پاک مزار ہے اور تو گندا عامل۔ "

"ہے رے۔ اب بھی پاک ناپاک کے چکر میں پڑے ہو مرجی ہے تمہاری۔ "

"سن کمینے غلیظ سادھو، میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہی اتنا ہے کہ میں دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں یقیناً میرے گناہ اتنے ہوں گے کہ میری یہ انتہا ہوئی اب اس آخری وقت میں، میں تیرے سامنے یہ ناپاک اقرار کر کے اپنا ایمان نہیں کھونا چاہتا۔ موت میرے سامنے ہے اب مجھے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے میں تھوکتا ہوں تجھ پر۔ " وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ "جندہ تو تمہیں رہنا ہے میاں جی، میں سمجھا تھا کہ کس بل نکل گئے ہوں گے موت کو سامنے دیکھ کر ہوش آ گیا ہو گا مگر کوئی بات نہیں۔ میرے پاس بھی وقت ہے اور تمہارے پاس بھی۔ یہ کام تمہیں کرنا ہو گا۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔ ایسے نہیں چھوڑوں گا میاں جی۔ ایک دفعہ میں مر گئے تو کا فائدہ مجا تو جب ہے کہ بار بار مرو اس وقت تک مرتے رہو جب تک ہمارا کام کرنے کے لئے تیار نہ ہو جاؤ۔ "

سنتری چونک کر مجھے دیکھ رہے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں کچھ کہہ رہا ہوں لیکن میں ان سے مخاطب نہیں تھا۔ آخری الفاظ کے بعد میں خاموش ہو گیا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں جیل کے پھانسی گھر پہنچ گیا۔ عجیب سی جگہ بنی ہوئی تھی مجھے سیڑھیاں چڑھائی گئیں پھر میری آنکھوں پر کپڑا چڑھایا گیا۔ مجسٹریٹ، جیلر اور ڈاکٹر وغیرہ موجود تھے، عجیب پراسرار ماحول تھا مجھ پر سکوت طاری تھا پھر میری گردن میں پھندا فٹ کیا گیا پھر کچھ اور کیا گیا مجھے اپنے پیروں تلے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی پھر یوں لگا جیسے کوئی نرم چیز میرے پیروں کے نیچے آ گئی ہو کسی نے مجھے نیچے گرنے سے روک لیا ہو۔ پھر ایک دھواں سا میرے اوپر چھا گیا اور دو ہاتھوں نے میری گردن سے پھندا نکال لیا۔ عجیب سا شور سنائی دیا بھاگ دوڑ ہونے لگی کسی نادیدہ ہاتھ نے میری کلائی پکڑی اور دوڑنے لگا میں بے اختیار قدم اٹھا رہا تھا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ میں گھسٹ رہا تھا پھر جیل کا دروازہ نظر آیا اور پھر دروازے پر کھڑے سنتری ادھر اُدھر لڑھک گئے ان کے ہاتھوں سے بندوقیں گر گئی تھیں۔ کسی نے ذیلی دروازہ کھولا اور مجھے باہر نکال لایا جیل کے دروازے سے کچھ فاصلے پر املی کا ایک درخت نظر آ رہا تھا جو بہت گھنا تھا اور اس کی موٹی موٹی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر ایک موٹی سی شاخ پر بٹھا دیا ہو۔ میرا سانس پھول رہا تھا حالت خراب ہو رہی تھی۔ پھر اچانک میرے سر سے کوئی چیز لگی دو پاؤں تھے جو لمبے ہوتے جا رہے تھے پھر وہ اسی شاخ سے آ ٹکے جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بعد ایک جسم بھی اس شاخ پر آ گیا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اسے پہچانتا تھا وہی منحوس چہرہ میرے سامنے تھا اور وہی شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

"کیسی رہی میاں جی، بچ گئے پھانسی سے تم .... " میری قوت گویائی ختم ہو گئی تھی پورا جسم لرز رہا تھا۔ آہ یہ سب کچھ خواب نہیں تھا۔ زندگی ختم ہو گئی تھی میری، سب کچھ ہو گیا تھا پورے حواس کے عالم میں ہوا تھا مگر میں بچ گیا تھا۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں۔ اس نے کہا۔ "اور اب آگے تمہیں بچنا ہے میاں جی، پھانسی دینے والے مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ ساری جیل میں تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جاؤ گے ان کے پاس؟ " میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر دیکھو۔ تمہارے گھر والے تمہاری لاش لینے آئے ہیں۔ سارے کریا کرم کا بندوبست کر لیا ہے انہوں نے۔ سنو میاں جی اور کچھ نہیں کہیں گے تم سے۔ ہمیں اتنا کہنا ہے کہ ایک دن تمہیں ہمارا یہ کام کرنا پڑے گا۔ خود آؤ گے چل کر ہمارے پاس۔ ہم سے رو رو کر کہو گے مہاراج ہم تمہیں

پھاگن کے دوارے لے چلنے کے لئے تیار ہیں۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ جب تک تم ہمارا یہ کام نا کروگے ایسے ہی در بدر پھرتے رہو گے۔ جہاں جاؤ گے مصیبت تمہارے ساتھ ہو گی جہاں ٹکو گے وہاں والے بھی مصیبت میں پھنس جائیں گے کوئی تمہیں ساتھ رکھنے کو تیار نہ ہو گا سب تم سے پناہ مانگیں گے اور پناہ تمہیں کہاں ملے گی، ہمارے پاس آکر، ہمارا کام کر کے کا سمجھے، ہمارا کام ای تھا کہ ہم تمہاری جان بچا کر یہاں تک لے آئے روشنی میں نیچے اترے تو دھر لئے جاؤ گے رات کو اترنا اور گھر چلے جانا اور پھر سوچنا کا سمجھے۔ ”

وہ اچانک میرے سامنے سے غائب ہو گیا میں پتھرایا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں سن تھے۔ اپنا بدن اپنا لگتا ہی نہیں تھا اور اب اپنا وجود اپنا تھا بھی کہاں، مجھے تو سزائے موت ہو چکی تھی جیل کی دنیا میں بھی یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی واقعہ ہو گا۔ اس سے پہلے بھلا ایسا کہاں ہوا ہو گا مگر کچھ احساس تو دوسرے لوگوں کو بھی ہو گا اب تو سوچا جائے گا کہ میں بے گناہ تھا کسی پراسرار جال میں پھنسا ہوا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کیسے ہوتا۔ ضمیر الدین صاحب نے یہ حوالے دیئے تھے مگر وکیل سرکار نے ان باتوں کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ ضمیر الدین صاحب کے بارے میں نازیبا جملے ادا کئے تھے اس نے کہا تھا۔ ”دوسرا قتل صرف اس لئے کیا گیا ہے جناب والا کہ ملزم خود کو دماغی مریض ظاہر کرنا چاہتا ہے اس نے صرف اس بات کا یقین دلانے کے لئے ایک انسان کی جان لے لی۔ وہ بے رحم اور سفاک ہے۔ اسے صرف اور صرف موت کی سزا دی جائے۔ ٹھیک ہے وکیل صاحب اس کا یقین آپ کو ضرور دلاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ دل و دماغ عجیب کیفیت کا شکار تھے بڑی مضحکہ خیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی خوف تھا کہ نیچے اترا تو نہ جانے کیا ہو، زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ ٹھنڈی سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا جہاں بیچارے ماموں ریاض میرے چھوٹے بھائی اور پڑوس کی مسجد کے پیش امام اور مزید دو افراد کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے دل چاہا کہ درخت سے نیچے کودوں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں انہیں بتاؤں کہ میں زندہ ہوں۔ مگر ہمت نہ ہو سکی تھی۔ پھر کچھ سپاہی باہر آئے ماموں صاحب کو بلا کر اندر لے گئے کوئی آدھے گھنٹے بعد ماموں صاحب واپس آئے عجیب شکل ہو رہی تھی۔ سب واپس چلے گئے مجھے تو یہ پورا دن یہاں گزارنا تھا۔ حیران پریشان درخت پر بیٹھا رہا۔ دن کو بارہ بجے کے قریب ایک بار پھر میں نے ماموں ریاض کو دیکھا اس وقت والد صاحب، والدہ صاحبہ، بھائی اور بہن بھی ساتھ تھے۔ والدہ کو بہت دن کے بعد دیکھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر جذبات سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا، صبر کیا۔ وہ لوگ اندر گئے کافی دیر کے بعد باہر آئے اور پھر چلے گئے میرا تمام دن بھوکے پیاسے گزرا تھا پھر جب خوب تاریکی پھیل گئی تو میں نیچے اترا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ گھر کا رخ بھول کر بھی نہیں کر سکتا تھا جانتا تھا کہ قانون آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا اور پھر سادھو کے الفاظ بھی یاد تھے گھر والے تو صبر کر ہی لیں گے مگر میں انہیں اپنی نحوستوں کا شکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آہ اب کیا کروں، کہاں جاؤں، کہاں ٹھکانہ ہے میرا............؟

دل و دماغ خوف کے زیر اثر تھے قوت فیصلہ ساتھ چھوڑ چکی تھی شہر اتنا اجنبی نہیں تھا لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات میں کوئی شناسا نہ ہو۔ انسانی شکل میں نظر آنے والا ہر وجود دشمن ہو۔ آہ موت میری تاک میں اور زندگی ایک کمزور و بے بس چڑیا کی مانند جو پرواز کے ناقابل ہو اور جینے کی آرزو میں پھڑپھڑا رہی ہو۔ کونسی جگہ ہے جو میری پناہ گاہ بن جائے۔ میری نگاہ ہر سائے میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی مگر ہر سایہ خوف کا سایہ تھا۔ قدم کس طرف لے جا رہے ہیں اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا پھر شاید غیب سے رہنمائی ہوئی۔ ریل کی سیٹی کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اور میرے قدم رک گئے تھے۔ ریل، ہاں ایک راستہ یہ بھی ہے کچھ فاصلے پر ریلوے اسٹیشن ہے کیوں نہ یہاں سے نکل جایا

جائے کیوں نہ یہ شہر چھوڑ دیا جائے، ہو سکتا ہے یہاں سے دور جا کر زندگی کی آس بندھے۔ قدم پھر آگے بڑھے رفتار تیز ہو گئی دماغ پر نیند جیسی کیفیت طاری تھی۔ اسی عالم میں اسٹیشن پہنچا بہت سی چیزوں کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ بس ریل کے آگے بڑھنے کے جھٹکے سے جیسے آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد کے مناظر دیکھے۔ کھڑکی سے باہر روشنیاں رینگ رہی تھیں اندر ملگجے بلب ان مسافروں کو نمایاں کر رہے تھے جو کہیں دور سے آ رہے تھے اور دور جا رہے تھے۔ سب کے سب میری طرح نیند کے سحر میں ڈوبے ہوئے نہ جانے میں کیسے ان کے درمیان آیا تھا اور انہوں نے مجھے کیسی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ روشنیوں کے دوڑنے کی رفتار تیز ہو گئی یوں لگتا تھا جیسے انہیں اندھیرے کا خوف ہو اور وہ اس سے جان بچانے کے لئے بھاگ رہی ہوں۔ کہیں پھر اندھیرا تمام روشنیوں کو کھا گیا اور کھڑکی سے باہر گھور تاریکی کے سوا کچھ نہ رہا۔ میں نے اس اندھیرے سے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں لیکن جونہی پلکیں جڑیں میرے اختیار سے باہر ہو گئیں۔ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھلیں۔ ذہن نے سوچوں کی گرفت سے آزادی کی جدوجہد کی اور اس کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔ سارا بدن خوشگوار احساس کے ساتھ سو گیا۔ اور نیند کی یہ عنایت اس وقت تک قائم رہی جب تک اجالے کے شہنشاہ نے تاریکیوں کو ملیامیٹ نہ کر دیا۔ باہر روشنی دوڑ رہی تھی۔ اور ٹرین پٹریاں بدل رہی تھی۔ آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ غالباً ٹرین کسی اسٹیشن سے گزری تھی۔ لوگ جاگ گئے اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آہ رات بھر کا سفر طے ہو چکا تھا۔ اور میں نہ جانے کتنی دور نکل آیا تھا، بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیا میری مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کیا مجھے ایک پرسکون زندگی دوبارہ مل سکتی ہے۔ دل نے خود ہی جواب دیدیا ناممکن ہے میں اپنے گناہوں کا پھل پا رہا ہوں۔ میں فطرت سے انحراف کا مجرم ہوں۔ وہ منحوس سادھو میرا پیچھا کہاں چھوڑے گا۔ اس نے مجھے سکون کی دنیا سے بہت دور لا پھینکا ہے میں ایک ایسا مجرم ہوں جو پھانسی کے تختے سے اتر بھاگا ہے نہ جانے قانون کے رکھوالوں نے میرے فرار کا کیا جواز پیدا کیا ہو گا لیکن یہ ایک سچ ہے کہ قانون چپے چپے پر مجھے تلاش کر رہا ہو گا۔ اپنے گھر واپس نہ جا کر میں نے بہترین فیصلہ کیا تھا وہ لوگ میری وجہ سے بدترین مصیبتوں کا شکار ہو سکتے تھے اب ایک یہی غم رہے گا انہیں کہ میں ان کے درمیان نہیں ہوں۔ دفعتہً مجھے ایک اور خیال آیا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میں ریل میں سفر کر رہا ہوں بغیر ٹکٹ ہوں۔ رات تو گزر گئی صبح کو ٹکٹ چیکر ضرور آئے گا میرے پاس ٹکٹ بنوانے کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں نتیجے میں مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہاں یہ بھی انکشاف ہو سکتا ہے کہ میں دراصل ایک مفرور مجرم ہوں۔ آہ پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا مگر اب اس خیال سے دل بیٹھنے لگا تھا اس کا کیا حل ہو سکتا ہے صرف ایک وہ یہ کہ میں خود ٹرین چھوڑ دوں مگر کیسے چلتی ٹرین سے تو نہیں اترا جا سکتا۔ آہ جلدی کوئی اسٹیشن آ جائے۔ ابھی صحیح طور پر صبح نہیں ہوئی ہے اسٹیشن سے باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا جگہ کوئی بھی ہو مجھے کیا لینا ہے سر چھپانے کا ٹھکانہ چاہئے امید بھری نگاہوں سے باہر دیکھنے لگا۔ شاید قبولیت کا وقت تھا دعا فوراً قبول ہو گئی۔ باہر عمارتوں کے آثار نظر آ رہے تھے کچھ دیر کے بعد ٹرین کی رفتار سست ہوتی محسوس ہوئی۔ اسٹیشن آ گیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بے صبری سے ٹرین کے رکنے کا انتظار کرنے لگا پھر عامل پور کا بورڈ نظر آیا۔ مجھے اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا میرے لئے کیا برا تھا۔ جونہی ٹرین رکی میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔ ابھی پلیٹ فارم پر قدم رکھے ہی تھے کہ عقب سے کوئی

میرے پاس آگیا۔ مجھے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا اور میرا رنگ پیلا ہو گیا تبھی ایک سرگوشی ابھری۔

"سرفراز۔" نہ جانے کس طرح گردن گھومی تھی لیکن حالت بیحد خراب ہو گئی تھی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ ابھرا، پروقار نسوانی چہرہ، خاتون کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہو گی۔ آنکھیں گہری سیاہ اور بڑی بڑی تھیں۔ رنگ سفید ایک عجیب سا چہرہ تھا جسے میں دیکھتا رہ گیا میری قوت گویائی تو ختم ہی ہو گئی تھی۔ خاتون نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی اور بولیں۔

"صرف میں تھی سرفراز جسے پورا یقین تھا کہ ایک دن تم ضرور واپس آجاؤ گے میرے بچے غلطیاں معاف بھی کر دی جاتی ہیں۔ ابا جان آرہے تھے ہم لوگ انہیں اسٹیشن لینے آئے تھے دیکھو وہ سارے لوگ ابا جان کو اتار رہے ہیں۔" خاتون نے انگلی سے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر بولیں۔ "ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں ہے کہ ہمیں دہری خوشیاں مل رہی ہیں۔" خاتون کی آواز رندھ گئی مجھ کم بخت نے ایک بار پھر انہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہا لیکن آواز نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔ خاتون پھر بولیں۔ "آؤ سرفراز آؤ، براہ کرم آؤ، ابا جان بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ بہت ان کے بعد آئے ہیں وہ سب تمہیں دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔" کچھ ایسا انداز تھا ان کا کہ میرے قدم خود بخود ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے اس طرح میری کلائی پکڑی ہوئی تھی جیسے میں بھاگ جاؤں گا اور پھر وہ مجھے لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گئیں جہاں سب ایک بزرگ کو گھیرے ہوئے تھے اور معمر بزرگ ایک ایک کو گلے سے لپٹا رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔

"ریحانہ، ریحانہ کہاں ہے کیا وہ نہیں آئی؟"

جواب میں معمر خاتون آگے بڑھیں اور اس وقت وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے پھر ایک نوجوان لڑکی کی چیختی ہوئی آواز ابھری۔

"ارے سرفراز بھائی، سرفراز بھائی۔" اور اس کے بعد وہ سارے کے سارے مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ میں بھلا ان سب سے مقابلہ کیسے کر سکتا تھا میرا چہرہ ان کی غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا اب بھلا کون سننے والا تھا ایک عجیب ہنگامہ بپا ہو گیا۔ معمر بزرگ بھی آگے بڑھے انہوں نے میرے سامنے کھڑے ہو کر میرا چہرہ غور سے دیکھا پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

"تو سرفراز میاں تم آخر آہی گئے، بہت ہی اچھا فیصلہ کیا بیٹے، بہت ہی اچھا فیصلہ کیا۔" عقل کھوپڑی سے دو فٹ اونچی اٹھ چکی تھی۔ کسی کی کوئی بات جو سمجھ میں آرہی ہو سارے کے سارے ایک ہی سُر میں بول رہے تھے۔ معمر خاتون نے ان سب کو روکا اور بولیں۔

"یہ اسٹیشن پر ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے آؤ گھر چلیں، چلو گھر چلیں۔"

"مگر یہ سرفراز بھائی یہ .... یہ .... یہ ...."

"اسی ٹرین سے اترے ہیں چلو۔" معمر خاتون نے اس دوسری لڑکی کے سوال کے جواب میں کہا۔ جن صاحب کو نانا جان کہا جا رہا تھا انہیں تو سب بھول گئے۔ میرے ہی گرد جمگھٹا لگ گیا تھا عجیب عجیب باتیں کی جا رہی تھیں میرے بارے میں۔ سارے کے سارے مجھے سرفراز سمجھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں انہیں اس قدر شدید غلط فہمی ہوئی تھی۔ لیکن میرے حق میں فی الوقت یہ بہتر تھا کیونکہ اس غول میں میں بآسانی اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکل آیا تھا ٹکٹ چیکر بھی لاپروا سا آدمی تھا اس نے گنتی بھی

نہیں کی۔ بہرحال ایک طرح سے مجھے عارضی طور پر یہ سہارا مل گیا تھا۔ باہر آکر میں نے معمر خاتون کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہا لیکن معمر خاتون نے اب میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور ان بزرگ سے باتیں کرنے لگی تھیں جو کہیں سے آئے تھے۔ بعد میں، میں نے ان لڑکیوں اور ان کے ساتھ موجود لڑکوں کو سمجھانا چاہا۔

"سنئے بھائی، سنئے بھائی صاحب۔" میں نے ایک نوجوان کو مخاطب کیا اور وہ مسکرا کر مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"آپ سے تو ایسی کشتیاں ہوں گی کہ پٹخنیوں پر پٹخنیاں دی جائیں گی۔ سرفراز بھائی آپ نے ہم سب کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم لوگوں پر کیا گزر چکی ہے۔"

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

"ارے تو کیا یہیں کہیں گے گھر نہیں چلنا ہے.........؟"

"سنئے آپ کو......... آپ کو......... غلط فہمی ہو رہی ہے میں سرفراز نہیں ہوں۔ آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے بعد میں آپ مجھے مورد الزام ٹھہرائیں گے۔"

"سنا نادیہ، یہ سرفراز نہیں ہیں۔"

"ان کی تو ایسی تیسی انہیں تو دس بار سرفراز بننا پڑے گا چلئے جلدی سے، شرافت سے، ورنہ میں لڑکی بہت بری ہوں"۔ اس خوب صورت سی لڑکی نے بے تکلفی سے کہا اور آستین چڑھانے لگی، سب ہنسنے لگے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا واقعی سربازار اپنے آپ کی اس شدت سے تردید کرنا نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ بڑی قیمتی گاڑیاں آئی ہوئی تھیں۔ غول بیابانی ان گاڑیوں میں بھرنے لگا اسی لڑکی نے جس کا نام نادیہ لیا گیا تھا ایک نوجوان سے کہا۔

"آپ نے ان کے الفاظ سن لئے شاکر بھائی ذرا ہوشیار رہیں خطرہ ہے۔"

"فکر ہی نہ کریں چار سو میٹر تک تو میں انہیں آگے نکلنے نہیں دوں گا اس کے بعد بھی اگر یہ دوڑتے رہے تو پھر دیکھا جائے گا؟" جس شخص کو شاکر کے نام سے پکارا گیا تھا اس نے کہا اور ایک بار پھر سب ہنسنے لگے۔

کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا ایسی شدید غلط فہمی ہوئی تھی مجھے کہ میں خود بھی حیران تھا لیکن اس غلط فہمی سے مجھے کوئی خوشی نہیں تھی کوئی دوسرا موقع ہوتا تو اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ اس غلط فہمی سے لطف اندوز نہ ہوتا لیکن مجھ پر تو زندگی ہی کٹھن ہو گئی تھی میں تو مصیبتوں کا مارا تھا بھلا اس ماحول سے ان الفاظ سے کیا لطف اندوز ہوتا۔ بس دل تھا کہ مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا اور ذہن طرح طرح کے خیالات کا شکار ہو رہا تھا گاڑیاں جس عمارت میں داخل ہوئیں اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ نہایت خوشحال لوگ ہیں اور بڑی اچھی حیثیت کے مالک ہیں۔ آہ کاش ان لوگوں سے واقعی میرا کوئی تعلق ہوتا، چاہتا تو جھوٹ بول کر ان کے درمیان اپنے لئے جگہ بنا سکتا تھا۔ لیکن دل یہ بھی گوارہ نہیں کر رہا تھا اور میں جھوٹ بول کر ایک اور گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا ویسے ہی زندگی بری طرح گناہوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی اور اس کا پورا پورا صلہ بھگت رہا تھا۔

یہاں پہنچنے کے بعد تمام لوگ نیچے اتر گئے۔ معمر خاتون معمر بزرگ کے ساتھ نیچے اتری تھیں لیکن ان کی توجہ ان بزرگ سے زیادہ مجھ پر تھی۔ رکیں اور میرے قریب آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ لڑکے لڑکیوں کا غول مجھے ان کے پاس لے گیا۔ معمر خاتون نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیا حلیہ بنا لیا ہے تم نے اپنا سرفراز، زندگی کھونے پر تلے ہوئے تھے میں جانتی تھی مجھے یقین تھا کہ تم

واپس آجاؤ گے لیکن بیٹے بڑائی اس میں ہے اور پھر شاید تمہیں علم ہو کہ وہ نہ رہے جن سے تمہیں اختلاف پیدا ہو گیا تھا کیا تمہیں علم ہے کہ رحمان صاحب کا انتقال ہو گیا۔" میری گردن بلاوجہ ہی نفی میں ہل گئی تھی۔

"ہاں ہم بے سہارا ہو گئے ہیں سرفراز، ہم بے سہارا ہو گئے ہیں ہمارے سر سے سائبان سرک گیا ہے اور اب ...." معمر خاتون کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ معمر بزرگ نے بھی میرے قریب پہنچ کر کہا۔

"چلو سرفراز میاں، تم بے شک بڑے ہو اور اب تو تمہیں اس خاندان کی سرپرستی کرنی ہے۔ بڑی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں تم پر۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے ہو۔" ہم سب لوگ اندر داخل ہو گئے خاتون نے ایک لڑکی کو حکم دیا کہ میرا لباس وغیرہ تیار کرے اور مجھے غسل خانے میں پہنچا دے میں اس افتاد پر سخت حیران پریشان تھا لیکن کیا کرتا عارضی طور پر حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا البتہ میں ان معصوم لوگوں کو مناسب موقع پر صورتحال سے آگاہ کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا جو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

لڑکی مجھے ساتھ لئے ایک وسیع کمرے میں پہنچی جو ایسی ایسی آرائشی چیزوں سے آراستہ تھا جو میں نے ہوش کے عالم میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ غسل خانے کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

" جایئے اور اب اپنا حلیہ درست کیجئے۔ آپ کا لباس میں ابھی تیار کئے دیتی ہوں۔ یہاں باہر اسٹینڈ پر مل جائے گا جاتے ہوئے میں دروازہ باہر سے بند کر دوں گی تاکہ آپ فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے دیکھا بڑی بڑی روشن آنکھوں والی خوب صورت لڑکی تھی جس کے چہرے پر شوخی اور معصومیت سجی ہوئی تھی پھر میں باتھ روم میں داخل ہو گیا سفید ٹائلوں سے مرصع باتھ روم تھا جس میں نہانے کے نئے نئے سامان موجود تھے مجھے ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا حق نہیں تھا لیکن یہاں بھی تقدیر کے اس فیصلے پر شاکر ہو گیا جو عارضی طور پر میرے لئے کیا گیا تھا ول یہ سوچ کر کم از کم مطمئن تھا کہ میں ان لوگوں کو دھوکا دینے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ میں نے جس حد تک بھی ممکن ہو سکا اس بات کی تردید کی تھی کہ میں سرفراز ہوں۔

غسل کیا، شیو کا سامان بھی موجود تھا۔ دل چاہا کہ شیو کر لوں چنانچہ یہ بھی کر لیا میں نے اور جب باہر نکلا تو میرا لباس رکھا ہوا تھا یہ حیران کن بات تھی کہ یہ لباس بھی میرے جسم پر بالکل درست تھا سلک کا کرتا اور سلک کا ہی پاجامہ یہاں تک کہ جو سلیم شاہی جوتے میرے لئے رکھے گئے تھے وہ بھی میرے پیروں پر فٹ آئے تھے اس حیران کن اتفاق پر ہنسی بھی آ رہی تھی ہو سکتا ہے سرفراز بالکل میرے جیسا ہو ورنہ اس قدر شدید غلط فہمی اور وہ بھی اتنے بہت سے افراد کو، ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دل کے گوشوں میں ایک اور خوف کا تصور بھی ابھر رہا تھا۔ کہیں یہ بھی اس کمبخت منحوس شیطان کی چال نہ ہو جس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ میں کہیں بھی سکھ کی سانس نہیں لے سکوں گا بلکہ جہاں بھی جاؤں گا اس کی نحوست میرا تعاقب کرتی رہے گی۔ دل کو یہ سوچ کر سمجھایا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی میں اپنے طور پر مدافعت نہیں کر سکتا اور نا ہی میرے اندر اتنی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اب خوف کے عالم میں مرنے سے کیا فائدہ .... ہاں اپنے طور پر میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے میرا گناہ شدید سے شدید تر ہو جائے جو کچھ کیا تھا اس کے صلے میں جو کچھ بھگت رہا تھا بس اس سے زیادہ کی میرے اندر ہمت نہیں تھی۔ اب تو میں کمرۂ امتحان میں تھا اور اپنی تقدیر پر شاکر تھا۔

ر کے بعد دروازہ کھلا اور باہر اچھے خاصے لوگ موجود تھے جو مجھے لیکر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔ ٹیبل پر ناشتے کا سامان موجود تھا اور کمرے میں تقریباً تمام ہی اہل خانہ موجود تھے۔ معمر خاتون مسلسل میری خاطر داری کر رہی تھی اور معمر بزرگ بھی، لڑکے لڑکیاں میرے اوپر ایک آدھ فقرہ چست کر دیتے تھے اور کمرے کا ماحول خوشگوار ہو جاتا تھا خاتون نے کئی بار لڑکیوں اور لڑکوں کو ڈانٹ بھی پلائی کہ بہت زیادہ باتیں نہ کریں اور میرے مزاج کا خیال رکھیں میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ واہ میں اور میرا مزاج ابھی جب انہیں اس حقیقت کا یقین آجائے گا کہ میں وہ نہیں ہوں جسے سمجھ کر وہ مجھے یہاں لائی ہیں تو مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ دنیا کا یہی انداز ہے اور دنیا اسی انداز میں جیتی ہے ناشتے کے بعد معمر خاتون نے کہا۔

"ابا میاں مجھے اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر سرفراز سے باتیں کر لوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، اور میں بھی اب سونا چاہتا ہوں سفر سے تھک گیا ہوں تم اطمینان سے باتیں کر لو۔"

" آؤ سرفراز میرے کمرے میں چلو۔" معمر خاتون نے کہا اور میں خاموشی اور سعادتمندی سے ان کے ساتھ چل پڑا وہ مجھے ایک خوبصورت کمرے میں لے آئیں۔ اندر پہنچ کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور پھر ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

"بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔" میں خاموشی سے بیٹھ گیا تھا وہ خود بھی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں پھر انہوں نے کہا۔

"سرفراز بیٹے زندگی میں نجانے کیا کیا اونچ نیچ ہوتی رہتی ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ غلطی ہماری نہیں ہے لیکن۔ لیکن بیٹے، تمہیں اس طرح سب کچھ چھوڑ کر نہیں چلے جانا چاہئے تھا ٹھیک ہے مرحوم رحمان صاحب کا رویہ تمہارے ساتھ سخت ہو گیا تھا لیکن بزرگ غلطیاں بھی تو کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا ان غلطیوں کی اتنی بڑی سزا دی جاتی ہے انہیں۔ یقین کرو رحمان صاحب کے دل پر تمہاری جدائی کا شدید غم تھا وہ فریحہ کو اس عالم میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ فریحہ کو وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ فریحہ کی جو کیفیت تمہارے پیچھے ہوئی میں اگر بتاؤنگی تو یہی سوچو گے کہ ماں ہوں اپنی بیٹی کی وکالت کر رہی ہوں۔ مگر بیٹے تم نے زیادتی کی ہمارے ساتھ، کچھ انتظار تو کر لیتے کوئی صحیح فیصلہ بھی ہو سکتا تھا۔"

"میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں خاتون۔" میں نے کہا اور معمر خاتون چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"کیوں کیا تم یہ بھول گئے کہ تم مجھے چچی جان کہتے ہو۔ ؟"

"جی کچھ ایسے ہی حالات ہیں کہ میں اپنی مجبوریاں آپ کو بتا نہیں سکتا لیکن اس بات سے آپ کو آگاہ کر دینا بیحد ضروری سمجھتا ہوں کہ حقیقتاً میں سرفراز نہیں ہوں میں زمانے کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں اور میں آپ کو دھوکا دیکر یہاں اپنے لئے کوئی مقام بنانے کا خواہشمند بھی نہیں ہوں۔" معمر خاتون بے اعتباری کے انداز میں سنجیدگی سے مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارا دل ابھی صاف نہیں ہوا۔ رحمان صاحب کی موت نے بھی تمہارے دل میں ہمارے لئے نرمی پیدا نہیں کی۔ خیر جو کچھ تم کہہ رہے ہو کہتے رہو۔ تمہاری سنگدلی کا تھوڑا تھوڑا اندازہ تو مجھے تھا .... لیکن .... لیکن اچھا ٹھیک ہے فریحہ سے مل تو لو ایک بار اسے یہ بھی بتا دو کہ تم سرفراز نہیں ہو اور اس کے بعد ہم اپنی تقدیر پر شاکر ہو جائیں گے جو کچھ بھی فیصلہ تم کرو گے ہمیں منظور ہو گا۔

س لھر

میری بچی تمہارے جانے کے بعد کبھی مسکرائی نہیں ہے کاش تمہیں ان حقیقتوں کا بھی احساس ہوتا۔ "

"ٹھیک ہے خاتون بالکل ٹھیک ہے آپ میری بات نہیں مان رہیں لیکن میں آپ سے صرف چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں کہ بعد میں آپ کو اگر حقیقتوں پر یقین آجائے تو مجھے مجرم نہ سمجھئے گا اس تمام کہانی میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ "

خاتون کے چہرے پر ناگواری کے آثار ابھرے انہوں نے گردن ہلائی اور آہستہ سے بولیں۔

"تمہاری انتہاپسندی کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں سرفراز۔ کیا تم اتنا تعاون کر سکتے ہو ہم سے کہ صرف چند روز یہاں گزار لو فریحہ سے ملاقات کر لو اگر تم ایسا کر لو گے تو یہ ہم سب پر احسان ہی ہو گا اسے سمجھا دو اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ " وہ اٹھیں اور انہوں نے دروازہ کھول دیا باہر سارا غول بیابانی جمع تھا۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"جی امی جان کیا ہوا یہ شرافت سے مان گئے یا پھر ہماری باری آگئی۔ "

"تم لوگ کوئی بد تمیزی نہ کرو, سمجھیں, چلو اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔ "

"ایسے نہیں جائیں گے اگر یہ شرافت سے مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم انہیں اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ " ایک لڑکی نے کہا اور وہ سب مجھ پر جھپٹ پڑیں۔

"نہیں نہیں سنئے. سنئے میں چل رہا ہوں میں چل رہا ہوں۔ " میں نے بوکھلا کر کہا اور ہنستے قہقہے لگاتے ہوئے یہ لوگ مجھے ایک طرف لے چلے۔

دل ہی دل میں دکھ بھی ہو رہا تھا کاش میں اس گھرانے کا ایک فرد ہوتا۔ کیا خوبصورت زندگی ہوتی لیکن میری نحوست بالآخر ان لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی .... لڑکیاں مجھے لئے ہوئے ایک دروازے پر پہنچ گئیں انہیں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکا دے دیا اور اس کے فوراً بعد دروازہ باہر سے بند بھی کر دیا گیا تھا عجیب سی صورتحال تھی دل میں ایک میٹھا میٹھا سا احساس بھی جاگ رہا تھا لیکن اس کا اختتام خوف کے دباؤ پر ہوتا تھا۔

گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوئے, دروازے کھڑکیوں اور دیواروں کی مناسبت سے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک جانب ایک مسہری تھی جس پر دو تکیئے رکھے ہوئے تھے مسہری کے بائیں جانب پھولوں کا ایک بہت بڑا خوبصورت گلدستہ نظر آرہا تھا جس میں تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے اطراف میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کے انتہائی سرے پر بنی ہوئی کھڑکی کے سامنے ایک نسوانی پیکر موجود تھا۔ جس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ گہرے نیلے لباس میں ملبوس سیاہ چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی تھی میں سکتے کی سی حالت میں کھڑا ادھر دیکھتا رہا اور پھر بمشکل تمام میری آواز ابھری۔

"سنیئے۔ ! " نسوانی جسم میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی اور پھر اس نے اپنا رخ تبدیل کر لیا اور آنسوؤں سے لبریز ایک حسین چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ بیحد حسین تھی اس کے چہرے پر عجیب سی یاسیت چھائی ہوئی تھی میں سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا میں زندگی کے اس شعبے سے پوری طرح روشناس نہیں تھا لیکن یہ سلگتا ہوا حسن میری آنکھوں کے راستے دل میں اترتا چلا گیا تھا۔ ان حسین اور بڑی

بڑی آنکھوں سے جن کے چہرے کے نقوش ان معمر خاتون سے کافی ملتے ہوئے تھے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی میں چند قدم آگے بڑھا اور میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سنیئے, شاید آپ کا نام فریحہ ہے یہاں سب لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ میں سرفراز ہوں ان لوگوں نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں خاتون کہ میرا نام سرفراز نہیں ہے ہو سکتا ہے میرا چہرہ ان سے اتنا ملتا جلتا ہو کہ سب دھوکہ کھا رہے ہیں لیکن آپ کو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ یہ غلط فہمی آپ کے لئے سب سے زیادہ بھیانک ہو سکتی ہے۔ " وہ آنسو بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"عامل پور کیوں آگئے۔ "

"تقدیر کا پھیر ہے۔ آپ سمجھدار ہیں اچھا برا سوچ سکتی ہیں۔ " اور ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ خاتون فریحہ بے اختیار ہو گئیں دوڑ کر آگے بڑھیں اور میرے سینے سے سر ٹکا دیا۔

"معاف کرو فرازی, مجھے معاف کر دو میں, میں اپنا تجزیہ نہیں کر پائی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم سے دور رہ کر میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ فرازی اب مجھے معاف کر دو۔ " وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ میرے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ فریحہ کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ "مجھے معاف نہیں کرو گے۔ ؟ "

"اس کے کچھ امکانات ہیں کہ آپ میں سے کوئی سمجھداری سے کام لے لے۔ ؟ " میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم سرفراز نہیں ہو۔ "

"ہاں میں سرفراز نہیں ہوں۔ "

"پھر تم کون ہو۔ ؟ "

"ایک تقدیر کا مارا۔ "

تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ؟ "

"کاش رہ سکتا۔ " میں نے کہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی اس کے چہرے سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کر رہی پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ایک درخواست قبول کر لوگے۔ "

"حکم دیجئے ؟ "

"اگر میرے لئے تمہارے دل میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تو ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی مگر تمہارے آنے سے یہ سب کھل اٹھے ہیں۔ امی بھی خوش نظر آرہی ہیں صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کے ساتھ کچھ وقت گزار لو ابو کی موت نے ان سب کو نیم مردہ کر دیا ہے۔ تمہاری وجہ سے کچھ خوشیاں مل جائیں گی۔ بات میری رہ جاتی ہے تو میں اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لوں گی دوسروں پر کچھ ظاہر نہ کرو صرف میری سزا قائم رکھو صرف میری۔ "

میں کچھ ہونٹ دانتوں میں دبا کر اسے دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ "میری دعا ہے فریحہ خاتون کہ اس گھر

کو کائنات کی ساری خوشیاں مل جائیں۔ میں ایک منحوس انسان ہوں۔ صرف اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ میری نحوست اس گھرانے کو لپیٹ میں نہ لے لے۔ ”

”ہاں میں نے یہ الفاظ کہے تھے میں نے تمہیں منحوس کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ تمہاری نحوست نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے میں ان الفاظ پر شرمندہ ہوں بس غصے میں منہ سے نکل گئے تھے۔ ” فریحہ بولی۔

”جی۔ ؟ ” میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اور تم کہتے ہو کہ تم سرفراز نہیں ہو۔ ” اس نے افسردگی سے مسکرا کر کہا۔

”خدا کا یہی حکم ہے تو یہی سہی میں سرخم کرتا ہوں لیکن خاتون فریحہ آپ کو ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں۔ ”

”کیا۔ ؟ ”

”بہتر ہے کہ دنیا کے سامنے بھی یہی ظاہر کریں کہ میرے اور آپ کے درمیاں فاصلے ہیں تاکہ جب سچائی سامنے آئے تو آپکی زندگی تباہ نہ ہو جائے اس کے بعد بات بنائے نہیں بنے گی کوئی ذریعہ نہیں ہو گا آپ کے پاس۔ ”

”ہاں تمہارے ان الفاظ کی وجہ جانتی ہوں مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو مجھے سزا دینا چاہتے ہو۔ فرازی مجھ سے زیادہ تمہیں اس دنیا میں کون جانتا ہے خیر اپنے لئے مجھے ہر سزا قبول ہے۔ شاید وقت میری مشکل حل کر دے مجھے منظور ہے۔ ”

میں نے بے چارگی سے گردن ہلادی تھی۔ اس نے مجھے اداس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہو سکے تو دوسروں کے سامنے میری توہین نہ کرنا۔ ”

”ہمیں کوئی درمیانی راہ نکالنی ہو گئی فریحہ صاحبہ۔ ” میں نے کہا، وہ خاموش رہی تھی۔ بحالت مجبوری اس انوکھے ڈرامے کے لئے تیار ہو گیا تھا موت کے جبڑوں سے نکلا تھا اور کوئی اور گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتا اب اسی روشنی میں عمل کرنا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آیئے فریحہ باہر چلیں، آپ دوسرے لوگوں کو جو کچھ بتانا چاہیں بتائیں۔ ”

”جی! ” اس نے گردن ہلادی۔ ہم باہر آ گئے۔ شریر لڑکے اور لڑکیوں کا غول جیسے منتظر ہی تھا انہوں نے اس مختصر وقت میں انتظام بھی کر لیا تھا، چنانچہ ہم دونوں کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ سب میری آمد کی خوشیاں منا رہے تھے مگر میرا دل رو رہا تھا، وہ میں نہیں تھا جس کے لئے خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ فریحہ بھی بجھی بجھی تھی۔ خوب ہنگامہ رہا تھا البتہ ریحانہ بیگم ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے تنہائی میں کہا۔

”لگتا ہے سرفراز میاں، تمہارے درمیان اختلاف دور نہیں ہوا ہے۔ ” مجھے موقع مل گیا.......... میں نے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے چچی جان، ہم دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے۔ ”

”کیا؟ ”

”ہم ایک ماہ تک اپنا تجزیہ کریں گے الگ الگ رہ کر، یہ فیصلہ کریں گے کہ مستقبل میں ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کا کس طرح خیال رکھنا ہو گا۔ ”

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ” ریحانہ بیگم بولیں۔

”اگر آپ اسے ہم دونوں کے درمیان رہنے دیں تو زیادہ اچھا نہیں ہو گا چچی جان ....! ” میں نے عاجزی سے کہا۔

”الگ الگ رہنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ ”

”میرا مطلب ہے ہمارے درمیان تعاون اور مفاہمت رہے گی۔ بس قربت نہیں ہوگی۔ ”

”تم دونوں ہی سرپھرے ہو۔ مگر اب تم یہاں سے جاؤ گے نہیں۔ ”

”جی چچی جان۔ ” میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ذاتی طور پر مجھے تم سے بیحد شکایت ہے۔ ”

”کیوں چچی جان؟ ”

”یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ رحمان اس طرح ہمارے درمیان سے چلے گئے تمہارا دل نہ پسیجا اور تم نے عادت کے مطابق ڈرامہ رچایا کہ تم سرفراز نہیں ہو، حالانکہ اس وقت تمہیں ساری رنجشیں بھول کر ہم سے افسوس کرنا چاہئے تھا۔ ہمارا سہارا بننا چاہئے تھا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں، بچے مرجھا کر رہ گئے ہیں اگر تمہیں اب بھی ضد تھی تو عامل پر کیوں اترے تھے۔ ”

”کاش میں آپ کو ساری حقیقت بتا سکتا چچی جان۔ ”

”میں نے بڑی دعائیں کی ہیں تمہاری واپسی کے لئے۔ فریحہ اپنے رویے پر کتنا افسوس کرتی رہی ہے تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال کوئی کسی کے دل میں نہیں داخل ہو سکتا۔ ”

سونے کا انتظام میں نے دوسرے کمرے میں کیا تھا۔ فریحہ کو بھی بتانا ضروری سمجھا تھا..........

”محسوس نہ کرنا فریحہ یہ ضروری ہے۔ ”

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے دوسروں کے سامنے رسوا نہیں کرو گے۔ ”

”ہاں فریحہ، میں آپ کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ ” میں نے آہستہ سے کہا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔ ” اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرا اور پھر تیسرا دن گزر گیا، حالات کسی قدر قابو میں آگئے تھے۔ بڑی کوششوں سے مجھے یہاں کے حالات معلوم ہوئے تھے۔ رحمان صاحب کا گھرانہ تھا جس کا وسیع کاروبار وغیرہ تھا۔ دو بیٹے شاکر اور عامر تھے۔ چار بیٹیاں تھیں جن میں فریحہ سب سے بڑی تھی۔ اس کی شادی سرفراز سے ہوئی تھی جو دنیا میں تنہا تھا چنانچہ اسے گھر داماد بنا لیا گیا۔ خود سر اور سرکش مزاج نوجوان تھا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ فطرتاً انتہا پسند تھا، فریحہ بھی خود پسندی کا شکار تھی چنانچہ دونوں میں اختلاف تھا۔ پھر ایک دن رحمان صاحب نے اسے طلب کر کے فریحہ کی شکایت پر برا بھلا کہا، فریحہ بھی باپ کے ساتھ تھی۔ سرفراز خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ بعد میں فریحہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ رحمان صاحب بھی پشیمان تھے کہ بیٹی کا گھر بگڑ گیا۔ پھر اچانک رحمان صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ یہ کہانی تھی سرفراز کی۔

میں نے اس کی تصویریں دیکھیں اور ششدر رہ گیا۔ ایسا انوکھا ہم شکل شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ وہ لوگ کافی حد تک اس سلسلے میں بے قصور تھے۔ اصولی طور پر مجھے یہاں سے خاموشی سے نکل جانا چاہئے

تھا مگر یہاں میری بزدلی مجھے روک رہی تھی اول تو میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا لباس بھی ان لوگوں کا دیا ہوا تھا لباس تک سلامت نہیں تھا اس عالم میں کیا فیصلہ کرتا پھر باہر کا ہولناک ماحول! جس دن سے اس گھر میں داخل ہوا تھا باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں، کئی بار نیت میں خرابی آئی تھی مگر ضمیر زندہ تھا۔ میں اپنے لئے اس خاندان کو فنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس الجھن میں تھا کہ اس ڈرامے کو کتنا طویل کیا جاسکتا ہے۔ فریحہ نے مجھے طرح طرح سے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ پھر ایک دن ڈراپ سین ہوگیا۔ شام کے پانچ بجے تھے باہر لان پر چائے کا بندوبست ہو رہا تھا کہ ایک کار اور اس کے پیچھے ایک پولیس جیپ اندر داخل ہوگئی۔ سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے اس وقت سب ہی باہر موجود تھے۔ جیپ سے جس شخص کو ہتھکڑیوں سمیت اتارا گیا اسے دیکھ کر میرا دل اچھل پڑا تھا۔ نہایت خراب حلیے میں وہ سرفراز تھا۔ سب دم بخود رہ گئے تھے میں بھی اپنی جگہ ساکت تھا۔ کار سے ایک عمر رسیدہ صاحب نیچے اترے اور نانا جان کے قریب پہنچ گئے۔

"اخاہ .... حامد حسین صاحب، آپ بھی یہاں موجود ہیں۔"

"ہاں بچی کا اصرار تھا کچھ دن کے لئے آیا ہوں مگر .... یہ سب، یہ سب۔" نانا جان بولے۔

"بڑا پریشان کن مرحلہ ہے۔ ذرا انہیں دیکھئے یہ کون ہیں۔" اتنی دیر میں تمام لوگ اس سرفراز کے گرد جمع ہوگئے تھے میرے قدم اپنی جگہ جمے ہوئے تھے دل اندر سے چیخ رہا تھا بھاگ جا قیامت آگئی ہے۔ بھاگ .... فوراً بھاگ .... مگر میں نہ بھاگ سکا۔

"چچی جان، میں سرفراز ہوں ...." سرفراز مظلوم لہجے میں بولا۔ ساتھ کھڑے پولیس افسر نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کر دیا۔

"تم سے بولنے کے لئے منع کیا گیا تھا۔"

"آپ بھی یہاں آجایئے شاہ صاحب۔" نووارد نے کار کی طرف رخ کر کے کہا اور اس میں سے ایک اور صاحب نیچے اتر آئے۔ سادہ لباس میں تھے مگر حلیے سے پولیس افسر معلوم ہو رہے تھے۔ نووارد نے کہا۔ "یہ محکمۂ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں، میرے پرانے ساتھی ہیں۔ محکمۂ پولیس نے اس شخص کو گرفتار کیا ہے اور پولیس کا خیال ہے کہ یہ ایک خطرناک قاتل ہے جسے سزائے موت ہوگئی تھی لیکن یہ تختۂ دار سے فرار ہوگیا۔ پولیس کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ موجود ہے جبکہ اس شخص نے یہ بات تسلیم نہیں کی اور اعلیٰ پولیس افسران سے کہا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے، وہ رحمان عظیم کا داماد ہے جو عامل پور کے رئیس ہیں۔ یہ بات شاہ صاحب کے علم میں آئی اور چونکہ شاہ صاحب یہ بات جانتے ہیں کہ میں عامل پور کا رہنے والا ہوں اور مرحوم رحمان میرے دوست تھے چنانچہ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں بٹیا کی شادی کے وقت ملک میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے اسے پہچانتا بھی نہیں تھا۔ مرحوم رحمان کا حوالہ ایسا نہ تھا کہ میں اس بات کو نظر انداز کر دیتا چنانچہ میں نے شاہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ میری مدد کریں اور اپنے رسک پر صرف میری وجہ سے اس خطرناک مجرم کو لے کر یہاں آئے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کریں۔

سب پر سکتہ طاری تھا اور میں خود بھی بت بنا کھڑا تھا۔ میرے اندر شدید کشمکش جاری تھی۔

"چچی جان، للہ اس وقت پرانی رنجشوں کو ذہن میں نہ لائیں۔ میں موت کے دہانے پر ہوں۔ میری زندگی بچالیں فریحہ .... فریحہ مجھے معاف کر دو، مجھے بچاؤ۔"

اچانک ہی میرے ذہن میں شیشہ سا ٹوٹ گیا۔ ایک عجیب سا جذبہ دل میں ابھرا اور اندر ہی اندر سارے فیصلے ہوگئے۔ میں ایک قدم آگے بڑھ گیا تب پہلی بار مجھے دیکھا گیا۔ اور اب ان لوگوں پر حیرت کے دورے پڑے۔ شاہ صاحب اور رحمان صاحب کے دوست بھی دنگ رہ گئے تھے اور اصل سرفراز بھی، سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"وہ سچ کہتا ہے شاہ صاحب جس کے دھوکے میں اسے پکڑا گیا ہے وہ میں ہوں۔ قدرت نے نہ جانے کیوں ہم دونوں کو ایک ہی شکل دیدی ہے اسے چھوڑ دیں تختۂ دار سے مفرور قاتل میں ہوں۔" شدید سنسنی پھیل گئی تھی سرفراز کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ شاہ صاحب بہرحال پولیس والے تھے فوراً سنبھل گئے۔ انہوں نے ساتھ آئے ہوئے پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ میرے گرد آکھڑے ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "تم پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ اعتراف کر رہے ہو؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی شاہ صاحب بے ہوشی کے عالم میں تو اور ہی باتیں کی جاتی ہیں اس بیچارے کو چھوڑ دیجئے، یہ خوش نصیب ہے، اپنے ساتھ بہت سے ہمدرد رکھتا ہے، میرا کیا ہے، مجھے تو موت نے گھیرا ہی ہوا ہے اور میں اس سے کہیں فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ کیوں اس بیچارے کے ہاتھوں میں آپ نے ہتھکڑیاں ڈال رکھی ہیں، یہ سرفراز ہے، جس مجرم کی آپ کو تلاش ہے وہ میں ہوں .... اور میرا نام مسعود ہے..........."

شاہ صاحب کے ساتھ جو صاحب آئے ہوئے تھے اور جن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سول جج ہیں، حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے، انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے چچی جان سے کہا...........

"یہ کیا قصہ ہے بھابھی صاحبہ..........." لیکن چچی جان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تھی، فریحہ دم بخود تھی، تمام ہی لوگ ابھی تک برے احوال میں تھے، شاہ صاحب نے کہا...........

"عجیب بات ہے، عجیب ہی بات ہے، دونوں ایک ہی شکل کے مالک ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اصل مجرم یہی ہے اور درحقیقت ہمیں مسعود ہی کی تلاش تھی، اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو تھوڑی دیر کے لئے اندر چلیں، ذرا تفصیلی گفتگو ہوجائے .... آیئے مسعود صاحب"۔ شاہ صاحب نے خاصے مہذب لہجے میں کہا اور میں نے شانے ہلا دیئے .... پولیس والے مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے لیکن میں تو خود ہی گھیرے میں آگیا تھا، انہیں خود بھی اس کا احساس تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس وقت بآسانی اپنے اس ہم شکل کو پھنسا سکتا تھا کیونکہ اس وقت میں ایک مہذب گھرانے کی پناہ میں تھا، لیکن بس ضمیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں، میری کچلی ہوئی شخصیت کسی اور گھرانے کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی، میری آرزو یہ تھی کہ سب آباد رہیں۔ میں برباد ہوگیا ہوں تو اپنی بربادی کے اثرات دوسروں پر نہ پڑنے دوں۔ ہم سب اندر آگئے، شاہ صاحب نے ایک جگہ بیٹھنے کے بعد مجھ سے پوچھا........... "مگر مسعود صاحب، اگر آپ درحقیقت وہی ہیں، میرا مطلب ہے تختۂ دار سے فرار ہونے والے قاتل، تو آپ نے اس گھر میں پناہ کیسے لی، آپ کو سرفراز کے بارے میں علم کیسے ہوگیا"........... میں نے بیگم صاحب اور فریحہ کی طرف دیکھا، عامر اور شاکر بھی تھے اور نانا جان بھی، پھر میں نے آہستہ سے کہا...........

"بس اسے لالچ سمجھ لیجئے، میں اس گھر میں پناہ لینے اور اس گھر کی دولت بٹورنے آیا تھا لیکن حق حق ہی ہوتا ہے سرفراز یہ ہیں اور میرا نام مسعود ہی ہے..........." شاہ صاحب نے کچھ پوائنٹ نوٹ کئے۔

سرفراز کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور یہ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں منتقل کر دی گئیں سب ہی میرے سلسلے میں متاثر نظر آرہے تھے۔ شاہ صاحب نے فوراً پوچھ لیا.........

"مگر مسعود صاحب آپ کو تو ایک بہترین پناہ گاہ حاصل ہوئی تھی اگر آپ یہ تسلیم کر لیتے کہ مسعود نہیں ہیں اور یہ شخص بہروپیا، تو میرا خیال ہے فیصلہ کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا... نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو کیوں گرفتاری کے لئے پیش کر دیا........؟"

"چھوڑیئے شاہ صاحب، یہ کہانیاں مختلف ہیں، اب آپ صرف وہ قانونی فرائض سرانجام دیجئے... آپ کو انجام دینے ہیں۔"

"جی ہاں بے شک بہرحال آپ نے ایک اچھا تاثر چھوڑا ہے ہم پر اس لئے بدترین مجرم ہونے... باوجود ہم آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر مجبور ہیں۔ براہ کرم کوئی ایسی کوشش نہ کیجئے جس... ہمارے ہاتھوں آپ کو نقصان پہنچ جائے۔ ٹھیک ہے اب ہمیں اجازت دیجئے۔ اگر آپ چلنا پسند فرمائیں... چلیں ورنہ آپ یہاں رکیے، ہم انہیں لے کر چلتے ہیں، شاہ صاحب نے جج صاحب سے کہا اور جج صاحب بولے۔

"ہاں مجھے تو ابھی کچھ وقت رکنا ہوگا، آپ بھی شاہ صاحب اگر........"

"نہیں جناب، کسی خاطر مدارت کی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں۔" شاہ صاحب مجھے... سے لے کر چلنے کے لئے تیار ہو گئے........ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

"چچی جان آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ میں نے یہ وقت یہاں کیسے گزارا ہے، فریحہ صاحبہ اس... کی گواہی دیں گی کہ میں نے یہاں جو نمک کھایا ہے وہ حرام نہیں کیا اور ہر چیز کا احترام کیا ہے۔ ... صاحب آپ کو نئی زندگی مبارک ہو، چند الفاظ میں آپ سے بھی کہنا چاہتا ہوں بے شک میں آپ کا... شکل ہوں اور چند روز میں نے بھی یہاں گزارے ہیں لیکن فریحہ صاحبہ کو میں نے ان کی غلط فہمی کے با... اپنے دل میں ایک سگی بہن ہی کا درجہ دیا ہے اور خدا کا شکر ہے اس تصور کو نبھایا ہے میری ایک چھوٹی... ہے اور آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں کہ خدا اسے آبرومند رکھے، چچی جان میرا پرانا لباس... ہے۔" چچی جان بری طرح رو پڑی تھی۔ یہاں موجود ہر شخص جانتا تھا کہ میں نے یہاں کیسے... گزاری ہے وہ جانتے تھے کہ میں نے ایک لمحہ بھی ان کی اس غلط فہمی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ شاہ صاحب نے رسمی کارروائیاں کیں اور مجھے لیکر چل پڑے۔ میں بہت بڑا مجرم تھا جو کچھ میں نے کیا تھا معمولی نہیں تھی۔ کھلبلی مچ گئی تھی بہت سے لوگوں کو تو صورتحال بھی معلوم نہیں تھی۔ مجھے لاک اپ میں رکھا گیا مگر میرے لئے سخت پہرہ لگایا گیا تھا۔ البتہ شاہ صاحب مجھ سے بہت متاثر تھے میرا کیس بیحد... تھا میں سزائے موت کا مجرم تھا تختۂ دار سے پھانسی دینے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل... تھا۔ قانون کے لئے بھی بیشمار الجھنیں تھیں۔ مجھے فوری پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ اس سزا کا... ختم ہو گیا تھا۔ ہاں مجھ پر از سر نو مقدمہ ضرور چلایا جا سکتا تھا یہ تحقیق کرنی تھی کہ میرے فرار کے عوامل... تھے۔ اس سازش میں کون شریک تھا۔ سازش کیسے تیار ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے لئے تیاریاں... ہونے لگیں پولیس ہیڈ کوارٹر کے لاک اپ میں مجھے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ ایک ایس آئی ا... کانسٹیبلوں کی مجھ پر مسلسل ڈیوٹی لگائی گئی تھی اور شاید انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ میرا ہر طرح خیال ر...

سہولت دی جائے اور وہ لوگ عمل کر رہے تھے۔ عمدہ کھانا ضرورت کی ہر چیز، شاہ صاحب خود مجھ سے ملے۔

"کہو مسعود کیا حال ہے؟" انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہوں شاہ صاحب۔"

"جیل کی نسبت یہاں تمہیں آرام ہوگا لیکن یہ عارضی ہے اس کے بعد جیل جانا ہوگا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے شاہ صاحب۔"

"میرے لئے کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ کوئی ضرورت، کوئی بات۔"

"آپ کا بیحد شکریہ ایک خیال دل میں ہے۔ پتہ نہیں آپ میری یہ مشکل حل کر پائیں گے یا نہیں۔"

"کہو، کیا بات ہے۔"

"جب مجھے پھانسی دی گئی تھی شاہ صاحب تو میرے اہل خاندان میری لاش لینے آئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں وہ لاش نہیں ملی ہوگی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان سے کیا کہا گیا۔ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ اب انہیں میرے بارے میں کوئی اطلاع نہ دی جائے۔ انہیں دوبارہ اس کیس میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر آپ یہ کام کر دیں تو میں آپ کا بڑا احسان مانوں گا"۔ شاہ صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔

"بہت مشکل کام ہے میں ایک دو دن میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ ویسے اطمینان رکھو اس بارے میں پوری رپورٹ میں تمہیں دے دوں گا۔"

"بیحد شکریہ شاہ صاحب۔" وہ چلے گئے اور میں ٹھنڈی سانس لے کر لاک اپ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ کیا سوچتا۔ کیا کرتا۔ سب کچھ بیکار تھا۔ ہاں ایک خوشی ضرور تھی کم از کم اس خاندان کو میں نے کسی المیے سے دوچار نہیں کیا اس احساس سے دل کو سکون ملتا تھا۔

اس رات مجھے کھانا پیش کیا گیا۔ عمدہ قسم کی بریانی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دھو کر کھانے کا آغاز کیا۔ بریانی کی پلیٹ میں چاولوں کے ساتھ مرغ کا گوشت نظر آرہا تھا میں نے ایک بڑا ٹکڑا باہر نکالا۔ عجیب سی ساخت تھی اس کی، لیکن جونہی وہ چاولوں سے برآمد ہوا اچانک میں نے اسے کلبلاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ میری انگلیوں کی گرفت سے نکل کر میری کلائی پر چڑھ گیا۔ تب میں نے اسے دہشت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ گوشت کا ٹکڑا نہیں تھا بلکہ، بلکہ ربڑ جیسا انسانی مجسمہ تھا۔ چلتا پھرتا متحرک مجسمہ۔ اس نے میری کلائی پر دوڑ لگائی اور کندھے پر آ گیا۔

دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بیشک بدترین حالات کا شکار تھا لیکن انسان تو تھا۔ بدروحوں کے درمیان تو نہیں رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہمیشہ تو نہیں دیکھا تھا۔ بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ حواس معطل ہوئے جا رہے تھے میرے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ میں نے پھریری لے کر اسے شانے سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا کان پکڑ لیا اور اس طرح گرنے سے محفوظ رہا۔ اس کی انگلیاں ننھے ننھے کانٹوں کی طرح میرے کان میں چبھ رہی تھیں پھر اس کی منحوس آواز ابھری۔

"مرے کیوں جا رہے ہو میاں جی۔ ہماری تمہاری تو پکی دوستی ہے اب ہم سے گھبرایا نہ کرو۔"

"نیچے اتر مردود۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔" میں نے دہشت سے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

"ار... رے۔ اچھل کود کرو گے تو سنتری تمہیں پاگل سمجھیں گے اور پاگلوں کو پاگل خانے میں

رکھ کر مار لگائی جائے ہے۔ بات کرنے آئے ہیں تم سے۔ آرام سے بیٹھو بات کرو.........! سمجھ میں آیا یا نہیں۔" اس نے کہا اس کا کہنا درست تھا میری چیخوں کی آواز سن کر باہر پہرہ دینے والا سنتری سلاخوں کے سامنے آکھڑا ہوا اور مجھے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

"کیا بات ہے؟" کیا بتاتا میں اسے اور بتاتا بھی تو وہ کیا کر پاتا۔ میں خاموش رہا۔ "کھانا کھا لو گے یا نہیں چاہئے۔"

"نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے کان میں قہقہہ ابھرا تھا پھر اس نے میرا کان چھوڑ دیا اور اچھل کر میرے سر پر چڑھ گیا وہاں سے زمین پر کود گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ آپ تصور کریں ایک مختصر ترین انسان میرے سامنے تھا مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی حقیقت جانتا تھا۔

"ہاں میاں جی عقل ٹھکانے آئی؟"

"کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے شیطان میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔" میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ارے سب کچھ تو تلپٹ کر کے رکھ دیا سارے کام ادھورے رہ گئے ہیں ہمارے۔ تو اگر ہمارا کام کر دے تو ہمیں بہت بڑی شکتی حاصل ہو جائے گی۔ سنسار میں سب کچھ کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم۔ ہمارے سارے دشمن پانی بھریں گے ہمارے سامنے، پر تو نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہے۔"

"تم کسی اور سے بھی تو یہ کام لے سکتے ہو۔"

"یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی ہمارے لئے بھی تو ایک ہی ہے دوسرا کوئی ہوتا تو کچھ سوچتے۔"

"مگر کیوں؟"

"کہا نا تجھ سے۔ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی تو خود ہمارے پاس آیا تھا ہم تو تیرے پاس نہیں پہنچے تھے۔ جاپ کیا تھا ہم نے سو دن کا اور۔ سوویں دن جسے ہمارے پاس آنا تھا وہی ہمارے کام کا تھا۔ جیون میں ایک ہی جاپ کیا جاوے ہے دوسرا نہیں۔ ہم بھی تجھ سے بندھے ہوئے ہیں پاپی۔"

"مگر میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا"۔

"کرنا تو تجھے ہو گا للّو۔ کام ہی تیرا ہے۔ آج نہیں تو کل کرے گا، کل نہیں پرسوں اور ہم تو سمجھائے دیتے ہیں بیکار ضد کر رہا ہے ہماری تیری دوستی پکی ہو جائے گی۔ ہمیں مہان شکتیاں حاصل ہو جائیں گی۔ اور وہ تیرے کام بھی آئیں گی۔ سنسار میں جو تو چاہے گا۔ ہم کریں گے تیرے لئے۔ یہی چاہتا تھا نا کہ دولت تیرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے تو جو چاہے سو کر سکے۔ ریس کورس میں گھوڑے تیرے اشارے پر دوڑیں تو جسے دیکھے وہ تیرا ہو جائے۔ ایسا ہی ہو گا للّو، سوچ لے۔ محل بنا دیں گے تیرے لئے سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیں گے تیرے سامنے۔ بیکار کی ضد کر رہا ہے۔ پورے سنسار میں تو ہی دھرماتما ہے کیا، لوگوں کو دیکھ۔ چار پیسے کے لئے دوسرے کا گلا آسانی سے کاٹ دیتے ہیں وہ گناہ نہیں کرتے کیا، تو ہمارا کام نہیں کرتا نہ کر۔ سڑ سڑ کر مر جائے گا کچھ دن کے بعد تیرے اپنے بھی تجھے بھول جائیں گے کوئی نام لیوا نہ ہو گا تیرا۔ کیا ملے گا تجھے بول کیا ملے گا!"

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہ نہیں سوچا تو نے۔"

"تیرا کوئی نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھوریا چرن ہے ہمارا نام۔ پر تجھے نام سے کیا ہے۔"

"مجھے سوچنے کے لئے وقت دے بھوریا چرن۔ کچھ وقت چاہئے مجھے۔"

"ٹھیک ہے وقت لے لے۔ سوچیو اور ہمیں آواز دے لیجیئو۔ جب بھی آواز دے گا ہم آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھوریا چرن، مجھے موقع دے میں سوچنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔

دنیا کا عجیب ترین انسان میرے سامنے تھا، کچھ دیر وہ وہاں رکا اور پھر اس نے میری طرف ہاتھ ہلایا اور سلاخوں کے دروازے کی جانب بڑھ گیا، یہ سلاخیں کسی عام انسان کا راستہ روک سکتی تھیں، شیطان کا نہیں، وہ ان کے درمیان سے آرام سے نکلتا ہوا آگے بڑھا اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا میرا دل چاہا کہ بھاگ کر اسے دیکھوں، کاش وہ کسی کی نگاہوں میں آجائے اور اسے پکڑ لیا جائے، کچھ ہو جائے اس کے ساتھ، لیکن خود ہی اپنے خیال پر ہنسی آگئی، اگر کسی نے دیکھ ہی لیا، تو دہشت سے چیخیں مارتا ہوا بھاگ جائے گا، اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، وہ جب بالکل دور چلا گیا تو میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی، بدن بری طرح نڈھال ہو گیا تھا......... میں زمین پر لیٹ گیا، سامنے ہی بریانی کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی، لیکن اب وہ میرے لئے ناپاک ترین تھی، وہ کم بخت پلیٹ میں گوشت کی جگہ چھپا ہوا تھا۔ سارے چاول غلیظ کر دیئے تھے اس نے، بھلا اب ان چاولوں کا ایک دانہ بھی کھایا جا سکتا تھا، کراہیت آرہی تھی مجھے اس پلیٹ سے۔ سنتری تھوڑی دیر کے بعد پھر میرے سامنے آکر رکا اور کہنے لگا۔

"کیا بات ہے، کھانا نہیں کھایا تم نے؟"

"کچھ طبیعت خراب ہے بھائی، کسی سے کہہ کر یہ چاول یہاں سے اٹھوا لو۔" میں نے عاجزی سے کہا اور میری یہ عاجزی سنتری کو نرم کرنے کا باعث بن گئی، وہ میرے قریب رکا اور بولا۔ "کیا بات ہے، کیسی طبیعت ہے؟"

"بدن ٹوٹ رہا ہے.........."

سنتری چند لمحات کے بعد واپس چلا گیا پھر دو آدمی آئے اور چاول اٹھا کر لے گئے، اس سے زیادہ میرے جیسے کسی انسان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی جا سکتی تھی۔ درحقیقت بھوریا چرن کے جانے کے بعد میں اپنا تجزیہ کرنے لگا، خود مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے عقیدے میں کبھی بھی ایسی پختگی نہیں تھی۔ میں تو ایک بدکار انسان تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان اچھا تھا، ماں باپ بہن بھائی نیک فطرت تسلیم کئے جاتے تھے، صرف میں ہی تھا جس نے اپنے خاندان کو بدنما بنا دیا تھا۔ لیکن میری یہ بدنمائی کہاں گم ہو گئی۔ میرے ذہن میں یہ عقیدہ کیوں جاگا۔ پیر پھاگن کا مزار بے شک میرے لئے بھی قابل احترام تھا، بہت بار گیا تھا ان کے مزار پر حاضری دینے، فاتحہ پڑھنے، لیکن یہ صرف روایت کے طور پر کیا تھا میں نے۔ عقیدت اور احترام کا کوئی ایسا جذبہ نہیں پل رہا تھا میرے سینے میں جس کی بناء پر میں اپنا مستقبل یا زندگی داؤ پر لگا دیتا۔ یہ جذبہ میرے سینے میں پہلے سے نہیں تھا۔ بلکہ اب پیدا ہو گیا تھا، نجانے کیوں میں اس سے اتنی ضد کر رہا تھا اگر اس سے تعاون کر کے، اس کے کہنے کے مطابق، پیر پھاگن کے مزار پر حاضری کی کوشش

جاری رکھی جاتی تو ہو سکتا ہے کامیابی ہی حاصل ہو جاتی .... اور اگر یہ کوشش ناکام بھی ہو جاتی تو پھر
شیطان اسے میرا قصور نہیں قرار دے سکتا تھا. میں بھی تو اس سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی شکتی اس ناپاک
پیر پھاگن کے مقابلے میں ناکام رہی ہے بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور یہ خیال نجانے کیوں میرے
میں جڑ پکڑنے لگا تھا کہ اگر ایسی ہی کوئی بات ہے اور میں اس شیطان کے پتلے کو وہاں لے جانے میں ناکام
رہتا ہوں تو پھر وہ مجھ سے کیا کہہ سکے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال ا
.... ”اگر اس میں کامیابی ہو گئی، تو کیا میں ایک گناہ عظیم کا مرتکب نہیں ہو نگا. ایک ناپاک روح
ایک مقدس جگہ پہنچانے کا باعث نہیں بن جاؤں گا. ٹھیک ہے مجھے گندی قوتیں حاصل بھی ہو گئیں تو کیا
میرے لئے کار آمد ہو سکیں گی۔ کیا مجھ سے میرا دین، میرا ایمان نہیں چھن جائے گا۔ نجانے کیوں دل
دماغ میں شدید کشمکش ہونے لگی اور مجھے ایک خوشگوار سا احساس ہوا. گویا مجھ جیسے بدطینت انسان کے
میں ایمان کا جذبہ موجود ہے اور یہ خوشی بڑھتی چلی گئی مجھے اپنا وجود ہلکا ہلکا محسوس ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے
اس تصور نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی. اس سے پہلے تو کبھی ایسی نیک باتوں پر غور کبھی نہیں
تھا........ لیکن آج نجانے کہاں سے بہت سے اقوال یاد آرہے تھے۔ نیکیوں کے راستے مصیبتوں
اور پریشانیوں سے گزرتے ہیں لیکن ان کا اختتام خوشگوار ہوتا ہے۔ جبکہ بدی کے راستے بہت خوبصورت
ہوتے ہیں اور تباہی کے غاروں پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔ اگر مجھے اپنی بدنما زندگی میں کوئی نیک کام کرنے
موقع ملا ہے تو میں اسے ہاتھ سے کیوں گنواؤں۔ اپنے آپ کو امتحان میں کیوں نہ ڈال دوں۔ شاید
میری برائیوں کا کفارہ ہو جائے ہرگز نہیں، مردود شیطان، بھوریا چرن تیرا کام تو میں کبھی نہیں کروں گا
چاہے اس کے لئے مجھے کیسی ہی مشکلات سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

دوسرا دن حسب معمول تھا، صبح کا ناشتہ میں نے رغبت سے کر لیا تھا، کسی اور نے مجھ سے کوئی ملاقات
نہیں کی تھی۔ لیکن دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب میری ملاقات آئی اور مجھے کچھ لوگوں کے سامنے
پہنچا دیا گیا۔ فریحہ، ریحانہ بیگم، اور سرفراز تھے .... ان سب کی آنکھوں میں میرے لئے رحم
ہمدردی کے آثار تھے۔ ریحانہ بیگم کی آنکھیں تو آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں، فریحہ مجھے عجیب
نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ریحانہ بیگم کہنے لگیں۔

”مسعود بیٹے اپنے اہل خاندان کا پتہ بتاؤ. ہم ان سے مل کر ان کی مشکلات کا حل بھی تلاش کر
گے۔“ میں نے ریحانہ بیگم سے کہا۔

”نہیں آنٹی آپ یہ سب نہ کریں میرے بارے میں مناسب سمجھیں تو آپ شاہ صاحب سے
تفصیلات معلوم کریں۔ آپ کو علم ہو جائے گا کہ میرے خاندان کا مجھ سے دور رہنا کس قدر ضروری
ہے۔ وہ لوگ بہرطور مجھے صبر کر لیں گے لیکن میری وجہ سے اگر وہ مشکلات کا شکار ہوئے تو میں خود
معاف نہیں کر سکوں گا۔“

”ہم جان کی بازی لگا دیں گے. تم فکر مت کرو، ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں، شاہ صاحب سے
کر لیں گے ہم اور ہاں یہ بتاؤ. تمہارے لئے اور کیا کیا جا سکتا ہے، کسی چیز کی ضرورت ہو تو
بتادو........؟“

”میری دعائیں ہیں کہ آپ سب لوگ خوش رہیں میں جس عذاب کا شکار ہوا ہوں اس سے
نکالنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے. بس ہو سکے تو میرے لئے دعا کر دیں۔“

”خیر یہ تمہارا اپنا خیال ہے۔ ہم کچھ کرنے کے بعد ہی تمہارے پاس واپس آئیں گے، آرام سے رہو
اور اگر ہو سکے تو اللہ کے بعد ہم پر اعتبار کر لو. ہم تمہارے لئے یقینی طور پر وہ سب کچھ کریں گے جو ہمارے
بس میں ہو گا۔“

وہ لوگ چلے گئے اور میں ان اچھے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ بھلا میں نے کیا کیا تھا. میں تو اپنے
ہی عذاب میں گرفتار تھا۔ اور کیا ضروری تھا کہ وہاں اگر میں سرفراز کی حیثیت قبول بھی کر لیتا تو ان ساری
مصیبتوں سے محفوظ رہ جاتا۔ ناممکن ہی تھا ایک طرح سے ناممکن ہی تھا. کیونکہ بھوریا چرن مجھے ضرور
تلاش کر لیتا۔

چند روز مزید یہاں رہنا پڑا اور پھر ایک دن جیل کی گاڑی آئی اور مجھے اس میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا
گیا۔ گو یہ جیل دوسرے شہر کی تھی لیکن جیلوں سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں بھی غالباً میرے بارے میں
رپورٹ دے دی گئی تھی کہ میں نے جیل میں بھی ایک قیدی کو قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ جیلر صاحب نے جو
بہت سخت انسان معلوم ہوتے تھے۔ پہلے تو مجھے کچھ نصیحتیں کیں اور کہا کہ وہ ذرا مختلف قسم کے آدمی
ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں بآسانی توڑ دیں گے اور مجھے اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ میں کسی کو نقصان
پہنچا سکوں، بہتر طریقہ یہی ہے کہ میں انسانوں کی مانند یہاں رہ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کروں۔
میں نے گردن جھکا کر جیلر صاحب سے کہا تھا کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی........

ان دنوں میرے دل میں ایک شدید آرزو بیدار ہو رہی تھی وہ یہ کہ کالے جادو کا توڑ بھی ہوتا ہے،
قرآنی آیات، اللہ کا کلام ہر قسم کے جادو کو ختم کرنے کی قوتیں رکھتا ہے۔ اگر مجھے کوئی ایسا علم آجائے کہ
میں بھوریا چرن کو خود سے دور رکھ سکوں تو یہ میرے لئے بہت بہتر ہو گا، خود تو زندگی میں کچھ نہیں کیا تھا۔
حالانکہ والدین نے پڑھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ اور دین سے واقف کرانے کے لئے بھی کارروائیاں
کی تھیں، مگر مجھ پر بچپن ہی سے شیطان سوار تھا اور میں نے ان کے کہے کو کبھی نہیں مانا تھا، آج اس بات کا
شدید افسوس تھا، اپنے طور پر ہی کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی، چاہے باہر سے کسی کی مدد نہ ملتی، لیکن اس سے محروم
تھا۔ یہ محرومی بعض اوقات بڑا دل دکھاتی تھی۔ جیل آنے کے تیسرے دن شاہ صاحب میرے پاس
پہنچے۔ پولیس کی وردی میں تھے۔ ویسے یہ اپنے طور پر بھی بہت اچھے انسان تھے۔ اور غالباً میرے کردار
سے بہت متاثر ہو گئے تھے، مجھ سے سلام دعا کی اور کہنے لگے۔

”جج صاحب بھی تم سے ملنا چاہتے تھے، کسی وقت آئیں گے تمہارے پاس، تمہارے بارے میں
بہت سی باتیں ہوئی تھیں ان سے ویسے تم نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی میں نے اسے پورا کیا ہے۔
لیکن تمہارے لئے کچھ افسوسناک اطلاعات ہیں۔“

میرا دل مچھلی کی طرح تڑپنے لگا. میں نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ صاحب کو دیکھا اور بمشکل تمام کہا۔

”کیا اطلاعات ہیں شاہ صاحب. جلدی بتائیے. خدارا جلدی بتائیے ....“

”وہاں تمہارے اہل خاندان محفوظ نہیں رہے اور وہ بھی مصیبتوں کا شکار ہو گئے ....“

میں نے دونوں ہاتھ دل پر رکھ لئے اور دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا ....

”کیا ہوا. کیا بات ہو گئی........؟“

”تمہارے سلسلے میں اہل محلہ تمہارے گھرانے سے کافی بد دل ہو گئے تھے وہ آوازے کسا کرتے تھے

اور برا بھلا کہا کرتے تھے، کیونکہ جو واقعات وہاں پیش آئے ہیں اور جن واقعات کے بارے مجھے معلوم
حاصل ہوئی ہیں وہ میرے لئے بھی عجیب ہیں۔ بہرطور میں تمہیں بتا رہا تھا کہ اہل محلہ سے تمہارے ماموں
اور بھائی کا جھگڑا ہوا، تمہارے بھائی نے ایک نوجوان کو چاقو مار دیا اور وہ نوجوان ہلاک ہوگیا۔ تمہارا بھائی فرار
ہوگیا اور تمہارے خاندان کو اہل محلہ نے وہاں سے نکال دیا اور تمہارے گھر میں آگ لگا دی..........

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ ”تو محمود بھی قاتل بن گیا، وہ معصوم
بچہ جس نے زندگی میں ہنسنے کھیلنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا، کیا وہ قاتل کی حیثیت سے فرار ہوگیا..........

”نہیں وہ مفرور ہے اور پولیس اسے تلاش کر رہی ہے“۔

”اور میرے والدین، میری ماں، بہن، ماموں.........“

”وہ لاپتہ ہیں، انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں پولیس نے بعد میں ان سے رابطے
کوشش کی لیکن وہ پولیس کو دستیاب نہیں ہوسکے۔ اخبار میں بھی ان کے بارے میں اشتہار شائع کیا گیا کہ
پولیس سے رابطہ قائم کریں لیکن پولیس سے انکا کوئی رابطہ قائم نہیں ہوسکا“۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے تو یہی سوچ کر ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کی تھی
کہیں میری نحوست ان لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا، وہ براہ راست میری
نحوست کا شکار ہوگئے تھے۔ آہ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ اب نجانے کیا حال ہوگا ان کا۔ ایک بیٹے سے
ہاتھ دھو بیٹھے تھے.......... لیکن محمود.......... آہ میرا محمود، میں درحقیقت اپنے بھائی بہن کو اپنی زندگی
کی طرح چاہتا تھا کتنا بڑا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے میرے گھر والوں پر میری وجہ سے.......... شاہ صاحب
میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

”دیکھو میاں، بدقسمتی جب آتی ہے تو پوچھتی نہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ لیکن بالآخر ایسی قوتیں بھی ہیں
انسان کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہیں تو سارے مشکل مسئلے حل ہوجاتے ہیں تمہارا کیس میں خود دیکھ رہا ہوں
اور بڑا عجیب محسوس ہو رہا ہے مجھے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے مسعود۔ بددل
ہونا، وقت کا انتظار کرنا، دیکھو تقدیر نے تمہیں پھانسی سے بچا لیا ہے، دنیا تمہاری موت کا یقین کر چکی
لیکن تم نے جو کچھ کہا ہے دوسرے لوگ اس پر یقین کریں یا نہ کریں مجھے کچھ کچھ اس پر یقین آتا
ہے، خاص طور سے ان تحقیقات کے بعد.......... میں نہیں کہتا کہ قانون میں تمہارے لئے کوئی لچک
ہوسکتی ہے، تمہارا مقدمہ از سرنو تیار ہو رہا ہے اور سرکاری وکیل اس سلسلے میں فیصلے کر رہے ہیں کہ
تمہارے لئے کیا کیا جائے۔ لیکن میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ تمہیں جس حد تک رعایتیں مل
ہیں ملیں۔ اس کے علاوہ میرا تم سے یہ وعدہ بھی ہے کہ میں تمہارے والدین کو ذاتی طور پر تلاش کر
گا، اگر انہیں قانون کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوا تو کم از کم میں اس کا ذریعہ نہیں بنوں گا..........

”شاہ صاحب، میں ابھی تو نہیں، اگر وقت ملا تو پھر کسی وقت آپ کو اپنی روداد غم سناؤں گا، آج
میں نے اپنی یہ کہانی کبھی کسی کو اس لئے نہیں سنائی کہ لوگ مذاق اڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کریں
یہ ایک ایسی کہانی ہے، جس کا حقیقتوں سے دور کا واسطہ بھی نظر نہیں آئے گا لیکن میرے ساتھ یہ سب
ہے، شاہ صاحب میں آپ سے یہ بھی مدد مانگوں گا کہ میری اس سلسلے میں روحانی رہنمائی

جائے..........“

”میرے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ لیکن تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے معاملے میں
براہ راست ملوث ہوچکا ہوں اور تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

”شکریے کے الفاظ کے علاوہ مجھ جیسے نادار شخص کے پاس اور کیا ہوسکتا ہے شاہ صاحب۔“

”میرا نام امتیاز عالم شاہ ہے اگر کبھی کسی مسئلے میں میری ضرورت پیش آئے تو کسی سے کہہ دینا۔
ویسے میں جیلر صاحب سے بھی تمہارے سلسلے میں کچھ سفارشیں کروں گا کم از کم تمہیں کوئی ایسی تکلیف
نہیں پہنچائی جائے گی جس سے تم بددلی کا شکار ہو، اچھا اب میں چلتا ہوں“.......... شاہ صاحب چلے
گئے۔ لیکن میرے لئے آنسوؤں اور آہوں کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑ گئے تھے میرا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ
پھوٹ کر روؤں۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ، کیا کیا ہوتا رہے گا کوئی امید ہے بہتری کی۔ کچھ ہوسکتا ہے
میرے لئے کوئی کچھ کر سکتا ہے۔

مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ کمرۂ عدالت کے باہر میں نے ریحانہ بیگم اور سرفراز کو دیکھا۔ ان کے
ساتھ بیرسٹر اشتیاق اور فاضلی بھی تھے جنہوں نے مجھ سے وکالت نامے پر دستخط کرائے اور بولے۔

”مجھ سے کچھ دیر سے رابطہ قائم کیا گیا، تم سے تمہارے کیس کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا ہے مگر
کوئی بات نہیں، آج مقدمے کی سماعت نہیں ہوگی میں تاریخ لے لوں گا۔“

میں نے شکر گزار نگاہوں سے ریحانہ بیگم کو دیکھا اور آنسو بھرے لہجے میں بولا۔

”بیگم صاحبہ آپ میرے لئے یہ زحمت کیوں کر رہی ہیں۔ ؟“

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مسعود..........؟“

”ضروری ہے بیگم صاحبہ۔ خدا کے لئے یہ سب کچھ نہ کریں مجھے میری تقدیر پر چھوڑ دیں۔ میرے
سلسلے میں یہ سب کچھ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ خدا نہ کرے آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔“

”تمہاری شرافت نے ہمیں خرید لیا ہے مسعود، ہم تمہارے مقروض ہیں ہمیں ادائیگی کرنے دو۔“

”بیگم صاحبہ، میری ایک اور مشکل ہے، وہ میری زندگی سے زیادہ اہم مسئلہ ہے اگر آپ انسانیت
کے رشتے سے کچھ کرنا چاہتی ہیں تو اس سلسلے میں کچھ کر دیجئے۔“

”ہاں بتاؤ“۔

”میرے والدین میری وجہ سے دربدر ہوگئے ہیں ڈی ایس پی امتیاز عالم شاہ صاحب کو اس بارے میں
سب کچھ معلوم ہے اگر ان کا پتہ مل جائے تو انہیں سہارا دیں میرے اوپر بہت بڑا احسان ہوگا۔“ میری
آنکھوں میں آنسو آگئے آواز رندھ گئی۔

ریحانہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ناک ہوگئی تھیں، پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”تم مجھے ان کے
بارے میں تفصیل بتا دو مسعود، اطمینان رکھو میں ان کا پورا پورا خیال رکھوں گی..........“

”امتیاز عالم صاحب سب کچھ جانتے ہیں، آپ انہی سے معلومات کر لیجئے۔ ویسے بھی اس وقت سب
کچھ بتانا ممکن نہیں ہے“۔ سرفراز نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ہم خود یہ سب کام کر لیں گے تم مطمئن رہو اور اپنی طرف سے بھی پریشان
نہ ہونا، ہم انتہائی حد تک کوشش کریں گے، ہمت سے کام لینا، باقی جو خدا کا حکم ہوگا وہی ہوگا۔“

مجھے واپس جیل سے لے آیا گیا۔ دوسرے دن نئے بیرسٹر صاحب سرفراز کے ساتھ جیل پہنچے۔ مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور میں نے انہیں تمام تفصیلات بتا دیں۔ سرفراز بھی حیران تھا۔ غالباً اسے پہلی بار اس ساری کہانی کا علم ہوا تھا۔ وہ ناقابل یقین سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، لیکن اس نے میری باتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ بس خاموش رہا تھا۔ اشتیاق احمد صاحب نے تفصیلات مکمل کیں۔ ویسے بھی وہ میرا فائل حاصل کر چکے تھے جو ان کے پاس موجود تھا۔ بڑے قانون دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اطمینان دلایا اور کہا کہ وہ کوئی ترکیب نکالیں گے جس سے میری یہ مصیبت ٹل سکے۔

وہ لوگ چلے گئے، میرے لئے روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی یہ بیچارے اپنے طور پر کوششیں تو کر سکتے تھے، لیکن جس شیطان سے میرا واسطہ تھا اس کی چالیں انسانی چالیں نہیں تھیں اور اس کے سفلی علوم کے مقابلے میں ان نیک لوگوں کی کوششیں بے اثر ہی تھیں .... ہاں ان لوگوں کے ذریعے اگر میرے اہل خاندان کو کچھ سہارا مل جائے تو میرے لئے یہی کافی تھا۔

اپنی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن کبھی کبھی دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ بھوریا چرن کم بخت کہہ کر گیا تھا کہ جب بھی میں اسے آواز دوں گا وہ میرے پاس آ جائے گا اور آواز دینے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کے مکروہ فعل کے لئے آمادہ ہو چکا ہوں، سچی بات یہ ہے کہ اپنے اندر کا یہ جذبہ خود میری سمجھ سے باہر تھا، جن مشکل ترین حالات میں بسر کر رہا تھا ان سے گھبرا کر تو دنیا کا مکروہ سے مکروہ ترین کام بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں بھوریا چرن کی بات ماننے کے لئے اندر سے آمادگی ہی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ یہ بات خود میری اپنی سمجھ سے باہر تھی، آخر ان برے حالات میں جبکہ میں اپنے لئے نہ سہی ماں باپ کے لئے بری طرح پریشان تھا میں بھوریا چرن کی بات ماننے کے لئے کیوں نہیں تیار ہو رہا تھا جبکہ میرے لئے اور کوئی سہارا بھی نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا اور میں اپنی عجیب و غریب کیفیات کا شکار رہا۔ پھر غالباً کچھ ہوا تھا شہر میں، بے شمار لوگ قیدیوں کی حیثیت سے جیل لائے جا رہے تھے غالباً کوئی سیاسی ہنگامہ تھا جس کی وجہ سے بڑی افراتفری نظر آ رہی تھی اور جیلیں بھرتی جا رہی تھیں۔

پھر ایک شام ہم لوگوں کو تیار کیا جانے لگا۔ قیدیوں کو ہتھکڑیوں کے علاوہ بیڑیاں بھی پہنا دی گئیں اور انہیں ایک جگہ جمع کیا جانے لگا۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا بعد میں مجھے دوسروں سے پتہ چلا کہ ہمیں کسی اور جیل میں منتقل کیا جا رہا ہے، اور یہ فیصلہ ان سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے ہے، جن سے جیلوں میں نفری بڑھتی جا رہی ہے۔ کئی گاڑیاں ہمیں لے کر چل پڑی تھیں۔ کہاں جا رہے ہیں کہاں تک سفر کرنا ہے کچھ معلوم نہیں تھا، دوسرے قیدیوں کی طرح میں بھی خاموشی سے سر جھکائے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیلوں سے کیا فرق پڑتا ہے، صرف جگہ بدل جاتی ہے، قید تو قید ہی ہے چنانچہ اس بارے میں کیا تردد ہوتا تھا۔ البتہ سفر کافی طویل تھا اور بری طرح بھری ہوئی گاڑی میں اتنے لمبے سفر سے جوڑ جوڑ دکھ گیا تھا۔ بالآخر منزل آ گئی اور قیدی نیچے اترنے لگے۔

نئی جیل کسی گرم علاقے میں تھی اور صحیح معنوں میں جیل تھی۔ کوٹھریاں انتہائی بوسیدہ، دیواریں ٹوٹے پھوٹے پلستر سے آراستہ۔ فرش میں جگہ جگہ سوراخ جن میں حشرات الارض کا بسیرا تھا

یہاں کا عملہ تھا۔ سخت بدمزاج لوگ تھے یقینی طور پر ایسے موسم کے ستائے ہوئے کبھی سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ باہر کا علاقہ سبزے سے خالی تھا۔ سیاہ ڈنٹھلوں والی بدنما جھاڑیاں البتہ وہاں نظر آتی تھیں۔ مچھروں اور دوسرے حشرات الارض نے زندگی حرام کر دی۔ نہ رات کو سکون کی نیند نصیب ہوتی تھی نہ دن کو چین تھا، صبر آزما وقت گزرتا گیا۔ اس دوران کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہفتہ، مہینہ اور پھر تقریباً تین ماہ گزر گئے۔ زندگی سب کچھ جھیل لیتی ہے جہاں ایک دن زندہ رہنے کا تصور نہ کیا جا سکے وہاں تین ماہ گزر چکے تھے اور زندہ تھا اور مجھ سے پہلے کے لوگ سالہا سال سے جی رہے تھے۔ ہاں طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ ہر چیز کو نفرت سے دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی۔

جھلتے دن، جھلتی راتوں میں زندگی آگے بڑھتی رہی وسیع و عریض جیل کے چپے چپے سے واقف ہو گیا تھا۔ اب نہ گھر والے یاد آتے تھے نہ باہر کی رنگین دنیا سے کوئی دلچسپی تھی۔ بھوریا چرن بھی غائب تھا کسی شکل میں وہ نہیں نظر آیا تھا اس کے تصور کے ساتھ ہی منہ سے گالیاں ابل پڑتی تھیں بڑی تبدیلی محسوس ہوتی تھی خود میں۔ پھر ایک دن جیل کے مغربی کونے میں کیاریاں سنبھال رہا تھا کہ بیرونی دروازے سے ایک بڑا ٹرک اندر داخل ہوا۔ اس ٹرک میں قیدی لائے اور لے جائے جاتے تھے۔ ہمیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ ٹرک سے قیدی اتارے جانے لگے۔ منظر چونکہ بالکل سامنے تھا اس لئے بے دھیانی کے انداز میں قیدیوں کو اترتے دیکھتا رہا۔ لیکن ایک قیدی کو دیکھ کر اچانک میرا پورا بدن لرز گیا۔ ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر اسے دیکھا۔ آہ، بینائی دھوکہ نہیں دے رہی تھی۔ یہ میرا بھائی ہی تھا۔ میرا چھوٹا بھائی، بھلا اپنے خون کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ محمود کو نہیں پہچان سکتا تھا اپنے محمود کو۔ وہ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ محمود۔ میرا محمود۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی مگر سارا وجود مجسم آواز بن گیا تھا۔ قیدیوں کو آگے لے جایا گیا اور میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں وہ بیرک آٹھ کی طرف جا رہے تھے یہی میری بیرک تھی۔ سپاہی قریب آ کر رک گیا اور اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آرام ہو رہا ہے۔"

"نہیں، نہیں صاحب۔" میں فوراً ہوش میں آ گیا۔ کام کرنے لگا مگر اندر سے جو کیفیت ہو رہی تھی میرا دل جانتا تھا۔ محمود گرفتار ہو گیا۔ شاہ صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ محمود کے ہاتھوں بھی قتل ہو گیا ہے وہ بھی قاتل ہے اور نہ جانے اسے کیا سزا ملی ہے۔ دل سینہ توڑ کر نکلا آ رہا تھا۔ نجانے دن کیسا گزرا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کو بیرک میں آ گیا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ میرے ساتھی رئیس خان نے پوچھا۔

"کیا بات ہے مسعود طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔"

"کھانا کیوں نہیں کھایا۔؟"

"دل نہیں چاہا رئیس صاحب۔"

"دل .... ؟ یہاں بھی دل ساتھ لائے ہو بھیئے ...." اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرایا۔

"نئے قیدی آئے ہیں ...." میں نے کہا۔

"یار، آتے جاتے رہتے ہیں"۔

"کونسی کوٹھریوں میں رکھے گئے ہیں۔"

"تقسیم ہوگئے ہیں۔"

"کچھ ادھر بھی تو لائے گئے ہیں۔"

"ہاں وہ تین کوٹھریاں بھری نظر آرہی ہیں............" رئیس خان نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

اور میری نظریں ادھر کا طواف کرنے لگیں۔ انہیں میں سے کسی میں محمود تھا۔ محمود جسے ساری کہانی معلوم ہوگی۔ امی کے بارے میں، ابو کے بارے میں، میری بہن کے بارے میں، دل تڑپ رہا تھا۔ بیرک میں خاموشی طاری ہوگئی بس کبھی کبھی سنتری کے بوٹوں کی آواز سنائی دیتی اور اس کے پاؤں نظر آجاتے۔ اس کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دل میں خیال آیا۔ "کیا محمود سزائے موت کا مجرم ہے۔ قتل کے نتیجے میں اس کی توقع تو کی جاسکتی تھی۔ اسے کیا سزا دی گئی ہے کیا میں ہمیشہ کے لئے اپنے بھائی سے محروم ہوجاؤں گا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا کیوں نہیں سمجھتی کہ یہ مجرموں کا گھرانہ نہیں ہے۔ ہم مصیبت زدہ لوگ ہیں ہمارے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہئے۔ ہم پر رحم کیا جائے ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے کیوں نہیں سمجھتی دنیا۔ کیا یہ کبھی نہ سمجھ پائیں گے کہ یہ سب کچھ ایک شیطان کا کیا دھرا ہے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، وہ شیطان مجھے ایک گندے کام پر اکسانا چاہتا ہے، وہ ایک مقدس مزار کی بے حرمتی کرانا چاہتا ہے میرے ہاتھوں، اپنے کالے جادو کو مکمل کرنے کے لئے وہ میرا اسہارا طلب کر رہا ہے اور میں اپنے عقیدے کے مطابق اس گندی کوشش میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ میرے ساتھ رحم کیوں نہیں کیا جاتا، یہ سب اس شیطان کے آلۂ کار کیوں بن گئے ہیں۔ یہ میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے اور اگر میں شیطنت پر اتر آؤں تو پھر یہ روتے چیختے پھریں گے۔ کیوں نہیں سوچا جاتا میرے بارے میں۔ کیوں نہیں کرتے یہ کچھ میرے لئے۔ سب اس شیطان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آج اگر میں برائی کے راستے اپنالوں، اپنے دین کے راستے چھوڑ کر اس شیطان بھوریا چرن کا ساتھی بن جاؤں، تو پھر یہ سب میرے تلوے چاٹیں گے شیطنت کا راج کیوں قائم ہونے دیا جارہا ہے، کیوں اکسایا جارہا ہے مجھے، اگر محمود کو پھانسی ہوگئی، اگر وہ سزا پا گیا تو میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاؤں گا، سن لو میری بات۔ اگر تم نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا، تو میں تم سے تمہاری زندگی چھین لوں گا، آخر میں بھی انسان ہوں۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ میں بھی غلط راستوں پر نکل سکتا ہوں روکو مجھے غلط راستوں پر جانے سے۔ لیکن یہ دل کی خاموش چیخیں تھیں، جنہیں سننے والا کوئی نہ تھا، اس روئے زمین پر، کوئی نہیں سنے گا میری بات، مجھے اپنی بات سنانی پڑے گی ان لوگوں کو عمل کر کے پھر دکھانا پڑے گا۔ جذبات کے یہ بول ان کے کانوں تک نہیں پہنچیں گے کبھی نہیں پہنچیں گے، عمل چاہئے عمل............ آہ ورنہ میں محمود کو ہمیشہ روتا رہ جاؤں گا۔ اتنی بے بسی اچھی نہیں ہے مجھے محمود کے لئے کچھ کرنا ہوگا، کچھ کرنا ہوگا............

دل میں لہریں اٹھنے لگیں، ہاتھ پاؤں میں اکڑن سی پیدا ہوگئی۔ رئیس خان گہری نیند سو رہا تھا۔ کم بخت کو پتہ نہیں یہ نعمت کہاں سے مل گئی تھی، وہ سوجاتا تھا تو اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی کاٹ دیا جاتا تو شاید اسے صبح ہی کو اس کا پتہ چلتا، اتنی گہری نیند سوتا تھا وہ............ آنکھوں میں نمی خشک ہوگئی تھی، ایک جلن سی پیدا ہوگئی تھی ان آنکھوں میں............ دماغ میں بھی کچھ سیاہ دھبے ابھر آئے تھے جو محسوس ہو رہے تھے۔ میں پوری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اپنے لئے میں کچھ نہ کر سکا لیکن بھائی کے لئے ضرور مجھے کچھ

کرنا ہوگا۔ دماغ اس وقت عجیب سی کیفیت کا حامل ہوگیا تھا چنانچہ سازشیں جنم پانے لگیں اور جب صبح کی روشنی نمودار ہوگئی تو میرے ذہن میں پورا پروگرام بن چکا تھا اس وقت میرے وجود میں ایک نیا انسان جاگ اٹھا تھا اور میں کم از کم اسے بھوریا چرن نہیں کہہ سکتا تھا، میں راستے متعین کرتا رہا، فیصلے کرتا رہا اور میں نے اپنے وجود کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ آج میں ایک زیادہ ذہین اور خود مختار انسان تھا، کسی قسم کی بے کسی اور بے بسی کا کوئی احساس میرے ذہن میں نہیں تھا۔ رات کو معمول کے مطابق بیرک میں آگیا، کھانا وغیرہ بھی کھالیا تھا۔ رئیس خان نے تبصرہ بھی کیا تھا مجھ پر کہ کل کی نسبت آج میری کیفیت بالکل درست ہے، اور میں نے قہقہہ لگا کر اس سے کہا تھا کہ بیماری روزانہ تو نہیں ہوتی۔ دن کی روشنی میں............ میں نے محمود کو دیکھا تھا اور اس بیرک کو بھی جس میں اسے رکھا گیا تھا۔ ہر احساس ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا، بیرکوں میں سناٹے پھیلتے چلے گئے، سنتری ڈیوٹی پر آگیا اور جیل کی دنیا خاموش ہوگئی حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس سناٹے میں ہزاروں آوازیں پوشیدہ ہیں، نجانے کتنے لوگ جاگ رہے ہیں، نجانے کتنے لوگ رو رہے ہوں گے لیکن یہ رونا بے آواز ہوتا تھا ان کے صرف دل روتے تھے۔

جیل کا اندرونی حصہ تاریک تھا لیکن باہر روشنی تھی۔ رات کو ڈیوٹی والا سنتری بدستور بیرک میں گشت کرتا رہا تھا اور میں اب اپنے کام کے لئے تیار تھا۔ سنتری کے قدموں کی آواز مجھے اپنی کوٹھری کی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی تو میں ڈرامہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے اپنے دانتوں سے اپنی کلائی کاٹ لی اور اس سے خون بہنے لگا، تب ہی میں اپنی جگہ سے کھسکتا ہوا سلاخوں والے دروازے کے نزدیک لیٹ گیا............ اور میرے حلق سے اذیتناک کراہیں نکلنے لگیں .... البتہ میں نے اتنا شور نہیں کیا کہ دوسرے قیدی بھی سن لیں۔ تدبیر کارگر ہوئی سنتری میرے پاس آکر رک گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کسی جانور نے کاٹ لیا ہے۔ سانپ لگتا تھا اسی سوراخ میں جا گھسا ہے میں نے ایک سوراخ کی طرف اشارہ کیا اور کلائی اس کے سامنے کردی، کلائی سے بہتے ہوئے خون اور میری گھٹی گھٹی آواز نے اس کے دل میں ہمدردی جگادی اور اس نے جلدی سے چابی نکال کر تالا کھول دیا۔ غلطی کی تھی اس نے۔ یہاں انسانیت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قیمت اسے بھی ادا کرنی پڑی جونہی اس نے میرے زخم کو چہرے کے قریب کیا میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ گھبرا گیا مگر بیکار تھا۔ میں نے پوری قوت صرف کردی اور اسے منہ سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں دیا پتہ نہیں بے چارہ مرگیا تھا یا صرف بے ہوش تھا۔ میں نے اسے بے سدھ پاکر آہستہ سے اپنی جگہ لٹادیا اور پھر اس کے پاس موجود چابیوں کا گچھا اپنے قبضے میں کرلیا، باہر نکل کر میں نے تالا بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔

دوسرا سنتری اپنا چکر پورا کر کے اسی طرف آرہا تھا۔ میں نے بیرک کے موڑ پر اس کا استقبال کیا۔ جونہی وہ موڑ گھوما میرا طاقتور گھونسا اس کی ناک پر پڑا اور ناک کی چوٹ بہت سے مسئلے حل کردیتی ہے۔ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے گرنے نہ دیا وہی گر میں نے اسی پر بھی آزمایا جس سے پہلے سنتری کو سنبھالا تھا جب مجھے اس کے بے حس و حرکت ہوجانے کا یقین ہوگیا تو میں نے اسے ایک تاریک جگہ لٹادیا۔ تقدیر شاید اس وقت میری طرف سے بے نیاز تھی کیونکہ میں اپنی پہلی کوشش میں کامیاب ہوگیا

تھااس کے بعد مجھے محمود کی کوٹھری تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔ میں چابیوں کے گچھے کی تمام چابیاں آزمانے لگااور ایک چابی نے اس کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ اندر چار قیدی تھے جن میں ایک محمود تھا۔ وہ زمین پر آرام سے سو رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا دل میں پیار کے بہت سے پھول کھل اٹھے۔ لیکن یہ عمل کا وقت تھا ابھی بہت مشکل مراحل تھے۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اس کے کان کے قریب ہونٹ لے جا کر سرگوشی کی۔ ”محمود .... جاگو .... محمود .... محمود........ “ اس کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ میں نے پھرتی سے اس کا منہ بھینچ لیا تھا۔ اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کافی مضبوط گرفت تھی، ایک مکمل مردانہ گرفت جو میرے ہاتھ کو منہ سے ہٹا سکتی تھی۔ میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ میرے الفاظ اس کی سماعت نے محسوس کر لئے، اس نے انہیں سمجھ لیا جس کا اندازہ اس کی گرفت کے ڈھیلے پڑ جانے سے ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

”ہوشیار ہو جاؤ محمود، یہ نہ سوچو میں یہاں کیسے آ گیا۔ یہ سب بعد میں معلوم ہو جائے گا تمہیں، خود کو سنبھالو، پوری طرح ہوشیار ہو جاؤ، ہمیں جیل سے فرار ہونا ہے۔ کیا تم جاگ گئے ہو۔ “

اس نے گردن ہلا دی اور میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا........ میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے قریب سوئے ہوئے قیدیوں پر ڈالی اور دوسری کھلے دروازے پر، پھر وہ گردن جھٹکنے لگا!

”آؤ........ “ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور وہ بے آواز چلتا ہوا کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ اب وہ پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ باہر اس نے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے دوسرے سنتری کو دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی رائفل اٹھا لی ساتھ ہی کارتوسوں کی پیٹی تھی۔ یہ میں نے نہ کیا تھا نہ سوچا تھا، مگر اس سلسلے وہ مجھ سے آگے نظر آ رہا تھا .... پھر ہم دونوں بے آواز، قیدیوں کی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بیرک کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے جس کے دوسری طرف موت بھی تھی اور زندگی بھی ....

جیل سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جتنا ہم نے سمجھا تھا لیکن میرے لئے نہ زندگی اتنی دلکش تھی نہ موت، یہ بھی نہیں کہتا کہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ کون نہیں جینا چاہتا، بس جو بیت رہی تھی اس نے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا ہاں اپنے بھائی کی زندگی کے لئے میں ہزار بار مرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ابھی اس دنیا میں کیا دیکھا تھا جو کچھ ہوا تھا میری وجہ سے ہوا تھا میں زندگی سے محروم ہو جاؤں گا مگر میرا محمود۔

”لاؤ یہ رائفل مجھے دیدو۔ “ میں نے سرگوشی کی۔

”نہیں بھائی جان، اسے میرے پاس رہنے دیں۔ “ اس نے فوراً جواب دیا اس کے انداز میں بڑی پختگی تھی جس پر مجھے حیرت ہوئی تھی بیرک کے باہر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی ہم بیرک کی دیوار سے لگے آگے بڑھنے لگے۔ سرچ ٹاور پر سنتری مستعد تھے۔ سرچ لائٹ گھوم رہی تھی کئی بار ہم اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ ایک جگہ دیوار تعمیر ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بات یاد آ گئی اور میں نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ میں نے تقدیر ہی کا سہارا لیا تھا اگر محمود کو نہ دیکھتا تو شاید فرار کا تصور بھی نہ کر پاتا لیکن اب صرف میری ایک ہی آرزو تھی محمود کو لے کر جیل سے نکل جاؤں صحیح معنوں میں تو میں نے اب جرم کیا تھا یعنی دو سنتریوں کو

زخمی کر کے اور یہ جرم اپنے بھائی کی محبت میں کیا تھا ورنہ ایسا کبھی نہ کرتا ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب بھی ایک سنتری کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی مگر وہ سو گیا تھا ہم نے اسے دیکھ لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی فیصلہ کروں محمود نے عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے سوتے ہوئے سنتری کو دبوچ لیا تھا کچھ دھینگا مشتی ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ محمود نے دوسرے سنتری کی رائفل مجھے دے کر کہا۔

”اسے سنبھا لیئے بھائی جان! “ میں نے رائفل پکڑ لی۔ بس کچھ تقدیر ہی کا فیصلہ تھا کہ ہم اس ٹوٹی دیوار کے سہارے باہر نکل آئے حالانکہ یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ لیکن وقت ہماری مدد کر رہا تھا جیل سے باہر آ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تاحد نگاہ گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دور تک ہمیں بہت محتاط ہو کر دوڑنا پڑا اور جب جیل کے ٹاور کی روشنی غائب ہو گئی تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا اب آبادی کی روشنیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔

میں نے محمود کو آواز دی تو وہ رک گیا۔ ”تھک گئے بھائی جان .... “

”بالکل نہیں۔ مگر شہر میں داخل ہونا خطرناک ہوگا ہمارے جسم پر قیدیوں کا لباس ہے۔ “

”شہر میں تو داخل ہونا پڑے گا۔ وہیں کچھ بندوبست ہو سکتا ہے۔ “ محمود نے کہا اور پھر بولا۔ ”آیئے دیکھتے ہیں۔ “ میں آگے بڑھ گیا وہ مجھ سے کہیں زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا رائفل اس نے اس طرح سنبھالی ہوئی تھی جیسے ضرورت پڑنے پر اسے بے دریغ استعمال کرے گا۔ اس کی نگاہیں دور دور تک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہم شہر میں داخل ہو گئے اور تاریک راستوں کا سہارا لیتے ہوئے بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جسے رہائشی علاقہ کہا جا سکتا تھا۔ ایک بنگلے کے سامنے محمود رک گیا اس نے چاروں طرف کا جائزہ لے کر کہا۔

”آپ یہاں رکیں بھائی جان ہوشیار رہیں اول تو میں کسی ہنگامے کا موقع نہیں دوں گا مگر کچھ دیر ہو جائے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کرنا مناسب ہوگا۔ “

”مگر محمود ....؟ “

”صرف لباس کے حصول کی کوشش کروں گا اور کچھ نہیں آپ فکر نہ کریں۔ “ میں بنگلے کے سامنے ایک درخت کے پاس پہنچ گیا تاریکی کے باوجود محمود کی حرکات کا جائزہ لے سکتا تھا اس کے ہر کام میں بڑی مہارت کا احساس ہوتا تھا اس مختصر وقت میں اسے سب کچھ کیسے آ گیا۔ ؟ وہ بنگلے میں داخل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے گردن اٹھا کر درخت کو دیکھا اس کی پھیلی ہوئی شاخوں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا وہاں سے میں بنگلے کے احاطے کے اندر دیکھ سکتا تھا چنانچہ میں فوراً درخت پر چڑھ گیا بنگلہ اندر سے تاریک تھا مجھے کچھ نظر نہ آ سکا اور میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ رہا تھا پھر میرے کانوں میں کچھ مدہم مدہم چیخوں کی آوازیں ابھریں اور میں نے رائفل سنبھال لی لیکن چیخیں دوبارہ نہ سنائی دی تھیں۔ کوئی دو منٹ کے بعد بنگلے میں کچھ روشنی نظر آئی یہ روشنی کسی کھڑکی کے شیشوں سے جھلکی تھی۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ جان آنکھوں میں سمٹی آ رہی تھی۔ بدن پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی نہ جانے اندر کیا ہو رہا ہے نہ جانے محمود ....

وقت کس طرح گزرا کوئی احساس نہ ہو سکا مجھ پر لرزہ طاری رہا۔ پھر میں نے ایک سایہ بنگلے سے بر آمد ہوتے دیکھا۔ کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ باقاعدہ گیٹ کھول کر باہر آیا اور میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ محمود ہی تھا مگر شلوار قمیض میں ملبوس اب اس کے ہاتھ میں رائفل کے بجائے ایک سوٹ کیس تھا۔ سنبھالے وہ باہر آیا۔ اور پریشانی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں پھرتی سے درخت سے نیچے کود آیا تھا۔ مجھ نے مجھے دیکھ لیا اور تیزی سے میرے قریب آ گیا۔ اس نے بغل سے ایک بنڈل نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”درخت کی آڑ میں جا کر لباس تبدیل کر لیں یہ آپ کے بالکل درست ہو گا۔“

”اوہ کیا بنگلے کے مکین۔“

”نہیں ان کا خطرہ نہیں ہے۔“ باتوں کا وقت نہیں تھا میں نے فوراً لباس تبدیل کر لیا۔ اس دوران محمود نے سوٹ کیس سے پشاوری چپل نکال لی تھیں۔ ”انہیں پہن کر دیکھئے خدا کرے یہ آپ کے پیروں میں آ جائیں بس کام چل جائے بعد میں بندوبست ہو جائے گا۔“ میں نے چپلیں پہنیں بالکل ٹھیک آ گئی تھیں۔ محمود ہنس پڑا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے وہاں ہمارے ہی دو بھائی اور موجود ہیں ان کے جسم اور پاؤں ہمارے جیسے ہیں۔“

”تمہیں چوری کرنی پڑی ہے محمود۔ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا۔“

”بالکل نہیں۔ البتہ رقم دیتے ہوئے وہ بہت کسمسائے تھے۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ اخراجات کے لئے رقم تو چاہئے ہی تھی۔“ محمود نے کہا اور میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ریل کا سفر کیا پھر ایک جانے پہچانے اسٹیشن پر اتر گئے۔ یہاں ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا غسل اور پھر کھانا پینا۔ میں محمود کے تمام حالات معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے کہا۔ ”محمود .... بیٹے مجھے اب تمام واقعات تو بتاؤ۔ کیا گزری۔ حالات کیسے رہے وہ سب لوگ۔“ میں اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا۔ میری آواز بھرّا گئی تھی۔

”ٹھیک ہے اس وقت سے شروع کرتا ہوں جب آپ گرفتار ہو گئے تھے۔ سب پریشان تھے میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا ہماری صرف ایک آرزو تھی آپ کی زندگی بچ جائے ابو کا فیصلہ تھا کہ اپنے تن کے کپڑے تک فروخت کر دیں گے۔ آپ کی زندگی بچانے کے لئے۔ پاس پڑوس کے لوگ ہم سے نفرت کرنے لگے تھے وہ ہم پر آپ کا نام لے کر آوازے کستے تھے لیکن فیصلہ کر لیا گیا کہ کان بند کر لئے جائیں۔ ہم برا وقت ہے اس کے ٹلنے کا انتظار کیا جائے۔ چنانچہ ہم خاموش رہے۔ پھر وہ منحوس وقت آ گیا جب .... محمود خاموش ہو گیا۔ ”ہم مرجھا گئے تھے ہم زندگی سے دور چلے گئے تھے میں ان لمحات کے بارے میں اس سے زیادہ آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ کی جدائی کا وقت آ گیا ہم آپ کی لاش لینے پہنچے مگر ہم سے کہا گیا کہ لاش ابھی نہیں دی جا سکتی۔ خاصی بھاگ دوڑ کی ہم نے مگر وہاں کچھ عجیب انداز تھا۔ ماموں ریاض نے تو اسی وقت کہا تھا کہ کچھ ہو گیا ہے کہ کوئی ایسی ان ہونی ہوئی جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ امی تو سجدے میں چلی گئی تھیں۔ رات کو تین بجے تصدیق ہو گئی۔ پولیس نے چاروں طرف سے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ تب بڑے بڑے پولیس افسر اندر داخل ہوئے۔ چپے چپے کی تلاشی لی گئی۔ بہت منت سماجت کرنے پر ایک بڑے افسر نے بتایا کہ آپ کو پھانسی نہیں دی جا سکی عین وقت پر آپ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم لوگ ایک بار پھر زندہ ہو گئے تھے مگر اب نئی مصیبت کا آغاز ہو گیا تھا پولیس ہمارے ملنے جلنے کی بھی نگرانی کرتی تھی۔ کوئی کہیں جاتا اس کا پیچھا کیا جاتا۔ تقریباً ایک درجن چھاپے پڑے ہمارے گھر۔ آپ کو شکور خان یاد ہو گا۔“

”ہاں۔“

”وہ دکاندار لطیف کا بیٹا“۔

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”غنڈہ سمجھتا تھا اپنے آپ کو۔ اکثر آوازیں کستا رہتا تھا اس دن ماموں ریاض بازار گئے تھے۔ اس نے ماموں ریاض پر آواز کسی۔ تو وہ رک گئے انہوں نے نرمی ہی سے کہا تھا کہ بھائی کسی پر برا وقت آ جائے تو اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ لطیف خان بھی بول پڑا۔ نہ جانے کیا کیا کہا ماموں سے۔ وہ گھر واپس آئے ہاکی لے کر گئے اور لطیف خان کا سر کھول دیا۔ میں ماموں کے پیچھے دوڑا تھا۔ لطیف خان تو زخمی ہو گیا مگر شکور نے ماموں پر حملہ کر دیا پاس ہی سبزی فروش کھڑا تھا میں نے اس کے ٹھیلے سے چھری اٹھائی اور شکور کے سینے میں اتار دی بھگدڑ مچ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ صورتحال بگڑ گئی ہے میں نے ماموں کے کان میں کہا۔

”ماموں میں ڈاک بنگلے میں ملوں گا۔ موقع ملے تو مجھے صورتحال بتایئے۔“ اور اس کے بعد میں وہاں سے نکل لیا۔ پانچ دن میں ڈاک بنگلے میں چھپا رہا۔ چھٹی رات کو ماموں آ گئے۔ بڑی احتیاط سے آئے تھے اور کچھ خاص انتظامات کر کے آئے تھے۔ شکور مر گیا تھا ماموں گرفتار ہو گئے تھے مگر ان کی ضمانت ہو گئی تھی پولیس میری تلاش میں تھی۔ ماموں نے کہا ہم گھر چھوڑ رہے ہیں پہلے ناظم پور جائیں گے اس کے بعد کہیں اور جانے کا فیصلہ کریں گے۔ ایک مہینے کے بعد میں ناظم پور میں شفیق خالو کے ہاں ان سے مل لوں اور اس وقت بس سے نکل جاؤں وہ میرے لئے پیسوں وغیرہ کا انتظام کر کے آئے تھے۔ چند جوڑے کپڑے بھی لائے تھے چنانچہ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور بس میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا بس فرید پور جا رہی تھی مگر میں جیسے ہی فرید پور اترا پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ شاید فرید پور اطلاع دیدی گئی تھی اور میری تصویریں بھی بھیج دی گئی تھیں۔ پولیس کو چکمہ دے کر میں وہاں سے بھاگا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ریل میں بیٹھ گیا۔ ریل میں مجھے چاند خان مل گئے۔“

”کون چاند خان!“

”کوئی شناسا نہیں تھے وہیں شناسائی ہوئی بہت اچھے انسان تھے پورا گروہ تھا ان کا۔“

”گروہ!“

”ہاں جیب تراشوں کا گروہ۔ انہیں مجھ پر شبہ ہو گیا مگر میں نے انہیں ایک جھوٹی کہانی سنا دی وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے اڈے پر میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس محبت سے پیش آئے وہ میرے ساتھ کہ پھر میں ان سے جھوٹ نہ بول سکا اور میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ وہ پولیس اسٹیشن گئے وہاں میری تصویر موجود تھی۔ چاند خان نے مجھے وہاں سے ہٹا کر ایک خفیہ جگہ رکھا اور پھر وہ میری تربیت کرنے لگے۔“

”تربیت“۔ میں نے پھر درمیان میں دخل دیا۔

”ہاں انہوں نے مجھے چاقو چلانا سکھایا، جیب تراشی سکھائی، پستول اور رائفل کا استعمال اور نشانہ بازی۔ زندگی بچانے کے سارے گر سکھائے انہوں نے مجھے، تاکہ کہیں پھنس جاؤں تو اپنا بچاؤ کر سکوں۔ اس دوران وہ میرے لئے کچھ اور بندوبست بھی کر رہے تھے۔ کسی خاص جہاز کے کپتان سے ان کی دوستی

تھی وہ اس کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ مجھے جہاز سے نکال دیں۔ سنا ہے بحری جہاز پر خفیہ نوکریاں بھی مل جاتی ہیں۔ مجھے چاند خان کے ساتھ کئی ماہ گزر گئے تھے۔ وعدے کے مطابق میں ناظم پور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال ستاتا تھا اور میں نے چاند خان سے اجازت لے ہی لی۔

"کیسی اجازت؟" میں نے پوچھا۔

"ناظم پور جانے کی۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار ان سے کہا تھا لیکن انہوں نے کہا تھا حالات سازگار نہیں ہیں ابھی جانا بہتر نہیں رہے گا وہ لوگ ابھی ناظم پور نہ بھی گئے تو جہاں جائیں گے اس کے بارے میں بتا جائیں گے چنانچہ میں جلد بازی نہ کروں پولیس سرگرم ہے۔ بالآخر چاند خان نے اجازت دیدی اور اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا۔ ہم چھپتے چھپاتے ناظم پور پہنچے۔ میں نے شفیق خالو کے مکان کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ شفیق خالو نظر آئے مجھے دیکھ کر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ میرا گریبان پکڑ لیا۔

"بدمعاش، آوارہ خونی تجھے میرے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی۔" آپ کو معلوم ہے بھائی جان، میں نے ہمیشہ خالو کی عزت کی وہ مجھ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتے رہے تھے میں حیران رہ گیا۔ فوراً نکل جا یہاں سے ورنہ پولیس کو بلا لوں گا۔" خالو جان بولے۔

"خالو جان، میں ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔"

"الٹے قدموں نکل جا ورنہ۔"

"کیا امی ابو اور دوسرے لوگ یہاں آئے تھے؟" میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا تو یہاں سے دفعان ہو جا۔"

"مجھے صرف ان لوگوں کے بارے میں بتا دیجئے۔ کیا وہ یہاں ہیں؟"

"دارالامان ہے نا یہ تو۔ تمہارے باپ کی جاگیر ہے۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔"

"کہاں گئے ہیں وہ کچھ بتا کر گئے ہیں"۔

"جہنم میں گئے۔ چلو نکلو یہاں سے۔" خالو مجھے دھکے دینے لگے۔ سر گھوما تھا بھائی جان لیکن خود پر قابو رکھا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت خالو جان خالہ سے بھی نہ ملنے دیں گے چنانچہ وہاں سے واپس نکل آیا لیکن اسی رات گھر کی ایک کھڑکی سے اندر داخل ہو کر خالہ جان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر زار و قطار روئیں، خالو دوستوں میں گئے ہوئے تھے تب انہوں نے اپنی بپتا سنائی۔"

"کیا؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"خالو جان ویسے ہی تنک مزاج انسان ہیں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور پھر ابو سے ان کی کبھی نہیں بنی واقعات کی کچھ بھنک انہیں بھی مل گئی تھی مگر جب یہ لوگ ان کے پاس پہنچے تو وہ ہمدردی سے پیش نہیں آئے۔ البتہ انہوں نے اسی وقت کہہ دیا کہ وہ انہیں پناہ نہ دے سکیں گے۔ اور یہ لوگ جلد یہاں سے چلے جائیں کیونکہ اس طرح وہ خطرے میں پڑ سکتے ہیں مگر پولیس تاک میں تھی، خالو کے ہاں چھاپہ پڑا پولیس نے انہیں بھی پکڑ لیا تین دن تک لاک اپ میں رہے شاید پولیس نے ان سے بھی ہمارے بارے میں پوچھا تھا دس ہزار روپے دیکر جان چھڑائی اور امی وغیرہ کو گھر سے نکال دیا یہ تھی خالو شفیق کی کہانی۔

"خالہ نے کچھ بتایا کہ امی ابو کہاں گئے۔" میں نے پوچھا۔

"انہیں یہ پتہ نہیں تھا۔ کچھ موقع ہی نہیں ملا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"بس بھائی جان خالو شفیق نے کچھ زیادہ ہی زیادتی کر ڈالی۔ جب میں خالہ کے پاس تھا تو انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں اندر ہوں پولیس کو اطلاع دیکر انہوں نے مجھے گرفتار کرا دیا۔"

"اوہ۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

"کھاتہ کھول لیا ہے انہوں نے اپنا بھائی جان قرض تو وصول کرنا ہے ان سے۔" محمود نے سرد لہجے میں کہا۔

"اوہ نہیں محمود، نہیں بیٹے۔ ذہن ٹھنڈا رکھو۔ ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے ہاں چاند خان کے اس آدمی کا کیا ہوا جو تمہارے ساتھ تھا!"

"ظاہر ہے اسے بھاگ جانا تھا ورنہ چاند خان پر پورا کیس بن جاتا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں پیش کیا گیا۔ بہت سی باتیں پوچھی گئیں اور ابھی میرا کیس چل رہا ہے مجھے ریمانڈ پر جیل بھیجا گیا تھا۔"

"چاند خان کس قسم کے آدمی ہیں رواداری میں تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے یا خلوص دل سے؟"

"انہوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا بھائی جان، وہ بالکل بے لوث تھا۔ بے غرض تھا اور پھر خاصا وقت صرف کیا انہوں نے مجھ پر، بعد میں بھی میرے ساتھ مخلص رہے، میرے خیال میں اچھے آدمی ہیں، بلکہ اچھے انسان ہیں، آپ آگے کہیں۔"

"تو پھر تمہیں چاند خان کے پاس واپس جانا ہو گا، ہو سکتا ہے تقدیر ہمارا ساتھ دے جائے، اگر چاند خان تمہیں ملک باہر سے نکال سکتے ہیں تو اس وقت اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو گی، کم از کم تم اس جال سے بچ کر نکل جاؤ، بعد میں جو کچھ ہو گا میں دیکھ لوں گا۔" محمود کا چہرہ ایک دم ست گیا، وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"آپ کا حکم نہ ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بھائی جان آپ مجھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے لئے بھی کہیں گے، خدا کی قسم لگا دوں گا۔ لیکن کچھ بات تو کرنے کی اجازت دیں............"

"کیا............"

"آپ کے خیال میں ان حالات میں اپنی جان بچا کر باہر نکل جانا ایک خوشگوار عمل ہو گا، کیا میں سکون پا سکوں گا، کیا مجھے یہ احساس نہ ہو گا کہ میں نے آپ سب کو چھوڑ کر خود غرضی کا ثبوت دیتے ہوئے صرف اپنی جان بچا لی ؟"

میں محمود کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ ایک جذباتی احساس ہے محمود، اور یہ ہمیں کچھ نہیں دے سکے گا۔ ہم الگ الگ رہ کر اگر زندگی پا سکتے ہیں تو اس میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہئے۔ پہلے تم اپنے طور پر باہر نکل جاؤ۔ میں اس دوران امی اور ابو کو تلاش کروں گا اور جیسے ہی کوئی موقع ملا میں امی اور ابو کے ساتھ اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد بھی کروں گا۔ کم از کم ایک طرف سے تو مطمئن ہو جاؤں۔ ہاں اگر تم مصیبت کا شکار نہ ہوتے تو میں تم سے پوری پوری مدد لیتا لیکن بیٹے اگر پھنسے تو دونوں ہی پھنس جائیں گے اس طرح کم از کم ایک تو محفوظ ہو جائے تاکہ زیادہ ہمت سے کام کرنے کا موقع مل جائے۔" محمود سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور اگر آپ مصیبت میں گھر گئے تو............؟"

"میری صرف ایک بات سن لو محمود، میں کسی بھی مصیبت میں گھر جاؤں، ابھی مر بھی نہیں پاؤ کیونکہ جو پراسرار قوتیں مجھے اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں وہ میری موت نہیں زندگی چاہتی ہیں یہ سب ہو رہا ہے محمود، مجھے ایک مکروہ عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے اور میں وہ عمل کرنے کے لئے نہیں ہوں، پہلے میں ان ناپاک قوتوں کو شکست دوں گا اور اس کے بعد اپنا کام کروں گا۔" محمود والے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔

ہوٹل میں کافی وقت گزرا، کمروں میں محصور ہو گئے تھے۔ اخبار وغیرہ منگوا لیا کرتے تھے لیکن کسی اخبار میں ہم سے متعلق کوئی بھی خبر ہمیں نہ مل سکی۔ بالآخر جب کئی دن گزر گئے اور ہم نے اپنی تھکن اتار لی تو پھر تیاریاں کرنے لگے چاند خان دوسرے شہر میں رہتے تھے اور یہاں سے ہمیں وہاں تک سفر کرنا تھا۔ ہر طرح کا سفر ہی کیا چار دیواری سے باہر نکلنا بھی عذاب ہی تھا، کسی بھی وقت مصیبت نازل ہو سکتی تھی لیکن کیا کرتے، البتہ حلیہ صرف تبدیل کیا تھا۔ پٹھانوں جیسے لباس پہنے تھے ہم نے۔ بازار سے کچھ خریداری بھی کی تھی اپنے لئے جس سے کچھ حلیہ بدلنے میں مدد ملی تھی۔ اپنے جس قدر ممکن ہو سکتا تھا کیا اور اس کے بعد ٹرین میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ مطلوبہ جگہ پہنچنے کے بعد کے ساتھ چاند خان کے اڈے پر پہنچ گیا۔

بڑا سا مکان تھا، خاص قسم کا احاطہ اندر بہت سے لوگ تھے انہوں نے ہمیں اجنبی نگاہوں سے دیکھا لیکن پھر کسی نے محمود کو پہچان لیا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ لوگ محمود سے بڑی محبت کا کر رہے تھے۔ چاند خان اندر موجود تھے۔ اطلاع ملی تو باہر نکل آئے۔

میں نے چاند خان کو دیکھا، وہ چہرے ہی سے پروقار اور کسی اچھے گھرانے کے فرد معلوم ہوتے تھے محمود کو بڑے خلوص سے سینے سے لگایا اور پھر میری جانب دیکھا اور چونک کر بولے۔

"اوہو یہ مسعود ہیں، کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا۔"

"نہیں خان صاحب بھائی جان ہی ہیں۔" محمود بولا۔ چاند خان نے ہم دونوں کو بازوؤں میں لے لیا اور اندر داخل ہو گئے۔

"شیروں کی جوڑی ہے پنجرے میں کیسے رہ سکتی تھی۔" وہ بولے۔ اندر ایک سجے ہوئے کمرے میں ہم دونوں بٹھایا گیا اور چاند خان نے باہر رخ کر کے کہا۔

"چلو شہزادوں کے کھانے پینے کے لئے کچھ لے آؤ۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"ایک بات کہوں محمود یقین کر لینا میری بات پر، مجھے تمہاری واپسی کا یقین تھا۔ انتظار کر رہا تھا کام تھے، آنے جانے کے مگر تین مہینے کے لئے سارے کام ملتوی کر دیئے تھے سوچا تھا بس تم پر کام گا۔ مگر یہ خیال بھی تھا کہ شاید مجھے ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"وہ کیسے خان صاحب۔"

"بھئی تمہارے خالو نے غداری کی، پولیس سے مل کر تمہیں پکڑوا دیا میرے آدمی نے مجھے دی۔ کوئی طوفانی قدم تو نہیں اٹھا سکتا تھا، بس تیاریاں جاری رکھیں بات جب آخری حد میں آ جاتی ذریعہ نہ رہتا تو کچھ کرتے۔ خبر مل گئی کہ تم جیل سے بھاگ گئے۔"

"کیسے خان صاحب۔" محمود بولا۔

"تمہارا کیا خیال تھا تم پکڑے گئے اور ہم چپ ہو کر بیٹھ گئے دیکھو چندا تم حیات پور لے جائے گئے تھے تھانے میں رہے۔ پھر چار پیشیاں ہوئیں تمہاری۔ اس کے بعد نئی آبادی جیل میں گئے وہاں سترہ دن رہے اس کے بعد دوسری جیل گئے اور منگل کی رات کو وہاں سے نکل گئے۔ ایک سنتری مار دیا تم نے اور ایک زخمی کر دیا.........!" چاند خان نے کہا۔ نہ صرف میری بلکہ محمود کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

"آپ کو سب معلوم ہے خان صاحب!"

"معلوم رکھنا تھا بیٹے۔ ورنہ تم خطرے میں نہ پڑ جاتے موقع کی تاک میں تھے بس، مگر مسعود میاں کی خبر نہ تھی۔"

"یہ اطلاع آپ کو کہاں سے ملتی رہیں خان صاحب۔"

"میاں ہر جگہ آدمی رکھنے پڑتے ہیں اپنے۔" چاند خان بولے اتنی دیر میں چائے کے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں آ گئیں اور ہم نے بھی تکلف نہیں کیا مصروف ہو گئے۔ چاند خان مخلص انسان تھے۔ میں نے سب سے پہلا سوال ان سے یہی کیا۔

"آپ نے اسے باہر بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا خان صاحب۔"

"ہاں اور لیگون ہارڈو آیا ہوا ہے نو تاریخ کو واپس جا رہا ہے۔"

"لیگون ہارڈو؟"

"جہاز کا نام ہے یونانی کمپنی کا ہے کپتان ہمارا دوست ہے۔"

"کیا محمود کو یہاں سے نکالا جا سکتا ہے؟"

"امید تو ہے۔"

"تو خان صاحب یہ کام کر دیجئے، یہ ہمارے خاندان پر احسان ہو گا مجھ پر احسان ہو گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ خان صاحب کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

"تمہارے لئے بھی بات کروں مسعود میاں۔"

"نہیں خان صاحب، بس آپ اسے نکال دیں۔ یہی کافی ہے۔"

"دیکھو میاں۔ اس وقت موقع اچھا ہے۔ ذرا اوپر نیچے کر لیں گے ہم اپنے دوست کو۔ باقی کام بعد میں دیکھے جائیں گے ہمیں اندازہ ہے کہ تم اپنے ماں باپ کی وجہ سے یہاں سے نہیں جانا چاہتے ہو یہ ذمہ داری ہمیں سونپ دو ہم ان کا خیال رکھیں گے وعدہ کرتے ہیں تم سے۔"

"اس بے لوث محبت کا ہم کوئی جواب نہیں دے سکیں گے خان صاحب۔ ہاں دعائیں ضرور دیں گے آپ کو، ابھی صرف محمود کو یہاں سے نکال دیں میں یہ ملک نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے ممنونیت سے کہا۔ اور خان صاحب کچھ سوچنے لگے پھر بولے۔

"خود ملنا پڑے گا کپتان سے کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔ کیوں بھئی محمود تیار ہو؟"

"ہاں خان صاحب بھائی جان کا یہی کہنا ہے۔"

"کل صبح نکل چلیں گے۔ تیار رہنا اللہ بڑا کارساز ہے امید تو ہے کہ کام ہو جائے گا مسعود میاں یہاں

رکنا، بھاگ مت جانا یہاں سے۔"

"جو حکم خان صاحب۔" میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"اب ہم زیادہ نہیں بیٹھیں گے تمہارے پاس۔ کام فوراً شروع کر دینا ہے تم دونوں بھائی کرو۔" خان صاحب اٹھ گئے۔۔ ہم دونوں وہیں رہ گئے تھے۔ میں نے کہا۔

"کونسی دعا دوں خان صاحب کو محمود اگر یہ کام ہو جائے تو عرصۂ دراز کے بعد مجھے ایک خوشی نصیب ہوگی۔"

"مگر آپ کو تنہا چھوڑ کر مجھے خوشی نہ ہوگی بھائی جان۔" محمود بولا۔ اور میں نے اسے لپٹا لیا۔

"مجبوری ہے محمود بیٹے۔ مجبوری ہے مگر وقت کے فیصلوں کا انتظار کرنا ہوگا ہو سکتا ہے ہماری دنیا سے آباد ہو جائے ہو سکتا ہے میں اگر آزاد رہا تو چاند خان سے رابطہ قائم کرتا رہوں گا تم جہاں کہیں بھی کسی فرضی نام سے یہاں اپنی خیریت بھیجتے رہنا میں بھی چاند خان سے تمہارے بارے میں پوچھ لیا کروں اور یہیں سے تمہیں حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔"

دوسرے دن صبح صبح میں نے محمود اور چاند خان کو رخصت کر دیا اور محمود کے لئے دعائیں کرتا رہا۔ مجھے بڑی عزت دی گئی ہر شخص میرا خیال رکھتا تھا چاند خان کو گئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے میں انتظار کرتا رہا تاریخ کو وہ واپس پہنچے۔ تنہا تھے اور خوش نظر آ رہے تھے میرا چہرہ خوشی سے کھل گیا چاند خان نے کہا

"جہاز کو سمندر میں دھکیل کر ہی واپس آیا ہوں۔ مبارک ہو محمود نکل گیا۔" میری آنکھوں خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ محمود کی زندگی بھی موت سے ہم آغوش ہونے جا رہی تھی۔ اور اگر ایسا ہو میں یہی محسوس کرتا کہ میں اس کا قاتل ہوں۔ لیکن خدا کا احسان ہوا تھا مجھ پر۔ میرے بھائی کی زندگی گئی تھی۔ چاند خان نے مجھ سے کہا۔ "اور اب مسعود میاں ذرا تم سے تفصیل سے باتیں ہوں گی سے مجھے جو حالات معلوم ہوئے ان سے میری تسلی نہیں ہو پائی تھی، مگر چونکہ بچہ مصیبت کا شکار ہو اور مجھے اس کی زندگی کا خطرہ تھا۔ اس لئے مجھ سے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ اب ذرا تم سے اطمینان سے باتیں کرنی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کوئی ایسی مصروفیت تو نہیں تمہاری جو میری وجہ سے رک جائے..........."

"نہیں خان صاحب، میری مصروفیت ہی کیا ہے، محمود سے مل کر ماں باپ کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں۔ چھوٹی بہن بھی ہے میری، ماموں بھی ہیں۔ جو بھائیوں کی طرح ہیں مگر اب نجانے کہاں گم ہو گئے ہیں؟"

"ویسے تمہارے خالو نے بڑی زیادتی کی۔ ذرا بھی رشتے داری نہیں نبھائی۔ مانتا ہوں کہ حالات تھے مگر رشتے دار ہی تو کام آتے ہیں کسی سے کیا شکایت، جو کچھ ان سے بن پڑا وہ انہوں نے کر دیا۔"

"ہاں خان صاحب، بس ہم گردش کا شکار تھے۔ بلکہ ہیں اور جب گردش کا شکار ہوتے مصیبت آتی ہے انسان پر تو لوگ کہتے ہیں کہ سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے مگر آپ کے پاس آ کر اس جھٹلانا پڑتا ہے۔"

"دیکھو میاں ہم اپنی تعریفیں نہیں سننا چاہتے گناہ گار بندے ہیں، برے لوگوں میں شمار ہو اگر ایک آدھ کام غلطی سے اچھا ہو جائے تو تم کیا سمجھتے ہو، ہمیں خوشی نہیں ہوتی اس کی۔ مگر یہ معاملہ تھا، یہ بتاؤ؟"

"بتا دوں گا خان صاحب، اطمینان سے بتا دوں گا آپ بھی تھکے ہوئے ہیں آرا

"ہاں ہاں ٹھیک ہے، ذرا تم سے لمبی نشست رہے گی ساری تفصیل پوچھیں گے اور بالکل پروا مت کرو۔ اکیلے نہیں ہو تم ہم تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔"

یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے تھے، حالانکہ دل کے گوشوں میں چور تھا۔ کم بخت لعنتی بھوریا چرن مکمل طور سے غائب تھا لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا وہ بھی ایک حقیقت تھی۔ میرا تعلق جس سے بھی قائم ہوتا، اس پر مصیبت نازل ہو جاتی تھی۔ چاند خان بے شک دوسری لائن کے آدمی تھے۔ لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہاں زیادہ وقت رک گیا تو چاند خان بھی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔ عارضی طور پر بے شک ان کے ساتھ رہا جا سکتا ہے، مستقل نہیں۔ بہرحال اسی رات چاند خان میرے پاس آ گئے۔ ساتھ ساتھ ہی بستر لگوا دیئے تھے انہوں نے............ اور تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد حقہ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور بولے............

"ہاں مسعود میاں مجھے تمہاری داستان سننے سے بڑی دلچسپی ہے۔"

"خان صاحب کچھ غلطیاں میری اپنی ہیں اور کچھ مصیبتیں نازل ہوئی ہیں مجھ پر۔" میں نے خان صاحب کو ابتداء سے حالات بتانا شروع کر دیئے۔ وہ حیرت و دلچسپی سے میری کہانی سن رہے تھے یہ کہانی سناتے ہوئے میرا دل لرز رہا تھا مجھے وہ لمحات یاد آ رہے تھے جب میں نے حکیم سعد اللہ صاحب کو یہ کہانی سنائی تھی۔ اور اس کے بعد سعد اللہ زندہ نہیں رہے تھے۔ بھوریا چرن کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ اس کی کہانی کسی کو سنائی جائے مگر اس وقت، اس وقت میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان چاند خان کو سنا دی ان کے چہرے پر سخت حیرت کے آثار تھے میں خاموش ہوا تو وہ بھی بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔

"بڑی دردناک کہانی ہے۔ بڑی بات ہے کہ تم نے اپنا ایمان قائم رکھا میں خود بہت برا انسان ہوں پوری عمر ہیرا پھیری میں گزاری ہے میں نے۔ مگر اتنی ہمت سے میں بھی کام نہ لے پاتا۔ تم نے ایک پاک بزرگ کے مزار پر ایک ناپاک وجود کو نہ پہنچا کر جو نیکی کی ہے میرا ایمان ہے کہ اس کے صلے سے محروم نہ رہو گے۔ یہ کالے جادو والے ایسے ٹونے ٹوٹکے کرتے رہتے ہیں اور اس طرح سے فائدے حاصل کرتے ہیں اس سے ملعون کو کوئی بڑا ہی فائدہ حاصل ہو گا ورنہ وہ اس طرح تمہارے پیچھے نہ پڑتا ویسے نہ تو تمہیں کسی نے مشورہ دیا ہو گا نہ ہی تمہیں اس کا موقع ملا ہو گا کہ اس سلسلے میں کچھ کرتے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کالے جادو کا توڑ بھی تو ہوتا ہے۔"

"مجھے ایسا موقع ہی نہیں ملا خان صاحب، نہ ہی میں نے اپنی یہ کہانی کسی کو سنائی وہ منحوس سادھو یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کی کہانی معلوم ہو۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے صاحب۔"

"میرا ایمان ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا یہی تمہیں بتانا چاہتا تھا یہ دیکھو۔" چاند خان صاحب نے اپنا سینہ کھول کر میرے سامنے کر دیا ان کی گردن میں چاندی کی موٹی زنجیر میں چاندی کا ایک تعویذ نظر آ رہا تھا۔ "سارے جادو اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساری دنیا کے جادو اس تعویذ کے سامنے بے اثر ہیں۔ بہت پرانی بات ہے مجھ پر بھی میرے دشمنوں نے جادو کر دیا تھا۔ کوڑھی ہو گیا تھا میں۔ تھا پاگل ہو چکا تھا لوگ مجھ سے گھن کھانے لگے تھے۔ پھر ایک مرد حق کی نگاہ مجھ پر پڑ

گئی۔ علیم الدین خان تھا ان کا نام، رتولی نامی جگہ ہے وہاں ایک پرانی مسجد ہے جس میں ایک نامعلو بزرگ کا مزار ہے وہ مجھے اس مزار پر لے گئے ایک مہینے تک مزار پر پڑا رہا تب ایک صبح فجر کے وقت قبر کتبے پر ایک تعویذ رکھا ملا۔ علیم الدین خان صاحب میرے ساتھ تھے خوش ہو کر بولے۔ ”لو میاں چا خان دلدر دور ہوگئے تمہارے۔ مشکل حل ہوگئی۔ یہ تعویذ گلے میں ڈال لو۔“

”کوڑھ ٹھیک ہوا دماغ درست ہوا اور اب اللہ کا فضل ہے مگر میں یہ تعویذ کسی کو دے نہیں سکتا۔ نہیں ہے تمہارے لئے یہ بیکار ہے ورنہ خدا کی قسم دل چاہتا ہے کہ تمہاری ہر مشکل حل کر دوں۔ مگر مت کرو میں تمہیں رتولی لے جاؤں گا۔ علیم الدین خان صاحب کی خدمت میں بھی بہت عرصہ حاضری نہیں دی ان سے ملاقات ہوجائے گی اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

”کیا خان صاحب میری مشکلات کا حل ہوگا!“ میں نے کہا۔

”فکر مت کرو! یہ کام ضرور ہوگا۔“ چاند خان نے کہا۔ میرے دل میں ایک نئی روشنی پیدا ہوگ تھی۔ چاند خان کے ساتھ دیر تک بات چیت کرتا رہا مجھے خود بھی یقین آگیا کہ چاند خان کیوں محفو رہے۔ منحوس بھوریا چرن اس تعویذ کی وجہ سے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا خاصی رات گئے خان صاحب آرا کرنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔ میں بیحد خوش تھا کہ نجانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آر تھے۔ میری نگاہیں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک چھت پر میں نے کچھ دیکھا سفید چونے سے پتی ہو چھت پر سیاہ دھبے رینگ رہے تھے ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ متحرک تھے میں چونک پڑا سیاہ دھ اتنے بڑے ہوگئے کہ پوری چھت ان میں چھپ گئی اور پھر وہ نیچے اترنے لگے۔ وہ .... وہ مکڑیا تھیں۔ مکروہ شکل کی منحوس مکڑیاں۔ جو لاکھوں کی تعداد میں تھیں اپنے جسم کے لیس دار مادے سے بناتی ہوئی وہ سب نیچے اتر رہی تھیں میری طرف۔ ان کا نشانہ میں ہی تھا..........!

میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔ مجھ پر ایسے ایسے مشکل وقت آئے تھے کہ اب کوئی مشکل مشکل نہیں لگتی تھی بلکہ ہر لمحہ کسی نئے حادثے کا منتظر رہتا تھا۔ حادثہ نہ ہوتا تو سوچتا تھا کہ اب کوئی زیادہ حادثہ ہوگا۔ اعصاب میں پختگی بھی پیدا ہوگئی تھی اور خوف ذرا کم ہوگیا تھا لیکن انسان تو تھا۔ میری ساخت میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خوف کے احساس کو ختم تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چاند خان کو بھو چرن کی کہانی سنا تو دی تھی لیکن دل اس احساس سے دھڑکتا رہا تھا کہ کہیں وہ کسی مشکل کا شکار ہوجائے۔ بلکہ مجھے حیرت تھی کہ اب تک ایسا کیوں نہیں ہوا تھا۔ ہاں چاند خان نے مجھے وہ متبرک تو دکھایا تھا اور میرے دل میں عقیدت پیدا ہوگئی تھی۔ آرزو بھی بیدار ہوگئی تھی کہ کاش اس مزار پر مجھے زندگی کی نوید مل جائے .... مگر .... یہ مکڑیاں۔ شاید بھوریا چرن نے مجھے کوئی نئی سزا دینے لئے انہیں بھیجا تھا۔

میں دہشت بھری نظروں سے انہیں دیکھتا رہا، جوں جوں وہ نیچے آرہی تھیں میرے دل و دماغ وحشت اترتی آرہی تھی۔ میں ان ننھی ننھی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ سرخ چمکتی ہوئی آنکھیں جو بھوریا کی آنکھیں تھیں، کوئی فرق نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ ان آنکھوں میں نفرت تھی غصہ تھا وہ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

مکڑیوں نے چھت سے رابطہ ختم کر دیا وہ کود کود کر زمین پر آگئیں۔ کیفیت یہ تھی کہ

زمین ان کے منحوس جسموں سے ڈھک گئی تھی۔ تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ یہی نہیں وہ دیواروں پر چڑھ گئی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر چڑھ گئی تھیں۔ پردوں پر نظر آرہی تھیں۔ ان کے ننھے ننھے منے منہ کھل رہے تھے بند ہو رہے تھے۔ پردوں میں سوراخ ہونے لگے۔ دروازے کی لکڑیاں بُرادے کی شکل میں بکھرنے لگیں۔ آہ وہ ہر شے کو کھا رہی تھیں۔ ہر چیز کو چاٹ رہی تھیں اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ میری آواز بند ہوگئی تھی۔ میرا بدن ساکت تھا ایک بار جی میں آئی کہ انہیں ماروں۔ بدن کو جنبش دی.......... لیکن جسم مجھ سے باغی ہوگیا۔ اپنے اعضاء پر میرا قابو نہ رہا۔ مجھے بس سانس لینے کی اجازت تھی سوچنے کی اجازت تھی. میں بدن نہیں ہلا سکتا تھا۔ تعو ہے چاند خان تو بھوریا چرن سے محفوظ تھا لیکن اس شیطان سادھو کو مجھ پر مکمل اختیار تھا۔ وہ چاہتا تو یہ مکڑیاں دیگر چیزوں کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑتیں۔ مجھے چاٹ جاتیں۔ میرے بدن میں سوراخ کر کے اندر داخل ہوجاتیں۔ میں انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ بھوریا چرن یہ کام کسی بھی وقت کسی بھی شکل میں کر سکتا تھا مگر اسے میری ضرورت تھی۔ وہ مجھے کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچنے دیتا تھا۔ منظر بیحد بھیانک ہوچکا تھا خونی مکڑیاں دروازے. کھڑکیوں کے فریم کھا چکی تھیں۔ پردے چٹ کر چکی تھیں۔ ڈیکوریشن کے لئے جو کچھ رکھا تھا وہ کھا چکی تھیں۔ دیواروں کا رنگ نگل چکی تھیں۔ یہ کام انہوں نے چند منٹ میں کر ڈالا تھا اور مجھے اپنی مسہری نیچے ڈھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ آہ وہ اسے کھا رہی تھیں یہاں تک کہ میں فرش نشین ہوگیا۔ میرے پلنگ کا بستر. گدا. تکیہ سب ان منحوس مکڑیوں کے پیٹوں میں جا چکا تھا اور اب وہ میرے بدن پر رینگ رہی تھیں۔ مجھے ان کی سرسراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ میرے پورے جسم پر چھا گئی تھیں۔ میری ناک. میرے منہ. میری پلکوں سے گزر رہی تھیں۔ آہ میں چیخ نہیں سکتا تھا۔ میں انہیں خود پر سے جھٹک نہیں سکتا تھا۔ میں بےبس تھا مفلوج تھا۔ دہشت سے میرا وجود اینٹھ رہا تھا مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دماغی قوتیں اس سے زیادہ ساتھ کیا دے سکتی ہیں۔ میں پے در پے پیش آنے والے ناقابل یقین واقعات سے دوچار ہو کر کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہوگیا تھا لیکن یہ دہشت ناک منظر میرے حواس چھیننے میں کامیاب ہوگیا اور بالآخر خوف کی انتہا نے مجھے اس کربناک ہوش سے نجات دلا دی۔ بےہوشی ہوش سے بدرجہا بہتر تھی۔ پھر نہ جانے کب سماعت نے ذہن کے پردوں پر دستک دی۔ ہوش واپس آنے لگے۔ پلکوں کے پپوٹوں نے روشنی کا احساس دلایا۔ آوازیں الفاظ بن کر سمجھ میں آنے لگیں۔

”ہوش آنے ہی والا ہے۔“ یہ اجنبی آواز تھی۔

”بہت بہت شکریہ حکیم صاحب۔“

”نسخہ مطب سے منگوا لینا۔ ترکیب استعمال لکھی ہوگی۔“

”بہت بہتر..........“ دوسری آواز چاند خان کے علاوہ کسی کی نہیں تھی۔ جی چاہا کہ آنکھیں کھولوں لیکن ایک نشے کی سی کیفیت تھی۔ آنکھیں بند رکھنے میں زیادہ لطف آرہا تھا۔ مگر بات سمجھ میں آرہی تھی۔ صبح ہوچکی تھی اور میری کیفیت کا حال دوسروں کو معلوم ہوچکا تھا۔ چاند خان شاید حکیم صاحب کو باہر چھوڑنے گئے تھے۔ یہ شخص بہت اچھا انسان ہے۔ اس دور میں بےلوث اتنی مدد کون کرتا ہے حالانکہ مجھے کچھ اچھے لوگ ملے تھے۔ ریحانہ بیگم اور سرفراز نے مقدور بھر میرے لئے کیا تھا۔ وہ بیچارے اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے۔ پھر بھی ان کا کیا بہت کچھ تھا مگر ان کے اس کرنے کا جواز تھا۔ وہ میری شرافت سے

متاثر ہوئے تھے۔ جس کے تحت ان کا گھرانہ ایک الیے سے بچ گیا تھا۔ مگر یہ بھی ان کی نیک دلی تھی ور
اس دور میں لوگ کسی کا احسان بھی کہاں یاد رکھتے ہیں۔ وقتی اعتراف اور اس کے بعد اجتناب کون کس
کے جنجال میں پھنسے۔ چاند خان واپس آگئے۔ رات کے بھیانک واقعات یاد آگئے تھے۔ پتہ نہیں
دوسرے لوگوں کو اس بارے میں کیا معلوم ہے اسی دوران چاند خان کی آواز سنائی دی۔

"چندا..... آنکھیں کھولو مسعود میاں۔" اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ "کیسی طبیعت ہے اب؟

"ٹھیک ہوں خان صاحب۔"

"چائے منگواؤں تمہارے لئے؟"

"منگوا لیجئے۔" میں نے کہا اور چاند خان خود ہی اٹھ کر باہر دوڑ گئے۔ خلوص کا وہی عالم نظر آ
تھا۔ پتہ نہیں رات کے واقعات ان لوگوں کے سامنے کس شکل میں آئے۔ چاند خان پھر میرے سامنے
آ بیٹھے۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میرے کمرے کا کیا حال ہے خان صاحب؟"

"اماں کیا ٹڈی دل گھس آیا تھا کمرے میں؟ کیا ہوا تھا؟ بچپن میں ایک بار ٹڈی دل دیکھا تھا۔ درخت
ننگے کر دیئے تھے۔ گھاس پھونس اور پودوں میں ڈنڈیاں رہ گئی تھیں۔ مگر یہ تو ٹڈی دل سے بھی بکت کی
چیز تھی۔ اللہ نے تمہیں بچا دیا۔ دروازے کھڑکیاں دیواروں کا چونا ہر چیز.......... سب کی عقل کھو
سے باہر ہو گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"آہ.......... گویا وہ صرف میرا خواب نہیں تھا؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"فضل خان صبح پانچ بجے اٹھنے کے عادی ہیں پورے گھر کا چکر لگانے کی عادت ہے پڑھ کر پھونکتے
ہیں تمہارے کمرے کے سامنے سے گزرے تو دروازہ ہی غائب دیکھا۔ ناچ کر رہ گئے اندر گھسے تو وا
نکل بھاگے اور پھر سب کو جگا دیا تمہارا کمرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی دو سو سال پرانا کھنڈر۔ تمہیں بے
میں اٹھا کر لایا گیا تھا۔ وہ کونسی چیز تھی جس نے یہ کیا۔"

"کچھ نشان تمہیں ملے خان صاحب۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"وہ مکڑیاں تھیں۔" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"مکڑیاں.........؟ خان صاحب حیرت سے بولے۔

"لاکھوں مکڑیاں جو چھت پر نمودار ہوئی تھیں اور پھر وہ نیچے اتر کر ہر چیز کھانے لگیں۔ بس انہوں
مجھے چھوڑ دیا۔"

"باہر کیوں نہ بھاگ آئے چندا۔"

"میں مفلوج ہو گیا تھا۔ آواز تک بند ہو گئی تھی"

"ہوں........" خان صاحب نے گہری سانس لی۔ چائے آگئی پورا ناشتہ تھا۔ خان صاحب بو

"ڈٹ کر ناشتہ کرو حکیم صاحب نے کسی چیز کا پرہیز نہیں بتایا۔ اس کے بعد دوا کھانی ہوگی۔"

"آپ جانتے ہیں خان صاحب مجھے دوا کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے افسردہ لہجے میں

"چلو چلو ناشتہ کرو۔ ارے لو بھئی کیا تکلف ہے۔"

"جی خان صاحب.........." میں نے کہا اور ناشتہ کرنے لگا خان صاحب خود بھی میرے ساتھ
مصروف ہو گئے تھے میں نے کہا۔ "کچھ کہنا چاہتا ہوں خان صاحب۔"

"ہاں کہو۔"

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں.........؟"

"کہیں بھی خان صاحب. جہاں خدا نے میرا ٹھکانہ بنایا ہوگا۔ آپ نے جو کچھ میرے لئے اور میرے
بھائی کے لئے کیا ہے اس کا صلہ میں مر کر بھی نہیں دے سکتا مگر میں اپنے محسن کی زندگی. صحت اور خیریت
کا خواہاں ہوں. میں نے بتایا تھا کہ حکیم سعد اللہ صرف اس لئے شکار ہوئے کہ.........."

"سمجھ گیا سمجھ گیا کیا کہنا چاہتے ہو۔ دو باتیں ہیں میاں مسعود. پہلی بات تو یہ ہے کہ چاند خان برا
دھندا کرتے ہیں مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ ہماری نسل بری نہیں تھی۔ رگوں میں کسی چمار کا خون نہیں ہے
باپ دادا آن بان پر مٹتے رہے ہیں کچھ تو سرخی ہمارے خون میں بھی ہوگی۔ وہ میاں کا جنا اگر اتنا ہی دلاور تھا
تو مکڑیاں ہمیں کھا جاتیں ہم بھی تو دیکھتے۔ اس سے یہ پتہ تو چل گیا کہ وہ ہمیں مالی نقصان پہنچا سکتا ہے جانی
نہیں۔ اور اس کی ہمیں پروا نہیں ہم نے کونسا محنت سے کمایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے چندا کہ ہمیں
تمہارا نہیں ان ماں باپ کا خیال ہے جو لٹ گئے ہیں ویران ہو گئے ہیں۔ راج دلارے انسان بڑا کمینہ
ہے۔ اسے جو کچھ مل جاتا ہے اسے وہ اپنی عقل کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ دینے والا جانتا ہے کہ وہ کسے کیا
اور کیوں دے رہا ہے۔ ہم نے تمہیں رتولی لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ ہمارے لئے بھی ضروری ہے
کیونکہ ہمارے ذریعے کسی کی بہتری ہونے والی ہے اگر ہم نے اس سے منہ موڑا تو ہمارا کیا بنے گا۔ یہ اللہ
جانے جو ہوا بھول جاؤ۔ ہم تو یہ تعویذ تمہارے گلے میں ڈال دیتے مگر منادی ہے اس لئے مجبور ہیں۔"

"خان صاحب میں.........."

"جو بات تھی تمہیں بتا دی دلارے۔ ہماری حیثیت گھٹانا چاہو تو دوسری بات ہے۔"

"نہیں خان صاحب۔ خدا نہ کرے۔"

"اور ہاں سنو. اب زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ پرسوں اٹھارہ ہے بس پرسوں نکل چلیں گے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ کون کم بخت یہ نہیں چاہتا تھا زندگی حرام شے بن کر رہ گئی تھی اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا
ماں باپ بچھڑ گئے تھے۔ بھائی نامعلوم راستوں پر نکل گیا۔ پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ ملاقات ہو کہ نہ ہو. ابا
اور اماں کا کیا حال ہوگا ان کے دونوں بیٹے ان سے چھن گئے تھے ماموں ریاض کے بارے میں یقین تھا کہ
وہ انہیں سنبھال لیں گے وہ نہ ہوتے تو باپ کی کمر تو ٹوٹ ہی گئی تھی۔

خان صاحب دن بھر مصروف رہے تھے۔ مجھے حکیم صاحب کی دی ہوئی دوائیں کھانی پڑی تھیں۔
رات کو خان صاحب واپس آ کر بولے۔ "کل روانگی ہے مسعود میاں"۔

"کل؟"

"ہاں کچھ کام تھے جن کی وجہ سے پرسوں کا ارادہ کیا تھا۔ وہ آج ہی ہو گئے اس لئے اب کل چلتے

ہیں۔ اللہ کرے علیم الدین میاں جیتے ہوں بڑے اچھے انسان ہیں پہلے ان کے پاس چلیں گے پھر ان کے ساتھ مزار پر چلیں گے تم دیکھ لینا ساری مشکلیں آسان ہوجائیں گی"

"جو حکم خان صاحب۔"

رات کو خان صاحب نے کہا۔ "میرے پاس سونا ہے تمہیں۔ دوسرے کمرے میں نہیں سونے دوں گا۔" دل کے انتہائی گوشوں سے خان صاحب کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بڑی پر سکون رات گزری، دل کو بڑی تقویت اور سکون رہا تھا۔ صبح بیحد خوشگوار تھی۔ خان صاحب نے آدمی بھیج کر ریل کے ٹکٹ منگوائے تھے اب میں صرف ان کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ تیاریاں ہی کیا کرنی تھیں۔ دو جوڑے کپڑے خان صاحب کے سوٹ کیس میں رکھے اور دوپہر کو ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے سوچ کے دروازے بند کر لئے تھے۔ اب صرف ایک ہی لگن تھی کسی طرح اس بزرگ ہستی کے حضور پہنچ جاؤں جس کے فیض سے میری مشکل حل ہوجائے۔ انتظار کرتے رہے۔ خان صاحب معمولی آدمی نہ تھے جو سامنے سے گزرتا سلام کرتا گزرتا۔ ریل آگئی ہمیں بڑے احترام سے ریل میں بٹھایا گیا۔ خان صاحب پان کھانے کے عادی تھے۔ ریل چل پڑی تو پانوں کی ڈبیہ اور بٹوا نکال لیا۔ مسکرا کر بولے۔ "لو چندا پان کھاؤ۔"

"خان صاحب میں پان نہیں کھاتا۔"

"اماں کھالو۔ عید بقرعید پر تو سب کھالیا کرتے ہیں۔ اور سنو ہنسو مسکراؤ بری گھڑی گھڑیوں کی مہمان رہ گئی ہے ایک وقت آئے گا کہ ان واقعات کو یاد کر کے ہنسا کرو گے مگر چاند خان کو مت بھول جانا اس وقت"۔ میں سسک پڑا اور خان صاحب نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا.......... "نا.......... نا چندا.......... نا.......... مرد کی آنکھوں سے آنسو نہیں شعلے نکلنے چاہئیں۔ نا چندا نا۔ دشمن بھی مردوں کے ہی ہوتے ہیں۔ مرد ہو، مردوں کی طرح حالات سے مقابلہ کرو۔ بری بات چندا بری بات۔" خان صاحب کے محبت بھرے لمس کو محسوس کر کے نہ جانے کیا کیا احساسات جاگ اٹھے تھے۔

سفر جاری رہا۔ رات ہوگئی۔ خان صاحب کھانا ساتھ لائے تھے۔ دسترخوان کھول کر بیٹھ گئے اصرار کر کے کھاتے اور کھلاتے رہے۔ رات کو بارہ بجے انہوں نے کہا۔

"اب پاؤں پھیلا کر سوجاؤ دلارے۔ ہم جاگ رہے ہیں۔"

"نہیں خان صاحب آپ سوجایئے۔"

"میاں عمر بھر سفر میں نیند نہیں آئی۔ آج کیا خاک آئے گی۔ تم سوجاؤ ہم کہہ رہے ہیں اور پھر جاگنا ضروری ہے ساڑھے چار بجے ریل منزل پر پہنچے گی تمہیں تو اندازہ بھی نہ ہوگا۔" انہوں نے ضد کر کے مجھے لٹا دیا۔ ٹرین کی ردھم خیالات کے ساتھ سفر کرتی رہی اور آنکھوں میں غنودگی گھل گئی تھوڑی دیر کے بعد سارے احساسات سوگئے۔ نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی سوتے ہوئے نہ جانے کیا وقت تھا کہ اچانک قیامت ظہور میں آگئی۔ اتنی تیز روشنی ہوئی کہ بینائی جاتی رہی کوئی آتش فشاں پھٹا تھا یا زلزلہ تھا کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ انسانی شور چاروں طرف سے ابھر رہا تھا۔ لوگ بھیانک آواز میں چیخ رہے تھے میرا چہرہ بھیگا بھیگا سا لگ رہا تھا۔ گہری نیند سے آنکھ کھل جانے کی وجہ سے سر دکھ رہا تھا۔ دوبارہ

سو جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ سب کچھ بھول کر سب کچھ نظر انداز کر کے میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر نہ جانے کب جاگا تھا۔ تیز روشنی ہوگئی تھی کھڑکیوں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ گرمی لگ رہی تھی پنکھا بند تھا۔ نہ جانے کیوں تبھی مجھے آواز سنائی دی۔

"رتنا او رتنا، کب تک سوتا رہے گا رے۔ دس بج رہے ہیں رتنا اٹھ جا بھئی"۔ نہ جانے کون تھا۔ نہ جانے کسے آواز دے رہا ہے۔ مگر پھر میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت خاتون اندر آگئیں۔ بھاری بھرکم معمر خاتون تھیں ساڑھی باندھے ہوئے تھیں ماتھے پر بندیا لگی ہوئی تھی عمر چالیس سے اوپر ہی تھی۔ "رتنا اٹھ جا بیٹا۔ دیکھ کتنا دن چڑھ چکا ہے اوہ پسینے میں بھیگ رہا ہے۔ نگوڑی ماری بتی دو گھنٹے سے گئی ہوئی ہے ان بجلی والوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ ارے تو اٹھے گا یا نہیں۔" خاتون نے میرے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اور میں دم بخود رہ گیا۔ "رتنا.......... میں" میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"پانی لاؤں ٹھنڈا چاچی۔ دو کٹورے بھر ڈال دو نیند ایسے بھاگے گی جیسے ماماجی کے سر سے سینگ۔" باہر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"رتنا اٹھ جا بیٹا۔ اتنی دیر سونا اچھا نہیں ہوتا۔" عورت نے پھر کہا اور میں جلدی سے اٹھ گیا۔ "جا منہ دھو لے میں مالتی سے ناشتہ بھجواتی ہوں۔ اب دوبارہ نہ لیٹ جائیو۔" معمر خاتون واپس مڑیں اور دروازے سے باہر نکل گئیں۔

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے کیا ہے یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں کہاں ہوں یہ کونسی جگہ ہے اور رتنا۔ یہ عورت مجھے رتنا کیوں کہہ رہی ہے کیسا عجیب انداز ہے اس کا۔ محبت سے بھرپور۔ ایسا جیسے مجھے عرصے سے جانتی ہو۔ کون ہے یہ۔ اور جگہ کونسی ہے۔ یا خدا یہ خواب ہے یا عالم بیداری۔ ابھی مسہری سے پاؤں لٹکائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ دروازے میں ایک جھری پیدا ہوئی اور ایک روشن چہرے نے اندر جھانکا۔ چمکتا ہوا سفید رنگ، بھورے بال، پرکشش نقوش، حسین آنکھیں جن میں شوخی تھی۔ پھر ہنسی سنائی دی اور وہ اندر آگئی۔ ہاتھ میں نقشین مراد آبادی کٹورہ تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

"رتن مہاراج صبح ہوگئی۔ یہ میری طرف سے۔" اس نے کٹورے کا پانی، میرے چہرے پر ڈال دیا اور میں اچھل پڑا۔ پانی یخ ٹھنڈا تھا اور میرا چہرہ اور سینہ بھگو گیا تھا۔ میں بھبھک کر مسہری سے نیچے آکھڑا ہوا۔ لڑکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی اور غڑاپ سے باہر نکل گئی۔

آہ۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے مگر اب.......... اب یہ کیا حقیقت ہے۔ کیا ہوگیا میرے معبود کیا ہوگیا ہے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے سوچا۔ یوں احمقوں کی طرح کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا باہر نکلوں کچھ اندازہ تو ہو۔ دروازے سے باہر نکل آیا۔ سامنے صحن تھا۔ باتھ روم کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ قدم اس طرف اٹھ گئے۔ میں اس پرانے طرز کے باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ دروازہ بند کیا کپڑے اتارے مگر کپڑے اتارتے ہوئے میں بری طرح اچھل پڑا۔ یہ میرے کپڑے نہیں تھے یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ سلک کا کرتا، لٹھے کا پائجامہ۔ آہ کیا ہوگیا مجھے۔ کیا ہوگیا ہے۔ میں نے پانی کا نل کھول دیا اس کے نیچے بیٹھ گیا۔ میری سوچ پرواز کرنے لگی۔ کب سویا تھا۔ کہاں سویا تھا کہ آنکھ یہاں کھلی۔ ذہن کے پردوں پر مٹے مٹے نقوش ابھرنے لگے۔ کانوں میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی

جو واضح ہوتی جارہی تھی۔ ریل کی آواز............ ریل............ چاند خان............ میاں کھالو چندا۔ عید بقر عید پر تو سب ہی............ سو جاؤ............ سو جاؤ............ چاند خان............ ارے ریل............ چاند خان رتولی............ رتولی............ وحشت زدہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پاگلوں کی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ پانی شانے پر گر رہا تھا۔

"کون ہے اندر؟" باہر سے آواز سنائی دی۔ اور میں دروازے کو دیکھنے لگا۔ "کون ہے اندر"۔ آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میں ہوں مالتی"۔ میرے منہ سے نکلا۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا تھا وہ............ وہ آہ کیا ہے یہ سب کچھ۔"

"نہا رہے ہو رتنا............" باہر سے پوچھا گیا۔

"ہاں!" گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"دروازہ باہر سے کیوں بند کرایا ہے"۔

"میں نے نہیں کرایا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"سمجھ گئی شیاما نے شرارت کی ہوگی۔ میں نے کھول دیا ہے۔" وہی آواز سنائی دی۔ مگر اس بار میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میرا دل میرا دماغ قابو میں نہیں تھا۔ اندر سے ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ پھر کچھ ہو گیا پھر کچھ ہو گیا۔ میں چاند خان کے ساتھ رتولی نہیں پہنچ سکا اور چاند خان۔ وہ نہ جانے کہاں گئے۔ میں ہوش میں ہوں اور نہ جانے کس طرح اس اجنبی جگہ آ گیا ہوں اجنبی جگہ۔ رتنا۔ کیا بے تکا نام ہے۔ آخر یہ لوگ مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہیں۔

"رتنا جی............" باہر سے پھر وہی آواز ابھری اور میں چونک پڑا مگر کچھ بولا نہیں............ "رتنا جی............ کتنی دیر میں باہر آؤ گے۔" بڑی زور سے غصہ آیا تھا مگر............ کیا مجھے غصہ آنا چاہئے۔ کیا میں اس پوزیشن میں ہوں۔

"آ رہا ہوں بس............"

"ہم نے ناشتہ لگا دیا ہے۔" باہر سے آواز ابھری اور میں گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ کوئی پاگل ہے۔ کچھ نہ سوچنے دے گی۔ نکلا جائے مگر دماغ ٹھنڈا رکھنا ہوگا۔ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ کیسے ہوا ہے۔ نل بند کر دیا لباس پہنا بال سنوارے اور باہر نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں اس کمرے میں نہیں گیا جہاں خود کو سوتے ہوئے پایا تھا بلکہ ایک راہداری سے گزر کر بائیں ہاتھ کے ایک کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل تھی اس پر ناشتے کا سامان سجا ہوا تھا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ناشتہ آگے سرکا لیا مگر............ میں اس کمرے میں کیسے آ گیا۔ میں کیسے جانتا تھا کہ ناشتہ اس کمرے میں لگا ہوگا۔ میرے قدم اس طرف کیسے اٹھے۔ میں بھٹک کیوں نہ گیا یہ سب کچھ مجھے اجنبی کیوں نہیں لگ رہا۔ آہ............ یہ کیا ہے۔ بھوریا چرن کا کوئی نیا کھیل............ دماغ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ چاند خان کہاں ہیں۔ ہم دونوں تو ریل میں سفر کر رہے تھے۔ چاند خان جاگ رہے تھے میں سو رہا تھا پھر وہ خواب جیسی کوئی آواز۔ تیز روشنی اور پھر میں دوبارہ سو گیا تھا سب کچھ ایک خواب سمجھ کر............ اور اب............ ضرور بھوریا چرن کوئی چال چل گیا۔ اس نے مجھے اس مقدس مزار پر نہیں پہنچنے دیا اور اب میں

کسی ہندو گھرانے میں تھا اور یہ لوگ مجھے رتنا کہہ کر پکار رہے تھے۔ کون لوگ ہیں یہ............ وہ معمر خاتون............ وہ خوبصورت شریر لڑکی............ آہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کسی خطرناک جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آنے والی۔ نہیں............ ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

"چائے واپس لے گئی تھی۔ سوچا ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اب گرم کر کے لائی ہوں۔ ارے تم نے ناشتہ بھی شروع نہیں کیا ابھی تک سو ہی رہے ہو کیا............" نوجوان عورت تھی۔ کالا رنگ تھا مگر نقوش برے نہیں تھے۔ "رتنا جی............! ناشتہ کرو............!"

"کر رہا ہوں مالتی............" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اور ایک بار پھر دل میں چونک پڑا۔ میں اسے اتنے اعتماد سے مالتی کیوں کہہ رہا ہوں۔ کیسے جانتا ہوں کہ یہ مالتی ہے۔

"کچھ اور لائیں تمہارے لئے............؟"

"نہیں۔"

"لالہ سریش چندر جی آئے ہیں۔ گڑ کے شیرے ہیں نرے۔ چپک جائیں تو چھٹنے کا نام نہ لیں بے چاری رما رانی ان کے سامنے جا پھنسی ہیں اب کوئی کیسے نکالے انہیں۔"

"ہوں۔"

"ہم کہیں انہیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے اور............ ارے کچھ اور لائیں تمہارے لئے۔" مالتی بھی جنونی ہی معلوم ہو رہی تھی کم بخت کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی بولے چلی جا رہی تھی۔ اسی وقت کہیں سے کتے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں اور مالتی کی آواز بند ہو گئی۔ کتا بری طرح بھونک رہا تھا۔ مالتی نے پریشانی سے کہا۔ "یہ کتا کہاں سے گھس آیا۔"

"دیکھو باہر جا کر۔" میں نے کہا۔

"ارے ہم دیکھیں۔ نا رتنا جی............ کتے سے ہماری جان نکلے ہے۔ دروازہ بند کئے دیں ہیں ہم کہیں پاپی ادھر ہی نہ گھس آئے............" مالتی نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں ناشتے میں مصروف رہا۔ کتا خاموش ہو گیا تھا۔ مگر کچھ دیر کے بعد ایک تیز آواز سنائی دی۔

"مالتی............ اری او مالتی کہاں مر گئی۔" مالتی اچھل پڑی۔

"لو شروع ہو گئیں آوازیں۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ "آئی رما رانی......وہ کتا۔"

"یہ کشتا کہاں چھپی ہے۔ اسے تلاش کر آج یہ نہیں ہے یا میں۔ آخر یہ کرنا کیا چاہتی ہے کیا سوچا ہے اس نے ارے ہمارے ہاں کام کے آدمی ہیں۔ ہزاروں کام نکلتے ہیں ان سے اور یہ ہے کہ............" رما رانی اندر داخل ہو گئیں۔ یہ وہی معمر خاتون تھیں۔ رما رانی............ میں نے سوچا............ معمر خاتون اندر گھس آئیں ادھر ادھر دیکھا اور بولیں............ "رتنا وہ یہاں تو نہیں آئی............؟"

"نہیں چاچی............" میں نے کہا۔

"جائے گی کہاں............ آج چھوڑوں گی نہیں اسے۔" رما رانی باہر نکل گئیں۔ میری کیفیت اب کسی قدر بحال ہو گئی تھی۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تھا لیکن اب دیوانگی سے کیا حاصل سمجھنے کی کوشش

کرنی پڑے گی۔ اور کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر اٹھا ہی تھا کہ وہی لڑکی اندر گھس آئی اور میری کمر پکڑ کر میرے پیچھے آ گئی۔

"آج بچالیں رتنا جی بس آج بچالیں۔ بھگوان کیلئے۔ وعدہ کرتی ہوں آگے کچھ نہیں کروں گی۔"

"ارے ارے .... میری کمر تو چھوڑو" ۔

"کپڑے دھونے کی موگری ہاتھ آ گئی ہے ایک بھی پڑ گئی تو اپنے جل ٹھنڈے ہو جائیں گے بیچ بیچ میں ہیں مار دیں گی۔"

"کون .... ؟"

"چاچی .... !"

"مگر ہوا کیا ہے .... ؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"ارے بھگوان اسکا ناس کرے۔ کھٹیا کھڑی ہوا ان کی، وہی آ مرے تھے سریش چندر جی۔ آتے تو جاتے نہیں ہیں سارا سارا دن اینڈتے رہتے ہیں یہاں اور ہم سب پر کرفیو لگ جاتا ہے۔ خاموش رہو ہنسو بھی نہیں .... اور سامنے آجاؤ تو ایسے گھورتے ہیں جیسے گنڈیری نظر آ گئی ہو۔"

"پھر تم نے کیا کیا .... ؟"

"کتے سے جان نکلتی ہے ان کی۔ سنا ہے اٹھائیس انجکشن لگوا چکے ہیں دو بار کتوں نے کاٹا ہے۔" ہنس پڑی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کندنی رنگ پر پسینے کے قطرے بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ بے اختیار ہنس رہی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا بولی۔ "کتے کی آواز کا ریکارڈ لگا دیا تھا میں نے اور آواز تیز کھول دی تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر بے اختیار ہنسنے لگی تھی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ ریکارڈ میں انہی کے لئے لائی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے چاچی پکارتی رہ گئیں۔"

"تم نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا تھا .... !" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اب جو ایسے کروں تو اتی بڑی مرجاؤں۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر سہمے ہوئے میں بولی .... "ارے ادھر ہی آ رہی ہیں۔ ...."

یہ تھا میرا نیا ٹھکانہ .... مگر میں یہاں کیسے آ گیا۔ یہ لوگ مجھے رتنا کہہ کر کیوں پکارتے ہیں۔ ان کا شناسا کیسے ہوں۔ بار بار تو ایک جیسے واقعات نہیں ہوتے ہیں اگر سرفراز کا ہم شکل نکل آیا تھا تو رتنا یا رتن کا ہم شکل تو نہیں ہو سکتا تھا .... پھر یہ سب کچھ .... آخر فیصلہ کیا کہ جو کچھ بھی ہے سکون سے برداشت کروں۔ انتظار کروں کہ صورتحال معلوم ہو جائے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ میں نہیں پہنچ سکا۔ اب بھوریا چرن کوئی اور چال چل گیا۔ مگر اس نے اس بار کیا کیا ہے کچھ اندازہ نہیں تھا نہ جانے چاند خان کہاں گئے۔

رتنا ہی بن گیا۔ اپنی کیفیت پر البتہ سخت حیران تھا۔ مجھے اس گھر کے بارے میں سب کچھ معلوم میرا کمرہ کونسا ہے۔ عورت کو میں چاچی کہہ کر پکار رہا تھا۔ ایک اور نوجوان لڑکی سامنے آئی تو میں نے رادھا کہا اور اس نے جواب بھی دیا۔ آہ اس طلسمی کیفیت کا کوئی جواز نہیں تھا میرے پاس .... بھر کوئی کام نہ کرنا پڑا۔ عجیب سا گھرانہ تھا۔ دو تین بار مردوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ البتہ رات ہوئی

تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ قرب و جوار کی ساری عمارتیں جگمگا اٹھیں اور ہر طرف سے طبلہ، سارنگی اور ہارمونیم کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ یہ ناچنے گانے والوں کا علاقہ تھا اور رمارانی بھی انہی میں ایک تھیں۔ خدا تجھے فنا کر دے بھوریا چرن .... یہ کہاں لا پھینکا تو نے مجھے .... اس غلاظت خانے میں۔ دل بری طرح دکھنے لگا کیا کروں۔ کیا یہاں پڑا رہوں .... یہاں .... کشنا یاد آئی معصوم شوخ الھڑ لڑکی رادھا اس کی ہم شکل۔ اور یہ سب ناچ گانے کا کاروبار کرتی تھیں۔ اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا۔ شام سے پہلے اس گھر کی حقیقت نہیں کھلی تھی۔ لیکن جونہی شام ہوئی ماحول بدل گیا پاکیزگی گندگی میں تبدیل ہونے لگی۔ رادھا، لکشمی اور شوخ و شریر کشنا رنگ بدلنے لگیں۔ زرق برق لباس، چہروں پر مصنوعی اشیاء کا نکھار اور پھر وسیع و عریض کمرہ سفید براق چاندنیاں، طبلہ، سارنگی، ہارمونیم۔ ان کے عقب میں نکیلی مونچھوں والے سازندے .... سازوں کے سر درست کرتے ہوئے۔ میں پا بہ زنجیر نہیں تھا یہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن کہاں .... ہر جگہ موت اور تباہی۔ کہیں امان نہیں تھی۔ بے بسی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدایا .... یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ایسی جگہ بھی رزق لکھا تھا۔ خان صاحب یاد آئے۔ میرے چاند مرد کی آنکھوں میں آنسو نہیں شعلے نظر آنے چاہئیں۔ آہ خان صاحب یہ شعلے مجھے بھسم کر سکتے ہیں۔ میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"رتن جی۔ اے رتن جی۔" مالتی کی آواز سنائی دی۔ اور وہ سامنے آ گئی۔

"کیا ہے مالتی؟"

"ہار نہیں لائے ابھی تک۔"

"ہار .... ؟"

"تیار کر رکھے ہوں گے۔ رحیم خان نے جاؤ لے آؤ۔ رمارانی پوچھ رہی تھی۔ ذرا جلدی جاؤ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں اور ہاں ذرا دیکھ کر لینا۔ رحیم خان سے کہنا اصلی چنبیلی لگایا کرے۔ بیچ میں سدا بہار ڈال دیتا ہے۔ لو پیسے رکھ لو۔" مالتی نے سو روپے میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے علم تھا کہ زینہ کہاں ہے۔ ہار کہاں سے لانے ہیں۔ کیسے آخر کیسے۔

سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔ بازار کی رونق عروج پر تھی۔ تر گلاب، موتیا، کڑاکڑ بول رہی ہیں ریوڑیاں۔ لیلیٰ کی انگلیاں مجنوں کی پسلیاں، کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں زیادہ تر پان والوں، پھول والوں اور عطر فروشوں کی دکانیں تھیں۔ بلندیوں سے طبلے ٹھونکنے کی آوازیں، ہارمونیم کی ریں ریں کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ دکانوں پر بورڈ لگے ہوئے تھے دور سے عبدالرحیم گل فروش کا بورڈ نظر آ گیا اور میں اسی طرف چل پڑا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کیا ہے یہ سب کچھ۔

"آؤ رتنا، بڑی دیر میں آئے۔ آج۔" عمر رسیدہ، مگر کلف لگی نوکیلی مونچھوں والے رحیم خان نے ایک بڑا سا پڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔" بیس ہیں پورے، گننا تو نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے پھنسے پھنسے لہجے میں کہا اور سو روپے کا نوٹ رحیم خان کی طرف بڑھا دیا۔

"کل تم بیس روپے ہی چھوڑ گئے۔ میں نے آواز لگائی مگر تم نے سنا ہی نہیں۔"

"کل .... !" میرا دل لرز گیا۔

"ہاں میاں۔ یہ بیس روپے کل کے اور بیس یہ لو چالیس ہو گئے نا..........!"

"ہاں .... رحیم خان کل بھی میں ہی آیا تھا ہار لینے؟" میں نے بمشکل پوچھا۔

"کیا مطلب؟" رحیم خان بولے۔

"کل میں ہی ہار لے گیا تھا نا؟"

"تو اور کون لے جاتا۔ کل تو کچھ ترنگ میں تھے پیارے۔" رحیم خان ایک آنکھ دبا مسکرائے۔

"وہ کب سے لے جاتا ہوں میں یہ ہار۔"

"مہینوں ہو گئے مگر بات کیا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری پچھلے ہفتے سے کچھ کھوئے کھوئے سے ہو"

"میرے خدا، میرے خدا۔" میرے منہ سے لرزتی آواز نکلی اور رحیم خان چونک پڑے۔ وہ پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ بولے۔

"کچھ نہیں۔" میں واپس چل پڑا۔ رحیم خان کی آواز کانوں میں گرم گرم سیسے کی طرح اتر تھی۔ "مہینوں سے مہینوں سے" کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں مہینوں سے یہاں ہوں۔ مہینوں مگر کیسے۔ یہ میں ہی ہوں کوئی اور نہیں ہے مگر میں تو پچھلی رات میں چاند خان کے ساتھ ریل میں سفر کر تھا۔ پھر میں مہینوں سے یہاں کیسے ہوں۔ یہ ماحول، یہ لوگ یہ سب کچھ جانا پہچانا کیوں ہے۔ کیا ہوا آخر میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

راستہ تک نہیں بھولا تھا۔ بے خیالی کے عالم میں آیا مگر انہی سیڑھیوں سے اوپر پہنچا تھا جن سے اتر کر گیا حالانکہ ساری سیڑھیاں ایک جیسی تھیں۔ یہ تمام باتیں ذہن خراب کر رہی تھیں۔ اتنا اندازہ تو میں نے لگا لیا یہ سب کچھ بھوریا چرن نے کیا ہے لیکن کیا کیا ہے۔ یہ جاننا ضروری تھا۔ مالتی ہار لینے کے لئے کھڑی تھی جلدی سے ہاروں کا پڑا لے کر چلی گئی۔ اور میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم خان نے کہا مہینوں سے میں اس سے ہار لے جاتا ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ وہی کچھ ہم شکل والا معاملہ ہو سکتا نامی کوئی شخص میرا ہم شکل ہو گا لیکن اتنے سارے ہم شکل ہر جگہ میرا ایک ہم شکل موجود ہے۔

مالتی آ گئی۔ بولی "اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو رتنا جی۔ بتی جلا دوں۔"

"رہنے دو مالتی اندھیرا اچھا لگ رہا ہے۔"

"کچھ چاہئے؟ اس نے پوچھا۔

"نہیں آؤ بیٹھو۔"

"اندھیرے میں نا بابا نا۔ ہمیں اندھیرا نا اچھا لگے۔"

"تمہیں کوئی کام تو نہیں ہے"۔

"اسی وقت تو فرصت ملے ہے۔ اب بارہ بجے مہمان چلے جائیں گے تو بڑا کمرہ صاف کر کے سوئیں گے۔"

"روشنی جلا دو اور بیٹھو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" مالتی نے لائٹ جلا دی اور پھر نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

"مالتی۔ آج کیا تاریخ ہے؟"

"انیس۔"

"مہینہ کونسا ہے معلوم ہے۔"

"ستمبر۔"

"ہیں.........." اور میں اچھل پڑا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے؟"

"کا ہے رتنا جی؟"

"آج انیس ستمبر ہے؟"

"تو اور کیا؟"

"اوہ میرے خدا۔ میرے خدا۔" میرے منہ سے سرگوشی میں نکلا میرے ہوش و حواس درست تھے۔ پاگل نہیں ہوا تھا لیکن یہ مالتی کیا کہہ رہی تھی۔ یہ ستمبر کا نہیں مارچ کا مہینہ تھا۔ چاند خان کا پہلے اٹھارہ مارچ کو رتولی جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن اپنا کوئی کام ہونے کی وجہ سے وہ سترہ مارچ ہی کو رتولی چل پڑے تھے۔ اور اس بات کو پانچ ماہ گزر گئے تھے۔ پانچ ماہ اگر واقعی ستمبر کا مہینہ ہے تو میرے یہ پانچ ماہ کہاں کھو گئے۔"

"مالتی میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ وعدہ کرو گی کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ بولو وعدہ کرو گی مالتی۔"

"شکنتا کے بارے میں پوچھو گے؟"

"شکنتا؟"

"ہاں رتن جی۔ شکنتا کے بارے میں بات کرو گے تو ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ رما رانی ہمارا سر گنجا کر دیں گی پہلے بھی تمہاری وجہ سے پٹ چکے ہیں۔"

شکنتا کون ہے؟"

"جانتے ہیں۔ آ گئے نا اسی پر۔ ارے ہاں ہمیں سب پتہ ہے سب ہمارے ہی دشمن ہیں۔"

"نہیں میں شکنتا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

"لو پوچھے جا رہے ہو اور کہتے ہو نہیں پوچھوں گا۔ ویسے ہماری مانو تو رتن جی شکنتا کے پھیر میں مت پڑو۔ وہ تم سے زیادہ پاگل ہے تمہیں بھی بیچ چوراہے پر مروا دے گی۔"

"تم مجھے کب سے جانتی ہو مالتی۔"

"تمہیں..........؟ جب سے تم یہاں آئے ہو۔"

"میں کب یہاں آیا تھا۔"

"ہولی جلی تھی جب تم یہاں آئے تھے۔ ٹھہرو بتاتی ہوں" وہ انگلیوں پر حساب لگانے لگی پھر بولی۔ "پورے پانچ مہینے ہو گئے۔"

"پانچ مہینے سے میں یہاں ہوں۔"

"تو اور کیا۔"

"کہاں سے آیا تھا میں؟"

"انجا پور گئی تھیں رما رانی سنکھ یاترا کو وہیں تم کاشو کا کے مندر کنارے دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ رما رانی کو دیکھا تو ماں کہہ کر ان سے لپٹ گئے۔ جمعہ استاد نے تو لٹھ ہی دے مارا ہوتا تمہارے سر پر مگر رما رانی کو اپنا رتن یاد آ گیا جیتا ہوتا تو تمہاری برابر ہوتا۔ انہوں نے جمعہ استاد کو روکا بعد میں پتہ چلا کہ تم

باؤلے ہو۔ اور سچ مچ تم تھے بھی نرے باؤلے. نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کا. رمارانی کو رتن یاد نہ آ... بھلا تم یہاں لائے جاتے. مگر ان کے من میں ماتا کی گنگا بہنے لگی تھی. وہیں تو مرا تھا ان کا رتن... مطلب ہے انجنا پور. گاڑی کے نیچے آ گیا تھا اور پھر رمارانی انجنا پور ہی میں اس کی ارتھی جلا کر آئی تھیں... مہینوں باؤلی رہی تھیں اس کے لئے. حالانکہ تم جانتے ہو رتن جی. ان جگھوں پر بیٹوں سے زیادہ پیار نہیں کیا جاتا، مگر اکیلے جو تھے رمارانی کے. تینوں لڑکیاں رمارانی کی بڑی بہن اومارانی کی ہیں۔ چچی کہتی ہیں... سے، مگر تم یہ سب کیوں پوچھے جا رہے ہو؟"

"تو میں رمارانی کا رتن نہیں ہوں۔" میں نے کہا اور مالتی ہنس پڑی۔ بڑی سادہ سی عورت تھی... کہنے لگی۔

"لو جب رتن مر ہی گیا، تو تم بھلا کیسے ان کے رتن ہو سکتے ہو؟ مگر انہوں نے تمہارا نام رتن ہی رکھ ڈالا اور بڑے پیار سے تمہیں رتنا رتنا کہتی ہیں۔"

"اور جب سے میں انہی کے پاس ہوں، مگر میں نے رمارانی کو اپنا نام نہیں بتایا تھا کیا۔" مالتی پھر ہنس پڑی اور بولی۔

"بتاتے کیسے، منہ سے رال بہتی تھی، ہر وقت ناک بہتی رہتی تھی. کھانے پینے کا ہوش نہیں تو... مہینوں کے بعد تو بولے ہو، ورنہ پہلے ہم تمہیں گونگا ہی سمجھتے تھے۔ ویسے ترویدی کے علاج نے تمہیں... فائدہ دیا مگر تم باؤلے کیسے ہو گئے تھے رتن جی ....؟"

میں ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔ جو انکشاف مجھ پر ہوا تھا وہ بہت سی حقیقتوں سے روشناس کرا... تھا مگر یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ پانچ مہینے کھو گئے تھے میرے، پورے پانچ مہینے کیسے... کیسے۔ کیا چکر چلایا تھا اس خبیث بھوریا چرن نے۔ اس بار کیا چکر چلا دیا تھا۔ چاند خان صاحب کو تو وہ... بزرگ کے دیئے ہوئے تعویذ کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا تھا لیکن راستہ ضرور روکا ہو گا اس نے... اور کامیاب ہو گیا کم بخت۔ خدا اسے غارت کرے۔ پتہ نہیں بیچارے چاند خان پر کیا گزری ہو گی۔ کہاں کہاں مجھے تلاش کرتے پھرے ہوں گے مگر میں پاگل کیسے ہو گیا تھا۔ بڑی الجھنیں باقی تھیں ابھی لیکن کم از کم اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں کسی رتن کا ہم شکل نہیں بلکہ دماغی خرابی ہو گئی تھی میرے اندر اور بھٹکتا پھر رہا تھا... رمارانی مجھے یہاں لے آئی مگر میری دیوانگی کی وجہ کیا تھی۔ ایک سوال اور کیا میں نے مالتی سے۔

"مالتی تمہارے اس شہر کا نام کیا ہے؟"

"ارے یہ بھی نہیں یاد تمہیں۔"

"بتا دو مالتی، بہت سی باتیں مجھے یاد نہیں۔"

"اب ہمیں باؤلا کر دو گے تم، شکتی نگر کا نام نہیں جانتے تم۔" اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا... تو وہی جگہ تھی جہاں چاند خان رہتے تھے۔ شکتی نگر۔ "یہ شکتی نگر ہی ہے نا۔" میں نے بے یقینی کے انداز میں مالتی سے پوچھا۔

"باؤلا کر کے چھوڑو گے۔ لو ہم نہیں بیٹھتے تمہارے پاس جا رہے ہیں جسے دیکھو ہمارا انداق اڑا رہا ہے۔" وہ اٹھی اور باہر نکل گئی لیکن میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بھوریا چرن صرف بھوریا چرن... بھلا اور کون ہو سکتا ہے ان واقعات کے پیچھے مگر چاند خان صاحب، آہ اگر یہ شکتی نگر ہی ہے تو پھر مجھے...

چاند خان صاحب سے ملنا چاہئے۔ ان کی خبر لینی چاہئے. بیچارے تھک ہار کر بیٹھ گئے ہونگے۔ نجانے کس طرح مجھے ان سے الگ کر دیا گیا ہو گا۔ دل بے چین ہونے لگا. جی تو چاہا اسی وقت باہر نکل جاؤں راستے تلاش کر ہی لوں گا۔ ویسے بھی شکتی نگر کے ان علاقوں سے اجنبی نہیں تھا جہاں چاند خان صاحب رہتے تھے باہر نکلوں گا تو پتہ چل ہی جائے گا۔ اس دوران کبھی اس طرف نہیں آنا ہوا تھا۔ اور آنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ رات نجانے کس طرح گزاری۔ بارہ بجے کے بعد اس علاقے میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا اور ویسے بھی بس یہی لمحات ہوا کرتے تھے یہاں زندگی کے۔ مجھے اب پوری طرح یہ احساس ہو گیا تھا کہ بہت سی باتیں میری شناسا کیوں ہیں لیکن لیکن یہ پانچ مہینے میری نگاہوں سے اوجھل کیسے رہے۔ روز اول ہی مجھے کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ میں کسی اجنبی جگہ آ گیا ہوں. مالتی کہتی تھی کہ میں پاگل ہو گیا تھا. ہو سکتا ہے مگر ان پانچ مہینوں نے مجھے فائدہ بھی پہنچایا تھا پولیس کی نگاہوں سے پانچ مہینے تک دور رہا تھا اور اب شاید میری تلاش میں اس قدر شدت بھی نہ رہ گئی ہو۔ آہ خدا کرے چاند خان صاحب مل جائیں تو.......... تو ایک بار پھر ان سے درخواست کروں کہ مجھے رتولی لے جائیں۔ وہ کم بخت بھوریا چرن کب تک میرا راستہ روکے گا۔

رات ہی کو میں نے اپنے دل میں کچھ اور فیصلے بھی کئے تھے۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ میں پانچ ماہ تک ذہنی عدم توازن کا شکار رہا تھا اور یہ وقت عالم دیوانگی میں گزرا ہو گا۔ لیکن یہ بھی بڑی اچھی بات تھی رما رانی نے یہ سب کچھ کیا تھا میرے لئے بے لوث. بے غرض. وہ جو کچھ بھی تھیں ماں کا جذبہ ابھرا تھا ان کے دل میں. جانور تک اس جذبے میں کھوٹ نہیں رکھتے وہ تو انسان تھیں چنانچہ اب کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی جس سے پرہیز کرتا۔ اگر مجبوری ہی ہوئی تو کچھ وقت اور یہاں گزاروں گا اور ایک بار پھر خود کو حالات سے لڑنے کے لئے تیار کروں گا۔ ہاں اگر تقدیر ساتھ دے اور چاند خان بد دل نہ ہو گئے ہوں تو ایک بار پھر ان کے ساتھ بزرگ کے مزار پر جانے کی کوشش کروں گا۔ نہ جانے رات کے کون سے حصے میں نیند آ گئی تھی۔ مگر صبح جلدی جاگ گیا تھا اور جاگنے کی وجہ وہ سنگترہ تھا جو کھلی کھڑکی کے راستے اندر آیا تھا۔ اور زور سے میرے سینے پر پڑا تھا۔ آنکھ کھلی تو چوٹ کا احساس ہوا ٹٹول کر دیکھا تو سنگترہ ہاتھ لگا۔ یہاں تو ہر چیز سے خوف کھانے کی عادت پڑ گئی تھی سنگترہ پکڑے اٹھ گیا خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کھلی کھڑکی نظر آئی اور قدم اس طرف بڑھ گئے کھڑکی کے آگے گلی تھی اور گلی کے دوسری طرف ایک عمارت اور عمارت میں اس جیسی ہی کھڑکی اور کھڑکی میں ایک سفید ساری. سفید چہرہ، گھٹاؤں جیسے بے پناہ بال جو نیچے نہ جانے کہاں تک چلے گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔ مجھے ہی مخاطب کیا گیا تھا اور ہندو طریقے سے مجھے یہ سلام کیا گیا تھا مگر مجھے کیوں؟ اسی وقت عقب سے دروازہ پیٹا جانے لگا اور میں اچھل پڑا۔ دروازہ جس زور سے پیٹا جا رہا تھا اس میں بڑا ہیجانی انداز تھا۔ آہ شاید پھر کوئی مصیبت آ گئی. پھر کوئی نیا کھیل۔ سامنے والی لڑکی کچھ اشارے کر رہی تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آخر میں وحشت زدہ انداز میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور دوازے پر پہنچ گیا۔ پھر دروازہ کھول دیا. کشنا تھی۔ دھلی، نکھری کشنا۔

"دروازہ کیوں بند کیا تھا۔" وہ غرائی میں منہ کھول کر رہ گیا۔ "بولو دروازہ کیوں بند کیا تھا!"

"کک .... کیا ہو گیا؟" میرے منہ سے خوفزدہ سی آواز نکلی۔

"اندھے ہیں نا ہم سب۔ کیوں اندھے ہیں۔" وہ مجھے دھکا دیکر اندر گھس آئی بری طرح بر ہوئی تھی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ بولی۔ "کیا پھینکا تھا اس نے۔ بتاؤ نشانہ باندھ کر پھینکی تھی۔"

"یہ............" میں نے سنگترہ سامنے کر دیا۔

"سنگترہ" اس نے میرے ہاتھ سے چھین لیا پھر غرائی۔ "تو یہ ہوتا ہے صبح ہی صبح۔ یوں جگایا جا راج کمار جی کو۔ اور راج کمار جی اب دروازہ بند اور کھڑکی کھلی چھوڑ کر سوتے ہیں۔ ارے تم پاگل ہیں پاگل ہو تم۔ سارے کھیل اچھی طرح جانتے ہو اور بنتے ہو پاگل۔ میں بتاؤں پاگل چاچی ہے۔ سمجھے پاگل ہم سب ہیں، تم ٹھیک ہو بالکل ٹھیک۔"

"مم............ میں............ میں............" میرے حلق سے بمشکل نکلا۔

"چلو پھینکو اسے گلی میں، میرے سامنے پھینکو!" وہ مجھ پر جھپٹی اور میں کھڑکی کی طرف دوڑا۔ میں سنگترہ گلی میں پھینک دیا۔ سامنے والی کھڑکی بند ہو چکی تھی اب وہاں کوئی نہ تھا کشنا میرے پیچھے تھی اور ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ اضطرابی انداز میں ہی ہوا تھا۔ دراصل سو کر جاگا تھا حواس بحال نہیں ہوئے تھے پھر جس بحران سے گزر رہا تھا، اس میں قوت ارادی کچھ نہ رہ گئی تھی چنانچہ کشنا نے جو رویہ اختیار کیا تھا، اس سے مرعو ہو گیا اور اسی کیفیت نے میری دیوانگی کا بھرم رکھ لیا۔ مگر یہ کشنا صاحبہ ان کا انداز کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اب شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کھولی تھی تم نے کھڑکی............؟"

"میں نے نہیں کھولی تھی۔"

"ہوا سے کھل گئی ہوگی۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

""ہاں شاید۔"

"آنکھیں پھوڑ دوں گی تمہاری، ٹینٹوا دبا دوں گی سمجھے۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ رمارانی اچا کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے شاید کشنا کے آخری الفاظ سن لئے تھے۔

"کیا ہوا............؟ کیا بات ہے کشنا............؟"

"کچھ نہیں۔" وہ جھٹکے دار لہجے میں بولی اور پلٹ کر جانے لگی رمارانی نے اس کی آستین پکڑ لی تھی۔

"یہ تو مجھ سے بات کر رہی ہے۔ دماغ میں خشکی ہو گئی ہے کیا۔"

"وہ............ وہ شکنتا کیا سمجھتی ہے خود کو، بہت خوبصورت ہے وہ سب کو پاگل بنا سکتی ہے۔ بے چارے پاگل کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے اور یہ اس کے ایک اشارے پر کیسے ہوش میں آ جاتا ہے اس کا ہر اشا کیسے سمجھ لیتا ہے۔ وہ سنگترہ پھینک کر اسے جگاتی ہے اور یہ کھڑکی پر پہنچ کر اس کے درشن کرتا ہے ہو جا اس کی اور ہم اسے پاگل سمجھتے ہیں۔" کشنا کا لہجہ عجیب تھا۔

رمارانی نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر کشنا کی طرف............ اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں

"پاگل تو تم بھی ہو کشنا، کیا تم پاگل نہیں ہو۔" کشنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رمارانی پھر بولیں

"یہ کونسی جگہ ہے کشنا تمہیں اچھی طرح معلوم ہے یہاں جیسی باتیں کرو۔ تم نہ جانے کہاں کی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہاں، جو کچھ ہوتا ہے اس میں یہ کوئی معیوب بات ہے۔ منع کر سکتے ہیں ہم کسی کو............ لوگ ہم پر ہنسیں گے نہیں، جو کچھ وہ کہیں گے اس کا اندازہ ہے تمہیں؟"

"وہ اور بات ہے چاچی، پر یہ ہمارا رتنا ہے۔"

"یہ............ یہ ہمارا کہاں ہے کشنا۔ یہ ہمارا تو نہیں ہے ترویدی جی کی بات بھول گئیں۔ کہتے تھے اپنا ماضی بھول گیا ہے اسے ماضی یاد آیا تو ہمیں بھول جائے گا۔ روک سکو گی اسے رہ سکے گا یہ اس اجنبی ماحول میں اور اسے تم شکنجوں میں جکڑنا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہمارا ہے نہ شکنتا کا اور............ اور............ پھر کیوں دوسروں سے لڑتی ہو۔ جاؤ کشنا ہوش سے کام کرو مہمانوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

کشنا نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی، ایک لمحے رکی مجھے گھورا پھر باہر نکل گئی۔ رمارانی خاموشی سے کھڑی مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کے چہرے پر غم کے تاثرات نظر آ رہے تھے پھر وہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آ گئیں۔

"کیوں رتنا............ ٹھیک کہا میں نے، تو ٹھیک ہو جائے گا۔ چلا جائے گا یہاں سے۔ ٹھیک ہوا تو سوچے گا کیسی بری جگہ آ گیا تھا، مگر میں تجھے اور کہاں لے جاتی رے ماں کہہ کر لپٹ گیا تھا تو مجھ سے ارے باؤلے ماں کہہ کر تو کسی پتھر کی مورتی سے بھی لپٹ جاتا تو، تو اس کی چھاتی دھڑک اٹھتی۔ میں تو گوشت پوست کی بنی ہوں، کیا کرتی اس سے۔ تیرے ساتھ دیوانی ہو گئی تھی مگر یہ جگہ غلط ہے۔ ہم وہ نہیں جو دوسرے ہوتے ہیں۔ میں کیا کروں۔ ہم تو وہ ہوتے ہیں، جو پیدا ہوتے ہی برے کہلاتے ہیں۔ ہمیں ماں کہنا گناہ ہے گالی بن جاتی ہے کہنے والے کے لئے، ڈاکو کے گھر ڈاکو پیدا ہو جائے، شریف بن سکتا ہے مگر یہاں، تجھے جونہی ہوش آیا یہاں سے چلا جائے گا تماشبین بن کر تو یہاں ہر کوئی آ سکتا ہے۔ بیٹا یا بھائی بن کر نہیں............"

میں سکتے کے عالم میں تھا۔ یہ الفاظ میرے دل کو چھو رہے تھے کتنا کرب تھا ان میں، کتنی انوکھی سچائی تھی۔

"دھت تیرے کی باؤلوں کے ساتھ میں بھی باؤلی بن گئی۔ چل منہ دھو ناشتہ کر لے۔ مالتی............ اری او مالتی، رتنا جاگ گیا ہے چل ناشتہ بنا اس کے لئے جا رتنا منہ دھو لے............!" رمارانی باہر نکل گئیں۔ میں ٹھنڈی آہ بھر کر کمرے سے باہر آیا اور غسل خانے کی طرف چل پڑا............! ناشتہ بڑی بد دلی سے کیا تھا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ رمارانی کے الفاظ نے دکھی کر دیا تھا کبھی خواب میں بھی اس ماحول کو نہیں دیکھا تھا۔ ابتداء میں دوسرے برے راستے اختیار کئے تھے یعنی ریس، سٹہ اور جوا وغیرہ لیکن شناساؤں میں بھی کوئی ان راستوں کا راہی نہیں تھا۔ البتہ کبھی اگر ان ناچنے گانے والیوں کے بارے میں سنا تھا تو بہت برے انداز میں............ لیکن ان کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے جواب میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ مجھ پر اپنا حق سمجھتی تھیں۔ کشنا نے کیسے عجیب انداز میں کہا تھا............ "پر یہ ہمارا رتنا ہے" آہ میں تو خود اپنا ہی نہیں رہا ہوں کسی اور کا کہاں ہو سکتا ہوں۔ مگر یہ شکنتا کون ہے؟ کیسی عجیب تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے میری اس سے بھی شناسائی رہی ہو۔

ناممکن تو نہیں تھا............ پورے پانچ ماہ کا معاملہ تھا کس کس سے کیا رابطے تھے کون جانتا تھا۔ چاند

خان سے ملنے کے لئے دل بے تاب تھا وہ مل جائیں تو کچھ ہمت بندھے پتہ تو چلے کہ کیا ہوا تھا۔ یہ تو آسانی سے سمجھا جا سکتا تھا کہ بھوریا چرن نے رتولی جانے کا راستہ روک دیا تھا۔ مگر کیسے؟

لباس تبدیل کر لیا تھا۔ بظاہر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ کہیں باہر آنے جانے کی۔ جیب میں چالیس روپے پڑے ہوئے تھے۔ نیچے اترا اور چل پڑا۔ شکتی پور سے زیادہ واقفیت تو نہیں تھی مگر چاند خان کے محلے کا نام معلوم تھا تانگے چلتے تھے ایک تانگہ نے مجھے وہاں اتار دیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ پیروں میں لرزش تھی اور اس وقت دل کو دھچکا سا لگا جب چاند خان کے مکان کے دروازے میں بڑا سا تالا لٹکا دیکھا۔ گم صم کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا ہو سکتا ہے سب لوگ کہیں گئے ہوئے ہوں۔ کچھ فاصلے پر ایک پرچون کی دکان تھی ایک بزرگ وہاں بیٹھتے تھے پہلے بھی انہیں دور سے دیکھا تھا ان کے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”وہ سامنے والے مکان میں چاند خان رہتے تھے ....“ میں نے اشارہ کر کے کہا۔

”ایں ....؟ ہاں!“

”کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟“

”چاند خان“ .... بزرگ حیرت سے بولے۔

”جی۔“

”وہ تو .... وہ تو خلد آشیانی ہو گئے عزیزی، کہیں باہر سے آئے ہو۔؟“ بزرگ نے کہا۔

کیا بتاؤں کیسا سماعت شکن دھماکہ ہوا تھا دل و دماغ، میں بزرگ کا جواب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یا سمجھ کر نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ ہمت کر کے دوبارہ کہا۔ ”کیا فرمایا آپ نے؟“

”آؤ میاں بیٹھو، کہیں باہر سے آئے ہو۔ عزیز ہو ان کے ....“

”کیا ہوا، انہیں، میں سمجھا نہیں۔“

”جنت نشین ہو گئے وہ تو .... محلے کی عظمت تھے بخدا پیشہ برا پایا تھا مگر محلے کی ناک تھے۔ درویش صفت، امیروں کی جیب تراش کر غریبوں کی ضرورتیں پوری کرتے تھے کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آدھی رات کو پہنچ جاؤ چاند خان دامے درمے سخنے حاضر ہیں مجال ہے کسی ضرورت مند کو ....“

”انتقال ہو گیا ان کا۔“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ بزرگ بہت باتونی معلوم ہوتے تھے۔

”ہاں میاں عرصہ ہوا۔ ریل کا حادثہ ہوا تھا۔ ستر افراد ہلاک ہوئے تھے اور بے شمار زخمی، خدا جانے ان میں سے کون کون ....“

”ریل کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے وہ ....“

”ہاں عزیز، مگر کئی ماہ ہو گئے اس بات کو .... تم کہیں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے؟“

”حادثہ کہاں ہوا تھا؟“

”رنجنا پور جنکشن سے کوئی چھ کوس پیچھے۔ سنا ہے قیامت خیز حادثہ تھا سنا ہے ریل کے ڈبے ....“

اس سے آگے بزرگ نے کیا کیا کہا سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا .... آہ .... وہی وقت تھا .... بالکل وہی وقت تھا۔ اس رات انہوں نے مجھے سلا دیا تھا۔ میں سو گیا تھا۔ پھر سورج چمکا تھا کچھ شور

تھا میں نے اور اس کے بعد .... اس کے بعد میرے پانچ ماہ کم ہو گئے تھے۔ رمارانی نے مجھے شکتی پور میں ہی پایا تھا یہی بتایا تھا مالتی نے .... حالات سمجھ میں آ رہے تھے حادثے نے میرا دماغ الٹ دیا ہو گا اور چونکہ میرا کوئی وارث تو تھا نہیں۔ اس لئے نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا ہوں گا اور پھر رمارانی ....

”محترم .... خان صاحب کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں رہتے تھے ....“ میں نے آواز پر قابو پا کر کہا

”ہاں بہت سے تھے، بہت سارے تھے، مگر جب بادشاہ ہی نہ رہا رعیت کیا رہتی، جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا، اب تو تالا پڑا ہے کوئی چار مہینے سے کوئی آتا ہی نہیں ادھر۔“ بزرگ نے جواب دیا۔

آخری امید بھی ٹوٹ گئی تھی، چاند خان صاحب کے بارے میں تو اندازہ ہو گیا تھا کہ بے چارے میری ہی وجہ سے موت کی نیند جا سوئے۔ ذلیل بھوریا چرن اس تعویذ کی موجودگی میں خان صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا، لیکن ریل کا حادثہ بلاوجہ ہی تو نہیں ہوا ہو گا، ضرور اس میں اس کی بھی کوئی چال ہو گی۔ آہ کتنے لوگ مارے گئے میری وجہ سے، ان سب کا خون میری ہی گردن پر تو ہے اگر میں برے راستوں کا انتخاب نہ کرتا، اگر غلاظت کی تلاش میں قدم آگے نہ بڑھاتا، زندگی کو اس انداز میں گزارنے کی کوشش کرتا، جیسے اس دنیا میں رہنے والے نیک نام لوگ گزارتے ہیں تو یہ سب کیوں ہوتا۔ بہت بڑا گنہگار تھا میں .... نجانے کس کس کا قاتل، اپنے ہاتھوں سے بھی تو میں نے قتل کئے تھے، وہ بیچارے جیل کے مظلوم سپاہی، جو صرف اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں، پیٹ کے لئے، رزق کے لئے، براہ راست میرے ہاتھوں مارے گئے تھے آہ گناہوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی، نجانے آگے کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا خان صاحب کے کسی ساتھی کا پتہ چل جاتا تو کم از کم اس سے رتولی کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا۔ ان صاحب کا نام بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا جن صاحب کے پاس خان صاحب مجھے لے جا رہے تھے۔ کاش اس وقت توجہ ہی دے لیتا۔ خان صاحب سے وہ تمام تفصیلات پوچھ لیتا تو کم از کم کوئی صحیح اندازہ ہی ہو جاتا۔ یہی غنیمت تھا کہ رتولی کا نام معلوم ہے وہاں جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن لیکن خان صاحب کے بغیر کیا کروں گا۔ کیا کہوں گا کسی سے، کیسے تلاش کروں گا، کیا یہ سب ممکن ہے، آہ کیا یہ سب ممکن ہے پھر دل میں ایک خیال ابھرا۔ خان صاحب کے گھر کا جائزہ تو لیا جائے ہو سکتا ہے وہاں کوئی ایسی نشاندہی ہو جائے، جس سے کچھ اور تفصیلات معلوم ہوں۔ یہ خیال اچانک ہی دل میں پیدا ہوا تھا اور اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ دل بے اختیار خان صاحب کے مکان میں داخل ہونے کو چاہنے لگا .... وہاں سے ہٹا تو بزرگ بولے۔

”ارے نہیں نہیں میاں ایسے کیسے جا سکتے ہو، گنے کا رس منگواتا ہوں تمہارے لئے، دو گلاس پیو، دل ٹھنڈا ہو جائے گا، بڑی بری خبر سنائی ہے ہم نے تمہیں لیکن تعجب ہے پانچ ساڑھے پانچ مہینے ہو گئے اس واقعہ کو تو .... تم نے خبر ہی نہ لی، آخر ان سے تمہارا کیا رشتہ تھا۔“ ان باتونی بزرگ کو بڑی مشکل سے ٹالا، گنے کے رس سے معذرت کی، جھوٹ بولنا پڑا تھا اس سلسلے میں۔ انہوں نے چائے کی پیشکش بھی کر دی۔ لیکن بس جان چھڑا کر وہاں سے ہٹا تھا۔ دل پر ایک بار پھر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے، یہ احساس دل سے دور نہیں ہو رہا تھا کہ چاند خان جیسا مخلص آدمی میری وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوا، مکان کے قریب پہنچا سامنے سے گزرا، بغلی سمت آ گیا، دوسرے مکانات میں گھرا ہوا تھا یہ مکان، البتہ چھ مکان آگے جا کر راستہ دوسری جانب مڑ جاتا تھا اور یہاں سے خان صاحب کے مکان کے احاطے کے پچھلے حصے میں پہنچا

جا سکتا تھا جسے میں نے دیکھا ہوا تھا.......... تنگ سی گلی تھی اور غیر آباد رہتی تھی۔ پھر احاطے کی دیوار بھی اتنی اونچی نہیں تھیں کہ انہیں عبور نہ کیا جا سکتا ویسے احاطے کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا دروازہ بھ تھا۔ لیکن وہ بھی شاید اندر ہی سے بند تھا۔ ادھر اُدھر دیکھا اور یہ جائزہ لینے کے بعد کہ کوئی میری جانب متوجہ نہیں ہے احاطے کی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ جگہ جگہ گھاس اگی ہوئی تھی۔ کافی بڑی بڑی ہو تھی رات کی رانی کے پودے مرجھا گئے تھے۔ خان صاحب کو پھلواری لگانے کا شوق تھا۔ عقبی حصے م طرح طرح کے گملے رکھے ہوئے تھے سب کے سب اسی طرح تھے۔ لیکن مرجھائے ہوئے۔ مکان ہولناک ویرانی برس رہی تھی۔

اس وقت جب میں یہاں تھا۔ خان صاحب کی موجودگی میں یہ مکان بڑا پر رونق رہتا تھا۔ ان کے ش ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ قہقہوں کی آوازیں ابھرتی رہتی تھیں۔ خان صاحب کا انداز ان کے لئے مشفقانہ ہوتا تھا۔ اب یہ ساری چیزیں موجود نہیں تھیں اور ایک عجیب سی ویرانی ہر شے پر چھائی ہوئی تھ آگے بڑھا اور اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ مکان کا سارا سامان غالباً نکال لیا گیا تھا اور اب وہ خالی پڑ تھا.......... خان صاحب کے کمرے میں داخل ہوا.......... وسیع و عریض کمرہ۔ کونے میں بچھا ہوا تخ ایک جانب پڑی ہوئی مسہری۔ یہ چیزیں موجود تھیں۔ مسہری پر البتہ بستر نہیں تھا۔ دیواریں ننگی کردی گ تھیں۔ خان صاحب جگہ جگہ نظر آرہے تھے، ہر سرسراہٹ پر یہ احساس ہوتا تھا کہ اب کوئی آواز سنائی دے گی۔ لیکن کچھ نہیں تھا۔ جو تصور لے کر اس گھر میں داخل ہوا تھا یہاں آتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ہ اس ویران کھنڈر میں اب مجھے کیا مل سکے گا۔ کسی نے کچھ نہیں چھوڑا تھا گردن جھٹکی۔ مایوسی نے دل م گھر کر لیا تھا۔ بھوریا چرن ابھی تک مجھ پر حاوی تھا جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کر دکھایا تھا۔ کم بخت نے سکون سے نہیں جینے دے گا سکون تو خیر کیا ہی ملتا۔ جینا بھی اتنا مشکل ہو گیا تھا کہ ناقابل بیان ہے۔ وہ ک یاد آیا جس میں خان صاحب نے مجھے ٹھہرایا تھا اور جو ایک رات عجیب ہولناک حادثہ کا شکار ہوا تھا اس جانب اٹھ گئے اور میں اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ بالکل ویسا ہی تھا۔ دروازے کھڑکیاں غائب تھوڑے تھوڑے سے ٹکڑے دیواروں میں پھنسے ہوئے۔ کیسی ہولناک کہانی تھی اس رات کی۔

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ دفعتہً ایک بار پھر میرا دل دھڑک کر اچھ گیا۔ دل کے کسی گوشے میں یہ تصور نہیں تھا کہ بھوریا چرن یہاں نظر آجائے گا۔ وہ اپنے منحوس وجود ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے۔ پاؤں پھیلائے۔ بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہی ہولنا شکل۔ میں سکتے کے سے عالم میں اسے گھورتا رہ گیا ایک لمحے کے لئے احساس ہوا تھا کہ کہیں یہ میرا و نہیں ہے لیکن دوسرے لمحے اس کی آواز سنائی دی۔

"آجا.......... آجا.......... تیرا ہی انتظار کر رہے تھے ہم۔ کیسی گزر رہی ہے؟"

میں اس کی آواز پہچانتا تھا۔ صورت تو میری نگاہوں کے سامنے ہی تھی۔ کچھ دیر تک منہ سے آواز نہ نکل سکی لیکن پھر سارے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور یہ تیرا مسکن ہے بھوریا چرن.........." جواب میں اس نے قہقہہ لگایا اور بولا.......... "تو کہتے بھی ہیں ایسی گندی جگہوں پر۔ محل دو محلے کھڑے ہوئے ہیں ہمارے لئے۔ یہی تو کمی ہے تیرے اندر بالک

ہی نہیں تو نے ہمیں پہچانا ہی نہیں.......... ارے پاپی ہم تو خود چل کر تیرے پاس نہیں گئے تھے۔ خود ہی تیرا من ہم نے ملنے کو چاہا تھا۔ بات کی تھی تو نے ہم سے۔ ہم نے تو ساری سچائی سے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو ہمارا کام کر دے ہم تیرا کام کر دیں گے۔ تجھ پر ہی مصیبت ٹوٹی تھی۔ کون سا ایسا دھرماتما تھا تو۔ تھوڑا سا کام کر دیتا ہمارا.......... ہمیں وہ شکتی حاصل ہو جاتی جس کے لئے ہم برسوں سے کوششیں کر رہے ہیں اور اس کا تھوڑا سا حصہ تجھے مل جاتا.......... مگر وہ تھوڑا سا حصہ بھی اتنا ہوتا کہ تیرے پرکھوں نے بھی خواب میں نہ دیکھا ہوتا۔ لیکن تو بھی.......... تو بھی عجب ہے۔ ساری رسی جل گئی۔ پر بل ہیں کہ کھلتے ہی نہیں۔ اب بھی سمے ہے۔ ارے ہم نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ اب بھی سمے ہے۔ مان لے ہماری بات۔ چھوٹا سا کام ہے اور صلہ جو ملے گا تجھے بس کیا کہیں اس کے بارے میں تجھے۔ کیا کہہ سکتے ہیں تجھ سے.........."

میں نے ایک گہری سانس لی اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اتنا کھو چکا ہوں کہ بھوریا چرن کہ اب کھونے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ایک جذبہ ہے میرے سینے میں۔ وہ یہ کہ وہ گندا کام نہیں کروں گا جو تو چاہتا ہے اس جذبے کو نہیں کھوؤں گا بھوریا چرن۔ یہ جذبہ میرا ایمان بن چکا ہے۔ یہ جذبہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ چاہے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ تو زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے تو۔ میری جان ہی لے سکتا ہے نا مجھ سے۔ مجھے اس جان سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو بالکل ہی بے جان ہے۔ کوئی مقصد نہیں ہے میری زندگی کا کچھ نہیں رہا ہے میرے پاس۔" بھوریا چرن کے ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں ابھری پھر اس نے کہا۔

جان لیتا تو کب کی لے سکتا تھا۔ بہت مان ہے تجھے اپنے ایمان پر۔ بہت جذبے ہیں تیرے سینے میں۔ ارے پگلے جان تو میں نے کسی کی بھی نہیں لی۔ تیرے ماتا پتا جیتے ہیں۔ تیری بہن زندہ ہے۔ تیرا بھائی جسے تو نے سمندر پار بھگا دیا جی رہا ہے اور تو بھی جیتا ہی رہا ہے ریل کا حادثہ ہوا تھا۔ ارے خود تھوڑی ہوا تھا۔ انجن اتار پھینکا تھا ہم نے پٹری سے۔ پٹری ہی توڑ دی تھی۔ وہ سورما جو تیرے ساتھ تھا بہت بڑا بنتا تھا۔ تعویذ گلے میں ڈالے رہتا تھا۔ ٹھیک ہے ہم اس تعویذ کی وجہ سے اس کے پاس نہیں جا سکتے تھے مگر ریل کے پاس تو جا سکتے تھے۔ کیسی رہی......؟"

میں خونی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ریل کے حادثے میں اس کا ہاتھ تھا۔ ستر آدمی مرے تھے صرف میری وجہ سے اور لاتعداد زخمی ہوئے تھے۔ میرا جنون عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں اس پر چھلانگ لگا دی۔ یہ کتا اگر میرے ہاتھ آجائے تو اپنے دانتوں سے اس کا نرخرہ ادھیڑ ڈالوں گا نہیں چھوڑوں گا اسے نہیں چھوڑوں گا۔

خاصی اونچی چھلانگ تھی اور ایک لمحہ گزرنے والا تھا کہ میں اس پر جا پڑتا.......... لیکن.......... لیکن ....میرے اور اس کے درمیان نجانے کیا چیز حائل ہو گئی تھی۔ نجانے وہ کیا تھا۔ میں خلاء میں ہی معلق رہ گیا.......... میں نے ہاتھ پاؤں مارے تو میرے ہاتھ پاؤں جیسے کسی لیس دار چیز میں جکڑتے چلے گئے۔ تب میں نے اس لیس دار چیز کو دیکھا موٹی سی رسی کی مانند بے رنگ جالے تھے۔ مکڑی کے جالے۔ لیس دار بدن سے چپک جانے والے.......... اتنے مضبوط کہ انہوں نے میرے جسم کا پورا بوجھ سنبھال لیا تھا

میں ان لیس دار جالوں سے لٹک کر بے بس ہو گیا۔ جتنے ہاتھ پاؤں چلائے اتنے ہی یہ جالے مجھ سے لپٹتے چلے گئے اور پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ میں جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں بھوریا چرن مجھے نظر آرہا تھا۔ وہ اسی طرح پاؤں پھیلائے مجھ سے بے تعلق بیٹھا ہوا تھا۔ یہ گھناؤنے لیس دار جالے چھت سے لے

کر زمین تک پھیلے ہوئے تھے اور بے رنگ ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ پھر ان جالوں پر کوئی شے متحرک نظر آئی۔ اس تحریک سے میرا بدن بھی جالوں میں لپٹا ہل رہا تھا۔ آہ یہ مکڑیا تھیں دس گیارہ مکڑیاں جو ان جالوں پر نمودار ہوئی تھیں۔ اور اپنی پیلی بدنما آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی مختلف سمتوں سے چلتی ہوئی میری سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان کا جسم کوئی ایک بالشت کا ہوگا۔ میں ان کے پورے جسم کو دیکھ سکتا تھا۔ بھوریا چرن نے کہا۔

" یہ میرے بیر ہیں. میری حفاظت کرتے ہیں۔ میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں یہ میرے لئے جاگتے رہتے ہیں۔ تم ایسا کبھی مت سوچنا۔ میرا کچھ بھی نہیں بگڑے گا تمہیں نقصان ہوجائے گا۔ اگر ہاتھی بھی میری طرف بڑھے تو یہ جالے اسے لپیٹ لیں اور وہ ہل نہ پائے۔ یہ بیر اسے آنکھ جھپکے چٹ کر جائیں۔ یہ کالا جادو ہے بالک کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ مگر کیا کروں تیرے بھاگ ہی خراب ہیں۔ دھرم دھرم کی رٹ لگائے ہوئے ہے ارے شکتی ہی دھرم ہے۔ مایا شکتی ہو یا کایا شکتی۔ اس کے بناء کچھ نہیں ہوتا۔ کیا دے گا تیرا دھرم تجھے۔ کیا بگاڑ لے گا تیرا دھرم میرا .... میرا گیان مہان ہے۔ "

" چاند خان پر تیرا جادو کیوں نہ چلا۔ ان کا کچھ کیوں نہ بگاڑ لیا تو نے اس تعویذ کے پاس جاتے ہوئے تیری جان کیوں نکلتی تھی بھوریا چرن .... " میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور وہ مکروہ ہنسی ہنس پڑا۔

" وہ کہاں جیتا ہے۔ ساٹھ ستر اور لے مرا اپنے ساتھ۔" اس نے کہا۔

" مجھے اس مزار پر جانے دے۔ پھر تیری شکتی دیکھوں۔ "

" خطرناک راستے بند کرنا بھی عقلمندی ہے، اور عقل بھی ایک شکتی ہوتی ہے باؤلے۔ اب بھی مان لے میری، چھوٹا سا کام ہے بہت چھوٹا سا اس کے بدلے تجھے جو کچھ ملے گا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھاگن دوار پہنچا دے مجھے بس ایک بار ایک ہی بھاؤنا ہے من میں. بدلے میں بتادے کیا چاہئے۔ جیون بھر کا سکھ، شانتی دھن دولت کے ڈھیر سنسار جھکا دوں گا تیرے چرنوں میں۔ جو مانگے گا دوں گا بول کے تو دیکھ۔ "

" بھوریا چرن۔ اتنا کچھ ہے تیرے قبضے میں .... " میں نے کہا۔

" اس سے بھی زیادہ بالک، اس سے بھی زیادہ۔ بھوریا چرن نے جیون بھر کیا کیا ہے ساری عمر گیان لینے میں بتائی ہے بڑے بڑے رشی منیوں کے چرنوں کی دھول پھانکی ہے اور اب سمے آگیا ہے۔ سمے آگیا ہے کہ .... " وہ کسی خوش آئند خیال میں کھو گیا پھر چونک کر بولا .... " ہٹو رے۔ ہٹو اس کے پاس سے۔ آجا بچہ نیچے اتر آ .... ! " اور اچانک میں جالے کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ مکڑیاں واپس چلی گئی تھیں۔

" بھوریا چرن۔ اتنا کچھ ہے تیرے قبضے میں اور تو سڑھیاں چڑھ کر پیر پھاگن کے مزار تک نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے تجھے کسی اور کا سہارا چاہئے۔ " میں نے طنزیہ کہا اور اس کا چہرہ آگ ہوگیا۔

" یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ "

" ہے بھوریا چرن. تیرا علم گندہ ہے۔ سفلی ہے۔ ناپائیدار ہے اور وہ ایک پاک بزرگ کا مزار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تو وہاں کیوں جانا چاہتا ہے لیکن ایک بات ضرور جانتا ہوں۔ تیرا ناپاک وجود اس پاک جگہ نہیں جانا چاہئے۔ کم از کم میں اس کا ذریعہ نہیں بنوں گا۔ ہم مقدس جگہوں کا احترام اپنی زندگی سے زیادہ کرتے

ہیں۔ " وہ طیش کے عالم میں کھڑا ہوگیا۔ " ہے رے کتے کی پونچھ۔ ارے تیری ٹیڑھ تو ہم ایسے نکالیں گے کہ یاد رکھے گا۔ جا مر۔ بھاگ جا یہاں سے۔ اپنی ضد کے مزے چکھ ٹھیک ہوگا خود ٹھیک ہوگا۔ "

" اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا اور بھوریا چرن دندناتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

میرے لئے اب وہاں رکنا بیکار تھا۔ چنانچہ میں بھی مکان سے باہر نکل آیا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ خیالات پریشان تھے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ خیالات میں ڈوبا جارہا تھا کہ راستے میں شگفتہ نظر آئی۔ کالج کے یونیفارم میں تھی مجھے نہیں دیکھ پائی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے آرہی تھی۔ ہوسکتا ہے تعلیم حاصل کرتی ہو۔ گھر واپس آگیا۔ پاؤں خود بخود یہاں لے آئے تھے۔ اور کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہی شام. وہی معمولات۔ مہمانوں کے لئے پھولوں کے ہار لینے نکلا تھا کہ تماش بینوں میں ایک صورت نظر آئی اور ساری جان آنکھوں میں کھنچ آئی۔ آہ کیا یہ ماموں ریاض ہی ہیں۔ ؟

آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ یہ ان صورتوں میں سے ایک صورت تھی جو آنکھوں کی حسرت بن چکی تھیں۔ ماموں ریاض ہمارے ماموں ہی نہیں دوست بھی تھے۔ اتنا اچھا وقت گزرا تھا ان کے ساتھ کہ اب یاد بھی کرتا تو یقین نہیں آتا تھا۔ مگر وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ تین اور آدمی بھی تھے۔ ایک لمبے تڑنگے نوابوں جیسے حلیے کے صاحب. باریک ململ کا کڑھا ہوا کرتا پہنے سلک کی شیروانی جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے، دودھ جیسا سفید رنگ. تلوار کٹ سیاہ مونچھیں، سر پر کالی ترچھی ٹوپی، چوڑی دار پائجامہ جس میں کلابتو کے پھندنے والا ازار بند جس کا پھندنا کرتے سے نیچے، وارنش کا لوفر شو جس کی "چرر چرر" شور کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی۔ دوسرے دو بھی کسی حد تک ایسے ہی لباس میں ملبوس تھے۔ البتہ ماموں ریاض شلوار قمیض پہنے ہوئے صاف ستھرے نظر آرہے تھے مگر ان صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے ان کا انداز بھی مؤدبانہ نظر آتا تھا۔

دل نے پورا یقین کرلیا کہ یہ ماموں ریاض ہی ہیں۔ بدن میں پھریری سی آئی۔ پاؤں آگے بڑھے۔ جی چاہا دوڑ کر لپٹ جاؤں۔ اتنا روؤں کہ آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ بہہ جائیں۔ مگر عقل نے روکا۔ اپنے بارے میں کچھ اندازہ ہے مسعود. ہاتھوں میں پھولوں کے ہار کے پڑے دبے ہوئے ہیں۔ ایک بری جگہ رہتا ہے. حرام کی کمائی پر جی رہا ہے۔ کیا لگ رہا ہے اس کا علم ہے اور پھر .... اس کے بعد کیا ہوگا وہی سب کچھ نا جس سے بچنا چاہتا ہے۔ آہ، مگر ماموں کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ پتہ تو لگے کہ وہ شکتی پور میں کب آئے. امی اور ابا کہاں ہیں سب کیسے ہیں۔ انہیں محمود کے بارے میں بتاؤں، نہ جانے امی اور ابا کا کیا حال ہوگا۔

" رتنا .... ! " کسی نے مجھے پکارا اور میں چونک پڑا۔ گھوم کر دیکھا مالتی تھی .... " یہاں کھڑے سو رہے ہو۔ وہاں رما رانی انتظار کر رہی ہیں تمہارا۔ "

" مالتی۔ تم یہ ہار لے جاؤ۔ مجھے کچھ کام ہے۔ "

" ارے نے کر جاؤ دوڑتے ہوئے۔ میں دوسرے کام سے جارہی ہوں! " مالتی نے کہا اور گردن جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ میں رک کر ان لوگوں کو دیکھتا رہا وہ سامنے والے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ لوگ بیلاوتی کے مہمان ہیں۔ پہلے ہار دے آؤں اس کے بعد آجاؤں گا اور پھر کچھ سوچوں گا۔ تیزی سے آگے بڑھا. اوپر پہنچا تو شریر کشنا نظر آئی۔ زرق برق جوڑے میں ملبوس سرخی پوڈر سے سجی ہوئی آنکھوں

میں کاجل کے ڈورے سجے ہوئے۔

"گجرے لائے ہو..........؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس میں ہیں۔ یہ سنبھالو مجھے کچھ کام ہے۔" میں نے اسے پڑے دینے کی کوشش کی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"مجھے بھی کام ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

"کشنا لے لو جلدی سے بڑا نقصان ہوجائے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"نا رتن جی۔ آؤ مجھے بھی کام ہے تم سے۔ مالتی نہیں ہے ورنہ تمہیں تکلیف نہ دیتی۔" وہ واپس مڑ گئی۔ رمارانی، رادھا اور لکشمی ہال کمرے میں تھیں جہاں طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے ساتھ گھنگرو چھنک رہے تھے۔ مجبوراً میں کشنا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگیا۔ کشنا نے پڑے کھولے گجرے نکالے اور پھر موتیا کے پھولوں کا ایک ہار مجھے دے کر بولی۔ "اسے میرے بالوں میں سجاؤ۔"

"کشنا میں.........." میں نے پھر خوشامد کی۔

"باندھو رتن۔ پھول لگانے سے تم پتی نہیں بن جاؤ گے میرے۔ چلو لگاؤ۔" مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے ایسے نہیں چھوڑے گی مجبوراً اس کے بالوں میں پھول سجائے اس نے کلائیوں کے گجرے اٹھا کر مجھے دیئے۔ "انہیں میرے ہاتھوں میں سجاؤ۔"

"تم مجھ پر ظلم کر رہی ہو کشنا..........!"

"تم نے بھی تو ہم پر ظلم کر رکھا ہے نہ جانے کب سے۔ باندھو بھئی دیر ہو رہی ہے۔" خاصی دیر لگی اس سے پیچھا چھڑا کر میں پھر نیچے بھاگا پوری گلی میں نظر دوڑائی۔ وہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ اطمینان ہوا کہ وہ بیلاوتی یعنی شکنتا کے کوٹھے پر ہیں۔ اب کیا کروں۔ کیا اوپر چلا جاؤں۔ مگر پھر۔ پھر کیا کروں گا۔ ماموں کے سامنے اس طرح نہیں جانا چاہتا تھا۔ نجانے کیا ہوجائے۔ ذرا بھی کسی کو اندازہ ہوگیا میرے بارے میں تو شاید اس بار پولیس مجھے گرفتار کرنے کی زحمت بھی نہ کرے گی دیکھتے ہی گولی مار دی جائے گی. کیونکہ اب میں صرف دو آدمیوں کا قاتل نہیں تھا بلکہ پولیس کے دو افراد بھی میرے ہاتھوں مارے جاچکے تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ پاگل کی حیثیت سے نجانے کیسے یہاں وقت گزار تا رہا تھا اور کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا, ابھی تک تو محفوظ تھا لیکن کمینہ صفت بھوریا چرن کی ایک ہلکی جنبش, مجھے پھر مصیبتوں میں گرفتار کر سکتی تھی. اس کا خوف تو لمحہ لمحہ رہتا تھا, میرے ساتھ جو بھی ہوگا عذاب میں گرفتار ہوجائے گا۔ نجانے بیچارے ماموں ریاض کیا کر رہے ہیں اور کس طرح یہ لوگ اپنے آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں ماموں ریاض کی جو جھلک دیکھی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بہت زیادہ بے کسی کا شکار نہیں ہیں, مگر کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔ شکتی پور میں کیسے آنا ہوا, کیا یہیں رہتے ہیں, یہ ساری باتیں ذہن کے پردوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ فیصلہ کیا کہ جب وہ نیچے اتریں گے تو ان کا پیچھا کروں گا, یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ کہاں رہتے ہیں, بعد میں سوچا جائے گا کہ کیا قدم اٹھانا ہے اس بات پر دل جم گیا تھا۔

بہت دیر تک پوری گلی کے چکر لگاتا رہا۔ یہاں جو کچھ ہوتا تھا اب میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا, ان لوگوں کے فوری طور پر نیچے آنے کا امکان نہیں تھا, اگر رقص کی محفل میں جم گئے تو رات کے بارہ تو بجیں گے. کچھ بھی ہوجائے میرے لئے اس سے زیادہ قیمتی کام اور کیا ہو سکتا تھا, فتح محمد پنواڑی کی دکان پر

رک گیا اور دکان کے قریب لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کے نیچے جو ایک سیمنٹ کا تھڑا سا بنا ہوا ہوتا ہے اس پر بیٹھ گیا. فتح محمد کے ہاتھ برق رفتاری سے چل پڑے تھے اور وہ پانوں کے انبار لگائے جا رہا تھا۔ گاہک آتے, فتح محمد ان سے طرح طرح کی باتیں کرتا اور پانوں کی گلوریاں بنا کر انہیں پیش کر دیتا۔ اس کی چرب زبانی سننے کے قابل تھی تھوڑی دیر کے لئے گاہکوں کا توڑا ہوا تھا تو اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

"بھئی رتن لال جی آج یہاں کیسے بیٹھے ہوئے ہو, اداس اداس سے۔ جھگڑا ہوگیا گھر میں کسی سے..........؟" میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے بات کی تو جواب دینا بھی ضروری تھا, میں نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا.......... "میرا کس سے جھگڑا ہوگا بھائی فتو..........؟"

"ہو بھی سکتا ہے, ویسے ایک بات اپنی کھوپڑی میں ایسی اٹکی ہوئی ہے کہ کھوپڑی کا بھوسہ نکل گیا ہے, سوچ رہے تھے کہ تم سے پوچھیں گے جب بھی ہاتھ لگو گے ضرور پوچھیں گے.........."

"کیا بھائی فتو.........." میں نے پوچھا۔

"یار اس دن جب تم ہم سے باتیں کر رہے تھے تو تمہارے منہ سے اچانک میرے خدا نکلا تھا, یہ کیا چکر ہے, تم تو ہندو ہونا..........؟"

میں حیران رہ گیا, میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ ایسی کوئی بات ہوگئی ہے. یقیناً ہوا ہوگا ایسا ہی مگر کیا جواب دوں اس کو, خوامخواہ ہنس پڑا..........

"فتح محمد بہت زیادہ گہرائیوں میں نہیں جاتے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پردے میں رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

"لو اور سنو, اماں کیا ہم کسی سے کہنے جا رہے ہیں, یار نہیں ہو ہمارے, بس ذرا یہ بتا دو کہ تمہارے منہ سے بھگوان, بھگوان کیوں نہیں نکلا..........؟"

"بتا دیں گے فتح محمد, کسی فرصت کے وقت بتا دیں گے۔"

"لو گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو, فرصت نہیں ہے تمہیں اماں کیا کسی کا انتظار کر رہے ہو..........!"

"ہاں یہی سمجھ لو.........."

"کس کا..........؟" فتح محمد نے کہا۔ شکر تھا کہ کچھ گاہک اس کی دکان پر آگئے, میں اسے جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گاہکوں میں الجھا تو میں آہستہ سے اس کی دکان پر سے اٹھ گیا اور اس کے بعد وہاں سے کافی دور چلا گیا۔ میری نگاہیں کوٹھے پر لگی ہوئی تھیں۔ وقت گزرتا رہا بیٹھے بیٹھے اور گھومتے گھومتے پورا بدن تھک گیا تھا, اچانک ہی مالتی مجھے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔

"اے تم نے تو مار ہی ڈالا رتن لال جی, کہاں چلے گئے تھے, ارے چلو بلا رہی ہیں.........."

"کیا کام ہے.........." میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا..........

"لو تم بھی مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو, ادھر سے بھی ڈانٹ پڑ رہی ہو اور ادھر سے بھی۔ اب کام تو تمہیں رمارانی ہی بتائیں گی۔ ہم کیا بتائیں۔"

"تم چلو میں آ رہا ہوں.........."

"ساتھ چلو, یہی کہا ہے انہوں نے۔" میں دانت پیستا ہوا مالتی کے ساتھ واپس چل پڑا۔ بہتر یہ تھا

کہ کسی ایسی جگہ روپوش ہو جاتا جہاں سے کوئی مجھے دیکھ نہ پاتا. خواہ مخواہ یہ لوگ ذہن خراب کر رہے
گھر واپس پہنچا تو رمارانی نے ایک کام میرے سپرد کر دیا۔ میں بھلا ان سے کیا کہتا. کوئی دس پندرہ
مصروف رہنا پڑا۔ اور اس کے بعد جیسے ہی کام ختم ہوا. میں مالتی سے کہہ کر وہاں سے نکل بھاگا. تھ
دیر کے بعد پھر میں ایک ایسی جگہ کھڑا انتظار کر رہا تھا. جہاں سے بیلاوتی کے کوٹھے کا دروازہ صاف نظر
تھا، بارہ بج گئے. ساز و آواز کا کھیل ختم ہو گیا اور مہمان اتر اتر کر گلی سے باہر کھڑے ہوئے تانگوں کی جان
بڑھ گئے۔ کچھ کی اپنی موٹریں تھیں۔ اور کچھ تانگوں وغیرہ میں آئے تھے۔ باقی پیدل ہی چل پڑے
.... لیکن بیلاوتی کے زینے سے وہ لوگ نیچے نہ اترے۔ میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ بیلاوتی
کوٹھے سے دوسرے بہت سے مہمان نیچے اترے تھے. پتہ نہیں وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے. کچھ
وقت گزرا تو میری پریشانی انتہا کو پہنچ گئی اور اب میں اپنے قدم نہیں روک سکا تھا .... یہ کیا ہوا۔ تیز
سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر پہنچا اندر سارا ساز و سامان سمٹ رہا تھا۔ ایک ہی انداز ہوتا تھا ان کوٹھوں
زندگی کے آغاز کا .... اور اختتام کا .... بیلاوتی نے مجھے دیکھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں
تھیں، مجھے دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ شکنتا موجود نہیں تھی۔ بیلاوتی نے نرمی سے

"ارے رتنا تو .... تو .... آ آ .... کسی کام سے آیا ہے کیا؟"

"نہیں نہیں .... وہ بیلا جی .... بیلا جی ...."

"ارے یہ بیلا جی کیا ہوتی ہے بھئی، چاچی جی کہتا تھا تو مجھے آج بیلا جی کیسے کہہ رہا ہے۔ بھول
اسے، ارے رتنا میں تیری چاچی ہوں چاچی، سمجھا ....؟"

"ہاں چاچی وہ۔ کچھ کام تھا آپ سے ...."

"رمارانی نے بھیجا ہے کیا ....؟"

"نن نہیں۔ میں خود آیا ہوں۔"

"تو اندر آ، ایسے اجنبیوں کی طرح باہر کیوں کھڑا ہوا ہے، آ بیٹھ بڑی دیر میں آیا، کیا بات ہے ...."

"کچھ معلوم کرنے آیا ہوں بیلا جی۔"

"پھر بیلا جی ...."

"نن نہیں میرا مطلب ہے چاچی جی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا معلوم کرنے آیا ہے اور آج یہ تو کیسا بہکا بہکا سا ہے چل چھوڑ کیا معلوم کرنے آیا
..........."

"وہ چار مہمان ایک ساتھ آئے تھے، ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ...."

"چار مہمان۔" بیلاوتی نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ اور پھر ہنس پڑی پھر بولی۔ "یہاں تو چار
کر کے بہت سے مہمان آئے تھے ...."

"نہیں وہ ایک صاحب، تلوار مار کہ مونچھیں تھیں ان کی، کالی ٹوپی پہنے ہوئے تھے کرتا، شیروا
.... اور .... اور ...."

"اوہو اچھا سمجھ گئی ہاں کہیں باہر سے آئے ہوئے تھے شاید مراد آباد سے۔" بیلاوتی نے

"کب چلے گئے"

"وہ تو بہت دیر پہلے اٹھ گئے تھے تھوڑی دیر بیٹھے تھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہونگے۔ مگر تھے کوئی رئیس قسم کے آدمی۔"

"نام نہیں پتہ ان کا ...."

"پوچھا تھا۔ نام نہیں بتایا، کہنے لگے مسافر ہیں ناموں میں کیا رکھا ہے. بس فن کے قدردان ہیں، فن دیکھنے آگئے تھے۔ شکنتا کو بہت کچھ دیا ہے انہوں نے، اچھے صاحب حیثیت معلوم ہوتے تھے۔"

"یہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ مراد آباد کے ہیں؟"

"بس یونہی انہوں نے خود ہی بتایا تھا. کہنے لگے کہ مراد آباد سے آئے ہیں، آپ کی دھوم سن کر، ہم نے نام بھی پوچھا مگر بتایا نہیں ...."

"اوہ۔ وہ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔"

"ہاں سب ان کے مصاحب معلوم ہوتے تھے، کوئی اچھے خاصے نواب وغیرہ لگتے تھے. رئیس آدمی تھے۔"

"کیا وہ میرا مطلب ہے کہ واپس مراد آباد چلے گئے۔"

"لے، مجھے کیا معلوم، مگر تجھے ان کی کھوج کیوں لگی ہوئی ہے۔؟" بیلاوتی نے کہا۔

"نہیں چاچی جی، بس ایسے ہی، عجیب سے لوگ تھے، نجانے کیوں جانے پہچانے سے لگ رہے تھے، معلوم کرنا چاہتا تھا کون ہیں۔" بیلاوتی نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"لے مجھے کیا معلوم تھا، پتہ چل جاتا تو نام پتہ بھی پوچھ لیتی ان کا .... اب اتنا تو تجھے پتہ ہی ہے، یہاں نجانے کون کون آتا ہے، بڑے بڑے تیس مار خان ہوتے ہیں ان میں مگر ہمیں ان کی تیس مار خانی سے کیا لینا ہمیں تو بس اتنا ہی کام ہوتا ہے ان سے جتنی ضرورت ہو، آ بیٹھ، کچھ کھائے پیئے گا؟"

"نہیں چاچی، بہت بہت شکریہ۔" میں نے مایوسی سے کہا، دل رو رہا تھا. یقیناً ان دونوں لمحات میں سے کوئی لمحہ ان کے جانے کا ہو سکتا تھا، جب مجھے گھر واپس جانا پڑا تھا، سب پر غصہ آ رہا تھا. کشنا نے مجھے پھولوں میں الجھا لیا تھا اور مالتی مجھے بلانے آگئی تھی۔ آہ بہت ہی برا ہوا، بہت ہی برا .... بری طرح نڈھال ہو گیا تھا، دل پر ایک عجیب سا بوجھ لئے واپس آیا، اور اپنے کمرے میں آ کر پڑ رہا۔ یہ تو بہت برا ہوا، کیا ماموں ریاض بھی ان کے ساتھ مراد آباد سے آئے تھے۔ مراد آباد .... مراد آباد ....

لیکن وہ فوراً ہی مراد آباد چلے تو نہیں گئے ہونگے۔ شکتی پور میں نجانے کہاں ٹھہرے ہونگے۔ بہرحال شکتی پور بھی اتنی چھوٹی جگہ نہیں تھی کہ میں ایک ایک گھر میں جھانک کر انہیں تلاش کر سکتا۔ آہ میری بدنصیبی نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، اگر ہمت کر کے ماموں ریاض سے مل ہی لیتا تو کیا ہو جاتا، جو ہونا ہے وہ تو ہر قیمت پر ہی ہو گا۔ ایک بار پھر وہ میرے ہاتھ سے نکل گئے تھے. جی چاہا کہ دیوانہ وار باہر نکل جاؤں۔ گلی گلی، کوچے کوچے میں ماموں ریاض .... ماموں ریاض پکارتا پھروں. لیکن اس سے کیا ہو گا۔ شکتی پور میں زیادہ اچھے ہوٹل تو نہیں تھے۔ لیکن وہ نواب قسم کے آدمی تھے ہو سکتا ہے کہ کسی ہوٹل ہی میں ٹھہرے ہوں۔ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ فیصلہ کیا کہ ہوٹلوں کے چکر لگاؤں، معلوم کروں۔ لیکن

نام پتہ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ دیوانگی ہی ہوتی .... دیوانگی ہی تھی میری .... میں ریاض کو پھر سے کھو بیٹھا تھا۔

لیکن ماموں ریاض۔ آخر وہ یہاں کیسے آئے .... وہ تو ان چکروں میں کبھی نہیں تھے۔ یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا مجھے کہ وہ شوقین صاحب جو عجیب سا حلیہ بنائے ہوئے تھے۔ ماموں ریاض کو لائے ہوں گے ساتھ، ورنہ ماموں ریاض تو بڑے نیک فطرت آدمی تھے لیکن وہ مجبور کیسے ہو گئے۔ بہت سی باتیں تھیں جو ذہن میں چکرا رہی تھیں، لیکن جواب کسی بات کا نہیں مل رہا تھا۔ بڑا دکھ ہوا تھا مجھے اپنی اس حماقت پر۔ زیادہ سے زیادہ یہ تو کیا جا سکتا تھا کہ ماموں ریاض کا پیچھا کر کے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا جاتا اور پھر ان سے ملا جاتا۔

دل میرے مختلف سوالات کے جواب خود ہی دے رہا تھا ہو سکتا ہے ماموں ریاض سے ملنے کے بعد صورتحال کچھ اور زیادہ پریشان کن ہو جاتی۔ وہ مجھے نہ چھوڑتے، گھر لے جاتے۔ امی اور ابا کے پاس لے جاتے .... اور .... پھر میں ان کے ساتھ رہتا اور وہ مصیبتوں کا شکار ہو جاتے .... آہ کچھ ہوا بہتر ہی ہوا، میں نے ٹھنڈی سانس لیکر سوچا .... ماں باپ کو بہن، بھائی کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے یہ آنسو نہ جانے کب تک تکیہ بھگوتے رہے تھے اور بھیگے ہوئے تکیے پر رخسار رکھ کر سو گیا۔ آنسوؤں کی ٹھنڈک خواب آور بن گئی تھی۔ صبح دل بڑا بوجھل تھا۔ سارا دن بے کیف گزرا شام ہوئی۔ رات ہو گئی لیکن اب میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس سے زیادہ یہاں رہنا ممکن نہیں تھا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کسی سے رشتہ قائم ہو جائے کسی سے ٹوٹ جائے لیکن بھوریا چرن مجھے نہیں چھوڑے گا۔ کہیں نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے مجھے اپنے کام پر آمادہ کرنے کے لئے وہ ہر گر آزما سکتا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ تھے۔ ہر ایک کا اپنا معاملہ تھا۔ کسی کو بھی میری وجہ سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ البتہ ایک اندازہ میں بار ہا لگا چکا تھا۔ بھوریا چرن نے اب تک صرف ان لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا تھا جو میری کہانی سے یا اس سے واقف ہوتے تھے یا جو میرے اس مسئلے کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ ہوئے تھے جن لوگوں کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا وہ محفوظ رہتے تھے۔ پھر بھی خطرہ رہتا ہے یہاں مجھے بہت سی پریشانیاں تھیں۔ ضمیر اس ماحول کو برداشت نہیں کر رہا تھا یہ لوگ کچھ بھی ہوں میرے حق میں برے نہیں تھے اگر میری وجہ سے انہیں نقصان پہنچا تو کچھ نہیں کر سکوں گا ان کے لئے شکنتلا اور کشنا کا معاملہ تھا۔ پولیس تھی نہ جانے کیا کیا تھا یہاں سے اب نکل جانا چاہئے۔ آخری فیصلہ کر کے بہت وقت گزرا تھا یہاں، عالم بے ہوشی میں اور اب عالم ہوش میں رما دیوی کے احسانات بھی تھے مجھ پر۔ جانے سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک کاغذ اور قلم تلاش کیا میں نے اور لکھنے بیٹھ گیا میں نے لکھا

رما رانی جی!

بڑے فخر سے، بڑے مان سے میں آپ کو ماتاجی کہہ سکتا ہوں اس دن آپ نے کہا تھا کہ میں ہوش میں آؤں گا تو اس جگہ کو برا سمجھوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس وقت ہوش میں آ چکا تھا سب کچھ جان چکا تھا سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ رما جی اس دنیا کو میں نے بہت زیادہ نہیں دیکھا۔ جتنا دیکھا ہے وہ مجھے بتاتا ہے کہ ماں کسی شکل میں ہو ماں ہوتی ہے۔ میرا مسئلہ کچھ اور ہے میں ایک مسلمان لڑکا ہوں اپنی غلط کاریوں کے عذاب سے گزر رہا ہوں۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں میری نحوست میرے سر پر سوار ہو کر

نقصان پہنچاتی ہے کئی بار کا تجربہ ہے اور میں اس گھر میں اپنی نحوستیں نہیں چھوڑنا چاہتا اس لئے یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ اگر میں ان نحوستوں کو شکست دے سکا تو ایک بار عقیدت کے پھول لے کر آپ کے گھر ضرور آؤں گا۔ اور آپ کو بھری محفل میں ماں کہہ کر پکاروں گا کیونکہ آپ اس قابل ہیں کہ آپ کو ماں کہا جائے۔

آپ کا بدنصیب رتن۔

یہ کاغذ تہہ کر کے تکیے پر رکھا۔ باہر نکلا تو مالتی نظر آئی۔ میں نے اسے روکا۔

"مالتی کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔"

"کتنے رتن جی؟"

"دو چار سو"

"یہ دو سو ہیں اور لا دوں۔"

"نہیں بس کافی ہیں۔" میں نے کہا اور پیسے جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ بہت افسردہ تھا۔ دنیا کے لئے یہ بہت بری جگہ تھی لیکن مجھے یہاں بہت پیار ملا تھا بڑی اپنائیت ملی تھی دل دکھ رہا تھا اس جگہ کو چھوڑتے ہوئے۔ سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا اور جو پہلی ٹرین آئی اس میں بیٹھ گیا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ یہ کہاں جا رہی ہے۔

ریل میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہمیشہ ہی ہوتے تھے یہ میرا پہلا سفر تو نہیں تھا۔ یہ سب مجھ سے کتنے مختلف ہیں بیشک ان کے ساتھ مسائل ہوں گے لیکن مجھ سے مختلف۔ یہ ان کا حل تو پا سکتے ہیں میری مشکل کا کوئی حل تو دور دور تک نہیں ہے۔ میرے ذہن میں تو کوئی راستہ ہی نہیں آتا۔ نجانے میری انتہا کیا ہے؟ اب تو درد ہی دوا بنتا جا رہا تھا۔ اتنی مشکلیں آ گئی تھیں زندگی میں کہ آنے والی کسی مشکل کا خوف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور کر سکتا تھا کہ کسی اور کو اپنی مشکل کا شکار نہ ہونے دوں۔ اور یہ کر رہا تھا میں۔ ان مشکلات میں جینا سیکھ رہا تھا۔ مگر ان محبتوں کا کیا کرتا جو دل کے گوشے میں جا گزیں تھیں۔ ان پیاروں کو کیسے بھول سکتا تھا جن کے ساتھ ہوش کی صبح ہوئی تھی۔ سچی بات ہے کہ اب تو زندگی سے دلچسپی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھ پر بہت سے مقدمے قائم تھے۔ ہو سکتا ہے اب تو مجھ پر کوئی انعام بھی رکھ دیا گیا ہو۔ گرفتار ہو جاؤں تو کچھ برا بھی نہ ہو گا مگر وہ منحوس مجھے مرنے تو دے۔

آنکھوں میں غنودگی سی آ گئی۔ شاید کچھ نیند کے جھونکے بھی آئے تھے قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے ہمدردی سے ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔

"نیند آوت رہے بیرا۔ لو لیٹ جاؤ۔ سو جاؤ۔ ہم جاگت رہیں۔"

"نہیں باباجی شکریہ آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"نا ہوت نا۔ کا ہے کی تکلیف سفر ہے کتنا، کٹ جاوے گا لیٹ جاؤ۔"

"آپ مجھ سے باتیں کریں باباجی، چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا اس لئے نیند کے جھونکے آنے لگے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری مرضی!"

"آپ کہاں جا رہے ہیں باباجی ...."

"بیکانیر، ہمار بٹیا کی سسرال ہے ہواں اسے لینے جاوے ہیں!۔ "

"کہاں کے رہنے والے ہیں۔ "

"گاؤں ہمار رتولی رہے۔ سقے کا کام کریں ہیں ہواں۔ بیس گھر لگا رکھے ہیں مولا گزر کرا دیوے ہے۔ " معمر شخص نے کہا مگر اس کے الفاظ میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھے رتولی کا نام میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے کسی قدر بے صبری سے پوچھا۔

" آپ رتولی کے رہنے والے ہیں۔ ؟"

"ہاں بیرا کیوں۔ "

"کیا نام ہے آپ کا"

"امام بخش۔ "

"بابا امام بخش آپ تو وہاں کے رہنے والے سب لوگوں کو جانتے ہوں گے۔ "

"وہاں پرکھوں سے آباد ہیں پر اب نئی نگری بس گئی ہے ہواں کچھ نئے لوگ آباد ہوئے ہیں۔"

"وہاں ایک نیک بزرگ رہتے تھے بڑے سچے اور دیندار آدمی تھے میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔"

"پرانے آباد تھے؟"

"ہاں! بہت پرانے۔ " میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"بڑے اچھے اچھے منوئی آباد ہیں ہواں۔ ابراہیم نانا ہیں، حمید اللہ خان ہیں۔ علیم الدین خان مرحوم تھے۔ گلاب علی تھے بے چارے ہندو مسلمانوں کے جھگڑے میں مارے گئے۔ "

دماغ میں چھناکہ سا ہوا۔ ایک نام شناسا تھا سو فیصد چاند خان نے یہی نام لیا تھا۔ علیم الدین خان آ... یہی نام تھا۔ میں نے بے اختیار کہا۔ "ہاں علیم الدین خان، علیم الدین خان۔ "

"فوت ہوگئے بے چارے دمہ دم لے کر ٹلا۔ دمے کے مریض تھے اور پھر عمر بھی اسی سال ہوگئی تھی۔"

"انتقال ہوگیا ان کا۔ " میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"لو۔ آج کی بات ہے۔ ؟ سات آٹھ سال ہوگئے کوئی رشتے دار تھے تمہارے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا عجیب سی کیفیت ہورہی تھی روشنی اندھیرا روشنی اندھیرا ایسی ہوا تھا آج تک۔

"وہاں ایک پرانی مسجد تھی جس میں کسی نامعلوم بزرگ کا مزار تھا۔ " بالآخر میں نے کہا۔

"اسی پر تو جھگڑا چلا تھا۔ کم ذات ہریالال نے سرکار سے آٹھ بیگھہ زمین خریدی تھی اور پرانی مسجد کی زمین بھی اسی زمین کے بیچ آگئی تھی ہریالال وہاں آبادی کرنا چاہتا تھا سو اس نے مسجد پر بھی نظر ڈالی اور مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے بس بھیا لٹھ چلے، سر کھلے، چھ آدمی مارے گئے چار مسلمان دو ہندو، پولیس آگئی۔ جھگڑا بہت بڑھا پھر مقدمہ چلا اور فیصلہ ہریالال کے حق میں ہوگیا جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ سرکار بھی انہی کی۔ وکیلوں نے کہا کہ مسجد پرانی ہے اور مسلمان اسے استعمال بھی نہیں کرتے اس لئے ہریالال کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی زمینوں کو استعمال کرے۔ فیصلہ ہوگیا تھا مگر مسلمان کافی عرصے تک ڈٹے رہے اور جب بھی ہریالال نے مسجد کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ مسلمان سر پر کفن باندھ کر آگئے خوب پکڑ دھکڑ رہی آدھی بستی تو ایسے ہی خالی ہوگئی تھی۔ پھر ایک بزرگ کو خواب میں بشارت ہوئی۔ پرانی مسجد کے مزار کے بزرگ نے کہا کہ زمین اللہ کی ہے ہم خود یہاں سے ہٹے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ بزرگ کی بات سب نے مانی اور ہریالال نے اپنا کام کر دکھایا سو اب اس جگہ نئی نگری آبادی ہوگئی ہے سارے سسرے ہندو ہی آکر آباد ہوئے ہیں ہواں، یہ ہے وہاں کی بات پر علیم الدین خان صاحب کا تو سات آٹھ سال پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ "

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا میرے دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھ رہی تھی یہی ہورہا ہے شروع سے یہی ہورہا ہے بھوریا چرن ہر راستہ روک لیتا تھا، تقدیر اگر کبھی کچھ سامنے لاتی بھی تو بھوریا چرن کھیل ہی ختم کر دیتا کیا اس کم بخت کا کوئی توڑ نہیں ہے وہ سب سے بڑا گیانی تو نہیں ہے اس سے بھی بڑے ہونگے۔ سفلی علوم کے ماہر اور بھی بہت سے ہوں گے۔ کیا ان سب کو ایسی ہی قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔ بھوریا چرن ایک انسان ہی ہے اور کالے جادو کا ماہر ہے اسے اتنی بڑی قوت کیسے حاصل ہوگئی اور اگر اس سے زیادہ طاقت والے سفلی علوم کے ماہر ہیں تو کیا انہیں بھوریا چرن کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا یا پھر اس کے سامنے ایسی قوتیں لے آئی جائیں جو مذہب سے تعلق رکھتی ہوں بھلا کالے جادو کا ایک ماہر قرآنی علوم کے سامنے کیسے ٹک سکتا ہے اگر کسی بزرگ کی نظر واقعی ہوجائے مجھ پر تو کیا میری کشتی پار نہیں لگ جائے گی یہ خیال دل میں عجیب سے احساسات پیدا کرنے لگا، بیچارہ امام بخش سادہ نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"رتولی گئے ہو بھیا کبھی۔ "

"نہیں باباجی میں کبھی نہیں گیا۔ "

"تو پھر علیم الدین خان کے بارے میں کیسے جانتے ہو۔ ؟"

"بس ایسے ہی نام سنا تھا کسی سے اور اس مزار کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جہاں سے لوگوں کو بڑا فیض ملتا تھا۔ "

"ارے ان کی کیا پوچھو ہو رتولی سنبھالے ہوئے تھے جو پہنچ جاتا مراد پوری ہوجاتی تھی۔ "

"یقیناً باباجی یقیناً، ویسے باباجی اور بھی ایسے مزار ہوں گے جہاں مرادیں پوری ہوجاتی ہوں گی۔ "

"لو بھیا بزرگوں سے دنیا خالی ہوگئی کیا ارے ایک سے ایک پڑے ہوئے ہیں۔ "

"آپ کو کسی ایسی جگہ کا پتہ معلوم ہے کوئی ایسے بزرگ جن کا بڑا نام ہو۔ "

"کوئی کمی ہے ان کی دلی جاؤ نظام الدین اولیاؒ، اجمیر جاؤ خواجہ صاحبؒ، کلیر شریف جاؤ صابرؒ، اور پھر ہزاروں خدا کے نیک بندے ہر جگہ موجود ہیں بھیا کوئی منت ہے تمہاری؟"

"ہاں۔ " میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، بابا امام بخش مجھے دیکھتے رہے۔ شاید سوچ رہے تھے کہ انہیں اپنی منت کے بارے میں بتاؤں گا اور پھر جب میں کچھ نہ بولا تو خود بھی خاموش ہوگئے۔

سفر جاری رہا نہ جانے کب سوگیا۔ دن کی روشنی میں آنکھ کھلی تھی گرمی لگ رہی تھی ریل کے پنکھے نہ جانے کیوں بند ہوگئے تھے۔ بابا امام بخش بھی موجود نہیں تھے ہوسکتا ہے ان کا اسٹیشن آگیا ہو ریل کے پہیے رگڑ رہے تھے شاید بریکیں لگ رہی تھیں۔

کوئی اسٹیشن آرہا تھا کھڑکی سے باہر خالی خالی عمارتیں نظر آرہی تھیں میں انہیں دیکھنے لگا۔ سانسی کا اسٹیشن تھا پتھر کی سل پر یہ نام لکھا ہوا پڑھا تھا۔ ٹرین رک گئی۔ لیکن بمشکل دو منٹ پھر وسل ہوئی ایک جھٹکا لگا اور ٹرین رینگنے لگی۔ میری نظریں کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر جمی ہوئی تھیں جہاں اکا دکا لوگ نظر

آرہے تھے۔ آگے والے ڈبوں سے اس اسٹیشن پر اترے ہوئے لوگ ابھی اپنا سامان ہی سنبھا
تھے۔ پلیٹ فارم کے انتہائی سرے سے میرا ڈبہ گزرا تو میں نے ایک برقع پوش عورت کو دیکھا جو
تھی اس نے ایک وزنی ٹوکری سنبھالی ہوئی تھی جو اچانک نیچے گر گئی۔ ٹوکری چٹائی کی بنی ہوئی تھی اور
ہینڈل ٹوٹ گیا تھا کچھ سامان نیچے گرا تو عورت نے گھبرا کر اپنے برقع کا نقاب الٹ دیا اور اچانک
چمک گئی۔ یہ سارا کھیل ایک لمحے کا تھا میرے ڈبے نے پلیٹ فارم کا آخری سرا چھوڑ دیا۔ ٹرین
پکڑنے لگی مگر اس الٹے ہوئے نقاب سے جو چہرہ نمودار ہوا تھا اس نے میرے پورے وجود کو لرزا
میری شمسہ تھی میری چھوٹی بہن۔ آہ اپنے خون کو نہ پہچانتا کچھ لمحے تو حواس ہی معطل رہے۔ سوچنے
کی قوتیں مفلوج ہو گئیں۔ مگر پھر ایک دم ہوش سا آ گیا۔ میں دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھا ممکن تھا
ٹرین سے چھلانگ لگا دیتا مگر ہاتھ زنجیر پر جا پڑا تھا اور ذہن نے ساتھ بھی دیا تھا چنانچہ پوری قوت سے
دی۔ لوگ چونک کر میری اضطراری حرکتوں کو دیکھنے لگے۔ کسی نے کچھ کہا بھی تھا مگر میں دروازے
گیا اور آدھا نیچے لٹک گیا لوگ چیخنے لگے تھے مگر کسی کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے
رفتار فوراً ہی مدہم ہونے لگی اور پھر بس وہ اتنی مدہم ہوئی کہ مجھے زمین نظر آنے لگی تو میں نے چھلانگ
پلیٹ فارم کافی دور ہو گیا تھا پیچھے کیا ہوا مجھے کچھ نہیں معلوم تھا بس میں بے تحاشہ پلیٹ فارم کی
بھاگ رہا تھا۔ شمسہ آہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ وہ ٹرین میں تنہا کہاں سے آئی تھی شمسہ میری بہن
پیروں میں پنکھ لگ گئے خاصا فاصلہ تھا مگر میں نے برق رفتاری سے طے کر لیا اور پلیٹ فارم پر پہنچ گیا
بری طرح پھول رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل رہا تھا مگر میں آنکھیں پھاڑے شمسہ کو
کر رہا تھا وہ اب پلیٹ فارم پر نظر نہیں آرہی تھی۔ یقیناً سامان سنبھال کر باہر نکل گئی ہوگی چنانچہ
اسٹیشن سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا ٹکٹ چیکر اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا میں باہر نکل
چاروں طرف سناٹا تھا۔ بہت کم لوگ نظر آرہے تھے میں نے ہر طرف نظریں دوڑائیں مگر شمسہ نظر
آئی۔ کچھ فاصلے پر دو تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک آگے تھا اور دوسرا اس سے کچھ پیچھے تانگے والا
کھڑا گھوڑے کے شانے سہلا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ابھی۔ ابھی یہاں تم نے کسی لڑکی کو دیکھا۔" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا
والا منہ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ "ایک لڑکی برقع پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں ٹوکری تھی۔" میں نے

"ہاں جی۔" تانگے والا بولا۔

"کہاں گئی۔ کدھر گئی۔؟" میں نے پھر کہا۔

"ہمارے کو کیا معلوم جی۔"

"اوہ تم کہہ رہے تھے تم نے اسے دیکھا ہے۔"

"دیکھا تو ہے جی مگر وہ کدھر گئی ہمیں کیا معلوم۔"

"پیدل گئی ہے؟" میرا سانس بحال ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں جی سجو کے تانگے میں گئی ہے۔"

"اوہو تو یہ کہو۔ چلو تم بھی چلو میں اس کے تانگے پر چڑھ گیا۔ اور تانگے والا حیرانی سے مجھے

لگا۔ "عجیب بے وقوف آدمی چلتے ہو یا میں تمہارا تانگہ لے جاؤں۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"ارے نہیں جی مگر جاؤ گے کہاں۔" وہ اچک کر تانگے پر چڑھ گیا اور اس نے گھوڑے کی لگامیں سنبھال لیں۔

"آگے بڑھو۔ !" میں نے غرا کر کہا اور تانگے والا گھوڑے کو ٹخٹخانے لگا سڑک پتلی تھی ناہموار تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی جو زیادہ تر جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور ان پر جگہ جگہ گھوڑوں کی لید نظر آرہی تھی۔ دو رویہ دکانیں اور عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ بھدی بدنما اور پلاستر سے محروم مگر دور دور تک سناٹا تھا اور آگے جانے والا تانگہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا میں نے تانگے والے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل پڑا میرے رویے اور انداز سے وہ کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے جی۔" اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"معاف کرنا دوست، وہ برقع پوش لڑکی میری بہن ہے مجھ سے بچھڑ گئی ہے اور بہت دن کے بعد وہ مجھے نظر آئی ہے اس لئے میں پریشان ہو گیا ہوں۔ ذرا تانگے کی رفتار تیز کر کے سجو کے تانگے کو پکڑو جتنے پیسے مانگو گے دوں گا۔"

"اچھا جی۔" اس نے ایک طرف اڑسا ہوا سانٹا نکال لیا اور پھر گھوڑے کو ہدایات دینے لگا۔

"یہ سڑک سیدھی گئی ہے؟"

"چوراہے تک جی۔"

"اوہ ذرا جلدی چلو کہیں وہ دور نہ نکل جائے۔" میں نے بے چینی سے کہا اور تانگے والے نے پھر گھوڑے سے گفتگو شروع کر دی۔ مگر گھوڑے سے اس کے تعلقات زیادہ بہتر نہیں معلوم ہوتے تھے اس لئے گھوڑا اس سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔ ہم چوراہے پر پہنچ گئے اور تانگے والے نے ایک جائز سوال کر دیا۔

"اب کدھر چلوں جی۔؟" میں کیا جواب دیتا بس آنکھیں پھاڑنے لگا۔ تانگے والے نے خود ہی یہ مشکل حل کر دی۔ "وہ جا رہا ہے سجو کا تانگہ۔" میں اچھل پڑا۔

"کہاں۔؟"

"وہ ادھر گیا ہے دور ہے۔"

"تو چلو نا۔ کہیں اوجھل نہ ہو جائے۔" میں نے کہا اور تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگانے شروع کر دیئے۔ خدا خدا کر کے میں نے بھی سجو کا تانگہ دیکھا وہ بھی اس لئے کہ اس کی رفتار ہی سست ہو گئی تھی پھر ہم اس تک اس وقت پہنچے جب وہ رک گیا۔ برقع پوش لڑکی کی ایک جھلک میں نے دیکھی وہ ایک مکان کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی میں گہری سانس لے کر نیچے اتر گیا تانگے والے کو میں نے ایک نوٹ دیا تو وہ بولا۔

"چھوٹے نہیں ہیں جی۔"

"جاؤ بھائی خدا کے واسطے جان چھوڑو۔" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور آگے بڑھ گیا شمسہ اس سامنے والے مکان کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور اسی دروازے کے دوسری طرف۔ اس کے دوسری طرف یقیناً میرے ماں باپ ہوں گے۔ آہ آنکھیں ترس گئی تھیں ان کی صورتوں کو اب تو ان کے چہرے بھی دھندلا گئے تھے۔ شمسہ۔ میری روح، ماموں ریاض، امی، ابا یہ بے چارے میری وجہ سے کس طرح دربدر ہوئے ہیں، سانسی اس شہر کا نام ہے، ہمارا یہاں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا، نہ جانے

کن حالات کے تحت انہوں نے ادھر کا رخ کیا ہو گا اور وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے کیسے جاؤں گا ان کے سامنے کیا ہو گا وہاں جا کر کیسے بلکیں گے وہ۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے بدن ڈھلا جا رہا تھا۔ میں خود ان سے دور بھاگتا رہا تھا مگر صرف یہ سوچ کر میں ایک مجرم ہوں قاتل ہوں اور منحوس بھوریا چرن مردود کی توجہ ان کی طرف نہ ہونے پائے وہ اس سے بچے رہیں اور اب میں ان کے سامنے جاؤں تو تو کیا وہ مجھ سے سب کچھ نہ پوچھیں گے۔ بتانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ میں نے جسے بھوریا چرن کے بارے میں بتا دیا وہ بچ نہ سکا۔ کتنا مشکل ہو جائے گا ان کے سوالات سے بچنا۔ اور ان کے پاس رکنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ان سے ملوں گا دل ہلکا کروں گا بس اتنا کہوں گا ان سے کہ وہ میرے لئے دعا کریں۔ خدا سے میری مشکل دور کرنے کے لئے گڑگڑائیں میں اس عذاب سے نکلا تو ان کی خدمت کروں گا ورنہ وہ مجھے صبر کر لیں ہاں محمود کی خیریت انہیں ضرور بتا دوں گا ماموں ریاض کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کس کے ساتھ شکتی پور گئے تھے۔

یہ سارے خیالات ان چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے دل میں آئے تھے عجیب تشنجی کیفیت ہو رہی تھی۔ نہ جانے کس طرح دروازے کی زنجیر بجائی۔ ایک بار دوسری بار، تیسری بار پھر دوسری طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں زنجیر ہلی اور میری روح آنکھوں میں آ گئی۔ اب ابا کا چہرہ نظر آئے گا۔ امی ہوں گی یا شمسہ۔ ! مگر دروازہ کھلا تو ان میں سے ایک چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے نہیں تھا وہ ایک باریش بزرگ تھے لمبی سفید داڑھی سفید کپڑے، چہرے پر نرمی تھی۔

"جی میاں کس سے ملنا ہے۔ ؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ وہ محفوظ۔ محفوظ۔ "

"میاں یہاں ہم رہتے ہیں نیاز اللہ ہے ہمارا نام یہاں کوئی محفوظ نہیں رہتے۔ "

"امی، شمسہ۔ " میری آواز رندھ گئی تھی اور نیاز اللہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے کچھ عجیب سا انداز تھا ان کا جیسے میری کیفیت پر غور کر رہے ہوں میرے چہرے پر مایوسی کی گہری لہریں چڑھ گئی تھیں۔ آنسو تھے آنکھوں میں امڈے آ رہے تھے۔ حلق بند بند سا ہوا جا رہا تھا سارے تصورات چکنا چور ہو گئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ تو میں نے خوابوں کے محل بنا کر طے کیا تھا دل نے یقین کر لیا تھا کہ ماں باپ کا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہو گا مگر یہ سب کچھ ....

"کہاں سے آئے ہیں میاں سانسی کے رہنے والے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں"۔ بزرگ نیاز اللہ نے بدستور نرم لہجے میں پوچھا اور میں ایک بار پھر چونک پڑا اگر میرے ماں باپ اس گھر میں نہیں رہتے تو شمسہ یہاں کہاں سے آئی .... میں نے بزرگ کے عقب میں اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"جناب یہاں ابھی میری بہن آئی ہے۔ شمسہ ہے اس کا نام سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی ہاتھ میں چٹائی کی بنی ایک ٹوکری تھی وہ میری بچھڑی ہوئی بہن ہے ریلوے اسٹیشن پر میں نے اسے دیکھا لیکن ریل نکل چکی تھی میں نے زنجیر کھینچ کر ریل روکی اور نیچے کود پڑا جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو وہ تانگے میں بیٹھ کر چل پڑی تھی اور بمشکل تمام میں دوسرے تانگے میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ "

نیاز اللہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تمہاری بہن شمسہ۔ ؟"

"جی۔ جی وہ ابھی ابھی برقع میں ملبوس .... "

"مگر وہ تو میری بیٹی عزیزہ ہے اپنی خالہ کے ہاں گئی تھی ایک ماہ کے بعد وہاں سے واپس آئی ہے ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو اچھائیاں کرو آؤ، ذرا اندر آؤ، آ جاؤ .... آ جاؤ .... جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ " میں ہچکچایا تو نیاز اللہ صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دروازے سے اندر لے گئے۔

چھوٹا سا صحن اس کے بعد برآمدہ جس کے اندر تین کمروں کے دروازے اور نجانے کیا کیا۔ برآمدے میں ایک تخت پڑا ہوا تھا جس پر دری اور سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر جائے نماز تہہ کی ہوئی رکھی ہوئی تھی۔ جائے نماز پر ہزارہ تسبیح رکھی ہوئی تھی بزرگ مجھے برآمدے میں لے آئے اور تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر انہوں نے آواز لگائی۔

"عزیزہ بیٹی، عزیزہ ذرا باہر آؤ .... "

"آئی ابا جان، کپڑے بدل رہی ہوں۔ " جواب ملا۔ بزرگ خود بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر تخت پر بیٹھ گئے وہ بدستور میرا جائزہ لے رہے تھے اور میرے چہرے پر بکھرے حزن و ملال سے متاثر معلوم ہوتے تھے پھر انہوں نے کہا کہ۔ "میاں کہاں سے آ رہے ہو۔ ؟"

"شکتی پور سے۔ "

"او ہو اچھا مگر تمہاری بہن کیسے بچھڑ گئی تم سے۔ ؟"

ابھی ان کا سوال ختم ہی ہوا تھا کہ درمیانی دروازے سے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس اچھے خدوخال، عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال مگر یہ چہرہ شمسہ کا نہیں تھا خدوخال بھی نہیں ملتے تھے پھر نجانے کیا ہوا تھا مجھے اس کے چہرے پر شمسہ کا دھوکا کیوں ہوا تھا آہ کچھ غلطی ہو گئی یقیناً کوئی غلطی ہو گئی۔ میں نے تو شمسہ کو ہی دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اس بے وقوف تانگے والے نے .... مگر نہیں لڑکی مجھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹھک گئی اس نے واپس دروازے کے اندر جانا چاہا لیکن نیاز اللہ کی آواز ابھری۔

"آ جاؤ بیٹی آ جاؤ۔ " لڑکی ٹھٹھکتی ہوئی برآمدے میں آ گئی میری نگاہیں جھک گئیں۔ نیاز اللہ صاحب مسکرا کر بولے۔

"میاں فیصلہ کرو یہ تمہاری شمسہ ہے یا ہماری عزیزہ۔ ؟" میں جلدی سے تخت سے نیچے اتر گیا اور شرمندہ لہجے میں بولا۔ "میں بے حد شرمسار ہوں انتہائی معافی چاہتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ "

"ارے تو اٹھ کر کیوں کھڑے ہو گئے بھئی ہماری عزیزہ اگر تمہاری بہن شمسہ بن جائے تو ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ "

"کیا بات ہے ابا میاں کون ہیں یہ۔ ؟"

"اسٹیشن سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں بلکہ تمہاری وجہ سے اپنا سفر کھوٹا کر چکے ہیں۔ "

"میں سمجھی نہیں ابا میاں۔ "

"اسٹیشن پر آپ برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ آپ کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس کا ایک ہینڈل ٹوٹ گیا تھا کیا ایسا ہوا تھا؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"جی ہاں ایسا ہوا تھا۔ " لڑکی نے کہا اور میرے دل میں امید کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔ یہ خیال آیا

تھاایک لمحے کے لئے تانگے والی کی غلط رہنمائی سے میں یہاں آگیا ہو سکتا ہے شمسہ کسی اور سمت نکل گئی مگر ٹوکری کے واقعہ کا اعتراف اس بات کی ضمانت تھا کہ میری آنکھوں نے ہی دھوکہ کھایا اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور نیاز اللہ صاحب چونک کر ادھر دیکھنے لگے پھر بولے۔

"پتہ نہیں کون ہے میں دیکھتا ہوں۔" لڑکی حیران سی کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی ویسے ہی کیا حماقت تھی کہ مزید یہاں رکتا نیاز اللہ کے پیچھے پیچھے ہی دروازے تک آیا دروازہ کھلا تو سامنے ہی اس تانگے والے کی شکل نظر آئی جس کے مریل گھوڑے نے بمشکل تمام یہاں تک پہنچایا تھا۔ تانگے والا میری شکل دیکھتے ہی

"نوٹ تڑا لائے ہیں جی آپ کا۔ چھوٹے پیسے لے لیں۔" نیاز اللہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے تانگے والی کی بات ایسی تھی کہ مجھے ہنسی آجاتی مگر تقدیر میں تو آنسو ہی آنسو لکھے ہوئے تھے ہنس نہ پایا تانگے والے سے کہا۔ "بھائی میں نے تم سے چھوٹے پیسے واپس تو نہیں مانگے تھے۔"

"ایں۔" تانگے والا حیرت سے بولا "مگر نوٹ تو جی آپ نے ہمیں دس روپے کا دیا تھا اور یہاں تک کا بنتا ہے سوا روپیہ باقی پیسے کا ہم کیا کریں۔" تانگے والا معصومیت سے بولا۔ نیاز اللہ صاحب نے میری طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر تانگے والے سے پیسے لے لئے اور تانگے والا اطمینان سے واپس مڑ گیا نیاز اللہ صاحب ہنستے ہوئے مڑے اور پیسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"یہ تو اپنا رزق اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ میاں کسی انسان سے بخشش لینے کی عادت ہی نہیں انہیں۔ یہ تم تیار کہاں کے لئے ہو رہے ہو۔؟"

"جی میں جانا چاہتا ہوں اور ایک بار پھر آپ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا میری اس حرکت سے ناراض ہو جاتا لیکن آپ نے .... خدا آپ کو اس کا اجر دے۔"

"ساری باتیں ٹھیک ہیں مگر آپ تشریف کہاں لے جا رہے ہیں۔ آیئے اب آپ ہمیں ایسا گیا گزرا بھی نہ سمجھیں کہ ہم آپ کو ایک پیالی چائے بھی نہ پلا سکیں اور جہاں تک بات رہی آپ کی غلط فہمی کی میاں غلط فہمی انسانوں ہی کو ہوتی ہیں اس میں برائی کی کیا بات ہے بلکہ ہمیں تو افسوس ہے کہ آپ کا نقصان ہوا۔ نجانے کہاں تک کا ٹکٹ ہوگا یہاں اترنا پڑ گیا اب واپس جاؤ گے تو نیا ٹکٹ لینا پڑے گا۔؟"

میں نے جلدی سے جیب سے ٹکٹ نکال کر نیاز اللہ صاحب کے سامنے کر دیا تاکہ اپنی سنائی کہانی کی تصدیق کر دوں۔ نیاز اللہ صاحب نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے واپس لا کر تخت پر بٹھا لڑکی ابھی تک اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی نیاز اللہ نے اس سے کہا۔

"عزیزہ بیٹی۔ تھکی ہوئی تو ہو گی لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ناشتہ کرائے بغیر تمہیں نیند نہیں آ اور پھر اب تو ہمارے مہمان بھی آئے ہیں۔ چنانچہ ہو جائے ذرا جلدی سے تیاری انڈے نعمت خا رکھے ہیں اور تمہارے ہاتھوں کے بے مثال پراٹھے۔ میاں نامعلوم مزہ نہ آجائے تو ہمارا ذمہ بیٹھو تکلف پر تکلف کئے جا رہے ہو۔ میاں لکھنؤ کے ہو کیا۔ بیٹھو بھئی بیٹھو کم از کم اپنا نام تو بتا دو"

کچھ ایسا عجیب لہجہ تھا ان کا ایسی اپنائیت اور محبت تھی کہ حلق میں پھنسا ہوا گولا پھوٹ بہا۔ اور نجانے کس طرح آنسوؤں کے ساتھ سسکیاں ابل پڑیں عزیزہ جو دروازے کی جانب مڑنے ہی والی تھی ٹھٹھک رک گئی۔ نیاز اللہ بھی حیران رہ گئے تھے مگر میں کیا کرتا نجانے کیوں میں نے اس لڑکی کو شمسہ

میں دیکھا تھا اور میرا وجود تہہ و بالا ہو کر رہ گیا تھا پھر نجانے دل میں کیا کیا آس لئے اس دروازے تک کا فاصلہ طے کیا تھا برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو دیکھنے کی آس بندھی تھی لیکن۔

نیاز اللہ اور عزیزہ مجھے تعجب سے دیکھتے رہے۔ ان کے سامنے اس طرح روتے ہوئے سخت شرمندگی ہو رہی تھی لیکن بند ٹوٹ گیا تھا بہاؤ روکے نہ رک رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا پھر بھی برداشت نہ ہو سکا تو تیزی سے دروازے کی سمت دوڑ پڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیاز اللہ کی آوازیں سنائی دی تھیں یقیناً روک رہے ہونگے مگر میں نہ رکا اور ان کے گھر سے بہت دور نکل آیا۔ اس عالم میں سڑکوں پر بھاگنا بڑا عجیب سا تھا خود کو سنبھالنا ضروری۔ سامنے ہی بڑ کا ایک درخت نظر آیا جس کا تنا بے حد چوڑا تھا اس کی آڑ میں رک گیا ادھر اُدھر دیکھا ویسے بھی سانسی بہت بڑی جگہ نہیں تھی آبادی بھی بہت زیادہ نہیں تھی چنانچہ اس وقت بھی آس پاس لوگ نظر نہیں آئے اور یہاں مجھے کافی سکون ملا۔

درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا آنسو خشک کئے بھوریا چرن کے خلاف دل میں جو نفرت تھی وہ انتا کو پہنچی ہوئی تھی کیا کروں اس کم بخت کا کیا کروں ہمیشہ ایسی چوٹ دیتا ہے کہ دل سینے سے باہر نکل آئے یقینی طور پر وہ بھی میرا نظری دھوکہ تھا میں نجانے کون سے بہتر راستے کی سمت سفر کر رہا تھا ادھر میری منزل ہو اور پھر رتولی کے اس سقّے نے جو کچھ بتایا تھا وہ بھی میرے لئے باعث دلچسپی تھا لیکن بھوریا چرن کم بخت مجھ پر بھرپور نگاہیں رکھے ہوئے تھا اور کہیں بھی میری دال گلنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ لڑکی شمسہ کی شکل میں دکھا کر اس نے مجھے ریل سے نیچے اتار دیا تھا خیر بھوریا چرن ایک وقت تو ایسا آئے گا جب میں تجھ پر حاوی ہو جاؤں گا جو خیال تیرے دل میں ہے اس کی تکمیل نہ کرنے کو تو میں نے اپنا ایمان بنا لیا ہے اور اس ایمان کو زندگی سے زیادہ قیمتی قرار دے دیا ہے. دیکھوں گا اس جدوجہد میں زندگی کب اور کس طرح چلی جاتی ہے لیکن پیر پھاگن کے مقدس مزار کی بے عزتی یا بے حرمتی اپنے پورے خاندان کی زندگی کی قیمت پر بھی نہیں کروں گا ہاں بھوریا چرن میں ایسا کبھی نہیں کروں گا .... تو بھی دیکھنا کہ تیرا واسطہ ایک مسلمان سے پڑا ہے۔

دل میں نجانے کیا کیا تصورات آتے رہے، شہر میں رونق ہوتی چلی گئی اب زیادہ لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ پہلے تو یہ سوچا تھا کہ کسی غلط تانگے کا تعاقب کر بیٹھا ہوں لیکن جب نیاز اللہ صاحب کی بیٹی نے ٹوکری گرنے کے واقعہ کو بھی تسلیم کر لیا تو اس کے بعد کوئی شک نہیں رہ گیا اور اب یہاں شمسہ کی تلاش بیکار ہی تھی بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا اس کے بعد سانسی شہر کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچا اور وہاں سے چل پڑا بس یُونہی نجانے کہاں مارا مارا پھرتا رہا کوئی تصور ذہن میں نہیں تھا کھانے پینے کا بھی کچھ ہوش نہیں تھا۔ دل تھا کہ مسلسل رو رہا تھا۔

دوپہر ہو گئی اور سورج عروج پر پہنچ گیا گرمی کافی تھی میں ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھا صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اب یہاں رکنا بیکار ہے ریلوے اسٹیشن جاؤں اپنا حلیہ درست کر لوں اور سانسی سے کہیں اور چل پڑوں .... کہاں .... مراد آباد کا سفر بھی کیا جا سکتا ہے باقاعدہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ممکن ہے ان صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے اور ان کے ماموں ریاض کے بارے میں۔ اب تو کوئی جگہ ایسی نہیں رہی تھی جہاں اعتماد کے ساتھ جا سکتا اور

اپنے ماں باپ کو تلاش کر سکتا۔ کتنی عجیب و غریب بات تھی میں نے خود ہی انہیں چھوڑا تھا ان سے
ہو گیا تھا میں ان کی مشکلات میں ساتھ نہیں دے سکا تھا اور اب۔ اب میری آرزو تھی کہ وہ ایک بار
نظر آجائیں۔ اس کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں تھا میری زندگی میں نا سہی لیکن بہر حال جینا تو ہے۔ وقت
اور گزرا تھا کہ میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی کوئی میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ چونک کر
تو نیاز اللہ صاحب تھے بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ؟" میں نے حیران لہجے میں کہا۔

"ہاں میاں ہم ہی ہیں۔" نیاز اللہ صاحب عجیب سے انداز میں بولے۔

میں انہیں دیکھتا رہا وہ دوبارہ بولے۔ "کسی کو اس طرح ذلیل کرنا خلاف انسانیت ہے اور خلاف مذ
بھی ہم نے تھوڑی سی میزبانی کرنا چاہی تھی مگر تم نے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا وجہ جان سکتے ہیں؟"

"نہیں جناب میں آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"مسلمان ہو۔؟"

"الحمد للہ۔" میں نے کہا۔

"تو پھر گناہ کیا ہے تم نے اس کا کفارہ ضرور ادا کرو۔"

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں نیاز اللہ صاحب۔"

"ان الفاظ سے کفارہ ادا نہیں ہوتا اٹھو ہمارے ساتھ چلو ہمیں شرف میزبانی بخشو جب چاہے جہ
چاہے جانا ہم بھلا راستہ کیوں روکیں گے۔"

"خدا آپ کو زمانے کی آفتوں سے محفوظ رکھے نیاز اللہ صاحب میں نہایت منحوس انسان ہوں
انتہائی سبز قدم جہاں میرے قدم رکھتے ہیں وہاں مصیبتوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔"

"خوب میاں یہ نحوست وغیرہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ
مخلوق سے بہت پیار کرتا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں وہ کسی کو منحوس بنا سکتا ہے۔ خیر چھوڑو کیا
ایک بار پھر اپنے غریب خانے پر چلنے کی درخواست کر سکتے ہیں۔"

"جو حکم۔!" میں نے آہستہ سے کہا۔ رستے میں نیاز اللہ نے کہا۔

"نام ابھی تک نہیں جانتے تمہارا........"

"مسعود ہے میرا نام۔"

"ماشاء اللہ۔" وہ بولے اور خاموش ہو گئے فاصلہ طے ہوا اندر عزیزہ موجود تھی مجھے دیکھ کر
خلوص سے مسکرا دی۔

"آپ لے آئے انہیں ابا جان میں ان سے ناراض ہوں۔"

"کیوں بھئی......؟"

"یہ مجھے بہن سمجھ کر میرے پیچھے آئے تھے لیکن مجھے دیکھ کر انہوں نے مجھے بہن نہیں تسلیم
اتنی بری ہوں میں ......؟"

"انہی سے پوچھ لو۔ مسعود ہے ان کا نام۔"

"بول ہی نہیں رہی میں ان سے یہ خود جواب دیں۔" عزیزہ نے کہا۔

"جی جناب، کیا فرماتے ہیں۔" نیاز اللہ بولے۔

"ذمے دار آپ لوگ ہیں۔ میرا قصور نہ ہوگا جس نے مجھ سے خلوص برتا جس کے دل میں میرا پیار
پیدا ہوا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ یہاں تک کہ میرے گھر والے بھی۔ شمسہ میری بہن ہے وہ سب مجھ سے بچھڑ
گئے ہیں میری ماں، میرے باپ، میرے ماموں سب میری نحوست کا شکار ہو گئے۔ آپ کو بہن کی شکل
میں دیکھا کچھ نظری دھوکہ ہو گیا تھا۔ آپ کے پیچھے بہت سے ارمان لے کر آیا یہ خیال تھا میرا کہ اب
ماں باپ بھی نظر آجائیں گے مگر........"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بہن نہ نکلی بہن جیسی تو ہو سکتی ہوں جہاں تک آپ کے منحوس ہونے کا
تعلق ہے تو میرا ایمان پختہ ہے خدا اپنے بندوں کو منحوس نہیں بناتا اس لئے آپ ہماری فکر نہ کریں۔"

"آہ کاش۔ کاش"۔

"آپ کو علم ہے کہ ابا میاں سارا دن آپ کے پیچھے پھرتے رہے ہیں۔"

"ایں"؟ میں چونک پڑا۔

"ہاں مسعود میاں آج ہم بھی جاسوس بن گئے تمہارا تعاقب کرتے رہے یہ دیکھتے رہے کہ تم کہاں کہاں
جاتے ہو اور جب تھک گئے تو تمہارے سامنے پہنچ کر تم سے یہاں آنے کی درخواست کر ڈالی۔"

"جس نے بھی مجھ سے اتنا پیار برتا ہے وہ مشکلات کا شکار ہو گیا ہے آپ بھی وہی سب کچھ کر رہے
ہیں۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔"

"یہ معاملہ ہمارا اور خدا کا ہے اسے ہمارے اور اس کے درمیان رہنے دو اور تم غسل کر لو۔ جاؤ بھئی
ہم نے آج ناشتہ تک نہیں کیا۔"

"صبح کو میری صورت جو دیکھ لی تھی۔" میں ہنس پڑا۔

"میں نے بھی دیکھی تھی مگر میں ناشتہ بھی کر چکی ہوں اور دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہے میں نے۔ جایئے
وہ غسل خانہ ہے۔" عزیزہ نے کہا اور میں گردن جھٹک کر غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ میری سسکیوں سے
متاثر ہو گئے ہیں بے چارے۔ مگر میں کسی قیمت پر ان کے ہاں پڑاؤ نہیں ڈالوں گا میں نے فیصلہ کیا تھا۔

کھانا کھایا اور پھر دونوں باپ بیٹی گھیر کر بیٹھ گئے۔ نیاز اللہ بولے۔

"پہلے ہمارے بارے میں سن لو۔ ہمارا نام نیاز اللہ ولد ضمیر اللہ ہے سانسی ہی میں پیدا ہوئے، پلے
بڑھے گو ہم نے آدھا ہندوستان دیکھا ہوا ہے لیکن قیام یہیں رہا۔ ہمارے والد ضمیر اللہ صاحب کے پاس
کچھ زمینیں تھیں جن سے کفالت ہوا کرتی تھی بعد میں وہ زمینیں ہمیں منتقل ہو گئیں اور ہم ان کی دیکھ بھال
کرنے لگے شادی ہو گئی والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ان کے اکلوتے تھے جس کی وجہ سے
تنہا رہ گئے پر خود ہی کچھ بزرگوں کی کرم فرمائی سے شادی وغیرہ کا سلسلہ ہوا شادی ہو گئی مگر اہلیہ بہت
عرصے تک ہمارا ساتھ نہ دے سکیں اور اپنی ایک نشانی چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ہم نے اپنی
تمام تر محبتیں اپنی بیٹی عزیزہ کو سونپ دیں اور ہم باپ بیٹی زندگی گزارنے لگے........ لیکن بیٹیوں کا ساتھ
کچا ہوتا ہے عزیزہ بیٹی کی شادی کی ہم نے اور بالکل ہی تنہا رہ گئے تقدیر نے عزیزہ کے شوہر کو زندگی کی مہلت
نہیں دی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے عزیزہ صرف چھ ماہ سہاگن رہ کر بیوہ ہو گئیں اور اس کے بعد انہوں

نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بھی ڈھلتی ہوئی عمر کے پیش نگاہ زمینیں فروخت کر
اور کچھ ایسی جائداد خرید لی جس سے کرایہ وغیرہ حاصل ہو سکے۔ سو اب یہاں یہ چھوٹا سا گھر ہے ہم
بیٹی ہیں اور یاد اللہ ہے بس اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مصرف نہیں۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ
ہو گا کہ ہماری زندگی کیا ہے اور اس کے بعد ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھیں
بے بسی یہ یاسیت تم پر کیوں طاری ہے دیکھو میاں گریز نہ کرنا تمہیں اندازہ ہے کہ انسان ہی انسان
دوست بھی ہوتا ہے اور دشمن بھی لیکن ہمیں دوستوں میں تصور کرو۔ باقی رہا جہاں تک تمہارے
تعلق۔ تو ہو سکتا ہے تمہارے تجربات تمہیں یہ احساس دلاتے ہوں۔ ہمارا مسئلہ ذرا مختلف ہے
• البتہ تمہیں ایک آزادی ضروری دی جاتی ہے وہ یہ کہ اگر کچھ بتانے سے خود تمہیں نقصان پہنچے تو ہم
تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ لیکن خواہشمند ہیں اس بات کے کہ تم ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ کہ
سے چراغ جلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری مشکل کا کوئی حل ہمارے پاس ہو اس بات سے انکار نہ کرو
قدرت پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے راستے متعین کرتی ہے اور ان راستوں سے گریز کا مطلب ہے
پریشانیوں کو خود پر نازل رکھا جائے۔ "

میں اس مخلص شخص کا چہرہ دیکھتا رہا الفاظ تو سمجھ میں آنے والے تھے لیکن میرے تجربات کچھ اور
کہتے تھے دیر تک خاموش رہا۔ عزیزہ نے کہا۔

"ابا میاں یہ ہمیں اس قابل نہیں سمجھتے۔ آپ انہیں مجبور نہ کریں کتنی کوششیں کر چکے ہیں آپ
انہوں نے ہمیں اپنا سمجھ کر ہی نہیں دیا۔ رہنے دیں ابا میاں، ہمارا فرض ہے کہ ان کی خدمت کریں
جب تک یہ یہاں رہنا مناسب سمجھیں ان کی خاطر مدارت کریں غیر واقعی کبھی اپنے نہیں ہوتے۔"

میں نے عزیزہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "عزیزہ بہن آپ براہ کرم ایسی باتیں نہ کریں
تو محبتوں کو ترسا ہوا انسان ہوں میں تو اپنے بھرے پرے گھر سے محروم ہو چکا ہوں میں کسی سے گریز
کروں گا ہاں یہ میرا تجربہ ہے کہ جس نے بھی مجھ سے محبت کا اظہار کیا مصیبت کا شکار ہوا۔ اگر آپ
مصیبتیں خریدنا چاہتی ہیں تو مجھے اپنی زبان کھولنے پر اعتراض نہیں۔ "

"ہاں میاں ہم سے بات کرو ہم مصیبتیں خریدنا چاہتے ہیں۔ " نیاز اللہ بولے۔

"تو پھر مختصراً میری کہانی یہ ہے کہ اچھے بھلے گھر کا فرد تھا دماغ میں خناس پیدا ہوا تن آسانیاں اپنا لیں
ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دولت کے حصول کا خواہاں ہو گیا اس سلسلے میں کچھ ایسے راستے اپنائے جو ناجائز
ایسے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا جو جنتر منتر سے دولت کے حصول کا ذریعہ پیدا کر دیتے ہیں
ایک ایسے شیطان کے جال میں پھنس گیا جس نے مجھے کچھ ایسے کاموں کے لئے مجبور کیا جو میرا ضمیر گوارا
نہیں کرتا تھا اس کے عتاب کا شکار ہوا اور مصیبتوں میں گرفتار ہوتا چلا گیا والدین چھن گئے خود دربدر
سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد سے مارا مارا پھر رہا ہوں اب نہ ماں باپ کا پتہ ہے نہ بہن بھائیوں
کا۔ اکیلا ہوں اور زندگی کی صعوبتوں میں گرفتار .... " نیاز اللہ صاحب نے میرے ان مختصر الفاظ پر
کیا مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "ذرا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھا دیا تو انہوں
نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر میری ہتھیلیوں کو سونگھا دیر تک سونگھتے رہے اور پھر ٹھنڈی
سانس لے کر بولے۔

"اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ سفلی عمل کے زیر اثر ہو۔ " میں نے انہیں جس قدر مختصر تفصیل بتائی تھی وہ
لئے یوں اطمینان بخش تھی کہ اس میں بھوریا چرن کا براہ راست تذکرہ اور اس کے
ایک طرح سے میرے
عمل کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی اور یہ میں نے اس لئے کیا تھا کہ نیاز اللہ صاحب کو کوئی نقصان نہ
پہنچے لیکن نیاز اللہ صاحب نے صحیح تجزیہ کیا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہو سکتا ہے۔"

"یہ کالا جادو ناپاک چیز ہے اور اس کے کرنے والے کم بخت انوکھی قوتیں حاصل کر لیتے ہیں۔
بعض اوقات اگر کوئی چھوٹا موٹا عامل اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا
ہے اس لئے عام قسم کے لوگ جو کاروباری طور پر یہ سب کچھ نہیں کرتے اس چکر میں نہیں پڑتے۔ البتہ
تم نے یہ تو سنا ہو گا کہ زہر کا تریاق، زہر ہی میں ہوتا ہے اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اس کے مصداق ایک بات
فوری طور پر میرے ذہن میں آئی ہے اب دیکھو نا تم نے کم از کم کچھ حقیقتیں بتائیں تو میرے ذہن میں بھی
کچھ خیال آیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔ "

"کیا۔ ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے نیاز اللہ کو دیکھا اور نیاز اللہ صاحب مسکرا دیئے پھر کہنے لگے۔

"رامانندی میرا بچپن کا دوست ہے دوسری کلاس سے ہائی اسکول تک ہم نے ساتھ تعلیم حاصل کی
اس کے بعد اس کے میرے راستے مختلف ہو گئے۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا پورے سولہ سال کے بعد
واپس آیا تو پاؤں زمین پر ہی نہیں تھے جوگی بنا ہوا تھا۔ گھر والے پہلے ہی اس سے مایوس تھے جو باقی
رشتہ دار تھے جب وہ اس سے ملے تو وہ ان کے کام کا نہیں رہا تھا لیکن دوستی نہیں بھول سکا اور مجھ سے
ویسے ہی ملتا رہا کم بخت نے نجانے کیا کیا جنتر منتر سیکھ لئے ہیں۔ بڑے چکر چلاتا رہتا ہے مالی حیثیت
انتہائی مستحکم ہے لیکن ویرانوں میں بسیرا کر رکھا ہے اور وہیں مستقل رہائش کر لی ہے بڑا گیانی بنتا ہے اگر تم
چاہو تو میں تمہیں اس سے ملاؤں ہو سکتا ہے وہ تمہارے کام آ جائے۔ "

"کیا وہ سفلی علوم کا توڑ جانتا ہے؟"

"بھئی نجانے کیا کیا توڑ پھوڑ کرتا رہتا ہے وہ باقاعدہ سادھو بن گیا ہے مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ بلاوجہ لوٹتا
نہیں کچھ جانتا ہے بلکہ یہ کہو کہ بہت کچھ جانتا ہے۔ ہم چونکہ ہم مذہب بھی نہیں ہیں اور پھر ظاہر ہے میرا
کوئی راستہ کبھی ایسا نہیں رہا۔ لیکن اس سے جب بھی میری ملاقات ہوتی ہے بڑی محبت سے ملتا ہے میرا
خیال ہے صرف ایک میں ہوں جسے وہ اپنا دوست سمجھتا ہے اپنا شناسا مانتا ہے سیکڑوں بار پیشکش کر چکا ہے
کہ اگر مجھے کوئی مشکل ہو تو اسے بتاؤں مگر تم خود سمجھتے ہو کہ اس سے کسی مشکل کا حل مانگنا یوں سمجھ لو کہ
بہت کچھ کھونے کے مترادف ہے لیکن تمہارا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ مسعود میاں میری مانو تو اس سے مل لو ہم
اس سے مشورہ کر لیتے ہیں کم از کم تمہیں جو مشکل درپیش ہے اس کا کوئی حل تو دریافت ہو۔ "

میں سوچ میں ڈوب گیا یہ بالکل ایک نئی سوچ تھی نیا انداز تھا۔ اب تک اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت
کارروائی ہوئی تھی وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوئی تھی جو میرے ہم مذہب تھے لیکن نیاز اللہ صاحب نے ایک
نیا راستہ دکھایا یعنی زہر کا توڑ زہر ہی سے حاصل کیا جا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شخص جس کا نام رامانندی ہے
بقول نیاز اللہ کے ان کی دوستی کے ناتے کوئی ایسا طریقۂ کار بتا دے جس سے میں بھوریا چرن سے محفوظ
ہو جاؤں لیکن اس شخص کے سامنے مجھے زبان کھولنا ہو گی بہرحال یہ بھی کر کے دیکھ لیا جائے میں نے سوچا
اور نیاز اللہ صاحب سے رضامندی کا اظہار کر دیا ....!

دوسرے دن تمام ضروریات سے فارغ ہو کر نیاز اللہ صاحب مجھے لے کر راماننی کے پاس چل پڑے۔ انہوں نے تانگے والے سے سوای مٹھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ راستے میں وہ مجھے راماننی کے بارے میں بتاتے رہے۔ پھر ہم سوای مٹھ پہنچ گئے۔ چند افراد وہاں بیٹھے جاپ کر رہے تھے۔ بہت اور ویران سی جگہ تھی۔ ہر طرف کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے۔ اینٹوں کے ڈھیر، ٹنڈ منڈ درخت منحوس سی شکل کے آدمی سے نیاز اللہ صاحب نے راماننی کے بارے میں پوچھا۔

"اندر ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ذرا انہیں بتاؤ نیاز اللہ آیا ہے۔ ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں۔" وہ شخص خاموشی سے راہداری میں سیدھا چلا گیا مگر نیاز اللہ صاحب وہیں رک گئے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک مضبوط بدن کالا آدمی جس کا صرف زیریں بدن ڈھکا ہوا تھا گلے میں ریٹھوں کی لمبی مالا پڑی ہوئی تھی۔ کسرتی بازوؤں پر کے حلقے بندھے ہوئے تھے، سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے اور نہایت غلیظ نظر آ رہے تھے تیزی سے نظر آیا۔ اس کے پیچھے وہی سوکھا آدمی دوڑ رہا تھا۔ قریب آ کر اس شخص نے سرد لہجے میں کہا۔

"آؤ نیاز اللہ .... آؤ۔" وہ واپس مڑا عجیب سا انداز تھا نیاز اللہ صاحب نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے کوئی دس قدم آگے بڑھ کر اچانک وہ شخص ٹھٹھک گیا اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اس کی بڑی اور کالی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی تیکھا پن تھا ایک لمحے وہ مجھے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ ایک پراسرار اور خطرناک آدمی ہے۔ جس جگہ سے اندر داخل ہوئے تھے وہ کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ ایک دیوار میں سوراخ کر کے اندر جانے کا رستہ بنایا گیا تھا۔ ناہموار اینٹوں کے درمیان سے سنبھل کر نکلنا پڑا تھا اور جس جگہ ہم پہنچے تھے وہ اس پورے کھنڈرات سے زیادہ عجیب تھی۔ بہت بڑا ہال نما کمرہ جس کی چھت بے حد اونچی تھی اس میں درمیان میں ایک ٹوٹا ہوا فانوس لٹک رہا تھا جس میں چند شمعیں روشن تھیں مگر ان کی روشنی ناکافی تھی اور ہال کے بیشتر حصے تاریک تھے جگہ جگہ مرگ چھالے بچھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ بہت سی اینٹیں چبوترے کی شکل میں چنی ہوئی تھیں اور ان پر بھی ایک مرگ چھالہ بچھا ہوا تھا پاس ہی ایک کمنڈل رکھا ہوا تھا قوی ہیکل شخص نے ایک دری نکالی اور اسے ہمارے لئے زمین پر بچھا دیا۔

"یہاں بیٹھو نیاز اللہ۔ یہ پاک صاف ہے اور زمین تو ہوتی ہی پاک ہے۔" وہ بولا اور ہنس دیا۔

"زمین تو بیشک پاک ہوتی ہے مگر اس پر تم جیسے ناپاک لوگ بھی تو بستے ہیں۔"

"سو تو ہے مگر چلو تم جیسے پاک لوگوں سے ہماری ناپاکی دور ہو جاتی ہے"۔

نیاز اللہ نے مختصر راماننی سے میرا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بتایا۔ راماننی نے میری داستان سننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میں ان تمام باتوں سے خوب محظوظ ہوا تھا مگر پھر سنجیدہ ہو کر میں نے کہا۔ "راماننی جی میں نہایت سنجیدگی سے آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی کہانی سناتے ہوئے میں ایک خوف کا شکار ہوں۔ میں نے مختصراً چچا نیاز اللہ صاحب کو اپنی داستان سنا دی ہے لیکن اس کا بہت سا حصہ میں نے انہیں نہیں بتایا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روز اول ہی سے میں نے جسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا یا وہ

موت کا شکار ہو گیا میں اپنے کئی پیاروں کو کھو چکا ہوں اور اب اس قدر دہشت زدہ ہوں کہ کسی کے سامنے یہ کہانی نہیں بیان کر سکتا مجھے نیاز اللہ صاحب کی زندگی کا خطرہ ہے آپ کی زندگی کا خطرہ ہے مجھ پر تو جو بیت رہی ہے سو بیت ہی رہی ہے" راماننی چند لمحات سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"بھتیجے جس جگہ تم بیٹھے ہو وہاں ہمارا راج پاٹ ہے کوئی آواز یہاں سے باہر نہیں جا سکتی اور کوئی مہا گرو یہاں اندر نہیں آ سکتا کتنا ہی بڑا گیانی ہو اپنی اپنی حد ہوتی ہے یہاں جو کچھ تم کہو گے محفوظ رہے گا اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ہمارا وعدہ ہے تم سے۔" نیاز اللہ صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔

"اور تم مسلسل ہماری توہین کئے جا رہے ہو۔ میاں زندگی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اور وقت جو کچھ بھی پیش کرے وہ اللہ کا حکم۔ نہ اس کے حکم میں کوئی رد و بدل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی کی زندگی کا اختتام ہو سکتا ہے تم ہمارے ایمان میں رخنہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو یہ سارے معاملات راماننی سمجھتا ہے اسے بتاؤ اور میرے سامنے بتاؤ۔ میں اپنی بربادی کا خود ذمہ دار ہوں گا۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"ٹھیک ہے آپ کا حکم مان رہا ہوں راماننی جی۔ مختصراً میں نے نیاز اللہ صاحب کو اپنی بربادی کی داستان بتائی لیکن دوبارہ بتا رہا ہوں میں نے ایک اچھے شریف خاندان میں جنم لیا تھا میرے والد محفوظ احمد صاحب ایک نیک اور دیندار آدمی تھے۔ مگر میں بچپن ہی سے غلط صحبتوں کا شکار ہو گیا اور آسان ذرائع سے دولت کے حصول کی کوششوں میں مصروف رہا مجھے کسی ایسے عامل کی تلاش تھی جو مجھے ان کوششوں میں مدد دے تب مجھے بھوریا چرن ملا اور اس نے میرا کام کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کے صلے میں اس نے بھی مجھ سے ایک کام کرنے کی شرط رکھی۔ میں نے راماننی کو پیر پھاگن کے مزار کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد کے واقعات سنائے کہ میرے گھر پر کیا بیتی، بعد میں حکیم سعد اللہ کے ساتھ کیا ہوا، لاک اپ اور جیل میں مجھ پر کیا گزری۔ بے چارے چاند خان کس طرح موت کے گھاٹ اترے۔ منحوس بھوریا چرن کیسی کیسی شکلوں میں مجھ پر نازل رہا اور اس نے زندگی کس طرح مجھ پر تلخ کر دی میرے ماں باپ کیسے دربدر ہوئے اور میں کس طرح نیاز اللہ صاحب کے پاس پہنچا۔ راماننی اور نیاز اللہ صاحب بڑی دلچسپی سے یہ ساری داستان سن رہے تھے۔ اس وقت نیاز اللہ صاحب کو میرے رونے اور سسکنے کی اصل داستان معلوم ہوئی تھی اور وہ بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ راماننی نے آنکھیں بند کر لیں دیر تک خاموش رہا، سوچتا رہا پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں وہ عجیب سی کشمکش کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو مسعود میاں۔ ؟"

"میں کیا چاہوں گا راماننی جی میرا خاندان بکھر چکا ہے ماں باپ اور بہن بھائی نجانے کہاں بھٹک رہے ہیں اور میں جن حالات سے گزر رہا ہوں، وہ آپ کے سامنے ہیں۔ پولیس الگ میری تلاش میں ہو گی میں کبھی یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ میں ان بے گناہ انسانوں کا قاتل نہیں ہوں۔ ان سارے حالات میں میری سوچ کیا ہو سکتی ہے میں خود نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو صرف ایک کام ہو جائے۔"

"کیا .... ؟" راماننی نے پوچھا۔

"میرے ماں باپ، ماموں اور بھائی بہن اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں اور باعزت زندگی بسر کریں

زیادہ سے زیادہ مجھے اپنے جرم کی پھانسی کی سزا ہو جائے .... اگر ان لوگوں کو ایک باعزت زندگی د سکے تو میں اس کے لئے ہزار بار موت قبول کر سکتا ہوں بس اتنا ہو جائے کہ بھوریا چرن میرے اہل خاندا کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ؟"

"کیا تمہارے دل میں کبھی یہ بات آئی کہ تم بھوریا چرن کا وہ کام کر دو۔" رامانندی نے پوچھا

"بس اس وقت جب میں پہلی بار اس کام کے لئے پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا کہ جب میں اوپر نہ پہنچ سکا اور میں نے وہ ہوشربا منظر دیکھا کہ پیر پھاگن کا مزار بلند سے بلند ہو گیا اور میرے نیچے زمین دور ہو گئی تو میرا ذہن بدل گیا اور اس کے بعد سے آج تک میں کسی بھی قیمت پر یہ کام کرنے تیار نہیں ہوا اور نا مرتے وقت تک اس کا یہ کام کروں گا۔"

رامانندی پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نیاز اللہ صاحب سے

"نیاز معاملہ بڑا گمبھیر ہے، میں بہت کچھ سمجھ چکا ہوں وہ پاپی ششنکھا ہے اور ششنکھا کالے جادو کے بڑ بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ علم ہو کہ سفلی علم رکھنے والے جو جنتر منتر پڑھتے ہیں ان کے لئے انہیں بہت سے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان مرحلوں کی ایک بڑی تفصیل ہے۔ ششنکھا پانچویں درجے کا گیانی ہوتا ہے اور اس علم کے کل آٹھ درجے ہیں۔ آٹھواں درجہ کسی کو نہیں مل سکا بڑے سے بڑے جادو کا ماہر چھٹے درجے تک پہنچا، مگر اس کے بعد وہ جی نہ سکا۔ ساتویں درجے پر صرف ایک گیانی پہنچا تھا مگر وہ پتھر بن گیا اور زمین کی گہرائیوں میں اتر گیا کیونکہ زمین اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ششنکھا بھیروں پرم ہوتا ہے اور بھیروں اس کے سارے کام کرتا ہے۔ مہاراج بھوریا چرن بھیروں پرم ہیں بھیروں کا نشان مکڑی ہوتا ہے۔"

"بھیروں کیا ہے؟" نیاز اللہ نے پوچھا۔

"چھوڑو نیاز یہ کالے علم ہیں تمہاری زبان گندی ہو جائے گی۔"

"اور تیری زبان جو گندی ہے۔"

"میرا تو دھرم ہی دوسرا ہے۔"

"تیرے دھرم کے لوگ بھی تو سارے تیرے جیسے نہیں ہوتے۔"

"مانتا ہوں مگر اس بے چارے کے من کی بات جتنی میں سمجھ سکا ہوں اتنی تم نہیں سمجھے ہو گے نیاز اللہ۔"

"مثلاً؟"

"یہ موجودہ معاشرے کے غلط اصولوں کا شکار ہے جیسا کہ میں تھا میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں ان گہرائیوں میں نہ اترو، تمہیں اور اسے دونوں کو نقصان ہو جائے گا اور ہماری ان باتوں سے اور بہت سوں کو نقصان ہو گا۔ کالا جادو سیکھنا اتنا مشکل نہیں ہے اس کی مثال یوں سمجھ لو جیسے گھورے یا گندے کیچڑ میں پڑی سونے کی اشرفیاں، ہاتھ گندے ہوتے ہیں مگر اشرفیاں ہاتھ آجاتی ہیں۔ ایمان کھونا پڑتا ہے مگر سب مل جاتا ہے اور جو وقت گزر رہا ہے وہ تیرے سامنے بھی ہے نیاز اور میرے سامنے بھی، ایمان تو بہت سے کھو چکے ہیں بس وہ کالا جادو نہیں جانتے۔ رشوت، چور بازاری، ڈکیتی اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب ایمان کے سہارے تو نہیں ہوتا۔ ان سارے دھندوں میں ایمان تو سلامت نہیں رہتا۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ ا

یہ سب کالے جادو کے سہارے نہیں کرتے ان کا اپنا جادو دوسرا ہے مگر انہیں کالے جادو کے بارے میں بتا دیا جائے تو وہ ضرور اسے سیکھ لیں گے تاکہ ان کا کام اور آسان ہو جائے مگر میں تمہیں بھیروں کے بارے میں ضرور بتائے دیتا ہوں۔"

"چلو وہی بتاؤ۔"

"سارے کے سارے پلید ہوتے ہیں پہلے کچھ کام کرنے ہوتے ہیں اس کے بعد پہلا جاپ کرنا پڑتا ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"پہلے جاپ کے مکمل ہونے کے بعد "ہیر" قبضے میں آتا ہے۔ ہیر "اشیش" ہوتا ہے من کھونے والا اور وہ من کے اندر بس جاتا ہے مگر اس کا وجود باہر بھی ہوتا ہے اور تم اسے خبریں لانے کے کام میں لا سکتے ہو، دوسرے جاپ سے "ویر" ملتا ہے تمہارا دوسرا غلام، جب ہیر اور ویر تمہارے قبضے میں آجاتے ہیں تو "بیر" کی باری آتی ہے۔ بیر بہت سے ہوتے ہیں۔ بارہ بیر بس میں کرنے کے بعد بھیروں جاگتا ہے، بھیروں ایک ہوتا ہے مگر سب کا میت، سب کے کام آنے والا، اسے بس میں کرنے والا ششنکھا کہلاتا ہے اور ششنکھا کے پاس بڑی طاقتیں ہوتی ہیں۔"

نیاز اللہ صاحب بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہے تھے مجھے بھی یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا نیاز اللہ نے کہا۔ "تمہارا کونسا درجہ ہے"۔ رامانندی مسکرا دیا۔

"بتانا منع ہوتا ہے۔"

"اوہ اچھا تب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا مگر ایک بات ضرور بتاؤ۔"

"وہ کیا؟"

"یہ بھوریا چرن، پیر پھاگن کے مزار پر جا کر کیا کرنا چاہتا تھا؟" نیاز اللہ صاحب نے ایک نہایت اہم سوال کیا اور رامانندی سوچ میں ڈوب گیا پھر آہستہ سے بولا۔ "وہ کھنڈولا بننا چاہتا ہے۔"

"کھنڈولا؟"

"چھٹی منزل کا شہنشاہ، اور اس کے لئے کسی صاحب ایمان کے گھر کو گندا کرنا ہوتا ہے مگر کوئی ششنکھا اپنے پیروں سے چل کر کسی پاک بزرگ کے مزار پر جانے کی قوت نہیں رکھتا۔ ایسی کوشش کرے تو جل کر راکھ ہو جائے ہاں کسی دوسرے صاحب ایمان کا سہارا لے کر وہ ایسا کام کر سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ششنکھا ایسا ہی چاہتا ہو گا۔"

دماغ کھل گیا تھا، ساری کہانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بھوریا چرن کے الفاظ بھی یہی تھے۔ اس نے کہا تھا کہ تو میرا کام کر دے، میں تیرا کام کر دوں گا، وہ کچھ بنا دوں گا تجھے کہ تو سوچ بھی نہیں سکتا، اس کا مطلب ہے کہ بھوریا چرن میرے ذریعے پیر پھاگن کے مزار کو ناپاک کرنا چاہتا تھا اور جب میں پہلی بار اس کا پتلا لے کر اس پاک مزار کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو میرا راستہ روکا گیا تھا، فاصلے طویل کر دیئے گئے تھے تاکہ یہ گناہ مجھ سے سرزرد نہ ہو سکے۔ آہ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا، بہت ہی اچھا، اگر مجھ پر یہ مصیبتیں اس لئے نازل ہوئی ہیں کہ میں ایک مقدس بزرگ کے پاک مزار کو ناپاک بنانے کا مرتکب نہ ہو سکا تو ایسی لاکھوں مصیبتیں میں بھگتنے کے لئے تیار تھا، چاہے میرا پورا گھرانہ برباد ہو جائے، میری ماں، میرا باپ، میرے بہن

بھائی سب لوگ اور خود میں کتے کی موت مارے جائیں لیکن یہ غلیظ کام میں قیامت تک نہیں کروں گا۔ میرے دل میں اب یہ عزم نئے سرے سے تازہ ہو گیا تھا اور روح کو بڑی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔

نیاز اللہ صاحب گردن جھٹک کر گہری گہری سانسیں لینے لگے پھر بولے۔ "عجب کہانی ہے بھئی ہمارے مذہب میں تو یہ سب کچھ نہیں ہے۔ سیدھے سادے عبادت کرو اور خدا کی خوشنودی حاصل کرو۔ نہ اس میں غلاظت کا کوئی کھیل ہے نہ دل کو گندا کرنے کا، ہمارے ہاں لاتعداد علوم ہیں لیکن سارے کے سارے انسانی بہتری کے لئے، خدا کے کلام سے کسی کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور خدا کے کلام میں وہ تمام قوتیں پوشیدہ ہیں جو ہزاروں جادوؤں میں نہیں، اب تم دیکھ لو رامانندی کہ تم اپنی گندی قوتیں حاصل کرنے کے لئے بھی ایک مزار پاک کو گندہ کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے، کیا انوکھی بات ہے۔"

رامانندی نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک اور بات کا مجھے بڑے تاثر انگیز انداز میں احساس ہوا تھا وہ یہ کہ رامانندی بے انتہا مخلص انسان تھا حالانکہ وہ کالے جادو کا ماہر تھا اور جو تھوڑا سا تماشا میں نے یہاں دیکھا تو اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ مکمل طور پر دنیادار ہے اور لوگوں کو بیوقوف بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک غیر مذہب سے اتنا مخلص ہے کہ اس کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اندر کی باتیں بتائی تھیں جو کوئی اور کسی کو نہیں بتا سکتا تھا اس طرح رامانندی کے کردار کا ایک بلند پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ رامانندی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو پھر نیاز اللہ اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں ......؟"

"بھئی میں تو کچھ بھی نہیں جانتا اس سلسلے میں، جو کچھ ان کے ساتھ بیتی تھی میرے ذہن میں تمہارا ہی خیال آیا تھا اور پورے اعتماد کے ساتھ میں تمہارے پاس آ گیا اور یہ فیصلہ تم خود ہی کرو گے کہ یہ بچہ کس طرح مصیبتوں سے نکل سکتا ہے یہ میں نہیں جانتا، تم جانتے ہو گے" .... رامانندی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تو پھر نیاز اللہ ایسا کرو کہ اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔" میں چونک پڑا۔ میں نے سنسنی خیز نگاہوں سے رامانندی کو دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ نیاز اللہ صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"کیوں میاں کچھ دل ٹھکتا ہے اس بات پر"۔ میں چند لمحات خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"میں جس عذاب سے گزر رہا ہوں نیاز اللہ صاحب، آپ کو اب تو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، بے شک میں اپنی زندگی بھی چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ بھی جس کا اظہار میں آپ سے کر چکا ہوں۔ ماں باپ، بہن بھائی میرے دل میں کسکتے ہیں لیکن آج بھی اس بات پر میں بہت خوش ہوں کہ مین نے وہ گندا کام نہین کیا اور آئندہ بھی میں ان سب کی زندگی کی قیمت پر یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ اب اس روشنی میں جو بھی فیصلہ میرے لئے مناسب ہو وہ آپ کریں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا ایمان بیچ کر ہی میرے ماں باپ مجھے مل سکتے ہیں تو میں آج ہی اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں اور اگر مجھ پر سے یہ مصیبت کسی اور ذریعے سے ٹل سکتی ہے تو اس کے لئے کوشش کر لی جائے آپ لوگوں کا احسان مند ہوں گا۔"

"تم میرے پاس کچھ روز رہو گے لڑکے اور تمہیں میرے احکامات پر عمل کرنا ہو گا۔"

"اس سلسلے میں، میں واضح طور پر ایک بات کہہ دینا چاہتا ہوں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا..........؟" رامانندی نے سوال کیا۔

"پہلی بار جب مجھے حکیم سعد اللہ کے پاس لے جایا گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے اپنے پاس رکھنے کے لئے کہا تھا اور پھر وہیں سے میری زندگی کا ایک بدنما دور شروع ہو گیا۔ حکیم سعد اللہ مجھ سے اس بارے میں تفصیلات معلوم کر رہے تھے اور میری آنکھوں کے سامنے منحوس بھوریا چرن ایک مکڑی کی شکل میں لہرا رہا تھا اور پھر میرے ہی ہاتھوں حکیم سعد اللہ قتل ہو گئے کہیں وہ کہانی پھر سے نہ شروع ہو جائے۔"

"ہو سکتی ہے، ضرور ہو سکتی ہے، مگر اب میں اس سے واقف ہوں اس لئے ایسا نہیں ہو گا۔" ....

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے آپ کے پاس رکھنے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے رامانندی جی" ....

"تو بس ٹھیک ہے نیاز، آپ آرام کریں اور ایک دو ہفتے کے لئے اسے بالکل بھول جائیں، جو کچھ بھی بن پڑے گا، کروں گا اس کے لئے ...."

نیاز اللہ صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے .... "رامانندی بڑا وقت لیا ہے میں نے تمہارا اور بہت کچھ مانگ لیا ہے تم سے، سوائے دعا کے میں اور کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے، میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں خدا کا گنہگار بندہ۔ میری تو دعاؤں میں یہ بھی اثر نہیں ہے کہ وہ کسی کے کام آ جائیں .... لیکن اس کے باوجود اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوں میں اور مسعود میاں بھروسہ رکھنا، تمہاری بہن اور میں، تمہارے لئے دعائیں کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ بہتری ہی کرے گا۔ اچھا تو رامانندی پھر مجھے اجازت دو۔"

"ٹھیک ہے نیاز، کام بھی دیا تو نے ہمیں تو ایسا کہ پورے بھروسے کے ساتھ نہیں کر رہے۔ لیکن چنتا مت کر نا رامانندی نے ہوش سنبھالنے کے بعد تیری صورت دیکھی تھی اور اگر مر بھی گیا تو تیری صورت آنکھوں میں ہو گی۔ چنتا مت کرنا اس کے لئے، جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے گا کریں گے مگر سنو ایک بات کہے دیتے ہیں۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اور جو کھو جائے اس کی ذمہ داری خود تم پر ہو گی۔"

"میں سمجھا نہیں رامانندی۔" نیاز اللہ صاحب نے کہا۔

میں سمجھا بھی نہیں سکتا تمہیں اس وقت۔" رامانندی نے کہا اور نیاز اللہ اسکا چہرہ دیکھتے رہے پھر بولے......

"اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ تو جو کچھ بھی کرے گا بہتر ہی کرے گا۔" رامانندی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور نیاز اللہ واپسی کے لئے پلٹے میں اور رامانندی انہیں باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ نیاز اللہ صاحب نے کہا ....

"تم اطمینان سے یہاں رہو میں اسی تانگے میں واپس چلا جاؤں گا کل پھر آؤں گا۔"

"نہیں نیاز اللہ، جب تک میں تجھے یہاں نہ بلاؤں تو یہاں نہ آنا، یہ میری درخواست ہے تجھ سے۔" رامانندی نے کہا اور نیاز اللہ چونک کر اسے دیکھنے لگے، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"ٹھیک ہے میں تیرے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا اچھا تو پھر چلتا ہوں، مسعود میاں اجازت ہے۔" میں نے نیاز اللہ صاحب سے مصافحہ کیا اور اس کے بعد وہ چلے گئے۔ رامانندی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا۔ اس بار وہ کھنڈر میں واپس نہیں گیا تھا بلکہ ٹہلنے کے سے انداز میں دوسری جانب چل پڑا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "مسعود ہے نا تمہارا نام..........؟"

"ہاں ...."

"دیکھو مسعود میں ایک بات پورے خلوص سے کہنا چاہتا ہوں تم سے۔ جو واقعات اور حالات میرے علم میں آئے ہیں۔ ان سے میں نے ایک اندازہ لگایا ہے۔ میری حیثیت ایک حکیم کی سی ہے جو مریض دیکھتا ہے اس کے مرض کی تشخیص کرتا ہے اور اس کے لئے دوا تجویز کرتا ہے۔ تم صاحب ایمان ہو۔ بے شک مانتا ہوں حالانکہ میرے اور تمہارے دھرم میں اختلاف ہے۔ میرا دھرم کچھ اور ہے تمہارا دھرم کچھ اور........ لیکن کیا تم اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرو گے کہ بعض اوقات صحت کے لئے مریض کو کڑوی دوائیں بھی دینا پڑتی ہیں۔"

"ہاں بے شک"۔

"اس کے علاوہ ڈاکٹروں کی اقسام ہوتی ہیں۔ کوئی ایلوپیتھک ہوتا ہے کوئی ہومیوپیتھک اور کوئی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے ہر ایک کا اپنا انداز ہوتا ہے میرا اپنا طریقۂ علاج ہے میں تو وہی کر سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں۔"

"مجھ پر اعتماد رکھنا میرا تم سے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے بس میں تمہاری صحت چاہتا ہوں او جو کچھ کروں گا اس کے لئے کروں گا۔"

"میں جانتا ہوں"۔

"آج سنیچر وار ہے تمہیں منگل وار تک انتظار کرنا ہو گا۔ منگل کی رات کو تمہیں بہت سی مشکلوں سے چھٹکارا مل جائے گا اس دوران تم یہاں رہو، جہاں من چاہے گھومو پھرو کچھ فاصلے پر باغ ہے اس میں پھل لگے ہوئے ہیں، کھیت بھی ہیں مکئی پک رہی ہے، بھٹے بھون کر کھا سکتے ہو۔ میں تمہیں اپنے ہاں کی کوئی چیز نہیں کھلاؤں گا تاکہ تمہیں اس سے کراہیت ہو۔"

"آپ بہت عظیم انسان ہیں رامانندی جی۔" میں نے متاثر ہو کر کہا اور رامانندی مسکرا دیا۔

"زندگی بہت تھوڑی سی ہوتی ہے مسعود میاں۔ انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ کچھ بھی کر لے کچھ بھی پا لے مگر اسے مرنا ہو گا۔ جیون بھر کی محنت سے جو کچھ حاص[illegible]ہے چھوڑنا ہو گا۔ مگر۔ اس کی فطرت میں طلب ہے۔ سب کچھ جان کر بھی وہ سب کچھ پانا چاہتا ہے او[illegible] تو سنسار کے سارے کام رک جائیں۔ مگر روح کی طلب بھی ایک چیز ہوتی ہے وہ جو کچھ کرتا ہے رو[illegible] کے لئے کرتا ہے اور روح کی آسودگی کے لئے محبت بھی [illegible] چیز ہے۔ نیاز اللہ اور میں ایک دوسرے [illegible]بت کرتے ہیں۔ ہماری یہ محبت ہمیشہ بڑھی ہے کبھی [illegible]ں۔ میں اس کی ایک ایک جنبش کا احترام کرتا ہوں۔ اس سے پیار کرتا ہوں۔"

"یہ ایک مثالی دوستی ہے۔"

"ہاں۔ تم کہہ سکتے ہو۔ تو سمجھ گئے نا میری بات اور ایک بات میں تمہیں اور بتا دوں میاں ڈرنا نہیں بھوریا چرن جو کچھ بھی ہے میرے حلقے میں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہمارے بیچ معاہدے ہوئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے نہیں لڑتے ورنہ نقصان دونوں کو ہو جاتا ہے ہمارے بیر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور سارا کھیل بیروں کا ہوتا ہے۔ بیر ایک طرح سے ہمارے سپاہی ہوتے ہیں۔ اس لئے تم ایک ایک کوس کے بیچ جہاں چاہو گھوم پھر سکتے ہو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے رامانندی جی۔"

"اس کے علاوہ رات کو جب بھی آرام کرو اسی کھنڈر میں کسی چھت کے نیچے آ کر آرام کرنا کھلا [illegible]

کبھی مت سونا۔"

"بہتر ہے"۔

"منگل کو ملوں گا اگر کوئی ایسی بات جو مجھ سے کرنا ضروری ہو، تو کسی آدمی سے کہہ دینا وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔ یہاں ضرورت مند آتے رہتے ہیں ان سے زیادہ مت گھلنا ملنا اور رات کو کسی جاپ کرنے والے کے پاس مت جانا وہ لوگ جو جوہڑ کے کنارے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

"میں خیال رکھوں گا۔"

"بس اب میں جاؤں۔" رامانندی نے پوچھا۔

"جی"۔ میں نے کہا اور رامانندی اندر کھنڈر میں چلا گیا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ دل و دماغ پر ایک سل سی رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دل و دماغ اپنے بس میں کہاں ہوتے ہیں اور یہ "بس" ہے کیا چیز، سمجھنا مشکل ہے۔ کچھ نہ کچھ آہی گھستا ہے۔ دماغ میں اس کا راستہ کون روکے۔ چنانچہ چشم تصور سے نیاز اللہ صاحب کو تانگے میں واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ دل نے دعا کی کہ خدا خیر کرے۔ رامانندی تو مضبوط ہے مگر نیاز اللہ بھی بھوریا چرن کی کہانی سے واقف ہو گئے ہیں کہیں وہ کتا انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ مگر کیا کر سکتا تھا کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔

سارا دن وہیں گزار دیا۔ تانگے آ کر رکتے تھے اور اس سے مرد عورتیں بچے اترتے۔ رامانندی کے آدمیوں سے ملتے پھر نہ جانے کیا ہوتا وہ واپس چلے جاتے۔ مجھے بھوک لگی اور میں باغوں کی تلاش میں نکل گیا۔ اس کے لئے مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا کوئی سو گز دور چلا ہی تھا کہ باغ نظر آ گیا۔ سامنے ہی ناشپاتیاں لگی ہوئی تھیں۔ بس شکم سیری کی بات تھی۔ چنانچہ اس پر گزارہ کر لیا۔ احساس ہوا تھا کہ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کر رہا ہوں لیکن [illegible] کون سے اقدار نبھائے جا رہے تھے جو اس سے بچتا زندگی زخم تو بن گئی تھی اور یہ زخم ہمیشہ بے کل ر[illegible] [illegible]ات کو رامانندی کی ہدایت کے مطابق کھنڈر کے ایک کمرے میں جا گھسا اور زمین پر لیٹ کر سو گیا۔ د[illegible] دوسری رات، پھر تیسرا دن، رامانندی ایک بار بھی نظر نہیں آیا تھا البتہ اس کے چیلے چانٹوں سے دو[illegible]ہا تھی۔ جاپ کرنے والوں کو بھی [illegible] رات میں کبھی باہر نہیں نکلا تھا ہاں اپنی مخصوص آرام گاہ میں کبھی کبھی راتوں کو میں نے بڑی بھیانک [illegible]یاں سنی تھیں۔

تیسرا دن بھی تمام ہوا اگلا دن منگل تھا۔ اس وقت شام کے کوئی سات بجے تھے۔ ناشپاتیوں کا ڈنر لے کر پلٹ رہا تھا اور کھنڈرات کے آس پاس لوگ نظر آ رہے تھے۔ سامنے ہی رنگین کپڑوں میں لپٹی ایک عورت اپنے بچے کو کندھے سے لگائے میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ اس نے میرے قدموں کی چاپ سنی تو رک گئی اور جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"مہاراج سنیے۔ مہاراج۔" میں رک گیا اسے دیکھا پچکے ہوئے گال دھنسی ہوئی آنکھیں۔ پیلا چہرہ، چہرے پر عجیب سی ویرانی، اس کے کندھے سے جو بچہ لگا سو رہا تھا وہ بالکل سوکھا ہوا تھا۔ میری انگلیوں کے برابر اسکی پنڈلیاں تھیں باقی بدن بھی ایسا ہی تھا سر بالوں سے صاف اور جسم کی نسبت بہت بڑا نظر آ رہا ہے۔

"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا

"اسے میری گود سے اتار دو۔" اس نے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیوں۔"

"اترتا ہی نہیں ہے۔ میں اسے لئے لئے تھک گئی ہوں۔"

"کوئی اور نہیں ہے تمہارے ساتھ۔"

"کوئی نہیں ہے۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے لے لو، میں تھک گئی ہوں ایک سال ہو گیا پورا ایک سال۔ یہ میری گود سے نہیں اترتا،" میں چونک پڑا عجیب سے الفاظ تھے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ کیا یہ بچہ بیمار ہے۔"

"سوکھے کی بیماری ہے اسے، مگر تم اسے لے لو نا۔" وہ آگے بڑھ کر میرے پاس پہنچ گئی۔ میں کشمکش کا شکار تھا کیا کروں کیا نہ کروں۔ اسی وقت بچے نے ماں کے شانے سے سر اٹھایا۔ پتلی گردن گھمائی اور اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور اس کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکلی۔ سیٹی بجا کر وہ شرارت سے مسکرایا۔ مکروہ چہرہ .... وہ چہرہ کسی بچے کا نہ تھا۔ وہ ایک معمر آدمی کا چہرہ تھا اور وہ معمر آدمی۔ بھوریا چرن کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ بھوریا چرن، جس کا بدن ایک بیمار مدقوق بچے کا بدن تھا مگر چہرہ مکمل .... ! میرے پورے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

انسان ہی تھا خوف تو فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے لاکھ سب کچھ جانتا تھا اور کافی حد تک ناقابل یقین مناظر کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن آپ خود تصور کریں آبادیوں سے دور ایک ویران اور سنسان علاقہ جہاں چاروں طرف ہولناک سناٹا پھیلا ہوا ہو۔ وہ کھنڈر بھی یہاں سے خاصا دور، جہاں کیسے ہی سہی کم از کم انسانی شکل کے لوگ نظر آ جاتے تھے سامنے ہی ایک پراسرار عورت جس کے انوکھے الفاظ کہ یہ بچہ ایک سال سے میری گود سے نہیں اترا اور پھر سوکھے کیکڑے جیسے ہاتھ پاؤں والا ایک بچہ جس کا سر بھوریا چرن کا تھا مجھے دیکھ رہا ہو، چہرے پر خباثت اور شیطانی مسکراہٹ پھر اس کی آواز اور اس کا انداز دہشت سے برا حال نہ ہو جاتا تو کیا ہوتا بالآخر بھوریا چرن کسی نہ کسی طرح میرے سامنے پہنچ ہی گیا۔ اور رامانندی کا عمل پورا نہیں ہوا تھا۔ سارے دن گزر گئے تھے بس ایک دن باقی رہ گیا تھا اگلا دن .... منگل تھا اور رامانندی نے کہا تھا کہ منگل گزر جائے تو میں ان مصیبتوں سے آزاد ہو جاؤں گا میں نہیں جانتا تھا کہ رامانندی کیا کرنے والا تھا لیکن ان دنوں تو تنکے کا سہارا بھی میرے لئے بڑی حیثیت رکھتا تھا۔

بھوریا چرن نے ایک بار پھر سیٹی بجائی اور عورت سے بولا۔ "چل اتار دے، مجھے اپنی گود سے۔" عورت نے اس طرح اسے جھٹک کر پھینک دیا۔ جیسے کسی بہت بڑی مصیبت سے چھٹکارا ملا ہو۔ بھوریا چرن زمین پر گر کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے چھوٹے بچے جو اپنے پیروں سے چلنا نہیں جانتے۔ کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اس کا بھیانک چہرہ مسلسل مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا .... پھر اس نے کہا۔

"کہو میاں جی کیسے ہو .... ارے ہم سے بچ کر سنسار کے کون سے کونے کھدرے میں بھاگو گے جہاں جاؤ گے ہمیں پاؤ گے تم نے تو نہ بلایا ہمیں مگر دیکھو ہم تمہاری کتنی خبر رکھتے ہیں۔" دفعتہً ہی میرے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئیں دہشت تو پہلے ہی دل و دماغ میں منجمد تھی ہاتھ پاؤں البتہ چند لمحات کے لئے ساکت ہو گئے تھے لیکن اچانک ہی مجھے ہوش آ گیا اور دوسرے لمحے میں نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور

اس طرح دوڑنے لگا کہ شاید کوئی گھوڑا بھی اسوقت میرا مقابلہ نہ کر سکتا تھا میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن میرے کان عجیب سی سرسراہٹیں سن رہے تھے اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بھوریا چرن اسی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل دوڑتا ہوا میرے پیچھے آ رہا ہے حالانکہ میں اپنی اس رفتار کو ناقابل یقین کہہ سکتا ہوں لیکن پھر چند ہی لمحات گزرے کہ بھوریا چرن ننھے سے بچے کی شکل میں دوڑتا ہوا مجھ سے آگے نکل گیا کچھ دور جانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ پاؤں زمین پر پھیلائے اور پھر میں نے دیکھا اس کے سارے بدن میں پاؤں ہی پاؤں نکل آئے وہ مکڑی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ان پیروں پر لمبے لمبے بال اگ آئے تھے بس اوپری بدن بھوریا چرن کا تھا۔ اور اس مکڑی کا سائز بلاشبہ کوئی ڈھائی فٹ کے دائرے میں تھا بھوریا چرن کی خونخوار آنکھیں اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں میں نے رخ تبدیل کیا تو وہ پھر میرے ساتھ دوڑنے لگا۔ لیکن اب وہ اپنے سارے ہاتھ پیروں سے دوڑ رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس گم تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں ان کھنڈرات تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور بالآخر کئی بار اسے چکمہ دے کر میں کھنڈرات کے نزدیک پہنچ گیا۔ جہاں مدہم مدہم روشنیاں نظر آ رہی تھیں رامانندی کا علاقہ آ گیا تھا وہ جوہڑ جس کے کنارے لوگ بیٹھے جاپ کیا کرتے تھے، قریب آ گیا تھا اور دفعتہً ہی میں نے جوہڑ سے کچھ فاصلے پر رامانندی کو کھڑے ہوئے دیکھا وہ اپنے مخصوص انداز میں ساکت کھڑا ہوا تھا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھوریا چرن مکڑی کے روپ میں میرے قریب آتا جا رہا تھا اور چند ہی لمحات کے بعد وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا میں دہشت سے چیختا ہوا رامانندی کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا تھا رامانندی نے میرا بازو پکڑ لیا اور بھوریا چرن کو دیکھنے لگا بھوریا چرن بھی آن کی آن میں ہمارے قریب پہنچ گیا اس نے مجھ سے نگاہیں اٹھا کر رامانندی کو دیکھا اور اس کے بعد اچانک سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا اب اس کے دو ہاتھ اور دو پاؤں ہی تھے اور وہ اپنے اس روپ میں نظر آ رہا تھا جس روپ میں اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا یعنی جوگی کے روپ میں .... رامانندی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر رامانندی کے ہونٹوں سے مدہم سی آواز نکلی۔

"اکھنڈ شنکھا ...."

بھوریا چرن نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی نگاہیں اب رامانندی پر جمی ہوئی تھی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں پھر ایک اور منظر میں نے دیکھا .... اس کی آنکھوں سے سرخ دھاریں بہنے لگیں دونوں آنکھوں سے خون جیسی سیال شے ابل کر نیچے گر رہی تھی اور اس کے پیر بھیگتے جا رہے تھے۔ رامانندی ساکت کھڑا ہوا تھا چند لمحات کے بعد اس کے منہ سے پھر آواز نکلی۔

"پدم شنکھا ...."

"چپ ہو جا رے چپ ہو جا، ارے او پاپی چھچھوندر رے، کالے دھرم کا کھائے ہے اور دھرم ہی کا ایمان کرے ہے، کیوں رے تیری یہ مجال ....؟"

"پدم شنکھا ...."

"ارے چپ شنکھا کے گھونسلے، کونسی بیڑی ہے تیری رے، کونسی بیڑی ہے؟"

"تیری بیڑی، پدم شنکھا ...." رامانندی نے جواب دیا۔

"اور باتیں ایسے کرے ہے جیسے کھنڈولا بن گیا ہو، کیوں رے، کھنڈولا ہے نا تو ....؟"

"نہیں پدم شنکھا میں کھنڈولا کہاں، داس ہوں تیرا۔"

"ارے واہ رے داس .... داس بنے ہے اور شنکھا کی برابری کرے ہے، شنکھا کے راستے روکے ہے، ارے تیرے کالے دھرم نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے ہمارے راستے بند کرنا چاہتا ہے. ارے تیرے اپنے راستے نہیں بند ہوتے تھے اس سے .... اگر تو اس کا دھرم خراب کر دیتا اور ہم کھنڈولے بن جاتے تو تیرا کیا نقصان ہوتا ایک کھنڈولا سو شنکھا کی رکھشا کرتا ہے اور ایک شنکھا ہزاروں بیڑیوں کے کام آتا ہے تو اپنی بیڑ خراب نہیں کر رہا تھا رے تیسری بیڑی والے بول جواب دے اور تو .... ارے او دھرم داس، تجھ سے کہہ رہا ہوں میں .... تو اپنا دھرم خراب کرنے جا رہا تھا اس کے ہاتھوں .... جانتا ہے تو یہ کل منگل کو کیا کرتا. اس کا خیال یہ تھا کہ یہ شنکھا کو دھوکا دے رہا ہے، شنکھا کو نقصان پہنچا رہا ہے، مگر شنکھا اس سے بہت بڑا ہے ارے بلا اپنے بیروں کو. ذرا پہلے ان کا حساب کتاب کر دیں، بلا رے بلا بلاتا کیوں نہیں ہے ارے کہاں ہو تیسری بیڑ کے بیروں، کہاں ہو بیرو ذرا سامنے تو آؤ. اپنے مالک کا کھیل دیکھو ...."

مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا رامانندی نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے بازو سیدھے ہو گئے تھے دفعتہً ہی میں نے کچھ عجیب و غریب شکلیں دیکھیں ان کے قد ڈھائی ڈھائی اور تین تین فٹ کے تھے اور چہرے غیر انسانی معلوم ہوتے تھے کالے سیاہ کسی کے کان ہاتھیوں کے کان جیسے، کسی کی سونڈ لٹکی ہوئی، کسی کی زبان باہر نکلی ہوئی .... وہ سب کے سب بے لباس تھے اور اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے عجیب سا منظر تھا تعداد ان کی کوئی دس بارہ ہوگی سارے کے سارے سامنے آ کھڑے ہوئے اور پھر ان کے منہ سے آواز نکلی۔

"اکھنڈ شنکھا، پدم شنکھا۔" وہ سارے کے سارے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے اور انہوں نے دونوں ہاتھ آگے رکھ لئے یہ منظر تھا عجیب و غریب و دماغ چٹخا دینے والا. آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں دل کی دھڑکنیں بند ہو چکی تھیں زبان خشک تھی اور اب ہر احساس دل سے فنا ہوتا جا رہا تھا خوف کی انتہا نے بدن کو پتھرا دیا تھا کان سن سکتے تھے دماغ بھی کام کر رہا تھا کسی حد تک ان کی آوازیں سمجھ میں آ رہی تھیں لیکن اعضا اس طرح ساکت ہو گئے تھے کہ اگر کوشش بھی کرتا تو بدن کو جنبش نہ دے پاتا یہ سب کیا جنجال تھا۔ بھوریا چرن کی آواز پھر ابھری۔

"اس سسرے کے بیر بنے ہو، تم اس کے بیر ہو، تم جو اپنی ہی بیڑی کاٹے ہے جو اپنا ہی کالا دھرم خراب کئے دیوے ہے ارے تو سن رہا ہے بڑے دھرم والے کیا کرتا یہ تیرے ساتھ جانتا ہے کیا کرتا یہ تیرے ساتھ! ارے او دیندار اس کے جال میں پھنسا تھا تو، اس کے جال میں یہ گندا خون جمع کر رہا ہے ایسا گندا خون جس کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر کل منگل کو چاند نکلے یہ وہ خون تجھے پلا دیتا تیرے شریر میں تیرے بدن میں یہ ناپاک خون اتر جاتا اور تو بھی ناپاک ہو جاتا اور اس طرح تو ہمارے بڑے گہرے دوست پیر پھاگن کے مزار پر نہ جا سکتا تھا۔ کسی گندے آدمی کو مزار کے احاطے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ مہان تین بیڑا سوچتا تھا کہ گندا خون پلا کر تجھے ہمارے لئے ناکارہ کر دے اور اس کے بعد ہم خود ہی تیرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مگر تیرے دھرم کا کیا ہوتا، دھرم ہی کے ناتے تو تو اب تک موت کے جال میں پھنسا ہوا ہے ارے اگر ایسے ہی دھرم کھونا تھا تو ہم کیا برے تھے، تو ہمارا کام کر دیتا تو تجھے بھی کچھ مل جاتا، ارے اتنا کچھ مل جاتا تجھے کہ سنسار میں تیرے لئے پھول ہی پھول ہوتے .... مگر تو اس کے ہاتھوں دھرم کھو رہا تھا پھر جانتا ہے کیا ہوتا تو دھوبی کا کتا بن جاتا گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا، کالے دھرم کو

تو مانتا نہیں اور اپنے دھرم سے دور ہو جاتا. یہی ارادہ تھا اس کا. ارے ایسا ہی اپنا دھرم خراب کرنا تھا تو اس کل کے بیڑے کے چکر میں کیوں پھنسا. مان لے ہماری اب بھی مان لے. لے چل ہمیں پیر پھاگن کے دوار اور پالے سارے سنسار کو .... بول اب بھی موقع ہے مگر ٹھہر پہلے تیرے اس مددگار کا کریا کرم کریں پہلے اسے اس کے حال پر پہنچا دیں ارے او بیرو او دھیرو. جاؤ اپنا کام کرو. جاؤ ڈوب مرو جوہڑ میں. چلو چلو ہم حکم دے رہے ہیں تمہیں .... زمین پر بیٹھی ہوئی عجیب و غریب مخلوق بین کرنے لگی .... وہ رو رہے تھے، پیٹ رہے تھے. اپنا سر دھن رہے تھے بال نوچ رہے تھے اور رامانندی کو خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ رامانندی اب بھی خاموش اور ساکت کھڑا تھا پھر خوب رو پیٹنے کے بعد وہ سارے کے سارے اٹھے اور اس کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے اس کالے کیچڑ کے جوہڑ میں چھلانگیں لگا دیں، ایسا لگتا تھا جیسے وہ خودکشی کر رہے ہوں میں اب ایک خاموش تماشائی کی طرح یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ رامانندی پتھرایا ہوا کھڑا تھا ان عجیب و غریب لوگوں کے غائب ہو جانے کے بعد بھوریا چرن رامانندی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں رے تیسری بیڑی والے، بول اب تیرا کیا کریں ہم چھوڑ دیں تجھے یا سزا دیدیں تجھے۔ بول کیا تھا تیرے پاس اسے دینے کے لئے .... اس کا دھرم خراب کرتا تو صرف اس لئے نا کہ پھر یہ ہمارے کام نہ رہے یہی منصوبہ تھا تیرا نا ....؟"

"ہاں پدم شنکھا۔" رامانندی نے جواب دیا۔

"پدم شنکھا میرے بچپن کے دوست نے مجھ سے یہ کہا تھا۔"

"ارے بچپن کا دوست تجھ سے یہ کہتا کہ اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو جا تو ہو جاتا کیوں ....؟"

"ہاں بھوریا چرن اگر وہ سچ مچ مجھ سے یہ بات بھی کہتا تو میں اس کی یہ بات بھی مان لیتا۔"

"یہی سننا تھا تیرے منہ سے ہمیں، یہی سننا تھا ارے کالے دھرم کو بدنام کرنے والے، تیرا اس سنسار میں رہنا اچھا نہیں ہے پتہ نہیں کب بہک جائے. کب بھٹک جائے ایں .... ٹھہر ہم تیرا بندوبست کئے دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر بھوریا چرن نے اپنے مختصر سے لباس میں ہاتھ ڈالا اور شاید چمڑے کی بنی ہوئی ایک گول سی بوتل نکال لی۔ رامانندی کے بدن پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی بھوریا چرن نے انگلی سے اس طرح جھٹکا دیا جیسے کسی چیز کے چھینٹے دیئے جاتے ہیں اور میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا کہ رامانندی کے پیروں میں لوہے کی ایک زنجیر جکڑ گئی ہے بھوریا چرن نے دوبارہ انگلی اسی طرح جھٹکی اور رامانندی کے دونوں ہاتھ بھی پیچھے جا بندھے۔ رامانندی چیخنے لگا۔

"چھوڑ دے، بھوریا چرن، چھوڑ دے پدم شنکھا چھوڑ دے مجھے شما کر دے، معافی چاہتا ہوں تجھ سے. آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گا، ارے دال روٹی کھانے دے مجھے بھی پدم شنکھا تیرا کچھ نہیں لوں گا میں، بھول ہو گئی، مجھ سے بھول ہو گئی۔"

"بھول ہو گئی تو بھگت باؤلے، یہ .... یہ سسرا تو چیٹ پٹ ہو جاتا ہمارے ہاتھوں اگر ہمارے کام کا نہ ہوتا. ارے اسکی اوقات کیا ہے ہمارے سامنے، کیا ہے یہ. بڑا میاں جی کا پلا بنا پھرتا ہے، ارے کیا ہے یہ دو منٹ میں ٹھیک کر دیتے ہیں اسے. مگر .... مگر جب ہم نے اسے اپنے کام کے لئے ٹھیک کر لیا تو پھر ٹھیک کر لیا، ہمیں یہی حکم ہوا تھا کھنڈولوں کی طرف سے، سمجھا کھنڈولا بننے کے لئے. یہی ہمارے کام آ سکتا ہے اور سب کچھ بتا دیا تو نے اسے بتا دے ہمارا کیا بگاڑ لے گا سسرا. دیکھ لیں گے ہمارے سامنے

کب تک سینہ پھلائے پھلائے پھرتا ہے. چل تو آجا اپنی جون میں آجا اپنی جگہ "۔

"معاف کر دے بھوریا. معاف کر دے۔" راماننذی بری طرح تڑپنے لگا. لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں پا رہا تھا. پاؤں نہیں ہٹا سکتا تھا وہ اپنی جگہ سے. اس کے دونوں پاؤں جکڑے ہوئے تھے اور زمین پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا بھوریا چرن نے اسے دیکھا. کچھ منہ ہی منہ میں بدبدایا اور پھر راماننذی کی طرف پھونک مار دی .... راماننذی کے بدن کی کیفیت سے ایسا ہی اظہار ہوا جیسے اچانک ہی وہ شعلوں میں گھر گیا ہو. اس نے بےاختیار چیخنا شروع کر دیا. ایسی بھیانک چیخیں تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے راماننذی دہشت سے چیخ رہا تھا۔ اور اس کا بدن عجیب سے انداز میں رنگ بدلتا جا رہا تھا پہلے یہ رنگ پیلا ہوا. پھر نارنجی. اس کے بعد سفید ہو گیا. بالکل یوں لگا. جیسے راماننذی جل کر راکھ ہو گیا ہو سفید سفید راکھ. اب اس کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ پھر دفعتہً ہی اس کے بدن سے سفید سا دھواں خارج ہونے لگا اور بھوریا چرن نے شیشی کا ڈھکن کھول دیا۔ دھویں نے بل کھایا اور پتلی لکیر کی شکل میں شیشی کے اندر داخل ہونے لگا۔ میرے ہوش و حواس گم تھے۔ آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور میرے بدن میں کوئی جنبش نہیں تھی. یہ سب کچھ یہ سب کچھ ایک انوکھے خواب کی مانند تھا. سارا دھواں سمٹ کر شیشی میں بھر گیا تو بھوریا چرن نے شیشی میں ڈاٹ لگائی اور اس کے بعد پوری قوت سے شیشی جوہڑ میں اچھال دی .... کوئی آواز نہیں ہوئی تھی۔

وہ جو جوہڑ کے کنارے بیٹھے جاپ کر رہے تھے نجانے کب اٹھ کر بھاگ گئے تھے. غالباً ان خوفناک چیخوں اور خوفناک آوازوں نے انہیں ان کے جاپ سے چونکا دیا تھا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے. کوئی بھی یہاں نہیں تھا سوائے بھوریا چرن کے .... جو میرے سامنے کھڑا مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھ لیا اپنے مدد گار کا انجام. اب بول تو کیا چاہتا ہے۔ ہاں بول اب کیا کہے گا تو .... ؟"

میں نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے. لیکن آواز حلق سے باہر نہیں آ سکی تھی میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھوریا چرن کو دیکھتا رہا۔ راماننذی کا یہ انجام میرے لئے بڑا ہی دردناک تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا. کالے جادو کا ماہر تھا ایک غلیظ ہندو .... لیکن میرے لئے انسانیت کے تمام دروازے کھول دیئے تھے اس نے .... وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا تھا میں نہیں جانتا تھا۔ بھوریا چرن کی زبانی یہ سن کر کہ وہ مجھے گندہ خون پلا کر بھوریا چرن کے لئے ناقابل قبول بنا دینا چاہتا ہے. مجھے کراہت تو ہوئی تھی اور یقیناً میرا وجود اس گندی اور غلیظ شے سے ناپاک ہو جاتا. تو میں خوش نہ ہوتا. بےشک بھوریا چرن کی مصیبت سے بچ جاتا لیکن اپنے ایمان ہی کے لئے تو میں نے اب تک یہ مصائب برداشت کئے تھے. مجھے یقینی طور پر اس کا وہ عمل اچھا نہ لگتا. لیکن اس نے خلوص دل سے جتنا وہ جانتا تھا کوشش کر ڈالی تھی۔ بھوریا چرن کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ اور وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے راماننذی کے اس انجام پر افسوس تھا۔ بھوریا چرن میرے قریب آیا اور اپنی اس مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا ....

"عقل آ رہی ہے اب شاید سمجھے. ارے چنتا کاہے کرے ہے بوا. سنسار دے دوں گا تجھے. سنسار دے دوں گا. بس ایک بار .... صرف ایک بار مجھے پیر پھاگن کے دوارے پہنچا دے. سمجھا ہے نا .... بول تیار ہے .... ؟"

"نہیں۔" نجانے کس طرح میرے منہ سے یہ آواز نکلی اور بھوریا چرن کا چہرہ ایک بار پھر سے

"نہیں؟" .... گیا

"نہیں بھوریا چرن .... " اچانک میری آواز صاف ہو گئی۔ ؟

"ارے کس کی نسل ہے رے تو. کس کی نسل ہے. ارے کب مانے گا پاپی. کب مانے گا. کتنا انتظار کرائے گا ہمیں. دل نہیں بھرا تیرا .... ابھی دل نہیں بھرا. کچھ اور چاہئے تجھے. کچھ اور چاہئے۔"

"ہاں بھوریا چرن مجھے کچھ اور چاہئے. سمجھا سچ مچ مجھے کچھ اور چاہئے. لیکن میں تیری اس خواہش کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا بھوریا چرن. تو دیکھنا. آزما لینا اپنے آپ کو. موت دے سکتا ہے تو مجھے. یہ کام تیرے لئے بہت آسان ہے میں یہ بات جانتا ہوں لیکن میرے ارادے کو نہیں بدل سکتا. کوشش کر بھوریا چرن. کوشش کر" .... بھوریا چرن اچانک ہی زمین پر بیٹھ گیا اور بری طرح اچھل کود کرنے لگا .... بڑا بھیانک لگ رہا تھا وہ اس انداز میں بھی .... غالباً یہ اس کے جنون کا انداز تھا. بہت دیر تک زمین پر لوٹتا رہا اور اس کے بعد سیدھا کھڑا ہو گیا .... پھر اس نے کہا ....

"آخری بار .... آخری بار کہہ رہے ہیں. مان لے .... دیکھ مان لے .... ورنہ نقصان اٹھائے گا .... ؟"

"لعنت ہے تیری صورت پر بھوریا چرن. لعنت ہے تیری صورت پر. تو مجھے کیا مجبور رکھ سکے گا. کوشش کر لے جتنی کی جا سکتی ہے تجھ سے. جتنی کوششیں تجھ سے کی جا سکتی ہیں کر لے. اور اب میں چلتا ہوں ......"

"ہلنا مت اپنی جگہ سے. کہہ دیا ہم نے. ہلنا مت۔" وہ بولا اور دفعتہً ہی میرے پاؤں اپنی جگہ ساکت ہو گئے. بھوریا چرن کی قوتیں میرے اوپر کارگر ہو رہی تھیں لیکن اس کا بس میرے دل و دماغ پر نہیں چل سکتا تھا. میرے ارادوں کو وہ نہیں تبدیل کر سکتا تھا۔ یہ میری مرضی پر ہی منحصر تھا کہ میں اس کی بات مانوں یا نہ مانوں. بھوریا چرن ایک بار پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں گھٹنوں میں اپنا سر دے لیا. دیر تک بیٹھا رہا اور اس کے بعد اچانک ہی اس کے ہاتھ پاؤں بڑھنا شروع ہو گئے. وہ ایک بار پھر مکڑی کی شکل اختیار کر لیا اس کا چہرہ اور جسم جوں کا توں تھا بس مکڑی کی طرح اس کے بدن میں ہاتھ پاؤں اگ آتے تھے اس وقت بھی وہ ایک کالی مکڑی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور خونی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا. پھر وہ مکڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میرے پاؤں تو پہلے ہی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے. جیسے اس نے مجھے بھی کسی ان دیکھی زنجیر میں جکڑ لیا ہو. وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا. اور پھر اس نے اپنے آگے کے دو پاؤں میرے بدن پر رکھے. پورے بدن میں جھرجھری آ گئی تھی لیکن کم بخت اعضا ساکت ہو گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے جادو کے جال میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے پاؤں کچھ اور آگے بڑھے. میری رانوں تک پہنچ گئے وہ آہستہ آہستہ میرے بدن پر چڑھ رہا تھا اور میرے پورے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں لیکن نہ ہاتھ اس قابل تھے کہ میں اسے اپنے آپ سے دور کر سکوں اور نا پاؤں ساتھ دے رہے تھے. بس میں گردن جھٹک رہا تھا اور پسینے سے تر ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ میرے چہرے کے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے اچانک اپنا منہ میری گردن کے قریب کر دیا اس کے بعد اس نے اپنے باریک نکیلے دانت میری گردن میں پیوست کر دیئے۔ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا. بدن میں سوئیاں سی چبھیں لیکن میں اسے اس کے عمل سے نہ روک سکا۔ نہ جانے کیا کر رہا تھا وہ کم بخت. چند لمحات وہ اسی طرح میری گردن سے چمٹا رہا اور پھر نیچے اتر گیا۔ گردن میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر میں ہاتھ اٹھا کر گردن مسل بھی نہیں سکتا تھا۔ بھوریا

چرن نے پھر روپ بدل لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"بہت کچھ جان لیا ہے تو نے ہمارے بارے میں لڑ کے ہمارا کچھ نا بگڑے گا، ضد کئے جا نقصا اٹھائے جا، ہم پھر تجھ سے یہ کہہ کر جا رہے ہیں کہ جب بھی ہمارا کام کرنے کا من کر جائے، ہمیں دے لینا۔ تجھ سے دور ہی کتنے ہوتے ہیں ہم، آجائیں گے اور کھلی چھوٹ ہے تجھے جو من چاہے ہمارے خلاف، کچھ نہ کر پائے گا، یہ ہم تجھ سے کہے دے رہے ہیں، ٹھیک ہے جا دیکھ سنسار کو، کیسا یہ، بڑا اچھا لگے گا تجھے، ہم پھر ملیں گے تجھے، جب ضرورت ہوگی۔" بھوریا چرن نے کہا اور رخ تبدیل کے وہاں سے آگے بڑھ گیا، جیسے ہی اس نے رخ تبدیل کیا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بدن پھر متحرک ہو گیا ہو اور پہلا کام میں نے یہی کیا کہ اپنی گردن کے اس حصے کو ملنے لگا جس میں شدید سوز ہو رہی تھی، نجانے اس کتے نے کیا کر دیا تھا، گردن کے اس حصے کو چھونے ہی سے ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں کچھ کچھ ذہن میں آتا جا رہا تھا۔ آہ! بے چارہ رامانندی ختم ہو گیا میری وجہ سے اور پتہ نہیں نیاز اللہ صاحب کا کیا ہوا خدانخواستہ کہیں وہ بھی اس کالے جادو کے ماہر کے عتاب کا شکار نہ ہو جائیں۔ بڑا غم ہوا مجھے اگر ایسا ہو گیا تو اپنی مصیبت میں تو گرفتار تھا ہی، نیاز اللہ صاحب کا خدشہ اور دل میں بیدار ہو گیا۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں یہاں رکنا تو اب بے مقصد ہی تھا جوہڑ میں جا کر اس شیشی کو تو تلاش نہیں کر سکتا تھا، یہ ساری باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ بس وقت نے نجانے کیا کیا بے تکی چیزیں سمجھائی تھیں جنہیں میں نے کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا ....

کھنڈرات سے واپس چل پڑا دل میں نیاز اللہ صاحب کا خیال بھی تھا اور اپنی تکلیف بھی بے چین کئے دے رہی تھی، چلتا رہا بس بے دھیانی کا سا عالم تھا حالانکہ کافی فاصلہ طے کر کے تانگے میں بیٹھ کر نیاز اللہ صاحب یہاں آئے تھے لیکن میں چلا جا رہا تھا نیاز اللہ صاحب کی خیریت مل جائے، بس اس کے بعد ان کی طرف رخ نہیں کروں گا، میری نحوستیں کسی بھی اس شخص کو نہیں چھوڑ سکیں گی جس کے دل میں میرے لئے محبت کا تھوڑا سا بھی جذبہ ابھرے گا اور جو میری کہانی سے واقف ہو جائے گا۔ خدا کرے، خدا کرے نیاز اللہ صاحب خیریت سے رہیں، خدا کرے اس بدبخت سادھو کے دل میں ان کا خیال نہ آئے بس یہ دعا میرے دل میں تھی، نجانے یہ سفر کب تک جاری رہا، وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا، ایک دیوانگی کی سی کیفیت طاری تھی بار بار گردن پر ہاتھ پہنچ جاتا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ گردن پر کیسا زخم ہے، ٹٹولنے سے کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔

نجانے کتنا سفر طے ہو گیا پھر مجھے روشنیاں نظر آئیں مدہم مدہم روشنیاں آبادی کا نشان دے رہی تھیں، میں شاید شہر کی حد میں داخل ہو گیا تھا، شہر میں داخل ہوا لیکن یہ سب کچھ تو اجنبی اجنبی لگ رہا تھا .... یہ وہ جگہ .... وہ جگہ تو نہیں تھی، میرا مطلب ہے وہ آبادی تو نہیں تھی۔ جہاں نیاز اللہ صاحب رہتے تھے، راستہ بھٹک کر کسی اور ہی سمت نکل آیا تھا، اتنے دن میں تھوڑا بہت اندازہ ان علاقوں کے بارے میں لگا چکا تھا، یقینی طور پر یہ نیاز اللہ صاحب کی بستی نہیں تھی۔ دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں، صبح ہونے میں شاید تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی ایک درخت نظر آیا اور اس کے نیچے جا بیٹھا اور پھر درحقیقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں دیر تک دل کی بھڑاس نکالتا رہا بھوک لگ رہی تھی اور چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا، ویسے بھی رامانندی کے ساتھ قیام کے دوران

کھانے پینے کو کچھ نہیں ملا تھا، بس درختوں کے پھلوں وغیرہ پر اپنا گزارہ کرتا رہا تھا۔ اس وقت بھوک کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی آنسو خشک کئے، گردن کی تکلیف کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی، اپنی جگہ سے ہٹا اور کافی دور چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ روشنی سی نظر آئی یہ کوئی چھوٹا سا جھونپڑا ہوٹل تھا جہاں شاید نہاری پکائی گئی تھی اور تندور پر روٹیاں لگ رہی تھیں، ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہی بھوک نے کچھ ایسی شدت اختیار کی کہ میرے قدم اس کی جانب بڑھ گئے۔ چند افراد کاموں میں مصروف تھے، غالباً صبح ہی صبح تمام تیاریاں کر لی گئی تھیں، گاہکوں کے آنے میں ابھی دیر تھی، پیسے نام کی کوئی چیز میرے پاس موجود نہیں تھی .... لیکن دل مچل رہا تھا وہ کرنے پر آمادہ ہو گیا جو کبھی نہیں کیا تھا میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔

"کھانا کھانا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"تیار ہے بابو، بہت صبح گھر سے نکل آئے۔" تھڑے پر بیٹھے ہوئے بھاری بھر کم شخص نے کہا۔

"مسافر ہوں بھائی۔" میں نے جواب دیا۔

"بیٹھو، اندر بیٹھ جاؤ۔" اس نے نرمی سے اشارہ کیا اور میں اندر جا بیٹھا۔ "رمضان دیکھ بابو کو۔" اس شخص نے زور سے کہا اور دبلا پتلا آدمی میرے پاس پہنچ گیا۔

"بولو بابو ....؟"

"کھانا لے آؤ بھائی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور وہ آوازیں لگانے لگا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا پیٹ کا دوزخ تو بھر جائے گا مگر اس کے بعد جو بے عزتی ہوگی اس کا احساس تھا ان لوگوں کی نرمی کیا رخ اختیار کر جائے گی۔ آہ! کبھی ایسا نہیں کیا تھا دل رو رہا تھا مگر یہ لمحے بھی میری تقدیر میں لکھے تھے۔ پھولی ہوئی خمیری روٹیاں اور سرخ تار والی نہاری کیا لذت دے رہی تھی بیان نہیں کر سکتا۔ کاش کچھ پاس ہوتا وہی دے کر ان لوگوں کو مطمئن کر سکتا۔ کھانا لیا، دو روٹیاں ختم ہو گئیں پیٹ میں پتہ ہی نہ چلا میں نے اسے اور کھانا لانے کے لئے کہا چھ پلیٹ سالن اور بارہ روٹیوں تک تو کام چل گیا حالانکہ میرے ہر بار کے آرڈر پر کھانا لانے والے کے چہرے پر حیرت پھیل جاتی تھی اور جب میں نے ساتویں پلیٹ مانگی تو وہ کسی قدر خوفزدہ ہو گیا اس نے مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"یہ سب کہاں جا رہا ہے بابو ...."

"ایں ....؟" میں چونک پڑا۔

"دیکھنے میں تو معمولی لگتے ہو کوئی پہلوان ہو کیا۔"

"اور کھانا لا سکتے ہو ....؟"

"ہمیں کیا .... دیگ کھا جاؤ پوری۔" وہ آگے بڑھ گیا البتہ اس نے دیگ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کچھ کہا تھا اور وہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں اس بار وہ چھ روٹیاں اور سالن لے آیا۔ اس کے احساس دلانے سے میں بھی چونکا تھا اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں کتنا کھا چکا ہوں مگر پیٹ .... یوں لگتا تھا جیسے کچھ نہ کھایا ہو۔ آہ! یہ نئی افتاد بھی ایسا کیوں ہو رہا ہے لاکھ کئی دن کے بعد گوشت چکھا تھا مگر بارہ روٹیاں مجھے تعداد یاد تھی مگر ہاتھ نہ رکے میں ان روٹیوں کو بھی چٹ کر گیا اب کیا کروں ....؟ میں نے کھانے لانے والے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر وہ کہیں کھسک لیا تھا سامنے پانی کا بھرا ہوا جگ رکھا تھا گلاس میں پانی انڈیل کر پیا اور پھر پانی پیتا چلا گیا چند گلاس میں ہی جگ

خالی ہو گیا تھا نہاری کی دیگ کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے دیکھ لیا تھا اور اس کا دم خشک لگ رہا تھا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جیسے ہی بینچ کے پیچھے سے نکلا اور وہ شخص بھی جلدی سے تھڑے سے نیچے اتر آیا۔

" اور پانی مل سکے گا بھائی۔ "

" ہو........... ہو........... ہے " اس نے ٹنکی کی طرف اشارہ کیا اور میں وہاں پہنچ گیا گلاس پر گلاس پئے جا رہے تھا مگر نہ بھوک مٹی تھی نہ پیاس۔ جھلا کر گلاس رکھ دیا اور پھر آخری مرحلے سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا مگر ایک عجیب چیز دیکھنے کو ملی تھڑے پر بیٹھا ہوا شخص غائب تھا۔ بیرا تو پہلے ہی غائب ہو گیا تھا یہاں تک کہ تندور پر روٹیاں لگانے والے بھی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ایک لمحے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر ہنسی آ گئی۔ کام دوسرے انداز میں بن گیا وہ لوگ شاید میری خوراک سے خوفزدہ ہوئے تھے اور نہ جانے کیا سمجھ کر بھاگ نکلے تھے مگر عزت رہ گئی تھی میں خود بھی تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل پڑا اور اس جگہ سے بہت دور آ کر سکون کی سانس لی۔ .... مگر قصہ کیا ہے یہ کوئی بیماری ہے اتنے دنوں کی بھوک ہے یا بھوریا چرن کا کوئی انعام .... آہ ! آخری بات دل کو لگتی تھی بھوک اب بھی کم نہیں ہوئی تھی اور گردن کی تکلیف کا بھی وہی عالم تھا۔

آبادی جاگتی جا رہی تھی زندگی کے معمولات شروع ہو گئے تھے ایک پلیا پر بیٹھ کر میں ان خوش نصیبوں کو دیکھنے لگا جو اتنی صبح جاگ کر زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے، اپنے عیش و آرام کو ترک کر کے لیکن میری نسبت وہ کس قدر خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسی کسی مصیبت میں نہیں گرفتار ہونا پڑا تھا۔ آہ ! کاش میرے ابتدائی اقدامات بھی درست ہوتے، میں بھی دنیا کے ان رہنے والوں کی مانند ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارتا اور انہی لوگوں کی مانند تلاش رزق میں نکل کھڑا ہوتا۔ آہ ! کاش میں آسان ذرائع سے جائز اور ناجائز طریقوں سے دولت کے ڈھیر لگانے کے بارے میں نہ سوچتا، کیا حسین زندگی ہوتی، صبح سے شام تک محنت کی جائے اور اس کے بعد گھر کا رخ کیا جائے .... مگر پیار اگر جہاں اپنے ہوتے ہیں لیکن ایک میں بدنصیب تھا بھائی، بہن، ماں، باپ، پیار کرنے والا دوست ماموں لیکن سب سے دور، سب کے لئے عذاب کا باعث، کاش تھوڑا سا سوچنے کا موقع مل جاتا اور میں اپنے آپ کو درست کر لیتا مگر اب تو سب کچھ چھن گیا تھا، سب کچھ .... ہاتھ تھا کہ مسلسل گردن پر مصروف تھا گردن پھوڑا سی لگ رہی تھی، جو کچھ ابھی ہو چکا تھا وہ بھی ناقابل یقین تھا۔ لیکن قابل یقین بات ہی کونسی تھی، لوگوں کو بتاتا تو سب ہی حیرت زدہ ہی ہو جاتے، اب تک ایسا ہی ہوا تھا، بڑا عجیب معاملہ تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ بھوریا چرن کا یہ وار سب سے زیادہ سخت ہے، اب تک تو دنیا سے ہی چھپتا پھرا تھا اور دنیا کے لئے اپنے آپ کو نقصان دہ سمجھتا رہا تھا .... لیکن بات اب اپنی ہی ذات پر آ گئی تھی، یہ بھوک اس بھوک کا کیا ہو گا۔ ناقابل یقین حد تک کھا پی کر آیا تھا بھلا اتنی ساری روٹیاں اور اتنا سارا سالن جو میری جیسی جسامت کے آٹھ دس آدمیوں کے لئے کافی ہو، میں اکیلا ہی چٹ کر گیا تھا اتنا پانی پی گیا تھا کہ بے چارے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اٹھ کر بھاگ گئے مگر بھوک .... بھوک نہ مٹی تھی، ہونٹ خشک ہو رہے تھے اس عالم میں کیا جی سکوں گا، دل یہ چاہ رہا تھا کہ کچھ کھاؤں لیکن ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا بے بسی کی نگاہوں سے وہیں پلیا پر بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا۔ سورج نکل آیا تھا پھر نیاز اللہ صاحب کا خیال آیا یہ بستی کون سی ہے آخر .... یہ نیاز اللہ صاحب کی بستی تو نہیں ہے کوئی منظر وہاں کا سامنے نہیں

نجانے کہاں نکل آیا ہوں، دل میں تجسس سا جاگا اور معلومات کرنے نکل پڑا اور پھر اس بستی کا نام بھی معلوم ہو گیا، وہ جگہ نہیں تھی، پتہ نہیں بے چارے نیاز اللہ صاحب کا کیا ہوا، خدا انہیں محفوظ رکھے، ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا، آنکھوں میں نیند کا سا جھونکا محسوس ہوا اور آنکھیں بند ہو گئیں، درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ نجانے کب تک سوتا رہا۔ جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ اور بھوک تھی کہ کم بخت پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی، کیا کروں، آہ ! کیا کروں، وہاں سے ہٹا اور آگے بڑھ گیا، ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پھلوں کا کاروبار ہوتا تھا، ایک سمت گلے سڑے پھلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ قدم رک گئے اور وہیں بیٹھ گیا اور ان گلے سڑے پھلوں کو اٹھا اٹھا کر کھانے لگا، لوگ مجھے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے لیکن اب جو افتاد پڑی تھی اسے گزارنا ہی تھا۔ یہ پھل میں اپنے معدے میں اتارتا رہا اور خاصا بڑا حصہ صاف کر دیا لیکن بھوک نہیں مٹی تھی، آہ بھوک نہیں مٹی تھی۔ وہاں سے ہٹا اور تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھا، اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، پورا دن گزر گیا تھا، مجھے اندازہ تھا کہ مصیبت میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی، جو کچھ ہوا اسے ٹالنے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا، گزاروں گا اس طرح بھی گزاروں گا بھوریا چرن، لیکن تیری بات نہیں مانوں گا، کسی قیمت پر نہیں مانوں گا کتے، یاد رکھنا، یاد رکھے گا تو بھی کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔

رات گہری ہو گئی تو سونے کی کوشش کرنے لگا نیند نہیں آ رہی تھی پھر آدھی رات گزر گئی تو آنکھیں خود ایک دوسرے سے جڑ گئیں، صبح و شام دن رات میں سڑکوں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا ایک اور کیفیت مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔ جس کا پہلا نمونہ دیکھتے ہی میرا دل خون کے آنسو رو پڑا وہ یہ تھی کہ بدن کے مختلف حصوں میں ننھے ننھے سرخ دانے نمودار ہو گئے تھے پھر ان دانوں میں سوراخ ہو گئے اور ان سوراخوں سے باریک مٹی جیسی کوئی چیز باہر نکلنے لگی، یہ چیز ان سوراخوں کے اوپر جمع ہو جاتی میں اسے صاف کرتا تو ایک ہلکی سی سوزش محسوس ہوتی اور اس میں لذت کا سا احساس ہوتا .... ! پتہ نہیں یہ کیا ہو رہا تھا دانے پورے بدن پر پھیل گئے وہی ہوتا پہلے دانے نکلتے پھر سوراخ ہو جاتے۔ دو تین دن کے بعد ان سوراخوں سے مٹی جیسی خشکی نکلنا بند ہوئی اور گاڑھا سیال نکلنے لگا بدن پر سفید سفید نشان بننے لگے تھے۔ حواس معطل رہے سب سے زیادہ بھوک نے نڈھال کر دیا تھا لوگ مجھ سے دور بھاگنے لگے وہ مجھ سے گھن کھاتے تھے، ویسے وہ مجھے کھانے پینے کی چیزیں دے دیا کرتے تھے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں تھک ہار کر کسی جگہ بیٹھ گیا اور لوگوں نے میرے سامنے پیسے پھینکنا شروع کر دیئے۔ لباس بوسیدہ ہو گیا تھا اور بدن کے سوراخوں سے نکلنے والا سیال لباس کو بھگو کر سڑنے لگتا جس سے بدبو اٹھتی تھی پھر ایک دن میں ایسے ہی بیٹھا اپنی تقدیر پر غور کر رہا تھا کہ ایک سفید گاڑی میرے پاس آ کر رکی بڑی سی وین نما گاڑی تھی اس سے کئی افراد نیچے اترے ایک شخص ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

" یہ ہے۔ " رہنمائی کرنے والے شخص نے کہا۔

" ہوں .... ! پاگل بھی ہے .... " دوسرے شخص نے پوچھا۔

" نہیں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ " دوسرا آدمی دو اور آدمیوں کو اشارہ کر کے میرے قریب آ گیا۔

" اٹھو .... ! " اس نے کہا۔

" جی .... ؟ " میں حیرت سے بولا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

"مگر کہاں ....؟"

"اسپتال تمہیں علم نہیں ہے کہ تم کوڑھی ہو۔"

"کک .... کوڑھی۔" میری آواز رندھ گئی۔ میں نے کوڑھ کا صرف نام سنا تھا یہ علم تھا مجھے بہت خطرناک مرض ہے مگر اپنے بارے میں خیال مجھے کبھی نہیں آیا تھا اپنے جسم کی اس کیفیت سے یہ تم میرے ذہن میں کبھی نہیں ابھرا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ حلق میں ایک گولہ سا آپھنسا

"گھبرانے کی بات نہیں تمہارا اعلاج ہو گا تم ٹھیک ہو جاؤ گے مگر تمہارا اس طرح سڑکوں پر پڑا رہنا ٹھیک نہیں ہے یہ یہاں کی میونسپلٹی کے رکن ہیں انہوں نے ہمیں تمہیں بارے میں اطلاع دی اور ہم تمہیں یہاں آگئے۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو" ۔ میں خاموشی سے اٹھ کر گاڑی میں جا بیٹھا اور گاڑی چل پڑی دل رو رہا تھا یہ بھی ہونا تھا ٹھیک ہے ہو جائے اس کے بعد کیا ہو گا۔

گاڑی کا سفر بہت طویل تھا اس کا اختتام ایک شاندار عمارت پر ہوا تھا مجھے اتار کر ایک کمرہ میں پہنچا گیا میں کرسی پر بیٹھ گیا بڑی صاف ستھری جگہ تھی کچھ دیر کے بعد ایک نرس آئی اور اس نے مجھے ایک لباس دیتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ ....!" میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ ایک دروازے کے قریب رک کر اس نے کہا۔

"یہ غسل خانہ ہے اندر ایک بڑا ڈبہ رکھا ہے جس پر ڈھکن ہے اپنا یہ لباس اتار کر اس ڈبے میں ڈال دینا اور غسل کر کے یہ لباس پہن لینا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور غسل خانہ میں داخل ہو گیا نرس کی ہدایت پر عمل کر کے میں دوسرے لباس میں باہر آیا تو نرس میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لیکر ایک اور بڑے کمرے میں داخل ہو گئی اور اس نے مجھے یہاں ایک جگہ بٹھا لیا دو عورتیں اور تین مرد یہاں بیٹھے ہوئے تھے یہ میری طرح کوڑھی تھے۔ کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر میری طلبی ہوگئی اندر کئی ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا اور پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا ....؟"

"مسعود احمد ....!"

"باپ کا نام ....؟"

"محفوظ احمد ....!"

"تمہارے اہل خاندان کہاں ہیں ....؟"

"مجھے نہیں معلوم ....!"

"کیوں ....؟"

"میں طویل عرصے سے ان سے بچھڑا ہوا ہوں۔"

"خاندان میں، والدین میں کوئی اور اس مرض کا شکار تھا ....؟"

"خدا نہ کرے .... یہ بدنصیبی صرف میرے حصے میں آئی ہے، انہوں نے اس مرض کی ابتداء پوچھی

عرصے کے بارے میں معلوم کیا مزید کیفیات پوچھیں تو میں نے بھوک کے بارے میں بتایا۔

"یہاں تم پیٹ بھر کر کھانا۔" ایک ہمدرد ڈاکٹر نے کہا اور پھر مجھے اس اسپتال میں داخل کر لیا گیا جنرل وارڈ تھا، بہت سے مریض تھے۔ بھیانک چہرے جذام کا شکار انہیں دیکھ کر خوف آتا تھا مگر تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا تھا میرے بہت سے ٹیسٹ ہوئے ان کی رپورٹیں موصول ہوئیں تو ڈاکٹروں کو حیرت ہوئی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق میرے خون میں کوڑھ کے جراثیم نہیں تھے۔ مجھے ڈاکٹروں کے بورڈ کے سامنے ان تمام رپورٹوں کے ساتھ پیش کیا گیا اور ڈاکٹروں نے انٹرویو لیا مگر میں اس پناہ گاہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں کچھ سکون تھا میں نے انہیں بھوریا چرن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا مگر مجھے جنرل وارڈ سے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا میرا انوکھا مرض ڈاکٹروں کو دلچسپ لگا تھا اور وہ اس پر تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بھوک کی تکلیف کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اسپیشل وارڈ میں میرے ساتھ تین مریض تھے جن میں ایک معمر شخص جو کافی تعلیم یافتہ اور نمازی آدمی تھا نام سلیم بیگ تھا اور دوسرا شہزادہ تھا جس کی عمر تیس سال کے قریب تھی تیسرا افرید شاہ تھا۔ سلیم پانچوں وقت کا نمازی خوش اخلاق آدمی تھا اور اس سے میری زیادہ دوستی ہوگئی تھی لیکن میں نے اسے بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ڈاکٹروں نے پہلا تجربہ میری بھوک پر کیا اور انہوں نے مجھے کھانے کے انبار کے سامنے بٹھا دیا مجھے کھانے کی کھلی چھٹی تھی میں نے کھانا شروع کر دیا اور ڈاکٹروں کو چکر آگئے بہت دیر کے بعد انہوں نے مجھے کھانے سے روکا میرا وزن کیا مگر وزن نارمل تھا۔ ان سب کے لئے یہ نہایت حیران کن بات تھی۔ ایک ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

"تم ہمیشہ اتنا کھاتے ہو ....؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب .... اس مرض کے آغاز کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔"

"مزید کتنا کھا سکتے ہو ....؟" دوسرے ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"کوئی انتہا نہیں ڈاکٹر صاحب ....!"

"اگر تمہیں علاج کے لئے ملک سے باہر جانا پڑے تو جاؤ گے ....!"

"ہاں، جینا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب ....!" میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ آنکھوں میں خودبخود آنسو آگئے تھے۔ ڈاکٹروں نے مجھے تسلیاں دیں اور چلے گئے ....!!! اس رات دل بڑا بے چین تھا طبیعت پر بوجھ طاری تھا بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا باہر پرسکون سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دور بلندی پر کچھ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں ان روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے اس کائنات میں لوگ بڑے بڑے جرم کر لیتے ہیں۔ بعض تو آرام سے زندگی بسر کر جاتے ہیں کیا میں اس دنیا میں سب سے بڑا مجرم ہوں ....؟ کیا اللہ کے حضور میری توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے ....؟ کیا میری توبہ کبھی قبول نہ ہوگی ....؟ دل بہت دکھ رہا تھا آنکھوں میں حیرت ابھر آئی تھی اچانک دل دہل کر رہ گیا کسی نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا کوئی آواز نہیں سنائی دی پھر یہ ہاتھ کس کا ہے گھوم کر دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا ....!!!

بدن پر کپکپی طاری تھی اب تو اعصاب بھی کمزور ہو گئے تھے۔ "کون ہے یہ کون ہے۔ کیا بھوریا چرن ....؟"

"ہو بیٹے۔" عقب سے آنے والی آواز نرم اور شفیق تھی۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی

کوشش کرنے لگا۔ پھر مجھے اپنے اس خوف پر شرمندگی ہوئی۔ آواز تو سلیم بیگ کی تھی۔ میرے خوف سے کپکپاتے بدن کو دیکھ کر سلیم بیگ سمجھا کہ میں رو رہا ہوں۔ میں نے گہری سانس لے کر رخ بدل لیا۔

”نہیں سلیم چچا........!“

”ایسا ہی لگا تھا۔ رات تو بہت گزر گئی نیند نہیں آئی؟“

”ہاں طبیعت کچھ بے چین ہے۔“

”ایک بات کہوں بیٹے۔“

”جی چچا۔“

”نماز پڑھا کرو۔ ساری بے چینی دور ہو جائے گی۔ اللہ نے اپنی مخلوق کو خود سے قریب آنے کے بہت سے راستے کھولے ہیں اور ان میں سب سے افضل نماز ہے جس میں تم اس کے حضور ہوتے ہو تمہارا تصور اس کی حمد و ثنا میں ہوتا ہے اور جب خیال اس ذات باری کی طرف ہو تو کوئی اور خیال بے چین نہیں کرتا۔ نماز شروع کر کے دیکھو بیٹے ایک تجربہ کر لو تمہیں فائدہ کا خود اندازہ ہو جائے گا۔“

دل کو ایک عجیب سا دھکا لگا تھا۔ سب کچھ کرتا رہا تھا۔ نہ جانے یہ کیوں نہ کیا تھا۔

”نماز آتی ہے؟“

”بھول گیا ہوں چچا........!“

”کوئی مشکل ہی نہیں۔ تھوڑی دیر میں یاد کرا دوں گا۔“

”ہمارے کپڑے۔ بدن کا کوڑھ۔ کپڑے تو خون اور پیپ سے گندے ہو جاتے ہیں۔“

”یہ مجبوری ہے بیماری بھی خالق کا تحفہ ہے۔ دل کی طہارت ضروری ہے۔ غلاظت تو ہمارے سارے وجود میں بھری ہے۔ روح سے بدن عاری ہو جائے تو اس غلاظت کا تعفن دیکھو، ناقابل برداشت ہوتا ہے بس روح طاہر ہے اس کی طہارت افضل ہے دل سے ضرور پاک رہو وہ مجبوریاں معاف کر دیتا ہے۔ آؤ پھر بے چینی کے یہ لمحات اس کی یاد میں گزار دیں۔ دیکھو بے چینی کیسے بھاگتی ہے فجر کی نماز دونوں ساتھ پڑھیں گے۔“ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور سلیم بیگ مجھے طریقہ نماز سکھانے لگے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ بڑے عجیب سے احساسات ہو رہے تھے ہم کس طرح وقت کے دھارے پر بہہ جاتے ہیں بچپن تھا۔ محمود بھی چھوٹا تھا۔ عید آتی تھی۔ امی دونوں بھائیوں کو تیار کرتی تھیں ماموں ریاض انگلیاں پکڑے ہوتے تھے ہم نماز پڑھنے جاتے تھے۔ ابو نماز کی تلقین کرتے تھے چھوٹے تھے تو خوف سے نماز پڑھتے تھے بڑے ہوئے تو سرکشی شروع کر دی جمعہ کے دن غائب ہوئے رفتہ رفتہ ابو نے کہنا چھوڑ دیا۔ سلیم بیگ صاحب آیات الٰہی دہراتے رہے اور میرا ذہن بھٹکتا رہا۔

”اب سو جاؤ۔ فجر کے وقت جگا دوں گا۔ جگا دوں نا........“

”جی........!“ میں نے کہا اور لیٹ گیا۔ سلیم بیگ صاحب بھی لیٹ گئے نہ جانے کب نیند آ گئی تھی۔ پتہ نہیں سویا بھی تھا یا نہیں۔ سلیم بیگ صاحب نے جھنجھوڑا تو فوراً آواز دی۔ ”ہاں چچا جاگ رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟“

”بھول گئے۔ فجر کی اذان ہو رہی ہے اٹھ جاؤ۔ بیٹے نماز افضل ہے نیند سے۔“

”جی چچا........!“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ نماز پڑھی اور پھر سلیم بیگ سے باتیں کرتا رہا۔ ...... دن گزر

گئے کوئی تکلیف نہیں تھی مگر بھوک کی تکلیف سے نڈھال رہتا تھا۔ حالانکہ مجھے ایک وقت میں کم از کم چھ افراد کی خوراک دی جاتی تھی۔ کھاتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی مگر دل نہیں بھرتا تھا۔ تیسری دوپہر کچھ نئے ڈاکٹر آئے اور مجھے خصوصی طور پر ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ میری ساری رپورٹیں ان کے سامنے تھیں۔

”ہم تمہیں جرمنی بھیجنا چاہتے ہیں۔ تمہاری تفصیل وہاں بھجوائی جا چکی ہے اور وہاں کے ڈاکٹر تم پر تجربات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تجربات تمہاری موت پر بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ تم کہتے ہو تم لاوارث ہو اس لئے کسی اور سے تو تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ تم بتاؤ۔ تم تیار ہو۔“

”جی........!“ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

”تم سے اس بارے میں پوچھا گیا تھا اور تم نے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔“ پرانے ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا۔

”جی ہاں مجھے یاد ہے۔ مجھے کب جانا ہو گا........“

”کچھ دن لگ جائیں گے۔ حکومت تمہاری روانگی کے انتظامات کرے گی تمہاری موت کی تو محض ایک بات کہی گئی ہے۔ زیادہ امکانات تمہارے درست ہو جانے کے ہیں تمہارے کوڑھ کے مرض کا تو یہاں علاج ہو رہا ہے اصل مسئلہ تمہاری اس بھوک کا ہے اور جرمنی کے ڈاکٹر اسی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاید وہ تمہارے معدے کا آپریشن کریں۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم آمادہ ہو تو اس فارم پر دستخط کر دو۔“ انہوں نے ایک فارم میرے سامنے کر دیا۔

”میں سوچنا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم نے تمہارے لئے بڑی کوشش کی ہے۔“ ڈاکٹر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”اگر میں آپ کو اس بھوک کی کہانی سنا دوں ڈاکٹر صاحب تو آپ اسے محض ایک دلچسپ افسانہ کہیں گے اس پر کبھی یقین نہیں کریں گے۔ میرا علاج جرمنی میں نہیں ہے بلکہ .... بلکہ اسی ملک میں ہے۔“

”بقراط بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں کسی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جانا چاہتے ہو تو اس فارم پر دستخط کر دو۔“

”سوچنا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب اور یہ ضروری ہے۔“

”ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے اسے سوچنے کا موقع ضرور دو؟“ نئے آنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا۔ مجھے واپس میرے کمرے میں بھجوا دیا گیا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ میری بیماری جو کچھ تھی میں جانتا تھا۔ یہ بے چارے یا جرمنی کے ڈاکٹر کیا کر سکتے تھے ہاں دل میں ایک خیال ضرور آ رہا تھا۔ بھوریا چرن سے اتنا دور نکل جاؤں تو شاید اس سے جان بچ جائے لیکن سب یہیں رہ جائیں گے ان سے ملنے کی آخری آس بھی ٹوٹ جائے گی........ یہ آس بھی زندگی تھی اور میں اس زندگی سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس رات پھر بے چینیوں نے دل میں بسیرا کر لیا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ سب سو گئے تھے۔ میں اٹھا، کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ تاریکیاں سامنے تھیں۔ بہت دور انہی بلندیوں پر روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر کچھ شور سی سی آوازیں ابھر رہی

تھیں۔ دل بوجھل ہورہا تھا۔ ڈاکٹر دوبارہ مجھ سے سوال کریں گے کیا جواب دوں گا انہیں۔ کیسے بتاؤں کہ میرا علاج تو بہت آسان ہے۔ اس گندی روح کو آواز دوں وہ آجائے گی مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکال لے جائے گی۔ اس مکردہ خواہش پر سر جھکا دوں، ایمان کھو دوں سب ٹھیک ہو جائے گا سوائے اس کے کہ عاقبت کے لئے کچھ نہ ہو گا بجز گناہوں کے انبار کے۔

”عرس ہو رہا ہے شاید..........!“ پیچھے سے آواز ابھری اور میں چونک پڑا۔ نہ جانے کب سلیم بیگ میرے پیچھے آکھڑے ہوئے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پھر بولے۔ ”قوالیاں ہو رہی ہیں۔“

”کہاں..........؟“

”مزار پر..........“

”کونسے مزار پر..........؟“

”یہ آوازیں نہیں سن رہے۔ وہیں سے آرہی ہیں۔“

”مزار کہاں ہے..........؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ روشنیاں جو نظر آرہی ہیں مزار ہی کی تو ہیں۔“

”کس کا مزار ہے۔“

”بابا جلال شاہ کا۔ لوگ یہی کہتے ہیں۔ دیکھا تو کبھی نہیں ہے!“ سلیم بیگ نے کہا۔

”کافی فاصلے پر ہے۔“

”ہاں بہت دور ہے۔ دن میں تو نظر بھی نہیں آتا رات کو بس روشنیاں نظر آجاتی ہیں۔ اس وقت قوالیوں کی آوازیں بھی ہوا کے ساتھ آرہی ہیں ہوا کا رخ بدل جائے تو آواز بھی نہیں آئے گی۔“

”چلیں..........؟“ میں نے بے اختیار کہا۔

”کہاں..........؟“ سلیم بیگ حیرت سے بولے۔

”عرس دیکھیں۔ قوالیاں سنیں۔“ میں نے کہا اور سلیم بیگ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ میں ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کچھ بولنا چاہتا تھا کہ اچانک ان کی سسکیاں ابھرنے لگیں اور میں حیران ہو گیا۔ ”ارے ارے۔ سلیم چچا۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”کوئی بات نہیں بیٹے۔ بس ایسے ہی دل بھر آیا تھا۔ تمہارا دل چاہتا ہے ناسب دیکھنے کو مگر اللہ کا حکم.......... وہ خود ہی سب کچھ جانتا ہے۔ بیٹے ہمیں کوئی اپنے درمیان کہاں قبول کرے گا لوگ ہم سے گھن کھاتے ہیں۔ ہم کیسے جا سکتے ہیں وہاں۔“

”ہم ان سے دور رہیں گے چچا..........“

”نہیں بیٹے۔ ویسے بھی گیٹ بند ہو گا چوکیدار اس وقت نہیں جانے دے گا۔“

”میرا دل چاہ رہا ہے چچا، میں جاؤں گا۔“

”ارے نہیں بیٹے۔ ممکن نہیں ہے۔ مزار شریف بہت دور ہے اور پھر باہر کیسے جاؤ گے۔ کمرے کے باہر بھی رات کی ڈیوٹی کے ڈاکٹر ہوں گے سختی کریں گے۔“

”یہ کھڑکی زیادہ اونچی تو نہیں ہے کود جاؤں گا۔“

”زخمی ہو جاؤ گے بیٹے..........!“

”زخمی تو میں ہوں چچا..........!“

دھند سوار ہو گئی ہے تم پر۔ مگر ٹھیک نہیں ہو گا بیٹے مناسب نہیں ہے۔“

”میں جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور کھڑکی پر چڑھ گیا۔ سلیم بیگ ”ارے ارے“ کرتے رہ گئے مگر میں نیچے کود گیا۔ بس دل پر یہ طلب طاری ہو گئی تھی اور پھر میں کوڑھی نہیں تھا۔ میرا بدن مضبوط تھا۔ میں یہ فاصلہ طے کر سکتا تھا میں نے احاطے کی دیوار عبور کی اور تیزی سے دوڑنے لگا مجھے دوڑنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی رخ کا تعین کر لیا تھا اور اسی طرف دوڑ رہا تھا۔ ماحول پر دہشت ناک سناٹا طاری تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اسپتال کی عمارت بہت پیچھے رہ گئی۔ راستے ناہموار تھے۔ کئی جگہ ٹھوکریں لگیں اور میں نے دوڑنے کی رفتار ہلکی کر دی۔ اب یہ خوف نہیں رہا تھا کہ اسپتال کے ملازم مجھے پکڑ لیں گے۔ پیچھے ایسے آثار بھی نہیں تھے۔ میرے ارد گرد جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے دوڑنا ترک کر کے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ اور آگے بڑھا تو کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھریں، پھر اچانک کہیں گیدڑ رونے لگے۔ یہ آوازیں کبھی کبھی بالکل انسانی آوازیں لگنے لگی تھیں۔ اچانک میرے حلق سے ایک خوفزدہ آواز نکل گئی اور میں رک گیا۔ کالے رنگ کا ایک ہولناک کتا مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک جھاڑی کی آڑ سے نکل آیا۔ کتا ہی تھا لیکن اس کی جسامت ناقابل یقین تھی۔ قد و قامت میں وہ کسی گدھے جتنا لگتا تھا۔ آنکھیں رات ہونے کے باوجود چمک رہی تھیں اور خون میں ڈوبی محسوس ہوتی تھیں۔ جبڑے کانوں تک کھلے ہوئے تھے۔ اس نے غرانا شروع کر دیا۔ اور ایسی پوزیشن بنالی جیسے مجھ پر چھلانگ لگانا چاہتا ہو۔ میرے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو گئے۔ خوف کے مارے میری گھگھی بندھ گئی۔ اصولاً مجھے پلٹ کر بھاگنا چاہئے تھا مگر بھاگنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ کتا خوفناک آواز میں غراتا رہا۔ پھر وہ وحشت ناک انداز میں چیخا اور اس نے اگلے دونوں پنجے دبا کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں میں مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک لمحے میں وہ مجھے دبوچ لے گا میری گردن اپنے انتہائی حد تک کھلے جبڑوں میں دبالے گا اور اس کے بعد شاید میں دوسری سانس بھی نہ لے سکوں گا۔ مجھے اس کے بدن کی ہوا اپنے سر سے گزرتی محسوس ہوئی وہ شاید میرے اوپر سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ چھلانگ کی غلطی ہو گئی تھی اس سے مگر اس کے گرنے کی آواز نہیں سنی تھی میں نے۔ البتہ میرا پلٹنا فطری تھا بس اسے بچاؤ کی ایک کوشش کہا جا سکتا تھا لیکن پیچھے کچھ نہیں تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا دور دور تک نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی متحرک شے نہ نظر آئی دور دور تک وہی خاموشی وہی سناٹا طاری تھا۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کتا نہیں تھا بلکہ.......... بلکہ میرا راستہ روکا جا رہا تھا آہ۔ میرا راستہ روکا جا رہا تھا۔ اس احساس نے مجھے ہمت بخشی۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میرا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا بلکہ اس کوشش نے میری ہمت بندھا دی تھی۔ میرے دانت بھنچ گئے۔ دماغ میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک پھٹ پھٹ کی آواز سنائی دی۔

ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے سے کچھ گدھ نکل آئے تھے۔ ان کی لمبی گردنیں ہل رہی تھیں اور انہوں نے اپنے پر چادر کی طرح پھیلائے ہوئے تھے۔ آسمان پر کھلے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ بھیانک لگ رہے تھے ان کی تعداد چھ تھی۔ اور وہ اس طرح قطار میں پھیل گئے تھے کہ دور تک کا راستہ بند ہو گیا تھا پھر

انہوں نے میری طرف بڑھنا شروع کر دیا بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ ایک دوسرے سے پکڑے کسی پر گھیرا ڈال رہے ہوں۔ میرے حلق سے ایک وحشیانہ دہاڑ نکلی اور میں خود ان کی طرف پڑا۔ خوف اور جوش میں ڈوبی اپنی آواز خود مجھے بہت بھیانک لگی تھی اور اچانک وہ گدھ آگے بڑھتے رک گئے تھے۔ پھر ان میں ابتری پھیل گئی اور وہ اپنے پیروں پر اچھلنے لگے۔ اسی طرح اچھلتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ رہے تھے جونہی میں ایک گدھ کے قریب پہنچا تو اس نے بھیانک چیخ ماری پر دبائے اور فضا میں پرواز کر گیا یہ دوسروں کے لئے پروانہ تھا کیونکہ اس کے اڑتے ہی دوسرے گدھوں نے بھی زمین چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نیچے نہیں جھکے اور بلند ہو کر مختلف سمتوں کو پرواز کر گئے۔ خوف میرے رُویں رُویں میں سما گیا تھا لیکن خوف کے ساتھ جوش بھی تھا۔ بدن اینٹھ رہا تھا مگر قدم دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ اب شاید میں مزار کے قریب پہنچ رہا تھا کیونکہ جھاڑیوں کے ایک اونچے سلسلے کے دوسری طرف سے روشنی چھن رہی تھی ادھر سے کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انسانی آوازیں تھیں۔ وہ پکار رہے تھے۔ نہ جانے کیا۔ آوازیں مبہم تھیں میں تیز قدم اٹھاتا ہوا جھاڑیوں کے دوسری طرف نکل آیا۔ روشنیاں مشعلوں کی تھیں جو چند لوگوں نے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی تھیں انہوں نے ایک حلقہ سا بنا رکھا تھا اور ان کے درمیان چند ملنگ رقص کر رہے تھے وہ کچھ گاتے بھی جا رہے تھے جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان کے جسموں پر مٹیالے رنگ کی کفنیاں تھیں جو لہرے لے رہی تھیں وہ کسی قدر گہرائی میں تھے اور میں بلند جگہ جہاں سے میں انہیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میرا اندازہ غلط تھا مزار ابھی دور تھا اور یہ لوگ میرے درمیان میں تھے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں ان کے قریب پہنچ گیا مگر قریب سے دیکھنے پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ان میں سے کسی کی گردن ان کے شانوں پر موجود نہیں تھی ان کے جسم رقصاں تھے۔ آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر سب کے شانے گردنوں سے خالی تھے۔ اس بھیانک منظر کو دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر قدم نہ روکے اب مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیا ہو رہا ہے خوف اب دل میں ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے چلنے سے جگہ جگہ ٹھوکریں لگ رہی تھیں میں لڑکھڑا رہا تھا مگر رک نہیں رہا تھا ملنگوں کی آوازیں مجھے اپنے آگے آگے چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ سب مجھے اپنے ساتھ آگے بڑھتے نظر آئے انہوں نے مشعلیں پکڑی ہوئی تھی۔ بے سر والے ناچ رہے تھے۔ میرے آگے جلوس کی سی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے رفتار تیز کی تو وہ بھی تیز چلنے لگے۔ نہ جانے کونسی قوت مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی ورنہ اس منظر کو دیکھ کر دل کی دھڑکن بند ہو جانی چاہئے تھی۔ نہ جانے کتنی دور تک چلتا رہا۔ دماغ سنسنا رہا تھا بدن کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں اور اب جانے کون چل رہا تھا وہ میں تو نہ تھا۔ آوازیں بند ہو گئیں اب قوالی کی آوازیں نمایاں ہو رہی تھیں قوال گا رہے تھے۔

من کی پیاس بجھانے آیا داتا ایک سوالی۔

آنکھیں کھل گئیں۔ بیشمار خلقت تھی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ خوب چہل پہل تھی۔ لوگ بول رہے تھے سر کٹے ملنگوں کا کوئی نام و نشان نہیں تھا میں بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا انسانوں کے ہجوم کے درمیان تھا جہاں تک پہنچا تھا وہیں بیٹھ گیا کچھ فاصلے پر بہت سے لوگ دری بچھائے بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ عرس میں شرکت کرنے والوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کچھ لوگ لنگر بانٹ رہے

میرے قریب آکر رک گئے۔

"کھانا لوگے۔؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"برتن ہے؟"

"نہیں"۔

"تو پھر کھانا کیسے لو گے؟"

"رکابی دیدو ایک؟" کسی ہمدرد نے کہا اور انہوں نے سلور کی ایک رکابی میں مجھے چاول دیدیئے بھوک تو سانسوں کا حصہ بن چکی تھی یہ تھوڑے سے چاول کیا حیثیت رکھتے تھے میں انہیں کھانے لگا۔ دری پر بیٹھے ہوئے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے جب میں چاول کھا چکا تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"پانی چاہئے۔"

"دیدو بھائی۔" میں نے عاجزی سے کہا اور ایک نوجوان پانی لے آیا اس نے جھک کر مجھے پانی دیا اور پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔

"تم کوڑھی ہو۔!" اس نے بے اختیار کہا۔

"ایں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر انہیں میرے بارے میں بتانے لگا میں نے ان سب کے منہ سے کوڑھی کوڑھی کے الفاظ سنے تھے پھر سب کھڑے ہو گئے دری وہاں سے اٹھا لی گئی اور وہ کسی اور سمت چلے گئے مجھے دلی رنج ہوا تھا مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی اچانک چھ سات آدمی میرے پاس پہنچ گئے۔

"تم یہاں کیوں آ بیٹھے کیا کوڑھ پھیلانا چاہتے ہو؟"

"نہیں بھائی۔ میں؟"

"اٹھو یہاں سے اٹھو۔" ایک آدمی گرج کر بولا۔

"چلو بھاگو یہاں سے۔" دوسرے نے کہا میں بادل ناخواستہ اٹھ گیا تھا رکابی اور پانی کا گلاس میں نے نیچے چھوڑ دیا تھا اسی شخص نے پھر چیخ کر کہا۔

"برتن اٹھاؤ اپنے چلو دفع ہو یہاں سے لاحول ولا قوۃ ابے چلا جا لگاؤں ایک ڈنڈا۔" اس جوشیلے شخص نے کہا اور ایک موٹی سی لکڑی سے مجھے دھکیلنے لگا۔

"جا رہا ہوں بھائی جا رہا ہوں۔" میں نے صبر کرتے ہوئے کہا اور دونوں برتن اٹھا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا دل رو رہا تھا کیا ناقدری ہے کیا عزت افزائی ہے واہ مگر صبر ضروری تھا۔ اس سے دور نکل آیا یہ مزار کا عقبی حصہ تھا پتھر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے ان کے درمیان جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ زمین ناہموار تھی۔ اس طرف کوئی نہیں تھا ہاں بلندی سے روشنی ضرور آ رہی تھی۔ ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ خود پر غور کرنے لگا عجیب سا دل ہو رہا تھا کیا بقیہ زندگی یہی ہوگی۔ کیا اب کبھی میری دنیا مجھے واپس نہیں ملے گی؟ بہت دیر گزر گئی پھر گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی کسی کے قدموں کی چاپ تھی گردن اٹھا کر دیکھا تو ایک ملنگ تھا مگر اس کا سر اس کے شانوں پر موجود تھا اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا دبا ہوا تھا

جس پر رنگین کپڑے اور گھنگرو لگے ہوئے تھے، ڈنڈا ٹیکنے سے گھنگرو بج رہے تھے وہ میرے پاس آ گیا میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہاں نہ بیٹھو بھائی۔ " میں نے کہا۔

"کیوں تیری جاگیر ہے کیا؟" وہ بولا۔

"نہیں میں کوڑھی ہوں۔ "

" میرا کیا ہو گا۔ "

"ادھر بیٹھا تھا ان سب نے مجھے دھکے دیکر بھگا دیا۔ "

"وہ سب کوڑھی ہیں سنا تو نے وہ سب کوڑھی ہیں ان کے دلوں میں کوڑھ ہے یہ دیکھ یہ کیا ہے اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے جن کی مٹھیاں بند تھیں۔ "بتا کیا ہے ان میں۔ "

"مجھے نہیں معلوم۔ "

"ہاتھ پھیلا" ۔ اس نے کہا میں نے ہتھیلی اس کے سامنے کر دی ۔"کون سی مٹھی کا مال لے گا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ "

"چاہئے، جھوٹ مت بول بتا کونسی مٹھی کھولوں۔ ؟" ملنگ نے کہا۔

"یہ .... " میں نے ہتھیلی اس کے ایک ہاتھ کے سامنے کر دی۔ اور اس نے مٹھی میں دبی میری ہتھیلی پر رکھ دی ہلکی سی کالی سی کوئی چیز تھی جو میرے ہاتھ پر کلبلانے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا ہے۔ ہاتھ چہرے کے قریب کر کے دیکھا اور حلق سے دہاڑ نکل گئی۔ وہ سیاہ رنگ کا پہاڑی بچھو تھا میں نے بے اختیار چیخ کر اسے ہتھیلی سے جھٹکنا چاہا مگر وہ میری درمیانی انگلی میں اٹک گیا میں نے پھر جھٹکا اور اس نے میری انگلی میں کاٹ لیا۔ ایک ٹیس ہوئی اور میں نے ہاتھ پتھر پر دے مارا۔ بچھو میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے انگلی دبا لی لیکن درد کی ٹیسیں میرے پورے ہاتھ میں پھیل گئیں۔ کالے پہاڑی بچھوؤں کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ پتھر پر ڈنک مار دیتے ہیں تو سنکھیا بن جاتا ہے۔ ہاتھی کو کاٹ لیں تو اس کا گوشت پانی بن کر بہہ جاتا ہے اسی کالے بچھو نے مجھے کاٹا تھا۔ درد تھا خون کی روانی کے ساتھ شانے، سینے کمر اور پھر پورے بدن میں پھیل گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں اس ناقابل برداشت تکلیف سے پاگل ہو گیا۔ اپنے حلق سے نکلنے والی چیخیں مجھے لگ رہی تھیں سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ میرا بدن زمین سے کئی کئی فٹ اونچا اچھل اچھل کر نیچے گر رہا تھا سارے بدن میں درد کے انگارے دہک رہے تھے نہ جانے کس طرح اٹھا اور اندھوں کی طرح دوڑ پڑا۔ نہ جانے کتنی دور دوڑا، نہ جانے کس چیز سے ٹکرایا اور سر میں چوٹ لگ گئی۔ مگر سر کی چوٹ مہربان تھی۔ اس نے مجھے اذیت سے نجات دلا دی تھی۔ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ نہ جانے کب تک بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو پرندے چہچہا رہے تھے۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ سر پر کسی درخت کا سایہ تھا اور بدن پانی میں بھیگا ہوا تھا میں پانی میں پڑا ہوا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ بیٹھ گیا۔ بڑی پراسرار بڑی عجیب جگہ تھی۔ برگد کا عظیم الشان درخت مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر تھا مگر اس کا پھیلاؤ کوئی پچاس گز کے دائرے میں تھا۔ اس کی ڈاڑھیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جس جگہ میں پڑا ہوا تھا۔ یہاں گھاس اگی ہوئی تھی کاہی لگے پتھر پھیلے ہوئے تھے اور ان پتھروں سے مدھم سے

ساتھ پانی ابل رہا تھا۔ یہ پانی گھاس کو بھگوتا ہوا نالیوں کی شکل میں بہتا دور نکل جاتا تھا۔ شاید ان پتھروں سے چشمہ ابل رہا تھا۔ تاحد نگاہ کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ ہاں پرندے بکثرت نظر آرہے تھے۔ جو برگد کی شاخوں پر پھدک رہے تھے۔ ادھر سے اُدھر پرواز کر رہے تھے۔ زمین پر بکھرے پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے فضا میں خربوزوں کی تیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اجنبی نظروں سے ماحول کو دیکھتا رہا۔ گزرے واقعات یاد آنے لگے۔ ملنگ نے بدترین حرکت کی تھی نہ جانے اس کی دوسری مٹھی میں کیا تھا۔ آہ اس خطرناک بچھو کے کاٹنے کے بعد بھی میں زندہ ہوں۔ شدت تکلیف میں شاید مزار شریف سے دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا تھا ورنہ وہ آس پاس ضرور نظر آجاتا۔ یہ تو آبادی سے دور کوئی ویران جگہ تھی۔ نہ جانے کون سی جگہ ہے اور میں اس سے کتنا دور نکل آیا ہوں۔ ہاتھ میں اب تکلیف نہیں تھی اس انگلی کو دیکھا جس میں بچھو نے کاٹا تھا۔ انگلی پر تو کوئی نشان نہیں تھا لیکن کچھ اور نظر آیا اور جو نظر آیا اس نے ایک بار پھر دیوانہ کر دیا۔ کوڑھ میرے پورے بدن پر پھیل چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی شکل بدلتی جا رہی تھی۔ انگلیاں اور ہتھیلی خون اور پیپ سے بھری ہوئی تھی مگر اس وقت ان زخموں پر کھرنڈ نظر آرہے تھے۔ کالے کالے کھرنڈ جیسے زخم اچانک سوکھ گئے ہیں۔ میرے زخم ٹھیک ہو گئے تھے۔ میرا کوڑھ سوکھ رہا تھا۔ کسی کے الفاظ یاد آئے زہر زہر کا تریاق ہوتا ہے۔ کالے پہاڑی بچھو کے زہر نے مجھے کوڑھ سے نجات دلا دی تھی۔ دیوانوں کی طرح بدن کے ایک ایک حصے کو دیکھنے لگا سب جگہ خاک سی اڑ رہی تھی میں ٹھیک ہو گیا تھا دل عقیدت سے بھر گیا میری لگن رنگ لائی تھی چشمۂ فیض سے مجھے صحت ملی تھی آہ میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ میں ٹھیک ہو گیا تھا بے اختیار دل بھر آیا آنسو بہے پھر ہچکیاں بندھ گئیں مجھے یوں لگا جیسے روٹھی ہوئی ماں نے اچانک مجھے کھینچ کر آغوش میں لے لیا ہو۔ میری بے سکونی سکون پا گئی تھی۔ سجدہ ریز ہو گیا اور نہ جانے کب تک سجدے میں پڑا روتا رہا۔ دل کا غبار نکل گیا تھا تو اٹھا، کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا کچھ فاصلے پر خربوزوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ پیلے پھل بڑی تعداد میں لگے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ کر ایک پکا پھل توڑا اور اسے ہاتھوں سے دبا کر بیج نکالے پھر اس کا شیریں گودا کھانے لگا پھل کا وزن کوئی ایک سیر ہو گا مگر میں اسے پورا نہ کھا سکا۔ تب اس بھوک سے نجات کا اندازہ ہوا جس نے میری حیات کا ہر لمحہ عذاب ناک بنا دیا تھا۔ خوشیاں رگ رگ سے پھوٹ پڑی تھیں۔ اس ویرانے میں مجھے خوشیوں کا جو خزانہ حاصل ہوا تھا وہ سنبھالے نہ سنبھالا جا رہا تھا۔ میں فرط مسرت سے بے خود ہوا جا رہا تھا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسرت کا اظہار کیسے کروں۔ بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں کب تک رک سکتا ہوں۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ بس سفر کر رہا تھا۔ تھک جاتا تو قیام کر لیتا جو مل جاتا اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ سنگلاخ چٹانیں، ناہموار میدان، خوفناک گھاٹیاں۔ ایک قافلے کو دیکھا آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی۔ کونسی جگہ ہے یہ ۔ ؟"

"گنجن پوری، اجمیر شریف جا رہے ہیں خواجہ نگری۔ "

دل تڑپ گیا۔ خواجہ غریب نوازؒ مظلوموں کے ہمدرد، قافلے کے پیچھے چل پڑا۔ چنبل گھاٹی سے گزرا یہاں راناسانگا سے لے کر مان سنگھ، ہری چند ہاڑا، اور پھولن دیوی کی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان علاقوں سے قافلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ خواجہ کے متوالوں کو کیا پریشانی ہوتی۔ پھر قافلہ دریائے فیض پہنچ گیا۔ تارا گڑھ کی پہاڑیاں نظر آئیں۔ پستیوں میں عقیدتمندوں کے ٹھکانے نظر آرہے تھے۔ میں نے بھی

ایک ٹھکانہ بنالیا۔ اور سنگلاخ زمین پر لیٹ رہا۔ دل عقیدت سے سرشار تھا کچھ سنوائی ہو رہی تھی۔
کے حضور پہنچ گیا تھا۔ اس جان لیوا بھوک سے نجات مل گئی تھی۔ سہانی رات بکھری ہوئی تھی۔
مزار مقدس روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ قوالیوں کی تانیں ابھر رہی تھیں اچانک کچھ فاصلے پر کوئی شے
نظر آئی۔ "غاؤں غاؤں" کی آواز ابھر رہی تھی۔ میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ سردی سی لگنے
یہ کیا ہے۔ ؟

دل میں نجانے کیا کیا خیالات آنے لگے۔ بھوریا چرن کے خوف سے خود کو آزاد نہیں کر سکا تھا۔
اس ناپاک سادھو کی کیا مجال کہ اس پاک جگہ قدم رکھے۔ یہ کچھ اور ہے مگر کیا؟ دل میں شدید تجسس
اٹھا۔ وہ بدبو جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اب سمجھ میں آنے لگی تھی۔ یہ سڑے گلے پھلوں کی بدبو تھی۔
میں اس جگہ پھل فروش ٹھیلے لگائے ہوئے تھے۔ گلے ہوئے پھل وہ یہیں پھینک گئے تھے اور یہ بو انہی
سے اٹھ رہی تھی اور وہ متحرک شے ممکن ہے کوئی چوپایہ ہو جو اس وقت یہ پھل کھا رہا ہو۔ اپنے ذہن
یہ معمہ اس طرح حل کر لیا ممکن تھا اس طرف سے لاپروا ہو جاتا لیکن ذہن تحقیق کا عادی ہو گیا تھا
قریب جا کر دیکھوں اور قدم آگے بڑھ گئے۔ میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ بو پھلوں کے اسی ڈھیر
آ رہی تھی مگر وہاں کوئی چوپایہ نہیں تھا بلکہ وہ کوئی انسان تھا جو یہ گلے ہوئے پھل کھا رہا تھا۔ شاید کوئی بھو
فقیر تھا ممکن ہے خواجہ کے لنگر سے محروم رہ گیا ہو اور قریب جا کر اسے دیکھا اس کے بدن پر چیتھڑے
جھول رہے تھے۔ بال اور داڑھی مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ عجیب سا تھا۔ بڑے انہماک سے پھل
کھا رہا تھا مجھے دیکھ کر اس نے پاس رکھی ہوئی چھڑی اٹھائی اور اسے بلند کر کے بولا۔

"ہش۔ ہش۔ بھاگ بھاگ"۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ کوئی مجذوب تھا۔ خواجہ کے مقدس مزار
احاطے میں، میں نے بے شمار قلندر، ملنگ اور مجذوب دیکھے تھے۔ جو ہُو حق کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔
میں سے کوئی تھا دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دل خوش تھا دل لگی سوجھی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"بھاگ بھاگ۔ گندگی کرے گا۔" مجذوب نے پھر لکڑی اٹھا کر کہا۔

"میں بھی پھل کھانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چھونا مت۔ ورنہ لکڑی سے ماروں گا۔"

"مجھے بھی کچھ پھل دیدو!" میں نے عاجزی سے کہا۔

"منع کر رہا ہوں بھاگ جا۔ پھل کھائے گا۔ گندا غلیظ کہیں کا. اتنا نہیں جانتا پہلے پھل چکھنا
ہے۔ پھر کھایا جاتا ہے جا بھاگ۔ ہش ہش۔" وہ ایک سڑی ہوئی نارنگی اٹھا کر کھانے لگا۔

"میں پھل چکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور وہ گردن جھکائے جھکائے ہنس پڑا۔ بار بار ہنستا
پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"چکھ تو رہا ہے جو کرتا رہا ہے اس کا پھل چکھ تو رہا ہے اور چکھے گا ابھی اور چکھے گا۔"

میں دنگ رہ گیا کیا رمز تھا اس کے جملے میں۔ دل میں عقیدت پیدا ہو گئی میں نے عاجزی سے کہا۔

"بہت پھل چکھ چکا ہوں اب کھانا چاہتا ہوں۔"

"ایسے ہی کھانا چاہتا ہے پہلے بیج بو۔ پودا لگا پھر اسے پروان چڑھا جب وہ پھل دے تو پھل کھا

ہے یا ماروں پتھر؟" مجذوب غصے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پاس پڑا پتھر اٹھا لیا تھا۔

"مجھ پر رحم کر دو۔ مجھے پھل دیدو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مار رہا ہے۔ دیکھو یہ مجھے مار رہا ہے۔ میں بھی ماروں گا پھر نہ کہنا۔" اس نے پیچھے رخ کر کے کہا
پھر جیسے کوئی آواز سن کر بولا۔ "بھگادوں؟ بھگاتا ہوں۔" اس نے پتھر مجھ پر کھینچ مارا۔ نشانہ سر تھا میں
بے اختیار جھک گیا اور پتھر میرے اوپر سے نکل گیا۔

"غیروں سے رحم مانگتا ہے۔ بھاگ یہاں سے بھاگ۔" اس نے دوسرا پتھر اٹھا لیا اور یہ پتھر میری
کمر میں لگا۔ اس کے بعد مجذوب نے مجھ پر پتھروں کی بارش کر دی۔ بے شمار چوٹیں لگی تھیں۔ بھاگنا پڑا۔
وہ میرے پیچھے آ رہا تھا اور پتھر اٹھا اٹھا کر مار رہا تھا سر بچا ہوا تھا ورنہ اٹھنا مشکل ہو جاتا مگر اب بدحواسی طاری
ہو گئی تھی۔ مجذوب میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ منہ سے ایسی آوازیں نکالتا جا رہا تھا جیسے کسی کتے کو بھگا رہا
ہو۔ بہت دور نکل آیا۔ ساری روشنیاں پیچھے رہ گئیں۔ پھر ایک پتھریلی دیوار سامنے آ گئی اور میں اس کے
پیچھے پہنچ گیا۔ عجیب ناگہانی پڑی تھی۔ خیمے دور رہ گئے تھے اور مجذوب تھا کہ پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میں
بری طرح تھک گیا تھا۔ اتنا فاصلہ طے کیا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا یقین تھا کہ وہ اب ادھر بھی آ جائے گا مگر
وہ نہ آیا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی جھانک کر ٹیلے کے دوسری طرف
دیکھا۔ وہ شاید واپس چلا گیا تھا۔ تاحد نگاہ کوئی نہیں تھا۔ سانس بحال ہونے لگی تھی۔ مزید کچھ دیر انتظار
کیا اور اس کے بعد وہاں سے نکل آیا۔ پتہ نہیں اس بھاگ دوڑ میں کتنا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ مجذوب کی
باتیں دل کو عجیب طرح سے متاثر کر رہی تھیں۔ ذرا سا غم کا احساس بھی تھا. وہ خوشی جو ایک تصور سے
تھوڑی دیر پہلے ملی تھی. یعنی میں نے سوچا تھا کہ مصیبتوں کے لمحات ٹلنے لگے ہیں. کچھ بہتری ہو رہی ہے۔
میری زندگی میں اور اس بات نے ہی اتنی خوشی بخشی تھی کہ اپنے خیمے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ مجذوب کے
الفاظ بڑی گہرائیوں کے حامل تھے۔ اس نے کہا تھا کہ پہلے پھل چکھا جاتا ہے اور اس کے بعد کھایا جاتا ہے.
اور اس کی تفصیل میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ برائیوں کا پھل واقعی چکھا جاتا ہے اور نیکیاں جب پھل
دیتی ہیں تب وہ پھل کھایا جاتا ہے۔ کون سی نیکیاں کر لی تھیں میں نے. بس برائیوں کے راستے پر نکلا تھا اور
غلاظتوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اب تو ہر چیز نگاہوں کے سامنے تھی، کوئی بات پوشیدہ نہیں رہی تھی، بھوریا چرن بھی اپنے ہی جال میں
جکڑ گیا تھا، غالباً اس کے کالے جادو کا یہ بھی ایک حصہ تھا کہ اس وقت جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے
اور اپنی غرض کا اظہار کرے تو وہ اپنی بھی غرض کا تبادلہ کرے اور یہ بدنصیبی ہی میری تقدیر میں لکھی ہوئی
تھی۔ نجانے اب اور کتنے پھل چکھنے پڑیں گے مجذوب کا کہنا تو کچھ اس انداز کا تھا. جیسے ابھی میں نے کوئی
مصیبت بھگتی ہی نہ ہو۔ آہ کیا میں مزید مشکلات کا شکار ہو سکتا ہوں۔ کیا میرے اندر اب اتنی سکت ہے کہ
میں اپنے کئے کا پھل چکھوں اگر میری تقدیر میں لکھا ہے تو پھل کھانے کو کب ملے گا۔ دل عجیب سی دکھن
کا شکار تھا۔ بہرحال ان بیچاروں تک پہنچنا تو بیحد ضروری تھا جو مجھے اپنی محبت کے سہارے یہاں تک لے
آئے تھے اور اس کے بعد مزید کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دل سے ریحانہ بیگم کے لئے دعائیں
نکلنے لگیں۔ بس ذرا سی بددلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن میں یہ تکلیف بھی ہنسی خوشی برداشت کر لینا چاہتا تھا۔
کسی سے کہنا تو بے مقصد ہی ہو گا۔ کیا فائدہ کسی سے ان باتوں کا تذکرہ کرنے سے. آگے بڑھتا رہا، جس

راستے سے دوڑتا ہوا اس سمت آیا تھا اسی پر واپس جا رہا تھا مگر نہ تو مزار اقدس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں کوئی اور ہی روشنی تھی۔ پیر جواب دیتے جا رہے تھے۔ جسمانی قوتیں ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ لیکن پہنچنا ضروری تھا۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر ایک جگہ رک کر میں نے ہراساں نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ کیا ہو گیا۔ کہاں نکل آیا ہوں میں۔ وہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا۔ کیا راستہ بھٹک گیا ہوں۔ ایسے کسی بلند ٹیلے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ جہاں چڑھ کر دور دور کا جائزہ لے سکوں۔ ایسا نظر آ گیا۔ کافی فاصلے پر ایک پہاڑی ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی جانب بڑھ گیا۔ اس پہاڑی ٹیلے پر چڑھنا بھی بڑا مشکل ثابت ہوا۔ ٹھوس پتھر کا پہاڑ تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آ جاتے تھے اگر کٹاؤ نہ ہوتے تو پاؤں جمانا بھی مشکل ہو جاتا۔ خاصا بلند تھا۔ دور سے اتنا احساس نہیں ہوتا تھا بالآخر کسی نہ کسی طرح بلندی پر پہنچ گیا۔ توازن سنبھالا اور دور دور تک دیکھنے لگا اور اس کے بعد نجانے کیوں دل ڈوبنے کا احساس ہوا۔ نگاہ کی حد تک اور آسمان کی بلندیوں تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ہوتا ہے کہ کہیں اگر روشنیاں ہوں ہوتی ہے تو وہاں آسمان پر ایک سفیدی سی آ جاتی ہے۔ جو ان روشنیوں کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن یہاں تو جدھر نظر اٹھتی۔ آسمان سیاہ ہی نظر آتا۔ آہ کیا تقدیر پھر کالی ہو گئی ہے۔ خواجہ کے دربار میں آنے کے باوجود معافی نہیں ملی۔ پھل چکھنا ہے۔ اتنا فاصلہ تو طے نہیں کیا تھا بے شک دوڑتا ہوا آیا تھا۔ پھر یہ سب کچھ نگاہوں سے کیوں اوجھل ہو گیا۔ کتنی دور بھگا دیا مجھے اس مجذوب نے خواجہ کے دربار سے۔ ایک بار پھر دل میں گداز پیدا ہوا اور آنسو سسکیوں میں ڈھل گئے۔ پہاڑی ٹیلے کی بلندی پر بیٹھ کے ہی رونے لگا تھا بہت رویا اور رونے سے دل درحقیقت ہلکا ہو گیا۔ پھر نیچے اتر آیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر وہیں پہاڑی ٹیلے کے دامن میں بیٹھ گیا۔ دن کی روشنی میں پھر کوشش کروں گا۔ دن کی کرن پھوٹنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔ ساری رات ہی گزر گئی تھی۔ یہ بھی تقدیر کا لکھا تھا ورنہ خیمے سے باہر کیوں نکلتا۔ ایک لمحے کی خوشی تھی دل میں سمائے رکھتا لیکن ایک طرح سے اچھا بھی ہوا تھا کم از کم غلط فہمیوں سے نکل آیا تھا۔ ابھی میری زندگی کو قرار نہیں ہے ابھی بے قراریوں میں بسر کرنی ہے۔ شاید مجھے زندگی کے آخری لمحے تک معافی نہ مل سکے۔ میری مشکل کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکے۔ سورج نے پہاڑوں سے جھانکا اور اس کے بعد فضا میں اٹھتا چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اس لق و دق صحرا میں زندگی بھی مشکل ہو جائے گی۔ پانی نہ خوراک۔ ایک بار پھر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دل تھا کہ سینے کا خول توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا میں وہاں سے چل پڑا مایوسی کے عالم میں چل پڑا۔ پھل چکھنا ہے مجھے نجانے کون کونسے پھل چکھنے ہیں۔

سر چکرا رہا تھا، آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا۔ جب تک ہمت ساتھ دیتی رہی چلتا رہا۔ پھر زور کا چکر آیا اور سر پکڑ کر جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ لیکن آنکھوں کے سامنے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ تاریکی میرے پورے وجود پر مسلط ہو گئی۔ بے ہوشی نجانے کتنی طویل تھی۔ ہوش نہ جانے کہاں آیا تھا۔ سینے پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی چبھن سی ہو رہی تھی، پتہ نہیں کیا تھا سب کچھ دفعتہً بازو میں شانے کے قریب کسی نے خنجر اتار دیا سینے پر دباؤ زیادہ ہو گیا بازو کی تکلیف سے آنکھیں کھل گئیں۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا اور خود اپنی مسلسل بھیانک چیخیں سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ میری انہی چیخوں سے میرے سینے پر بیٹھا خوفناک پرندہ بھی خوفزدہ ہو گیا۔ گدھ تھا اور میرے سینے پر بیٹھ کر ضیافت اڑانا چاہتا تھا اسی نے اپنی مڑی

ہوئی تیز چونچ میرے بازو میں اتاری تھی اور بازو بری طرح ادھیڑ دیا تھا۔ زخم سے خون کا فوارہ بلند ہو گیا اور میرے بری طرح تڑپنے سے گدھ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس نے اپنے چھتری جیسے پر پھیلائے اور صرف چند قدم کے فاصلے پر اتر کر جا بیٹھا۔ وہ بھوکی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بازو کی تکلیف سے جان نکلی جا رہی تھی۔ حلق سے مشینی انداز میں کربناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ بے اختیار اٹھ کر بھاگا اور گدھ خوفزدہ ہو کر دوبارہ اڑ گیا۔ مجھے ٹھوکر لگی اور میں گر پڑا۔ پورے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لگتا تھا جیسے بدن کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ شدت تکلیف سے دیوانہ ہو کر میں نے زخم پر منہ رکھ دیا بہتا ہوا خون چوسنے لگا۔ گاڑھا نمکین خون جو بدن سے بہہ جانے کے لئے بے چین تھا۔

"کوئی ہے، کوئی ہے، میری مدد کرو، میری مدد کرو۔ میں مر رہا ہوں۔ میری مدد کرو" .... میں نے آواز لگائی۔ گدھ مجھ سے زیادہ زوردار آواز میں چیخا اور پنجے دبا کر فضا میں بلند ہو گیا۔ میں جانوروں کی طرح اپنا بازو جھنجھوڑ رہا تھا۔ زخم کی اس جلن کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ میں ادھر ادھر بھاگتا رہا گرتا رہا۔ پھر ایک جگہ مٹی نظر آئی میں نے مٹھی بھری اور اسے زخم سے لگا لیا۔ مٹی خون میں لتھڑ گئی مگر اس سے فائدہ ہوا تھا کچھ ٹھنڈک سی محسوس ہوئی تھی۔ منحوس گدھ لمبے لمبے چکر لگا کر بار بار میرے سر پر آ جاتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا بس غلطی ہو گئی تھی اس سے ذرا دیر ہو گئی تھی۔ عالم بے ہوشی میں اسے اپنا کام کر لینا چاہئے تھا۔ جگہ کے انتخاب میں غلطی ہوئی تھی اس سے آنکھوں پر چونچ مارنا چاہئے تھی۔ یا پیٹ پر حملہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ بے چین تھا۔ میرے گر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ خون رک گیا۔ میں مسلسل کراہ رہا تھا۔ بار بار چکرا رہا تھا۔ زمین گھومتی محسوس ہو رہی تھی آنکھوں میں دھندلاہٹ آ جاتی تھی لیکن سوچنے سمجھنے کی قوتیں باقی تھیں۔ گدھ سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ متحرک رہوں اسے اپنی زندگی کا یقین دلاتا رہوں۔ کافی آگے بڑھ آیا۔ چاروں طرف پتھروں کے انبار تھے نہ جانے کونسی جگہ تھی۔ گدھ بہت دیر تک منڈلاتا رہا پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ جب وہ دور نکل گیا تو میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

"تھک گیا ہوں، مدد کرو میری، برداشت ختم ہو گئی ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب خودکشی کرلوں گا۔ ذمے دار میں نہیں ہوں گا۔ سن رہے ہو۔ ذمے دار میں نہ ہوں گا۔ خودکشی کرلوں گا بس .... بس .... بس۔" جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ پھر اٹھ کر چل پڑا۔

چلتا رہا بہت دور نکل آیا اس جگہ سے۔ چند درخت نظر آئے۔ ان کے سائے میں ایک چشمہ تھا۔ درختوں کے نیچے گلے سڑے پھل پڑے ہوئے تھے۔ گول گول چھوٹے چھوٹے پھیکے اور بدمزہ۔ زخمی بازو تو سیدھا نہ ہو سکا دوسرے ہاتھ سے پھل اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑی اور اونچی چٹان تھی اس کے دامن میں اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ اس میں دروازہ تھا۔ دیکھتا رہا کوئی تجسس ذہن میں نہیں ابھرا۔ بس ایک ہی خواہش تھی زمین پر پڑے ہوئے سارے پھل معدے میں اتار لوں۔ حلق تک بھر لیا پانی کے چند گھونٹ لئے اور چشمے کے کنارے لیٹ گیا۔ زخمی ہاتھ پانی میں ڈال دیا پھر زور سے چکر آیا آنکھیں بند ہو گئیں اور کوشش کے باوجود نہ کھلیں۔ مگر زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ آنکھیں پھر کھلیں۔ ماتھے پر پھوڑا رکھا ہوا تھا۔ سینے پر وزن تھا گدھ کا خیال آ گیا۔ پھر آ گیا۔ نیم مدہوشی کے عالم میں، میں نے سوچا۔

"شیں .... شیں .... ہو ہو .... ہاہا۔" میرے منہ سے آواز نکلی اور میں بے اختیار اٹھ بیٹھا لیکن فوراً ہی کسی نے بھرپور دباؤ ڈال کر مجھے لٹا دیا اور پھر ایک آواز سنائی دی۔

"نہیں میاں .... نہیں ہوش میں آؤ .... لیٹے رہو .... لیٹے رہو۔" لیٹ تو گیا
یہ آواز، اوہ گدھ نہیں ہے شاید۔ پھر کون ہے یہ .... اچانک ماتھے پر کوئی ٹھنڈی سی چیز
آنکھیں بھی ڈھک گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھی شے ہٹانے کی کوشش کی۔ گیلا پ
وہی نرم آواز دوبارہ سنائی دی۔ "بیٹے آرام سے لیٹے رہو، دل و دماغ کو سکون دو۔ تم محفوظ جگہ
کوئی خطرہ نہیں ہے تمہیں یہاں بے فکر ہو جاؤ۔"

"یہ .... یہ کیا ہے۔ میری آنکھیں ہٹاؤ، اسے ہٹاؤ۔" میں نے گیلا کپڑا آنکھوں سے ہٹا
تب میں نے وہ چہرہ دیکھا۔ عمر رسیدہ شخص تھا۔ سفید داڑھی، چہرے پر چیچک کے داغ تھے رنگ
پیشانی پر ایک گہرا نشان نظر آ رہا تھا۔ "کون ہو، کون ہو تم .... ؟"

"ایک بندۂ خدا ہوں میاں، فضل حسین ہے میرا نام ...."

"مسلمان ہو .... ؟"

"الحمد للہ۔" فضل حسین نے کہا، میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا، پتھروں کو چن کر
کمرہ سا بنایا گیا تھا۔ کشادہ اور ہوا دار تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا، "پانی پیو گے۔ ؟"

"ہاں .... ! ہاں" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ فضل حسین نے ایک آبخورے
میں مجھے پانی دیا کئی آبخورے پیے تھے تب سکون ہوا تھا۔ میں فضل حسین کو دیکھنے لگا!

"میں نے تمہارے بازو کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی ہے۔ تمہیں شاید اس کی تکلیف کی وجہ
بخار ہو گیا ہے خدا کے فضل سے بخار اب ہلکا ہو گیا ہے۔"

"میں اٹھ کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ باہر جانا چاہتا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے آؤ ...." بزرگ فضل حسین نے کہا۔ مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر
کٹیا سے باہر لے آئے۔

"تم یہاں تنہا رہتے ہو ...." میں نے پوچھا۔

"بیٹھ جاؤ، بتاتا ہوں۔" بزرگ نے کہا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ فضل حسین بابا بولے۔ "ہاں
تنہا ہوں۔ ایک دنیا آباد ہے یہاں، چرند و پرند کی ہم نشینی ہے خوب باتیں رہتی ہیں ان سے۔ پرندوں
ڈاریں پانی پینے آتی ہیں ان سے دوستی ہے۔"

"کوئی انسان نہیں ہے۔"

"انسان" .... بابا فضل حسین ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

"کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں .... اب تم جو آ گئے ہو ...."

"تم یہاں کیوں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا اور بابا فضل حسین ہنس پڑے۔ "شکر ہے معبود کا
تم ٹھیک ہو گئے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب ہے۔"

"نہیں خوش ہو رہا ہوں، تین دن کے بعد ہوش میں آئے ہو۔ مگر جب ذہن میں تجسس جاگ اٹھا

خیر چھوڑو .... کہانی سناؤں، کہانی سننا چاہتے ہو۔ سن لو۔ تمہاری خوشی ضرور پوری کروں گا۔
میں یہاں کیوں رہتا ہوں۔ بس دنیا والوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میرا چہرہ دیکھ رہے ہو، بس
کور چشم دنیا والے اس سے نفرت کرتے تھے۔ چار بھائی تھے ہم، تین خوبصورت تھے مجھے خدا نے یہ شکل دی تھی
لوگوں نے اس کی رضا میں نکتہ چینی شروع کر دی۔ دلبرداشتہ ہو گیا۔ جھنجھلاہٹوں کا شکار ہو گیا خلق خدا
سے اس کی نفرت کا بدلہ لینے لگا، تب ایک اللہ والے کی نظر ہو گئی۔ کہنے لگے فضل حسین جو یہ کر رہے ہیں وہی
تم کر رہے ہو، کور بینا ہیں مگر تم بینائی حاصل کر لو۔ ان سے دور ہٹ جاؤ۔ اللہ اپنے بندوں کو نقصان پہنچانے
والوں کو معاف نہیں کرتا۔ بس میاں یہ گوشہ آباد کر لیا اور بہت خوش ہوں۔ کائنات کی سچائیاں یہاں نظر
آتی ہیں۔ انسان بھٹک گیا ہے مگر اللہ کی مخلوق وسیع ہے۔ دوسرے بہت سے ہیں ننھے ننھے پرندے میرے
شانوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ معصوم ہیں مجھے محبت سے دیکھتے ہیں سب سے شکایتیں ختم ہو گئیں۔"

"کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟"

"رازق سے اتنا فاصلہ ہے تمہارا۔ اسے کیوں بھول گئے بیٹے۔ یہ درخت، یہ چشمہ، اللہ نے سب
کچھ مہیا کر دیا ہے۔"

"یہ پھل کھا کر جیتے ہو؟"

"آہ .... (بھٹک جانے والوں نے دنیا خود پر تنگ کر لی ہے) اللہ کی یہ نعمت اپنا ایک مقام رکھتی
ہے۔ شکر ہے اس معبود کا .... !" فضل حسین نے پر تشکر لہجے میں کہا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"میاں اب تمہاری باری ہے، ہمیں بھی تو کہانیاں پسند ہیں۔"

"میری کہانی موت کی کہانی ہے فضل بابا۔ میری کہانی سننے والا پھر کوئی اور کہانی سننے کیلئے زندہ نہیں رہتا۔"

"خوب! تمہاری کہانی کا آغاز کب سے ہوا ہے عزیزی؟"

"کیا مطلب؟" میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس کائنات میں جتنی اموات ہوئی ہیں تمہاری کہانی سن کر ہی ہوئی ہیں؟"

"ایسا نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں نے میرے بارے میں جان لیا ہے وہ ...." وہ میں نے جملہ پورا
نہیں کیا تھا کہ بابا فضل حسین بول اٹھے۔

"غلط مشاہدہ ہے بیٹے! موت زندگی کی طرح ایک ٹھوس سچائی ہے۔ کب آنا ہے کب جانا ہے، ہم
نہیں جانتے، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

"نہ پوچھو فضل بابا، میں ڈرتا ہوں میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"بتا دو بیٹے! میں تمہارے دل سے خوف نکالنا چاہتا ہوں مجھے اپنے بارے میں ضرور بتاؤ۔" فضل
حسین نے ضد کرنے والے انداز میں کہا اور میں انہیں دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اول سے آخر تک ساری
باتیں انہیں بتا دیں وہ خاموشی سے سنتے رہے دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ پھر بولے "اس کے
باوجود اپنی خوش بختی سے منحرف ہو؟"

"خوش بختی؟"

"ہاں بیٹے۔ ان مشکلات کے باوجود زندگی کی نعمت تمہیں حاصل ہے ایمان کی دولت نہیں چھنی تم

سے۔ ایک لمحے میں ایمان جاتا ہے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اپنے ایمان کے محافظ تم نہیں ہو۔ بخدا تمہارے ایمان کی حفاظت کی گئی ہے ورنہ ایک لمحہ درکار ہوتا ہے............ صرف ایک لمحہ! یقیناً کچھ ذمے داریاں تم سے منسوب کی گئی ہیں کوئی کام کرنا ہے تمہیں ضرور کوئی کام کرنا ہے۔ ایک سوال کروں بیٹے تم سے؟"

"ضرور۔"

"اسپتال میں تھے، کوڑھی ہو گئے تھے، نماز شروع کر دی تھی سلیم کے کہنے سے کر دی تھی نا؟"

"ہاں"۔

"چھوڑ دی۔"

"اس ہاں............ وہ بس............ حالات............ میں آپ کو بتا چکا ہوں؟" میں نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔

"حالات! نہیں بیٹے جو حالات تم نے سنائے ہیں ان میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا جہاں تمہیں نماز پڑھنے میں دقت ہو۔ دراصل تم نے غور نہیں کیا۔ سوچا نہیں۔ ورنہ تم خود مجھے بتا رہے ہو کہ سکون کا آغاز کہاں سے ہوا تمہیں نماز نہیں چھوڑنی چاہئے تھی۔" آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا گزرے ہوئے واقعات یاد آئے تو احساس ہوا کہ وہ لمحات واقعی بہتری کے آغاز کے تھے حالانکہ میں نے فضل حسین بابا کو اتنی تفصیل سے واقعات نہیں سنائے تھے ہاں بس سرسری طور پر ان کے بارے میں بتایا تھا۔ میں سوچتا رہا............ فضل بابا بولے۔

"تاہم وقت ہے۔ جو گیا سو گیا۔ جو کل نہ کیا آج سہی۔ ابھی سے سہی۔ بازو کے زخم پر پٹی باندھ دی ہے میں نے جاؤ اس نیت سے چشمے پر غسل کرو۔ جاؤ بیٹے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔" میں اٹھ گیا چشمے پر جا کر غسل کیا اور پھر فضل حسین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"بھوک لگی ہے؟"

"ابھی نہیں۔"

"چلو دوزانو بیٹھ جاؤ۔ آنکھیں بند کرو سانس کو ناک سے کھینچو اور سانس کی آواز میں کہو۔ "اللہ ہو............ اللہ ہو............ دیکھو اس طرح۔" بابا فضل حسین خود دوزانو بیٹھ گئے اور پھر ان کا سانس چلنے لگا۔

"اللہ ہو............ اللہ ہو............" فضا میں ساز بجنے لگے۔ ذہن سحر میں ڈوب گیا چاروں طرف سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ "اللہ ہو............ اللہ ہو۔" کہ جانے کب............ نجانے کب کیسے، میرا سینہ بھی چلنے لگا میں سانس کھینچ رہا تھا۔ اللہ کو پکار رہا تھا اور ایک بے خودی سی طاری ہو گئی تھی۔ یہ آواز میرے وجود میں طرب بن گئی تھی کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بابا فضل حسین نے تھپکی دی۔ "مغرب کا وقت ہو گیا ہے" چلو نماز پڑھیں۔" میں آنکھیں کھول کر حیران نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا میں سو گیا تھا؟"

"نہیں جاگ رہے تھے جو جاگتا ہے وہی پاتا ہے۔ وضو کر آؤ۔" ہم دونوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد کچھ دیر دم کشی کی۔ فضل بابا نے اس عمل کا یہی نام بتایا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ان

درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ درختوں سے پھل برس رہے تھے۔ ہواؤں کے جھونکوں سے ڈالیاں ہل رہی تھیں اور پھل نیچے گر رہے تھے۔ کافی پھل سمیٹے اور کھانے لگے۔ مجھے کسی کے الفاظ یاد آئے۔

"پہلے پھل چکھو............ پھر کھاؤ۔"

رات کو ہم دونوں کٹیا میں لیٹ گئے۔ میں نے فضل بابا سے کہا۔ "آبادی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"انسانی آبادی تو بہت دور ہے"

"آپ انہی پھلوں پر زندہ رہتے ہیں؟"

"دو بیج لگائے تھے ان کے۔ درخت بنے اور پھر دیکھو کیسے بکھر گئے۔ شکر نہ کرو گے؟" میں خاموشی سے فضل بابا کو دیکھتا رہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ فضل بابا کے ساتھ اب دل لگنے لگا تھا۔ بہترین مشغلہ یاد الٰہی تھا۔ سب کچھ ذہن سے محو ہو جاتا تھا۔ نماز باقاعدگی سے جاری تھی۔ زندگی کا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ فضل بابا کی باتوں میں بڑی گہرائی ہوتی تھی ایک دن میں نے کہا۔

"فضل بابا میں نے ایک نشست میں ایک ہزار بار دم کشی کی تب کہیں جا کر رکا۔"

"گن رہے تھے؟"

"ہاں! دم گن کر دم کشی کر رہا تھا۔"

"دو بیج بوئے تھے میں نے۔ دو درخت اگے، پھر درخت ہی درخت بکھر گئے۔ کتنے پھل کھا چکے ہو گے تم ان درختوں کے۔"

"اندازہ نہیں۔"

"واہ میاں مسعود خوب اس کا مال بے حساب کھاؤ اور یاد نہ رکھو اور اس کا نام گن گن کر لو۔ اپنا حساب خوب یاد رکھو یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بے حساب دیتا ہے اسے بے حساب یاد کرو۔"

"مجھے اپنے والدین، بہن بھائی بہت یاد آتے ہیں۔"

"اللہ کو یاد رکھو۔ اس کا ساتھ پا لیا تو پھر کچھ دور نہیں رہے گا۔" انہوں نے مجھے تسلی دیکر کہا۔ بازو کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ جسم کی چوٹوں کا تو پہلے ہی احساس نہ رہا تھا حالانکہ کوئی علاج نہیں کیا تھا کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تھا اس دن ظہر کی نماز کے بعد کٹیا میں آرام کر رہا تھا فضا میں دھوپ کے ساتھ حبس کی کیفیت تھی۔ پھر بادل چھانے کا احساس ہوا اور اندھیرا سا ہونے لگا۔ موسم کا جائزہ لینے باہر نکل آیا۔ دیکھا تو آسمان پیلا ہو رہا تھا۔ گرد و غبار بلندیوں پر پہنچا نظر آ رہا تھا غالباً آندھی چڑھ رہی تھی۔ فضل بابا بھی باہر نکل آئے۔

"آندھی چڑھ رہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"خطرناک ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا فضل بابا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کسی سوچ میں ڈوبے نظر آ رہے تھے پھر نجانے کیا سوچ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور زمین پر ایک گہری لکیر بنا دی۔ پھر وہیں کھڑے کچھ پڑھتے رہے اس کے بعد لکیر سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مجھ سے بولے۔

"اس حصار کے پیچھے رہنا۔"

"کیوں؟"

"دیکھو............ آندھی آگئی۔" وہ میری بات کے جواب کے بجائے بولے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان نزدیک آگیا۔ ہواؤں کی ایسی خوفناک گڑگڑاہٹ اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔ ایسی بھیانک آوازیں تھی جیسے زمین و آسمان ہل رہے ہوں۔ ایسا اندھیرا چھا رہا تھا کہ دن کی روشنی چھپ گئی تھی مگر یہ ایک احساس اور ہوا۔ ہم کٹیا سے باہر کھڑے تھے۔ ہواؤں کو دیکھ رہے تھے مگر یہ ہوائیں ہمارے جسموں کو نہیں چھو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کہیں اور سے انہیں دیکھ رہے ہوں۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے تھے نجانے کیا کیا ہو رہا تھا مگر ہم محفوظ تھے۔ پھر بادل گرجے اور بارش شروع ہوگئی۔ ہم کٹیا میں آگئے۔

"بڑی خوفناک آندھی تھی۔" میں نے کہا مگر فضل بابا کسی سوچ میں گم تھے وہ کچھ نہ بولے۔ بارش تیز نہیں تھی مگر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر اتنا کہ ماحول نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ باہر سے عجیب سی گھنٹیوں کی آواز ابھرنے لگی۔ خاصی تیز آواز تھی اور قریب آتی جا رہی تھی۔ فضل حسین بابا اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی یہ آواز سن کر حیران ہوا تھا۔ فضل حسین کے ساتھ باہر نکلنے لگا تو وہ بولے۔

"مسعود میاں! ہماری ہدایت یاد رکھنا جو لکیر ہم نے بنائی ہے اس سے باہر قدم نہ نکالنا۔ آؤ ملیں اس سے۔" میں حیران سا باہر نکل آیا۔ مدھم مدھم بوندیں پڑ رہی تھیں اور کٹیا سے کچھ فاصلے پر کالے رنگ کا ایک بڑے سینگوں والا بھینسا نظر آ رہا تھا جس کی گردن میں لوہے کی لمبی لمبی دو گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ بھینسا کی پیٹھ پر کالا رنگ بھجنگ بھوریا چرن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح نچلے بدن پر ایک دھوتی نما کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ گردن میں کوڑیوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ جن میں رنگین دھاگے لٹک رہے تھے۔ سر پر ایک بڑی سی انسانی کھوپڑی ٹوپی کی طرح پہنی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں ایک لمبی لکڑی تھی جس میں گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ سینے پر مالاؤں کے درمیان لکڑی کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا سنکھ منہ سے لگایا اور فضا میں ناقوس کی آواز ابھری ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کی جنبش سے اس کے گھنگھرو بجانے لگا۔ فضل حسین بابا خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سنکھ منہ سے ہٹا کر اس نے ایک لمبی بھیانک تان لگائی اور بولا۔

"جے............ بھورنا مجنڈا............ جے کالی چنڈال"۔

"اللہ کا نام سب سے بڑا۔" فضل بابا بولے۔

"کون ہو میاں جی...... ہمارے منہ کیوں لگ رہے ہو؟" بھوریا چرن نے فضل بابا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کیا پریشانی ہے تجھے۔"

"سب جانتے ہو، انجان نہ بنو۔"

"تو ناپاک ہے، مردود ہے غلیظ۔ جا بھاگ جا۔ کسی پر زندگی تنگ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"ہمارا نوالہ چھین رہے ہو، اچھا نہ ہوگا، ہمیں اس کی ضرورت ہے اسے ہمیں دیدو۔"

"مسلمان بچہ ہے بھوریا چرن، اور مسلمان کے پاس ہے۔ کسی مسلمان نے کبھی ایسا کیا ہے۔ یہ میرا مہمان ہے۔"

"اسے مہمان نہ بناؤ، ہم شنکھا ہیں بھسم کر دیں گے، راکھ کر دیں گے ہم سے ٹکرانا مت میاں جی۔"

"جا...... چلا جا یہاں سے غلاظت کے پتلے، تیرا کالا جادو محدود رہے گا ہم تجھے بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، تھک گیا ہے یہ، اب خطرہ ہے کہ ایمان نہ کھو بیٹھے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا دیدو گے اسے میاں، کیا کیا دیدو گے اسے ہمارا کام کرنا ہے۔ ضرور کرنا ہے۔"

"اب تک تو نہ کیا بھوریا چرن، تجھے اب بھی اپنی اوقات پتہ نہ چلی، بہتر ہے بھاگ جا کیا فائدہ جھگڑے سے ورنہ اپنے جیسے بہت سوں کی جان گنوائے گا۔"

"ٹھیک ہے میاں جی، پھر تماشا دیکھو۔" بھوریا چرن نے کہا اور بھینسے کا رخ تبدیل کر دیا۔ میں پتھرایا ہوا خاموش کھڑا تھا وہ واپس نہ گیا بلکہ کچھ دور جا کر رک گیا اور پھر بھینسے کا رخ تبدیل کرنے لگا اسکا چہرہ ہماری طرف ہو گیا اور وہ ہولناک آواز سے اپنے کھر سے زمین کریدنے لگا۔

بھوریا چرن کی سرخ آنکھیں ہمیں دیکھ رہی تھیں کالا بھینسا سر جھکائے پھنکار رہا تھا۔ وہ کھروں سے زمین کرید رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے قدموں کی دھمک ابھری زمین پر جیسے ڈھول بجنے لگے فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس لئے چند چھلانگوں میں وہ ہمارے قریب پہنچنے والا تھا ایک لمحے کے لئے میرا ذہن ماؤف ہو گیا یہی تصور دل میں ابھرا تھا کہ بھینسے کی ایک ہی ٹکر ہمارے جسموں کے پرخچے اڑا دے گی۔ پلک جھپکنے کا کھیل تھا اور پلک جھپکتے سب کچھ ہو گیا تھا۔ ایسی ہی آواز ابھری جسے دو چٹانیں آپس میں ٹکرائی ہوں بھینسا ہم تک نہیں پہنچ سکا تھا اور درمیان میں کسی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ بھینسے کا سر پھٹ گیا گردن ٹوٹ کر لٹک گئی اور بھوریا چرن اچھل کر دور جا گرا بھینسا لٹکی ہوئی گردن لئے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ کئی بار گرا کئی بار اٹھا پھٹے ہوئے سر سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے ادھر بھوریا چرن اس طرح ساکت پڑا تھا جیسے مر گیا ہو بھینسا آخری بار گرا تو پھر نہ اٹھا بلکہ اس کا لمبا چوڑا بدن کسی پھرکنی کی طرح زناٹے سے زمین پر گھومنے لگا۔ آپ نے ممکن ہے کبھی مکھی کو دیکھا ہو جو الٹی ہو جاتی ہے اور چونکہ وہ بدن کا کوئی حصہ زمین پر ٹکا کر اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لئے بدن کی پوری طاقت سے پھرکنی کی طرح گھومتی ہے تاکہ سیدھی ہو جائے۔ یہی کیفیت اس وقت بھینسے کے قوی ہیکل بدن کی تھی اس کے بدن کے گھومنے سے بڑی بھیانک آواز پیدا ہو رہی تھی مگر دوسرا حیرتناک منظر یہ تھا کہ اس طرح اس کا جسم چھوٹا ہوتا جا رہا تھا اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ ایک فٹ سے زیادہ کا نہ رہ گیا تب وہ رکا اس کی ہیئت بدل گئی تھی پھر اچانک میں نے اسے ایک چیل جیسے پرندے کی شکل اختیار کرتے دیکھا وہ دو پیروں پر اٹھنے کوشش کر رہا تھا دو تین بار وہ گرا اور پھر ایک کریہہ چیخ مار کر فضا میں بلند ہو گیا کوئی پانچ فٹ اونچا اٹھ کر وہ زمین پر گرا مگر تیسری کوشش کے بعد وہ پرواز کرنے میں کامیاب ہو گیا بھوریا چرن اسی طرح ساکت پڑا تھا۔

دیر کے بعد میرے حواس بحال ہوئے میں نے بابا فضل حسین کو دیکھا ہونٹ ہل رہے تھے ان کے، جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مر گیا وہ............؟" میرے بدن کو جنبش ہوئی تو شاید بابا فضل حسین سمجھے کہ میں بھوریا چرن کو قریب سے دیکھنے جا رہا ہوں ان کے منہ سے تیز آواز نکلی۔

"ہونہہ............ ہونہہ" میں ساکت ہو گیا، بابا فضل حسین پڑھتے رہے پھر بولے۔ "مکاری کر رہا

ہے کمینہ۔"

ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ بھوریا چرن اٹھ کھڑا ہوا وہ بری طرح اچھل کود کرنے لگا پھر ہماری طرف بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے کچھ ٹٹولنے لگے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا رہے ہیں اور وہ اس کے دوسری طرف آنا چاہتا ہے مگر نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بھوریا چرن رک کر ہمیں گھورتا رہا پھر اس نے سانس کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے "ہو ہو" کی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں اور ہر آواز کے ساتھ اس کا قد بڑھتا جا رہا تھا وہ کوئی دس فٹ لمبا ہو گیا اور پھر چوڑائی میں پھیلنے لگا خوفناک آوازیں مسلسل اس کے منہ سے نکل رہی تھیں، کچھ ہی دیر میں وہ ایک بھیانک عفریت کی شکل اختیار کر گیا تھا اس کا مختصر لباس چیتھڑے ہو گیا تھا یہ حجم حاصل کر کے وہ ایک بار پھر ہماری طرف بڑھا اور پھر دونوں ہاتھوں کی طاقت سے اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کرنے لگا جو اسے ہم تک پہنچنے سے روک رہی تھی۔

"کوئی شنکھا اس رکاوٹ کو نہیں توڑ سکتا بھوریا........ تو کوشش کر کر کے مر جائے گا۔" بابا فضل حسین نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھوریا چرن بھیانک چیخیں مار مار کر دیوار سے زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر دیوانہ وار ادھر سے اُدھر دوڑنے لگا اچانک اسے درخت نظر آئے اور وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ آہ ایک کے بعد ایک بھیانک منظر نظر آ رہا تھا مگر میں ایسے لاتعداد مناظر سے نہ گزر چکا ہوتا تو دل ساتھ نہ دیتا اور اس کی حرکت بند ہو جاتی۔ میں نے دیکھا کہ بھوریا چرن نے درخت کے تنے سے ہاتھ لپیٹے اور اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا پھر دوسرے اور تیسرے درخت کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا اور پھر سارے درخت اسی طرح اکھاڑ پھینکے۔ بابا فضل حسین نے کہا۔

"ہاں تنکھا........ ایک شنکھا یہ کر سکتا ہے۔" بھوریا چرن نے گھور کر انہیں دیکھا پھر وہ پانی کے چشمے کے پاس پہنچ گیا میں نے اس انسان نما دیو کو ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دیکھا اس نے منہ پانی میں ڈال دیا اور چشمے کا پانی ختم ہونے لگا مگر اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی اس نے کئی بار چشمہ خالی کیا مگر چشمہ میں مزید پانی پھوٹ آتا اور چشمہ دوبارہ بھر جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اندازہ ہونے لگا کہ بھوریا چرن اپنے آپ کو اس کوشش میں ناکام محسوس کر رہا ہے۔ وہ تھک کر کھڑا ہو گیا اور پھر اچانک اس نے چشمے کے پانی میں تھوک دیا۔ بابا فضل حسین کے منہ سے نکلا۔

"لعنت ہے تجھ پر، لعنت ہے تجھ پر ناپاک۔ اب بلاشبہ تو نے کامیابی حاصل کر لی۔" یہ کہہ کر بابا فضل حسین خاموش ہو گئے بھوریا چرن زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جسامت کم ہونے لگی کچھ ہی دیر میں وہ اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا لیکن اب وہ بے لباس تھا کیونکہ لباس تو پہلے ہی جسم بڑا ہونے کی وجہ سے اس کے جسم سے جدا ہو گیا تھا اس نے زمین پر سے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ ایک تکون بنایا اور اس کے بیچ پالتی مار کر بیٹھ گیا ہم سے کوئی آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا اس کا........ اس نے ہم دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میاں جی ہماری تمہاری خوب چلی مگر چھپ کر بیٹھ گئے ہو بزدلوں کی طرح ذرا باہر آؤ پھر دو ہاتھ ہوں؟" بابا فضل حسین ہنس پڑے پھر انہوں نے کہا۔

"حکم نہیں ہے بھوریا، ورنہ تجھ سے بات کرتے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اب نہ یہ پھل تمہیں ملیں گے اور نہ ہی پانی۔ بھوکے پیاسے بیٹھے رہو۔ دیکھوں میں بھی کہ کب تک بیٹھے رہتے ہو۔ بھوک سے مرو گے تو باہر نکلو گے۔"

"وہی بات ہے بھوریا چرن کہ شریف اپنی شرافت سے مرتا اور ذلیل یہ سمجھتا کہ شریف اس سے ڈر گیا ٹھیک ہے یہ بھی دیکھیں گے یہ بھی دیکھ لیں گے........ چلو میاں یہ باؤلا کتا تو دانت مار کر خاموش ہو گیا۔ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، آرام کرو۔"

بابا فضل حسین میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے جھونپڑے نما حصے میں داخل ہو گئے میرا دل لرز رہا تھا بدن پر کپکپی طاری تھی وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولے۔

"اطمینان سے آرام کرو، اگر ان ناپاک قوتوں کو ایسی ہی طاقت مل جائے تو دنیا کا سکون غارت ہو جائے۔ یہ کالے جادو کے ماہر اپنے جنتر منتر سے بے شک ناپاک قوتیں حاصل کر لیتے ہیں لیکن میاں کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اللہ کا نام سب سے بڑا ہے شیطان کو طاقت دی گئی ہے اور شیطان اپنی طاقت آزماتا پھرتا ہے لیکن بس محدود ہے وہ۔ اس سے آگے اس کے راستے بند ہیں، آرام کرو۔"

وقت کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا یہ سارا بھیانک ڈرامہ نجانے کتنی دیر جاری رہا تھا اب چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی تھی میں سیدھا سیدھا لیٹ گیا اندر کھانے پینے کا جو سامان موجود تھا رات کو کھانے کے طور پر استعمال کیا میں نے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت کھایا، دل پر خوف و دہشت طاری تھی۔ باہر بھوریا چرن علی الاعلان موجود ہے اور ہمیں بھوکا مارنے کی فکر میں کم بخت نے سارے درخت تباہ کر دیئے، چشمہ غلیظ کر دیا تھا اور اب اس کا پانی کسی بھی طور پینے کے قابل نہیں رہ گیا تھا آنے والا وقت اپنی آواز میں بتا رہا تھا کہ کیا لمحات آنے والے ہیں۔

بابا فضل حسین جائے نماز بچھا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ عشاء کی نماز میں نے بھی پڑھی اور اس کے بعد میں پھر دراز ہو گیا دل چاہ رہا تھا کہ میں باہر نکل کر دیکھوں کہ بھوریا چرن کوئی نئی کارروائی تو نہیں کر رہا ہے، کیا کیا پینترے نہیں بدلے تھے اس نے مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا ایک بار پھر دل کو ڈھارس ہو رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے میری دادرسی کی جا رہی ہو لیکن بہت زیادہ پر امید نہیں تھا۔ نجانے کس وقت نیند آ گئی جاگا تو دن چڑھ چکا تھا اور دھوپ خوب تیز پھیل گئی تھی بابا صاحب ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا۔

"بھوریا چرن موجود ہے؟"

"ہاں کتا تاک لگائے بیٹھا ہوا ہے"۔

"اب کیا ہو گا بابا صاحب........؟"

"کچھ نہیں میاں وقت خود فیصلے کرے گا میں نہیں جانتا کہ اب کیا ہو گا........؟"

"باہر نکل کر دیکھ سکتا ہوں میں اسے؟"

"ہاں ہاں، جو جگہ ہم نے قائم کر دی ہے اور تم سے درخواست کی کہ اس سے باہر قدم نہ نکالنا بس یہیں تک رہنا دس بار چاہو تو جا سکتے ہو۔"

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا بابا صاحب میرے پیچھے ہی تھے بھوریا چرن اپنی مخصوص جگہ آنکھیں بند کئے دھونی رمائے بیٹھا ہوا تھا، اس کا بھیانک اور بدہیئت چہرہ بڑی عجیب و غریب کیفیات کا حامل تھا میرے قدموں کی آہٹ پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، میں نے بابا صاحب سے کہا۔

"اگر ہم [illegible]ں جگہ سے باہر قدم نکالنا چاہیں تو کیا ہماری راہ میں بھی رکاوٹ ہو گی؟"

"بالکل نہیں .... مگر ایسا کرنا نہیں تم، جب تک میں نہ کہوں۔ ہم بھوکے رہیں گے تو یہ بدبخت بھی تو بھوکا ہی مرے گا .... یہ اپنے لئے غلاظتیں ضرور حاصل کر سکتا ہے مگر یہ غلاظتیں اس کی شکم سیری نہیں کر پائیں گی۔"

یہ سارے رمز میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے بس دیکھتا تھا، دیکھتا رہتا تھا کئی بار دل میں یہ خیال ابھرا کہ کاش مجھے بھی ان تمام چیزوں سے آشنائی حاصل ہوتی۔ بھوریا چرن کو دیر تک دیکھتا رہا اور اس کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر واپس اپنی جگہ آ گیا۔

بابا فضل حسین بھی خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گئے تھے یوں پورا دن گزر گیا پھر رات گزرنے لگی۔ پیاس شدید محسوس ہو رہی تھی بھوک بھی لگ رہی تھی مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا البتہ محسوس کیا گیا تھا کہ بابا صاحب نے کئی بار مجھے تشویشناک نگاہوں سے دیکھا ہے اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے ہیں تین دن گزر گئے پورے تین دن۔ اب تو ہاتھ پیروں میں جان بھی نہیں رہی تھی۔ ہمارا دشمن ہمارے سامنے دھونی رمائے بیٹھا ہوا تھا رات کو اگر وہ کچھ کھا پی لیتا ہو تو کھا پی لیتا ہو۔ دن میں کئی بار اس پر نگاہیں ڈالتے تھے اور اسے اسی طرح ساکت و جامد بیٹھے پاتے تھے وہ بھی جان ہی کو اٹک گیا تھا کیونکہ بدترین شکست سے دوچار ہوا تھا میں اپنی تمام ہمتیں کھو بیٹھا۔ تین دن بھوکا پیاسا رہنا معمولی بات نہیں تھی یوں لگ رہا تھا جیسے بدن کی ساری قوتیں ختم ہو گئی ہوں۔ گلا خشک تھا سر چکرا رہا تھا آنکھوں کی بینائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی بابا فضل حسین کے چہرے پر نگاہ دوڑاتا تو اس پر تشویش کے آثار پاتا اس وقت بھی وہ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کئے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کچھ دیر کے بعد انہوں نے گردن اٹھائی میری طرف دیکھا اور پھر ان کی آواز ابھری۔

"مسعود میاں اٹھ کر آؤ، میرے پاس آؤ۔" میں نے نجانے کس کس طرح اپنے لاغر اور بے جان جسم کو گھسیٹا، کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا بہرطور کسی نہ کسی طرح بابا فضل حسین کے سامنے آ کر بیٹھ گیا ان کے چہرے پر بھی مردنی چھائی ہوئی تھی ہونٹ خشک تھے۔ آواز بھی نحیف ہو گئی تھی، کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں بڑا مشکل کام ہے بہت مشکل ہے میں تو شاید اسے اس طرح برباد کر دیتا کہ دوبارہ کسی کو للکارنے کی جرأت نہ ہوتی اسے۔ لیکن میاں تم نوجوان ہو تمہارے بدن کو ہر چیز کی ضرورت ہے اس لئے کچھ اور سوچ رہا ہوں دیکھو میاں کہنے کی بات نہیں ہے نا ہی احسان ہے کسی پر، بس کچھ ایسی چیزیں آتی ہیں جو اپنے لئے وقت مانگتی ہیں اور جب وقت آتا ہے تب انسان کچھ بھی کرے تکمیل خود بخود ہو جاتی ہے میرا خیال ہے میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہوں گی ظاہر ہے غذا اور پانی اللہ کا حکم ہے اور ان سے دوری بہرطور بہت سی کمی پیدا کر دیتی ہے، میرا خیال ہے مسعود میاں بات ختم کر دینی چاہئے لو یہ لو رکھو تمہارے لئے بڑے کام کی چیز ہے انہوں نے اپنے لباس سے ایک سفید چھوٹی سی تختی نکال کر مجھے دی۔

"یہ میرا اثاثۂ حیات ہے سامنے کی سمت رخ کر کے داہنے بازو پر باندھ لو اس کے ساتھ ہی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے پورے غور سے سنو، ہوش و حواس ساتھ دے رہے ہیں۔"

"جی بابا فضل حسین۔" میں نے کہا۔

"میں بے علم انسان ہوں، مسعود میاں بڑی کم معلومات ہیں مجھے تمہیں کوئی علم نہیں دے سکتا بس تھوڑا بہت جانتا ہوں بتائے دے رہا ہوں۔ علم کی وسعت اس کائنات کے سارے سمندوں سے زیادہ ہے۔ معرفت عطیۂ الٰہی ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا بس اس کی دین ہے جسے چاہے اشارے کر کے دے دے جو کچھ مل جائے اس پر شکر ضروری ہے اور کی ہوس سب کچھ چھین لیتی ہے چنانچہ قناعت کرنا جو ملے اسے امانت جاننا ور امانت میں اپنا حصہ نہیں ہوتا ہاں صاحب امانت جو اجازت دے۔ بدی کو تلاش نہیں کرنا پڑتا بدی خود بولتی ہے، جان لو کہ تفریق نہ کرنا دین دھرم کی کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور سب اسی مٹی کی تخلیق ہیں اور مٹی کا مالک آسمان والا ہے ہوش و حواس ساتھ دے رہے ہیں............؟"

"جی ...." میں نے کہا۔

"ان الفاظ کو گم نہ کرنا .... یہ امانت کے طور پر دے رہا ہوں تمہیں۔ آنکھیں بند کر لو ذہن کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر لو۔" انہوں نے دوبارہ کہا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ فضل حسین بولے۔ "صاحب ایمان ہو ایمان قائم ہے یہی تمہاری جیت ہے وہ نہ مانگنا جو نہ ملے۔ کچھ طلب کیا جائے اور پاؤ تو دے دینا دل وہ چیز ہے جو فیصلہ کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن سرکشی کرے تو تسلیم نہ کرنا ....! اپنی طلب اپنی ذات کو پیچھے رکھنا تاوقتیکہ لکیر ختم نہ ہو جائے تمہیں یہ لکیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کرنی ہے بس اس کے بعد تمام راستے کشادہ ہو جائیں گے۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

بابا صاحب خاموش ہو گئے میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولیں دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ اور شاید آدھا گھنٹہ گزر گیا پھر آنکھیں خود بخود کھل گئیں پہلی نگاہ بابا صاحب پر ڈالی اور دہل کر رہ گیا وہ کروٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے نور تھیں اور بدن ساکت .... گھبرا کر نبضیں ٹٹولیں مگر جسم سے روح کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا وہ رخصت ہو گئے تھے یقین نہ آیا۔ نہ جانے کتنی آوازیں دیں انہیں ہلایا جلایا اور دم بخود رہ گیا۔ آہ .... بابا فضل حسین اب دنیا میں نہیں تھے یہ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا سب کچھ بھول گیا سارا خوف دل سے نکل گیا نہ بھوریا چرن یاد رہا نہ بھوک پیاس .... بابا فضل حسین کے بچھڑ جانے کا غم تھا اور دل رو رہا تھا بہت دیر اسی طرح گزر گئی میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے چنانچہ اٹھا اس پتھروں سے چنی ایک کمرے کی عمارت کے بائیں سمت گیا وہاں کدال پڑی ہوئی تھی اٹھائی اور پتھروں میں سوراخ کرنے لگا میری کدال نے چٹانیں شق کر دیں اور میں نے رکے بغیر ایک گہرا گڑھا تیار کر لیا اس کے بعد بابا فضل حسین کے جسد خاکی کو اس میں اتار کر میں نے اسے بند کر دیا پتھروں سے اسے اچھی طرح ڈھانکنے کے بعد میں نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی انہوں نے کہا تھا۔

"اب یہاں رکنا مناسب نہیں ہے مسعود میاں یہاں سے چل پڑو اور چلتے رہو۔" میں نے ایسا ہی کیا اس جگہ پہنچا جہاں بھوریا چرن دھرنا مارے بیٹھا تھا وہ وہاں موجود نہیں تھا شاید اکتا کر وہاں سے چلا گیا تھا کوئی خاص خیال نہ آیا چلتا رہا۔

بابا فضل حسین کے ساتھ جو وقت گزرا تھا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا انہیں یاد کر کے دل رونے لگتا تھا۔ لیکن رونے کے لئے تو اور بہت سے تھے۔ سب یاد آتے تھے۔

کئی دن کے سفر کے بعد کسی آبادی میں داخل ہوا۔ ریلوے اسٹیشن سامنے تھا۔ ایک ٹرین آ کر رکی تھی۔ مسافر اتر رہے تھے۔ سوار ہو رہے تھے بس دل چاہا کہ میں بھی ٹرین میں سوار ہو جاؤں۔ چنانچہ ایک ڈبے میں داخل ہو گیا۔

ٹرین کہاں سے آئی ہے کہاں جائے گی، کچھ پتہ نہیں تھا چند لمحات کے بعد اس نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔

نچلے درجے کا ڈبہ تھا معمولی قسم کے مسافر بھرے ہوئے تھے۔ ایک مسافر نے اپنے قریب جگہ دے دی. اور میں بیٹھ گیا۔ ٹرین کی آواز ذہن کو سلائے دے رہی تھی رات کے بارہ بجے کے قریب ٹکٹ کلکٹر آ گیا اور سوتے ہوئے مسافروں کو جگا جگا کر ٹکٹ مانگنے لگا۔ میں نے جیب سے پیسے نکال لئے اور ٹکٹ کلکٹر کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا. جب وہ قریب پہنچا تو میں نے پیسے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چندوسی کے اسٹیشن سے سوار ہوئے ہیں بھائی. یہ ریل جہاں جا رہی ہے وہاں کا ٹکٹ دے دو۔"

ٹکٹ چیکر نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں ہاتھ میں پیسے لئے منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے برابر ہی ایک میلے کچیلے سے کمبل میں منہ ڈھک کر سوتے ہوئے شخص نے کمبل کا کونہ سرکایا اور "شی شی" کا اشارہ کر کے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک بوڑھا باریش آدمی تھا. ہنس کر بولا۔

"آرام بڑی چیز ہے. منہ ڈھک کر سویئے۔" میں نہیں سمجھ سکا اس نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے. اس نے دوبارہ کمبل منہ پر ڈھک لیا تھا۔ میں پریشان نظروں سے دور پہنچ جانے والے ٹکٹ چیکر کو دیکھنے لگا تو اچانک باریش شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑی زور سے مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور پھر کمبل میرے چہرے پر بھی ڈھک دیا۔ میرے بدن میں سناٹا سا پھیل گیا۔ کمبل کی تاریکی میں ایک لمحے کے لئے گھٹن کا احساس ہوا اور پھر فنا ہو گیا۔ مدھم مدھم سے مناظر نگاہوں میں ابھرنے لگے۔ آہستہ آہستہ عجیب سے روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں حیرانی سے اس روشنی کو دیکھنے لگا۔ ایک شخص ہاتھ میں جھاڑو لئے قریب آتا ہوا محسوس ہوا اور پھر مجھ سے کچھ فاصلے پر رک کر اس نے جھاڑو دینا شروع کر دی. گرد اڑ رہی تھی۔ میں نے گرد سے بچنے کے لئے کمبل سر پر اوڑھ لیا اور چہرہ ڈھک لیا۔ جھاڑو کی آواز مسلسل ابھر رہی تھی۔ جب وہ دور چلی گئی تو میں نے چہرہ کھول کر دیکھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا. کافی فاصلے پر لال رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت نظر آ رہی تھی غالباً مسجد تھی. اس کی سیڑھیوں سے نمازی نماز پڑھ کر نیچے اتر رہے تھے۔ دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا. چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ نہ ٹرین تھی. نہ ٹرین کے مسافر اور نہ ہی وہ کمبل پوش مسافر. لیکن کمبل میرے پاس تھا اور سو فیصدی وہی تھا جس میں مجھے چھپایا گیا تھا۔ دل کو احساس ہوا جیسے میرے پاس کائنات کی ساری دولت آ گئی ہو مگر حیرانی اپنی جگہ تھی۔ یہ سب ہوا کیا۔ ہوش و حواس کے عالم میں ریل میں بیٹھا تھا اور سب کچھ غائب ہو گیا۔ یہ کونسی جگہ ہے اور ....

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دور سے ایک گھوڑا گاڑی آتی نظر آئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ میرے قریب سے گزر کر وہ مسجد کے سامنے رک گئی۔ اس سے کچھ لوگ نیچے اترے اور کچھ سامان اتارنے لگے۔ پھر کچھ خواتین گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر آئیں. قیمتی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس سے بہت سے گدڑی بردار مرد عورتیں گھوڑا گاڑی کے پاس آ گئے اور ہنگامہ آرائی ہونے لگی۔ لیکن گاڑی سے اترنے والے چار آدمیوں نے انہیں دھکے دیکر پیچھے ہٹایا اور پھر شاید ان کے کہنے سے وہ قطار بنا کر بیٹھ گئے۔ میں دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ انہیں شاید کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ میرے پیٹ میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ شدید بھوک کا احساس ہوا مگر قدم اس طرف نہ اٹھ سکے۔ میں خاموشی سے ادھر دیکھتا رہا۔ اچانک ایک آدمی میری طرف بڑھا اور قریب آ گیا۔

"ناشتہ لے لو باباجی۔ ادھر قطار میں آجاؤ۔" ایک دم سے دل میں انا جاگی۔ میں فقیر تو نہیں ہوں مگر ذہن نے فوراً ٹوکا۔ رزق ٹھکرانا گناہ ہے اور جھوٹی انا دشمنی۔ رزق لینے کے لئے بڑھنے والے ہاتھ انسان کے سامنے نہیں اللہ کے سامنے پھیلتے ہیں۔ اٹھا اور اس شخص کے ساتھ چل پڑا .... کمبل سے لپٹا ہوا تھا۔ اس شخص نے مجھے بھی قطار میں بٹھا دیا۔ حلوہ پوریاں اور ترکاری تھی۔ یہ چیزیں بڑے بڑے تھالوں میں سجی ہوئی تھیں۔ ڈھاک کے پتوں کے دونے بنے ہوئے تھے۔ ایک شخص تھال سنبھالے ہوئے تھا۔ دو اس کے پیچھے تھے دونوں جوان لڑکیاں جو قیمتی پوشاک پہنے ہوئے تھیں تھال کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ایک لڑکی دونے اٹھا کر دوسری کو دیتی اور دوسری یہ دونے فقیروں کو دے دیتی۔ غالبًا یہ خیرات دوسری لڑکی کے ہاتھوں تقسیم کرائی جارہی تھی۔ تھال خالی ہوتا تو دوسرا تھال گھوڑا گاڑی سے آجاتا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب پہنچتے جارہے تھے۔ دونوں لڑکیاں بے حد خوبصورت تھیں میں نے ایک نگاہ ان پر ڈال کر جھکائی مگر اس سرسری نگاہ سے مجھے انوکھا احساس ہوا۔ میں نے کچھ دیکھا تو .... اور جو کچھ دیکھا تھا ناقابل یقین تھا۔ گہرے کالے رنگ کا ایک ناگ ایک لڑکی کے جسم کے گرد بل ڈالے لپٹا ہوا تھا۔ وہ بہت لمبا اور پتلا تھا اس کا نچلا حصہ لڑکی کی کمر سے لپٹا ہوا تھا اور باقی بدن بل کھاتا اوپر چلا گیا تھا۔ اپنے اس شبہ کو یقین کی شکل دینے کے لئے میں نے جلدی سے گردن اٹھائی اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ دونوں اب میرے سامنے تھیں۔ دونے لڑکی کے ہاتھ میں تھے اور وہ مجھے دینے کے لئے جھک رہی تھی۔ میں نے اس بار سانپ کو بخوبی دیکھ لیا اس کا پھن لڑکی کے سر کے اوپر رکھا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں ایک دم انسانی کمزوری کا غلبہ ہوا۔ لڑکی جھکی تو میں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

"سانپ .... سانپ۔"

دونے لڑکی کے ہاتھ سے نیچے گر گئے اور ان کا سامان بکھر گیا۔ سب چونک پڑے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی متوحش ہوگئی تھیں۔

"کہاں ہے سانپ .... کیسا سانپ؟" تھال سنبھالنے والوں نے کپکپاتے ہوئے بمشکل تھال سنبھال کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ .... یہ ...." میں انگلی سے سانپ کی طرف اشارہ کرکے ایک دم کھڑا ہوگیا۔ سانپ کا اونگھتا ہوا سر جنبش کرنے لگا۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور اس کی ننھی سرخ چنگاریوں جیسی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔ ان میں کینہ سوزی کی جھلک تھی۔ میرا اشارہ چونکہ لڑکی کے جسم کی طرف تھا اس لئے ان لوگوں نے لڑکی کو بھی دیکھا پھر ایک بولا۔

"پاگل لگتا ہے اٹھا یہ رزق .... سب نیچے گرا دیا۔"

"تم لوگ .... تم لوگ۔" میرے منہ سے نکلا .... میرے چہرے سے کمبل سرک گیا تھا۔ دوسری لڑکی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر سے دونے اٹھا کر تقسیم کرنے والی لڑکی کو دے کر بولی۔

"لو مہر، زمین پر گری چیزیں خراب ہوگئی ہیں اور دیدو!" میں شدت حیرت سے گنگ ہوگیا۔ یہ لوگ لڑکی کے جسم سے لپٹے سانپ کو دیکھ نہیں پارہے ......! اس بار دونے میرے ہاتھوں میں آگئے تھے مگر میں نے کچھ پیچھے ہٹ کر انہیں لیا تھا۔ وہ آگے بڑھ گئیں مگر میں پاگلوں کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ یا الٰہی یہ کیا قصہ ہے کالے سانپ نے لڑکی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور یہ لوگ نہ تو اس سے خوف کھا رہے ہیں نہ اسے کوئی اہمیت دے رہے ہیں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تقسیم کرنے والے آخری فقیروں کو بھی ناشتہ دے چکیں تو واپس پلٹیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا میں اسی طرح دونے پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس بار انہوں نے مجھے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ سب گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے اور کوچوان نے اپنی جگہ سنبھال لی۔

"اے پیٹ بھرا ہوا ہے کیا پہلوان۔" میرے برابر بیٹھے ہوئے فقیر نے للچائی ہوئی نظروں سے میرے دونے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایں ...... !" میں چونک پڑا۔

"میرے کو دیدے خلیفہ، کلن کا پیٹ چار پوریوں سے نہیں بھرنے کا۔ دیدے استاد اللہ تیرا بھلا کرے گا۔" اس نے لجاجت سے کہا اور میں نے دونے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"ارے ارے، کھانے دے اسے کلن، اللہ تیرا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔" قریب بیٹھی ایک عورت نے کہا اس کے ساتھ دو بچے تھے جو جلدی سے نیچے گری ہوئی پوریاں اور حلوہ اٹھا کر لے بھاگے۔

"اے بی تمہیں کیا ہورہا ہے۔ اپنی خوشی سے دیا ہے اس نے آئیں کہیں سے بی ہمدردی۔" کلن نے پوریوں کے نوالے بناتے ہوئے کہا۔ اسی وقت دوسرا فقیر چیخا۔

"لو اور ناشتہ آرہا ہے کلن استاد ......" گھوڑا گاڑی پھر واپس آرہی تھی۔ کلن نے سرگوشی کی۔

"میاں بھائی۔ تیرے کو اگر ضرورت نہیں ہے تو میرے لئے لے لیجیو۔ اللہ تجھے خوش رکھے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" گھوڑا گاڑی کچھ فاصلے پر رک گئی اس بار اس سے عورتیں نیچے نہیں اتریں تھیں بلکہ ایک بھاری جسامت کا دراز قامت شخص نیچے اترا تھا۔ اس کے جسم پر قیمتی شیروانی تھی، چوڑی دار پائجامہ، سیاہ وارنش کے پمپ پہنے ہوئے تھے۔ اسکے پیچھے وہی دونوں آدمی بھی نیچے اترے تھے جو پہلے تھال اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اس طرف بڑھنے لگے۔ کلن نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابے لو، پھوٹ لے خلیفہ ...... کوئی اور ہی چکر ہے، نکل لے، نکل لے۔" وہ جلدی سے اٹھا اور پیچھے کھسک گیا۔ شیروانی والا شخص پُروقار چال چلتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ ان دونوں افراد نے میری طرف اشارہ کردیا۔ دوسرے فقیر ابھی ناشتہ ہی کررہے تھے۔

"آپ ناشتہ نہیں کررہے میاں صاحب۔" پُررعب شخص نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایل لو، کیسے ناشتہ کرے بے چارہ، وہ مری کالیا کلن جو چار سو بیسی کرکے اس کا ناشتہ لے گیا۔ بے چارے کو اور دیدو میاں جی بھوکا ہے۔" عورت نے سفارش کی۔

"آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتا ہوں میاں صاحب، غریب خانے تک زحمت کرنی ہوگی؟"

"مم میں ...... وہ ...... وہ۔" میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

"بعد میں آپ جہاں حکم دیں وہاں پہنچا دیا جائے گا، خدارا انکار نہ کیجئے۔ میں آپ کا شکر گزار

ہوں گے۔ میاں فتح محمد کوئی تانگہ کر کے میاں صاحب کو احترام سے گھر لے آؤ۔ وہ دیکھو، وہ خالی تانگہ گزر رہا ہے"۔ اس شخص نے ایک سمت اشارہ کیا اور دوسرا آدمی تانگے کی طرف دوڑ گیا۔ میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ تقدیر کے فیصلے اہم ہوتے ہیں ہر تحریک کا ایک مقصد ہوتا ہے آخر مجھے کسی کام کے لئے ہی یہاں بھیجا گیا ہے اور کام ...... وہ شاید میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

تانگہ آگیا، اس شخص نے مجھے اپنے سامنے تانگے میں سوار کرایا دونوں ملازم نما آدمی بھی تانگے میں بیٹھ گئے اور شیروانی والے نے تانگے والے سے کہا۔ "ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

"جی سرکار عالی۔" تانگہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے چلتا رہا میں دونوں طرف بنی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا کوئی بڑا شہر تھا مگر میرے لئے اجنبی تھا اپنا تجسس نہ روک سکا اور پوچھ بیٹھا۔

"یہ کونسا شہر ہے بھائی ......" میرے قریب بیٹھے دونوں ملازم چونک پڑے۔ تانگے والا بے اختیار بول پڑا ......

"دلی ہے بھائی میاں، کہیں باہر سے آئے ہو"۔

"تم تانگہ چلاؤ شیخ جی، میاں صاحب کا بھیجا ٹلا ہے۔" فتح محمد نے کہا اور دوسرا ملازم اسے گھورنے لگا۔

"تیری کترنی کبھی قابو میں نہیں آئے گی فتے چپکا بیٹھ ......"

"اماں تو گول مرچی کائے کو چبا رئے ہو، میں نے کیا کر دیا؟" فتح محمد نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"بس تو چپکا بیٹھا رہ ......"

"کمال ہے۔ عمر قید نہیں۔ کائے کو میرے اوپر حکم چلاتے رہتے ہیں؟ تمہاری دبیل میں ہوں؟"

"لڑنا بری بات ہے بھائی تحمل سے کام لو ......" میں نے انہیں ٹوکا۔

"اے لے، بول پڑے مرلی داس۔ میاں بھائی سب تمہارا کیا دھرا ہے۔" فتح محمد نے کہا۔

"میرا؟"

"تو اور کیا میاں بھائی، وہ سانپ کاں سے نظر آگیا تمہارے کو......"

"سانپ۔" میں آہستہ سے بولا۔

"سن لو بندو خان صاحب، میاں جی بھول گئے اور سناؤ بڑے میاں، صاحب کو سانپ کی کہانی"۔

"خدا کے لئے چپ رہو۔ گھر جا کر بات کر لینا۔" دوسرے ملازم نے کہا۔

"یہ شہر دہلی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اماں تم کیا بارہ بنکی سے آئے ہو۔"

"ہاں، میں یہاں اجنبی ہوں۔"

"کاں کے رہنے والے ہوں۔" فتح محمد بولا۔

"چندوسی سے آیا ہوں۔"

"تو یہ نہیں پتہ کہ دلی میں اترے ہو۔ ابے بھائی میاں کیا ہوائی جہاز سے گر گئے تھے۔"

"نہیں بس یونہی۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"دلی میں ہو پہلوان اور فتح پوری کی جامع مسجد پر بیٹھے تھے۔ اب سمجھ میں آگئی مگر وہ سانپ کاں سے نظر آگیا تمہیں۔" فتح محمد بولنے کا مریض تھا ...... !

"یہ کون صاحب ہیں جو شیروانی پہنے ہوئے تھے؟"

"شیخ عبدالقدوس اچھے نواب۔ بہت بڑی سرکار ہے آدھی دلی ان کی ہے اللہ کے فضل سے۔" فتح محمد بولا۔

"وہ دونوں لڑکیاں کون تھیں ...... ؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مہرالنساء شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹیا اور دوسری ......"

"فتح محمد قسم کھا رہا ہوں اچھے نواب سے تیری شکایت ضرور کروں گا۔ رستے میں بک بک کئے جا رہا ہے یہ کوئی اچھی بات ہے۔" ملازم بندو خان نے کہا اور فتح محمد برا سامنہ بنا کر خاموش ہو گیا۔ ؟

میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی لیکن حالات کا کچھ اندازہ ضرور ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی میرے لئے معمہ بنی ہوئی تھی جس کے جسم پر میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں سانپ لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر دوسرے اس سے لاعلم تھے کیوں آخر کیوں پھر ایک قدیم طرز کی شاندار حویلی کے احاطے کے سامنے تانگہ رک گیا گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو گئی تھی۔ ہم تانگے سے نیچے اتر آئے گھوڑا گاڑی کی سواریاں اندر چلی گئی تھیں۔ شیروانی والے شیخ صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے ان کے پاس ایک اور شخص کھڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر اچانک میرے دماغ میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ چہرہ، یہ چہرہ میں پہچان گیا تھا۔

یہ وہی نواب قسم کا آدمی تھا جسے میں نے اس وقت دیکھا تھا جب لوگ مجھے رتنا کہتے تھے۔ اسی شخص کے ساتھ میں نے ماموں ریاض کو شکنتا کے کوٹھے پر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور بعد میں یہ مجھے نہیں مل سکا تھا مگر اتنا پتہ چلا تھا کہ یہ لوگ الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ان لوگوں کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ آہ کیا ماموں ریاض بھی اس کے ساتھ ہیں۔ شیخ عبدالقدوس احترام سے آگے بڑھے اور بولے۔

"تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں قبلہ۔ دلی آرزو ہے کہ ایک مختصر وقت کیلئے مجھے شرف میزبانی بخشیں۔"

"آپ کا کوئی کام ہے ہم سے۔" میں نے پوچھا۔

"اس حقیقت سے انکار کر کے جھوٹ بولنے کا جرم نہیں کروں گا۔" شیخ صاحب بولے۔

"اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم آپ کے کسی کام آسکتے ہیں تو ہم حاضر ہیں اگر آپ کا کام ہم سے نہ ہو سکے تو ہمیں مجرم قرار نہ دیجئے گا۔"

"وہ میری تقدیر ہو گی آپ کے قدموں کی برکت ہی سے فیض یاب ہو لوں گا۔" شیخ صاحب نے کہا۔ پھر فتح محمد سے بولے "میاں فتح محمد میاں صاحب کو مہمان خانے لے جاؤ اور عزت و احترام سے وہاں قیام کراؤ تمہاری خدمات ان کے لئے ہیں انہیں کوئی تکلیف ہوئی تو سزا پاؤ گے۔"

"جی ......" فتح محمد نے خم ہو کر کہا پھر میرے سامنے گردن جھکا کر بولا۔ "آیئے میاں صاحب۔"

میں شانے ہلا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ مہمان خانہ حویلی کے بغلی حصے میں تھا۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ بھی دوسری سمت سے تھا اس طرف آم اور شریفے کے درختوں کی بھرمار تھی۔ تین چوڑی سیڑھیاں عبور کر کے ایک عریض دالان آیا اور فتح محمد نے دالان میں بنے دروازوں میں ایک دروازہ کھول دیا۔

"سب سے بڑھیا کمرہ دے رہا ہوں میاں صاحب تمہارے کو، قسم اللہ کی نصیب کھل گئے تمہارے تو۔ ابھی چار دن پہلے نواب مینڈو گئے ہیں اس کمرے سے جاتے ہوئے سو روپے دے گئے تھے میرے کو۔ کہنے لگے میاں فتح محمد جب بھی یاں سے نوکری چھوڑو میرے پاس آجائیو نہال کر دوں گا۔ ویسے بھائی میاں کونسی بنٹی گھمادی تم نے ہمارے شیخ صاحب پر، بڑا دم بھر رئے ہیں تمہارا۔"

"تم واقعی بہت زیادہ بولتے ہو فتح محمد۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب۔ ہم تو یہ سوچیں ہیں کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور مردہ دل کو دل سے باہر نکال پھینکنا چاہئے۔ بالکل ٹھیک کہا مرزا جی نے۔ میاں ہنس بول کر زندگی گزار لو۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ ایک بات بتاؤ فتح محمد۔ یہ شیخ صاحب کے ساتھ جو ایک صاحب کھڑے ہوئے تھے وہ کون تھے۔"

"بتن میاں۔"

"میں ان کا نام نہیں جانتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ابے وہ ہاں۔ - ایل لو۔ میاں صاحب وہ اچھے نواب کی بڑی بٹیا فخر النساء کے ممیا سسر ہیں نام ہے ان کا الیاس خان الہ آبادی امرود۔ پیار سے سب لوگ انہیں بتن میاں کہتے ہیں۔ ایک بات بتاؤں تے کی۔"

"بتاؤ!"

"بس میاں کھاؤ کماؤ ہیں، کبھی اس کے گھر جا پڑے، کبھی اس کے گھر جا پڑے۔ شیخ صاحب بٹیا کے سسرال کا خیال کرتے ہیں۔ اب کوئی بیس دن ہوگئے میاں پڑے ہوئے کھا رہے ہیں اینڈ رہے ہیں۔"

"الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔"

"ہاں بڑی بٹیا کی سسرال الہ آباد میں ہے۔"

"ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"لو۔ ان کے ساتھ اور کون ہوگا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ بس یار دوست ہیں اور رنگ رلیاں۔ ابے کیا بتاؤ میاں صاحب۔ "فتح محمد کی بات ادھوری رہ گئی۔ بندو خان ناشتہ لے آئے تھے۔

"تم یہاں باتیں مٹھار رہے ہوگے۔ پتہ ہے میاں صاحب نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔"

"اماں ہاں۔ لو۔ بھول ہی گیا۔ تم بھی خدمت کل لو میاں صاحب کی۔ ایک سٹے کا نمبر مل گیا تو وارے نیارے ہوجائیں گے۔" فتح محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ناشتہ بڑے اہتمام سے لایا گیا تھا۔ بھوک پھر چمک اٹھی میں خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ بندو خان نے فتح محمد کو کوئی کام بتا

کر وہاں سے بھیج دیا تھا۔ خود بندو خان سمجھدار اور سنجیدہ آدمی تھا۔ خاموشی سے بیٹھا رہا، میں نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر وہ برتن اٹھا کر چلا گیا۔ مہمان خانے کا یہ کمرہ بے مثال سجاوٹ کا حامل تھا۔ مسہری بیحد قیمتی تھی۔ دوسری چیزیں بھی اسی معیار کی تھیں۔ میں گہری سانسیں لیکر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس پر غور کر رہا تھا۔ چندوسی سے ریل میں بیٹھا تھا۔ کمبل پوش کے الفاظ سنے تھے اور بس۔ اس کے بعد یہ سب کچھ۔ وہ کمبل اب میرے پاس تھا اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی تھی مگر دل سے سوال کرتا تو جواب ملتا کہ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے اور یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے۔ مجھے اس مقصد کے سامنے آنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ البتہ دل میں رہ رہ کر الہ آباد کے الیاس خان کا خیال آ رہا تھا۔ اس شخص سے اگر ماموں کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے تو۔ باہر آہٹیں ابھریں پھر شیخ عبدالقدوس اندر داخل ہوگئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا تھا۔

"مجھے گنہگار نہ کیجئے میاں صاحب۔ آپ تشریف رکھئے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔"

"حکم فرمائیے۔"

"میاں صاحب۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے وہی جانتا ہے کہ اس نے آپ کو کیا دولت عطا کی ہے۔ آپ نے میری بچی کو دیکھ کر کچھ سانپ کا حوالہ دیا تھا وہ کیا تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر میرے ملازموں نے یہ تذکرہ کیا تھا اور میرا دل بے اختیار چاہا تھا کہ آپ کو غریب خانے پر زحمت دوں۔"

"وہ خاتون آپ کی صاحب زادی ہیں۔"

"جی۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ معبود کریم نے یہی دو بیٹیاں عنایت فرمائی ہیں۔ بڑی کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں چھوٹی کے لئے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس مصیبت کا شکار ہوگئی۔"

"وہ مصیبت کیا ہے؟"

"آپ کے سوال کا جواب دینا میرا فرض ہے۔ حالانکہ میرا سوال تشنہ رہ گیا ہے۔ آپ نے اس وقت سانپ سانپ کیوں کہا تھا؟"

"کیا آپ لوگ ان کے بدن سے لپٹے ہوئے سانپ سے خوفزدہ نہیں ہوتے؟"

"بدن سے لپٹے ہوئے سانپ سے۔" شیخ صاحب نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اس کا پھن ان کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ چمکیلا سانپ گہرا سیاہ تھا اور وہ ان کے پورے بدن کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔" میں نے کہا اور شیخ صاحب دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ "وہ آپ کو نظر آیا تھا۔"

"آپ کو نظر نہیں آتا؟"

"نہیں ہمیں، یہ بصیرت نہیں ملی حضرت۔ اب میں آپ کو پوری تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ مختصر عرض کرتا ہوں۔ میں دہلی کا قدیم باشندہ ہوں۔ اجداد دور مغلیہ سے یہاں آباد تھے یہ حویلی بھی اسی دور کی ہے۔ دہلی میں تھوڑی بہت جائداد اور کاروبار ہے۔ اللہ کے کرم سے عزت سے گزر رہی ہے اولاد

نرینہ سے محروم ہوں اور یہی دو بچیاں سرمایۂ حیات ہیں۔ مہر النساء میری چھوٹی بچی کا نام ہے۔ کوئی آٹھ ماہ پہلے وہ ایک خوش گفتار ہنس مکھ اور زندگی سے بھرپور بچی تھی۔ اچانک ایک رات وہ خواب کے عالم میں ڈر گئی اور سانپ سانپ چیخنے لگی۔ ہم سب جاگ گئے اور اسے بیدار کیا تو وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دہشت زدہ نظروں سے چھت میں لٹکے ہوئے فانوس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ فانوس میں سانپ ہے۔ وہ نیچے لٹکا ہوا تھا اور اس پر گرنا چاہتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ تاہم اس وقت سارے ملازموں کو بلا کر بھاری فانوس اتار لیا گیا اور اس کو چکنا چور کر دیا گیا سانپ کہیں نہیں تھا۔ اسے اطمینان تو ہو گیا مگر وہ بدستور سہمی رہی پھر دوسری صبح اس نے اپنی والدہ کو بتایا کہ وہ یہ سانپ کئی دن سے دیکھ رہی ہے کبھی یہ اسے پائیں باغ کے کسی درخت کی جڑ میں بیٹھا نظر آتا ہے، کبھی پھولوں کے کسی کنج میں مگر پھر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ننھی چمک دار آنکھیں اسے نظر آتی رہتی ہیں۔ نذر نیاز کی گئی صدقے اتارے گئے جو ممکن تھا کر لیا گیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ وہ ملول اور خوفزدہ رہنے لگی۔ دو تین بار اس نے سانپ کا تذکرہ کیا اور پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد بارہا اس سے سانپ کے بارے میں پوچھا گیا مگر اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اس تذکرے پر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ تمام صفات ختم ہو گئیں۔ پہلے وہ بلبل کی طرح چہکتی رہتی تھی اب بالکل خاموش بلکہ ایک طرح سے نیند کے عالم میں رہتی ہے بس کبھی کبھی وہ اس خول سے نکلتی ہے اس سے کچھ پوچھا جاتا ہے تو رونے لگتی ہے ساتھ ہی کچھ عجیب و غریب واقعات رونما ہوئے ہیں جو ناقابل فہم ہیں۔"

"وہ کیا"۔ میں نے دلچسپی سے پوچھا اور شیخ صاحب کسی سوچ میں گم ہو گئے۔ جیسے ان عجیب و غریب واقعات کو یاد کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کہا۔

"اس کے کمرے میں خوشبوئیں بکھری رہتی ہیں۔ گلدانوں میں ایسے ایسے حسین پھولوں کے گلدستے نظر آتے ہیں جو شاید پورے ہندوستان میں کہیں نہ ملیں دہلی تو کیا۔ شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنی تھی اس کے لباس کی الماری میں اطلس کا ایک ایسا جوڑا ملا جس میں ہیرے ٹکے ہوئے تھے وہ آدھی آدھی رات کو باغ میں چلی جاتی ہے اور وہاں بیٹھی رہتی ہے بس ایک بار رات کا چوکیدار اسے دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا تھا۔ دوسری صبح وہ بے ہوش ملا اور پھر پاگل ہو گیا۔ ایسے ہی کچھ اور واقعات"۔

"انہوں نے سانپ کا تذکرہ دوبارہ نہیں کیا"۔

"نہیں اس کے بعد نہیں"۔

"آپ لوگوں نے ان کے پاس کسی سانپ کو نہیں دیکھا؟"

"کبھی نہیں"۔

"آج کل بھی نہیں؟"

"بالکل نہیں"۔

"آپ نے انہیں کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟"

"میرے خاندان کے بزرگوں نے منع کر دیا"۔

"کیوں؟"

"ان کا کچھ اور خیال ہے"۔

"کیا؟"

"مجھے منع کیا گیا ہے کہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہوں"۔

"آٹھ ماہ سے ان کی یہ حالت ہے"۔

"ہاں۔ لگ بھگ"۔

"کوئی ایسا واقعہ جس کا رابطہ ان واقعات سے کیا جا سکے"۔

"ہاں۔" شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بتایئے۔"

"دہلی سے کچھ فاصلے پر غازی آباد ہے۔ غازی آباد میں بھی میری زمینیں اور جائداد ہے وہیں ایک قدیم حویلی بھی ہے جو کوئی سو سال سے ویران پڑی ہے۔ ایک ہندو بنیئے نے اس پر اپنا حق جتا دیا اور ہمارے درمیان مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ میں وہ مقدمہ جیت گیا مقدمے کے دوران حویلی سیل کر دی گئی تھی مجھے اس کا قبضہ دیا گیا اور چونکہ یہ تنازع عرصے سے چل رہا تھا اس لئے جب ہم قبضہ لینے لگے تو تمام گھر والے ساتھ تھے۔ مہر النساء بھی تھی۔ حویلی تباہ حال پڑی ہوئی تھی جھاڑ جھنکار سے بھری ہوئی۔ میں نے ایک کمرہ صاف کرایا اور ہم نے ایک رات وہاں قیام کیا تھا۔"

"جی۔ پھر؟"

"بس اس کے بعد ہی مہر النساء کی یہ کیفیت شروع ہو گئی۔"

"اس رات کے قیام میں کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"بالکل نہیں۔ خوشگوار چاندنی رات تھی۔ بچے صاف ستھرے علاقے میں ساری رات آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔"

"آپ نے کسی عالم سے رجوع کیا؟"

"نہیں۔ دراصل ذہن کچھ مختلف ہے۔ اس بارے میں، میں نے اپنے اہل خاندان سے اختلاف کیا مگر اب، اور پھر میاں صاحب آپ نے براہ راست مجھے متاثر کیا ایسے کام میں کرتا رہتا ہوں۔ اس کا صدقہ اتارتا رہتا ہوں۔ کھانا وغیرہ اسی طرح تقسیم کرتا رہتا ہوں جس طرح آپ نے دیکھا۔"

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہتر سمجھتے ہیں میاں صاحب۔ اللہ کا حکم ہوا ہے تو آپ میری مدد کریں۔ وہ بچپن سے اپنے پھوپھی زاد بھائی سے منسوب ہے میری بہن بہنوئی یورپ میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان طے ہے کہ ہم دونوں بچوں کی شادی کریں گے سلطان میاں کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔"

"صاحبزادی اپنے منگیتر سے مطمئن ہیں۔"

" نے خالص مشرقی ماحول میں میری والدہ سے تربیت حاصل کی ہے اور مشرقی لڑکیاں صرف اتنا

سوچتی ہیں جتنا انہیں بتایا جائے۔ اس کی اداسی اور غم آلود کیفیت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ا... اپنے مستقبل کا خیال ہے۔ " شیخ صاحب نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ نہ میں عالم تھا نہ درویش ان حالات پر اپنا تبصرہ کیا کرتا مجھے تو رہنمائی درکار تھی۔ سوچنے لگا کہ شیخ صاحب کو کیا جواب دوں با... کہا۔

" قبلہ شیخ صاحب! میں آپ سے اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں خود بھی ایک ناواقف از... ہوں۔ ہاں اس اعتراف سے گریز کر کے جھوٹ کا مرتکب نہ ہوں گا کہ میں نے مہر النساء بیگم کے... سے ایک پتلا لمبا سانپ لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کا پھن ان کے سر پر رکھا ہوا تھا، اسی لئے ناشتہ... دونے میرے ہاتھ سے گر گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ آپ سب لوگ بھی اسے دیکھ رہے ہوں گے مگر ا... کا حکم۔ اگر اس نے مجھے یہ بینائی بخشی ہے تو اس کی کچھ وجوہ بھی ہوں گی۔ میں دہلی میں نووارد ہوں چند ر... سے آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے خدا کے نیک بندوں سے فیض حاصل کرنے نکلا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس بارے میں، میں کوئی خدمت سرانجام دینے میں کامیاب ہو جاؤں۔ آپ کے در دولت پر چند روز قیام کا خواہشمند ہوں۔ دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ درکار نہ ہو گا۔ اگر بزرگان دین سے کچھ رہنمائی حاصل ہوئی تو یہاں ٹھہروں گا ورنہ آپ سے اجازت لے کر چلا جاؤں گا۔ خدارا مجھے ایک گنہگار انسان کے سوا کچھ تصور نہ فرمایئے گا۔ ہو سکتا ہے صاحبزادی کی صحت یابی کی سرخروئی مجھے عنایت ہو جائے۔ "

" سبحان اللہ۔ میاں صاحب آپ کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ جسے عاجزی اور انکساری کی دولت مل جائے اس سے زیادہ امیر کون ہو سکتا ہے ورنہ یہاں تو دو ٹکوں پر اچھلنے والوں کی بہتات ہے۔ آپ کا قیام میرے لئے بڑی ڈھارس کا باعث ہو گا۔ آپ یہاں قیام فرمایئے میں آپ کا احسان مانوں گا۔ ویسے حضور کوئی نام تو ہو گا آپ کا؟ "

" جی۔ آپ مجھے مسعود احمد کہہ سکتے ہیں۔ "

" جس شے کی حاجت ہو ارشاد فرما دیجئے گا؟ "

" شکریہ۔ مہر النساء بیگم سے ملتے رہنے کی اجازت چاہتا ہوں مجھے ان کے لئے بھائی کا درجہ دیا جائے اور حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کی اجازت بھی۔ "

" سب کو ہدایت مل جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیں "۔

" مہر النساء بیگم پر کسی بھی وقت کوئی خاص کیفیت طاری ہو مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ "

" بہت بہتر۔ ویسے آپ چاہیں تو ابھی اس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ نور جہاں میری بھتیجی ہے اور مہر کے ساتھ رہتی ہے اسے سب سے زیادہ مہر سے لگاؤ ہے میں اسے بھی ہدایت کر دوں گا۔ "

" ابھی کچھ توقف فرمایئے۔ بعد میں ان سے ملاقات کر لوں گا۔ " میں نے کہا اور شیخ صاحب اٹھ گئے۔ رخصتی الفاظ ادا کر کے وہ باہر نکل گئے اور میں احمقوں کی طرح دروازہ کو دیکھتا رہ گیا۔ کیا میں اس سلسلے میں کچھ کر سکوں گا۔ مگر کیسے۔ میرا عمل کیا ہونا چاہئے۔ بابا فضل میں نابینا ہوں۔ میں کچھ نہیں

" آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سویئے۔ " میرے کانوں میں آواز ابھری اور میں اچھل پڑا۔

آواز اتنی صاف تھی کہ کوئی دھوکہ نہیں ہوا تھا اور یہ آواز۔ میری نگاہ اس کمبل کی طرف اٹھ گئی۔ اس کمبل کا ان الفاظ سے گہرا تعلق تھا۔ مگر اس وقت پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس طرح آیا کہ میں خود کو اس سے باز نہ رکھ سکا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمبل کو بڑے احترام سے اٹھا کر مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ مسہری پر دراز ہو کر میں نے کمبل اوڑھ لیا۔ تاریکی پھیل گئی سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا مگر میں صبر و سکون سے لیٹا رہا پھر اچانک میری نظروں میں روشنی کا ایک نکتہ ابھرا یہ نکتہ رفتہ رفتہ پھیل رہا تھا۔ پھر احساس ہی نہ رہا کہ میں کہاں ہوں کس حال میں ہوں۔ میرے اطراف تیز روشنی تھی اور اس روشنی میں، میں بہت کچھ دیکھ رہا تھا سن رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔ میرے ذہن کے دریچے کھلتے جا رہے تھے اور ان دریچوں میں نجانے کیا کیا تھا۔

دروازہ زور زور سے پیٹا گیا تو میں جاگا اور آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مہمان خانہ ہی تھا۔ میں مسہری پر تھا اور دروازہ مسلسل پیٹا جا رہا تھا۔ کمبل احترام سے طے کر کے میں نے ایک طرف رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا، فتح محمد تھا۔

" اماں بھائی میاں روٹی نیئں کھاؤ گے کیا، ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اماں گھوڑے بیچ کو سو گئے تھے کیا؟ "

" نہیں فتح محمد۔ کھانا لے آئے ہو کیا؟ "

" اماں کھانا لانے میں کونسی دیر لگے گی۔ ابھی لائے۔ " فتح محمد نے کہا اور چلا گیا میرا سر چکرا رہا تھا جو کیفیت طاری ہوئی تھی وہ نیند نہیں تھی بلکہ کچھ اور تھا اور اس میں جو کچھ بتایا گیا تھا اس نے مجھے اعتماد بخشا تھا۔ کھانے کے بعد فرصت تھی۔ کچھ دیر آرام کیا پھر غسل کر کے لباس سلیقے سے پہنا فراست کا دیا ہوا یہ لباس قیمتی تھا مجھے وہ حلیہ بنانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جو درویشوں اور گوشہ نشینوں کا ہوتا ہے کہا گیا تھا۔

" وہ روپ ہوتا ہے بہروپ نہیں۔ اور روپ ملتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ جذب کی وہ منزل عمر تمام کی گرفت میں نہیں ہاں کسی مرد حق کی نظر ہو جائے۔ سو جو بہروپ بھرتے ہیں وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ اور جھوٹ سے ہمیشہ خسارہ ہوتا ہے۔ سو دنیا تو دنیا داروں ہی کی طرح گزارنا بہتر ہے اور بہروپ بھرنا گناہ ہے۔ " تب میں نے سوچا کہ مجھے دوسرے لباس بھی درکار ہیں اور میرے ہاتھ پاؤں مضبوط۔ کسی کے چھوٹے موٹے کام کے لئے اس کے در پر جا پڑنا رزق حلال کا حصول تو نہیں۔ اس کے لئے تو بساط بھر محنت کرنی ہوتی ہے لیکن ابھی کچھ ذمے داریاں پوری کرنی ہیں اس کے بعد یہ سوچوں گا کہ کیا کرنا چاہئے۔

شام کے چھ بجنے والے تھے مہمان خانے سے نکلا اور حویلی کے باغ کی بہار دیکھتا ہوا درختوں کی آڑ میں دور نکل آیا۔ تب ایک برگد کا قدیم درخت نظر آیا جو کئی سو سال پرانا ہو گا۔ اس کی داڑھیاں بے شمار تھیں اور نیچے آ کر زمین کی گہرائیوں میں اتر گئی تھیں مگر مجھے جس شے نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ ایک زنگ خوردہ کلسا تھا جو تانبے کا بنا ہوا تھا اور زنگ تانبہ کھا گئی تھی مگر کلسے میں سونا چمک رہا تھا۔ کلسا چمکدار

سونے کی گنیوں سے بھرا ہوا تھا اور یہ مال تھا زمانۂ قدیم کے ایک سود خور بنئے کا جس نے ہر اچھے برے ذریعے سے اسے جمع کیا اور یہاں دفن کر دیا مگر وہ اسے استعمال نہ کر سکا اور مر گیا اور اب اسے کسی کی ملکیت بن جانا چاہئے مگر میری نہیں۔ نہ ہی میرے دل میں اس کی طمع پیدا ہوئی تھی۔ مگر میں نے پاؤں سے اس جگہ کو کرید کر دیکھا اور اندازہ ہو گیا کہ کلسا گہرائی میں ہے پھر کچھ باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں اور گردن گھوم گئی۔ وہ دونوں اسی طرف آ رہی تھیں اور زیادہ دور نہیں تھیں میں نے انہیں پہچان لیا اور انہوں نے مجھے، مگر وہ خود میری طرف بڑھ آئی تھیں اور مہر النساء سانپ کی گرفت میں نہیں تھی۔

"لو دیکھ لو یہی ہیں۔" نور جہاں نے شوخی سے مسکرا کر کہا اور مہر النساء نے اسے ٹہوکا دیا۔

"مجھے کیوں پیٹ رہی ہو ، خود ہی تو دیکھنا چاہ رہی تھی مگر کمال ہے۔ اس عمر میں فقیری۔ مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔ کیوں جناب شاہ صاحب آپ کچھ بتائیں گے؟"

"کیا بتاؤں۔"

"انہیں تو پہچان لیا ہو گا آپ نے؟" نور جہاں نے مہر النساء کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی ہاں۔"

"اس وقت ہم نے بھی آپ کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر بعد میں آپ کی بڑی تعریفیں سنیں۔ وہ تعریفیں سچ ہیں یا کوئی اور قصہ ہے؟"

"قصہ کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بس وہی کہ، اک محلے میں تھا ہمارا گھر۔ وہیں رہتا تھا ایک سوداگر یعنی مثنوی زہر عشق۔ یا پھر زیب النساء اور عاقل خان والا معاملہ۔" نور جہاں بہت تیز اور شوخ تھی۔

"اتنی بے لگامی اچھی نہیں ہوتی نور جہاں۔" مہر النساء نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔

"سنو تو۔ ارے رکو تو۔" نور جہاں نے کہا۔ مگر مہر النساء تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی مجبوراً نور جہاں کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔ میں خاموشی سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور دوبارہ اس وقت چونکا جب ایک درخت کے عقب سے تالیاں بجنے کی آوازیں سنیں۔ دیکھا تو الیاس خان فتح محمد کے ساتھ نظر آئے اور درخت کے عقب سے نکل کر میرے پاس پہنچ گئے۔

"سڑکوں پر بھیک مانگنے والے بھی بعض اوقات بڑے ذہین نکل آتے ہیں جیسے ہمارے شاہ صاحب۔ مگر تمہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نور جہاں سچ کہہ رہی تھی۔" میں نے الیاس خان کو دیکھ کر سلام کیا۔ اس شخص سے میں بھی راہ و رسم چاہتا تھا۔ "جیتے رہو جیتے رہو ہمارا کیا جاتا ہے۔" الیاس خان مکاری سے بولا۔ صورت سے ہی شاطر آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"کیسے مزاج ہیں خان صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"میاں ہم تو سدا بہار ہیں مگر تمہارا چکر ذرا سمجھنے سمجھانے کا ہے۔" الیاس خان صاحب نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں خان صاحب؟"

"خیر سمجھ تو سب کچھ گئے ہو گے، یہ دوسری بات ہے کہ بننے کی کوشش کر رہے ہو مگر سنو! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ بڑے چکر چلا چکے ہیں خود بھی جوانی کی عمر کا اندازہ ہے ہمیں۔ یہ عمر ایسے ہی کھیل کھیلنے کے لئے ہوتی ہے مگر کسی سمجھ دار کو راز دار بنا لینا اچھا ہوتا ہے، کیا چکر ہے جان من؟" الیاس خان نے ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرا دیا۔

"گو آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آئیں، لیکن سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"ملی بھگت چل رہی ہے، کس سے نور جہاں سے یا مہر النساء؟"

"اوہ یہ بات ہے، نہیں خان صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ کا یہ خیال غلط ہے۔"

"دیکھو میاں! جب آدمی بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرے تو اگلے کو بھی غصہ آ سکتا ہے اور پھر یہ تو تمہیں پتہ چل ہی گیا ہو گا فتح محمد سے، فتح محمد نے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہمارے بارے میں بھی پوچھ رہے تھے۔ تو یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ اس گھر میں ہماری رشتے داری ہے۔ دور کی سہی، مگر آتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور پھر بے چارے اپنے شیخ عبدالقدوس اللہ میاں کی گائے ہیں بلکہ اللہ میاں کے بیل، ایک منٹ میں ہر ایک پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ ملی بھگت کی بات ہے اور کوئی کھیل رہے ہو، صورت سے فقیر نہیں معلوم ہوتے، حلیہ بگاڑنے سے کیا ہوتا ہے، تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں، لیکن یاروں سے یاری کرنا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ یہ فتح محمد تو باؤلا ہے کہنے لگا کہ خان صاحب ذرا شاہ جی سے بات چیت کر کے سٹے کا نمبر معلوم کریں، اسی لئے پیچھے لگا آیا تھا ہم نے تمہیں مہمان خانے میں دیکھا اور پھر اس طرف آتے ہوئے تب پتہ چلا کہ صاحبزادے کوئی دوسرا ہی کھیل کھیل رہے ہیں، راز دار بنا لو فائدہ ہی فائدہ ہو گا۔" میں بدستور مسکراتا رہا۔ میں نے کہا۔

"خان صاحب سٹے کا نمبر معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"پہلے تو یہی سوچا تھا کہ فتح محمد کی بات پر یقین کر لیں مگر اب جو کچھ سامنے آیا ہے وہ کچھ اور ہے۔"

"ہوں، آپ سے اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں کرنی ہیں مجھے خان صاحب۔"

"ابے دیکھا، بھائی فتے بھیا اپنی عمر سے اونچی اڑان اڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہم نے بھی اچھے اچھوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں، چلو بولو کیا بات ہے، کیا قصہ ہے، ہو سکتا ہے ہم کام آ ہی جائیں۔"

"تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"چل بے فتح محمد پھوٹ لے اور سن زبان بند رکھیو۔ ورنہ تو جانتا ہے الیاس خان کو۔"

"نہیں خان صاحب ہم تو نوکر ہیں آپ کے جی۔ مجال ہے قسم اللہ کی ادھر سے ادھر ہو جائیں، مگر ایک وعدہ کر لینا بھائی میاں، کچھ ہاتھ لگے تو اس میں تھوڑا سا حصہ ہمارا بھی ہونا چاہئے۔"

"اب جاتا ہے یا لگاؤں لات۔" الیاس خان نے کہا اور فتح محمد ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ الیاس خاں ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"آؤ پہلوان، بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو، صورت شکل سے بھی اور لباس سے بھی کیا چکر تھا مہر النساء سے کوئی معاملہ چل رہا ہے یا نور جہاں سے۔ ویسے آدمی ہو سانپ وانپ کا قصہ سن لیا ہو گا کہیں سے اور عین موقع پر پوبارہ کر دیئے اور شیخ عبدالقدوس ٹمبر لے آئے۔"

"خان صاحب، میں آپ کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا اور الیاس خان چونک پڑے چند لمحے چہرے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "فتح محمد سے پوچھا ہو گا میرے بارے میں۔"

نہیں میں نے آپ کو شکتی پور میں دیکھا تھا۔"

"کہاں"؟ خان صاحب چونک کر بولے۔

"شکتی پور میں، شکنتا کے کوٹھے پر، آپ کے ساتھ چند افراد اور تھے اور آپ شکنتا بائی کا رقص و سرور دیکھنے گئے تھے۔" الیاس صاحب نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دیکھتے رہے پھر ہنس پڑے اور بولے۔ "تم وہاں کیا کر رہے تھے شہزادے؟"

"آپ کے ساتھ جو افراد تھے الیاس خان صاحب میں ان کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتا جہاں تک آپ کے اس خیال کا معاملہ ہے کہ میں یہاں مہر النساء یا نور جہاں کے چکر میں آیا ہوں یہ ہو گا کہ اسے دل سے نکال دیجئے۔ میں کوئی فقیر یا درویش نہیں ہوں ایک گنہگار بندہ ہوں اللہ کبھی کبھی نظر عنایت ہو جاتی ہے اللہ والوں کی اور حکم ملتا ہے کہ کسی کا کوئی کام کر دیا جائے تو کر ہوں۔"

"لے وہ کتے کی دُم والی بات ہو رہی ہے کہ بارہ برس نلکی میں رہی مگر ٹیڑھی کی ٹیڑھی یعنی اب رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہم نے اور تم پھر وہی رام کہانی سنا رہے ہو ہمیں۔" الیاس خان صاحب گھورتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو یقین دلاؤں گا الیاس خان صاحب، لیکن ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا شکتی پور میں آپ کے ساتھ تھے۔"

"چلو ٹھیک ہے، مگر تمہاری اس معلومات سے ہمارے اوپر کیا فرق پڑتا ہے بھائی دنیا دار ہیں فقیر بن کر عشق و محبت کا ناٹک نہیں کھیلتے جیسے تم کھیل رہے ہو، رنگین مزاج ہیں، شوق رکھتے خرچ کرتے ہیں، کوٹھوں پر جاتے ہیں، اگر تمہیں یہ پتہ چل گیا تو اس سے ہمارا کوئی نقصان شہزادے، مگر تم ان لوگوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔؟"

"ان میں ایک صاحب میرے شناسا تھے۔ ان کے بارے میں آپ سے معلومات ہوں۔"

"کیا نام تھا......؟" الیاس خان نے پوچھا۔

"ریاض ......" میں نے جواب دیا اور الیاس خان سوچ میں ڈوب گئے پھر بڑ بڑا بولے۔

"اس دن ہمارے ساتھ، رشید خان صاحب تھے، غلام علی تھا، فرید احمد تھے ہاں ہاں یاد ہے منشی ریاض کی بات کر رہے ہو بالکل ٹھیک ہے، فرید احمد کے ہاں منشی ہے وہ شخص، فرید احمد ذرا یار باش کا آدمی ہے، نوکروں سے بھی دوستی رکھتا ہے، کسی کام سے گئے تھے ہم لوگ شکتی پور، منشی ریاض ساتھ تھا اور جب ہم گانا سننے گئے تو منشی ریاض کو بھی ساتھ لے گئے بس اس کے علاوہ اور کوئی ریاض تھا ہمارے ساتھ ......" میرا دل دھڑکنے لگا، میں نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا منشی ریاض صاحب، فرید احمد کے ساتھ الٰہ آباد میں رہتے ہیں؟"

"ہاں بھئی، فرید احمد الٰہ آباد کا ایک بڑا کاروباری ہے، منشی ریاض بہت عرصے سے اس کے ہاں کام کرتا ہے۔"

"آپ کو کچھ اور بھی معلوم ہے اس شخص کے بارے میں......؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا الیاس خان مجھے گھورنے لگے۔

"ابے عقل کی بات کرو بھائی کسی آدمی کے منشی کے بارے میں میں اس سے زیادہ اور کیا جان سکتا ہوں"

"میرا مطلب ہے کہ منشی ریاض اس وقت بھی الٰہ آباد ہی میں ہیں۔"

"جب فرید الٰہ آباد میں ہے تو منشی ریاض الٰہ آباد میں کیوں نہ ہوں گے مگر تمہارا اس شخص سے کیا تعلق ہے؟" میں گہری سانس لیکر خاموش ہوگیا الیاس خان کہنے لگے۔ "اچھا اب تو بتادو کہ قصہ کیا ہے؟"

"اگر کوئی قصہ ہے بھی خان صاحب تو آپ اس میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟"

"تمہارے بھلے کے لئے سمجھے تمہارے بھلے کے لئے، ہوسکتا ہے، ہم تمہارے کسی کام آجائیں، ویسے تم بتادو یہ روپ بدلا ہے ناں تم نے یا کچھ جانتے بھی ہو۔"

"ان باتوں کو جانے دیجئے الیاس خان صاحب آپ اپنی بات کیجئے۔ سٹے کا نمبر معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ......؟"

"چلو بیوقوف بنانا شروع کر دیا تم نے ہمیں بتا سکتے ہو تم سٹے کا نمبر؟" الیاس خان نے پوچھا۔

"نہیں لیکن آپ کی خواہش پوری کر سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور الیاس خان چونک پڑا۔

"کیا مطلب؟"

"میں آپ کو سٹے سے حاصل ہونے والی رقم یہیں اور اسی جگہ دے سکتا ہوں لیکن اس کے لئے ایک شرط ہوگی۔" الیاس خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا غالباً بات سمجھ میں نہیں آئی تھی میں نے مسکرا کر کہا۔

"سٹے کا نمبر معلوم کر کے ظاہر ہے آپ سٹہ کھیلیں گے، اس سے آپ کو رقم حاصل ہوگی وہ سب کچھ اگر یہیں مل جائے تو کیا حرج ہے؟"

"کیا آسمان سے دولت برسے گی؟" الیاس خان نے کہا۔

"نہیں زمین سے حاصل ہوگی، لیکن الیاس خان صاحب آپ پر وہ دولت اس وقت حلال ہوگی جب آپ میرا بھی ایک کام کر دیں۔" الیاس خان عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا میں نے پھر کہا

"میں آپ کو ایک چھوٹا سا خزانہ دے رہا ہوں لیکن اس کے بدلے جب آپ الٰہ آباد

احمد کے ہاں موجود منشی ریاض سے ملاقات کریں اور ان سے کہیں کہ ایک شخص کچھ عرصے کے بعد آپ سے ملنے آرہا ہے، کہیں جانے کی ضرورت نہیں، اس شخص کا آپ سے ملنا بیحد ضروری ہے، آپ اس کا انتظار کریں، اس کا نام مسعود احمد ہے اور اس کے باپ کا نام محفوظ احمد بتایئے الیاس خان صاحب، آپ میرا یہ کام کر دیں گے؟"

"یہ سب کچھ تو خیر میں کر ہی دوں گا، مگر تم وہ دولت والی بات کیا کہہ رہے تھے؟"

"آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میرا یہ کام کر دیں گے؟" میں نے پھر کہا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، آنکھوں میں امیدوں کی چمک آگئی تھی، الیاس خان نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ "کر دیں گے بھائی کر دیں گے چلو وعدہ کرتے ہیں، مگر وہ بات ادھوری رہ گئی۔"

"دولت کی ضرورت ہے؟"

"کس کو نہیں ہوتی؟" الیاس خان نے کہا۔

"تمہاری ضرورت برگد کے اس درخت کے اس حصے کو کھود کر پوری کی جا سکتی ہے جہاں وہ اس کی سب سے چوڑی داڑھی زمین میں پیوست ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میاں تانبے کا ایک کلسا گڑھا ہوا ہے جس میں سونے کی اشرفیاں بھری ہیں۔" میں نے کہا۔

الیاس خان مجھے گھورنے لگا، پھر بولا! "کیوں بے تکی چھوڑ رہے ہو شہزادے وہاں اشرفیاں گڑھی ہوئی ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو......" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"وہ تمہارے لئے ہیں۔ لیکن انہیں نکالنے کے لئے مناسب وقت کا تعین کرنا اور پالو تو میری بات کا خیال رکھنا، صلے میں مجھے بس وہی چاہئے جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

"اور گر نہ پاؤں تو؟" وہ بولا۔

"مجھے اپنی پسند کے مطابق سزا دے لینا۔"

"کان کھول کر سن لو شہزادے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش خطرناک ثابت ہوگی تمہارے لئے میرا نام الیاس خان ہے۔" اس نے کہا اور میں مسکرا دیا۔ وہ چلا گیا۔

عشاء کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔ دل کم بخت بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہوجائے یہ سرکشی ضرور کرتا ہے۔ الیاس خان کے مل جانے سے نہ جانے کیا کیا امنگیں جاگ اٹھی تھیں۔ ایک بار پھر وہ سارے چہرے آنکھوں میں آبسے تھے۔ ایک بار پھر اسی پر بہار زندگی کے خواب نظر آنے لگے تھے۔ ماموں ریاض نوکری کر رہے ہیں۔ محمود ملک سے باہر ہے ہوسکتا ہے ابو ان حالات کا شکار ہو کر صاحب فراش ہوگئے ہوں اور گھر کی ذمہ داریاں ماموں نے سنبھال لی ہوں۔ ایک بار، صرف ایک بار ان لوگوں کے سارے حالات معلوم ہوجائیں اس کے بعد...... اس کے بعد۔

دروازہ زور سے بجا اور سارے خیالات چکنا چور ہوگئے جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ بندو خان صاحب تھے۔ سلام کر کے بولے۔ "وہ حضور اچھے نواب نے سلام کہا ہے۔"

"شیخ صاحب۔"

"جی، بلایا ہے۔"

"خیریت ہے؟"

"بٹیا کی طبیعت بگڑ گئی ہے، آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"رکو۔ چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور جلدی سے متبرک کمبل شانے پر ڈال کر بندو خان کے ساتھ چل پڑا۔ حویلی کے اس حصے میں پہلی بار داخل ہوا تھا قابل دید تھا بندو خان میری رہنمائی کر رہے تھے۔ راستے طے کرتے ہوئے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ مگر ایک کمرے کے سامنے روشنی میں کئی افراد نظر آئے ان میں خواتین بھی تھیں جنہوں نے دوپٹے سر پر ڈال لئے شیخ صاحب کراہتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔

"پھر...... پھر حالت بگڑی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا کیفیت ہے؟"

"آپ کو طلب کیا ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔

"مجھے؟"

"ہاں نام لے کر ...... کہا بلاؤ اس استاد اعظم کو۔ ذرا اس سے بات کر لوں اس کو یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ میں نے پوچھا کسے تو جواب ملا مسعود کو اور میں نے آپ کو بلا بھیجا۔"

"خوب مجھے انتظار تھا آیئے۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا حسین خوابگاہ تھی۔ ایک تپائی پر مہر النساء بیٹھی ہوئی تھی۔ دراز گھنے سیاہ بال چھتری کی طرح کھلے ہوئے تھے دروازے کی طرف پشت تھی اور رخ دوسری طرف تھا لیکن اچانک گردن گھومی اور چہرہ مڑ کر پیچھے ہو گیا۔ بڑا خوفناک انداز تھا یعنی جسم کا رخ دوسری طرف تھا اور چہرہ مکمل میری طرف، مہر النساء کو شام کو بھی دیکھا تھا۔ سبک اور ملیح چہرہ چمپئی رنگ، نرم و نازک نقوش، گہری سیاہ آنکھیں لیکن اس وقت جو چہرہ نظر آیا یہ شام والا چہرہ نہیں تھا۔ خدوخال بگڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں شرربار تھیں اور ان میں نیلاہٹیں جگمگا رہی تھیں رنگ میں تپش تھی۔

"السلام علیکم ......" میں نے کہا۔ مگر وہ مجھے گھورتی رہی، میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"والدین نے سلام کا جواب دینا بھی نہیں سکھایا۔"

"وعلیکم السلام" ایک کرخت مردانہ آواز مہر النساء کے منہ سے ابھری میں مسکرا دیا۔ پھر میں نے کہا۔

"جب ہم ایک دوسرے کی سلامتی کے خواہاں ہیں تو دشمنی کا تصور تو خود بخود مٹ جاتا ہے۔"

"اس دشمنی کی داغ بیل تو تم ڈال رہے ہو۔"

"میں نے تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔"

"یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہی مطالبہ میرا ہے۔"

"تم کون ہوتے ہو۔" وہ مردانہ آواز میں بولی۔

"بندۂ خدا ہوں اور اس بچی کو مشکل سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"سوچ لو۔"

"سوچنا تو تمہیں ہے غلام جلال، مسلمان کے بیٹے ہو، سب کچھ جانتے ہو تمہیں علم ہے کہ وہ بچپن سے ایک نوجوان سے منسوب ہے۔ نیک والدین کی نیک اولاد ہے اور اس تصوّر سے دور نہیں ہو سکتی جو بچپن سے اس کے ذہن میں ہے۔ تم اسے کیوں پریشان کر رہے ہو۔"

"بہت کم وقت رہ گیا ہے جب اس کے دل میں میرے سوا کوئی تصوّر نہیں ہو گا۔"

"یہ تصوّر نہیں تسلط کہلائے گا اور اس سے ایک خاندان بدترین المیے کا شکار ہو جائے گا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"یہ بات شرافت کے منافی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہو۔"

"میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔"

"نہ مانوں تو۔"

"خود ذمہ دار ہو گے تم نے مجھے بلایا ہے اور اب جب میرا اور تمہارا آمنا سامنا ہو گیا ہے تو پھر فیصلہ ہی ہو جانا چاہئے۔"

"میں تمہیں فنا کر دوں گا۔"

"یہ الفاظ کفر کے مترادف ہے۔ آؤ ذرا تمہاری قوت کا جائزہ لیا جائے۔" میں آگے بڑھا اور میں نے مہر النساء کے چھتری کی طرح بکھرے ہوئے بالوں کا کچھ حصہ اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ شیخ صاحب کے ساتھ کچھ دوسری چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ نجانے کون اندر آ گیا تھا مگر میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں نے شانے پر پڑا کمبل مہر النساء پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی مہر النساء تپائی سے نیچے آ رہی مگر فوراً ہی کمبل کے ایک کھلے ہوئے حصے سے ایک کالے ناگ کا پھن برآمد ہوا اور وہ برق کی تیزی سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے پھن اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا مگر میں غافل نہیں تھا۔ میں نے پینترہ بدل کر ایک زوردار تھپڑ اس پھن پر رسید کیا اور سانپ اچھل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ کمرے میں ڈری ڈری چیخیں ابھر رہی تھیں۔ سانپ ایک لمحے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر وہ ادھر اُدھر رینگنے لگا جیسے نکل بھاگنے کی راہ تلاش کر رہا ہو۔ میری نظر اس کھلی کھڑکی پر پڑی جو کمرے کی پشت پر تھی اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ سانپ دیوار سے ٹکریں مار رہا تھا، جیسے اسے نظر نہ آ رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کھلی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اسے پھینکتے ہوئے میں نے کہا۔

"بہتر یہ ہو گا غلام جلال کہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس میں میرا ذمہ نہیں ہو گا۔ " میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کئے اور واپس پلٹا۔ پھر میں نے کمبل سمیٹ کر تہہ کیا اسے شانے پر ڈال لیا۔ مہر النساء بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " انہیں مسہری پر لٹا دیں۔ " میری ہدایت کی تعمیل کی گئی۔ عورتیں کمرے میں رہ گئیں۔ شیخ صاحب میرے ساتھ باہر نکل آئے ان کا بدن کپکپا رہا تھا اور منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ "خود کو سنبھالئے شیخ صاحب۔ "

" آپ مسعود شاہ صاحب۔ آپ تو میرے لئے امداد غیبی ثابت ہوئے۔ سخت شرمسار ہوں کہ آپ کو وہ مقام نہ دے سکا جو ہونا چاہئے تھا۔ آہ میں آپ کو آپ کے شایان شان تعظیم نہ دے سکا"۔ شیخ صاحب نے کہا۔

"گنہگار نہ کریں شیخ صاحب۔ مجھے اور کیا درکار تھا۔ بڑی عزت دی ہے آپ نے مجھے اللہ آپ کو عزت بخشے"۔

" آپ اس کا نام بھی جانتے تھے شاہ صاحب وہ کون تھا اور ...... ؟"

"ابھی خاموشی اختیار کریں۔ جوانی سرکش ہوتی ہے اگر اس نے مزید سرکشی کی تو اسے نقصان پہنچانا پڑے گا لیکن آپ اطمینان رکھیں ہم فیصلہ کر کے ہی واپس جائیں گے ! اجازت ہے"۔ شیخ صاحب میرے ساتھ اٹھنے لگے تو میں نے انہیں روک دیا اور خود باہر نکل کر خاموشی سے مہمان خانے کی طرف چل پڑا۔ مجھے یہی کرنا تھا اور اسی کی ہدایت کی گئی تھی مجھے۔ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب تک لیٹا اس بارے میں سوچتا رہا۔ غلام جلال کا نام بھی مجھے بتایا گیا تھا ورنہ میں اُس بیچارے کو کیا جانتا البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کے بعد غلام جلال کا قدم کیا ہو گا۔ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں شاید کامیاب ہو گیا تھا مگر یہ رات سونے کے لئے نہیں پھر دروازہ بجایا گیا تھا۔ دروازہ کھولا تو اندھیرے میں کوئی کھڑا نظر آیا لیکن جو کوئی بھی تھا کالی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ میں اسے پہچان نہ پایا کہ اس کی آواز ابھری۔

" پیرو مرشد، میں الیاس خان ہوں۔ "

"الیاس خان، اندر آجاؤ۔ " میں نے کہا اور الیاس خان اندر داخل ہوتے ہی جھک کر میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

"معاف کر دیں مرشد، معاف کر دیں۔ شاہ صاحب بڑی گستاخیاں کی ہیں آپ کی شان میں معاف کر دیں، آپ تو اللہ والے ہیں۔ میں نے بڑی بدتمیزی کی آپ سے۔ "

" خدا کے بندے اٹھو، کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہو، کیا ہو گیا تمہیں۔ "

" مجھے وہ مل گیا جو آپ نے بتایا تھا دلدّر دور ہو گئے میرے تو ...... بڑا مقروض تھا مرشد عزت پر بنی ہوئی تھی قرض خواہوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ اب آپ کی عنایت سے عزت سے جی سکوں گا اتنا عاجز آگیا تھا اپنی بد اعمالیوں کے نتیجے میں چڑھ جانے والے قرض سے کہ دو ہی صورتیں رہ گئی تھیں میرے لئے ۔۔۔

تروں یا خودکشی مگر مرشد، آہ آپ کتنے رحم دل ہیں میری بدتمیزی کو نظر انداز کر کے آپ نے مجھے نئی زندگی دیدی۔ " الیاس خان کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا نہ وہ تیکھا پن تھا نہ اکڑ فوں مجسم نیاز بنا ہوا تھا۔

"چلو تمہارا کام بن گیا۔ ہمیں بھی خوشی ہوئی مگر ہماری وہ شرط قائم ہے"۔

"حضور میرے ساتھ ہی الہٰ آباد چلئے. غلاموں کی طرح خدمت کروں گا۔ سارے کام کروں گا جو آپ حکم دیں گے۔ "

"ہمیں بس اپنا پتہ بتا دو۔ ہم آئیں گے تمہارے پاس، ابھی یہاں کام ہے۔ "

"آپ مجھے بس حکم دیدیں خود لینے آجاؤں گا دوبارہ آپ کہیں تو ریاض صاحب کی بھی خدمت کروں"

"جو تمہارا دل چاہے کرنا، ہمیں پتہ بتا دو۔ " میں نے ہنس کر کہا اور الیاس خان نے مجھے الہٰ آباد میں اپنا پتہ ذہن نشین کروایا اس کے بعد وہ نہ جانے کیا اول فول بکتا رہا تھا, بمشکل تمام ٹلا۔ صبح کو جا رہا تھا۔ یہ سونا چاندی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ انسان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما کر دیتی ہے۔

سورج کی کرنوں نے پپوٹے چیرنے شروع کر دیئے۔ نیند ایسی ٹوٹی تھی کہ آنکھ کھولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دفعتہً ہی حواس جاگے اور ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ دل ہی دل میں لاحول پڑھتا ہوا اٹھ گیا۔ نہ جانے آنکھ کیوں نہیں کھلی تھی۔ غسل خانے جا کر وضو کیا اور قضا پڑھنے بیٹھ گیا۔ غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ جائے نماز بچھانے سے پہلے دروازہ کھول دینا چاہئے تھا۔ نماز شروع ہی کی تھی کہ دروازہ بجایا جانے لگا۔ جو شخص بھی دروازہ بجا رہا تھا نہایت احمق تھا اسے جواب نہ ملنے پر رکنا چاہئے تھا مگر وہ ہاتھ ہٹانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سخت غصہ آیا مگر کیا کرتا۔ خدا خدا کر کے سلام پھیرا اور غصے سے دروازہ کی طرف بڑھا اندازہ ہو گیا تھا کہ فتح محمد کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

" شکر اللہ کا زندہ ہو۔ ہمیں تو اندیشہ ہو گیا تھا کہ چل بسے۔ اماں کیا ازار بند نکل گیا تھا؟"۔

" فتح محمد تم نہایت بے وقوف انسان ہو۔ "

"لو اول لو اماں بھائی جی یہ تو سب ہی کہتے ہیں تم نے کونسی نئی کہی، کچھ خبر بھی ہے بسنت کی؟"

"کیا ہوا بندۂ خدا ؟ "

" بھائی پھوٹ لئے نہار منہ، خبر دینے آئے ہیں۔ "

" کون ؟"

"الیاس خان، منہ اندھیرے بستر بغل میں دبا کر نکل لئے، اللہ خیر کرے اچھے نواب کو دبی زبان سے بتا تو دیا ہے کچھ بولے نہیں بس اتنا کہا کہ فتح محمد انہیں جانا تھا مگر قسم اللہ کی دال میں کچھ کالا ضرور ہے ورنہ وہ .... دو دن پہلے سے کہتے ہیں جانا ہے۔ ناشتے کے بعد جانے کا فیصلہ کرتے ہیں پھر سوچتے ہیں کھا کر جائیں گے۔ مگر اس مرتبہ تو وہ چپ چاپ نکل لئے۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ "

"کیا دال میں کالا ہے ؟"

"اماں کچھ ہاتھ لگ گیا، لے کر نکل لئے بھائی کی سسرال کا مال سمجھ کے۔ "

"کیا تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں فتح ! " میں نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"اماں تو کونسی کسی غیر سے کر رہے ہیں تم اتنے شریف آدمی ہو کہ دل کی کہہ لیتے ہیں۔ پر ایک بات ہے میاں، غریب کا کوئی نہیں ہوتا گھٹنے پیٹ کی طرف ہی مڑتے ہیں۔ کل تم نے بھی انہیں سٹے کا نمبر بتاتے ہوئے ہمیں بھگا دیا اماں ان کی کیا ہے خود بھی گھر کے کھاتے پیتے ہیں اور پھر ادھر اُدھر سے مارتے کھاتے رہتے ہیں، اماں بھائی میاں ہمیں بھی کچھ دیدو بڑے غریب آدمی ہیں بال بچوں کو دعا دیں گے۔"

"میں نے انہیں سٹے کا نمبر نہیں دیا فتح محمد!" میں نے کہا۔

"اماں ہم سے اڑ رہے ہو۔ اڑتے کبوتر کے پر گن لیتے ہیں، ہم بھی تاڑ میں لگے رہے تھے ان کی رات کو برگد کی جڑ میں تعویذ گاڑتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا ہم نے۔"

"تعویذ گاڑتے ہوئے.........؟" میں حیرت سے بولا۔

"قسم اللہ کی برگد کی جڑ میں گڑھا کھود رہے تھے۔ پھر برابر بھی کر دیا۔ جب چلے گئے تو ہم نے قریب جاکر بھی دیکھا مٹی برابر کی گئی تھی۔ تعویذ کی بات نہ ہوتی تو کھود کر دیکھتے۔"

"اوہ۔" میں نے گہری سانس لی بات سمجھ میں آ گئی تھی باہر سے آواز آئی۔

"فتح محمد او فتے لگ گئے باتیں بنانے میں۔"

"لو وہ آ گئے نصیحت علی خان، اب نصیحتیں کریں گے۔"

"اماں آ رہا ہوں بندو خان پوچھ رہا تھا کہ.............."

"ناشتے کی پوچھنے آئے تھے تم..............اور یہاں جم گئے..............لو چلو ناشتہ رکھو سنبھال کر۔" بندو خان خود ناشتے کی ٹرے لے آئے تھے۔ فتح محمد نے جلدی سے ٹرے سنبھال لی۔

"ناشتے کے بعد رحیم الدین کے پاس چلے جانا۔"

"اور کچھ.............؟" فتح محمد نے پوچھا۔

"اور یہ کہ میاں صاحب کا بھیجہ مت کھایا کرو۔"

"بہت بڑھ چڑھ کر بولنے لگے ہو بندو خان صاحب..............برابر کے عہدے ہیں ہمارے تمہارے۔ حکم مت چلایا کرو میرے پر..............!"

"عہدے برابر ہیں فتح محمد، مگر عمر تم سے زیادہ ہے سمجھے۔" بندو خان مسکرا کر بولے اور پھر کہنے لگے۔

"اچھا یوں کرو تم میاں کو ناشتہ کراؤ، میں رحیم الدین کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اچھا چلتا ہوں۔" بندو خان مسکرا کر باہر نکل گئے۔ فتح محمد نے ٹیڑھی گردن کی، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور اس کے بعد میرے لئے ناشتہ لگانے لگا۔ میں نے اسے بھی ناشتے کی پیشکش کی تو وہ کہنے لگا۔

"نہیں میاں صاحب، آپ کر لو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں پوچھا، مگر شکایت کیا کرتے رہیں گے غریب آدمی کی بھی سننی چاہئے، اصل ضرورت ہماری ہے ان کا کیا ہے، سٹہ لگائیں گے مال کمائیں گے، عیاشی کریں گے، یہاں تو بارہ بچوں کا معاملہ ہے۔" میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا پھر میں نے کہا۔

"برتن لے جاؤ.............." وہ شاید مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا، برتن اٹھا کر باہر

نکل گیا۔ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا اور اس کے بعد خود بھی باہر نکل آیا۔

حویلی کے ملازم اپنے کاموں میں مصروف تھے، مالی کیاریاں درست کر رہا تھا، دوسرے لوگ ادھر اُدھر آ جا رہے تھے صفائی کرنے والا، صفائی کر رہا تھا، میں ٹہلتا ہوا دور تک نکل آیا اور اتفاق سے ہی اس وقت برگد کے اسی درخت کے قریب پہنچ گیا جس کی جڑ سے الیاس خان کا کام بنا تھا، یونہی نگاہ اس کی جڑ پر جا پڑی اور بس، قدرت نے یہ عطیہ عطا فرما دیا تھا، جس کا احساس اس وقت پھر ہوا، آنکھوں نے ان گہرائیوں میں دیکھا، کلسا غائب تھا لیکن مٹی میں چند اشرفیاں نظر آ رہی تھیں۔ دس بارہ سے کم نہیں ہوں گی۔ فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ وہ اشرفیاں ہیں جو مٹی میں مل جانے کی وجہ سے الیاس خان کو نظر نہیں آسکیں ویسے بھی اس نے یہ کام رات میں کیا تھا اور یقینی امر ہے کہ افراتفری کے عالم میں کیا ہو گا چنانچہ یہ اشرفیاں رہ گئیں۔ دل خوش ہو گیا بیچارے فتح محمد کے کام آ سکتی ہیں۔ یہ بتا دوں گا اسے پھر وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر چلا تھا کہ فتح محمد نظر آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا اور وہ بھی مسکراتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ابھی اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چھوٹا آدمی تھا، چھوٹی طبیعت کا مالک، میرے منہ سے الفاظ سنتے ہی پاگل ہو جاتا اور پھر خواہ مخواہ کہانی عام ہو جاتی، دوسروں کو پتہ چلتا تو نجانے کیا کیا قیاس آرائیاں ہوتیں۔ ٹہلتا ہوا حویلی کے عقبی حصے میں جا نکلا اور اس وقت پیچھے سے مہر النساء نور جہاں کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی، دونوں تیز تیز قدموں سے میری طرف آ رہی تھیں، نور جہاں نے مجھے سلام کیا۔ مہر النساء عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، میں بھی رک گیا، سلام کا جواب دے کر میں نے ان دونوں کی خیریت پوچھی اور مہر النساء کہنے لگی۔

"مسعود صاحب، ہم مہمان خانے میں آپ کی قیام گاہ تک گئے تھے، آپ اس طرف چہل قدمی کے لئے نکلے ہوئے تھے۔"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے مہر النساء؟" میں نے پوچھا۔

"بہت عرصے کے بعد میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کر رہی ہوں اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں بھی جینے والوں میں شامل ہوں، مطلب یہی ہے کہ جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی میں صحیح الفاظ میں تو ان لوگوں کو نہیں بتا سکتی تھی لیکن، لیکن زندگی سے بیزار تھی۔ میں آہ کاش میری یہ کیفیت مستقل ہو، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اور اسی لئے آپ کے پاس پہنچی تھی۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے، میری یہی دعا ہے۔"

"اب جبکہ مہر النساء نے آپ کو، آپ کے نام سے مخاطب کیا ہے مسعود صاحب، تو میں بھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی، براہ کرم آپ ہماری گستاخی کا برا نہ مانئے گا، بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ ہماری ہی عمروں کے ہیں، اور اگر ہم آپ کو کسی احترام کے نام سے پکاریں تو بڑا مضحکہ خیز لگے گا۔"

"کوئی حرج نہیں ہے نور جہاں صاحبہ آپ کو میرا نام معلوم ہے، بس اتنا کافی ہے۔ آپ مجھے میرے نام سے پکار لیجئے۔"

"بے حد شکریہ، دراصل مہر النساء چاہتی ہیں کہ اگر آپ کسی بھی طرح یہاں قیام کے لئے کچھ وقت

نکال سکیں تو ان کا خوف دور ہو جائے. مجھ سے باتیں کرتی رہی ہیں اور شیخ صاحب سے بھی انہوں نے کہا ہے اوہو دیکھئے وہ شیخ صاحب آ گئے۔ " نورجہاں ایک دم بولی اور میری نظریں بھی اس جانب اٹھ گئیں، شیخ عبدالقدوس ادھر ہی چلے آ رہے تھے، سلام کر کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگے۔

" یہ اچھا ہوا کہ یہ لڑکیاں خود ہی آپ کے پاس آ گئیں مسعود میاں، کیا انہوں نے اپنا مقصد بتایا آپ کو؟ " " جی جی، مہرالنساء صاحبہ کا کہنا ہے کہ اگر میں یہاں کچھ عرصے قیام کروں تو انکے دل سے خوف نکل جائے گا، لیکن اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے، آپ کے سامنے کچھ حقیقتیں عرض کر دوں، میں بے شک ابھی کچھ وقت یہاں ہوں، لیکن جاؤں گا تو ایک ایسا اطمینان بخش حل چھوڑ جاؤں گا جس کے بعد یہ خطرہ موجود نہ رہے گا، اس سے زیادہ قیام ظاہر ہے کسی بھی طرح میرے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ "

مہرالنساء اور نورجہاں اس اطمینان کے بعد واپس لوٹ گئیں کہ ابھی میں یہاں قیام کروں گا، نورجہاں واقعی بڑی شوخ و شریر تھی نجانے کیا کیا مہرالنساء کے کان میں بدبداتی رہی تھی لیکن مہرالنساء سنجیدہ لڑکی تھی، بہرحال شیخ صاحب بھی چلے گئے اور میں واپس اپنی آرام گاہ میں آ گیا۔ اب یہاں قیام کرنا واقعی ایک مشکل امر تھا، دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا عمل ہو جس کی بنیاد پر مہرالنساء مکمل محفوظ سمجھی جائے اور میں یہاں سے الہ آباد کا رخ کروں، وہاں ہو سکتا ہے ماموں ریاض کے ساتھ امی ابو اور بہن بھی مل جائیں، آہ کیا ایسا ہو سکے گا، کیا میری زندگی میں ایک بار پھر وہی دن لوٹ آئیں گے۔ بس حسرتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا نجانے کیوں تقدیر پر بھروسہ نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے میری لٹی ہوئی دنیا واپس کر دے۔

شام کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں نے خود فتح محمد کو اپنے پاس بلایا اور وہ میرے قریب آ گیا۔ "لگتا ہے فتح محمد کچھ ناراض ہو گئے ہو مجھ سے۔ "

"کیا لے لیں گے میاں جی آپ سے ناراض ہو کر ہم نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ بس شکایت ہے ہمیں تم سے۔" "فتح محمد دیکھو، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ الیاس خان کو میں نے کوئی نمبر وغیرہ نہیں بتایا، وہ وہاں کیا کر رہا تھا، یہ وہ جانتا ہے لیکن میرے علم نے مجھے بتایا ہے کہ برگد کے اسی درخت پر اس کے نیچے نظر آنے والی مٹی سے ڈھکے ہوئے گڑھے میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو تمہارے کام آ سکتی ہے۔ "

"ایں.................. " فتح محمد نے منہ پھاڑ کر کہا۔

"ہاں فتح محمد تم بھی اسی وقت جب الیاس خان نے درخت کی جڑ میں گڑھا کھودا تھا وہاں پہنچنے کے بعد وہ گڑھا کھودنا اس کی مٹی کو اچھی طرح تلاش کر لینا، ممکن ہے تمہیں اس میں کوئی ایسی چیز مل جائے جو تمہارے لئے کار آمد ہو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اگر واقعی کچھ مل جائے تو اسے اپنے پاس پوشیدہ کر کے گڑھا برابر کر دینا سمجھ رہے ہو ناں۔ "

"ابھی چلا جاؤں۔ " فتح محمد نے کہا۔

" ابھی تمہیں وہاں دیکھ لیا جائے گا اور جو کچھ تمہارے ہاتھ لگا وہ اس گھر کے مالکوں کی ملکیت ہو گا تم

اسے اپنے قبضے میں نہیں لے سکو گے۔ "

"اماں تو کیا الیاس کو بھی وہاں کچھ مل گیا تھا؟ " فتح محمد نے پوچھا۔

"اب یہ تو مجھے نہیں معلوم، الیاس خان نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی مگر تم یہ کام احتیاط کے ساتھ کر لینا، بعد میں مجھ سے یہ مت کہنا کہ میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا۔ "

"ارے بھائی میاں تم نے تو دل ہولا دیا ہے قسم اللہ کی، اب میرے کو صبر کیسے آئے گا، اب کیا کروں پیارے بھائی، بب.................. بس خدا جانے رات کس وقت ہو گی۔ "

جاؤ جاؤ سکون سے اپنا کام سرانجام دینا جلد بازی کی تو جو نقصان اٹھاؤ گے اس کے خود ذمہ دار ہو گے"

"نہیں، نہیں میاں صاحب جو آپ نے کہہ دیا ہے وہی کروں گا قسم اللہ کی۔ " فتح محمد نے کہا اور وہاں سے چلا گیا، بس اس کے بعد کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا.................. لیکن یہاں اس حویلی میں گھسے رہنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ رات کو دل میں یہ آئی کہ یہاں دہلی میں جو مقدس مزارات کا شہر ہے کیوں نہ مزارات کی زیارتیں کروں اور کچھ نہیں تو کم از کم دل کو سکون ہی ملے گا۔ زیادہ تو نہیں سن سکا تھا لیکن تھوڑی بہت باتیں کانوں تک پہنچی تھیں کہ دلی میں بڑے بڑے جید بزرگوں کے مزارات ہیں۔ اب مجھے ان تمام چیزوں سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

دوسرے دن صبح معمول کے مطابق جاگا، ناشتہ فتح محمد لایا تھا، آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، زبان بند تھی، چہرے پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس کا مقصد ہے کہ فتح محمد کا کام ہو گیا، اس نے ناشتہ میرے سامنے رکھا، حیرت انگیز طور پر خاموش تھا، میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

"فتح محمد۔ " اور وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"کتنی تھیں؟ " میں نے سوال کیا۔

"تیرہ۔ " وہ بے اختیار بولا اور پھر چونک کر کہنے لگا۔ "کیا میاں صاحب کیا؟ "

"کام ہو جائے گا تمہارا؟ " میں نے پوچھا اور فتح محمد ادھر اُدھر دیکھنے لگا چند لمحات سوچتا رہا پھر جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔

"قسم اللہ کی، زندگی بھر غلام رہوں گا آپ کا میاں صاحب، دن پھیر دیئے آپ نے میرے، معاف کر دیجئے مجھے معاف کر دیجئے، رات کو یہ سوچ رہا تھا بلکہ ساری رات سوچتا رہا تھا کہ آپ سے قبول کر کے ہی نہیں دوں گا چپ لگا جاؤں گا م.................. مگر غلطی تھی گستاخی تھی میری، معاف کر دیجئے۔ "

"ارے فتح محمد ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی بھئی ہم بھلا کس سے کہنے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور تمہارا کام۔ "

"میاں صاحب آپ نے، آپ نے.................. "

"بس بس بیکار باتوں سے گریز کرو، اچھا ہاں ذرا ہمیں یہ بتاؤ یہاں کون کونسے بزرگوں کے مزارات ہیں اور کہاں سے کہاں جانا ہو گا ہمیں..................؟ "

"مزارات! اب لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دلی کی کسی بھی سڑک پر نکل جاؤ کسی چلتے پھرتے

سے پوچھ لو وہ سارے کے سارے مزاروں کے پتے بتادے گا پہلے تو حضرت سلطان جی ہی میں... دربار میں جاؤ، میاں صاحب مزا آجائے گا قسم اللہ کی کیا جگہ ہے۔ " اس کے بعد فتح محمد تمام بزر... نام گنوانے لگا اور میں نے انہیں ذہن نشین کر لیا، فتح محمد بولا۔

"جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ہاں فتح محمد جی چاہتا ہے۔"

تو پھر موٹر نکلوالو شیخ صاحب کی، سارے میں گھمادے گا۔"

"نہیں فتح محمد میں پیدل ہی جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی ہے میاں صاحب۔" فتح محمد بولا۔ آج اس نے ایک بھی فضول بات نہیں کی تھ... میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے پھر ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں وہاں سے باہر نکلا۔... سے کہہ دیا تھا کہ اگر شیخ صاحب پوچھیں تو بتادے کہ میں سیر کرنے نکلا ہوں شام تک واپس آجاؤں ... دہلی کی سڑکوں پر آگیا۔ پتے پوچھتا رہا روایتوں کا شہر تھا وقت کتنا ہی گزر جائے دلی کی قدیم روایتیں کبھی نہیں توڑیں گی۔ اس کی اداؤں میں فرق نہیں آئے گا۔ ایک جگہ رک کر ایک شخص سے حضرت ... الدین اولیا ؒ کے مزار کا پتہ پوچھا اور اس نے حیرت سے منہ کھول دیا۔

"اماں نئے لگتے ہو دلی میں کہیں باہر سے آئے ہو۔"

"یہی بات ہے۔" میں نے جواب دیا اور وہ سر ہی پڑ گیا مجھ سے پوچھے بغیر تانگہ روکا اور مجھے ... ہونے کا اشارہ کیا۔ "کیوں؟"

"اماں آجاؤ تکلف نہ کرو، ہمارے سلطان جی کی زیارت کو آئے ہو چلو ہم پہنچا دیں گے ان ... کنے۔" لاکھ منع کیا نہ مانا۔ تانگہ چل پڑا اور وہ مجھے راستوں کے بارے میں بتانے لگا۔ "یہ ہر کا ... ہے، یہ منکوں والے پیر کا مزار ہے اور یہ نیلی چھتری۔" یہاں سے تانگہ دائیں کو مڑ گیا۔ "یہ بائیں ... والی سڑک ہمایوں کے مقبرے کو جاتی ہے۔" میرے رہنما نے بتایا بالآخر درگاہ شریف پہنچ گئے۔ وہ ... تانگے میں واپس چلا گیا۔ اس کی محبت نے دل پر بڑا اثر کیا تھا اندر داخل ہو گیا۔ زیارت سے دل شاد ہو... فاتحہ خوانی کی اور بہت دیر تک رکا رہا اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ بہرحال آگے بڑھنا تھا۔ وہاں سے ... کوٹلہ، پرانا قلعہ، شیر منڈل پھر مہرولی اور پھر قطب صاحب، دوپہر کا وقت تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی ہو... جھکڑ چل رہے تھے گرمی اور دھوپ کی وجہ سے کوئی نظر نہیں آرہا تھا ہواؤں کے مرغولے ریت کو ... کرتے اور بعض جگہ بھنور کی شکل میں بلند ہوتے اور چکراتے دور نکل جاتے۔ بچپن کی کچھ باتیں یاد ... گئیں۔ اکثر دوپہر کو کھیلنے نکل جاتا تھا ایسے ہی جھکڑ چل رہے ہوتے اماں دیکھ لیتیں تو کہتیں۔

"ایسی دوپہر میں گھر سے نہ نکلا کرو چمرباؤ لے اٹھا لے جاتے ہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا تو ماں نے مجھے چمرباؤ لے دکھائے۔ ہوا کے بھنور جو ریت کو ... کرتے ہوئے انسانوں کی طرح چلتے نظر آتے تھے۔ "ان میں کیا ہوتا ہے۔"

"جنوں کی سواری جن ان پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے ہیں اور اگر کوئی ان کے راستے میں آجائے تو انہ...

...پٹ کر چلا جاتا ہے اور جن اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔" بچپن کی باتیں شاید عمر کے آخری حصے تک ...یاد رہتی ہیں اور انہیں بھلانا ناممکن ہوتا ہے۔ ان بگولوں کو دیکھ کر دل میں وہی خوف طاری ہو گیا جو بچپن ...ہو جایا کرتا تھا اس خوف میں بھی ایک لذت کا احساس ہوا۔ ماں یاد آگئی تھی اور یہ یاد تو ایک ایسی کیفیت اختیار کر چکی تھی جسے الفاظ میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک چمرباؤ لے کی زد میں آگیا۔ اچانک ہی ہوا کا ایک زور دار جھکڑ عقب میں نمودار ہوا۔ اس جھکڑ نے ایک وسیع دائرے کی شکل اختیار کر لی۔ گہری اور گاڑھی مٹی کئی فٹ اونچی بلند ہوئی اور چکراتی ہوئی اس برق رفتاری سے میری جانب بڑھی کہ میں اس کی لپیٹ سے نہ نکل سکا۔ یوں لگا جیسے زمین سے پاؤں اکھڑ گئے ہوں۔ بڑا شدید دباؤ تھا ہوا کا۔ میں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور تیز ہواؤں کا یہ زور دار جھکڑ مجھے زمین سے بلند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام محسوسات جاگ رہے تھے اور کسی بھی قسم کے وہم کا گمان نہیں تھا بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب زمین پر گرا تب گرا.......... سنبھلنے کی کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ ہوا کا یہ جھکڑ پلک جھپکتے مجھے میری جگہ سے کافی دور لے گیا اور اس کے بعد میں گر پڑا۔ گھٹنوں میں چوٹ لگی تھی باریک باریک پتھروں کے ٹکڑے ہتھیلیوں میں چبھ گئے تھے اور میں گرد کی وجہ سے آنکھوں میں کڑواہٹ محسوس کر رہا تھا ہوا کا یہ تیز جھکڑ مجھ پر سے گزر گیا۔ کئی فٹ دور لا پھینکا تھا اور اب وہ مجھ سے آگے نکل گیا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مٹی چبھنے لگی۔ بمشکل تمام شانے سے کمبل اتار کر ایک سمت رکھا اور قمیض کے دامن سے آنکھیں صاف کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں اس قابل ہوئی تھیں کہ زمین نظر آسکے۔ مسکراہٹ آگئی تھی چہرے پر اور بدستور ماں کی ہدایت یاد کر رہا تھا پھر زمین پر ہاتھ ٹکا کر اپنے آپ کو سنبھالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا لیکن دماغ کو جو خوفناک جھٹکا لگا تھا اس نے آنکھیں تاریک کر دیں۔ جو منظر نظر کے سامنے آیا تھا اس پر یقین کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چند لمحات تک جھنجھناتے ہوئے دماغ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارد گرد کا ماحول دیکھا خدا کی پناہ یہ وہ جگہ ہی نہیں تھی جہاں اب سے چند لمحے پیشتر موجود تھا۔ یہ تو ماحول ہی بدلا ہو تھا۔ لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی ایک انتہائی بوسیدہ اور وسیع عمارت، ٹوٹی پھوٹی دیواریں، بڑے بڑے جھروکے، عجیب سے فصیل نما ستون اور جگہ جگہ لکھوری اینٹوں کے ہیبت ناک ڈھیر، کہیں ٹوٹے ہوئے دروازے تو کہیں محرابیں۔ کہیں چبوترے جو صاف ستھرے اور کشادہ اور کہیں کچھ منبر نما جگہ، ایک بات جو سمجھ میں آئی وہ نگاہوں کا دھوکہ تو ہو نہیں سکتا اور اگر دماغ کی کوئی خرابی ہے تو ان باتوں کو محسوس کرنے کی قوت ذہن میں کیسے موجود ہے۔ لیکن کچھ بھی نہیں تھا۔ جنوں کی سواری گزر رہی تھی اور میری ماں کے کہنے کے مطابق جن مجھے یہاں اٹھا لائے تھے۔ بھلا اس کے علاوہ اور کیا سوچ سکتا تھا۔ بچپن کی حدود سے گزرا تھا اور ماں کی ہدایت پر غور کیا تھا تو یہی سوچا تھا کہ ماں دھوپ سے بچانے کے لئے یہ الفاظ ادا کر کے خوف زدہ کرنا چاہتی ہے تاکہ دھوپ مجھ پر اثر انداز نہ ہو لیکن وہ کہانی اس وقت مجسم تھی۔ چمرباؤلوں میں سفر کرنے والی جنوں کی سواری کے بیچ آگیا تھا اور انہوں نے مجھے یہاں لا پٹخا تھا۔ کیا اسی بات پر یقین کر لوں مگر جگہ کونسی ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ کیا واقعی سچ ہے۔ ایک انوکھا سچ، اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی، اٹھا کمبل احترام سے اٹھا

کر شانے پر ڈالا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ ٹوٹی عمارت کہاں ہے کچھ اندازہ نہ ہو آس پاس ٹوٹی دیواریں جھاڑیاں اور ویران اور ہیبت ناک مناظر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اینٹوں سے بنے ہوئے اس چبوترے کی جانب بڑھ گیا جس کی سیڑھیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے بلندی پر کھڑے ہو کر کچھ اندازہ ہو سکے۔ چبوترے پر پہنچا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دور دور تک ویرانے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے جن میں جگہ جگہ چھدرے درخت سنسان کھڑے ہوئے تھے پھر چبوترے کے ایک گوشے میں ایک کنواں نظر آیا جس کے کنارے اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ وہاں کا ایک ڈول رکھا ہوا تھا اور رسّی کا لچھا بہت بڑا نظر آ رہا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کنواں بہت گہرا ہے لیکن جگہ، یہ جگہ کونسی ہے دفعتہً ہی قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور سمت کا اندازہ کر کے دہشت زدہ اس طرف مڑ گیا۔ تین در ایک ساتھ بنے ہوئے تھے اور ان کی دوسری طرف اندھیرا سا چھایا ہوا تھا طرف کا حصّہ سالم نظر آتا تھا۔

آنے والے انہی دروں سے برآمد ہوئے تھے۔ تینوں دروں سے ایک ایک فرد باہر نکلا تھا شانوں سے لیکر ٹخنوں تک کے سفید لباس میں ملبوس چہروں پر داڑھیاں اور یہ چہرے عام انسانوں جیسے ہی تھے۔ میں ان کے مخصوص لباس سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری یہاں موجودگی سے واقف ہیں اور میرے ہی لئے اندر سے نکل کر آئے ہیں۔ بہرطور انسان تھے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں انہیں دیکھنے لگا اور وہ تینوں قدم بڑھاتے ہوئے میرے نزدیک پہنچ گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہا لیکن میں نے فوراً ہی انہیں سلام کیا تھا۔ سلام کا جواب تینوں نے دیا اور اس کے بعد اس شخص نے جس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہا تھا مدہم لہجے میں کہا۔

"اندر چلو تمہیں طلب کیا گیا ہے۔" میں کچھ اور سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن ان میں سے دو میرے عقب میں آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ سے میرے شانوں کو دھکیلا، خاصا طاقتور دھکا تھا۔ میں قدم آگے بڑھتا چلا گیا اور اس کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ خاموشی سے ان کی ہدایت پر عمل کروں ان کا انداز سخت تھا۔ وہ لوگ مجھے لئے ہوئے درمیان کے بڑے درے سے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں چھت تھی اور یہ جگہ خاصی وسیع تھی، اس کے دوسری جانب ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے روشنی چھن رہی تھی اور یہ روشنی قدرتی تھی اس کا مطلب ہے کہ دوسری طرف بھی کوئی کھلی جگہ موجود ہے۔ وہ لوگ مجھے اسی دروازے کی سمت لے چلے اور پھر میں اس دروازے سے بھی دوسری طرف نکل گیا۔ تب میں نے اس کھنڈر نما عمارت کا وہ صحیح و سالم حصہ دیکھا جو بہت خوبصورتی سے بنا ہوا تھا۔ غالباً عمارت کا بیرونی حصہ ٹوٹ پھوٹ کر تباہ و برباد ہو گیا تھا لیکن یہ اندرونی حصہ بالکل درست تھا اور یہاں بڑے بڑے دروازے نظر آ رہے تھے۔ کچی زمین تھی اور اس پر گھاس اگی ہوئی تھی اسی گھاس سے گزار کر مجھے ایک بڑے دروازے تک لایا گیا اور پھر وہاں دونوں آدمی رک گئے۔ البتہ ان میں سے ایک مجھے اسی طرح لئے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ جس پر دری اور چاندنی بچھی ہوئی تھی۔

سامنے ہی ایک بڑا سا گاؤ تکیہ لگائے ہوئے ایک عمر رسید شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر پر صافہ بندھا ہوا تھا، شانوں پر خاص طریقے سے چادر ڈالی گئی تھی، ڈھیلے ڈھالے سفید لباس میں ملبوس براق داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ سرخ و سفید چہرے کے ساتھ بڑی پُر رعب شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں سمت نیم دائرے کی شکل میں دس بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کچھ فاصلے پر ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے مجھے لانے والے نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور اس شخص نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا پھر انگلی سے ایک سمت اشارہ کر دیا مجھے ایک الگ گوشے میں بٹھا دیا گیا۔ لیکن معمر شخص سے میرا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس وسیع و عریض کمرے میں اور بھی دروازے تھے ایک دروازے سے چند افراد اندر داخل ہوئے اور پھر ایک اور دروازے سے جو شخص اندر آیا وہ میرے لئے بڑا حیران کن تھا ایک خوبصورت سی شکل کا نوجوان جس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جس کی تیز نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ معمر شخص کے قریب آ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کے برابر ہی ایک اور کالی داڑھی والا شخص آ کر بیٹھ گیا تھا۔ معمر شخص نے گردن اٹھا کر گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر کالی داڑھی والے شخص کو اور اس کے بعد اس کی آواز ابھری۔

"ثابت جلال اپنے بیٹے غلام جلال سے پوچھو کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس پر غلام جلال نے اپنے آپ کو زخمی کرنے کا الزام لگایا ہے۔" جس شخص کو ثابت جلال کہہ کر پکارا گیا تھا، اس نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر پاس بیٹھے ہوئے نوجوان کو لیکن غلام جلال کا نام سن کر میں خود ہی چونکا تھا میری جس قدر رہنمائی ہوئی تھی اس میں غلام جلال کا نام تو شامل تھا لیکن اس کی صورت سے آشنائی نہ ہو پائی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے ساری حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی دل سے خوف بالکل ختم ہو گیا تھا۔ نوجوان لڑکے نے مجھے گھورتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا۔

"ہاں معزز قاضی صاحب، حقیقت یہی ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے زخمی کیا۔"

"اے شخص تیرا نام کیا ہے ....؟" جس شخص کو قاضی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اور جس کی سفید داڑھی اس کے سینے پر لہرا رہی تھی اس نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"میرا نام مسعود احمد ہے اور میرے والد کا نام محفوظ احمد۔"

"ہم تجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ غلام جلال سے تیرا کیا اختلاف تھا اور اس جھگڑے کی بنیاد کیا تھی کیا تجھے اس بات کا علم تھا کہ غلام جلال ہمارے قبیلے سے ہے اور کیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ ہمارے قبیلے کے کسی نوجوان کو زخمی کرنے کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔"

"معزز قاضی صاحب نہایت احترام کے ساتھ تفصیل عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" میں نے خوش خلقی سے کہا۔

"ملاحظہ فرمایا آپ نے قاضی محترم یہ شخص کتنا سرکش ہے اس کا انداز گفتگو ایسا ہے جیسے یہ ہمیں گردانتا ہی نہ ہو ...." ثابت جلال نے کہا۔

"تمہیں خاموش رہنے کا حکم دیا جاتا ہے ثابت جلال۔" باریش بزرگ نے کہا اور سیاہ داڑھی والا ثابت جلال خاموش ہو گیا۔ باریش بزرگ نے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

"غلام جلال نے ایک ایسی پاکباز لڑکی پر تسلط قائم کر لیا تھا جو بچپن سے ایک نوجوان سے منسوب تھی اور اسے چاہتی تھی اس نے اس کے اہل خاندان کو خوفزدہ کر رکھا تھا اور وہ نیک مسلمان گھرانہ پریشان تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی مگر اس نے مجھے ضرر پہنچانا چاہا اور میں نے اپنے دفاع کے لئے اسے جھٹک دیا یہ سانپ کی شکل میں مجھے ڈسنا چاہتا تھا۔ یہ دیوار سے جا ٹکرایا اور زخمی ہو گیا۔ کیا یہ قصور ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے غلام جلال۔"

"ہاں قاضی محترم۔ وہ دوشیزہ میرے جی کو بھا گئی تھی۔"

"وہ تجھے کہاں ملی تھی؟"

"اسی بوسیدہ حویلی میں یہ حویلی اس کے باپ کی ملکیت ہے وہ چاندنی رات میں کلیلیں کر رہی تھی اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔"

"گویا وہ شیخ عبدالقدوس کی بیٹی ہے"۔

"درست ہے قاضی محترم۔"

"مگر یہ تو گناہِ کبیرہ ہے۔ اول تو شیخ عبدالقدوس ایک دیندار اور خدا ترس انسان ہے۔ مسلمان، سخی اور پابند احکامات الٰہی ہے۔ دوم دوشیزہ نسبت رکھتی ہے۔ تجھے یہ لازم نہ تھا غلام جلال کہ اس پر فریفتہ ہوتا اور اسے گمراہ کرتا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ یہ شخص بے قصور ہے اور جو کچھ ہوا اس میں غلام جلال کی نادانی تھی۔ چنانچہ ثابت جلال تجھ پر لازم ہے کہ اسے ہرجانہ ادا کرے اور وہیں پہنچائے جہاں سے اسے لایا گیا ہے۔"

"قاضی محترم میرا بیٹا غمزدہ ہو جائے گا۔" ثابت جلال نے کہا۔

"تو کیا تو چاہتا ہے کوئی غیر شرعی فیصلہ کیا جائے۔ دوسرے احتجاج پر تو بھی سزا کا حقدار ہو گا۔ تیرا فرض ہے کہ تو اپنے سرکش بیٹے کی نگرانی کرے اگر اسے نافرمانی کا مرتکب پایا گیا تو اس کے لئے سزا موت تجویز کی جائے گی۔"

"قاضی کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔" ثابت جلال نے کہا اور قاضی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ان کے ساتھ بقیہ افراد بھی اٹھ گئے تھے۔ ثابت جلال نے ایک تھیلی ہرجانے کے طور پر مجھے دی جو مجھے لینا پڑی۔ پھر وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ حویلی کے بیرونی صحن میں ایک گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔

"یہ جانتا ہے تجھے کہاں جانا ہے۔ اس پر سوار ہو جا۔" میں نے رکاب پر پاؤں رکھا اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھنا چاہا مگر دوسری سمت جا گرا۔ بڑی خفت ہوئی تھی مگر معاملہ دوسرا ہی تھا جگہ ایک دم بدل گئی تھی۔ وہی دھوپ، وہی ہوائیں، وہی ماحول جہاں سے میں ہواؤں کا قیدی بنا تھا۔ واپس چل پڑا اور شیخ صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔ یہاں کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی آرام گاہ میں آ کر پورے واقعہ پر غور کرنے لگا۔ کیا کچھ عطا ہو گیا تھا مجھے۔ جنوں کی نگری پہنچ گیا تھا۔ ان کی عدالت میں حاضری ہوئی تھی اور مقدمہ جیت گیا تھا۔ جو کچھ ظہور پذیر ہوا تھا اس کے بعد مہرالنساء بالکل محفوظ ہو گئی

تھی۔ چنانچہ اب شیخ صاحب کی حویلی میں قیام بے معنی تھا۔ یہ لوگ خدشے کے پیش نگاہ مجھے اجازت نہیں دیں گے اور میرے دل کو اب الہ آباد کی لگن لگی ہوئی تھی۔ ثابت جلال نے ہرجانے کی جو تھیلی دی تھی اس میں ضرورت کے لئے بہت کچھ تھا چنانچہ حویلی کے مکینوں سے غائبانہ معذرت کر کے ایک بار پھر وہاں سے نکل آیا۔ کمبل شانے پر موجود تھا لیکن چند جوڑے لباس درکار تھے جو بازار سے خریدے انہیں لا کر ایک سوٹ کیس میں رکھا اور اسٹیشن پہنچ گیا۔ الہ آباد جانے والی ریل کے بارے میں معلوم کیا اور جب ریل آئی تو اس میں بیٹھ گیا اب دل والدین میں الجھ گیا تھا۔ ایک عجیب ہوک اٹھ رہی تھی۔ کانوں میں ان کی آواز بھر رہی تھی۔ ریل میں بہت سے مسافر تھے مگر میں سب سے لاپروا اس وقت اس تصور میں کھویا ہوا تھا۔ آہ کاش الیاس خان نے میرا پیغام ماموں ریاض کو دیدیا ہو۔ آہ کاش وہ اسے مل گئے ہوں۔ نہ جانے یہ سفر کیسے طے ہوا نہ جانے یہ سفر کتنا طویل تھا۔ الہ آباد اسٹیشن کا بورڈ نظر آیا اور میں مختصر سامان سمیٹے نیچے اتر آیا۔ بڑا تاریخی شہر تھا اور زمانۂ طالب علمی میں اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں مگر اس وقت دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اس احساس نے خوف چہرے پر طاری کر دیا تھا کہ ماموں ریاض اسی شہر میں ہیں اور ماں باپ کے بھی یہاں ہونے کے امکانات ہیں۔ آہ کیا انہیں دوبارہ دیکھنا نصیب ہو جائے گا۔ کیا میری تقدیر ایسی ہے۔ باہر تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک تانگے والے سے کہا۔

"حویلی شاہ پور چلو گے۔"

"بیٹھو بھیاجی۔ تین روپے ہوں گے۔" میں تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگہ سفر کرنے لگا۔ کوئی پچاس منٹ کا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ ایک جگہ تانگہ رک گیا۔ "اب کہاں چلوں؟"

"حویلی کہاں ہے ....؟" میں نے پوچھا۔

"کونسی حویلی ....؟"

"حویلی شاہ پور۔"

"یہی محلہ ہے بھیاجی۔ حویلی تو کہیں نہیں ہے۔" تانگے والے نے کہا اور میں نے نیچے اتر کر کرایہ ادا کر دیا۔ گھروں میں دکانیں کھلی ہوئی تھیں ایک دکاندار سے وہ پتہ پوچھا جو الیاس خان نے بتایا تھا۔

"الیاس خان وہ سامنے والے گھر میں رہتا ہے۔" دکاندار نے خوشگواری سے بتایا۔ بڑی صحیح جگہ پہنچا تھا مگر گھر دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا تھا۔ شیخ عبدالقدوس تو بڑے کروفر کے آدمی تھے اور الیاس خان کی بیٹی کا سسرالی رشتے دار، ظاہر ہے شیخ صاحب نے بیٹی کسی معمولی گھر میں تو نہ بیاہ دی ہو گی۔ یہ گھر نہایت معمولی تھا۔ میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھولا۔

"جی فرمائیے ...."

"الیاس خان صاحب یہیں رہتے ہیں ....؟"

"جی ہاں۔"

"میں دہلی سے آیا ہوں، ان کا شناسا ہوں مجھے یہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔ اگر وہ

موجود ہوں تو انہیں بتا دیجئے کہ شیخ عبدالقدوس کے ہاں سے مسعود آیا ہے۔"

"اوہو تم شیخ صاحب کے ہاں سے آئے ہو۔ بیٹا ایک منٹ رکو، ذرا بیٹھک کھول دوں۔"

بزرگ اندر چلے گئے۔ پھر بڑے احترام سے مجھے اندر لے گئے۔ مجھے بٹھا کر بولے۔ "جوتے اتار لو لوٹے میں پانی لے آتا ہوں منہ ہاتھ دھولو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے پہلے کھانا کھائیں گے پھر باتیں ہوں گی۔ آرام سے بیٹھو بیٹے یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"الیاس خان موجود ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مگر آجائے گا۔ اوہو میرا بھی کیسا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ستر سال عمر ہو گئی ہے کیا کر[و]ں بیٹے میں الیاس خان کا باپ ہوں۔ جمال احمد خان ہے میرا نام۔ وہ گیا ہوا ہے آجائے گا۔ ابھی [آتا] ہوں۔" بزرگ باہر نکل گئے کچھ دیر کے بعد لوٹے میں پانی لے آئے۔ میں نے بھی تکلف ختم کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد کھانا آ گیا بزرگ میرے ساتھ خود بھی کھانے میں شریک ہو گئے ارہر کی دال تھی پیاز لیموں کی چٹنی باہر سے گرم گرم روٹیاں آ رہی تھیں۔ دستک ہوتی اور بزرگ اٹھ کر روٹیاں لے لیتے۔ کھانے میں لطف آ گیا۔ پھر جب برتن وغیرہ سمٹ گئے تو بزرگ میرے پاس آ بیٹھے۔

"ہاں میاں صاحب سناؤ دلی کی داستانیں۔ شیخ صاحب کیسے ہیں۔"

"بالکل خیریت سے ہیں میں نے کچھ دن وہاں قیام کیا تھا میرا شیخ صاحب سے کوئی رشتہ نہیں ایک غرض سے وہاں مقیم تھا وہیں الیاس خان صاحب سے شناسائی ہوئی۔ دعوت دے آئے تھے مجھے۔"

"میاں محبتوں کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں تم اتنا فاصلہ طے کر کے یہاں آئے اتنا ہی کافی ہے۔ [ت]و الیاس خان دلی میں موجود تھا ....؟"

"جی ....؟" میں نے بزرگ کو دیکھا۔

"ایں ہاں مجھے پتہ نہیں تھا۔ خیر چھوڑو .... دراصل علیم الدین خان میرے ماموں زاد بھائی ہیں ان کے بیٹے جمیل الدین خان سے شیخ عبدالقدوس کی بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں مگر شیخ صاحب ایسے وضع دار آدمی ہیں کہ بیٹی کی سسرال کے کتے کی بھی عزت کرتے ہیں۔ یہ الیاس ا[سی] حوالے سے وہاں پہنچ جاتا ہے حالانکہ کسی کو زیر بار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اچھا میاں سفر سے تھک گئے ہو گے، آرام کرو سو جاؤ، شام کو باتیں ہوں گی۔ دروازہ چاہو تو اندر سے بند کر لو .... اچھا خدا حافظ"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ یہ کمرہ بھی شاید مہمان خانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کے حالات کا مجھے کچھ اندازہ ان چند باتوں سے ہو گیا تھا۔ حالانکہ شیخ صاحب کی حویلی میں کچھ اور ہی سنا تھا الیاس خان کے بارے میں مگر وہ نوکروں کی بات تھی جو بس اتنا جانتے ہوں گے کہ الیاس خاص بڑی بیٹا کے سسرال والے ہیں مگر الیاس خان .... وہ جو کچھ لایا ہے وہ اس گھر کی تقدیر بدل سکتا ہے اس نے آغاز کیوں نہیں کیا۔ الیاس رات کے کھانے پر بھی نہیں تھا۔ بزرگ شرمندہ نظر آتے تھے۔ میرے اصرار پر انہوں نے بتایا۔

"بس میاں تقدیر کا کھوٹا ہوں...... بری صحبتوں میں رہتا ہے وہ۔ حالانکہ میرا اکیلا بیٹا ہے ایک بہن ہے اس کی جو ہماری غربت کا شکار ہو کر کنواری بیٹھی ہے۔ مگر وہ توجہ نہیں دیتا۔ الا خانے ہیں بر[ے]

دستوں کی صحبت ہے اور......"

مجھے بیحد افسوس ہوا تھا میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ بزرگ سے کچھ نہ کہا رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور پھر الیاس خان اندر داخل ہو گیا۔ نشے میں دھت تھا قدم لڑکھڑا رہے تھے چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"پیرو مرشد آپ آ گئے میرے مرشد......" وہ میرے پاؤں چومنے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔

"تم اتنے گرے ہوئے ہو الیاس خان، ایک بوڑھے باپ کے بیٹے، ایک جوان بہن کے بھائی ہو کر تمہیں شرم نہیں آتی۔ وہ کہاں ہے جو تمہیں ملا تھا۔"

"آپ نے میری تقدیر بنا دی ہے۔ میرے عزت بنا دی ہے۔ ایک بار پھر لوگ مجھے جھک جھک کر سلام کرنے لگے ہیں۔ کملاوتی نے میرے لئے ناچنا شروع کر دیا ہے گلنار مجھ پر جان چھڑکنے لگی ہے۔ پیرو مرشد خوش آمدید..... خوش آمدید۔" وہ نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ اسی وقت بزرگ اندر آ گئے۔

"اسے لے جاؤں مسعود میاں۔ اب یہ صبح ہی کو ہوش میں آئے گا۔" وہ الیاس خان کا بازو پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ مجھے سخت دکھ ہوا تھا۔ اس گھر کی کسمپرسی کا عالم آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ الیاس خان کے چند جملوں سے مکمل صورتحال میرے علم میں آ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اشرفیوں سے بھرا وہ کلسا کہاں گیا۔ دفعتہً ہی مجھے ایک عجیب احساس ہوا ایک فاش غلطی کا احساس، برگد کی جڑ میں مدفون وہ خزانہ مجھے نظر آیا تھا اس کی کہانی بھی مجھے پتہ چل گئی تھی۔ لیکن وہ خزانہ میری ملکیت کہاں سے ہو گیا۔ مجھے یہ حق کہاں تھا کہ میں اسے اپنی مرضی سے کسی کو دیدوں۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ یہ کہاں استعمال ہو گا پھر الیاس خان کی شخصیت کسی حد تک میرے علم میں آ گئی تھی جو شخص سٹہ کھیلتا ہو وہ اچھا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارے تو مجھے اندازہ ہو جانا چاہئے تھا مگر میں نے یہ سب سوچے سمجھے بغیر اسے کلسے کا پتہ بتا دیا۔ صرف اس لئے کہ میری اس سے ذاتی غرض تھی۔ میں اس کے ذریعے ماموں ریاض کا پتہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم اس سنگین غلطی کا احساس ہوا تھا یہ تو...... یہ تو بالکل غیر مناسب بات تھی۔ مجھے بے اختیار ہو کر یہ قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ دل بڑا بے چین رہا۔ رات سکون سے سو نہ سکا۔ علی الصباح جاگ گیا۔ نماز پڑھی اس دوران جمال احمد خان صاحب وہاں آ گئے۔ مجھے دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

"نماز پابندی سے پڑھتے ہو بیٹے؟"

"کوشش کرتا ہوں محترم۔"

"اللہ قبول کرے۔ جوانی کی عبادت قبول ہوتی ہے نیک والدین کی اولاد ہو۔ ہم اس خوشی سے محروم ہیں ہمارے صاحب زادے خراٹے بھر رہے ہیں۔"

"ایک نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں محترم انکار نہ کیجئے گا۔" میں نے کہا اور ہرجانے کی تھیلی سے مٹھی بھر اشرفیاں نکال کر انہیں پیش کر دیں۔ باقی اس لئے رہنے دی تھیں کہ مجھے ضرورت تھی۔

"یہ کیا ہے......!" بزرگ لرز کر بولے۔

"ایک ناچیز کا نذرانہ...... اپنی بہن کے لئے آپ کے بوجھ میں حصہ بٹانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے ہمارا تو صحیح تعارف بھی نہیں ہے۔ اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔"

"آپ نے فرمایا تھا محبتوں کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں مجھ سے یہ رشتہ توڑ رہے ہیں؟"

"مگر بیٹے......"

"انکار نہ کریں اور انہیں محفوظ رکھیں۔" بڑے جتن کے بعد جمال احمد نے یہ اشرفیاں قبول کی تھیں۔ ہم ناشتہ کر چکے تھے جب الیاس خان کی صورت نظر آئی مجھے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا۔

"رات کو بھی آپ کی خدمت میں حاضری دی تھی مرشد مگر اس وقت......"

وہ باپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"ہوش میں نہ تھے۔" جمال احمد نے کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔

"ساری رات آپ کو خواب میں دیکھتا رہا، اس وقت بھی یہ دیکھتا رہا اس وقت بھی یہ دیکھنے آ گیا تھا کہ رات کی وہ کیفیت بھی تو خواب نہیں تھی۔ مرشد آپ کے آنے سے نئی زندگی ملی ہے مجھے اور میرے دوستوں کو بھی۔ مرشد آپ دیکھئے گا کہ یہاں آپ کا کیسا استقبال ہوتا ہے وہ لوگ تو مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ آپ کو لینے دہلی چلا جائے سب غائبانہ مرید ہو گئے ہیں آپ کے۔"

"کون لوگ......؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"وہ فرید خان، نواب دلبر، رحمت یار خان، بڑی مشکل سے باز رکھا اور یقین دلایا کہ مرشد یہاں ضرور آئیں گے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور اللہ والے جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔"

"تم نے سب کو بتا دیا ہمارے بارے میں......"

"وہ میرے بہترین دوست ہیں مرشد...... آپ نے کیا میرے ابا کو اس دولت کے بارے میں بتا دیا جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔"

"نہیں......" میں نے افسردگی سے کہا۔ یہ ساری باتیں سن کر مجھے افسوس ہو رہا تھا سب کچھ میری حماقت کے سبب ہوا۔ میں نے کہا۔ "تم نے میرا کام بھی کیا الیاس خان۔"

"بھلا بھول سکتا تھا۔"

"ماموں ریاض ملے......؟"

"منشی ریاض آپ کے ماموں ہیں۔"

"ہاں......" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہاں وہ مل گئے۔"

"میرے بارے میں انہیں بتایا؟" میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

"آپ کا پیغام دے [illegible] میں......"

"کچھ بولے...... کچھ کہا انہوں......؟"

"نہیں۔" خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "اچھا۔"

"اچھا......؟" میں حیران رہ گیا۔ "اور کچھ نہیں کہا انہوں نے، کچھ خوشی نہیں ہوئی انہیں اس خبر سے......؟"

"اندازہ تو نہیں ہوتا تھا۔"

"تم نے انہیں سب کچھ بتایا تھا جو میں نے کہا تھا۔"

"من و عن......؟" الیاس خان نے کہا اور میرا دل ڈوبنے لگا ایسا کیوں ہوا اس کی کیا وجہ ہے ماموں ریاض کو کوئی خوشی نہیں ہوئی میرے بارے میں سن کر کیوں آخر کیوں۔

"اس وقت وہ کہاں ہوں گے......"

"فرید خان کے ساتھ ہی ملیں گے۔"

"مجھے وہاں لے چلو الیاس خان مجھے فوراً وہاں لے چلو۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"بس ذرا ناشتہ کر لوں اتنی دیر میں آپ تیار ہو جایئے۔" الیاس خان بولا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ایک ایک لمحہ شاق گزر رہا تھا۔ ہزاروں پریشان کن خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ آہ کیا ہوا ہے ایسا کیوں ہوا ہے کچھ دیر کے بعد الیاس خان تیار ہو کر آ گیا اور میں اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ماموں ریاض مجھ سے اس قدر بے گانہ ہو گئے۔ انہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی میرے بارے میں سن کر۔ کیوں کیا انہیں الیاس خان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ یا پھر وہ لوگ۔ میری وجہ سے اس قدر پریشان ہوئے ہیں کہ ان کے دلوں میں میرا کوئی مقام نہیں رہا وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ کیا امی بھی، ابو بھی اور میری بہنیں۔ حلق میں گولا سا اٹک گیا۔ الیاس خان نے تانگہ روک لیا تھا۔ "آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" الیاس خان نے کہا۔

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ منشی ریاض آپ کے ماموں ہیں۔"

"ہاں بس یونہی۔"

"آپ کا پورا خاندان ہو گا مرشد؟"

"ہاں ہے۔"

"کہاں کے رہنے والے ہیں آپ۔"

"الیاس خان میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور الیاس خان نے گردن ہلا دی۔ تانگہ دوڑ گیا۔ الیاس خان نے تانگے والے کو ایک پتہ بتایا تھا مگر میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ الہ آباد کے گلی کوچے نگاہوں سے گزرتے رہے مگر میں انہیں نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکا دماغ بجھا ہوا تھا۔ دل میں آرزوؤں کی کسک تھی۔ ماں باپ کا احساس ہو رہا تھا وہ یہاں ماموں ریاض کے ساتھ ہیں بھی یا نہیں۔ ویسے امید تو یہی تھی کہ وہ ماموں ریاض کے ساتھ ہونگے۔

ماموں ریاض بچپن ہی سے امی کے ساتھ تھے مشکل حالات میں وہ کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑ گے۔ آہ کاش وہ سب یہاں ہوں۔

بہت فاصلہ طے ہو گیا پھر تانگہ ایک بہت بڑے مکان کے سامنے رکا اور الیاس خان نیچے اتر گیا۔ اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور میں نیچے اتر آیا۔ وسیع و عریض مکان کا احاطہ پکی اینٹوں سے بنا ہوا لکڑی کا بڑا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اندر کی عمارت احاطے کی بلند دیواروں میں چھپی ہوئی تھی۔ دروازہ سے بند نہیں تھا۔ الیاس خان نے اسے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔" آیئے مرشد بے دھڑک آیئے۔ " وہ بولا۔

"کیا یہ فرید خان کا گھر ہے۔ ؟"میں نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ..... یہ نواب دلبر کی حویلی ہے۔ "

"یہاں کیوں آئے ہو۔ "

"سب یہیں ملیں گے۔ "

"ماموں ریاض بھی۔ "

"ہاں۔" وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ میں جھجکتے قدموں سے آگے بڑھا احاطے کی یہ دیوار بعد میں بنوائی گئی تھی۔ اندر کی عمارت بوسیدہ تھی۔ وسیع احاطے میں جگہ جگہ جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے تھے۔ ٹوٹی دیواروں کے ڈھیر نظر آ رہے تھے سامنے ہی ایک بڑا دروازہ تھا جسے کھول کر الیاس خان نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"یہاں خواتین نہیں ہیں.....؟"

"نہیں..... " الیاس خان بولا، ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے کہ ہمیں دو افراد نظر آئے وسیع ہال میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے میز پڑی ہوئی تھی جس پر خالی بوتل اور خالی گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ چونک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے ان دونوں کو بھی پہچان لیا تھا۔ یہ بھی اس وقت موجود تھے جب میں نے ماموں ریاض کو دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے الیاس خان کو دیکھنے لگے۔

"مرشد ہیں۔ " الیاس خان بولا۔

"کون مرشد؟ " ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کمال ہے مرشد کو نہیں جانتے میں نے بتایا تھا تمہیں کہ آنے والے ہیں۔ "

"ارے وہ! وہ! ارے توبہ یہ ہیں وہ۔ معاف کیجئے گا محترم ہم پہچان نہیں سکے تھے۔ " وہ آگے بڑھے اور میرے ہاتھ پکڑ پکڑ کر چومنے لگے۔

"مرشد یہ فرید خان صاحب ہیں اور یہ رحمت یار خان میں نے آپ کو بتایا تھا۔ "

"اوہ ہاں۔ فرید خان صاحب۔ ہمیں منشی ریاض صاحب سے ملنا ہے۔ "

"کام سے گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ملوا دیا جائے گا آپ سے مرشد۔ " فرید خان نے کہا اور "آپ تشریف رکھیئے۔ "

"شکریہ۔ کب تک آجائیں گے۔ " میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہمیں آپ کی آمد کا علم نہیں تھا عالی حضور ورنہ انہیں نہ جانے دیتے چند کاموں سے گئے ہوئے ہیں واپسی میں کچھ دیر لگ جائے گی۔ آپ تشریف رکھیں رحمت تم نواب صاحب کو خبر دیدو۔ " رحمت یار خاموشی سے اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ فرید خان بار بار مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر دو آدمی اندر داخل ہوئے ایک رحمت یار تھا اور دوسرا یقیناً نواب دلبر ہو گا یہ شخص ان سب میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ گہری سرخ آنکھیں، نکیلی مونچھیں بلند و بالا قد مضبوط ہاتھ پاؤں موٹے ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی اس کے دو دانت سونا چڑھے تھے۔

"تو یہ ہیں تمہارے مرشد الیاس خان۔ " نواب دلبر بولے۔

"ہاں یہی ہیں۔ "

"ہمیں تو اب بھی یقین نہیں آیا۔ " وہ بولا۔

"کیا مطلب؟ "

"سکھا پڑھا کر لائے ہو گے کونسا مشکل کام ہے۔ "

"تم لوگوں نے انہیں سمجھایا نہیں پہلے بھی انہوں نے ایسی ہی باتیں کی تھیں برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اب مرشد کے سامنے بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ میری غلطی یہی ہے کہ دوبارہ تم لوگوں کے پاس آگیا اور سب کچھ ایمانداری سے تمہارے حوالے کر دیا۔ "

"نواب دلبر یہ تمہاری زیادتی ہے۔ " رحمت یار بولا اور دلبر نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا زیادتی ہے تو کمی کئے دیتے ہیں مگر بڑے چھوٹے سے ہیں مرشد ابھی تو گلی ڈنڈا کھیلنے کے دن ہیں۔ خیر ہمیں کیا یاروں کا کہنا ہے مان لیتے ہیں امان کچھ خاطر مدارت کر دان کی الیاس خان اندر لے چلو انہیں یہاں چوراہے پر کیوں بٹھا رکھا ہے۔ "

"الیاس خان تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ " میں نے کہا۔

"یہ سب آپ سے ملنا چاہتے تھے مرشد میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آئے تو ان سے ضرور ملاؤں گا۔"

"مگر میں صرف منشی ریاض سے ملنا چاہتا ہوں۔ "

"ان سے بھی مل لینا میاں خان پریشانی کی کیا بات ہے ہم بھی اتنے برے نہیں ہیں۔ " نواب دلبر تمسخرانہ انداز میں بولا۔ مجھے بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ سب کچھ غلط ہوتا جا رہا تھا یہ لوگ برے لوگ معلوم ہوتے تھے اس کا اندازہ مجھے پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ ابتداء ہی سے اندازہ ہو جانا چاہئے تھا وہ مجھے کسی بہتر جگہ نہیں ملے تھے۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر نظر آنے والے لوگ اچھے تو نہیں ہوتے۔ میں اتنا فیاض ہو گیا کہ زیر زمین نظر آنے والا خزانہ الیاس خان کے سپرد کر دیا۔ اپنی ملکیت کی طرح اور پھر۔ آہ بڑی غلطی ہو گئی اس کا احساس تو پہلے ہی ہو گیا تھا۔

"اٹھیے مرشد۔ " الیاس خان نے کہا۔

"میں واپس جانا چاہتا ہوں ماموں ریاض مل جائیں تو بعد میں مجھے ان سے ملا دینا۔ " میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے کہاں میاں خان۔ مہمان آتے اپنی مرضی سے ہیں جاتے میزبان کی مرضی سے ہیں۔ ابے ترا بُر آنکھیں پھاڑ رہے ہو لے چلو انہیں اندر۔ " اس بار نواب دلبر کا لہجہ سخت تھا وہ کھڑے ہو گئے۔

الیاس خان کے انداز میں جھجھک نظر آرہی تھی اس نے کہا۔ ”چلئے مرشد۔“

”گویا تم لوگ میرے ساتھ سختی پر آمادہ ہو۔“

”اماں ہم سے بات کرو خان۔ ہمارا نام ہے دلبر، چھری کا کھیل کھیلتے ہیں اور پکے دوزخی ہیں۔ جنت تو ہمیں ملنے کی نہیں ہے گناہ ہی اتنے کئے ہیں تم جانو ایک قتل کی سزا بھی موت ہے اور دس قتل کی بھی۔ گئے ہوگے سو پچاس گناہ اور کریں گے تو بھی دوزخ میں جائیں گے۔ یہ بیچارے کچے ہیں تم سے ڈر رہے ہیں اٹھو اور اندر چلو ورنہ چھری بھونک دیں گے اور انتڑیاں نکال کر الگنی پر لٹکا دیں گے۔“ اس نے نیفے سے چھری نکال لی۔ مجھے اٹھنا پڑا تھا میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ٹھیک ہے الیاس خان۔“

”آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی مرشد بلکہ ہم تو آپ کو آسمان پر بٹھا دیں گے۔ خلقت آپ کے پاؤں چومے گی۔ آپ دیکھیں تو سہی نواب صاحب آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“ الیاس خان بولا۔

”اور تم ہمیں دھوکا دے کر یہاں مجرموں کے درمیان لے آئے۔ خیر حساب ہو جائے گا بعد میں۔“ میں اٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ اندر آگیا باہر سے برے حال نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے بہت بہتر تھی مجھے کافی اندر ایک کمرے میں لایا گیا یہاں خوب روشنی تھی کچھ قدیم فرنیچر بھی پڑا ہوا تھا نواب دلبر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”ہاں میاں خان، کہانی یہ ہے کہ یہ الیاس خان دلی گیا واپس آیا تو سونے کے ڈھیر لایا تھا۔ ہم لوگ پرانے ساتھی ہیں کبھی اچھے خاندانوں کے تھے مگر وہ پرانی بات ہے۔ وقت نے جو راہ دکھائی وہ دیکھنی پڑی۔ اور جو کرایا کرنا پڑا۔ اب تو ماضی کی ساری باتیں بھول گئے ہیں جہاں سے جو کچھ مل جائے سارے مل کر کھا چلا لیویں ہیں۔ سو جب الیاس خان گنیوں کے توڑے لے کر آیا تو سیدھا ہمارے پاس پہنچا دوستوں میں یہ معاہدہ ہے مگر اس نے کہانی بڑی عجیب سنائی۔ ہمیں تو خیر ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا مگر یہ سب لگو ہوگئے۔ ایسے میاں صاحب مل جائیں تو پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ ہم بھی چپ ہوگئے کہ چلو تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو مگر یہ تمہیں پکڑ ہی لایا بھائی جی پہلے تو یہ بتاؤ کو تم ہو کون۔ تم نے ہمیں شکتی پور میں دیکھا تھا؟“

”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”کہاں“؟

”شکنتا نامی طوائف کے کوٹھے پر“۔

”تم وہاں کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ کر رہا تھا تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔“

”یہی تو کانٹے کی بات ہے یہیں سے تو پول کھلتی ہے ایسے شوقین درویش کہاں ملتے ہیں۔ چلو ماں؛ مگر وہ گنّیاں کہاں سے آئیں کیا سچی مچی تم نے وہ خزانہ بتایا تھا۔“

”ہاں“۔

”تب تو پیارے اور بھی خزانے معلوم ہوں گے تمہیں؟ کیوں؟“۔

”کچھ نہیں معلوم مجھے“۔

”وہ کیسے معلوم ہو گیا جو الیاس خان کو دیا تھا۔“

”تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔“

”گویا شرافت سے کام نہیں نکلے گا تمہاری مرضی ہے میاں خان۔ آؤ ہم تمہیں اپنا خزانہ دکھائیں۔ لے کر آؤ مرشد کو۔“ نواب دلبر نے کہا۔

میری جدوجہد بیکار تھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ایک بار پھر دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ جو کیا ہے اس کا خمیازہ شروع ہوگیا ہے۔ اب نقصانات کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ جانا پڑا۔ بڑی پراسرار حویلی تھی۔ کمرے کے کمرے سب کے سب ویران پڑے تھے۔ ایک کمرے میں قید خانے کا دروزاہ تھا۔ یہ دروازہ ایک الماری کے پیچھے تھا جسے دو آدمیوں نے پوری قوت سے سرکایا تھا۔ تب وہ دروازہ نمودار ہوا تھا۔ الماری سرکانے سے جو جگہ پیدا ہوئی تھی اس میں کواڑ کھلا تھا۔ اور گہری تاریکی تھی۔ رحمت یار خان نے میرا ہاتھ پکڑا الیاس خان نے ماچس نکال کر تیلی جلائی اور مجھے زینہ نظر آگیا جو نیچے جاتا تھا۔ بارہ سیڑھیاں تھی۔ اس کے بعد کوئی لامحدود جگہ جو تاریک پڑی تھی۔ نواب دلبر پہلے ہی نیچے اتر گیا تھا۔ پھر اس نے ایک شمعدان میں لگی لمبی لمبی شمعیں روشن کر دیں۔ شمعدان ایک بلند اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے روشنی پھیل گئی تھی۔ یہاں ایک بیڈ پڑا ہوا تھا اور بید کی کچھ آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں مگر یہ تہہ خانہ وسیع لگتا تھا۔ روشنی بہت دور تک نہیں جارہی تھی۔

”بٹھا دو انہیں!“ دلبر نے کہا اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا دوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ ”تو میاں مرشد۔ اصل بات تو تم ہی جانو ہو بیرہ۔ ہم سے جو کہا گیا ہے ہمیں تو وہی معلوم ہو گا!“

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو نواب دلبر۔“

”زندگی بھر نہیں کیا اب کیا کریں گے۔ مگر تم نیکی کر لو!“

”کیا چاہتے ہو؟“

”خزانہ۔ خزانے۔ سٹے کے نمبر۔ ڈربی کی ریس میں انعام۔ سترہ تاریخ کو بمبئی میں ڈربی ہو رہی ہے۔ گھوڑوں کے نمبر بتاؤ۔ سٹے کے دو چار نمبر بتا دو۔ کوئی خزانہ دبا پایا ہو تو وہ بتا دو۔ ہماری ضرورت پوری ہو جائے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

”منشی ریاض کہاں ہیں؟“

”ان سے بھی ملا دیں گے“

”مجھے ان سے ملا دو۔“

”ہمارا کام ہونے کے بعد۔“

”تمہارا کوئی کام میرے لئے ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”بس وہ خزانہ مجھے زمین میں دفن نظر آگیا تھا، میں نے الیاس خان کو بتا دیا۔“

”زمین میں خزانوں کی کیا کمی ہے۔ تمہیں سیر کرا دیں گے چندا۔ یہاں بڑے بڑے راجوں مہاراجوں کے محل دو محلوں کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ کہیں تو کچھ ملے گا۔ ویسے چندا یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔ ہم بڑے سر پھرے ہیں زمین میں چھپے خزانے دیکھ سکتے ہو تو اس تہہ خانے کے فرش کے نیچے بھی جھانک لینا چار بندوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آجائیں گے تمہیں۔ ان سے لگی ہوئی تھی ہماری گلا دبا کر

یہیں قبرستان بنا دیا سسروں کا۔ پوچھ لینا ان سے ساری رام کہانی سنا دیں گے تمہیں۔ پانچویں تم بھی۔ ہماری نہ مانی تو ویسے بھی تم اللہ والے ہو یہاں دفن ہوگئے تو برکت رہے گی کیا سمجھے؟"

"ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو!"

"مذاق سمجھ رہے ہو میاں صاحب ہماری بات کو۔ چلو تھوڑا سا آرام کرنے دو۔ دو تین دن بعد دیکھیں گے۔"

"نہیں نواب دلبر، ایسے کہیں کام ہوتا ہے۔" الیاس خان بولا۔

"اے رحمت یار۔ یہ الیاس خان کچھ زیادہ ہی بولنے لگا ہے۔ کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں۔ میاں جی گنیوں پر اکڑ رہے ہو تو حساب کتاب کرلو۔ لاکھوں خرچ کر چکا ہوں تم پر۔ تمہیں جو کرنا تھا وہ تم کر چکے اب ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ آؤ۔" نواب دلبر نے سخت لہجے میں کہا اور اس بار الیاس خان کچھ نہ بولا۔ وہ سب سیڑھیاں عبور کر کے باہر نکل گئے اور دروازہ بند ہوگیا۔

میرے بدن میں ٹھنڈی لہریں پیدا ہو رہی تھیں دماغ پر ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ جو کچھ ہوا وہ ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ یہ تو کم ہے اس سے زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ پھل چکھنے کے دور سے گزر رہا تھا کھانے کی اجازت ملی تھی مگر میں نے باغ لٹانے شروع کر دیئے تھے۔ مجھے اس کا حق کہاں پہنچتا تھا۔ غلطی کا احساس تو پہلے ہی ہو چکا تھا نہ جانے کیوں میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب میرا کوئی محاسب نہیں ہے۔ غلطی کی تھی۔ اب کچھ ذہن میں نہیں تھا کچھ بھی نہیں تھا۔ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ شمعیں روشن تھیں لو لرز رہی تھی ماحول بڑا ہولناک ہوگیا تھا آہ۔ الفاظ نہیں تھے میرے پاس۔ اب تو معافی نہیں مانگ سکتا تھا۔ فرش پر لیٹ جانے کو جی چاہا اور میں نے اس پر عمل کر ڈالا۔ تھک گیا تھا۔ شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ دماغ کو خالی کر دیا تھا میں نے۔ اس عالم میں کافی دیر گزر گئی۔ شمعیں آنکھوں کے سامنے تھیں۔ پلکوں پر پیلی روشنی پڑ رہی تھی۔ مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر وہ شمعیں بجھا دیتا۔ اور پھر اندر جیتا جاگتا انسان تھا، اندھیرے سے ڈرتا تھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا شمعدان اٹھایا اور اس وسیع تہہ خانے کے دوسرے گوشے دیکھنے لگا۔ بہت بڑے حصے میں تھا خالی پڑا ہوا تھا سوائے ان چند چیزوں کے فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا تھا اور چار ایسے نشانات صاف مل گئے تھے جس سے نواب دلبر کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی یعنی اس نے چار انسانوں کو ہلاک کر کے یہاں دفن کر دیا تھا۔ مگر میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا وہ کیا اسکی اوقات کیا میں تو خود سے ڈر رہا تھا جو کیا تھا اس سے دہشت زدہ تھا۔

بہت وقت گزر گیا کوئی آواز نہیں تھی۔ احتیاطاً چند شمعیں بجھا دی تھیں۔ بس ایک روشن رہنے دی تھی۔ زیادہ وقت گزارنا پڑا تو تاریکی میں رہنا پڑے گا۔ نواب دلبر تو کئی دن کی بات کر گیا تھا۔ شاید رات ہوگئی۔ تہہ خانے میں اس کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا تھا بس وقت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا فرش سے اٹھ کر بیڈ پر جا لیٹا۔ بستر سے بدبو اٹھ رہی تھی مگر اس پر پڑا رہا۔ پھر اچانک سرسراہٹ سنائی دیں اور میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ نگاہیں دروازے پر ہی تھیں مگر کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ آوازیں سنائیں دیں۔ سمت کا بھی اندازہ ہوگیا پھرتی سے پلٹا اور تاریکی کی عادی آنکھوں نے اس انسانی ہیولے کو دیکھ لیا جو ایک گوشے میں نظر آرہا تھا میں ششدر رہ گیا۔ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا۔ دروازہ بند ہے۔ ہمت کر کے آواز دی۔ "کون ہے۔؟"

"ہم ہیں۔" جواب ملا۔

"کون؟"

"ارے ہم ہیں اور کون۔ تمہارے پاس ہمارا ایک کمبل ہے۔"

"کیا؟" میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔

"ریل میں تھے تم۔ ہمارا کمبل لے گئے تھے۔ واپس نہیں دیا تم نے۔" یہ وہی آواز تھی جس نے کہا تھا۔ "آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کر سویئے۔" اور اس کے بعد کمبل میرے چہرے پر ڈھک دیا تھا۔ کمبل ہٹا تو میں دہلی میں تھا۔ وہی آواز تھی مگر کمبل۔ واقعی میں دیوانہ ہوگیا تھا اپنی لگی میں سب کچھ بھول گیا تھا کمبل میں الیاس خان کے گھر پر ہی چھوڑ آیا تھا اور وہ کمبل۔ وہ تو میری رہنمائی کرتا تھا اسے میں نے ہر لمحہ ساتھ رکھا تھا اس سے مجھے ہمیشہ مدد حاصل ہوئی تھی اس نایاب چیز کو میں اس طرح چھوڑ آیا تھا۔

"ہمارا کمبل واپس دو گے بھائی۔ ہمیں ضرورت ہے۔"

"اس وقت وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"کہاں گیا؟"

"میں اسے وہاں بھول آیا ہوں جہاں میں تھا۔"

"تم ایک اچھے امانت دار نہیں ہو بھائی ارے واہ ہمارا کمبل ہی کھو بیٹھے۔ یہ کوئی بات ہوئی۔"

"معافی کا کوئی راستہ ہے میرے لئے۔ جو غلطی ہوگئی ہے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے کسی طرح؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"راستے مشکل سے ملتے ہیں نظر آجائیں تو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے بھول بھلیاں ہیں سب بھول بھلیاں ہیں سورج تو بڑا روشن ہے ایک دھبے کو سورج سمجھ لینا دانشمندی تو نہیں ہے، جو دانشمند نہیں وہ کچھ نہیں ہے"

"معافی کا کوئی راستہ ہے میرے لئے۔" میں چیخ کر بولا۔

"ارے ہمیں کیا معلوم ہم پر کیوں بگڑ رہے ہو ایک تو ہمارا کمبل کھو دیا اوپر سے بگڑ رہے ہو۔"

"دیکھو، انسان ہوں گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں بہت تھک گیا ہوں بھٹک جاؤں گا مجھے سہارا دو۔ مجھے سہارا چاہئے ورنہ راستہ بھول جاؤں گا۔"

"ہمیں کچھ نہیں معلوم ہمارا کمبل دیدو۔"

"سہارا چاہئے مجھے سہارا چاہئے دیدو۔"

"سہارا دینے کا کام ہمارا نہیں ہمارے بھائی کا ہے۔" انسانی ہیولا غائب ہوگیا۔ مجھ پر دیوانگی سوار ہوگئی تھی۔ جنون طاری ہوگیا تھا میں چیختا رہا مگر اب میری آواز سننے والا کوئی نہیں تھا پھر میں خاموش ہوگیا۔ دماغ بند بند سا ہوگیا تھا میں نے تند نظروں سے چاروں طرف دیکھا آگے بڑھا اکلوتی شمع سے ساری شمعیں روشن کر دیں۔ تبھی میری نظر شمع دان کے اسٹینڈ پر پڑی۔ وزنی فولاد کا بنا ہوا تھا کوئی تین فٹ لمبا اور ٹھوس، شمعدان اس پر سے اتار کر میں نے ایک طرف پھینک دیا۔ وزنی اسٹینڈ اٹھا کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ نیچے گری ہوئی شمعیں روشن تھیں اور مجھے دروازہ نظر آرہا تھا۔ آخری سیڑھی پر کھڑے ہو کر میں نے اسٹینڈ ہاتھوں میں تولا اور بھرپور قوت سے اسے دروازے پر مارا۔ لکڑی تڑخنے کی آواز سنائی دی اور دروازے میں سوراخ ہوگیا۔ میرے ہاتھ مشینی انداز میں چلتے رہے۔ اور تہہ خانے میں

دھماکے گونجتے رہے۔ میں نے دروازے کے پرخچے اڑا دیئے تھے جب اس کے دونوں کواڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تو میں نے اس اسٹینڈ سے الماری پر وار شروع کر دیئے الماری ٹوٹ تو نہیں سکی مگر کھسک ضرور گئی۔ تھوڑی سی جگہ بنی تو میں نے اس میں ہاتھ ڈال کر اسے مزید سرکایا اور اتنی جگہ بنالی کہ باہر نکل آؤں۔ ا... میں باہر نکل آیا۔ اتنے زور دار دھماکے ہوئے تھے اتنی آوازیں ہوئی تھیں مگر ... متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ا... کا مطلب یہ تھا کہ کوئی موجود نہیں ہے اچھا ہی تھا ورنہ نہ جانے میری دیوانگی کہ... تک جاتی۔ راستہ تلاش کرتا باہر نکل آیا آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ خاموش چاندنی تاحد نگاہ بکھری ہوئی تھی۔ لوہے کا اسٹینڈ پھینک دیا دماغ تاریک ہو رہا تھا اس عمارت سے باہر نکل آیا اور آگے بڑھ گیا۔ چلتا رہا بے مقصد کوئی منزل نہیں تھی۔ نہ جانے کونسی قوت سیدھے راستے پر لے آئی چونک کر دیکھا تو الیاس خان کے مکان پر کھڑا تھا یقین نہیں آیا کسی راستے کا تعین نہیں کیا تھا نہ جانے یہاں تک کیسے پہنچا تھا اگر حواس کے عالم میں ہوتا تو راستہ تلاش کرنا ناممکن تھا۔ لیکن بے حواسی رہنما بن گئی تھی اب کیا کروں۔ اس مکان سے میرا کیا واسطہ ہے۔ مجھے اب دوبارہ یہاں نہیں آنا چاہئے مگر یہاں میرا کمبل تھا۔ دوسرا سامان تھا اور پھر الیاس خان۔ آہ کچھ بھی ہو جائے الیاس خان ہی مجھے ماموں ریاض کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے راندۂ درگاہ ہونا پڑا ہے۔ وہ بھی ان کا شریک کار ہے اس نے بدعہدی کی ہے مجھ سے۔ حالانکہ رات بہت ہوگئی تھی مگر دستک دینا پڑی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ جمال احمد خان صاحب تھے چونک کر بولے۔

"ارے بیٹے آپ۔ آجاؤ۔ الیاس کہاں ہے؟"

"گھر نہیں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں"۔

"صبح ہی کے گئے ہوئے ہیں؟"

"ہاں آپ کے ساتھ ہی گیا تھا۔"

"وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ دوستوں نے تو اسے تباہ کیا ہے۔ آؤ میاں اندر آؤ۔ آرام کرو اس کا کیا انتظار کرنا۔" میں اندر داخل ہوگیا۔ مجھے بہرحال اس کا انتظار کرنا تھا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو بیٹے تو بتا دو۔"

"نہیں بے حد شکریہ۔" میں نے کہا اور وہ چلے گئے۔ میں اس کمرے میں داخل ہوگیا جو میری آرام گاہ تھا سب سے پہلے میں اپنے سامان کی طرف لپکا۔ مجھے کمبل کی تلاش تھی مگر۔ کمبل موجود نہیں تھا۔ سارا سامان اسی طرح موجود تھا سوائے کمبل کے کمبل کہاں گیا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کمبل کس نے غائب کر دیا ہوگا کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ اس وقت پوچھ گچھ بھی نہیں کر سکتا تھا بہرحال صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ نیند کا تو اب تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جاگتا رہا، سوچتا رہا۔ رات شاید آخری پہر میں داخل ہوگئی تھی۔ دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔ الیاس خان۔ میرے ذہن میں گونجا۔ اندر سے سارا وجود کھول اٹھا۔ آنکھوں سے شرارے ابل پڑے۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا کہیں اندر اس دستک کو نہ سن لیا جائے، اس سے پہلے ہی الیاس خان کو چھاپ لینا ضروری تھا۔ برق رفتاری سے پاؤں باہر نکلا دروازے تک پہنچ گیا۔ آہستہ سے زنجیر کھولی وہی تھا۔ اس نے اندر قدم رکھا ...

پڑا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرے سے منہ بھینچ لیا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ اور اس طرح دبوچے ہوئے اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ الیاس خان کچھ نہ سمجھ سکا تھا میں نے اسے فرش پر لا پٹخا تھا۔ پوری زندگی میں مجھ پر یہ کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی جو اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ الیاس خان نے پلکیں ٹپٹپا کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔

"تم۔" اس کے منہ سے سرسراہٹ نکلی۔

"ہاں الیاس خان۔ تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں تمہارے قید خانے سے نکل آؤں گا۔"

"نہیں مجھے یقین تھا۔" وہ بولا۔ اور پھر سہارا لے کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں نے ان لوگوں سے بھی کہہ دیا تھا۔"

"تم نے میرا برسوں کا مجاہدہ ختم کر دیا الیاس خان، صرف تم ہو جس نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا۔ نہ جانے کیا کیا جتن کئے تھے میں نے، نہ جانے کیا کیا مگر تم نے الیاس خان تم نے!"

"کچھ کہنا چاہتا ہوں سن لوگے؟" وہ بولا اور میں اسے گھورتا رہا۔ "صدیوں کے بعد جاگا ہوں۔ برسوں کے بعد آنکھ کھلی ہے بے ہوش تھا یا سو گیا تھا تمہاری وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ ایک اور بات سن لو۔ سزا چاہتا ہوں، ہر قیمت پر سزا چاہتا ہوں۔ بدترین سزا بہتر ہے وہ موت ہو۔ تمہارا احسان ہوگا اتنا کچھ کھو چکا ہوں کہ ہوش میں آنے کے بعد جینا مشکل ہوگا۔ بے حد مشکل۔ تمہیں بھلا نہیں رہا۔ یہ سب کچھ کہہ کر رعایت نہیں مانگ رہا بلکہ کچھ سن لو۔ ایک تھکا ہوا بے بس انسان ہوں۔ میرا اختتام ہو چکا ہے آخری باتیں کہہ رہا ہوں تم سے وہ لوگ تمہیں نہیں جانتے مگر میں جانتا ہوں نواب دلبر نے جو کچھ کیا وہ اس کا قدم تھا مجھے اس کی خبر نہیں تھی جو کچھ ہوا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا مگر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوا کو قید نہیں کر سکتے یہ ان کی بھول ہے۔"

"میں فضول کہانیاں نہیں سننا چاہتا الیاس خان۔"

"سن لو۔ خدا کے لئے سن لو۔ اس کے بعد میں مرجانا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو میں خودکشی کرلوں گا دل اکتا گیا ایک دم سے۔ دنیا بہت بری ہے میرے تصوّر سے بھی زیادہ بری۔ میں خود بھی اتنا ہی برا ہوں۔ ایک برے انسان سے دنیا کو چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں۔"

میں الیاس خان کو گھورنے لگا اس کا لہجہ عجیب تھا جیسے۔ جیسے وہ سچ بول رہا ہو، جیسے وہ فریب نہ کر رہا ہو وہ کہنے لگا۔

"جتنی برائیوں کا تصوّر کیا جا سکتا ہے وہ مجھ میں موجود ہیں بوڑھا باپ ہے، جوان بہن ہے مگر میں نے کبھی ان کے بارے میں نہیں سوچا۔ اپنے تعیّشات میں مگن رہا۔ میرے گھر والے فاقے کرتے رہے اور میں اعلیٰ درجے کے کھانے کھاتا رہا میری بہن کے پاس دو جوڑے کپڑے بھی نہ تھے اور میں طوائفوں کو تحفوں سے خوش کرتا رہا یہ سب کچھ کیا ہے میں نے۔ آج تک یہی کیا ہے مگر نہ جانے کیسے ہوش آگیا نہ جانے کیسے۔"

"الیاس خان۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔" میں نے غرا کر کہا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ سسک سسک کر روتے ہوئے بولا۔

"خدا کے لئے مسعود صاحب خدا کے لئے آپ کو اللہ نے بڑا بنایا ہے میری سن لیجئے دل ہلکا کرنا چاہتا ہوں بڑا بوجھ ہے سینے پر۔ آپکے ساتھ جو کچھ ہوا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ نواب دلبر ہم پر حاوی ہے حالانکہ ہم بچپن کے دوست ہیں وہ بگڑا ہو رئیس ہے۔ پہلے اس کے پاس بہت کچھ تھا مگر عیاشیوں میں گنوا

بیٹا ہم تینوں ہمیشہ سے اس کے شریک تھے جب اس کے اپنے پاس سب کچھ ختم ہوگیا تو ہم چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگے۔ جوا، سٹہ کھیلنے لگے ہمیں پیسہ درکار تھا جس کے حصول کے لئے سب کوششیں کرتے تھے ہر وہ جگہ تلاش کرتے تھے جہاں سے کچھ ہاتھ لگ جائے۔ سب یہی کرتے تھے میں اکیلا نہیں تھا۔ میں نے اپنے گھر میں چوری کی، ماں باپ کو رُلایا، میں رشتے داروں سے قرض لیتا رہا، میرے والد ادا کرتے رہے۔ بے چارے شیخ عبدالقدوس صاحب سے بھی میں نے بہت کچھ لیا۔ وہ مجھے صرف اس لئے یہ رقم دیتے رہے کہ میں ان کی بیٹی کا سسرالی رشتے دار تھا۔ ہم سب جو بھی حاصل کرتے اسے یکجا کرکے خرچ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ آپ نے مجھے جو قیمتی خزانہ دیا وہ میں نے لاکر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ دنگ رہ گئے۔ پھر میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتایا مرشد۔ اور وہ بضد ہوگئے کہ آپ کو لینے دلی چلا جائے میں نے انہیں منشی ریاض کے بارے میں بتایا اور یقین دلایا کہ آپ منشی ریاض سے ملنے ضرور آئیں گے۔ اس دن سے سب آپ کا انتظار کر رہے تھے مگر میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ یہ سلوک کرے گا۔ اس نے آپ کو قید کر دیا اور اس وقت میرے ضمیر پر ضرب پڑی۔ مجھے احساس ہوا کہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے کے ساتھ یہ سلوک میری وجہ سے ہوا۔ بعد میں، میں ان سے لڑ گیا میں نے کہا انہوں نے غلطی کی ہے اچھا خاصا جھگڑا ہوگیا ہمارا اور میری آنکھیں اچانک کھل گئیں میں اسی احساس میں ڈوبا ہوا اس وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ راستے بھر میں یہ سوچتا رہا تھا کہ اب کیا کروں کچھ کرنا تو میرے بس میں نہیں ہے مگر خودکشی تو کر سکتا ہوں۔"

میں خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا یہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ یہ تو اللہ جانے مگر اب میں اس کا کیا کروں۔ اب میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں۔ غصہ اتر گیا تھا میں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

"میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی تھی الیاس خان مگر تم نے!"

"مجھے احساس ہے مسعود صاحب۔"

"اگر دل میں واقعی سچائیاں اتر آئی ہیں تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے!"

"تم خودکشی کر لو۔ اس الیاس خان کو ختم کر دو جو برا انسان تھا اسے فنا کر دو ایک باپ کا سہارا بن جاؤ۔ ایک جوان بہن کے محافظ بن جاؤ۔ محنت مزدوری کر کے اس برے انسان کی برائیوں کا کفارہ ادا کر دو۔ خود کو مٹا کر ایک اور گناہ نہ کرو اس بوڑھے شخص کو جوان بیٹے کی موت کا داغ نہ دو جو بے کس ہے بلکہ اس کے ناتواں بدن کو اپنے طاقتور جسم کا سہارا دو۔ ہو سکتا ہے اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔"

وہ گردن جھکائے آنسو بہاتا رہا۔ یہ آنسو مکر کے آنسو نہیں تھے میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اب وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"اسی عمارت میں گئے ہیں۔"

"تم اب تک انہی کے ساتھ تھے؟"

"ہاں ان سے قطع تعلق کر کے آیا ہوں۔"

"وہ یہ تو نہ سوچیں گے کہ تم نے مجھے وہاں سے نکالا ہے؟"

"نہیں میں تو اسی وقت سے ان کے ساتھ تھا مگر میں نے دعویٰ کیا تھا کہ آپ وہاں

گے نواب دلبر ہنسنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی وہیں لے جا رہا تھا مگر میں واپس آگیا۔"

"نواب دلبر تمہارے لئے خطرہ تو نہیں بن جائے گا؟"

"اس میں میرے مقابل آنے کی ہمت نہیں ہے مرشد۔"

"تو پھر میری ہدایت کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"مرشد میں آپ کا مجرم ہوں۔"

"تو اسے میری طرف سے سزا سمجھ کر قبول کر لو!"

"آپ کا دل صاف ہو جائے گا میری طرف سے۔"

"ہاں مگر بعد میں تم مجھ سے سٹے کا نمبر مت مانگ بیٹھنا۔" میں نے کہا۔

"نہیں مرشد۔ حرام کا پیسہ اب میرے لئے حرام ہے۔ میں محنت کی کمائی کر کے اپنے ماں باپ کو کھلاؤں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں مرشد جو کر چکا ہوں وہ اب نہیں کروں گا۔ مرشد میرے حق میں دعا کریں اللہ مجھے زندگی دے تو اسے میرے گناہوں کے کفارے کیلئے وقف کر دے پھر سے گناہوں کی دلدل میں پھنسوں تو مجھے موت دے دے۔" اس کے الفاظ سچائی کا اظہار کر رہے تھے میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب کچھ اور پوچھوں تم سے الیاس خان۔"

"پوچھیں مرشد۔"

"منشی ریاض سے واقعی ملے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔"

"ان سے میرا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں۔"

"اور ان پر وہی رد عمل ہوا تھا جو تم نے بتایا تھا؟"

"بالکل وہی۔"

"وہ فرید خان کے پاس کام کرتے ہیں۔"

"بالکل یہی بات ہے۔"

"مجھے ان سے ملا سکتے ہو۔"

"آپ اسے میری ذمہ داری پر چھوڑ دیں۔ مسعود صاحب میں کل ہی انہیں یہاں لے آؤں گا۔"

"وہ فرید خان کے پاس رہتے ہیں؟"

"نہیں اس کے ساتھ نہیں رہتے۔"

"پھر؟"

"ان کا کوئی اور گھر ہے۔ شام کو چھٹی کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"تم ان کا گھر جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"کل مجھے وہاں پہنچا سکتے ہو جہاں وہ کام کرتے ہیں۔"

"فرید خان کے گھر پر رہتے ہیں وہ۔"

"وہیں سہی۔ "

"مرشد۔ فرید خان کے گھر پر ان سے ملنا درست نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو آپ کے نکل آنے ک پتہ چل چکا ہوگا۔ وہ پاگلوں کی طرح آپ کو تلاش کریں گے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔ "

"کیا..........؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مرشد، میں نے نواب دلبر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ کچھ لینے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا جو اس نے اختیار کیا ہے اس کے لئے آپ کی خدمت کی جاتی۔ آپ کی محبت حاصل کی جاتی۔ مگر اس نے کام ہی دوسرا شروع کر دیا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا اس سے کہ اس کا وہ قید خانہ مرشد کو نہ روک سکے گا اور وہ اپنی روحانی قوتوں سے کام لے کر وہاں سے نکل جائیں گے۔ اس پر فرید خان نے کہا تھا ایسا ہوا تو نواب دلبر کی گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ ہو جائے گا کیونکہ وہ مرشد کو ان چار لاشوں کے بارے میں بتا چکے ہیں جو تہہ خانے میں دفن ہیں اور جنہیں نواب دلبر نے قتل کیا ہے۔ "

"اوہ۔ ہاں۔ " میں چونک پڑا۔

"نواب دلبر اس بات پر پریشان ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ واپس پرانی گڑھی گیا تھا۔ "

"پرانی گڑھی۔ "

"اسی حویلی کا نام ہے وہ رہتا الگ ہے، پرانی گڑھی اس کے پرکھوں کی ملکیت ہے اور جائداد میں بس وہی باقی رہ گئی ہے باقی سب وہ ختم کر چکا ہے۔ ان باتوں کے بعد وہ اٹھ گیا اور اس نے سب سے کہا پرانی گڑھی چلیں کہیں کچھ ہو ہی نہ جائے میں اس سے اختلاف کر کے چلا آیا تھا۔ "

"تب تو اس وقت اس کی جان ہی نکلی ہوئی ہوگی۔ "

"یقیناً مرشد۔ "

"ہوں تو پھر یوں کرنا الیاس خان کہ تم مجھے دور سے فرید خان کا گھر دکھا دینا۔ میں اس وقت منشی ریاض سے ملوں گا جب وہ فرید خان کے گھر سے نکلیں گے۔ اور اپنے گھر جائیں گے۔ "

"جو حکم مرشد۔ مگر آپ خود کو محفوظ رکھیں۔ "

"اطمینان رکھو۔ " میں نے کہا اور الیاس خان نے گردن جھکالی۔ میں نے خود ہی کہا۔ "اور اب تم جاؤ آرام کرو۔ اس نئی زندگی پر سب سے پہلی مبارکباد میں تمہیں پیش کرتا ہوں۔ " وہ ایک بار پھر رو پڑا۔ میرے ہاتھ چومے اور باہر نکل گیا مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ جمال احمد خان کا بڑھاپا سنور جائے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔ دیر تک ان کی خوشیوں کا اندازہ لگاتا رہا پھر آہستہ آہستہ اداسیوں میں ڈوبتا چلا گیا میری خوشیاں کہاں ہیں مجھے خوشیاں کب ملیں گی مجھ پر یہ نحوستیں کب تک طاری رہیں گی وہ میری تقدیر کی صبح کب ہوگی؟ الیاس خان نے کہا تھا کہ منشی ریاض فرید خان کے ساتھ نہیں رہتے ان کا کوئی گھر ہے۔ کوئی گھر ہے۔ اسی گھر میں مجھے میرے ماں باپ اور بہن نظر آئیں گے۔ آہ۔ ماموں ریاض انہی کے لئے تو نوکری کر رہے ہوں گے۔ آہ۔ صبح کب ہوگی، کب صبح ہوگی؟

صبح ہو گئی دروازے سے الیاس خان اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ آنکھیں سرخ اور مغموم تھیں میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جلدی جاگ گئے الیاس خان۔ "

"جی!" وہ آہستہ سے بولا۔

"خیریت۔ "

"جی ہاں ناشتہ کر لیجئے۔"

"آجاؤ۔ " میں نے کہا۔ "تم بھی ناشتہ کر لو۔ "

"میں نے چائے پی لی ہے ابھی کچھ نہیں کھاؤں گا۔ "

"کب چلو گے؟"

"بتادوں گا ابا آ رہے ہیں۔ " وہ بولا اس وقت جمال خان صاحب اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے سرد نگاہوں سے الیاس خان کو دیکھا اور وہ گردن جھکا کر باہر نکل گیا۔

"ناشتہ کریں میاں۔ " جمال خان صاحب بیٹھتے ہوئے بولے اور میں نے ٹرے سامنے سرکالی۔

"آج یہ کوئی ناٹک کر رہا ہے ضرور کوئی چکر ہے۔ " وہ پرخیال انداز میں بولے۔

"کیا بات ہے؟"

"صبح میں جاگا تو یہ وضو کر چکا تھا رات کو کس وقت آیا اور کیسے اندر داخل ہوا پتہ نہیں وضو کے بعد باقاعدہ نماز پڑھی پھر ماں کے پاس جا بیٹھا اور انہیں دیکھتا رہا۔ "

"خوب مگر یہ ناٹک کیسے ہوا؟"

"وہ اور نماز۔ میرے خیال میں تو اسے نماز آتی بھی نہیں بھائی مجھے تو شبہ ہو گیا اور میں نے فوراً احتیاطی تدابیر کر ڈالیں۔ "

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے جو عنایت کی ہے اس نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے سچ جانو بیٹے ہمارے ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے ہیں۔ میری اہلیہ نے تو اتنے سجدے کئے ہیں کہ گنے نہ جاسکیں۔ بیٹی کے چند رشتے ہیں جن پر اس لئے غور نہیں کیا تھا کہ پاس پلے کچھ نہیں تھا ہاں یا نہ کرتے تو کس برتے پر۔ مگر اب مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اسے پتہ نہ چل گیا ہو اس لئے میں نے تمہارے عطیہ کو محفوظ کر دیا۔ "

"میرا ناقص علم کچھ اور کہتا ہے محترم بزرگ۔ "

"کیا؟"

"صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا ہے ایک گزارش بھی ہے آپ سے۔ "

"کیا بیٹے؟"

"وہ اگر نیکیوں کی طرف واپس آئے تو اسے سہارا دیں ماضی کو بھول جائیں اسے طعنہ نہ دیں۔ "

"آہ مجھے اگر بیٹے کا سہارا مل جائے تو۔ تو کاش ایسا ہو جائے۔ " جمال احمد خان آبدیدہ ہو گئے۔ بڑی دیر تک وہ میرے پاس بیٹھے رہے پھر جب اٹھنے لگے تو مجھے اچانک یاد آ گیا۔

"وہ جمال احمد صاحب یہاں ایک کمبل تھا کسی کی امانت ہے وہ نظر نہیں آیا ذرا چچی جان اور بہن سے پوچھیں دھوپ لگانے کو تو نہیں ڈالا۔ "

"کمبل! اچھا پوچھے لیتا ہوں۔ " کچھ دیر کے بعد وہ واپس آئے اور بولے "نہیں میاں کمبل یہاں سے کسی نے نہیں اٹھایا۔ کہاں گیا کہاں جاسکتا ہے۔ " وہ پریشانی سے بولے اور دل ہولنے لگا نہ جانے کمبل کہاں گیا۔ جمال احمد پھر باہر نکل گئے نہ جانے کیسے تفتیش ہوئی مگر کمبل نہیں ملا وہ پریشان اور شرمندہ تھے اور میں۔

الیاس خان نے دوپہر کے کھانے کے بعد تیاری کرلی اس بارے میں میری اس سے بات ہوگئی تھی اور طے ہوگیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے پھر ہم تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ کافی فاصلہ طے ہوا تھا اور پھر خان کا مکان آیا تھا شاندار مکان تھا۔ فرید خان کھاتے پیتے گھر کا فرد تھا۔ منصوبے کے مطابق الیاس خان مجھے چھوڑ کر فرید خان کے مکان میں چلا گیا یہاں اس کا آنا جانا تھا اور چونکہ اس کی ابھی ان لوگوں سے باقاعدہ نہیں ٹھنی تھی اس لئے کوئی مشکل بھی نہیں تھی دس منٹ کے بعد وہ واپس آ گیا۔

”وہ رات سے غائب ہے واپس نہیں آیا یقیناً وہ پرانی گڑھی میں ہونگے اور آپ کے نکل جانے سے خوفزدہ ہوں گے خیر منشی ریاض اندر موجود ہیں کام میں لگے ہوئے ہیں پانچ بجے چھٹی کر کے نکلیں گے۔“

”کچھ کہا تو نہیں تم نے ان سے۔“

”بالکل نہیں آپ نے منع فرمایا تھا۔“

”ہاں یہ اچھا کیا۔“

”اب کیا حکم ہے مرشد۔“

”الیاس خان تم واپس جاؤ جس نئی زندگی کا تم نے آغاز کیا ہے اسی پر ثابت قدم رہنا ہی ذریعۂ نجات ہے برائی بہت خوبصورت ہوتی ہے مگر اس کی انتہا بے حد بھیانک اس کے برعکس نیکیوں کا سفر مشکل ترین لیکن منزل نہایت سکون بخش۔“

”میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن مرشد ابھی میں آپ کے پاس رکنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”مرشد ان سوروں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں انہوں نے آپ کی تلاش شروع کر دی ہوگی ان کے بہت سے گر گے ہیں وہ انہیں بھی استعمال کریں گے۔“

”اور تم میری حفاظت کرو گے؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں مرشد میں تو خود ایک کمزور انسان ہوں لیکن میں ان لوگوں کو جانتا ہوں اگر کوئی نظر آیا تو آپ کو ہوشیار تو کر سکتا ہوں۔“

”تمہارا شکریہ الیاس خان میری نصیحت ہے کہ ان لوگوں سے تصادم کی کیفیت نہ اختیار کر اب تم ایک ذمہ دار شخص ہو تمہارے شانوں پر جوان بہن اور بوڑھے ماں باپ کا بوجھ ہے۔ بہت مشکل سے تمہارے ماں باپ کو اپنی خوش بختی پر یقین آئے گا مگر انہیں یقین دلانا تمہارا فرض ہے جاؤ دوست تمہاری حفاظت کرے۔“

”آپ مرشد؟“

”میں آجاؤں گا میری فکر مت کرو۔!“ بمشکل تمام میں نے اسے روانہ کیا اور جب وہ نظروں سے ہو گیا تو فرید خان کے گھر کے دروازے کو دیکھنے لگا اندر ماموں ریاض موجود تھے۔ میرے ماموں ریاض معلوم تھا کہ امی ابا کہاں ہیں۔ آہ میں انہیں دیکھ سکوں گا ان سے مل سکوں گا۔ میری امی، میرے ابا بہن دل میں سرور اتر آیا تھا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ماموں ریاض کے سامنے نہیں آؤں گا ان کے گھر کا پیچھا کروں گا اور پھر سب کے سامنے ایک دم جاؤں گا کیا کیفیت ہوگی ان کی کیا ہو گا۔

بدن اینٹھ رہا تھا اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے کہ جانے کتنے عرصے کے بعد پانچ بجے او

خان کے گھر کے دروازے سے ماموں ریاض کو نکلتے دیکھا۔ ہاں وہ ماموں ریاض ہی تھے۔!

کھوئے کھوئے سے، مضمحل مضمحل سے، شیو بڑھا ہوا تھا ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا تھیلا تھا جس میں کوئی چیز محسوس ہوتی تھی۔ لباس بھی بہت معمولی تھا۔ ان کی پریشان حالی کا صاف احساس ہوتا تھا۔ آہ نہ جانے کیسے زندگی گزار رہے ہیں یہ لوگ ظاہر ہے ابو تو کچھ کرنے کے قابل نہ رہے ہونگے۔ ان سب کی کفالت کا بوجھ ماموں پر ہو گا دل بے اختیار ہو رہا تھا، جذبات مچل رہے تھے، خواہش ہو رہی تھی کہ سب کچھ بھول کر دوڑوں اور ان سے لپٹ جاؤں۔ اتنا روؤں کہ ایک عرصے سے رکے ہوئے سارے آنسو بہہ جائیں۔ لیکن خود کو سنبھالا۔ احتیاط ضروری ہے مجھے ماضی کو نہیں بھولنا چاہئے۔

ماموں ریاض کافی دور نکل گئے تھے میں چل پڑا خیالات کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ سونے کے چند سکے میرے پاس موجود تھے۔ یہ ان کے کام آئیں گے اس کے بعد جس طرح بھی بن پڑا میں ان کے حالات بدل دونگا آہ .... یہ تو میرا فرض ہے میری تو ابتداء یہیں سے ہونی چاہئے تھی مگر یہ تقدیر میں نہیں تھا اگر امی، ابو اور شمسہ وہاں موجود ہوئے جہاں ماموں جا رہے ہیں، تو مجھے دیکھ کر ان پر کیا گزرے گی، کیا کیفیت ہوگی؟ کہیں یہ لوگ بھی مجھ سے بددل نہ ہوں مجھے اپنی پریشانیوں کا ذمہ دار سمجھ کر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگے ہوں۔ یہ احساس مجھے الیاس خان کے ان الفاظ سے ہوا تھا جن میں اس نے ماموں ریاض کے بارے میں بتایا تھا کہ میرے پیغام کا ان پر کوئی رد عمل نہیں ہوا تھا خیر اگر ایسا ہوا بھی تو کیا بالآخر میں انہیں خود سے راضی کر لوں گا اپنی کہانی سنا کر بتاؤں گا کہ میں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے۔ ان سوچوں نے، ان احساسات نے اس سفر کی طوالت کا احساس ختم کر دیا تھا جو ماموں ریاض نے رکے بغیر طے کر لیا تھا۔ یہ بہت طویل سفر تھا۔ نہ جانے کتنی سڑکیں، گلیاں، بازار، محلے عبور کر آئے تھے وہ آبادی خال خال رہ گئی تھی جس جگہ وہ پہنچ گئے تھے، وہاں کھیت بکھرے ہوئے تھے اور ان کھیتوں کے دوسرے سرے پر کچھ بوسیدہ مکانات دور دور سے نظر آ رہے تھے غالباً یہاں بجلی نہیں تھی، کھمبے بھی نہیں لگے ہوئے تھے۔ ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں سے چند ملگجی مدہم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں چونک پڑا ان روشنیوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ کتنا فاصلہ پیدل طے کیا گیا ہے کہ چلتے چلتے رات ہوگئی اور پھر یہ آبادی عجیب سی تھی۔ یہاں یہ لوگ اتنی دور اور ایسی جگہ جو زندگی کی سہولتوں سے محروم ہے اس کی وجہ بھی غربت ہی ہو سکتی تھی دل رونے لگا کتنی بے بسی کا شکار ہیں یہ لوگ کیا بیت رہی ہے ان پر ....

ماموں ریاض ایک دروازے پر رک گئے۔ ایک لمحے رکے پھر اندر داخل ہوگئے میرا دل بند بند سا ہو گیا۔ منزل آگئی تھی وہ جگہ آگئی جس کی مجھے صدیوں سے تلاش تھی قدم من من بھر کے ہوگئے نہ جانے کتنی مشکل سے یہ بقیہ راستہ طے کیا تھا ان مکانوں کو قریب سے دیکھا زمانۂ قدیم کے بنے ہوئے تھے دیواروں میں ایک اینٹ سلامت نہیں تھی اس کے باوجود مضبوط تھے۔ جس دروازے میں ماموں ریاض داخل ہوئے تھے۔ اس کی زنجیر بجائی اور دھڑکتے دل کے ساتھ انتظار کرنے لگا دروازہ کون کھولے گا شمسہ، امی، ابو .... یا ماموں ریاض ....؟ کس سے کیا کہوں گا کیا وہ لوگ مجھے ایک نگاہ میں پہچان لیں گے۔ مشکل ہو جائے گا کچھ دیر انتظار کے بعد زنجیر دوبارہ بجائی پھر تیسری بار بہت زور سے لیکن کوئی جواب نہیں ملا جگہ شاید بہت بڑی ہے۔ یہ لوگ دروازے سے دور ہوتے ہونگے یا کوئی اور یہاں آتا نہ ہوگا یا ماموں ریاض اکیلے ....؟ اس خیال سے دل لرز گیا اگر ماموں ریاض یہاں اکیلے ہیں

تو امی، ابو........... ایک دم بے چینی طاری ہو گئی زور زور سے زنجیر بجانے لگا پھر دروازے کو زور سے اندر دھکیلا دروازہ کھل گیا بے صبری سے اندر قدم رکھ دیا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جگہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"ماموں ریاض۔" میں نے آواز لگائی اور میری آواز گونج کر رہ گئی دل پر وحشت چھانے لگی تھی اس بار پہلے سے زیادہ زور سے چیخا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ "یہاں کوئی ہے۔" میں نے پھر حلق پھاڑا اس بار روشنی کی ایک مدہم سی کرن ابھری یہ کرن کسی دروازے کی جھری سے ابھری تھی اسے دیکھ کر میں اندھوں کی طرح اس طرف لپکا بہت مدہم کرن تھی لیکن اس کی نشاندہی میں، میں دروازے تک پہنچ گیا اس دروازے کو بھی دھکا دے کر میں نے کھول دیا اور دوسری طرف نکل آیا یہاں زیادہ تاریکی نہیں تھی گول سا بڑا صحن نظر آ رہا تھا۔ جس کی زمین اینٹوں سے بنی ہوئی تھی لیکن وہی کیفیت یہاں بھی موجود تھی۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں درمیان میں کیاریوں جیسی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس میں درخت اگے ہوئے تھے بہت اونچے اونچے چار درخت یہاں نظر آ رہے تھے جو اوپر جا کر آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے تھے اور انہوں نے اس صحن پر سایہ کر لیا تھا لیکن چونکہ آسمان پر ابھی تھوڑی بہت مدہم مدہم روشنی تھی اس لئے یہ صحن زیادہ تاریک نہیں ہوا تھا روشنی کی وہ کرن جس نے دروازہ اجاگر کیا تھا، اس دروازے کے عین سامنے ایک اور دروازے سے ابھر رہی تھی۔ خوف و دہشت کا ایک ہولناک احساس میرے وجود پر طاری ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اور کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شاید یہ خوف کا احساس تھا جو میرے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا ماموں ریاض کہاں چلے گئے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے اور دل چاہ رہا تھا کہ بیٹھ جاؤں۔ سانس بے حد تیز ہو گیا تھا اس حالت میں کئی منٹ یہاں کھڑے کھڑے گزر گئے نجانے کس طرح میں نے ایک بار پھر اپنے حلق سے آواز نکالی اور ماموں ریاض کو پکارا لیکن جواب ندارد. دل کے کسی گوشے میں یہ احساس ابھر رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ غیر حقیقی ہے کچھ ہو گیا ہے کوئی ایسی بات جو آنے والے وقت میں میرے لئے خطرناک ہو سکتی ہے۔ آہ یہ کیا ہوا سوچا تو کچھ تھا اور ہو کچھ رہا تھا کیسے کیسے احساس لے کر یہ طویل اور تھکا دینے والا سفر کیا تھا کیا کیا امیدیں باندھی تھیں۔ آخر کیا ہونے والا ہے۔

لرزتے قدموں سے اس دروازے کی جانب بڑھا جہاں سے روشنی آ رہی تھی یہاں پہنچ کر دروازہ زور سے بجایا میرے ہاتھوں سے پیدا ہونے والی آواز کئی گنا زیادہ ہو کر پھیل رہی تھی اس میں ہوا کی شائیں شائیں بھی شامل تھی درختوں کے پتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج رہے تھے اور ماحول پر ایسا دہشت ناک سناٹا سا پھیلتا جا رہا تھا کہ دل کی دھڑکنیں چیخ اٹھیں میرے زور زور سے دروازہ بجانے سے یہ دروازہ اندر کو دب گیا اور میں نے کسی انوکھے جذبے کے تحت اندر قدم رکھا اس بار میں ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا تھا جس کی قدامت کا اندازہ اس میں موجود اشیاء سے ہوتا تھا۔ گرد کی ایک دبیز اور بدنما تہہ اس کے فرش پر جمی ہوئی تھی اونچی چھت کے درمیان ایک بہت بڑا جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف جالے لگے ہوئے تھے اور ایک طرف آتشدان میں مدہم مدہم سی زرد روشنی ہو رہی تھی اسی آتشدان کے اوپر ایک شمع روشن تھی۔ میں نے اس کمرے کی فضا میں ہلکی ہلکی گرمی محسوس کی اور بدن ایک بار پھر دہشت سے لرز اٹھا کیونکہ اچانک ہی کمرے کی روشنی میں اضافہ ہونے لگا تھا میری آنکھوں کے سامنے کوئی سات فٹ کے فاصلے پر آتشدان کے اوپر رکھی ہوئی چند شمعیں خود بخود روشن ہو گئی تھیں۔

شمعیں پرانے قسم کے ایک شمع دان میں لگی ہوئی تھیں سفید سفید لمبی لمبی خدا جانے ان شمعوں کو روشن کس نے کیا تھا۔ میں اب شدید دہشت کا شکار ہو چکا تھا۔ آہست آہستہ آگے بڑھ کر میں ان شمعوں کے قریب پہنچ گیا میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ پہلے تو صرف ایک ہی موم بتی جل رہی تھی لیکن اب یہ شمعیں کس نے روشن کیں وہ نادیدہ ہاتھ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ جنھوں نے یہ حرکت کی تھی موم بتیوں کے شعلے بالکل سیدھے اوپر اٹھ رہے تھے جیسے ہوا سے محفوظ ہوں میں غیر ارادی طور پر ان پر پھونکیں مارنے لگا اور ایک بار پھر میری آنکھوں میں خوف ابھر آیا میری پھونکوں سے کسی نہ کسی شعلے کو تو بجھ جانا چاہئے تھا لیکن وہ جنبش بھی نہیں کر رہے تھے دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا پورا بدن پسینے میں ڈوب گیا اور اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ فریب نظر تھا۔ ماموں ریاض حقیقت نہیں تھے بلکہ کوئی خوفناک دھوکا تھے جس کا تعاقب کرتا ہوا میں اس ہولناک مکان میں پہنچ گیا ہوں لیکن اس دھوکے کی بنیاد کیا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے بہت عرصے سے تک میں اس سے محفوظ رہا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ میری ایک حیثیت بن گئی تھی آہ........... اس کے بعد یہ سب کچھ........... کیا کروں۔ کیا کرنا چاہئے مجھے، بے شک شدید ترین حالات کا شکار رہ چکا تھا ان حالات میں رہنے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن کچھ عرصے سے صورتحال ذرا مختلف ہو گئی تھی اور اب یہ سب کچھ میرے لئے بڑا دہشت ناک تھا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا دروازہ در دروازہ۔ ایک کے اندر ایک۔ ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ماموں ریاض کا تصور تو اب دل سے نکلتا ہی جا رہا تھا میری تقدیر میں بھلا یہ روشنی کہاں ہے میں تو تاریک اندھیروں کا مسافر ہوں مجھے انہی تاریکیوں میں زندگی بھر کا سفر کرنا ہے ان خوشیوں سے بھلا میرا کیا واسطہ جو انسان کی زندگی میں آتی ہیں مگر اب یہ نیا جال نیا فریب کیا معنی رکھتا ہے۔ آہ. پچاس بار غور کر چکا تھا اس بات پر کہ غلطی ہوئی ہے مجھ سے اور میری اس غلطی نے مجھ سے میرا سائبان چھین لیا ہے وہ کمبل جو میرے لئے ایک بزرگ کا عطیہ تھا. مجھ سے واپس مانگا گیا تھا صاف کہا گیا تھا کہ میں اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا تھا میں نے اسے چھوڑ دیا ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہوا تھا. اس میں میری غلطی نمایاں تھی لیکن اب. اب کیا کرنا چاہئے اپنی اس غلطی کو تسلیم کر کے کیا ایک بار پھر موت کی آرزو کرنے لگوں یا زندگی کی جانب رخ کئے رہوں جیسا بھی ہو جو کچھ بھی ہو گزاروں اسی میں گزاروں۔ زندگی کتنی قیمتی شے ہے کوئی جینے والوں سے پوچھے جو کسی بھی طور مرنا نہیں چاہتے میں بھی مرنا نہیں چاہتا۔ ہاں بے شمار بار دل اس دنیا سے اکتایا اپنے آپ سے اکتایا، لیکن جب موت کو گلے لگانے کی آرزو کروں گا تو نہ جانے کیا احساس ہو گا دل میں، کافی دیر تک میں اسی طرح اس پراسرار کمرے میں کھڑا سوچوں میں گم رہا اور اس کے بعد میں نے سوچا کہ کم از کم یہاں کا تھوڑا سا جائزہ اور لے لوں اور اس کے بعد اس گھر سے باہر نکل جاؤں جہاں میں صرف ایک دھوکے کے تعاقب میں آیا تھا سامنے ہی جو کمرہ نظر آ رہا تھا اس کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ میں اس دروازے کے زنگ کو دیکھ رہا تھا صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مدت سے نہیں کھولا گیا ہے ہو سکتا ہے دوسری طرف تاریکی ہی تاریکی ہو کیونکہ روشنی نظر نہیں آ رہی تھی اس لئے میں واپس پلٹا ایک شمع ہاتھ میں اٹھائی اور دوبارہ دروازے کے قریب پہنچ گیا پھر میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور ایک لمحے میں دروازہ کھل گیا۔ شمع کی روشنی میں مجھے ایک اور بڑا سا کمرہ نظر آیا یہاں بھی فرش بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر صدیوں سے انسانی قدموں کا گزر نہ ہوا

ہو دیواریں پلاسٹر کے بغیر تھیں اور ان سے ٹوٹی پھوٹی اینٹیں جھانک رہی تھیں ایک سمت ایک زینہ سامنے تھاجو اوپر جاکر چھت میں گم ہو گیا تھا یہ کمرہ پہلے کمرے سے بھی زیادہ پراسرار تھا ابھی میں یہیں کھڑا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً ہی مجھے اوپر قدموں کی سی آہٹ سنائی دی اور میرا دل دہشت سے اچھل پڑا میرے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ماموں ریاض، ماموں ریاض، کہاں ہیں آپ. ماموں ریاض کیا آپ یہاں اس گھر میں موجود ہیں۔" اپنی آواز کے کھوکھلے پن کا خود بھی احساس ہوا تھا جسے پکار رہا تھا اب اس کی موجودگی سے مایوس ہو گیا تھا لیکن کوئی اوپر ہے ضرور یہ مکان خالی نہیں ہے یہاں یقینی طور پر زندگی ہے۔ آہ کوئی نظر تو آئے کوئی دکھائی تو دے اس سے پوچھوں کہ مجھے اس طلسم خانے میں لانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر میں یہاں کیوں آیا ہوں بس دماغ پر ایک دھند سی طاری ہو گئی اور میرے قدم ان سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ گیارہ سیڑھیاں تھیں اور اس کے بعد لکڑی کی بنی ہوئی چھت۔ اوپر پہنچا شمع کی روشنی نے ایک اور دروازہ اجاگر کیا لیکن اس دروازے کے دوسری جانب روشنی تھی یقینی طور پر وہاں کوئی موجود تھا کچھ سرسراہٹوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے دوازے کو دھکا دیا یہ دلچسپ بات تھی کہ یہاں کوئی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا یہ دروازہ بھی میرے دھکا دینے سے کھل گیا اور وہاں مجھے تیز روشنی نظر آئی یہ روشنی بالکل نیچے لگی ہوئی شمعوں کی جیسی روشنی تھی۔ یہاں بھی پانچ شمعیں جو بہت لمبی لمبی تھیں. روشن تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے انہیں ابھی ابھی روشن کیا گیا ہو کیونکہ ان کا موم پگھلا نہیں تھا لیکن کمرے کے منظر میں کچھ ایک انوکھیں باتیں تھیں جنہیں دیکھ کر میرا دل اینٹھنے لگا اعصاب میں عجیب سی کھنچاوٹ پیدا ہوئی سامنے ہی ایک تابوت جیسی شے رکھی ہوئی تھی اور سرسراہٹوں کی آوازیں وہیں سے آرہی تھیں۔ کمرہ روشن تھا لیکن میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمع پھینکی نہیں اور آہستہ آہستہ اس تابوت کے قریب پہنچ گیا۔ میرے خدا میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا تابوت خاص قسم کا بنا ہوا تھا اس کے کنارے اونچے اونچے تھے اور اس کے اندر ایک لاش نظر آرہی تھی ایک انسانی لاش جس کی بے نور آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور چہرہ، یہ چہرہ ماموں ریاض کا چہرہ تھا۔ ہاں میں اس چہرے کو صاف پہچانتا تھا ماموں ریاض ہی تھے۔ لیکن جو چیز مجھے ایسی نظر آئی جو میرے حواس کو بالکل ہی بے قابو کر رہی تھی وہ ماموں ریاض کی لاش سے چمٹی ہوئی لاتعداد پیلی پیلی مکڑیاں تھیں جو ان کے جسم پر ادھر سے اُدھر پھر رہی تھیں اور جگہ جگہ ان کے کھلے جسم میں اپنے پنجے جمائے ان کا خون چوس رہی تھیں۔ آہ ماموں ریاض.......... ماموں ریاض .... میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ شمع میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر کھلے ہوئے تابوت میں جاگری مکڑیاں ایک دم منتشر ہونے لگیں ان کی تعداد بے پناہ تھی ان کا سائز بھی مختلف تھا شمع گرنے سے ان میں سے کچھ مکڑیاں جل بھی گئی تھیں وہ ایسے انداز میں اوپر کی جانب لپکیں جو بے حد لرزہ خیز تھا میں بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا لیکن پاؤں کسی چیز میں الجھ گیا اور میں چاروں شانے چت نیچے گر گیا دفعتہً ہی مجھے ایک دھماکہ سا سنائی دیا اور اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہو گئی وہ دروازہ جس سے میں اندر داخل ہوا تھا. زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا تھا ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی اگر ہوا چلتی تو شمعوں کے شعلے بھڑکتے اس کا مطلب ہے کہ کسی نادیدہ شیطانی قوت نے یہ دروازہ بند کیا ہے میں ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن جسم جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ آن واحد میں لاتعداد سفید اور پیلی مکڑیاں

گئیں میں اپنے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر ان کے نوکدار پیروں کی گردش محسوس کرنے لگا۔ وہ میرے جسم سے چمٹ رہی تھیں جسم کے کھلے ہوئے حصوں میں باریک باریک سوئیاں سی چبھنے لگیں اور درد کی شدت سے میرے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔ اعصاب اچانک ہی قابو میں آگئے تھے میں نے جوش وحشت میں ان مکڑیوں کو ہاتھ مار مار کر دور کرنا چاہا مگر بے سود ان کی نوکیلی ٹانگیں میری کھال میں پیوست ہو رہی تھیں اور وہ اپنے باریک باریک دانت میرے جسم میں چبھو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ میری گردن تک پہنچ گئیں اور اس کے بعد انہوں نے میرے چہرے پر چڑھنے کی کوشش کی ایک خوفناک دھاڑ میرے منہ سے نکلی اور میں نے ایک دم کروٹ بدل کر زمین پر ہاتھ ٹکائے اور اٹھ کھڑا ہو گیا جسم میں انتہائی خوف کے عالم میں قوتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ میں نے بہت زور زور سے ہاتھ اور پاؤں جھٹک جھٹک کر ان مکڑیوں کو نیچے گرایا اور اس کے بعد دروازے کی جانب دوڑ لگائی پوری قوت سے میں نے دروازے کو پکڑ کر کھینچا اور دروازہ کھل گیا لیکن میں باہر نکلتے نکلتے ایک بار پھر گر پڑا تھا چند مکڑیاں جو میرے لباس پر چڑھ گئی تھیں، میرے ساتھ ہی باہر آگئی تھیں۔ میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا مکڑیوں نے میرے جسم کے کھلے حصوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا اور وہاں پہنچ کر مجھے کاٹنے لگیں میں بار بار چیخ رہا تھا اور لجلجی مکڑیوں کو چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر نیچے پھینک رہا تھا ساتھ ہی میں انہیں پاؤں سے مسلتا بھی جا رہا تھا یہ ایک بے حد گھناؤنا کام تھا لیکن اس وقت زندگی بچانا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا مکڑیاں اپنا کام کر رہی تھیں مگر میری کوششوں سے ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ آخری مکڑی بھی میرے پاؤں کے نیچے آکر مر گئی اس مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہی میں اس راستے کی طرف دوڑا جہاں سے اندر داخل ہوا تھا سامنے ایک دروازہ کھلا نظر آیا اور میں اس میں گھس گیا مگر وہ ایک کمرہ تھا اور اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا وہاں سے نکل کر ایک راہداری میں بھاگا جو آگے جاکر دوسری طرف گھوم گئی تھی لیکن دوسری طرف مڑ ہی رہا تھا کہ سامنے بند دیوار آگئی اور بمشکل دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر ٹکرانے سے بچا۔ آہ وہ راستہ کہاں گیا جہاں سے اندر آیا تھا کہاں گیا وہ راستہ .... وہاں سے پلٹا اور پھر جہاں تک بھاگ سکا، بھاگا لیکن جہاں پہنچتا راستہ بند ملتا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے آواز نہیں نکل رہی تھی پھر ایک تاریک کمرہ میں داخل ہو گیا گہرا گھُپ اندھیرا تھا پانی گرنے کی آواز آرہی تھی غالباً غسل خانہ تھا میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا ایک جگہ پانی کی دھار گر رہی تھی پانی ہلکا گرم تھا مگر پیاس اتنی شدت کی تھی کہ میں نے منہ کھول دیا پانی کے کئی گھونٹ حلق سے اتارے مگر یہ پانی ہلکا نمکین تھا اور اس میں پانی جیسا پتلا پن نہیں تھا اس کے علاوہ ایک عجیب سی بو ایک عجیب سی سڑاند .... میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا دونوں ہاتھوں کا چلو بنایا پانی اس میں لیا اور اسے انگلیوں سے مسل کر دیکھنے لگا عجیب سے چکنی تھی اس میں۔ مگر تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا اس سڑاند سے الٹی آرہی تھی، پیٹ اور سینے پر ایک دم بڑا بھاری پن پیدا ہو گیا تھا میں کراہتا ہوا وہاں سے بھی نکل آیا۔ کوئی عظیم شیطانی جال تھا جس میں میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔ آہ کیا ہے یہ سب کچھ۔ کہاں جاؤں کسی جگہ روشنی نظر آئی اس سے پہلے یہ روشنی نہیں تھی مگر اس طرف رخ کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا ادھر کلیجہ تھا کہ حلق کے راستے باہر نکل آنا چاہتا تھا۔

"راستہ کہاں ہے .... کوئی ہے اس منحوس گھر میں۔ ارے کوئی ہے ماموں ریاض، ابو، امی، ثمر .... کوئی ہے کوئی ہے۔" میری آواز گھٹ گئی متلی آگئی تھی اور میری حالت خراب سے خراب

تر ہوتی جا رہی تھی سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ رہے تھے لگ رہا تھا یہی آخری وقت ہے مر جاؤں گا۔ آہ پھر وہی سب کچھ آہ .... آہ آگے بڑھا رخ ایک روشنی کی طرف تھا نہ جانے وہاں ہے، نہ جانے وہاں کیا ہے۔ کھلا ہوا دروازہ تھا چوکور کمرہ تھا کھردرا فرش دیواریں کارنس پر روشنی سامنے ایک اور دروازہ بھی تھا۔ نقشہ بدل گیا تھا اس گھر کا میرے داخل ہونے کے بعد۔ کیسے کیسے۔ روشنی میں ہاتھوں پر نظر پڑ گئی ایک اور چیخ حلق سے بلند ہو گئی دونوں ہاتھ سرخ ہو رہے تھے انگلیاں ایک دوسرے سے چپک گئی تھیں خون آہ خون پورا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا وہ دھار جو نہ جانے کہاں سے گر رہی تھی، پانی کی نہیں خون کی دھار تھی اور .... اور میں نے کئی گھونٹ خون پیا تھا اس بار

• تو یوں لگا جیسے آنتیں حلق کے راستے باہر نکل رہی ہوں بری طرح متلیاں ہو رہی تھیں اور مجھے بیٹھ جانا پڑا تھا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ حلق سے نکلنے والی آلائش نظر نہ آئے۔ سر بالکل خالی ہو گیا تھا جب حالت کچھ بہتر ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے نظر آنے والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ بے نور سی آنکھوں سے کمرے کے ماحول کو دیکھا وہی کمرہ تھا جہاں تابوت دیکھا تھا اور اس تابوت میں ماموں ریاض کی لاش نظر آئی تھی مگر اب وہاں مکڑیاں نہیں تھیں فرش صاف پڑا تھا مکڑیاں یقیناً دوبارہ تابوت میں جا گھسی تھیں ماموں ریاض مر گئے میں نے دل میں سوچا بے اختیار قدم آگے بڑھے تابوت میں جھانکا لاش موجود تھی مگر مکڑیاں موجود نہیں تھیں ایک بھی مکڑی نہیں تھی البتہ ماموں ریاض کی لاش خون سے عاری تھی بالکل زرد، بے رونق، سرد .... ! تابوت میں جھانکا دونوں ہاتھ نیچے کئے ان کے شانوں کو مضبوطی سے پکڑا اور اوپر اٹھایا بالکل ہلکا جسم تھا مگر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ماموں ریاض نے پاؤں اٹھایا ہو یہ صرف احساس نہیں تھا ایسا ہوا تھا میرے ہاتھوں کے سہارے وہ تابوت سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا اور پھر جلدی سے انہیں چھوڑ دیا یہ ماموں ریاض نہیں تھے بلکہ اب یہ چہرہ مکروہ صورت بھوریا چرن کا چہرہ بن چکا تھا وہ سو فیصد بھوریا چرن تھا اس کی شکل نامعلوم سے انداز میں کسی مکڑی کی شکل سے مشابہ تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی اسی طرح مڑے مڑے تھے اسے اب میرے سہارے کی ضرورت نہیں تھی وہ اچھل کر تابوت سے باہر نکل آیا۔

"کیسے ہو میاں جی .... ؟ اس نے چہکتی آواز میں پوچھا۔

"بھوریا چرن۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"پہچان لیا نا .... ؟ ہاہا .... چلو اچھا ہے ہم تو سمجھے بھول گئے ہو گئے ہمیں بہت سمے بیت گیا تھا۔"

"ماموں ریاض کہاں ہیں۔ بھوریا چرن .... ؟"

"سب مل جائینگے میاں جی .... سب مل جائینگے اب کیا رہ گیا ہے مگر تم بھی دھن کے پکے نکلے۔"

"وہ کیسے بھوریا چرن .... "

"ہمارا کام ہی کر کے نہ دیا۔"

"اب بھی نہیں کروں گا بھوریا چرن۔ اب بھی نہیں کروں گا۔"

"اب .... ؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں تو کیا سمجھتا ہے ہار مان لی ہے میں نے تجھ سے، تو پاگل ہے بھوریا چرن۔"

"ڈوب مرو ستیاں جی کہیں چلو بھر پانی میں .... ڈوب ہی مرو تو اچھا ہے اب تم ہو کہ ... ذرا

اس پر تو غور کر لو۔"

"میں تو کبھی کچھ نہیں تھا بھوریا چرن مگر تو دیکھ لے آج تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"مقصد میں تو ہم ایسے کامیاب ہوئے ہیں میاں جی کہ جانو گے تو جی خوش ہو جائے گا تمہارا .... ۔"

"اچھا .... کیا تو کھنڈولا بن گیا .... ؟"

"ہم تو کھنڈولا نہ بنے .... پر تم بھی دھرماتما نہ بن سکے یہ ہے تمہارا دھرم، جیون بھر کشٹ اٹھائے، پر ایک غلطی کری اور مارے گئے۔" اس نے مسرور لہجے میں کہا اور میں اسے گھورنے لگا۔

"اب تم ہم میں سے ہو میاں جی .... نام اور بدل لو اپنا .... ! دھرم داس رکھ لو یا کالی چرن مسعود احمد تو نا رہے اب تم۔" وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اور میں اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا کیا کہہ رہا ہے یہ کیوں کہہ رہا ہے اتنا عرصہ دور رہا تو دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب اس سے جان چھوٹ گئی جو ذمہ داری مجھے دی گئی ہے اگر اسے پورا کر لوں تو شاید اس کرب کی زندگی سے نجات پا لوں مگر .... اور اب اسے برا بھلا کہہ لوں تو کیا ملے گا۔ کم از کم معلومات ہی حاصل کروں، کچھ سمجھ میں ہی آئے۔

"تم کس مقصد میں کامیاب ہوئے ہو بھوریا چرن۔"

"ہا .... بھاگ ہوتے ہیں منش کے شنکھا بنے تو من میں آئی کہ کھنڈولے بنیں مگر بھاگ میں نہیں تھا۔ ملا بھی تو تم جیسا پاگل۔ دھرم کے پیچھے بھاگنے والا ارے پاپی تو دھرم داس بننے تو نہیں آیا تھا ہمارے پاس برے کاموں کے لئے ہی تو آیا تھا ریس کے گھوڑے، سٹے کے نمبر، دولت کے انبار، ابلاؤں کی قربت یہی سب مانگنے آیا تھا تو ہم سے، ہم نے کب منع کیا تھا تو ہمارا کام کر دیتا تو ہم تجھے وہ دیتے کہ جیون بھر مزے کرتا دھرم ضرور بھرشٹ ہوتا تیرا، مگر دھرم داس تو ہی بتا کیا تیرے ہی دھرم میں یہ سب جائز ہے ریس میں دوڑے ہوئے گھوڑوں کے کھیل سے جو دولت ملتی ہے وہ نیک کمائی ہے، پھر تیرے من میں نیکیاں کیوں پھوٹ پڑیں .... ہمارا استیاناس مار دیا تو نے اور اس کے بعد جو کچھ تو کرتا رہا وہ مرے پر سو درے تھے طرح طرح کے لوگوں سے دہائی دی تو نے اور ہمیں نقصان پہنچایا تو کیا سمجھتا تھا چھوڑ دیتے ہم تجھے۔"

"تو تم میرے پیچھے لگے رہے۔" میں نے کہا۔

"پہلے تو یہی سوچا تھا ہم نے کہ ایک دن راستے پر آجائے گا مگر اس مسلّے نے کھیل بگاڑ دیا۔"

"کس نے .... ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے اسی فضل نے۔"

"بابا فضل کی بات کر رہے ہو۔"

"ہاں اس نے جیون وان دے کر تیری رکھشا کی نہ صرف رکھشا کی بلکہ بلکہ .... !"

"بلکہ .... ؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رستے کھول دیئے تیرے تو نے جو گناہ کئے تھے اپنے دھرم کی نگاہ میں، اس نے انہیں دھونے کے لئے قربانی دیدی اور تو بچ گیا تیری کٹھنائیں دور ہونے لگیں مگر ہمارے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔"

میرے حلق میں گولہ سا آن پھنسا بڑا روح فرسا انکشاف تھا بابا فضل نے میری مشکلات دور کرنے کیلئے جان کا نذرانہ دیا تھا اتنا بڑا ایثار کیا تھا انہوں نے، اتنا بڑا ایثار .... بھوریا چرن میری کیفیت سے بے نیاز بولا۔

"ہماری بھی کچھ مشکلیں ہوتی ہیں کچھ بھید بھاؤ ہوتے ہیں اگر تو مہان بن جاتا اگر تیرے ہاتھوں کا جادو والوں کو نقصان پہنچتا تو وہ ہمارے حساب میں لکھا جاتا۔ ہمیں جواب دینا ہوتا اس کا اور ہمارے ور بے کم ہوتے جاتے۔ مصیبت گلے پڑ گئی تھی ہمارے تو، لینے کے دینے پڑ گئے تھے اپنا کلام بھولنا پڑا تیری [illegible] میں لگے رہے، تجھے دیکھتے رہے تیرے راستے روکنا تھے ہمیں اور ہم کامیاب ہو گئے چولہے میں جا تیری مہانتا۔" وہ پھر ہنس پڑا۔

"وہ کیسے بھوریا چرن۔" میں نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

"بتائیں گے سسر۔ سب کچھ بتائیں گے۔ تجھے بھی تو کچھ دکھ ہو، تو بھی تو ہماری طرح کلپے۔"

"بتاؤ بھوریا چرن۔"

"دیوتا بن رہے تھے مہا پرش بن رہے تھے سنسار کو دکھوں سے دور کرنے جا رہے تھے۔ اپنے دین دھرم کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔"

"تم جانتے ہو............؟"

"کیوں نہیں، ہمیں سب سے پہلے دشمنوں سے ہوشیار رہنے کی سکھشا دی جاتی ہے اس کے لئے دوسرے دھرموں کے بارے میں جاننا ہوتا ہے۔"

"میرے دین کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"جتنا جانتے ہیں وہ تجھ سے زیادہ ہے۔ تیرے دھرم میں ایک نکتہ ہے۔ سب سے بڑی چیز ایک نکتہ ہے۔"

"وہ کیا............؟"

"ساری ہم سے پوچھ لے گا کیوں بتائیں تجھے۔"

"اس لئے کہ تم نے میرے دین کو جاننے کا دعویٰ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہم جانتے ہیں۔ نکتے کی بات بالکل ٹھیک کہی ہم نے، تیرے دھرم میں واسناؤں کی گنجائش نہیں نفس کی موت کو پہلا درجہ حاصل ہے اور جو نفس کے جال میں پھنسا ڈوب گیا تجھے ڈبونا ضروری ہو گیا تھا ہمارے لئے دھن کے چکر سے تو نکل گیا، سندر ناریاں تجھے متاثر نہیں کر سکتی تھیں اور ہمارا کام اس سے تک نہیں بن سکتا تھا جب تک تو ایسے کسی پھیر میں نہ پڑے۔ سو ہم لگے رہے تیری تاک میں اور موقع مل گیا ہمیں بڑا دین دیال بنا ہوا تھا اور لوگوں کے بڑے کام آ رہا تھا۔ ہم نے حساب کتاب لگایا اور کام میں مصروف ہو گئے۔ باؤلے وہ مٹکا جو تجھے درخت کی جڑ میں نظر آیا تھا، کسی کا دبا ہوا خزانہ نہیں تھا وہ تو ہم نے سونے کی مہروں سے بھر کر وہاں گاڑ دیا تھا سو تجھے وہ نظر آ گیا وہیں پر ہمارا کام بن گیا تو وہ نکتہ بھول بیٹھا تجھے بتایا گیا تھا یاد ہے ناں تجھ سے کہا گیا تھا کہ پہلا کام انسانوں کے کام آنا ہے دوسرا کام اپنے نفس کو مار کر اپنی منزل کی تلاش۔ اس کے بغیر مہانتا مکمل نہیں ہوئی اگر تو اپنی خواہشوں کے جال میں پھنس گیا تو کچھ نہیں حاصل کر سکے گا اس سنسار میں بول یہی بتایا گیا تھا ناں تجھے سو یوں ہوا کہ تو نے دیکھا اس آدمی الیاس خان کو اور تجھے یاد آ گئے اپنے ماماجی ارے ہم نے سوچا کہ اس سے بڑھیاں موقع ملنا تو ممکن ہی نہیں ماماجی کے پھیر میں تو لمبے لمبے سے پھیر میں پڑ سکتا ہے اور بات بن گئی بھیا ہماری۔ سونے کا وہ مٹکا تو نے الیاس خان کو دیدیا اس لئے کہ وہ تیرے ماماجی کا پتہ تجھے بتا دے۔ بس کام تو وہیں سے ہو گیا تھا ہمارا تو خود سوچ دھرتی تو بہت بڑی ہے نجانے کتنے خزانے بھرے ہوئے ہیں اس دھرتی میں اور سب کے سب

جاتے تیری آنکھوں میں کیونکہ تجھے آہستہ آہستہ روشنی مل رہی تھی تو تو بہت بڑا بن جاتا بھائی مگر راستے بنائی تھے سو تو نے وہی کیا جو ہم نے چاہا اور نکل گیا تو ان پابندیوں سے جو تجھ پر قائم کی گئی تھیں بس ایک کے بعد ایک ہمارا کام بنتا رہا اور پھر بن گئے ہم تیرے ماماجی۔"

"تم!" میں خوف سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"ہاں رے اس سے تو یہی سب کچھ کرنا تھا لگا لائے تجھے اپنے پیچھے ہم اور سب کچھ بھول گیا تو جو کچھ تجھے دیا گیا تھا اسے بھول کر تو پڑ گیا اپنے ماماجی کے پھیر میں، ماتا پتا کے جلل میں اور یہی ہم چاہتے تھے اور یہ جگہ اب جہاں تو آیا ہے، کہلاتی ہے بیر منڈل یہاں سارے کے سارے ہمارے بیر رہتے ہیں وہ مکڑیاں جو تیرے ماماجی کی لاش سے چمٹی ہوئی تھیں، تیرا کیا خیال ہے مار دیں تو نے۔ ارے جا باؤلے بیر کہیں مرتے ہیں وہ تو اپنا کام کر رہے تھے ہمارے کہنے سے، اور پھر ہم نے وہ خون تیرے شریر میں اتار دیا جو ہم نے سات پورن ماشیاں منتر پڑھ پڑھ کر تیار کیا تھا۔ سترہ آدمیوں کا خون جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور جن پر سات پورن ماشیاں منتر پڑھا تھا ہم نے، کالے جادو کا وہ سب سے بڑا منتر جس سے بڑا منتر اور کوئی نہیں ہوتا اور جو ایک شنکھا کو ہی معلوم ہوتا ہے بس وہ خون پانی سمجھ کر پی لیا تو نے اور تیرے اندر سے سب کچھ صاف ہو گیا کچھ نہیں ہے اب تیرے پاس۔ سمجھا تو ایک کورے مٹکے کی طرح ہے جو اندر سے خالی ہے اور کورا ہے یقین نہ آئے تو آزما لے اپنی کسی بھی بات کو، ارے پاگل تیری ساری تپسیا ایک لمحے میں ختم ہو گئی اس طرح کم از کم ہمارا ایک کام تو بنا ایک کام سے تو فارغ ہوئے ہم، نہ تو اپنے دھرم کا رہا اور نہ اس سنسار کا............ اب جا بھاڑ جھونک چولہے میں، ہمارا کام کر دیتا تو بہت کچھ مل جاتا نہیں کیا تو ہمارا کیا بگاڑ لیا ہم شنکھا تو ہیں ناں، مگر تو کیا ہے تو کیا رہ گیا اب اگر کہے تو کتا بنا کر نکال دیں تجھے یہاں سے بول کیا کریں تیرے ساتھ............؟" میں بھوریا چرن کو دیکھتا رہا جو کچھ اس نے بتایا تھا، دل میں اتر رہا تھا۔ کم بخت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا نہ جانے کیا کیا جتن کئے اس نے اپنے کام کے لئے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کا کہنا بالکل درست تھا ایک نکتہ صرف ایک نکتہ ہی تو اصل حیات ہے بڑے بڑے عالم دین، بڑے بڑے ولی درویش، قلندر اپنے آپ کو تیاگ کر کچھ حاصل کرتے ہیں اپنی خواہشوں کے آگے سر جھکا دیا اپنی محبتوں کے ہاتھوں دیوانے ہو گئے تو پھر کیا باقی رہ گیا۔ عام انسان بھی تو یہی سب کچھ کرتا ہے میرا تو آزمائشی دور تھا اور میں اس امتحان میں نامکمل رہ گیا۔ میں نے وہ نعمتیں ٹھکرا دیں جو مجھے دی گئی تھیں اتنی ساری نعمتیں دے کر صرف ایک ہدایت کی گئی تھی مجھے کہ اپنی خواہشوں کا غلام نہ بنوں وہ نہ مانگوں جن کا دینا ابھی آسمانوں میں منظور نہیں ہوا ہے لیکن کر ڈالا میں نے وہ سب کچھ ماموں ریاض کے چکر میں پڑ کر، وہ کمبل بھی وہیں چھوڑ آیا جس نے میری آنکھوں کو روشن کر دیا تھا، جس نے میرے دل و دماغ کو منور کر دیا تھا۔ بھوریا چرن قہقہے لگانے لگا پھر بولا۔

"سلو اب جا مر اس سنسار میں۔ جا دیکھوں آگے تو کیا کرتا ہے چھوڑوں گا نہیں تجھے پاپی، ہتھیارے تو نے میرے راستے روکے ہیں میں سنسار کے سارے راستے تجھ پر بند کر دوں گا چل بھاگ رے یہاں سے اب تو مٹی کا ڈھیر ہے میرے لئے کچھ نہیں رہا۔"

میں گردن جھکائے وہاں سے واپس پلٹ پڑا اندر سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ درحقیقت خالی ہو چکا ہوں اور اب کچھ نہیں ہے میرے پاس، ایک بار پھر یہ دنیا میرے لئے امتحان گاہ بن گئی تھی اور اس بار میں نے

خود کو اس امتحان میں ڈالا تھا بلاشبہ یہی ہوا تھا یہی سب کچھ ہوا تھا آہ .... میں نے اپنے ہاتھوں
اپنے منصب گنوا دیئے تھے یہ میرا گناہ تھا صرف میرا گناہ اس میں کسی کا قصور نہیں تھا مجھے تو جگہ جگہ
گیا تھا. مجھ سے کہا گیا تھا کہ پہلے پھل چکھوں پھر کھانے کو ملے گا۔ بھوریا چرن نے بالکل درست کہا تھا
مذہب سچا ہے انہیں چھوٹ ہے جو کچھ نہیں جانتے لیکن جو واقف ہوں ان پر ذمہ داری ہوتی ہے مجھے
گیا تھا مگر میں نے اپنی خواہشوں کو اول قرار دیا اس بار سارے راستے کھلے ہوئے تھے میں باہر نکل
گہری رات چھا چکی تھی نہ جانے کیا بج گیا تھا چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا جگہ جگہ درخت بکھرے
ہوئے تھے میں آگے بڑھتا رہا کچھ سوچے بغیر اب تو کچھ سوچنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر
شور ابھر رہا تھا۔ آواز میرے کانوں تک آ رہی تھی مگر احساس کچھ نہیں تھا۔ تھک گیا تو جہاں تھا وہیں پڑ
گیا وہیں سو گیا خوب گہری نیند آ گئی تھی صبح کو اس وقت جاگا جب کہیں دور سے اذان کی آواز سنائی دی
آواز نے اعضا میں تھرتھری سی پیدا کر دی۔ بے اختیار اٹھ گیا دماغ کھویا کھویا سا تھا. دل کچھ چاہ رہا تھا
اعضاء کچھ طلب کر رہے تھے مگر کیا .... یاد نہیں آ رہا تھا کھڑا ہو گیا اسی جگہ کھڑا ہو گیا دونوں ہاتھ
نیت کے انداز میں بندھ گئے مگر اب کیا کروں آہ .... اب کیا کروں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کچھ بھی
نہیں آ رہا تھا بہت کوشش کی مگر سب کچھ بھول گیا تھا جھکا پھر گھٹنوں کے بل سجدے میں گر پڑا، آنکھوں
آنسو ابل پڑے، بلک بلک کر رونے لگا۔ بھول جانے کا غم تھا یاد کرنا چاہ رہا تھا مگر یادداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی
سارے آنسو بہہ گئے، آنکھیں خشک ہو گئیں تو اٹھ کھڑا ہوا کانوں میں ایک آواز ابھری۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

میری عمر ہی کیا ہے آہ .... چند لمحے میری بخشش کا ذریعہ تو نہیں بن سکیں گے مگر یہ زندگی جو ایک
ہے، یہ تو میرے لئے مزید گناہوں کا باعث بن جائے گی .... مزید گناہ نہیں اور گناہ نہیں اور
نہیں اس سزا کو ختم ہو جانا چاہئے برائی میرے لئے نہیں ہے۔ میں برائی کے قابل نہیں ہوں اور گناہ کرنے
کے لئے مجھے اس دنیا میں نہیں رہنا چاہئے۔ مر جانا چاہئے .... مجھے مر جانا چاہئے .... ہاں مجھے
مر جانا چاہئے، میں نے وحشت ناک نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر میری سماعت نے مجھے اس شور کی
طرف متوجہ کیا جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا میرے قدم تیز و تند دریا کی طرف بڑھ گئے۔
بے خودی کے عالم میں اس طرح چل پڑا وسیع و عریض چوڑا پاٹ میرے سامنے تھا. پانی برق رفتاری سے
اپنا سفر طے کر رہا تھا، مٹیالی لہریں جھاگ اڑا رہی تھیں۔ میں دریا میں اتر گیا آگے اور آگے اور آگے
پھر پانی نے میرا وزن سنبھال لیا ایسی پٹخنی لگائی کہ سر نیچے پاؤں اوپر ہو گئے. دوسری پٹخنی اور آس
تاریکی گہری اور پر سکون تاریکی پھر روشنی دھندلی روشنی پھر ایک آواز۔

"ہل رہا ہے کا کا ...."۔

"ہل رہا ہے ....؟"

"کراہ بھی رہا ہے۔"

"ماتھو .... ارے دیکھ بٹو .... او کا ہوس آئے رہے۔"

"آت رہیں کا کا .... ابھو آت میں"

"اب کا کرت ہے جانکی۔"

"ہمیں ٹٹپا رہا ہے۔"

"ہیں .... اب آئی سسروا کو ہوس .... اری جانکی دودھ گرم کر لئی ہے کا؟"۔

"ہاں کا کا .... ہنڈیا چولہے پر رکھی ہے۔"

"بھر دو کٹورے ماں .... ویدجی اے ہی کہہ گئے تھے جاری جلدی کر ...."۔

یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ ہوش میں تھا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں ہوں یہ بھی یاد آ گیا کہ دریا میں کود کر جان دینا چاہی تھی یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ موت نے قبول نہیں کیا ہے یہ بھی یاد تھا کہ مسعود احمد نام ہے میرا اور بھوریا چرن بھی یاد تھا۔

"کہاں ہوس آئی کا کا۔" ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"نا آئی۔ جانکی ہی بولت رہی۔" دوسری آواز نے کہا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اتنی دیر میں ایک لڑکی بڑا سا کٹورا لئے اندر آ گئی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرا دیا پھر بولا۔

"جاؤ کا کا دودھ کی کھس بو پڑتے ہی ہوس آ گئی انجانی کو، چل بوا دودھ پی لے۔" اس نے سہارے سے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔ سخت بھوکا تھا۔ لڑکی نے کٹورا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنی اوڑھنی کا ایک حصہ گرم کٹورے کے نیچے رکھ دیا۔ باقی اوڑھنی اس کے شانوں پر تھی اور اسے نیچے اس طرح جھکنا پڑا تھا کہ اسکا چہرہ میرے عین سامنے آ گیا تھا۔ دودھ کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے اسے دیکھا سانولا سلونا چہرہ سادہ سے نقوش، انیس بیس سال کی عمر، جوانی کی تمازت سے تپتے ہوئے سانس۔ کاجل بھری آنکھوں میں دوڑتی زندگی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر آنکھیں "جھکیں" چہرے کا رنگ بدلا پھر آنکھیں اٹھیں کڑے انداز میں مجھے دیکھا پرکھا اور پھر جھک گئیں۔ ہونٹ آہستہ سے کپکپائے جیسے انہوں نے کچھ کہا ہو۔ مگر بے آواز۔ میں کچھ بدحواس ہو گیا مگر گرم دودھ کے دو بڑے گھونٹوں نے سنبھالی لیا آنتیں تک جل گئی تھیں۔

"دودھ پیوت ہے کہ نا؟" کا کا پھر بولا۔

"ہرے سب ڈکوس گئی سسر۔" نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ لڑکی نے جلدی سے کٹورا میرے ہاتھ سے لے کر اپنی اوڑھنی سنبھال لی اور پھر کٹورا لئے باہر نکل گئی۔ میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں شکنتا نے مجھ سے اظہار عشق کیا تھا کلثنا میری دیوانی تھی، یہ لڑکی انکے مقابلے میں کچھ نہیں تھی مگر نہ جانے دل اس کی طرف کیوں مائل ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکل گئی تو اس جگہ کا جائزہ لیا ہر مٹی کی دیواروں سے بنا کمرہ تھا۔ چھت پھونس کے چھپر سے بنی ہوئی تھی۔ تین چارپائیاں کل کائنات تھیں جن میں ایک پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ وہ غالباً اندھا تھا۔ یہی احساس ہوا تھا۔

"ہاں بھائی ٹیسورام۔ اب بولو جمنا ماں کا کر رئے تھے" نوجوان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جمنا میں؟"

"ارے تو اور کا۔ کا اندر مہاراج کے رتھ ماں سیر کر رئے تھے؟"

"نہیں بس کنارے پر تھا پاؤں پھسل گیا۔"

"بھلے پھسلے بوا۔ اور ہم نا نکالتے تو ...."۔

"مرجاتا۔" میں نے کہا اور ایک بیکس مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"لیو کا کا۔ بوا مرن لئے گرے تھے جمنا ماں۔"

"کاہے بٹوا۔ جیون بھاری ہوگیا کا۔"

"ہاں چاچا۔"

"دکھی لاگو ہو۔ ارے ناتھو رے۔ مہمان بنا لو اپنا اسے جی بہل جائے تو جان دینا۔"

"ارے ای کہاں جائے رہے اب کا کا۔ ہم محنت کری ہے اس پر، ایسے کاہے جانے دینگے سرواً"

"بس ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

دھوبیوں کی آبادی تھی۔ جمنا گھاٹ پر آباد تھی۔ بستی کا نام تھا پوریا۔ کوئی سو گھر تھے پوری بستی میں بوڑھے شخص کا نام راگھو تھا۔ بیٹے کا ناتھو اور لڑکی کا نام جانکی۔ ناتھو گھاٹ پر چھبیٹو رام کر رہا تھا میں بہتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا اور اس نے مجھے نکال لیا۔ جانکی کی نگرانی میں پیٹھ پر لاد کر مجھے اپنے جھونپڑے میں لے آیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا شہر تھا جہاں سے یہ لوگ بیل گاڑیوں پر گھروں کے کپڑے دھونے لاتے تھے اور پھر وقت پر انہیں ان کے مالکوں کے پاس پہنچا دیا کرتے تھے۔ سادہ سی زندگی۔ روکھا سوکھا ملا کھا لیا اور خوش۔ سادگی کی حد یہ تھی کہ مجھ سے میرا نام تک نہ پوچھا اور ناتھو نے مجھے ٹیسو کہا تو سب اس نام سے پکارنے لگے۔ یہ بستی بڑی اچھی لگی تھی۔ میں یہاں رہ پڑا۔ کہاں جاتا کیا طلب کرتا جو مانگا وہ گناہ بن گیا۔ اور اب یہ سوچا تھا کہ کچھ نہیں مانگوں گا جو ملے گا قبول کر لوں گا۔ بھول جاؤں سب کو۔ کوئی فائدہ نہیں کسی کو یاد کرنے سے۔ وہ بھی مجھے بھول گئے ہوں گے۔ صبر کر لیا ہوگا مجھ پر۔ کرے محمود اپنی کوشش میں کامیاب ہوجائے، خدا کرے اس کا ماں باپ سے رابطہ ہوجائے۔ خدا کرے میری بہن شمسہ اپنا مستقبل پا لے۔ میں تو ان کا قاتل تھا۔ اب کیا کروں گا ان کے پاس جا کر۔ جو چھن گیا تھا وہ نہیں ملا تھا۔ آہ جب بھی وقت ملتا جب دوسروں کی نظروں سے محفوظ ہوتا قبلہ رو کھڑا ہوجاتا ہاتھ باندھ لیتا پھر سجدے میں چلا جاتا لیکن جو چھن گیا تھا یاد نہ آتا۔ ایسے لمحوں میں ذہن سوجاتا تھا۔

"راگھو بابا۔ میں کپڑے دھوؤں گا۔"

"کاہے بٹوا؟"

"اسی بستی میں رہوں گا میں۔"

"رہو بٹوا!"

"تمہارا کھاتا رہوں۔"

"سو کاہے۔"

"ٹھیک تو کہے ہے کا کا۔ دئی مٹی ہوجائے گی۔ کام کرنے دے اسے۔" ناتھو نے کہا اور وہ میرا استاد بن گیا۔ میں اس کے ساتھ کپڑے دھونے لگا۔ اس کا کام بڑھ گیا تھا ایک دن جانکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "کچھ معلوم ہے تجھے ٹیسوا۔"

"کیا؟"

"کا کا اور بھیا ہمارے بیاہ کی بات کر رہے تھے۔ کا کا کہہ رہا تھا کہ چھورا بڑھیا ہے کام بھی کرے ہے جانکی کے ساتھ پھیرے کرا دیں اس کے چوکھا رہے گا۔"

میرے ہاتھ رک گئے۔ میں عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جانکی مجھے اچھی لگتی تھی اس کی قربت سے ایک نشہ سا چھایا رہتا تھا مجھ پر۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھی مجھے چاہتی تھی جس کا صاف اظہار ہوتا تھا۔ مگر وہ میری ہم مذہب نہیں تھی کچھ بھی تھا۔ مجھے اپنا نام یاد تھا، اپنا مذہب یاد تھا اور مجھے اس سے محبت تھی۔ جو کچھ مجھ سے چھن گیا تھا وہ میری بدقسمتی تھی لیکن باقی سب.......... کیا.......... کیا خود کو بھول جاؤں۔ کیا..........

جانکی نے کہا۔ "کیا سوچنے لگا۔"

"کچھ نہیں جانکی۔"

"اپنے یاد آرہے ہوں گے۔"

"ہاں!"

"سب کچھ بھلا دوں گی تجھے۔ سب کچھ۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر میں بہت بے چین ہوگیا تھا اس رات میں بہت بے کل تھا۔ ساری رات بے کلی میں گزری۔ صبح کو اٹھا۔ دل کی بے چینی کسی طرح دور نہیں ہو رہی تھی ایک گوشہ تلاش کیا اور بے کسی سے کھڑا ہوگیا ہاتھ باندھ لئے پھر سجدے میں گر گیا۔ بہت دیر گزر گئی چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اٹھا تو.......... ناتھو پر نظر پڑی وہ اچنبھے سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ "کیا تو مسلمان ہے؟"

پورا وجود مجسم آواز بن گیا۔ رُواں رُواں پکارنے لگا "ہاں، ہاں، ہاں"۔ اور یہ کہتے ہوئے جو سکون ملا تھا اس کی قیمت کائنات کے سارے خزانے نہیں تھے۔ یہ الفاظ میری گمشدہ بینائی تھے۔

"مسلمان ہے تو۔" ناتھو نے اس بار کڑک کر پوچھا۔

"ہاں میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔" میں نے عجیب سی کیفیت میں کہا۔

"ہم کا دھوکا کاہے دیت رہے تے۔ ہمارے سامنے ٹیسو کاہے بنا رہے۔"

"نہیں ناتھو۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں بنا۔ میں تو مصیبت کا مارا ہوں ناتھو میں نے تو..... میں نے تو.....۔"

"ہماری بہنیا سے بیاہ کرنے لاگا تھا نے۔ ارے ہم سب کی آنکھن ما دھول جھونک رہے رے۔"

"ناتھو، تم لوگوں نے جمنا سے مجھے اس وقت نکالا جب میں بے ہوش تھا۔ میں تو خود اپنی زندگی ختم کرنے کے لئے دریا میں گرا تھا میں کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کیسے کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے ناتھو، تم جانتے ہو کہ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ کل جانکی نے مجھے بتایا کہ تم لوگ ایسا سوچ رہے ہو۔ میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ اپنے اوپر احسان کرنے والوں کو میں کبھی دھوکا نہ دیتا۔ اگر میں تمہیں حقیقت نہ بتاتا تو کم از کم یہاں سے چلا جاتا۔"

"اور جانکی سے بیاہ نہ کرتا۔"

"کبھی نہیں ناتھو، کبھی نہیں۔" ناتھو میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ ان سچائیوں پر غور کر رہا تھا بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بڑی بکٹ بات ہوگئی رے ٹیسوا۔ جانکی تیرے سپنے دیکھن لاگی رہے اس نے اپنی سکھیاں کو بتا دیا

ہے۔ اب بات برادری مانگل جئی ہے تو ہم پر کرپا کر بیرا۔ کرپا کر ہم پر۔ تو یہاں سے چلا جا۔ چپ چاپ چلا جا۔ سب سوچیں گے کہ تے بھاگ گیا۔ ہم کہہ دئی ہے کہ تے ہمارے روپے لے کر بھاگ ہماری عِزت بچی جئی ہے۔ لوگ تو کا برا بھلا کہہ کر کھاموس ہو جئی ہے۔ تیرا کچھ نا بگڑے گا۔ ہماری لے، ہماری عجت بچالے بیرا۔" ناتھو نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں جارہا ہوں۔ ابھی جارہا ہوں ناتھو میرے بھائی۔ تیری عزت مجھے زندگی سے زیادہ پیاری ہے۔ ابھی چلا جاتا ہوں میں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔" میں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ اُ اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میں نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

بستی بہت چھوٹی تھی۔ میں آخری مکان سے بھی گزر گیا آگے کھیت بکھرے ہوئے تھے اکا دکا نظر آرہے تھے کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں نے رفتار تیز رکھی تھی۔ کسی رخ کا تعین نہیں کیا تھا۔ کدھر کرتا کہاں جاتا۔ بس چل پڑا تھا، ناتھو اور دوسرے دھوبی کسی بستی کا تذکرہ کرتے تھے کہتے تھے شہر ہے جہاں سے وہ کپڑے لاتے ہیں اور دھو کر ان کے مالکوں کو پہنچا دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی اس کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ چلتا رہا اس وقت ناتھو رام کی عزت پیش نگاہ تھی۔ اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ اب ویران جنگل کے سوا کچھ نہیں تھا، درخت نظر آرہے تھے، پرندے پرواز کررہے تھے، آسمان شفاف تھا، دھوپ ہوئی تھی، جب پیروں نے جواب دے دیا تو ایک درخت کے نیچے پناہ لی اور زمین پر بیٹھ کر آنکھیں کرلیں۔ نیند تو نہیں آئی تھی۔ البتہ نقاہت نے غنودگی طاری کردی تھی بدن کو سکون ملا۔ پچھلے کچھ آرام سے گزرے تھے اس لئے برداشت کی قوت میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ سورج ڈھلے اٹھا اور پھر پڑا۔ شام جھلک آئی اور پھر میں نے سیاہ رنگ کی ایک عمارت دیکھی۔ ٹوٹی دیواریں بکھری ہوئی زمینوں ڈھیر، ایک بڑا سا گنبد۔ قدم اسی جانب بڑھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ کوئی قدیم مسجد تھی سیڑھیاں تک سلامت نہیں تھیں۔ بڑا سا صحن تھا جو بری طرح ادھڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف پتے بکھرے ہوئے تھے۔ دل میں عقیدت کا ایک جذبہ ابھر آیا۔ پیار ابھر آیا یہ سب مجھ سے روٹھے ہوئے تھے۔ گار تو تھا میں لیکن .... لیکن مجھے پیار تھا اس احساس سے پیار تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ کوئی ایسی نہیں آئی جس سے یہ صحن صاف کرتا۔ قمیض اتاری اور صحن کی صفائی میں مصروف ہو گیا وسیع و عریض کو صاف کرتے کرتے اتنی دیر ہو گئی کہ رات ہو گئی سوکھے پتے سمیٹ کر میں نے مسجد کے پچھلے حصے پھینکے اور وہاں ایسے پتوں کے انبار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی باقاعدگی سے صحن صاف کر کے پتے یہاں پھینکتا ہو۔ نہ جانے کون کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ زیادہ غور بھی نہیں کیا۔ اب کوئی کام نہ تھا۔ سیڑھیوں کے پاس آکر ایک جگہ صاف کی اور لیٹ گیا، بھوک لگ رہی تھی دن بھر پیاس کی شدت بھی رہی تھی کہیں سے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ بس چلتا رہا اور یہاں آکر اس مسجد کے پاس کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ بھوک پیاس بے شک تھی لیکن اسے رفع کرنے کا کوئی ذریعہ سامنے نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور شاید سو گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا عالم ہوش تھا کہ دفعتہً کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ شاید ان آہٹوں سے نہیں جاگا تھا بلکہ کسی نے پاؤں پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔ چونک پڑا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ تین چار آدمی نزدیک کھڑے ہوئے تھے۔ چاند نکلا ہوا تھا اور

ماحول روشن تھا ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ سونے کی جگہ نہیں ہے میاں صاحب یہاں کیوں سو رہے ہو، راستہ ہے گزر گاہ ہے" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس ویرانے میں اس وقت مسجد میں آنے والے کون ہیں، جن لوگوں نے مجھے جگایا تھا، وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ سفید لباس میں ملبوس پاکیزہ نورانی چہرے والے بزرگ، نوجوان اور چھوٹی عمر کے لوگ جوق در جوق مسجد کی جانب آرہے تھے اور اندر مسجد میں بڑا اہتمام تھا میں پرشوق انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اس وقت یہ اجتماع کیوں ہوا ہے۔ یہ تجسس میرے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ لوگ صفیں بنا کر بیٹھے تھے میں بھی ایک سمت بیٹھ گیا۔ سامنے ہی ایک منبر لگایا گیا تھا، جو پہلے یہاں موجود نہیں تھا غالباً یہاں آنے والے اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان آدمی سے جس کی داڑھی سیاہ تھی اور رنگ سفید تھا۔ مدھم لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"درس، کیا تم درس میں شرکت کے لئے نہیں آئے؟"

میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلادی تھی پھر میں نے اس معمر شخص کو دیکھا ٹخنوں تک چغہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ براق سفید داڑھی جو سینے تک لٹکی ہوئی تھی۔ بھنویں تک سفید تھیں وہ منبر کی طرف بڑھے اور پھر منبر پر جا بیٹھے اور اس کے بعد انہوں نے وہاں موجود تمام لوگوں کو سلام کیا سب نے بلند آواز سے جواب دیا اور معمر بزرگ کہنے لگے۔

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج تو مسجد پوری بھری ہوئی ہے سبھی آگئے ہیں۔"

"جی امام صاحب، آج ایک عجیب واقعہ بھی ہوا ہے۔" ایک شخص نے کہا۔

"کیا؟"

"ہمارے آنے سے پہلے ہی کسی نے مسجد کا صحن صاف کر دیا ہے جب ہم یہاں پہنچے تو صحن صاف ملا تھا؟"

"ہو گا کوئی بندۂ خدا، خدا کے بندے کہاں موجود نہیں ہوتے۔"

"ایک اجنبی شخص کو ہم نے سیڑھیوں کے پاس پڑے پایا، سو رہا تھا۔ غالباً اسی شخص نے صحن صاف کیا ہو گا۔"

"کہاں ہے وہ......؟" جن بزرگ کو امام صاحب کہہ کر پکارا گیا تھا انہوں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا، پھر کسی کے بتائے بغیر انکی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ فاصلہ کافی تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی آنکھوں سے روشنی کی ایک لکیر نکل کر آگے بڑھی اور مجھے تک پہنچ گئی ہو۔ اس روشنی نے میرا احاطہ کرلیا تھا اور اس کے بعد مجھے امام صاحب کی گونج دار آواز سنائی دی تھی۔

"آگے آؤ۔ کون ہو تم؟" مجھے یوں لگا جیسے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے کھڑا کیا ہو۔ قدم بھی خود بخود ہی آگے بڑھے تھے۔ درمیان میں آنے والوں نے مجھے امام صاحب تک پہنچنے کا راستہ دیا تھا اور میں وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ جونہی امام صاحب کے قریب پہنچا، انہوں نے عمامہ کا لٹکتا ہوا سرا ہاتھ میں پکڑ کر ناک پر رکھ لیا۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کڑی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کون ہے تو، اور یہاں کیا کر رہا ہے؟" میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہیں نکل سکی تھی، امام

صاحب کہنے لگے۔

"کیا تو نے اس مسجد کا صحن صاف کیا تھا؟" میرے منہ سے تو آواز نہ نکل سکی البتہ گردن ہل گئی تو

"کیا تجھے علم نہیں ہے کہ یہ مسلمانوں کی مسجد ہے؟" میں نے امام صاحب کو دیکھا ان کی نگاہیں گڑھی ہوئی تھیں میری آنکھوں میں نہ جانے کیا کیا کیفیات تھیں، وہ چونک کر بولے۔

"مسلمان ہے تو.........؟"

"ہاں، ہاں........." میرے حلق سے جیسے رکی ہوئی بے شمار آوازیں نکل گئیں۔

"مگر تیرے جسم سے تو بدبو اٹھ رہی ہے ایک ایسی بدبو جو کبھی کسی مسلمان کے جسم میں نہیں ہوتی۔ کیسے ہوا، نہیں نوجوان تو صاحب ایمان نہیں ہے، یہ بدبو جو تیرے بدن سے اٹھ رہی ہے، کسی ایمان والے کے جسم سے نہیں اٹھ سکتی، یہ تو، یہ تو غلاظت کی بو ہے براہ کرم صحن سے باہر نکل جا، یہاں درس الٰہی ہوگا اس کے بعد نماز تہجد، تجھ جیسے کسی بے ایمان شخص کو ہم اپنے درمیان جگہ نہیں دے سکتے۔ براہ کرم باہر نکل اس سے پہلے کہ تجھے مسجد کے صحن کو ناپاک کرنے کی سزا دی جائے۔ یہ سزا تجھے صرف اس لئے نہیں جائے گی کہ تو نے کسی بھی جذبے کے تحت سہی، صحن مسجد کو صاف کیا ہے مگر تجھے اپنے درمیان جگہ نہیں گے ہم۔" میں بلک بلک کر رو پڑا میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا۔

"سارے زمانے کا ٹھکرایا ہوا ہوں میں، میں ایک بدنصیب انسان ہوں مجھے سہارا چاہئے، میں قصور ہوں، لاکھوں گناہ کئے ہیں میں نے، تائب ہو رہا ہوں۔ میری مدد کرو، خدا کیلئے میری مدد کرو۔" لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوگئے تھے کسی نے چیخ کر کہا۔

"اس ملحد کو دھکے دیکر مسجد سے باہر نکال دو، اس بدنما شخص کو مسجد میں داخل ہونے کی سزا دو، آخر یہاں آیا کیوں ہے نکالو اسے، نکالو اسے۔"

امام صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ایمان والو! ایمان والوں جیسی باتیں کرو، وہ جو کچھ بھی ہے اس نے کوئی دشمنی نہیں کی ہے، بھولے سے اگر خدا کے گھر میں داخل ہو گیا ہے تو خدا کے گھر سے اسے دھکے دیکر نہیں نکالا جا سکتا، کیسی باتیں کر رہے ہو تم لوگ۔"

چاروں طرف سناٹا چھا گیا، لوگ خاموش ہو گئے کسی کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلی۔ امام صاحب نے کہا۔

"اور تو کہتا ہے تو مسلمان ہے، مگر کیا یہ بتا سکے گا کہ یہ بدبو تیرے جسم میں کیسے داخل ہوئی؟"

"یہ میرے گناہوں کا پھل ہے۔ یہ میرے گناہوں کا پھل ہے، میری مدد کرو، میری مدد کرو۔" میں گڑگڑا کر بولا۔

"گناہوں کیلئے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، مگر یہ کیسا گناہ ہے جس سے تیرے جسم میں کی بدبو پھیل گئی ہے خدا کیلئے ہمارے ان لمحات کو ضائع نہ کر۔ ہم نے اپنے طور پر جو انتظام کیا ہے جس مقصد کیلئے کیا ہے ہمیں اس کی تکمیل کرنے دے تو باہر جا، تیرے لئے توبہ کے دروازے ہوئے ہیں اور یہ دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ جب بھی بارگاہ ایزدی میں تیری توبہ قبول ہو گئی تجھے مشکلات کا حل مل جائے گا لیکن تو جا یہاں سے، یہاں سے چلا جا، فوراً چلا جا۔ ہم اپنی عبادت میں مداخلت پسند نہیں کرتے، اسے راستہ دو........." امام صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہو گیا تھا کہ اب مجھے ان کے درمیان جگہ نہیں ملے گی۔ پھر یہاں رکنا بے مقصد ہی ہے نڈھال اور قدموں سے وہاں سے واپس پلٹا تو امام صاحب نے کہا۔

"سیدھے راستے پر چلے جانا کافی دور جاکر تجھے ایک درخت نظر آئے گا اس درخت میں پھل ہوں گے، ان پھلوں سے تو اپنی شکم سیری کر سکتا ہے بس اس سے زیادہ اور تیری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔"

کچھ نہ سنا نہ جانے کیسے کیسے خیالات دل میں آرہے تھے، جو کچھ ہوا تھا اس پر غور بھی نہیں کر پا رہا احساس تھا کہ میرے جسم میں ایک ایسی بو اٹھنے لگی ہے جو کسی مسلمان کے جسم میں کبھی نہیں ہوتی اور اس بو کی وجہ میں جانتا تھا، بھوریا چرن نے میرے وجود میں کفر اتار دیا تھا۔ یہ کفر میرے دل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکا تھا لیکن جسم غلیظ ہو گیا تھا اور بقول امام صاحب جسم سے وہ بو اٹھ رہی تھی جو ان کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ آہ جو کچھ ہوا ہے، جو کچھ بھی ہوا ہے میں کافی حد تک میرا قصور ہے بلکہ قصور ہی میرا ہے، بلاشبہ انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ مل جائے تو بھول جاتا ہے اپنے آپ کو، کھو جاتا ہے، لیکن ایک لمحہ صرف ایک لمحہ ایسا آتا ہے جس کے بعد ساری توبہ بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے، جو ہو گیا تھا وہ ہو گیا تھا، بے عزت کر کے ہر جگہ سے نکالا جا رہا تھا، پوریا سے بھی اور اب اس مسجد سے بھی، آہ یہ سب کچھ میرے لئے از حد ضروری تھا، گناہوں کی سزا میں تذلیل ہو کم ہے۔ وہاں سے بھی چل پڑا کوئی منزل تو تھی نہیں بس چلتا رہا اور پھر کسی شہری آبادی کے آثار نظر آئے تھے۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ قدم اس طرف بڑھ گئے بستی کے پہلے مکان سے سنکھ بجنے کی آواز سنائی دی اس کے بعد پیتل کا گھنٹہ کئی بار بجا اور پھر ایک موٹی بھدی آواز سنائی دی۔ بھجن قسم کی کوئی چیز تھی، لیکن اس کے بول بڑے دل ہلا دینے والے تھے اور ان کا مفہوم سمجھ میں آرہا تھا۔

جب تک ہنس رہیو چولا میں، چولا جب تک بنو ریو، (جسم میں جب تک روح رہی، جسم برقرار رہا)
اڑ گیو ہنس رہ گئی ماٹی لون ہار د کدر گیو، (روح جسم سے نکل گئی تو بس مٹی کا بدن رہ جاتا ہے اور جب تک چراغ میں تیل رہتا ہے چراغ جلتا رہتا ہے، تیل ختم ہوا چراغ کی بتی جل گئی، تب پھر اس روشنی کو پیدا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟)

بھجن کے ان الفاظ نے ذہن کے نجانے کون سے گوشوں کو چھو لیا تھا۔ دیر تک وہیں کھڑا ان الفاظ پر غور کرتا رہا جب گردن گھمائی تو اوپر سے برہنہ جسم کے مالک، دھوتی باندھے ہوئے، ماتھے پر تلک لگائے، بھاری بدن کے شخص کو دیکھا، چہرے پر شوخی سی چھائی ہوئی تھی، دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر مجھے گھور رہا تھا، نگاہ ملی تو گردن مٹکاتے ہوئے بولا۔

"آج بھی رہ گئے مہاراج، آج بھی کامیابی نہیں ہوئی تمہیں۔"

"جی!" میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھینس کھولنے آئے تھے نا پنڈت کاشی رام کی ارے بہت دن سے تم ہماری بھینس کی تاک میں ہو اور تاک میں، آج ملاپ ہو ہی گیا، ارے دیا کرو مہاراج دیا کرو، غریب آدمی ہیں، اس بھینس سنسار میں اپنا کوئی نہیں ہے۔ ارے اسی کے دودھ پر اپنا جیون گزار رہے ہیں، کیا کرو گے جاکر۔" مجھے ہنسی آگئی، میں نے آہستہ سے کہا۔

"پنڈت جی میں نے تو آپکی بھینس دیکھی بھی نہیں بھلا اسے چرانے کا خیال کیسے آتا میرے دل میں؟"

"تو پھر کیا یہاں پوجا کررہے ہو کھڑے ہوئے۔" وہ کسی قدر طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آپ بھجن گارہے تھے، اسے سننے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔"

"ارے ارے ارے۔ بھجن سننا ہے تو بیٹھ کر سنو بھیا، ایسے کیوں کھڑے ہو، جیسے بھینس پر آئے ہو۔ آؤ آؤ تمہیں اور بھی بہت سے بھجن سنائیں گے۔ ایک تم ہو کہ ہمارا بھجن سن کر چلتے چلتے رک گئے اور ایک وہ ہے جو کہتی ہے کہ بھینس کی اور ہماری آواز میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ذرا آؤ بتاؤ اسے بھجن گاتے ہیں ہم۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور احاطے سے اندر لے گیا، چھوٹا سا مکان بڑا سا دروازہ، اسی چھوٹے سے احاطے کے ایک گوشے میں بھینس بندھی ہوئی تھی، اس کے آگے کھانے پینے کا سامان پڑا ہوا تھا، ایک طرف بانوں سے بنی ہوئی جھلنگا چارپائی جو بیٹھنے کے لئے تھی اور کاشی رام نے مجھے اسی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود مجھ سے کچھ فاصلے پر پتھر سے بنی ہوئی ایک سل پر بیٹھ گئے اور اس کے بعد انہوں نے لہک لہک کر پھر سے اپنا بھجن شروع کر دیا۔ کافی زور دار آواز میں گارہے تھے، آواز میں ذرہ برابر دلکشی نہیں تھی لیکن بول مست کر دینے والے تھے پھر کاشی رام جی اس وقت چپ ہوئے جب اندر سے ایک دھاڑ سنائی دی۔

"کسے پکڑ لائے تم صبح ہی صبح اور کیوں بھینس کی طرح ڈکرائے جارہے ہو، میں کہتی ہوں تمہاری کھوپڑی بالکل ہی خراب ہو گئی ہے............ ارے تو کون ہے رے۔" میں نے اور کاشی رام دونوں ہی چونک کر اس بھیانک آواز کو سنا تھا اور گردن موڑ کر دیکھا تھا، چہرہ تو اتنا بھیانک نہیں تھا، لیکن آواز اور جسامت خوفزدہ کر دینے والی تھی، سفید دھوتی باندھے، ماتھے پر تلک لگائے، آنکھیں نکالے کھڑی ہم دونوں کو گھور رہی تھی۔ کاشی رام اچھل کر کھڑے ہو گئے اور خاتون آگے بڑھ کر ہمارے سامنے آ گئیں۔ پھر ایک پوز بنا کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے بولیں۔

"یہ تم دونوں صبح ہی صبح کیا کررہے ہو؟"

"ارے وہ دیورانی، دیورانی جی، یہ بے چارہ مسافر ہے، بھجن سن کر کھڑا ہو گیا تھا کہنے لگا کہ من رہا ہے، یہ بھجن سن کر، اب سب تیرے جیسے ہی تو نہیں ہوتے کہ کاشی رام کی آواز پسند ہی نہ آئے، اس سے پوچھ کیا حال ہوا ہے اس کا میرا بھجن سن کر۔"

"اور جو حال میں کروں گی اس کا وہ کون دیکھے گا پنڈت جی۔" خاتون نے کہا اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ اصولاً تو مجھے بھاگ جانا چاہئے تھا، لیکن کاشی رام جی میرے سامنے آ گئے۔

"دیکھو دیومتی، گھر کی بات گھر تک رہنی چاہئے، بے چارہ باہر سے آیا ہے، کیا سوچے گا ہمارے بارے میں۔ ارے پربھو بھیا یہ دیومتی جی ہیں، دیورانی، پرنام کرو انہیں۔ کہنے کو تو ہماری دھرم پتنی ہیں پر اصل میں یہ ہمارے دھرم پتی ہیں، سمجھ رہے ہو نا، ارے پرنام کرلو انہیں پرنام کرو..........

"کون ہو تم، کیوں آئے ہو یہاں۔"

"بس وہ دیوی جی، میں، میں۔"

"پربھو نام ہے تمہارا؟" عورت نے پوچھا۔

"تو اور کیا، صورت سے نہیں لگتا تمہیں، کچھ شرم کرو دیومتی، بھگوان نے صبح ہی صبح تمہارے مہمان بھیجا اور تم اس کے ساتھ یہ سلوک کررہی ہو۔"

"اور تم بڑا اچھا سلوک کررہے ہو اس کے ساتھ اپنی پھٹے ڈھول جیسی آواز میں اسے بھجن سنائے جارہے ہو، کاشی رام جی بھینس نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے، جب سے تم نے یہ بھجن وجن گانے شروع کئے ہیں۔"

"ہرے رام ہرے رام، سن رہے ہو پربھو بھیا، بھینس نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اچھا اب تو جا، زیادہ باتیں نہیں کرتے، پتنی ہے، پتنی ہی رہ، میری ماتا بننے کی کوشش مت کر جا مہمان کے لئے بھوجن تیار کر، اری سنتی ہے یا نہیں۔" کاشی رام جی غرائے اور خاتون کچھ ڈھیلی پڑ گئیں، اس کے بعد مڑیں اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں۔ کاشی رام انہیں جاتے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے رازداری سے کہا۔

"ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے، پتہ نہیں کیوں تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت میرے چہرے پر کیسے تاثرات تھے؟" کاشی رام کا انداز عجیب سا تھا، میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا، میں نے آہستہ سے کہا۔

"سمجھا نہیں کاشی رام جی۔"

"ارے بھائی یہ دیومتی ہے میری دھرم پتنی، مگر دیومتی ہی نہیں دیونی بھی ہے، تم نے دیکھا، ایک ہاتھ کسی پر پڑ جائے تو بھگوان کی سوگند گھنٹوں بیٹھا گال سہلائے، وہ تو کبھی کبھی میری دھونس میں آجاتی ہے، پر کبھی کبھی ہی ایسا ہوتا ہے، اس سمے بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں یہی تو پوچھ رہا تھا تم سے کہ میں نے کیسا چہرہ بنایا تھا جس کی وجہ سے یہ ڈر کر اندر چلی گئی، ایسا کم ہی ہوتا ہے، ارے بیٹھو، بس اب سب ٹھیک ہو گیا ہے، اب ہمت نہیں پڑے گی اس کی، تو تمہیں میرا بھجن پسند آیا؟"

"ہاں کاشی رام جی۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے کچھ دن ہمارے مہمان رہو ارے لیکن یہ صبح ہی صبح تم آئے کہاں سے ہو؟"

"مسافر ہوں، بس اس بستی میں نکل آیا، دراصل یہاں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں، کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"نوکری............ کیسی نوکری؟"

"صرف ایسی نوکری کاشی رام جی جس میں دو روٹیاں اور بدن ڈھکنے کیلئے لباس مل جائے............"

"تو پھر تم کون سی غلط جگہ آئے، سیدھے نوکری کے پاس چلے آئے ...... نوکری مل گئی تمہیں۔" کاشی رام جی بولے............

"کیا............؟" میں نے حیرانی سے منہ پھاڑ کر کہا............

"ہاں............" کاشی رام نے گردن جھکا کر مسخرے پن سے کہا۔

"کاشی رام جی اگر............ اگر مجھے واقعی نوکری مل جائے تو میں ہر قسم کی نوکری کرلوں گا............"

"دیکھو پربھو بھیا بات اصل میں یہ ہے کہ ہم تو بڑے اچھے آدمی ہیں لیکن عورتیں عام طور سے بری ہوتی ہیں اور دھرم پتنیاں بن کر تو وہ بہت بری ہو جاتی ہیں، بس یوں سمجھ لو کہ دھرم پتنی بن کر دھرم کے علاوہ اور سب کچھ ہوتا ہے ان کے پاس تو ایسا کرتے ہیں پربھو جی کہ ہم تمہیں نوکر کہہ کر اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں۔ روٹی اور کپڑے کی تو بالکل چنتا مت کرنا۔ خرچ کے پیسے بھی لے لیا کرنا ہم سے، کوئی مشکل بات نہیں، مگر ذرا ان دیومتی جی کو برداشت کرنا ہو گا تمہیں، بڑی خراب ہیں مزاج کی، کام بھی کرائیں گی تم سے گھر کے بھینس کے کام کرنے آتے ہیں تمہیں............؟"

"آپ فکر نہ کریں، میں بھینس کا کام تمام کر دوں گا۔" میں نے کہا............

"ارے ارے ارے، نا بھیا نا، اس بھینس پر تو جیتے ہیں ہم، کچھ نہیں کھاتے پیتے بس دودھ پیتے ہیں اور جیتے

ہیں۔ تم ذرا اسکا خیال کر لینا۔ تھوڑی سی گھر کی صفائی ستھرائی، بازار کا سودا سلف اور کوئی کام نہیں ہے۔ میں وہ اپنے علاوہ اور کسی کو جانے نہیں دیتی، پکاتی کھاتی بھی اپنا ہی ہے، بچہ وچہ کوئی نہیں ہے ہمارے ہاں کام ہو گا تمہارا اور اس کے بعد مزے ہی مزے .... ہم تمہیں بھی بھجن سکھا دیں گے پربھو بھیا۔"

میں عجیب سی نظروں سے کاشی رام جی کو دیکھتا رہا، انہوں نے اپنی بیوی کے خوف سے میرا نام پربھو رکھا اور اب مجھے اسی نام سے پکار رہے تھے۔ ویسے سیدھا سچا آدمی معلوم ہوتا تھا، کام بھی میرے سپرد کر رہا کے نتیجے میں اگر روٹیاں مل جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے ویسے بھی اب کون سا میرا اختیار رہ گیا تھا کہ یہ کام اور وہ کام نہ کروں۔ زندگی اگر تھوڑی سی سکون سے گزر جائے تو کیا حرج ہے اب تو کوئی بات بھی اپنے میں سوچنا مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یہ کروں، وہ کروں، سب بیکار ہے بس زندگی کی سانسیں پوری ہو جائیں، موت مرضی سے مجھ تک پہنچ جائے بس یہی میری زندگی کا مصرف رہ گیا ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی ہے کہ کوئی مجھے پربھو کے نام سے پکارے یا مسعود کے نام سے، جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں رہ گیا تو ان ناموں میں بھی کیا رکھا ہے، ٹھیک ہے مسعود احمد ٹھیک ہے، اب وقت جو کچھ کہہ رہا ہے وہی مناسب ہے۔

میں نے کاشی رام سے کہا .... "آپ کی دیا ہے مہاراج، دیا ہے آپ کی۔ میں تیار ہوں"

"ارے تو پھر بات ہی کیا رہ گئی مگر ذرا ناشتہ کر لینا اس کے بعد بتائیں گے یہ بات اسے پہلے سے پتہ چلا سوچے گی کہ گھر کے نوکر کی، خاطر مدارت ہو رہی ہے اور ناشتہ اٹھا کر لے جائے گی کھا پی لینا، بعد میں بتائیں گے اسے کہ تم کون ہو اور ہم کون ...." میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔ دونوں دلچسپ تھے، دونوں خاصے پُرلطف میاں بیوی معلوم ہوتے تھے۔ چلو اچھا ہے ذہن بٹانے میں آسانی ہو گی دل پر لدھے ہوئے اس بوجھ کو کہاں تک اپنے آپ پر لادھے رکھوں، ٹھیک ہے جیسے بھی گزرے دن آواز ہے، وقت جو کچھ کہے گا وہ ہی سب سے مناسب ہو گا کچھ دیر کے بعد کاشی رام کی دھرم پتنی نے ناشتہ رکھ دیا گرم پوریاں اور آلو کی بھاجی۔ بہت بھو کا تھا پل پڑا کاشی رام جی کوئی بھجن گنگنانے لگے تھے۔

"آپ ناشتہ نہیں کریں گے پنڈت جی..........؟" میں نے پوچھا۔

"ڈٹے رہو...... ڈٹے رہو پربھو مہاراج .... بھگوان نے اپنے بھاگ میں بھینس لکھ دی ہے اس پر گزارہ کر رہے ہیں۔" پنڈت جی نے کہا۔ پنڈتائن مزید گرم پوریاں لے کر اندر داخل ہوئی تھیں، پنڈت جی کی پشت ان کی جانب تھی اور وہ اس وقت یہی الفاظ ادا کر رہے تھے، پنڈتائن کچھ اور سمجھیں، پوریاں بڑے سامنے رکھی تھالی میں پٹخیں اور غرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آج فیصلہ ہو ہی جائے پنڈت جی، اب دوسروں کے سامنے بھی تمہاری زبان کھلنے لگی ہے۔ میں بھینس ہوں، بھینس پر گزارہ کر رہے ہو تم ....؟"

"ہرے رام، ہرے رام، ارے کیا بک رہی ہے، کون بھینس کیسی بھینس، ارے پربھو بھیا گڑبڑ ہو گئی سمجھاؤ ان دیوی جی کو کہ ہم کیا کہہ رہے تھے، ارے دیورانی، ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ناشتہ واشتہ نہیں کرتے بلکہ دیدی جی نے پیٹ کی بیماری ٹھیک کرنے کے لئے ان بند کر دیا ہے اور بھینس کے دودھ پر گزارہ ہے"

"پنڈت جی کسی اور کو چیراؤ، تمہارے منہ سے کئی بار یہ بات سن چکی ہوں۔" پنڈتائن نے غرا کر کہا۔

"ارے پربھو جی اب پوریاں منہ میں ٹھونسے جا رہے ہو یا کچھ بولو گے بھی، ذرا بتاؤ تم ان پنڈتائن کو کہ بات کس کی ہو رہی تھی ان کی یا بھینس کی...... .....؟"

"جج جی ہاں، جی ہاں .... جی ہاں، جی ہاں ......"

جی ہاں، جی ہاں ارے بھائی میں ان پوریوں میں سے ایک بھی پوری نہیں چھوڑوں گا، میری جان تو چھڑا پنڈتائن بھگوان کی سوگند، میں تمہیں بھینس نہیں کہہ رہا تھا بلکہ ذکر ہو رہا تھا ناشتے کا، میں نے کہا بھائی، ہم تو میں بس بھینس کا دودھ لکھا ہے اس پر گزارہ کر رہے ہیں، ہرے رام تو تو ہواؤں سے لڑتی ہے۔"

"پنڈت جی زبان سنبھال کر بات کیا کرو اپنی، میں بھی کسی ایسے ویسے گھر کی نہیں ہوں، تم سے اچھے میرے پتا، کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟"

"ارے پنڈت کی بیٹی اور کیا ...." کاشی رام نے جلدی سے کہا اور مجھے ہنسی آنے لگی۔ پنڈتائن بکتی اندر چلی گئی تھیں اور پنڈت جی سینے پر پھونکیں مار رہے تھے پھر انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"پربھو جی تم بھی بس اپنے گن کے پکے ہو، ناشتہ کئے جا رہے ہو، میری کوئی مدد نہیں کی تم نے، اب تین دن اس کا منہ پھولا رہے گا، ویسے چلو اچھا ہے تم سے ذرا اطمینان سے باتیں ہو جائیں گی............"

پنڈت جی کافی دلچسپ آدمی تھے، میرا بھی جی لگنے لگا پنڈتائن نے بس آ کر برتن اٹھائے تھے اور پنڈت جی کا چہرہ دیکھتے رہے تھے، دیر کے بعد پنڈت جی نے کہا۔

"تو پھر پربھو بھیا آؤ ہمارے ساتھ، گھر کے پچھواڑے ہم نے اپنی دکان کھولی ہوئی ہے، آجاؤ آجاؤ بیٹھ کر تمہارے ساتھ ساری باتیں کریں گے.........."

گھر کا یہ پچھواڑا ایک چوڑی گلی تھا اور یہاں پنڈت جی نے واقعی اپنے بیٹھنے کے لئے ایک بڑے سے کمرے کی جگہ بنا رکھی تھی، ایک چھوٹا سا ڈیسک رکھا ہوا تھا وہاں پر چادر بچھی ہوئی تھی، دری چاندنی تھی، پنڈت جی اس کے پیچھے بیٹھ گئے اور میں ان سے تھوڑے فاصلے پر.......... پھر میں نے ان سے پوچھا..........؟

"آپ کیا کرتے ہیں پنڈت جی..........؟"

"ارے مہان ہیں ہم بس بھگوان جس کام سے دو روٹی دے دیتا ہے وہ کر لیتے ہیں، جیوتش ودیا بھی آتی ہے حالانکہ ستاروں سے ہماری کبھی نہیں بنی، ہمیں دیکھ کر ہمیشہ الٹے سیدھے ہو جاتے ہیں اور مجال ہے جو کبھی صحیح بات بتا دیں، مگر ایک بات ہے ان کا الٹا سیدھا پن بھی اپنے کام آ جاتا ہے ہم بھی لوگوں کو ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ کر الٹی سیدھی باتیں ہی بتا دیتے ہیں۔ بس جیسے ستارے ویسی بات کام چل جاتا ہے اس کے علاوہ کبھی کسی کے گھر میں بھجن کیرتن ہوں تو بھلا پنڈت کاشی رام کے بغیر کیسے ہو سکتے ہیں، چڑھاوا بھی ٹھیک ٹھاک ہی مل جاتی ہے، کتھا کہہ دی، کام چل گیا، شادی بیاہ کی مہورتیں نکال دیں کچھ نہ کچھ کام ہوا کر ڈالا، ویسے اپنا صحیح دھندا جیوتش ہی ہے.......... اور پربھو جی نمک کھا چکے ہو اپنا اس امید ہے کہ نمک حرامی نہیں کرو گے۔ بتا چکے ہیں ہم تمہیں کہ ہمیں جیوتش ویوتش نہیں آتی، کہو کیا کہتے ہو.........؟" پنڈت جی ہنسنے لگے پھر بولے .... "اب تین دن تک تو تم عیش کی اڑاؤ، گھر میں بسیرا دیا ہے ہم نے تمہیں، اس میں ساری برائیاں ہیں مگر سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ جو بات اس سے کہہ دی جائے، اس میں منہ پھلا لے سو پھلا لے، کوتاہی نہیں کرتی، تین دن تک مزے سے مہمان رہو اور چوتھے دن جب اس کا منہ بگڑے تو کام دھندہ شروع کر دینا۔"

میں پنڈت جی کی باتوں پر ہنستا رہا تھا۔ پھر میں نے ان کے پاس بیٹھ کر یہ بھی دیکھا کہ ان کا کاروبار برا نہیں چل رہا ہے اکا دکا لوگ ہاتھ دکھانے بھی آ جاتے ہیں اور پنڈت جی پوری کہکشاں زمین پر اتار کر اس کا جائزہ لے کر اس شخص کے ستارے نکالتے ہیں اور پھر ان ستاروں کے بارے میں ایسی باتیں

بتاتے ہیں اپنے گاہکوں کو کہ نہ خود پنڈت جی کی سمجھ میں آئیں نہ ان کی سمجھ میں آئیں۔ بحالت مجبوری بے چارے پنڈت جی کی فیس ادا کر کے اپنی جان چھڑا کر چلے جاتے تھے۔ اگر پنڈت جی کی ہدایات میں سے کچھ باتیں واقعی کار آمد ثابت ہوگئیں تو پنڈت جی کا بول بالا۔ دن بڑا دلچسپ گزرا کو پنڈت جی کو کتھا کہنے کہیں جانا تھا مجھ سے کہنے لگے۔

"چلو میرے ساتھ، کتھا میں بڑا مزہ آتا ہے اپنی کتھا بھی بس ایسی ہی ہوتی ہے لوگوں کو کبھی اعتراض بھی ہو جاتا ہے بھئی دیکھو نا اب پڑھے لکھے تو ہیں نہیں جو رامائن کا ہر صفحہ کھنگال ڈالیں۔ ایک ایک لفظ پڑھ لیں جو جی میں آتی ہے سنا دیتے ہیں پبلک کے کچھ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اور کچھ تحقیق کرنے نکل جاتے ہیں ایک دو دفعہ ایسا بھی ہوا کہ تحقیقات کرنے والوں نے گلا پکڑ لیا۔ مگر تجربہ ہے زبانیں بند کرنا آتا ہے چلو گے کتھا میں؟"

"پھر کسی دن چلوں گا پنڈت جی، آج رہنے دیجئے۔"

"اچھا ٹھیک ہے تمہارے آرام کی جگہ بتا دیتے ہیں۔"

پیپل کا ایک درخت جو پنڈت جی کے گھر کے صحن کے ایک گوشے میں تھا میری رہائشگاہ قرار دیا گیا اس کے نیچے بانوں کی چارپائی بچھا دی گئی ایک لٹیا رکھ دی گئی۔ بس اس کے علاوہ اور کیا درکار تھا لیکن شام میں نے یہاں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر دیا صحن میں پیپل کے درخت کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جھاڑو لے کر ان کی صفائی پر تل گیا اور پنڈتائن کے چہرے کی لکیروں میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ میں نے پورا صحن صاف کر دیا تھا اور رات ہونے پر چارپائی پر جا لیٹا تھا۔ دماغ کو ایک عجیب سی بند بندی کا احساس ہو رہا تھا اور میں ہر احساس کو ذہن سے جھٹک کر آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا پنڈت جی کے گھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا دن گزر گیا۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے میں انہی تک محدود تھا میں نے باہر جا کر کچھ دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا جو کچھ دیکھ چکا تھا وہی کافی تھا چوتھے دن پنڈتائن، ساڑھی کا پلو کمر کے گرد اڑسے پنڈت جی کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"ایک دن کا مہمان، دو دن کا مہمان، تین دن کا مہمان۔ کیا تمہارا یہ مہمان ہمارے لئے جان نہیں ہو گیا۔" انہوں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے ارے کیے جا رہی ہے یہ بات پیچھے بھی تو کی جا سکتی تھی۔"

"میں عورت ہوں کھری، جو کہتی ہوں سامنے کہتی ہوں کب تک یہ مہمان رہے گا ہاں؟"

"یہ مہمان ہے کہاں پنڈتائن میں نے تو اسے گھر کے کام کاج کے لئے رکھ لیا ہے، دو روٹی کھائے گا سال سوا سال میں ایک دو جوڑی کپڑے بنا دیں گے اور بس۔" پنڈت جی نے کہا اور پنڈتائن ان کی بات سے خوش ہو گئیں۔ انہوں نے اس حقیقت سے مجھے بخوشی قبول کر لیا تھا کیا برا تھا ویسے بھی کونسے تھا بس بیکار زندگی کا بوجھ جیسے کہیں بھی رہ کر گھسیٹا جا سکتا تھا۔ اب تو آرزو میں بھی مرتی جا رہی تھیں تک زندہ رکھتا اپنے آپ کو کیسے زندہ رکھتا، صحن کی جھاڑو اس کے بعد بھینس کی دیکھ بھال اس کے کرنا، سانی بنانا، اسے نہلانا، پھر گھر کی ساری صفائی، بازار کا سودا سلف لانا۔ یہ میری ذمہ داری تھی۔ ویسے ذمہ داری معمولی نہیں تھی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھتا تو شام ہی ہو جاتی

ساتھ بھی مشکل ہی سے ملتا تھا۔ البتہ وہ جب بھی مجھ سے ملتے ان کی آنکھوں میں تاسف کے آثار نظر آنے لگتے تھے میرا حلیہ خراب سے خراب تر ہو گیا تھا پنڈت جی نے ایک شام مجھ سے کہا۔

"ایسے تو تیری ارتھی نکل جائے گی پربھو، مر جائے گا تو تو کام کاج کرتے کرتے یہ آج کل کچھ زیادہ ہی کام ہونے لگا ہے دیکھا تو نے عورتیں ایسی ہوتی ہیں، شادی مت کریو کبھی بالک یہ ہماری ہدایت ہے تجھے ورنہ اس سے زیادہ کام پڑ جائیں گے مگر کچھ کرنا پڑے گا تیرے لئے۔ تجھے اتنا کام کرتے دیکھ کر تو ہمیں بڑا ہی افسوس ہوتا ہے۔"

"نہیں پنڈت جی ایسی کوئی بات نہیں۔ کاموں میں تو جی لگ جاتا ہے اور دن گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا۔"

"انگ انگ جو ٹوٹ جاتا ہو گا اس کی بات کبھی نہیں کرے گا آدمی تو شریف ہے پربھو، اس میں کوئی شک نہیں ہے سوچیں گے تیرے لئے سوچیں گے کہ کیا کریں۔؟"

پنڈت جی اگر سوچ رہے ہوں تو سوچ رہے ہوں میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ یہاں رہ کر دل و دماغ کو ایک عجیب سا سکون ملا تھا میں نے ساری سوچیں بھی ذہن سے نکال ڈالی تھیں۔ وہ رشتے وہ ناتے جن کی تڑپ نے دل کو مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈبو دیا تھا سب کچھ بھلا دیا تھا میں نے، صبح جاگتا اور اپنے کاموں کا آغاز کر دیتا۔ پنڈت جی کے بھجن سننے کو ملتے اور پنڈتائن کی جھڑکیاں اور گالیاں انہوں نے سب کچھ بھول کر ایک مالکن کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک بیحد بد مزاج مالکن کا، ہر کام میں کیڑے نکالتی تھی بات بات پر جھڑکیاں سناتی تھیں لیکن مجھے کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری تذلیل ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے یہی چیز میرے لئے باعث نجات بن جائے مگر پنڈت کے انداز میں اب سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی پنڈتائن سے عموماً ڈرے ڈرے رہتے تھے۔ کچھ کہنے کی مجال نہیں ہوتی تھی کوئی ایسی ترکیب سوچ رہے تھے شاید جس سے بقول ان کے میرا کلیان ہو سکے۔

پھر ایک دن چھٹی کا دن تھا غالباً کوئی ہلکا پھلکا تہوار بھی تھا۔ پنڈتائن نے صبح ہی صبح مجھ سے سارے گھر کی صفائی کرائی تھی اور میرے سر پر کھڑے ہو کر ایک ایک چیز کی نگرانی کرتی رہی تھیں، پنڈت جی بیٹھے ہوئے اچانک ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔

"پربھو، تو نے اپنا ہاتھ نہیں دکھایا کبھی مجھے۔؟"

"ہاتھ؟" میں نے پنڈت جی کو دیکھا۔

"ہاں دیکھیں تو سہی تیری ریکھائیں کیا کہتی ہیں؟"

"بس بس، دماغ مت خراب کر داس کا پنڈت جی اس کی ریکھائیں جو کچھ کہتی ہیں وہ تمہیں کبھی نہیں معلوم ہو گا بیکار اس کا من خراب کرو گے کام کرنے دو اسے۔"

"اری بھاگوان کچھ پتہ تو چلنا چاہئے کون کتنے پانی میں ہے میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کے ہاتھ میں چوری کی لکیر ہے یا نہیں۔"

"چوری کی؟"

"تو اور کیا گھر کھلا رہتا ہے کسی دن بھینس لے کر نکل گیا تو بتا کیا تو مجھے دوسری بھینس خرید کر دے سکے گی۔؟" پنڈتائن ہول کر خاموش ہو گئیں۔ پنڈت جی نے ایک آنکھ دبائی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں سامنے کر لیا کان سے پنسل نکال کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگے اور پھر یک دم اچھل پڑے۔

"ہے بھگوان۔ ہے بھگوان یہ میں نے کیا کیا۔" پنڈتائن قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں چونک کر بولیں۔

"ہائے رام کیا ہو گیا۔ ؟"

"اری تیرا ستیاناس۔ تو نے اپنے ساتھ میری بھی لٹیا ڈبو دی۔" پنڈت جی انتہائی خوف زدہ ہو کر بولے۔ پنڈتائن کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا قریب آ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"کیا ہو گیا کیا ہو گیا۔ ؟"

"بس یہ سمجھ لے جو ہو گیا وہ بہت برا ہو گیا اور .... جو ہو چکا ہے اس سے آگے نہیں ہونا چاہئے۔ پربھو جی ہے معاف کر دیں ہمیں شما کر دیں غلطی ہو گئی پربھو جی غلطی ہو گئی جو کچھ ہوا غلطی سے ہوا۔"

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پنڈت جی کو دیکھنے لگا تو پنڈت جی اپنی پتنی کی طرف رخ کر کے بولے۔

"پربھو مہاراج کا ہاتھ تو دیکھ ذرا۔ نظر تو ڈال ایک۔ نہیں سات ستارے جگمگا رہے ہیں ان کی ریکھاؤں میں یہ دیکھ ایک دو تین۔" وہ پنسل سے اشارہ کر کے ستارے گنانے لگے اور پنڈتائن میرے ہاتھوں پر ستارے تلاش کرنے لگیں جبکہ مجھے خود ان ستاروں کی جھلک کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ایسے لوگ مہان ہوتے ہیں سات پورنیاں ہیں ان کی ریکھاؤں میں اور کسی بھی سمے ساتوں پورنیاں ان کا گھیرا کر سکتی ہیں اور ایسے لوگ اچانک ہی دیوتا بن جاتے ہیں پربھو مہاراج! آپ تو دیوتا ہیں ہمارے لئے ہمارے بھاگ بھی بدل دیں پربھو مہاراج جے بھگوتی جے بھگوتی۔" پنڈت جی دونوں ہاتھ جوڑ کر اوندھے ہو گئے پنڈتائن کے چہرے پر بھی کسی قدر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم تھا یہ تو ہیں ہی ایسے مگر یہ سات پورنیاں ارے تمہاری ایسی کی تیسی۔ مجھے بھی الو بنا رہے ہو۔ تمہاری جیوتش اور میں اسے مان لوں کبھی کوئی بات سچ بھی کہی ہے تم نے۔" پنڈت جی سیدھے ہو کر پنڈتائن کو گھورتے ہوئے بولے۔

"دیکھ دیورانی ساری باتیں مان لیں میں نے تیری جیون بھر تیری مانتا رہا ہوں مگر اس بات میں تو نے کوئی برائی نکالی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کیوں اسے بہکا رہے ہو کام کاج سے بھی جائے گا سسرا۔" پنڈتائن نے کہا۔

"تیری مرضی ہے۔ سوچ لے جتنا اسے ستائے گی بعد میں اتنا ہی نتیجہ بھگتنا ہو گا تجھے اب تو جانے اور تیرا کام مجھے ضرور شما کر دیں مہاراج بلکہ پورن مہاراج۔ پورنیاں آپ کا گھیرا ضرور ڈالیں گی کسی بھی دن کسی بھی سمے۔ یہ میں کہے دیتا ہوں مگر اس سمے آپ صرف دیورانی کی طرف رخ کریں گے جو آپ کے ساتھ زیادتی کرتی ہے میرا کوئی دوش نہیں ہو گا اس میں۔"

"لو میں کونسی زیادتی کرتی ہوں گھر کے کام کاج ہی تو کرا لیتی ہوں ٹھیک طریقہ سے۔ نہ کریں ہم کونسا کہتے ہیں ان سے ہم خود کر لیا کریں گے اپنا کام ارے واہ سات پورنیاں گھیرا ڈالیں گی دیکھیں گے کیسے گھیرا ڈالیں گی؟" پنڈتائن نے کہا اور پاؤں پٹختی چلی گئیں میں پنڈت جی کا چہرہ دیکھ رہا تھا پنڈت جی بولے۔

"بس سمجھ لے تیرا کام بن گیا خود تھوڑا بہت کام کر دیا کر بلکہ ہماری بھینس سنبھال لے تو گھر کے کام کاج سے تو چھٹی مل گئی پنڈتائن سامنے کی بہادر ہیں اندر جا کر جب سوچیں گی تو حلیہ خراب ہو جائے گا۔ سمجھا۔" اور پنڈت جی کا کہنا کافی حد تک درست ہی ثابت ہوا پنڈتائن کی زبان ایک دم بند ہو گئی تھی۔ مجھے خود بھی گھر کے کام کاج سے دلچسپی تھی اپنی پسند سے سارے کام کر لیتا تھا لیکن اب پنڈتائن نے مجھ سے کام لینا

چھوڑ دیا تھا اور عموماً مجھ سے دور ہی رہنے لگی تھیں۔ پنڈت جی کے اس ناٹک پر اکثر مجھے ہنسی آ جاتی تھی مگر میں خود گھر کے کاموں میں الجھ کر اپنا ذہن بنائے رکھتا تھا پنڈت جی سچے جیوتشی تھے یا نہیں میں نہیں جانتا تھا دال روٹی البتہ کما لیا کرتے تھے اور لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

پورن ماشی کی رات عجیب واقعہ ہوا پورے چاند کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا پنڈت جی پوتھی سجائے بیٹھے تھے پنڈتائن کسی بات پر ان سے الجھ رہی تھیں کہ اچانک صحن میں عجیب سی روشنی پھیل گئی۔ اتنی روشنی کہ پورا گھر جگمگانے لگا۔ دھنک کے سات رنگوں میں بنی ہوئی سات حسین دوشیزائیں نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھیں ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے غیر مانوس ساز تھے اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پنڈت جی کو دیکھا کہ یہ شاید میرا وہم ہو۔ مگر پنڈت جی اور پنڈتائن کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں اور دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔

میں نے پریشان نظروں سے ان عورتوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھی۔ انہوں نے جگمگاتے ہوئے لباس پہن رکھے تھے۔ سب کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پیپل کے درخت کے نیچے میرے چاروں طرف دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔ اپنے ساز انہوں نے سامنے رکھ لئے اور پھر فضا میں ان سازوں کی آواز ابھرنے لگی۔ ایک ایسا سحر انگیز نغمہ پھوٹنے لگا کہ دل کھنچ جائے۔ کچھ دیر سازوں کی آواز ابھرتی رہی۔ پھر ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ کچھ گا رہی تھیں۔ سُر حسین تھے آوازیں درد بھریں لیکن بول نامعلوم۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بس دماغ سوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پنڈت کاشی رام اور دیومتی بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ دیر تک یہ نغمہ جاری رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے ساز بلند کئے اور وہ ان کے ہاتھوں سے غائب ہو گئے۔ پھر اچانک ان کے ہاتھوں میں چراغوں سے جگمگاتی چاندی کی تھالیاں آ گئیں۔ تھالیوں میں سات سات چراغ روشن تھے۔ وہ تھالیاں کندھے تک بلند کئے میرے گرد رقص کرنے لگیں۔ رقص کا یہ انداز بھی بے حد دلنشیں تھا۔ ایک ایک میرے سامنے آتی، تھالی کو میرے سر سے چھوتی ہوئی پیروں تک لے جاتی پھر دوسری کے لئے جگہ خالی کر دیتی۔ یہ شغل بھی خوب دیر تک جاری رہا۔ چاند آدھے سے زیادہ سفر کر چکا تھا تو انہوں نے اپنا یہ شغل ختم کر دیا اور پھر میں نے آخری حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ اچانک زمین سے بلند ہونے لگیں ان کے پیروں نے زمین چھوڑ دی۔ ساتوں کی ساتوں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ پیپل کے درخت سے اونچی ہو گئیں، اونچی اور اونچی یوں لگ رہا تھا جیسے سات قندیلیں فضا میں اوپر اٹھتی چلی جا رہی ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ٹمٹماتے ہوئے مدہم ستاروں کی مانند ہو گئیں پھر یہ ستارے بھی ڈوب گئے۔

میں خود بھی اس انوکھے منظر میں اتنا کھو گیا تھا کہ باقی سب میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پنڈت کاشی رام اور ان کی دھرم پتنی بھی یاد نہیں رہے تھے۔ جب سب کچھ نظروں سے دور ہو گیا تو مجھے وہ دونوں یاد آئے اور میری نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ پنڈتائن تو اوندھی پڑی ہوئی تھیں اور پنڈت جی کو جاڑا چڑھا ہوا تھا بالکل ایسے ہی کانپ رہے تھے وہ جیسے سخت سردی لگ رہی ہو۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پنڈت جی کی طرف چل پڑا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا پنڈت جی سمٹتے جا رہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ

میں کچھ بدبدا بھی رہے تھے۔

"یہ سب .... یہ سب کیا تھا پنڈت جی .... ؟" میں نے پوچھا۔

"شما........... شما .... شما کرو مہاراج۔ اندھے ہیں ہم۔ اندھے ہیں تم تو دیوتا ہو۔ مہاراج .... ہے بھگتی ہمیں شما کردو........... شما کردو ہمیں۔" کاشی رام جی میرے پیروں کی طرف لپکے۔

"ارے .... ارے کاشی رام جی .... یہ کیا کر رہے ہیں آپ ....؟" میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"جے بھگوتی۔ شما کردو ہمیں۔ اسے بھی شما کردو۔ ہم نے تو ٹھٹھول کیا تھا ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم سچ پورن بھگت ہو۔ ہے پورن بھگت ہمیں شما کردو۔ اری اٹھ اندر چل۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے مہاراج .... اسے معاف کر دو .... ہم سنسار باسی کیا جانیں کون کس روپ میں ہے۔"

"میری بات سنیں پنڈت جی ....۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"بس ایک بار مہاراج .... ہم سچے جیوتشی نہیں ہیں۔ ناٹک کرتے ہیں پیٹ بھرنے کے لئے۔ دیومتی۔ اری اٹھ جا کم بخت۔ اری اٹھ جا ورنہ ماری جائے گی۔" پنڈت جی دہشت کے عالم میں بے ہوش پنڈتائن کو جھنجھوڑنے لگے۔ وہ میری کچھ نہیں سن رہے تھے بس اپنی کہے جا رہے تھے۔

"میں پانی لاتا ہوں۔" میں نے کہا اور پانی لینے چل پڑا۔ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ پانی لایا پنڈتائن کو خوب نہلایا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ ہوش میں آئیں۔ مجھے دیکھ کر چیخ ماری اور پنڈت جی سے لپٹ گئیں۔

"ارے ارے گرائے گی کیا۔ ہتھنی کی ہتھنی ہو رہی ہے۔ اری سیدھی ہو چل اندر چل ...."

پنڈت جی نے انہیں دھکا دیا وہ خود میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ بمشکل تمام وہ پنڈتائن کو سنبھالے اندر داخل ہو گئے۔ پھر انہوں نے دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ میں بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں میں تو خود ان سے سمجھنا چاہتا تھا۔ پھر کچھ نہ بن سکا تو واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ انوکھا منظر بار بار آنکھوں میں آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھیں اور یہ سب کچھ کیا کر رہی تھیں۔ پیپل کے پتوں کو تکتے تکتے نیند آ گئی۔ .... اور پھر گہری نیند نے سب کچھ بھلا دیا۔

صبح کو ہمیشہ جلدی آنکھ کھل جاتی تھی۔ عادت پڑ گئی تھی اس کی۔ پنڈتائن دودھ دوہنے کی بالٹی ایک مخصوص جگہ رکھ دیا کرتی تھیں اور میں جاگ کر پہلا کام یہی کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جاگ کر ادھر ہی رخ کیا مگر دودھ کا برتن اپنی جگہ موجود نہیں تھا اور اسے نہ پا کر مجھے رات کے واقعات ایک دم یاد آ گئے تھے۔ میں اچھل پڑا آنکھیں زور زور سے بند کر کے کھولیں۔ رات کے واقعات خواب نہیں تھے پنڈت جی خوفزدہ ہو کر اندر جا گھسے تھے اور انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور شاید اسی خوف کے عالم میں آج دودھ کا برتن بھی اپنی جگہ نہیں پہنچا تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آگے بڑھ کر بند دروازے کے قریب پہنچ گیا مگر قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"پنڈت جی .... چاچی جی۔ دودھ کی بالٹی دے دیں"۔ میں نے آواز لگائی مگر اندر خاموشی ہی

رہی۔ دروازے کو دھکیل کر میں اندر داخل ہو گیا۔ پہلے بھی اندر آ چکا تھا۔ دوسری اور تیسری بار بھی آواز دینے پر جواب نہیں ملا تو یہ خیال گزرا کہ دونوں گھر میں نہیں ہیں۔ رسوئی سے دودھ کی بالٹی لے کر بھینس کے پاس آ گیا اور اپنا کام مکمل کر کے دودھ گرم کر کے چولہے پر رکھ دیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ دودھ کا ایک گلاس پی کر باہر نکل آیا۔ احاطہ صاف کیا۔ پنڈت جی اور پنڈتائن نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ انتظار کرتا رہا۔ دس بجے پھر بارہ بجے۔ پھر ایک اور دو .... اب بات پریشانی کی تھی۔ کہاں گئے وہ دونوں پہلے تو سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے کسی کام سے نکل گئے ہوں مگر اب تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ اچانک دل میں خیال آیا کہ کہیں خوفزدہ ہو کر گھر سے بھاگ تو نہیں گئے۔ اس تصوّر سے خود حیرت زدہ رہ گیا۔ گھر ان کا تھا۔ ان کے بغیر تو یہاں رہنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہ ایسا ہی ہوا ہے اب انہیں کہاں تلاش کروں۔ وہ اس گھر کے مالک ہیں اگر میری وجہ سے خوفزدہ ہوئے ہیں تو مجھے گھر چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ کہاں چلے گئے۔ انہیں کہاں تلاش کروں۔ ہو سکتا ہے کسی سے پوچھنے سے پتہ چل جائے۔

احاطے میں دھوپ چلچلا رہی تھی۔ انتہائی گرم دن تھا مگر اس خیال کے بعد گھر میں بیٹھے رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ احاطہ عبور کر کے دروازے پر آ گیا۔ گرم لو کے تھپیڑوں نے مزاج پوچھا۔ اندر تو پھر بھی پیپل کی وجہ سے امن تھا۔ مگر باہر .... پھر دفعتہً ان بے شمار لوگوں پر نظر پڑی جو پنڈت جی کے گھر کے سامنے والے میدان میں سر نیہوڑائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس وہ قطاریں بنائے بیٹھے ہوئے تھے بالکل خاموش۔ حیرانی سے آگے بڑھا اور ابھی ان سے چند قدم دور تھا کہ اچانک وہ اچھل اچھل کر کھڑے ہونے لگے۔ تب میں نے انہیں بغور دیکھا اور میرے بدن میں خون کی گردش رک گئی۔ آہ وہ انسان نہیں تھے۔ لاتعداد بھیانک صورتیں میرے سامنے تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قد، چیتھڑوں میں لپٹے، پتلی ٹانگیں، سوکھے ہاتھ، گنجے سر اور بڑی کھوپڑیاں۔ دہشت کے عالم میں پلٹا اور دروازے سے اندر گھس جانا چاہا مگر .... دروازہ .... وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔ پنڈت جی کا گھر ہی غائب ہو گیا تھا۔ پیچھے وسیع میدان نظر آ رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ پنڈت جی کا مکان کہاں رہ گیا۔ آہ پھر گڑبڑ شروع ہو گئی۔ پھر کسی نئی مصیبت نے میری طرف رخ کیا۔ اب کیا کروں کیا پوری بستی ہی غائب ہو گئی۔ کیا .... مگر سامنے کے رخ پر بہت دور مکانات نظر آ رہے تھے اور میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اب ان کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھوں۔ لرزتے دل کو سنبھال کر آگے بڑھا اور وہ اس طرح ادب سے پیچھے ہٹ گئے جیسے مجھے راستہ دینا چاہتے ہوں۔ میں ان کے بیچ سے نکل کر آگے بڑھا تو پورا مجمع میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ مارچ پاسٹ کرتے ہوئے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ دم ہی نکلا جا رہا تھا۔ خوف کے عالم میں سوچنے سمجھنے کی قوتیں گم ہو گئی تھیں۔ دفعتہً ٹھوکر لگی اور گرنے سے بچنے کے لئے کئی قدم دوڑنا پڑا۔ شیطانی گروہ پیچھے رہ گیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایک دم دوڑ لگا دی تھی مگر خدا کی پناہ۔ انہوں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک اور ہولناک آوازیں سن کر گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ مگر جب میں ان گھروں کے درمیان سے گزرا تو ہر گھر سے دہشت بھری چیخیں ابھرنے لگیں اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نظر آ رہے تھے۔ کون ہیں یہ کون ہیں۔ یقیناً یہ بھیانک وجود انسان نہیں تھے۔ میں دوڑتا ہوا ایک بازار میں پہنچ گیا۔ دکانیں کھلی ہوئی

تھیں۔ دھوپ اور گرم ہوا کی وجہ سے خریداری تو نہیں ہو رہی تھی، مگر دکاندار دکانوں میں موجود تھے۔ انہوں نے حیرانی سے اس جلوس کو دیکھا اور پھر ان کا بھی وہی حشر ہوا۔ بہت سوں نے دکانوں کے شٹر گرائے اور بہت سے دکانوں سے اتر کر بھاگے۔ میں نے رفتار سست کی تو میرے پیچھے دوڑنے والوں کی رفتار بھی سست ہو گئی۔ وہ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ دوڑنا ترک کر کے سست قدمی اختیار کی تو ان سے پیچھا چھڑانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

پھر کسی طرح پولیس کو خبر ہو گئی۔ جونہی بازار ختم ہوا اور ایک بڑی سڑک آئی میں نے سامنے سے پولیس کی دو گاڑیاں آتے ہوئے دیکھیں۔ پولیس کو دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی۔ اب آئی میری شامت۔ میں نے سوچا اور رک گیا۔ پولیس گاڑیاں تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچ گئیں اور ان سے لاٹھی بردار پولیس والے نیچے کودنے لگے۔ دونوں گاڑیوں سے پولیس افسر بھی نیچے اترے تھے۔

"اے۔ کون ہو تم........" ایک افسر نے کڑک کر مجھے اور پھر میرے پیچھے مجمع کو دیکھتے ہوئے کہا مگر پھر وہ صرف انہیں دیکھتا رہ گیا۔ میرا تعاقب کرنے والے ہولناک بھوتوں نے بولنا اور منمنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں ہنسنے بھی لگے۔ ان کی صورتیں اور حلئے ہی کونسے کم بھیانک تھے کہ انہوں نے ایک اور عمل بھی شروع کر دیا تھا وہ دور تک پھیل گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنی کھوپڑی شانوں سے اتار کر دوسرے کی طرف پھینکی اور دوسرے نے اسے گیند کی طرح لپک لیا۔ پھر اس نے وہ کھوپڑی تیسرے کی طرف پھینک دی پھر وہ سب کے سب ہی یہ کھیلنے لگے۔

دوپہر کا وقت ہُو کا عالم۔ اور یہ بھیانک کھیل۔ پولیس کے جوانوں نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ کھیل دیکھا پھر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑے۔ افسر جہاں تک ممکن ہو سکا دلیری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک چیختا ہوا ایک پولیس گاڑی کے نیچے گھس گیا اور دوسرا جان توڑ کر مخالف سمت بھاگا۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اسی پولیس افسر کی طرف دوڑ پڑا۔ میں اس کے ساتھ نکل جانا چاہتا تھا مگر افسر کچھ اور ہی سمجھا۔ اس نے مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔

"ہرے، ہرے، مر گیا رے، ہرے، مم، میں ہرے بچاؤ........ ہرے بچاؤ........ بچاؤ۔ رام دیال........ ہرے رامورے، ہوئے ہوئے ہوئے۔" وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور میں چونکہ اس کی سیدھ میں دوڑ رہا تھا اس لئے اس سے الجھ کر میں اس کے اوپر ہی گرا تھا۔ افسر کٹنے والے بکرے کی طرح چیخا اور ساکت ہو گیا مگر میں چوٹوں کو بھول کر پھر اٹھا تھا۔ نگاہ پیچھے بھی اٹھی تھی۔ وہ اپنے اپنے سر دوسروں سے مانگ کر اس طرح شانوں پر رکھ رہے تھے جیسے ٹوپیاں پہن رہے ہوں، اور پھر وہ مستعدی سے دوبارہ میرے پیچھے لگ گئے۔ میں پولیس افسر کو بھول کر پھر دوڑ پڑا تھا۔ آبادی ختم ہو گئی اور کچھ دور جا کر سڑک بھی ختم ہو گئی۔ آگے کچا راستہ آ گیا تھا اور اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ اس عالم میں حرکت قلب بھی بند ہو سکتی تھی۔ نکلا تھا پنڈت جی اور پنڈتائن کو ڈھونڈنے اور یہ آفت گلے پڑ گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر کھیتوں پر نظر دوڑائی کھیتوں کے بیچوں بیچ مجھے ایک پگڈنڈی نظر آئی تو میں اس پگڈنڈی پر ہو گیا۔ لیکن صاحب کہاں میرے جاں نثار بدستور میرا تعاقب کر رہے تھے، وہ کھیت روند رہے تھے۔ انہوں نے اپنی گردنیں شانوں سے اتار کر مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں پکڑلی تھیں تاکہ وہ کہیں گر نہ جائیں اور وہ میرا پیچھا کر رہے

تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ تو تا حد نگاہ چلا گیا تھا۔ چیخیں کھیتوں میں بھی سنائی دیں۔ یہ ان غریب کسانوں کی چیخیں تھیں جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ عورتیں بھی چیخی تھیں، مرد بھی چیخ رہے تھے مگر میرا پیچھا کسی طرح نہیں چھوٹ رہا تھا۔ بہت فاعلہ طے ہو گیا اور اب میرے دوڑنے کی قوت بھی جواب دے گئی تھی۔ یہاں تک دوڑتا سانس بری طرح پھول گیا تھا، چہرہ سرخ ہو گیا تھا، بمشکل تمام میں نے خود کو زمین پر گرنے سے بچایا اور ایک جگہ بیٹھ کر برح طرح ہانپنے لگا۔ وہ سب پھر میرے گرد مجمع لگا کر اکٹھے ہو گئے۔ اور عجیب و غریب انداز میں اچھلنے لگے۔ پھر شاید کچھ اور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد بیلوں کی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دی تھیں اور میں نے ایک بہت ہی خوبصورت رتھ دیکھا۔ یہ رتھ آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ سازو سامان سے سجا ہوا تھا اور بڑی خوبصورتی سے اسے بنایا گیا تھا۔ رتھ قریب آ گیا اور رتھ سے ایک رتھ بان نیچے اترا۔ یہ اچھی خاصی شکل و صورت کا مالک تھا پیلے رنگ کی دھوتی اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں، بڑی بڑی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، ماتھے پر تلک، میرے سامنے آ کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور نیچے جھک کر بولا۔

"رتھ حاضر ہے مہاراج جہاں بھی چلنا ہو رتھ میں بیٹھ جائیں ہمیں آگیا دیجئے ہم لے چلیں گے آپ کو......"

"بھاگ جاؤ میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ، یہاں سے۔ لے جاؤ یہ رتھ مجھے نہیں بیٹھنا اس میں، میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ........" رتھ بان نے خوفزدہ سی شکل بنائی۔ گردن خم کی اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا واپس رتھ میں جا بیٹھا اور اس کے بعد اس نے بیلوں کو واپس ہانک دیا۔ کچھ دیر کے بعد یہ رتھ میری نظروں سے غائب ہو گیا لیکن وہ مجمع پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا، میں نے تھک ہار کر ان سے کہا۔

"آخر تم کون لوگ ہو، کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو، کیوں لگے ہوئے ہو میرے پیچھے؟" ان میں سے ایک خوفناک شکل کا شخص آگے بڑھا اس کی گردن شانوں پر ہی تھی۔ اس نے منمناتی آواز میں کہا............

"بیر ہیں مہاراج آپ کے، ایک سو اکہتر ہیں پورے، ہمیں آپ کی سیوا کا حکم دیا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ ہم آپ کی سیوا میں رہیں۔"

"اور اس طرح مجھے دوڑاتے رہو............"

"مہاراج آپ کا ساتھ تو دینا ہی تھا آپ چلے سو ہم چلے، آپ دوڑے سو ہم دوڑے، ہم تو بیر ہیں آپ کے، آپ کی پرجا ہیں مہاراج، آپ کی پرجا ہیں ہم۔"

"کیا تم اپنی یہ صورتیں گم نہیں کر سکتے؟" میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کر سکتے ہیں۔" اس شخص نے معصومیت سے جواب دیا۔ اسے شخص کہنا اس کے لئے عجیب سا بے تکا لگتا ہے لیکن میں کسی ایسے جاندار کو کیا کہوں جس کے دو ہاتھ دو پاؤں سر گردن آنکھیں سب کچھ ہو لیکن ذرا ہیئت بدلی ہوئی ہو۔ میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی اچانک سارا مجمع نگاہوں سے اوجھل ہو گیا میں منہ پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑی عجیب و غریب صورتحال تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ سب یہیں موجود ہیں لیکن بس آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ آہ کیا کروں میں کیا کروں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، اتنا دوڑا تھا کہ بھوک لگنے لگی تھی، ایک گلاس دودھ ہی تو پیا تھا۔ بھلا اس سے کیا ہوتا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ادھر اُدھر دیکھا اور اسی وقت وہ شخص پھر نمودار ہو گیا۔

"بھوجن لگا دیتے ہیں مہاراج۔" اس نے میرے اندر کی آواز سن لی تھی، آہ بڑا خوفناک وقت پڑا تھا مجھ پر۔ میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ دفعتہً ہی میں نے اپنے سامنے ایک قالین کھلتے ہوئے دیکھا بڑا خوبصورت قالین تھا وہ اور وہیں کچی زمین پر کھل گیا تھا اور پھر قالین پر بے شمار پھل اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء سجنے لگیں۔ میں حیران نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پورا قالین کھانے پینے کی چیزوں سے بھر گیا تھا، ہنسی بھی آ رہی تھی اپنے آپ پر اور اپنے ان بیروں پر جو نجانے کہاں سے میرے بن گئے تھے۔ میں بڑی پریشانی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہ شخص اب بھی میرے سامنے اسی طرح ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔ جیسے میرے دوسرے حکم کا انتظار کر رہا ہو۔ یہ سارے کے سارے بڑی انکساری کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن جو چیز حقیقت ہی نہ ہو اسے تسلیم کرنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے، میں تو اس حقیقت ہی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ سب کالا جادو تھا۔ اور یہ سب جو میرے سامنے آ کر سجا تھا یہ بھی کالے جادو ہی کے زیراثر تھا۔ حرام اور ناپاک چیز میں اسے اپنے شکم میں نہیں اتار سکتا۔ آہ جو غلاظت میرے وجود میں داخل ہو گئی ہے وہی کونسی کم ہے کہ میں اپنی بھوک کا شکار ہو کر مزید غلاظت اپنے وجود میں اتار لوں۔ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اٹھالو، ان سب کو اٹھالو مجھے نہیں چاہئے یہ سب کچھ، سمجھے اٹھالو، ورنہ میں اسے اٹھا کر پھینک دوں گا۔" میں نے جھک کر قالین کے دونوں سرے پکڑے اور اسے الٹ دیا۔ ساری چیزیں اوندھی ہو گئی تھیں اور سہما ہوا بیر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے مایوس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا دوسرا کوئی میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان سب کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب موجود ہیں۔ بہرحال یہ کھانا پھینک دیا گیا اور میری نگاہیں سامنے کھیتوں میں ان پھوٹوں پر پڑیں جو میں اگ آئی تھیں۔ بھوک واقعی لگ رہی تھی، جو واقعات پیش آئے تھے اب ان میں ایڈجسٹ ہوتا جا رہا تھا، آگے بڑھا ایک پھوٹ توڑی اور اس کا چھلکا دانتوں سے اتار کر اسے آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ پھوٹ نے شکم سیر کر دیا تھا لیکن جس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا اس سے چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ دل میں سوچا کہ یہاں سے آگے بڑھوں اور چند قدم آگے بڑھائے لیکن اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہوں اور میں زمین سے خاصا اونچا اٹھ گیا، میرے منہ سے بوکھلاہٹ بھری آوازیں نکل رہی تھیں۔

"ارے ارے، یہ کک .... کون، کون کیا کیا ہے؟" جواب میں مجھے آواز سنائی دی۔

"ہم اپنے کندھوں پر آپ کو لے کر چل رہے ہیں مہاراج آپ تھک گئے ہیں دھرتی پر سفر نہیں کر سکیں گے۔ بیٹھے رہیں ہم آپ کو گرنے نہیں دیں گے۔"

"نیچے اتارو مجھے، میں کہتا ہوں مجھے نیچے اتارو ...." میں نے کہا اور مجھے نیچے اتار کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ میری وجہ سے پریشان تھے اور میں ان کی وجہ سے پریشان تھا۔ ان بیروں کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ دل کی حالت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ سخت پریشان ہو رہا تھا۔ نیچے اترا اور ایک لمحے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم آگے بڑھا لیکن جیسے ہی پیر آگے بڑھایا پاؤں کے نیچے کوئی لجلجی سی شے محسوس ہوئی۔ دوسرا پاؤں آگے بڑھایا تو اس کے نیچے بھی بالکل ایسا ہی لگا۔ پھر یہ ہوا کہ میں قدم نہیں بڑھا رہا تھا لیکن آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے پیروں کے نیچے اس ذریعے کو دیکھا جو مجھے آگے بڑھا رہا تھا تو ایک بار پھر میرے حلق سے وحشت بھری چیخ نکل گئی۔ دو بڑی بڑی مکڑیاں تھیں اتنی بڑی کہ

میرے پاؤں بآسانی ان کے جسموں پر ٹکے ہوئے تھے اور وہ اپنے بے شمار قدموں سے مجھے آگے بڑھا رہی تھیں۔ میں نے خوفناک چیخ کے ساتھ چھلانگ لگائی لیکن جہاں گرا تھا وہاں بھی ایک مکڑی کی پشت پر ہی گرا تھا۔ اس کے پاؤں، میرے وزن سے پھیل گئے لیکن رفتہ رفتہ وہ پھر پاؤں جما کر کھڑی ہو گئی دوسرا پاؤں آگے بڑھایا تو پھر وہی مکڑی آ گئی، میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"آہ مجھے آزاد کر دو، مجھے آزاد کرو میں تھک گیا ہوں، میں تنگ آ گیا ہوں۔" سامنے ہی ایک درخت نظر آ رہا تھا اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، میں مکڑیوں سے پاؤں اتار کر جہاں بھی قدم رکھتا ایک نئی مکڑی نمودار ہو جاتی اور میرا پاؤں اس کی پشت پر ہی پڑتا۔ میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا بھلا اس لجلجی اور منحوس شے پر کیسے سفر طے کرتا، کس عذاب میں گرفتار ہو گیا آہ کس عذاب میں گرفتار ہو گیا ہوں، میں نے بے بسی سے درخت کی جانب نظر اٹھائی تو ایک بار پھر ایک دہشت بھری کیفیت کا سامنا کرنا پڑا یہاں وہ تھا تو درخت ہی لیکن اس کی دو شاخیں جو سامنے کی سمت پھیلی ہوئی تھیں دو انسانی بازوؤں کی شکل رکھتی تھیں۔ اور اس کا تنا انسانی جسم کی کیفیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تنے کے اس حصے پر جہاں سے بقیہ شاخیں مختلف سمتوں کو تقسیم ہو جاتی تھیں بھوریا چرن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ بھوریا چرن جو مسکرا رہا تھا، ایک طنز بھری شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ یہ بھی نظر کا واہمہ نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت تھی جو روشن دوپہر میں چلچلاتی دھوپ میں میرے سامنے عیاں ہو گئی تھی۔ پھر مجھے بھوریا چرن کی وہی مخصوص مکروہ آواز سنائی دی۔

"کیسے ہو میاں جی، کیا حال چال ہیں تمہارے؟" میں نے نفرت بھری نگاہوں سے بھوریا چرن کو دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا بلکہ شدید غصے کے عالم میں اس پر تھوک دیا۔ بھوریا چرن ہنسنے لگا پھر بولا۔

"اب تو تمہارا۔ یہ تھوک بھی بڑا قیمتی ہو گیا ہے کبھی کسی پر تھوک کر دیکھ لینا مہاراج مگر بڑے بے ایمان ہو تم، بہت ہی ناشکرے اگر یہ سب کچھ کسی اور کو مل جاتا تو چرن دھو دھو کر پیتا بھوریا چرن کے ہمارے کسی دھرم والے کو یہ شکتی مل جاتی مہاراج تو نجانے کیا کر ڈالتا وہ۔ گرو مان لیتا ہمیں اپنا۔ مگر تم تو ہو ہی برے خون والے، گرو پر تھوک رہے ہو۔ ارے سات پورن ماشیاں بنائی ہیں ہم نے تمہارے لئے۔ سات پورنیوں کو سترہ انسانوں کا خون دے کر جگایا ہے اور وہ ساری کی ساری اب تمہاری سیوک بن گئی ہیں۔ ایک سو اکہتر بیر ان کے قبضے میں ہوتے ہیں اور یہ سارے کے سارے تمہارے اوپر بلیدان ہونے کو تیار ہیں۔ دیکھ لیا تم نے، کس کی مجال ہے کہ تمہاری طرف انگلی اٹھا جائے۔ لڑ مریں گے یہ سرے تمہارے لئے اور وہ سات پورنیاں جو اس باؤلے جیوتشی کے گھر میں اتری تھیں۔ سات پراثر ہیں کسی کو مل جائیں تو وہ آکاش پر قدم رکھنے کی کوشش کرے، آکاش باسی بن جائے، مگر تم تھوک رہے ہو ہمارے اوپر، یہ ہے ہمارے دیئے کا صلہ ...."

"بھوریا چرن میں ان ساری چیزوں پر لعنت بھیجتا ہوں کمینے کتے، لعنت بھیجتا ہوں میں تیرے اس دیئے پر۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔

"تو ہم نے کیا اس لئے کیا ہے یہ سب کچھ میاں جی، من کی شانتی چھینی ہے ہم نے تمہاری سمجھے من کی شانتی چھینا ہے اب کیا کرو گے بڑی قوتوں کے مالک بن گئے ہو کسی بستی میں قدم رکھو گے تو لوگ پوجا کریں گے مگر

تمہارے من کی شانتی کہاں ہے، تم نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھینا ہمیں کھنڈولا نہ بننے دیا تو ہم نے بھی تمہارے من کی شانتی چھین لی۔ بڑے دھرم داس بنے پھرتے تھے ایں۔ " بھوریا چرن نفرت بھرے لہجے میں بولا
" دیکھو بھوریا چرن دیکھو، دیکھو۔ "

" ارے کیا دیکھیں، دیکھ لیا سب کچھ، تم نے جو کچھ کیا اس کے نتیجے میں ہم نے تمہارا دھرم بھرشٹ کر دیا اب بھاگتے پھرو سارے سنسار میں، دھرم دھرم چیختے چلاتے .... کچھ نہ ملے گا جب تک تمہارے بدن میں ہمارے پہنچائے ہوئے خون کا ایک ذرہ بھی باقی ہے ذرا واپس آ کر دیکھ لو اپنے دھرم میں بھوریا چرن نہ ہمارا نام، شنکھا ہیں، کھنڈولا بنا دیتے تو کیا بگڑ جاتا تمہارا اس وقت بھی یہی شکتی دیدیتے ہم تمہیں سمجھے اور اس شکتی کے ذریعے گھوڑے تمہارے اشارے پر دوڑتے، جو تمہارے اشارے پر ہوتا، نجانے کیا کیا مل جاتا تمہیں مگر تقدیر کی بات ہے بھاگ کے پھیر ہیں۔ تم اس قابل ہی نہیں تھے، اس قابل ہی نہیں تھے۔ "

" مگر بھوریا چرن اب میں کیا کروں؟ "

" بھاگتے پھرو پاگلوں کی طرح، اتنی بڑی طاقت ہے تمہارے پاس مگر تم اسے استعمال نہیں کر سکتے مہاراج سمجھے کیونکہ تم نے مانا ہی نہیں ہے من سے انہیں، جب انہیں استعمال کرو گے تو بات دوسری ہو جائے گی اور تم بڑے مہان بن جاؤ گے سمجھے مگر تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے کبھی نہیں من کی شانتی نہیں ملے گی تمہیں یہی ہمارا فیصلہ ہے یہی بھوریا چرن کا بدلہ ہے۔ " بھوریا چرن نے اپنے شاخوں جیسے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اس کے بعد اس کے نقوش درخت میں معدوم ہوتے چلے گئے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا اس کے دیئے ہوئے بیر اور پورنیاں اب میری سمجھ میں آ رہی تھیں پنڈت کاشی رام نے صرف اپنی بیوی کو ڈرانے کے لئے اور یہ سمجھانے کے لئے کہ میں بڑا مہان ہوں۔ سات پورن ماشیوں کا اور پورنیوں کا ذکر کیا تھا مگر کم بخت بھوریا چرن نے وہ ساری بلائیں میرے اوپر نازل کر دی تھیں وہیں بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر سوچنے میں مصروف ہو گیا اب تو آنکھیں بھی خشک ہو گئی تھیں اگر میرے دل کا طبی تجزیہ کیا جاتا تو شاید وہ دنیا کا طاقتور ترین دل نکلتا کیونکہ اتنا کچھ برداشت کر لینے کی اہلیت تھی اس میں ان تمام مصیبتوں کے باوجود اس کی دھڑکنیں قائم تھیں مگر کچھ سکون بھی ہوا تھا پتہ چل گیا تھا کہ یہ سب کیا ہے بھوریا چرن انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اس نے مجھ پر سخت محنت کی تھی اپنے کالے جادو کی ساری قوتیں صرف کر دی تھیں وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے دھرم کے کسی شخص کے لئے یہ سب کچھ کر دیتا اور اسے سات پورنیوں اور ایک سو اکہتر ناپاک غلاموں کی قوت مل جاتی تو وہ نہ جانے کیا کر ڈالتا مگر مجھ پر یہ سب حرام تھا میرے لئے یہ بیکار تھا بلکہ ناقابل برداشت تھا میں تو اسے سزا سمجھتا تھا اب تو اس سزا پر دل دکھنے لگا تھا مظلومیت کا احساس ہوتا تھا کیا میں اس کائنات کا سب سے بڑا گنہگار ہوں دوسرے لوگ بھی تو گناہ کرتے ہیں میں نے تو اس کے بعد سے صرف کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے ہمیشہ پچھتایا ہوں لیکن انسان ہوں کہاں تک برداشت کروں، بھوریا چرن نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ میں بے سکون ہو جاؤں اندر کی کیفیت مجھے ان قوتوں سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھے اور بیرونی طور پر سب کچھ میرے قبضے میں ہو آہ .... نہ جانے مستقبل میں اس ایمان کو قائم رکھ سکوں گا یا نہیں۔ .... بھاڑ میں جائیں پنڈت کاشی رام میں تو خود ایک مجبور انسان ہوں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے نفرت بھری نظروں سے

اس درخت کو دیکھا اور دفعتہً میرے دل میں ایک خیال آیا میں نے گردن ہلائی اور آواز دی۔

"میرے بیرو کہاں ہو تم ....؟ "

"یہیں ہیں مہاراج ہم کہاں جائیں گے۔ " سارا مجمع پھر نمودار ہو گیا اب انہیں دیکھ کر میرے دل میں خوف نہیں ابھرا تھا۔

"اس درخت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ " میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا اور وہ سب بھرا مار کر درخت کی سمت لپکے سب نے مل کر درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا پھر اس کی شاخیں توڑنے لگے ایک ایک پتہ کچل ڈالا انہوں نے تنا ادھیڑ پھینکا وہ کیڑوں کی طرح اس سے لپٹ گئے تھے پھر وہ اسی وقت سیدھے ہوئے جب درخت ننھی ننھی لکڑیوں میں تبدیل ہو چکا تھا اس درخت میں مجھے بھوریا چرن نظر آیا تھا مگر میں خود بھی جانتا تھا کہ اس طرح بھوریا چرن ہلاک نہیں ہو جائے گا وہ شنکھا ہے ہزاروں روپ دھار سکتا ہے بس ایک نفرت تھی اس کے خلاف دل میں جو ابھری تھی اور یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہ بیر سچ مچ میرے اشارے پر سب کچھ کر سکتے ہیں وہ سب اپنے کام سے فارغ ہو کر دوبارہ میرے گرد جمع ہو گئے میں نے اس بیر کو دیکھا جو سب سے پیش پیش رہتا تھا۔

" آگے آ .... " میں نے کہا اور وہ آگے بڑھ آیا۔ " کیا نام ہے تیرا۔ "

"کھتوری مہاراج۔ "

"میں کون ہوں؟ "

"ہمارے مالک۔ "

"کیا نام ہے میرا؟ "

"پورن بھگت۔ "

"غلط، میرا یہ نام نہیں ہے۔ "

"ہمیں نام سے کیا لینا مہاراج .... ہمیں تو کام بتاؤ۔ "

"بھوریا چرن کہاں ہے؟ " میں نے پوچھا اور بیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر بولا۔ " چلے گئے یہاں سے۔ "

"کیا تو بھوریا چرن کو مار سکتا ہے۔ "

"وہ شنکھا ہے سوامی، شنکھا کا شریر کہاں ہوتا ہے وہ تو ہوا ہوتی ہے اور ہواؤں پر ہمارا بس نہیں ہے۔ " " اگر بھوریا چرن میرے سامنے ہو تو تم لوگ اس کی مانو گے یا میری۔ "

" تمہاری مہاراج .... ہم تمہارے داس ہیں۔ "

" رتھ لاؤ میرے لئے۔ " میں نے کہا اور کھتوری نے گردن ہلا دی۔ ذرا سی دیر میں رتھ میرے سامنے آ گیا میں رتھ میں جا بیٹھا اور کھتوری نے رتھ سنبھال لیا۔ " چلو" میں نے کہا اور اس نے بیل ہنکانے شروع کر دیئے پیچھے وہ سب ٹیڑھے میڑھے چل رہے تھے دل میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ اس طاقت سے میں تہلکہ مچا سکتا ہوں سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے مجھے جو چاہوں سامنے لا سکتا ہوں بہت بڑی طاقت حاصل ہو گئی ہے مجھے مگر نجانے کیوں آنکھوں میں نمی آ گئی بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ شنکھوں نے دل کو احساس دلا یا تھا کہ یہ سب کیا ہے کالا جادو ہے یہ، جسے کرنے والے کافر ہوتے ہیں ان کی بخشش بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کچھ کھونے کے مترادف ہے اور جو کھو گیا اسے دوبارہ نہیں حاصل کیا

جا سکتا دل میں گرم گرم لہریں دوڑنے لگیں اعضا میں تناؤ پیدا ہو گیا اور میں نے رتھ سے باہر چھلانگ لگا دی لیکن میرے بیروں نے مجھے زمین پر نہیں گرنے دیا تھا وہ زمین پر لیٹ گئے تھے اور میں ان کے اوپر آ رہا لیکن میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا میں نے دیوانوں کی طرح ان پر لاتیں برسانی شروع کر دیں اور وہ ادھر ادھر لڑھکنے لگے، رونے اور چیخنے لگے مگر کسی نے احتجاج نہیں کیا تھا میں نے کھتوری کے ہاتھ سے سانٹا لیا اور بیلوں پر پل پڑا بیل ڈکرا کر بھاگے اور کھتوری اچھل کر سر کے بل نیچے گرا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھاگ جاؤ تم سب بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ۔" میں سانٹا لے کر ان پر پل پڑا اور وہ سب بھاگنے لگے کچھ دیر میں وہ بہت دور نکل گئے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تو بھوریا چرن .... بھوریا چرن کتے تو نے میرے خون میں گندگی گھول دی ہے مجھ سے میرا دین چھین لیا ہے مگر میرا دین میرے دل میں ہے کبھی نہیں چھوڑوں گا اسے۔ کر لے جو تجھ سے کیا جا سکے میں مسلمان پیدا ہوا ہوں مسلمان مروں گا بھوریا چرن .... کتے۔" میری آواز ویرانوں میں گونجتی رہی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا آواز پھٹ رہی تھی گلا دکھ رہا تھا چیختا رہا پھر تھک کر خاموش ہو گیا وہاں سے چل پڑا اب میرے گرد سرسراہٹیں نہیں تھیں۔ میرے بیر بھاگ گئے تھے میں نے جو ان سے کہا تھا۔

چلتا رہا، چلتا رہا پھر ایک بستی آئی لوگ نظر آئے مگر میں نہ رکا اور چلتا رہا گھاس، پھونس، پتے جو ملا کھا لیتا پھر کچھ کھنڈرات نظر آئے ایک ویرانہ تھا اور یہاں کالی کیچڑ اور جوہڑ بھی تھا کچھ جانی پہچانی جگہ محسوس ہوئی پھر یاد آیا یہ تو نیاز اللہ کی بستی تھی عزیزہ رہتی تھی یہاں اور یہ جگہ کیا نام تھا اس کا ہاں شاید رامانندی یہی نام تھا اس کا بھوریا چرن نے اسے ہلاک کر دیا تھا وہ بے چارہ رامانندی اچھا انسان تھا۔

چاروں طرف بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا کھنڈرات پر خوفناک خاموشی طاری تھی سناٹا چیختا محسوس ہو رہا تھا اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا میری نظریں جوہڑ کی طرف اٹھ گئیں کیچڑ جگہ جگہ سوکھ گئی تھی اور اس پر حشرات الارض رینگ رہے تھے میرے منہ سے آواز نکلی۔

"کھتوری ....؟"

"بھگت پورن۔" کھتوری میرے نزدیک ظاہر ہوا۔

"دوسرے کہاں ہیں؟"

"تم سے دور نہیں مہاراج۔"

"بلاؤ سب کو۔"

"ہم تو یہیں ہیں بھگت۔" ان کا پورا ریوڑ نمودار ہو گیا۔ "اس جوہڑ میں ایک شیشے کی بوتل ہے جس میں رامانندی کی لاش ہے اسے تلاش کر کے لاؤ۔" میں نے کہا اور وہ سب جوہڑ کی طرف دوڑ پڑے۔ پورے جوہڑ میں بھونچال آ گیا مکھیوں اور مچھروں کے غول کالے بادلوں کی طرح اٹھے اور چاروں طرف پھیل گئے سخت تعفن پیدا ہو گیا تھا کچھ دیر جوہڑ میں ہلچل رہی پھر ایک بیر وہ بوتل نکال لایا۔

"یہ رہی بھگت۔"

"کھول اسے۔" میں نے بوتل کو ہاتھ لگائے بغیر کہا اور اس نے بوتل کھول دی بوتل سے دھواں نکلنے لگا پھر یہ دھواں زمین پر جم گیا اور کچھ دیر کے بعد وہ رامانندی کی شکل اختیار کر گیا۔ رامانندی کھڑے کھڑے جھول رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں پھر وہ گرتے گرتے سنبھلا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"چلا گیا۔" اس نے سرگوشی کے عالم میں پوچھا۔

"کون۔"

"نظر نہیں آ رہا۔"

"کسے کہہ رہے ہو۔"

"شنکھا .... شنکھا .... وہی بھوریا چرن۔"

"تم ٹھیک ہو رامانندی۔" میں نے پوچھا مگر رامانندی نے اب ان بیروں کو دیکھا جو آہستہ آہستہ جوہڑ سے نکل کر جمع ہو رہے تھے۔

"یہ کون ہیں ....؟ تم کون ہو۔" پہلے اس نے مجھ سے اور پھر ان سے پوچھا۔

"سیوک ہیں پورن بھگت کے۔" کھتوری بولا۔

"پورن بھگت .... ایں .... ارے .... اوں .... اوہ .... جے بھگوتی جے پورن مہاراج۔" رامانندی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے مگر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اس نے آنکھیں مسل مسل کر کئی بار مجھے دیکھا پھر حیران لہجے میں بولا۔

"تم .... مہا بھگت، تم وہی ہو نا .... مسعود احمد .... وہ نیاز اللہ .... معاف کرنا مجھے نہ جانے کیوں میری بات کا برا مت ماننا وہ دراصل تمہاری صورت کا ...." وہ بار بار ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔

"رامانندی میں مسعود ہی ہوں آؤ اندر چلو آؤ پریشان نہ ہو۔" میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھنڈرات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ مگر تم .... پورن بھگت .... یہ ....۔" اس نے بیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ سارے کے سارے پھر میرے پیچھے لگ گئے تھے۔

"تم کہاں آ رہے ہو چلو بھاگ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں میرے قریب مت آنا جاؤ۔" میں گرجا اور وہ خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بھاگنے لگے۔ رامانندی سخت پریشان تھا میں اسے لئے ہوئے کھنڈرات میں آ گیا اور رامانندی سخت الجھا ہوا نظر آ رہا تھا کھنڈرات میں جہاں وہ رہتا تھا وہاں کی حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"یہ سب تمہارا کالا جادو ہے، رامانندی .... تم شاید صورتحال کو سمجھ نہیں پائے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کئی ماہ سے اس شیشی میں بند جوہڑ میں پڑے ہوئے تھے طویل عرصے کے بعد تم اس سے نکلے ہو۔"

"کئی ماہ سے۔" رامانندی گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔

"ہاں کئی ماہ سے، بیٹھ جاؤ میں تمہیں پوری تفصیل بتاتا ہوں بیٹھ جاؤ پریشان مت ہو۔" وہ بیٹھ گیا تب میں نے اسے شروع سے اب تک کی ساری کہانی سنائی اور وہ میرا منہ دیکھتا رہ گیا آخر تک کہانی سننے کے بعد بھی وہ دیر تک کچھ نہیں بولا تھا۔ "اس کے بعد رامانندی تم مجھے بتاؤ گے کہ اب میں کیا کروں ....؟" لیکن وہ اس کے بعد بھی دیر تک کچھ نہ بولا اور سوچتا رہا پھر کئی گہری گہری سانسیں لے کر اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

"کالے جادو کے سولہ درجے ہیں ابتداء نرتھ سے ہوتی ہے نرتھ پہلا جاپ ہے اس میں گندی اور غلیظ چیزوں سے شریر کو بھنگ کیا جاتا ہے اور اس طرح کالا علم سیکھنے والا خود کو کالی قوتوں کے حوالے کر دیتا

ہے دوسرا درجہ سنگنت کہلاتا ہے اس میں کمال حاصل کر لینے کے بعد کیڑے مکوڑوں کا کاٹا اتارا جاتا ہے اسی طرح جاپ ہوتے رہتے ہیں۔ آٹھویں کنٹھا میں لونا چماری اور نویں میں کالی دیوی سے واسطہ پڑتا ہے پورنیاں گیارہویں درجے میں آتی ہیں اور جسے پورنیوں کا اختیار حاصل ہو جائے وہ کالے جادو کا گیارہواں ماہر ہوتا ہے۔ سات پورنیوں کے ایک سو اکہتر بیر ہوتے ہیں جو پورن بھگت کے غلام ہوتے ہیں بارہواں درجہ بھیروں ستوترن ہوتا ہے وہاں سے شنکھا کا سفر شروع ہوتا ہے ایک شنکھا ہی پورن جاپ کرکے اپنا جاپ کسی اور کو دے سکتا ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا مگر تمہیں جو قوت حاصل ہو گئی ہے وہ بہت بڑی ہے تم اس سے نچلے درجے کے سارے ویر داسیوں کو نیچا دکھا سکتے ہو مگر تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔"

"اس نے دھوکے سے میرے ساتھ یہ کیا۔"

"ہاں مگر بہت بڑا کام اسے سترہ انسانوں کی بلی دینا پڑی ہوگی۔"

"تم اب ٹھیک ہو رامانندی۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں مگر اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"کیوں۔"

"وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" رامانندی نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ رامانندی کیا ان بیروں سے میں اپنے ماں باپ اور بہن کا سراغ لگا سکتا ہوں کیا یہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔"

"بھول کر بھی ایسا مت کرنا۔"

"کیوں۔"

"ان سے تم کالے کام لے سکتے ہو صرف کالے کام اگر کوئی ایسا کام لیا ان سے جو کسی طور کالے علم سے تعلق نہ رکھتا ہو تو یوں سمجھ لو وہ شے باقی نہیں رہے گی۔ تمہارے ماتا پتا کا پتہ لگا کر یہ تمہیں خبر دیں گے مگر بعد میں انہیں مار دیں گے ریت ہے کالے جادو کی یہ برائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کسی نیک اور ضرورت کے کام کے لئے نہیں، مثال کے طور پر ان سے اپنے کسی دشمن کو مروا تو سکتے ہو کسی بیمار دوست کے لئے دوا نہیں منگوا سکتے۔"

"لعنت ہے اس علم پر............ اپنے لئے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"راجہ بن جاؤ محل بنوا لو، دولت کے ڈھیر لگا لو، سندر ناریاں اٹھوا لو یہ سب خوشی سے سارے کام کریں گے۔"

"ایک بار پھر لعنت ہے اب بتاؤ میں اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں۔" میں نے کہا اور رامانندی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

"بہت مشکل ہے ایک طرح ناممکن ہے۔"

"رامانندی دل چاہتا ہے یہ سب قبول کر لوں دل چاہتا ہے وہی بن جاؤں جو بنا دیا گیا ہوں۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اور رامانندی چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر وہ آہستہ سے بولا۔ "مسعود جی من کیا چاہتا ہے۔"

"کیا بتاؤں میں کیا بتاؤں۔"

"میں ایک مشورہ دوں۔"

"بولو"

"بڑے کشٹ اٹھائے ہیں تم نے اپنا دھرم بنائے رکھنے کے لئے اب اسے کھونا اچھا نہیں ہوگا مگر تمہاری بات کو میں مانتا ہوں وہی بن جاؤ جو بنا دیئے گئے ہو۔" میں الجھی ہوئی نظروں سے رامانندی کو دیکھنے لگا۔

"نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔"

"بڑے کانٹے کی بات کہہ رہا ہوں بھوریا چرن نے تمہیں اتنا بڑا جاپ دے کر تم سے من کی شانتی چھینی ہے نا۔"

"ہاں یہی اس کتے کا مقصد ہے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"اور تمہارے من کی شانتی چھن گئی ہے اگر تم اپنا من شانت کر لو تو پھر اس کے من کی شانتی چھن جائے گی وہ سوچے گا کہ یہ تو بات الٹی ہو گئی اور پھر وہی کچھ اپائے کرے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ............۔"

"سنسار چرنوں میں جھکاؤ، ہنسو، بولو، خوش رہو تمہاری خوشی اسے بھسم کر دے گی وہ تمہیں خوش ہی تو نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"مگر کالے جادو سے کام لے کر میں اپنے لئے جو کچھ کروں گا رامانندی وہ مجھے میرے دین سے دور سے دور تر کر دے گا۔"

"اپنے لئے کچھ نہ کرنا یہ تو اسے جلانے کے لئے ہوگا کسی کنواری کو پریشان نہ کرنا، کسی کو نقصان نہ پہنچانا، بس ایسے کام کر لینا جس سے اسے پتہ چلے کہ تم خوش ہو من کے بھید تو کوئی اور ہی جانتا ہے باقی سب عمل کے بھید ہوتے ہیں اور تمہارے عمل کے بھید ہی سامنے آئیں گے۔" میں رامانندی کی بات پر غور کرنے لگا کچھ سمجھ میں آ رہی تھی کچھ نہیں آ رہی تھی وہ بے چارہ میرے دین کی نزاکتوں کو کیا جانے بس ایک معمولی سی لغزش اور............ کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے میرے پاس آخر کروں بھی تو کیا کس سے رہنمائی حاصل کروں اور بھوریا چرن وہ تو میرے سلسلے میں ہمیشہ ہی کامیاب رہا تھا بڑا عجیب سا دل ہو رہا تھا۔ میں نے رامانندی سے کہا۔ "تمہارا کیا ارادہ ہے رامانندی۔"

"مجھے کہیں منہ چھپانا ہے مسعود جی، ہاں اگر تم اپنے ساتھ رکھنا چاہو تو مگر میں مجبور نہیں کروں گا۔"

"میرے ساتھ مگر بھوریا چرن تمہیں دیکھ لے گا۔"

"کچھ بگاڑ نہ پائے گا تمہارے ساتھ میرا جیون محفوظ رہے گا ورنہ مجھے خطرہ ہے۔"

"ٹھیک ہے رامانندی مگر تمہیں میرے ساتھ تکلیفیں رہیں گی۔"

"اٹھالوں گا جیون تو بچا رہے گا۔" میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی تھی رامانندی نے کہا۔ "اب یہاں سے نکل چلو مہاراج مجھے اندیشہ ہے کہ وہ یہاں نہ آ جائے۔"

"چلو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی اور ہم دونوں کھنڈرات سے باہر نکل آئے جوہڑ کے پاس سے گزر کر ہم دور نکل آئے میں نے رامانندی سے نیاز اللہ صاحب کے بارے میں کہا۔

"چلو گے ان کے پاس۔"

"دل تو چاہتا ہے مگر............؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے بھوریا چرن کو ان کی طرف متوجہ مت کرو کہیں نقصان نہ اٹھا جائیں ویسے اگر

تم چاہو تو خاموشی سے انہیں کچھ بتائے بغیر ان سے ملے بغیر ان کی کچھ مدد کر دو۔ "

"اوہ ...... نہیں رامانندی نیاز اللہ صاحب ایسے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فقر و فاقے کی زندگی گزار کر اپنا ایمان قائم رکھا ہے یہ غلیظ دولت ان پر مسلط کر کے میں انکی ایماندارانہ زندگی کو داغدار نہیں کرونگا۔"

"ٹھیک کہتے ہو یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے پھریوں کرتے ہیں کہ بستی کا رخ ہی نہیں کرتے کوئی دوسری سمت اختیار کرتے ہیں آؤ اس طرف چلیں۔ " راستے میں میں نے رامانندی سے کہا۔

"ہمیں اب کیا کرنا چاہئے رامانندی۔ "

"وقت اور حالات کے ساتھ دیکھنا ہوگا۔ شنکھا تمہیں افسردہ، ملول اور پریشان دیکھنا چاہتا ہوگا تمہیں اس کے برعکس کرنا ہے تاکہ اسے احساس ہو کہ اس نے جو محنت کی وہ بیکار گئی کیا سمجھے۔ "

"ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔ "

"بیروں کو بلاؤ سواری کیلئے کچھ منگوا لو دور جانا ہوگا ہمیں۔ " رامانندی نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"واہ رامانندی دو قدم چل کر ہی بھول گئے میرے ساتھ رہ کر تمہیں کافی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ میں اس عمل کی قوت سے اپنے لئے کوئی آسائش کبھی حاصل نہیں کروں گا۔ سوچ لو۔ "

"اوہ ہاں سچ مچ بھول گیا تھا کوئی بات نہیں چلو رامانندی تم سے پیچھے نہیں ہے۔ " رامانندی نے کہا اور ہم چل پڑے کوئی منزل ذہن میں نہیں تھی بس قدم اٹھ رہے تھے نہ جانے کس طرف ....!

رامانندی کا ساتھ بڑا سکون بخش تھا تنہائی سے نجات مل گئی تھی اس سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا۔ کسی بھی قدم کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ ہم نے آبادی کا رخ نہیں کیا تھا جان بوجھ کر ویرانوں کی سمت چل پڑے تھے۔ رامانندی نے کہا۔

"بھوریا چرن سے کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے اسکے بیروں نے اسے میرے بارے میں بتا تو دیا ہوگا۔ "

"کیا یہ ممکن ہے؟ "

"ہاں بالکل بیر اسے سب کچھ بتاتے رہتے ہیں انکی حیثیت رپورٹروں جیسی ہوتی ہے پھر وہ تو شنکھا ہے۔"

"تمہارے خیال میں وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔ ؟" میں نے پوچھا اور رامانندی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"تمہارا تو وہ کچھ نہیں بگاڑے گا ویسے یقین کرو مسعود جی تم تقدیر کے دھنی ہو تمہارے بارے میں کچھ باتیں میری سمجھ میں آج تک نہیں آئیں۔ "

"کیا؟ "

"پوری کہانی مجھے معلوم ہے تم عام جوانوں کی طرح زندگی کی آسائشیں چاہتے تھے اور اس کے لئے تم نے دین دھرم کے سارے رشتے توڑ کر ہر ناجائز طریقے سے طاقت حاصل کرنا چاہی۔ بھوریا کو ایک کچے دماغ والے مسلمان لڑکے کی ضرورت تھی جو ایک مقدس مزار کو ناپاک کر کے اس کے غلیظ وجود کو پاک قدموں میں پہنچا دے۔ تم نے ایسا نہ کیا اور وہ کھنڈولا بننے سے رہ گیا۔ چلو اس سمے اس نے سوچا تھا کہ تمہیں خوب پریشان کر کے اپنے کام کے لئے مجبور کر لے گا مگر تم اس کے جال میں نہیں آئے۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہیں ختم کر دیتا اس نے دوسرے کام شروع کر دیئے اس نے تمہیں پورنا بنا دیا۔ آدھا جیون لگ جاتا ہے کسی کو پورنا بھگتی

کرتے ہوئے۔ تب پورنیوں کا حصول ہوتا ہے مگر اس نے تمہیں کالی شکتی دیدی۔ "

"اس طرح وہ میرے دل کا سکون چھیننا چاہتا تھا۔ "

"نہیں مہاراج ایسا کرنے کیلئے تمہیں بلی کتے کا روپ بھی دے سکتا تھا۔ اس نے یہ کیوں نہ کیا؟ "

"تمہارا کیا خیال ہے رامانندی۔ ؟ "

"میرا جیون بھر کا تجربہ کہتا ہے مسعود جی پورے جیون کا تجربہ کہتا ہے کہ کوئی مہان شکتی تمہارے پیچھے ہے۔ کوئی ایسی قوت جو اس کا دماغ پلٹے ہوئے ہے۔ وہ تمہارے لئے برے کام کر رہا ہے مگر الٹے سیدھے کام وہ نہیں سوچ پا رہا۔ "

"ایسی کوئی قوت ہو سکتی ہے۔ میں نے ایک مقدس مزار کی بے حرمتی کرنے سے گریز کیا تھا کیا مجھے وہاں سے فیض مل رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ بزرگ مجھے اس گندی گرفت سے کیوں نہیں بچاتے۔ "

"میرا کچھ اور خیال ہے مسعود میاں۔ "

"کیا ....؟ "

"ماں ہے نا تمہاری ....؟ " رامانندی نے سوال کیا اور میرے قدم رک گئے اعصاب پر جیسے بجلی سی گر پڑی میں نے رامانندی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ....! " میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز ابھری۔

"تو پھر عیش کرو، تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنے عرصہ سے اس سے دور ہو اس کے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ کبھی خالی نہیں رہ سکتے۔ وہ کچھ نہیں جانتی ہوگی تمہارے بارے میں مگر کہتی ہوگی کہ بھگوان تمہیں زندہ سلامت رکھے۔ اور بھگوان تمہیں زندہ سلامت رکھے گا۔ تمہارے دشمن کے دماغ الٹے کرتا رہے گا۔ "

دل ڈوب گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں حسرت و یاس کلیجہ کاٹنے لگی۔ بالکل سچ تھا ایک لفظ جھوٹ نہیں تھا ماں کی دعائیں آفات سے بچائے ہوئے تھیں باقی جو کچھ تھا وہ کئے کی سزا تھی مگر زندگی ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی مرہون منت تھی۔

"ارے ارے۔ مسعود جی سنبھالو خود کو ارے نہیں بھائی روتے نہیں ہیں ملیں گے۔ سب ملیں گے تمہیں۔ بھگوان کے ہاں اندھیر نہیں ہے اور پھر تم تو اپنی معصومیت کے شکار ہو رہے ہو۔ تم اتنے شکتی مان ہونے کے باوجود اس شکتی کو کالی شکتی سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ کچھ ہوگا ضرور تمہارے لئے .... مگر ارے .... ارے .... ارے .... " دفعتہً رامانندی کا حلق بند ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا رگیں ابھر آئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا میں پریشان ہو گیا۔ اپنی کیفیت بھول کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا میں اس کے قریب بیٹھ گیا پھر میں نے اسے آواز دی۔

"رامانندی، رامانندی کیا بات ہے بتاؤ تو سہی کیا بات ہے کیا ہو گیا رامانندی ....؟ "

رامانندی نے آنکھیں بھینچ کر گہری گہری سانسیں لیں اور بولا۔ "کچھ نہیں مسعود جی کچھ نہیں، یار عجیب سی بات ہو گئی ہے پتہ نہیں میرا کیا بننے والا ہے، پتہ نہیں، بیٹھو یار تم بھی جذباتی ہو گئے اور میں بھی نہ

بچ سکا، کچھ ایسی بات ہوگئی جو بڑی عجیب ہو سکتی ہے۔"

"آخر کیا؟" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ بھوریا چرن کا خوف بہر طور دل پر سوار تھا۔ کم بخت کے تصور سے کب جان چھوٹ سکتی تھی اور کچھ نہیں رامانندی کی زندگی ہی اس کے لئے تکلیف دہ ہو سکتی تھی رامانندی اس کا اظہار بھی کر چکا تھا کہ بھوریا چرن اسے نہیں چھوڑے گا لیکن اطراف پُرسکون نظر آرہے تھے اور بظاہر بھوریا چرن کہیں قرب و جوار میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ رامانندی نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور کہنے لگا۔

"کالا جادو سیکھنے کے لئے سب سے پہلا کام دھرم کو کھونا ہوتا ہے دھرم کو ناس کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے گندے گندے کام شروع کئے جاتے ہیں اور دھرم دیوتا کا نام کبھی زبان پر آنے نہیں دیا جاتا یہاں تک کہ عادت پڑ جاتی ہے کالا جادو بھگوان کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف ہی تو ایک کوشش ہے، جو طاقت شیطان کو مل گئی ہے اسی طاقت کا ساتھی تو بننا ہوتا ہے اور جب انسان شیطان کا ساتھی بن جائے تو پھر اللہ کا نام بھگوان کا نام اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا۔ یہاں تک کہ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہو جاتا ہے بھگوان اسے یاد ہی نہیں رہتا میں نے بھی تو یہی سب کچھ کیا تھا، بھگوان کے نام سے اپنا من ہٹا لیا تھا اور نجانے کتنا عرصہ ہو گیا کہ میں نے بھگوان کا نام نہیں لیا ہمارے کالے جادو کے دھرم میں اگر اس کا کوئی پاپی دھرم ہے تو بھگوان کا نام لینا سخت منع ہے بلکہ کالے جادو کا تھوڑا بہت علم اس وقت آتا ہے جب بھگوان کے نام سے دوری اختیار کر لی جائے۔ آج تمہاری ماں کا ذکر کرتے ہوئے میرے منہ سے بار بار بھگوان کا نام نکل گیا۔ یقین کرو یہ نام میں نے نجانے کتنے عرصے سے نہیں لیا۔ یہ تو مجھے ایسے بھول گیا تھا جیسے............ جیسے بس کیا بتاؤں تمہیں............ لیکن تذکرہ ایک ماں کا تھا اور بھگوان کی سوگند ماں بھگوان ہی کا دوسرا روپ ہوتی ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بھگوان پھر سے میرے من میں آگیا۔ بار بار میرے منہ سے اس کا نام نکل رہا ہے۔ آہ اس طرح تو میں بھی تمہارا ہی ساتھی بن گیا۔ مسعود بھیا میں بھی تمہارا ساتھی ہی بن گیا کالے جادو کا گیان تو اب ٹوٹ ہی جائے میرا، میں خود بھی اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کیا پایا میں نے اس سے۔ ابھی تو مکمل بھی نہیں ہوا تھا، چھوٹے موٹے کام کر لیتا تھا اور اس کے بعد جوہڑ میں جا پڑا۔ نجانے کب تک پڑا رہتا۔ اگر تمہارے ہاتھوں نہ نکلتا کیا ملا مجھے اس کالے جادو سے۔ آج بھگوان میرے من میں پھر سے زندہ ہوا ہے تو اب میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ مسعود میں کبھی بھگوان کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بھی اپنے گناہوں سے توبہ کروں گا میں بھی اپنے پاپوں کا پرائشچت کروں گا۔ او بھیا ایک نہیں دو کھیل شروع ہو گئے، اور یہ کھیل خود بخود نہیں شروع ہوا۔ ماں بیچ میں آگئی ہے، میری ماں نہیں ہے مگر میں تمہیں بھیا کہتا ہوں۔ ماں اپنے اس دوسرے بیٹے کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل کر لے، ماں صرف مسعود تیرا بیٹا نہیں ہے ایک بیٹا رامانندی بھی ہے اس کے لئے بھی ہاتھ اٹھا لے ماں، اس کے لئے بھی ہاتھ اٹھا لے۔" رامانندی ایسا بلک بلک کر رویا کہ میرا دل پانی پانی ہو گیا، میں خود بھی ماں کو یاد کر کے رونے لگا تھا لیکن رامانندی نے کچھ ایسی آہ و زاری کی کہ اپنا سارا دکھ بھول گیا اور اسے دلاسے دیتا رہا۔ ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے تھے۔ رامانندی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"میری ماں اس سنسار میں نہیں ہے۔ میں نے تیری ماں کا سہارا طلب کر لیا ہے مسعود بھیا............

ہے تو میرا، جیون وار دوں گا تجھ پر، بس اور کیا کہوں، میں ہوں ہی کس قابل۔" بہت دیر تک ہم ...ت میں ڈوبے رہے رامانندی نے کہا۔

"چلو چلیں آگے بڑھیں بھوک لگ رہی ہوگی تمہیں بھی میں بھی بھوکا ہوں۔ بھگوان کا دیا کھائیں ...ت ہے اس کالی شکتی پر جس کے ذریعے ہمیں سب کچھ مل سکتا ہے مگر ایسا نہیں کریں گے ہم۔ چلو ...ے رہو، چلتے رہو۔" اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ دن گزر گیا شام ہوگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بستی کے ...ار نظر آئے تھے اور شام کے جھٹپٹے کے بعد جب سورج ڈوبا تو بستی کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔" مغرب کا وقت ہو گیا تھا اذان ہو رہی تھی۔ قدم رک گئے رامانندی بھی ...ں آواز کو سننے لگا، میرے دل میں بھی عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں پھر آگے بڑھنے لگا، دور سے مسجد ...ے مینار نظر آرہے تھے۔ اس پر لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور غالباً روشنی بھی کر دی گئی تھی مگر صرف مینار پر باقی ...جد ابھی قدرتی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ بے خودی طاری ہوگئی قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ مسجد کے ...ریب پہنچا تو رامانندی نے شانے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

"اندر مت جا مسعود............ تو گندا ہے۔"

"ایں............" میں چونک پڑا۔ رامانندی کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر رک گیا۔ گردن ہلائی اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پہنچ گیا پھر حسد بھری نظروں سے نمازیوں کو دیکھنے لگا۔ چند ہی لوگ آئے تھے ممکن ہے اسی بستی میں مسلمانوں کی آبادی کم ہو۔ اندر نماز شروع ہوئی تو بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ نیت بندھی تو میں نے بھی نیت باندھ لی ایک بار پھر ذہن پر زور ڈالا اندر قرأت ہو رہی تھی مگر میرا منہ بند تھا۔ ذہن بھی بند تھا پاک کلام گندے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ سجدے میں پڑ گیا۔ بس اسی میں سکون مل رہا تھا۔ نماز ختم ہوگئی نمازی شاید باہر نکل کر چلے گئے تھے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سجدے سے سر ابھارا تو دو تین افراد کو قریب کھڑے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے سلام کیا تو اسے جواب دیا۔

"مسجد میں تو بہت جگہ ہے آپ لوگ باہر نماز کیوں پڑھ رہے تھے؟" اس شخص نے سوال کیا۔

میں نے تھوک نگل کر ادھر اُدھر دیکھا کیا جواب دیتا اس بات کا لیکن گردن گھمائی تو ایک انوکھا منظر دیکھا۔ رامانندی بھی سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ تب ایک لرزتی ہوئی بوڑھی آواز ابھری۔

"آپ لوگ چلیں ہم پوچھ لیں گے۔"

"مسافر معلوم ہوتے ہیں امام صاحب۔ ہو سکتا ہے لباس صاف نہ ہو اس لئے اندر نہ آئے ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو اس کے گھر کے اس احترام کا جذبہ وہ قبول کرے۔ میاں انہیں اٹھاؤ، سجدے اتنے طویل مناسب نہیں ہوتے۔" میں نے حکم دینے والے کو دیکھا تقریباً اسّی سال کی عمر کے سفید ریش انسان تھے۔ بھنوؤں کے بال بھی سفید تھے ڈھیلے سفید چغے اور عمامے میں ملبوس تھے۔ میں رامانندی کے قریب پہنچا اور اسے جھنجھوڑنے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مگر رامانندی کی سجدہ گاہ بھیگی ہوئی نظر آرہی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

میری عقل چکرا گئی۔ رامانندی کو کیا ہو گیا۔ اسی وقت نمازیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔

"مسافروں کے لئے کھانا لے آؤں امام صاحب............؟"

"نہیں میاں خانۂ خدا کے مہمان ہیں۔ اس کے ہاں کیا کمی ہے۔ آپ کا بیحد شکریہ۔ گھر میں جو پکا ہے

ان کے سامنے رکھ دوں گا۔ "لوگ معلوم کر کے چلے گئے۔ امام صاحب ہمارے قریب ہی زمین پر بیٹھ
وہ بغور ہمارا جائزہ لے رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔ "جو کچھ پوچھوں گا تفسیر احوال کیلئے پوچھوں گا۔ جو
کا جواب دینا ناپسند ہو نہ دینا برا نہیں مانوں گا مگر جھوٹ نہ بولنا۔ خانۂ خدا کے سامنے ہو۔"

"نہیں امام صاحب۔ آپ کچھ نہ پوچھیں جواب نہ دے سکیں گے۔"

"خدائے قدوس کی قسم بغرض تجسس نہیں انسان سے محبت مجبور کر رہی ہے کہ تم سے احوال دریافت کروں۔ عمر میں تم سے کہیں زیادہ ہوں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ کسی مشکل میں مشورہ کر لینا ضروری... حل نکل آتا ہے مجھے بتاؤ بچو............ حلیئے سے مشکل کا شکار معلوم ہوتے ہو کیا بات ہے۔؟"

"ہماری داستان طویل ہے۔"

"عشاء تک فراغت ہے مجھے۔ بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہارے نام کیا ہیں۔"

"میرا نام مسعود احمد ہے اور ان کا رامانندی ہے۔"

"رامانندی.............. "امام صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور پھر گہری نظروں سے رامانندی کو دیکھا پھر بولے۔ "جیل سے فرار ہوئے ہو۔؟"

"نہیں.......... "رامانندی نے جلدی سے کہا۔

"کسی قانونی مشکل میں ہو.............؟"

"نہیں۔" رامانندی ہی بولا۔

"الحمد للہ احوال کہو۔ تم بتاؤ میاں خاموش کیوں ہو.........؟ پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

زبان کھل گئی۔ میں نے اول سے آخر تک داستان امام صاحب کو سنا دی اس میں رامانندی کا پورا ذکر آ گیا تھا۔ امام صاحب خاموشی سے سنتے رہے تھے۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد بھی وہ دیر تک خاموش رہے تھے پھر رامانندی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"عزیزی تمہاری داستان تو معلوم ہو گئی۔ مگر تم سجدے میں کیوں پڑے ہوئے تھے۔ تم کیا کر رہے تھے؟"

"اسے جس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ جس کا کہا آپ بول رہے تھے۔ میں اسے... کر رہا تھا۔ میرے گناہوں نے بھگوان سے تو میرا رشتہ توڑ دیا تھا امام جی.............. مگر میں اس کی پناہ... چاہتا ہوں جس کی باتیں آپ لوگوں کو سنا رہے تھے۔ میں کالے دھرم سے نکل کر اس کے سائے... چاہتا ہوں۔" رامانندی نے روتے ہوئے کہا۔ اور امام صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ........... "انہوں نے کہا.............. رامانندی سہما سہما کھڑا ہو گیا تھا میں بھی اٹھ کھڑا ہوا... صاحب نے مڑ کر کہا۔ "نہیں تم یہاں رکو............ تمہیں یہیں رکنا ہو گا۔ مسعود میاں جانا نہیں... سے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے تاکید کرتا ہوں۔ یہ نا آشنا ہے۔ کہتا ہے بھگوان سے اس کا رشتہ... گیا ارے باؤلے نام بدل لینے سے کچھ نہیں ہوتا افکار نہیں بدلنے چاہئیں وہیں سے کفر کی سرحدیں... ہوتی ہیں افکار بدل کر نام بدلو تو بری بات ہے سچ کو کچھ بھی کہہ لو سچ رہتا ہے آؤ۔" انہوں نے رامانندی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مسجد میں لے گئے۔

میں ڈبڈبائی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا اندازہ ہو رہا تھا اپنے بارے میں اندازہ ہو رہا تھا وہ لا مذہب...

...ہے وہ اندر جا سکتا ہے اور میں.............. وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بہت دیر گزر گئی رات ہو گئی پھر وہ ...گئے۔ میں نے مسجد سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا رامانندی کا لباس بدل گیا تھا۔ اس نے شاید ...جب کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔

"کھانا کھا لو مسعود میاں۔" امام صاحب بولے اور میں نے رامانندی کو بغور دیکھا۔ امام صاحب مسکرا کر بولے.........

"ہم نے ان کا نام سرفراز رکھا ہے خدا کے فضل سے یہ مشرف بہ اسلام ہو گئے ہیں۔"

"اوہ اور میں.........؟"

"کھانا کھا لو۔"

"میرا کیا تعین ہے امام صاحب.........؟"

"کھانے کے بعد پوچھ لینا........."

"نہیں میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکوں گا۔" میں نے آخری لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارے وجود میں کلبلاتی غلاظت بول رہی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو تمہارے دل میں حسد نہ پیدا ہوتا۔ خیر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ سنو نا آگہی کی معافی ہے اور جو آشنا ہوتے ہیں ان پر امانتوں کا بوجھ ہوتا ہے اس نے ہندو گھرانے میں جنم لیا اور وہی سیکھا جو دیکھا تم نے بھی وہی سیکھا جو دیکھا تھا۔ اور تمہارا دیکھا وہ تھا جو مکمل تھا۔ تمہارا سنا وہ تھا جو حقیقت تھا۔ فرق صرف آشنا نا آشنا کا ہوا۔ مساجد میں عالم دین کتابوں میں وہ بتاتے ہیں جو نجات کی سمت تعین کرتا ہے اور جان کر بھٹکنا بدترین ہے۔ تم نے ...ے منہ موڑا، بار بار ایک بار نہیں جب تم اس پر بھروسہ کرتے تھے تو خود قدم کیوں بڑھائے تمہیں تو سمت ...گئی تھی اور وہی سمت تمہیں آگے لے جا رہی تھی رخ بدل لیا تم نے کوئی کیا کرے؟ بار بار رخ بدلتے ہو۔ اب انتظار کرو اپنی طرف چلنے والی ہواؤں کا، ہوا کے صحیح رخ کا اندازہ ہو جائے تو اس سمت چل پڑنا۔"

"گویا اب میں تنہا ہوں.......... "میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تمہارے ساتھ توبہ ہے۔ سانسوں کی آخری حد تک۔ موت کے ہوش چھین لینے سے پہلے تک۔ اور میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ تمہیں مایوسی نہیں ہو گی۔ ہاں قبولیت تک انتظار کرنا ہو گا۔"

میں سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ میں چلتا ہوں۔"

"کہاں.......؟"

"پتہ نہیں........"

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ برتن گندے ہو جائیں گے۔"

"ہم انہیں دوبارہ استعمال نہیں کریں گے۔"

"میں یہ نقصان نہیں کرنا چاہتا.........." میں نے کہا اور امام صاحب خاموش ہو گئے۔ میں پلٹا تو

راماننددی بے قرار ہو کر بولا۔

"ایک منٹ مسعود۔ ایک منٹ، میں امام صاحب سے اجازت لے لوں۔ امام صاحب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"اللہ کے احکامات کی تعمیل کرنا بس اس کے سوا کچھ نہیں۔" امام صاحب نے کہا اور کھانے کے برتن واپس لے کر اندر چلے گئے۔ میں نے رامانندی سے کہا۔

"راما........... اوہ معاف کرنا سرفراز تمہارا میرے ساتھ چلنا اب مناسب نہیں ہو گا ہم اسے تحفۂ الٰہی کہتے ہیں تمہیں جو عطا ہوا وہ بہت قیمتی ہے۔ بہتر ہے کہ امام صاحب کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کر کے دینی معلومات حاصل کر و وہ گریز نہیں کریں گے۔"

"آؤ........... " رامانندی نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں ہچکچایا تو اس نے میرے بازو پر گرفت مضبوط کر لی اور پھر مجھے ساتھ لے کر چل پڑا رخ بستی کی طرف تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد اس نے کہا۔ "تمہیں چھوڑ دوں گا میں۔ ابھی تو میرے اور تمہارے درمیان نیا رشتہ قائم ہوتے دیر بھی نہیں ہوئی۔"

"نہیں رامانندی بڑا دلچسپ واقعہ ہو گیا ہے۔" میں نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا...........؟"

"ایک مصرع ہے کہیں سنا تھا۔ اس وقت بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔"

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا"

"خدا نہ کرے تم کافر کیسے ہو گئے؟"

"اب بھی یہ سوال کر رہے ہو۔ امام صاحب نے مجھے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ وہ برتن جن میں، میں کھانا کھاؤں گا نا قابل استعمال ہو جائیں گے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا مسعود........... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پتہ نہیں کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دین کی بات ہے میں کچھ نہیں بول سکتا مگر دماغ کچھ الجھتا ہے۔ میں نے وہ سارے کرم کئے ہیں جن سے کالا جادو آتا ہے گندے اور غلیظ عمل........... صحیح معنوں میں تو میں ملچھ ہوں۔ جبکہ تم نے کالا جادو کیا اور نہ اس کی خواہش کی، میں کیسے پاک ہو گیا؟

"نہیں میں امام صاحب کی بات سے متفق ہوں۔ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کا فرق ہے۔ باریک نکتے کوئی عالم ہی سمجھا سکتا ہے مجھے جگہ جگہ اپنی غلطیوں کی گواہی ملتی ہے بابا فضل نے مجھے کچھ نصیحتیں کی تھیں انہوں نے کہا تھا کہ عمل کا ایک راستہ ہوتا ہے تمہارے نفس کی خواہش تحریک شیطانی ہوتی ہے اس سے بچنا۔ محبتوں کے جال میں پھنس کر فرض کو نہ بھولنا۔ مجھے ایک کراماتی کمبل ملا تھا جسے مجھے ہر وقت رکھنا تھا مگر رشتوں کے جال میں پھنس کر ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا اور کمبل گم ہو گیا۔ میں نے اپنی دانست کے زعم میں کچھ ایسے عمل بھی کئے جن کے بارے میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ شیطان کے بچھائے ہوئے جال ہیں۔ مجھ سے ایسی غلطیاں بار بار ہوئی ہیں۔"

"امام صاحب نے تمہیں توبہ کرنے کے لئے کہا ہے۔"

"ہاں کروں گا مگر قبولیت کا وقت نہ جانے کونسا ہو گا تم جس رشتے کی بات کر رہے ہو افسوس وہ قائم نہ ہو سکا۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اب اور کیسے سمجھاؤں۔ بتا تو چکا..........." میں نے کہا۔

"یعنی دین کا رشتہ...........؟"

"ہاں۔"

"میں اس رشتے کی بات کہاں کر رہا ہوں؟"

"تو پھر...........؟" میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"اوہ نہیں میرے بھیا........... ماں کا رشتہ قائم ہوا ہے میرے اور تیرے درمیان۔ میں نے ماں سے کہا تھا کہ اپنے دوسرے بیٹے کے لئے بھی ہاتھ اٹھا لے اس نے ضرور میرے لئے دعا کی ہو گی اور دیکھ لے مسعود مجھے اس کی دعا سے کیا مل گیا۔ کل ماں نے مجھ سے بھیا کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دوں گا اسے۔"

میں خاموش ہو گیا ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ بازار کھلے ہوئے تھے ایک نانبائی کی دکان پر بیٹھ کر اس نے کھانا طلب کیا اور سرگوشی میں مجھ سے بولا۔ "تمہیں میری قسم مسعود خاموش رہنا۔"

میں نے خاموشی سے کھانا کھا لیا تھا اپنی کیفیت کا خود اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کیا ہو رہا ہے مجھے شکایت ہے بغاوت ہے صدمہ ہے نہ جانے اس وقت میری سوچ کیا ہے۔

"اب بستی چھوڑ دیں کیا خیال ہے...........؟" رامانندی بولا۔ "نجانے کونسی بستی ہے؟"

"کوئی بھی ہو، کیا فرق پڑتا ہے ریلوے اسٹیشن کا پتہ پوچھ لیتے ہیں کہیں بھی نکل چلیں گے۔"

"تھکن ہو گئی ہے۔ رات گزار لیں کل چلیں گے۔"

"ضرور ٹھیک ہے وہ سامنے پیپل کا درخت ہے اس کے نیچے چبوترا بنا ہوا ہے رات گزارنے کیلئے بہترین جگہ ہے۔" ہم دونوں چبوترے پر جا لیٹے۔ پیپل کی جڑ میں ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے پاس مٹھائی کے دونے پڑے ہوئے تھے رامانندی نے مجھے بتایا........... "یہ گوبردھن پوجا کا سامان ہے صبح جلدی اٹھ جائیں گے یہاں سے، ہو سکتا ہے ہندوؤں کو اعتراض ہو۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"تم اب تک الجھے ہوئے ہو...........؟"

"ٹھیک ہو جاؤں گا..........."

"کوشش کر کے سو جاؤ نیند سکون دے گی۔"

"ہاں۔" میں نے کہا سر کے نیچے ایک اینٹ رکھی اور کروٹ بدل لی۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا، "سو گئے نندی...........؟"

"یار مجھے سرفراز کہو...........!"

"سو گئے سرفراز...........؟"

"نہیں!"

"کیا بھوریا چرن کو ان حالات کے بارے میں معلوم ہو گا...........؟"

"ہو سکتا ہے..........."

"اس پر کیا اثر ہوگا؟"

"اللہ جانتا ہے مجھے اب بالکل پروا نہیں ہے بڑا سکون ملا ہے مجھے مسعود بیان نہیں کر سکتا بھوریا کا پدم معلوم ہے تمہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"شناختی نشان ...."

"مکڑی ....؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جہاں مکڑی کو دیکھو لو ہوشیار رہنا۔ اس کے بیر اسی شکل میں ہوتے ہیں۔"

"ہاں میرا واسطہ پڑ چکا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر خاموش ہوگیا۔ آنکھوں میں غنودگی تیرنے لگی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیند بھگانے لگا۔ سو گیا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ رامانندی کی گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا رامانندی پر ایک نگاہ دیکھا اور پھر بلی کی طرح دبے قدموں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بستی کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس منہ اٹھا کر چل پڑا تھا اور رفتار تیز رکھی تھی تاکہ رامانندی مجھے تلاش نہ کرے۔ بہرحال اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

خدا کی دین تھی۔ رامانندی کو بہت کچھ مل گیا تھا۔ وہ خوش نصیب تھا، میں تو اب اپنے نصیبوں کو بھی نہیں رو سکتا تھا۔ سفر ہی کیا تھا بے مقصد چلت پھرت تھی۔ میں چلتا رہا۔ جس علاقے میں پہنچا وہ انتہائی ویران اور ہیبت ناک تھا کہ کلیجہ منہ کو آجائے۔ رات ہونے لگی تھی۔ شاید کوئی تباہ شدہ بستی تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں کے ڈھیر، کالے مٹھ، وہیں بسیرا کرلیا۔ لیکن جونہی چاند نے سر ابھارا وہاں زندگی پھیل گئی۔ پتھروں نے انسان اگل دیئے۔ مگر صرف نام کے انسان بھیانک شکلوں کے مالک تھے۔ ان کے درمیان ایک عورت کالی کا روپ دھارے چل رہی تھی۔ ان کا رخ میری طرف ہی تھا وہ میرے قریب آکر سجدے میں گر پڑی۔ اور میں چیخ پڑا۔

"اے ناپاک عورت۔ یہ کیا جہالت ہے، انسان کو سجدہ نہیں کیا جاتا۔"

"جے پورنا۔ جے پورنا بھگت، تو انسان کہاں ہے، تو پورن دیوتا ہے، میں پورن جاپ کر رہی ہوں مجھے گیان دے۔"

"تو پورنیاں حاصل کرنا چاہتی ہے؟"

"اوش پورن دیوتا۔" اس نے سرخ زبان لپلپاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کوئی ایسا عمل کر کہ میرے قبضے میں جو پورنیاں ہیں وہ تیری ہوجائیں۔"

"ہیں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"مہاوتی مہاراج۔ کالکی ہوں۔ پورن بھگت بننا چاہتی ہوں۔"

"یہ پورنیاں مجھ سے لے لے مہاوتی۔ میں خوشی سے تیار ہوں۔" میں نے کہا اسی وقت عقب سے ایک مکروہ صورت بوڑھا آگے آگیا۔

"اس کے لئے آپ کو اپنے شریر میں دوڑتا خون اسے دینا ہوگا مہاراج۔ اسی میں تو... شکتی ہے۔"

"میں تیار ہوں۔" میں نے کہا اور بوڑھے نے خوشی سے قلقاری مار کر کہا۔

"مہاوتی۔ دھیرنا چنڈی آج تجھے سنسار دینے کو تیار ہے جلدی کر چندر ماں نے واپسی شروع کرلی تو ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔"

مجھے ایک پتھر کی چٹان پر بٹھا دیا گیا۔ بوڑھے نے ایک مڑا ہوا خنجر مہاوتی کو دیا اور وہ خنجر ہاتھ میں لے کر میرے گرد رقص کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے پہلا وار میرے بازو پر کیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میرے وجود میں آگ دوڑ گئی لیکن میں نے آہ نہ کی۔ دل میں سوچا۔ معبود حقیقی مجھے کفارہ ادا کرنے کی ہمت عطا فرما۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ مجھے ان زخموں کو برداشت کرنے کی قوت دے جو میرے وجود کو اس غلاظت سے نجات دلا دیں۔ چاروں طرف شور مچ رہا تھا۔ مہاوتی نے میرے جسم پر درجنوں وار کئے اور میرا خون چوستی رہی۔ میرا وجود سُن ہوگیا تھا۔ مہاوتی سیراب ہوگئی۔ وہ میرے پاس سے پلٹی تو اس کے پاؤں زمین سے اونچے اٹھے ہوئے تھے۔ وہاں موجود بھیانک لوگوں نے نعرے لگائے۔

"جے مہاپورنی۔ جے مہاوتی۔" مگر اس وقت میں نے بھوریا چرن کو دیکھا جو بگولے کی طرح وہاں پہنچا تھا۔ مہاوتی نے اسے دیکھ کر کہا۔

"جے پدم شنکھا۔ کیسے آنا ہوا؟"

"اری او حرام خور کالکی۔ یہ کیا کیا تو نے۔ یہ دھوکہ کیا ہے تو نے، اپرم شردھاتیوں کو..........!"

"کالی کلکتہ والی کا شردھان ہے مہاراج جے مہا کالی۔ جسے دیدے اس سے پوچھ تو اس نے تو یہ بوجھ خود اتارا ہے۔"

بھوریا چرن نے غصے سے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاتیں، گھونسے، تھپڑ..........

"دیالو مہاراج۔ پورن شکتی دیدی اس کالکی کو تم نے مگر بچ سکو گے مجھ سے؟ تمہیں تو میں نشٹ کردوں گا.........." میں نقاہت سے ہنس پڑا۔

"خدا کا شکر ہے مجھے اس غلیظ خون سے نجات مل گئی۔"

"مجھ سے نجات نہیں ملے گی۔" اس نے میرے گلے میں ایک زنجیر باندھی اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ نجانے کب تک وہ میرے بے جان وجود کو گھسیٹتا رہا۔ میں حواس میں ہی تھا۔ پھر وہ خود ہی تھک کر رک گیا۔

"ارے او مہان پرش ذرا گردن تو اٹھا رے۔ بہت بڑا انسان ہے تو.......... بڑا دھرماتما ہے اب بول کیسی بیت رہی ہے؟" میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ بھوریا چرن کا چہرہ بگڑا ہوا تھا، میرے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے اس مسکراہٹ کو دیکھ کر بھوریا چرن اور آگ بگولہ ہوگیا۔ "بڑا بے غیرت ہے بھئی، نا دیکھے تیرے جیسے نا دیکھے حالت بکٹ ہے اور دانت نکل رہے ہیں۔"

"میرے دین میں اسے صبر کہتے ہیں بھوریا چرن۔"

"چنتا مت کر بچہ سارا جیون صبر ہی کرنا پڑے گا۔"

"مجھ سے زیادہ تیری حالت خراب ہے بھوریا۔"

"لات دوں گا جبڑا ٹوٹ جائے گا۔ زیادہ بک بک مت کر، کوئی نہ بچا سکے اب، نہ تیرا دھرم، نہ بیر، سب کچھ دیدیا اسے باپ کا مال سمجھ کر۔"

اس بار مجھے زور کی ہنسی آگئی۔ بھوریا چرن کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ اپنی تمام تر تکلیفوں کے باوجود میں

ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور اس بات سے وہ بالکل ہی دیوانہ ہو گیا، دانت پیس کر آگے بڑھا، میرے قریب آ کر رک گیا پھر بولا۔

"مرے ہوئے کو کیا ماروں، ایسا مرے گا ایسا مرے گا کہ دیکھنے والے کان پکڑیں گے تجھے، ایسا بدلہ لوں گا تجھ سے کہ سنسار میں کسی نے کسی سے ایسا بدلہ نہ لیا ہو گا، تو نے تو میرا ستیاناس کیا ہے مگر بیٹا اپنا بھی ستیاناس دیکھنا، ابھی کیا دیکھا ہے تو نے، بدلہ لوں گا تجھ سے مسلمان کے پلّے بدلہ ایسا بدلہ لوں گا کہ یاد کرے گا۔ ایسے گھاؤ لگاؤں گا تیرے دل میں کہ میرے من کے سارے جائیں گے۔ چل اٹھ اور اب تو بول کر دکھا نا ذرا دیکھوں گا کیسے تیری زبان چلتی ہے۔" اس نے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی، میرے قریب پہنچا اور یہ مٹی میرے منہ میں بھر دی۔ عجیب سی غلیظ تھی بدبودار۔ میں تھو تھو کرنے لگا، مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔ مگر جسم اس طرح بے جان تھا کہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ غالباً ہاتھوں اور پیروں کے بل چل کر یہاں تک جو آیا تھا تو وہ بھی بھوریا چرن ہی کی دی ہوئی قوت تھی ورنہ جس شخص کے جسم سے سارا خون بہہ جائے وہ جنبش کیسے کر سکتا ہے۔

بمشکل تمام منہ کی مٹی صاف کی اور اس کے بعد بھوریا چرن کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔

"اب ذرا ایک لفظ بھی بول کر دکھا دے اپنے منہ سے۔ بول کر دکھا اپنے منہ سے ایک لفظ بول، مان لیں تیرے کو، کہ بہت دھرماتما ہے ....؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ارے او نواب کے جنے، چل ذرا چل آگے بڑھ۔" اس نے زنجیر پکڑی اور مجھے گھسیٹنے لگا۔ گھسیٹ ہی رہا تھا، نجانے کتنی دور تک گھسیٹتا رہا۔ پھر شاید کوئی آبادی آ گئی تھی، دماغ تو ساتھ نہیں دے رہا تھا، کتوں کے بھونکنے کی آواز تھی جس نے یہ احساس دلایا تھا کہ اس وقت کسی آبادی کے قریب سے گزر رہا ہوں میں۔ نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے اور کچی زمین تھی، پتہ نہیں بدن کی کیا حالت ہو رہی تھی، پتہ نہیں میرا جسم گھسٹ رہا تھا یا شاید مردہ حالت میں مجھے گھسیٹے لے جا رہا تھا۔ پھر اس نے میری زنجیر چھوڑ دی۔ پٹہ گلے سے نکال دیا اور مجھے وہیں ڈال کر کہیں چلا گیا۔ میں آسمان کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیا کیفیت ہو رہی تھی، میں اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا، بہت دیر کے بعد بھوریا چرن واپس آیا، خوش نظر آ رہا تھا، مجھے آواز دی تو میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کھوتیا گی جی مہاراج، کیسے حال ہیں تمہارے ....؟" میں نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز غائب ہو چکی تھی، بہت ہی زور لگایا پتہ نہیں جسمانی کمزوری تھی یا پھر بھوریا چرن نے جو حرکت کی تھی اس کا نتیجہ۔ بولنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو وہ قہقہے لگانے لگا، خوب ہنسا پھر بولا۔

"بھوک لگ رہی ہو گی۔ ایں۔ لگ رہی ہے نا بھوک کھانا کھلائیں تمہیں۔ لو یہ کھا لو۔" اس نے ایک برتن سامنے کیا، ایک عجیب سی تعفن زدہ چیز تھی وہ، اس نے میرے چہرے کے بالکل قریب کر دی۔ ایک بار پھر حالت بگڑنے لگی تھی۔

"ڈرو نہیں مہاراج۔ بہت اچھا بھوجن ہے۔ گائے کا گوبر ہے، یہ کھا لو۔ کھا لو۔ بہت اچھا ہوتا ہے اور پھر ہے بھی گائے کا، لو۔" اس نے پلیٹ میرے منہ پر پھینک دی اور گوبر میرے چہرے پر تھپ گیا۔ ہاتھ اٹھا کر بمشکل تمام چہرہ صاف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بھوریا چرن کہنے لگا۔

"چلو یہ بھوجن ناپسند ہے تو ادھر دیکھو وہ کھا لو۔" اس نے پاؤں سے میرا رخ دوسری جانب کر دیا۔ تب گندی نالی تھی جس میں سفید رنگ کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ بھوریا چرن ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ کیڑوں کو مٹھی میں بھرا اور میرے چہرے کے قریب کر دیا۔

"بڑے بڑھیا ہیں یہ، کھا کر دیکھو، آتما کو شانتی ملے گی پیٹ بھی بھر جائے گا۔" میں نے وحشت کے عالم میں رخ بدل لیا اور بھوریا چرن قہقہے لگانے لگا۔ "ستیاناس مار دوں گا تیرا ستیاناس مار دوں گا تیرا، چل اٹھ.......... اٹھ۔" اس نے جھک کر میرے بال پکڑے اور اس کے بعد مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پیروں میں بالکل جان نہیں تھی کھڑا ہوا تو زمین پر گر گیا۔ پھر دوبارہ کھڑا ہوا اور دوبارہ زمین پر گر گیا۔ بھوریا چرن بدستور قہقہے لگا رہا تھا اور میں نے اپنا ذہن و دل ساکت کر لیا تھا نہ غصہ آ رہا تھا نہ افسوس ہو رہا تھا بس دل میں ایک ٹھنڈک سی اتر رہی تھی اور شاید یہ ہی ٹھنڈک مجھے زندہ رکھنے کا باعث تھی۔ بھوریا چرن نے میرے منہ پر تھوکا اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں پڑا رہا۔ بدن میں تحریک ہی نہیں ہو رہی تھی، کئی بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور اس کے بعد وہیں رخسار زمین پر رکھ کر ساکت ہو گیا۔ موت کتنی بے رحم ہے، وہ جو جینا چاہتے ہیں، وہ جو زندگی کی تمام آسائشیں چاہتے ہیں وہ جو تندرست و توانا ہیں، انہیں ایک لمحے میں لپیٹ لے جاتی ہے اور وہ جو اس کے آرزو مند ہوتے ہیں، وہ جن پر زندگی عذاب جہنم ہوتی ہے۔ انہیں وہ دور سے دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے۔ اس وقت موت بھی میرے قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے کیا حرج ہے ہر حالت میں شکر ہی کرنا ہو گا۔ کیونکہ اور کچھ کر نہیں سکتا۔ پڑا رہا۔ دماغ بے جان ہو گیا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئیں، پھر شاید کسی نے چہرے پر پانی ڈالا تھا۔ لوٹے کی دھار سے پانی ڈالتا رہا، ہوش تو آ گیا تھا لیکن آنکھیں نہ کھل پا رہی تھیں، بدن میں توانائی سی محسوس ہوئی، آنکھیں کھولیں۔ دیکھا تو کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ ایک سنسان سڑک نظر آ رہی تھی اور میں اس سڑک کے کنارے زمین پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھا، کون یہاں لے آیا۔ منظر کیسے بدل گیا۔ رفتہ رفتہ رونق ہونے لگی، جوں جوں روشنی جاگنے لگی لوگ آتے جاتے نظر آئے۔ کسی نے رک کر میرے سامنے کچھ ڈال دیا۔ دیکھا تو ایک روپے کا نوٹ تھا۔ میں نے پھیکی سے مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کوئی اور آیا اور میری گود میں کچھ رکھ گیا۔ ٹٹول کر دیکھا تو دو پوریاں اور ان پر رکھی ہوئی ترکاری تھی۔ یہ میری ضرورت تھی چنانچہ میں نے اس من و سلویٰ کو احترام سے اٹھا لیا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے لگا۔ اس نعمت کو کھا کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیاس لگنے لگی تھی۔ پانی تھوڑے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ غالباً میونسپلٹی کا نلکا تھا، جس سے تھوڑا تھوڑا پانی بہہ رہا تھا۔ بدن کو جنبش دی۔ پیروں سے کھڑا تو نہ ہوا گیا، گھسٹتا ہوا نلکے تک پہنچا، پانی پیا اور جسم آسودہ ہو گیا۔ ایک بار پھر پھل چکھ رہا ہوں تو ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ سزا پوری ہونی چاہئے، تاکہ جزا ملے۔ میں خوش ہوں میرے معبود، میں خوش ہوں، مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے میں بالکل مطمئن ہوں، میں تیری رضا میں خوش ہوں بہت شکر ہے تیرا کہ تو نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا، مجھے کوئی شکایت نہیں ہے میں مطمئن ہوں۔

واپس پلٹنا چاہا کہ اپنے پیروں سے چلوں۔ نہ چل پایا درخت کا سایہ غنیمت تھا۔ پورا دن وہیں گزار دیا۔ دینے والے دیتے رہے۔ زبان ہلا کر یہ کہنے کی کوشش کی کہ یہ پیسے میرے لئے بے کار ہیں اگر

ہوسکے تو روٹی دے دو. لیکن گویائی تو بھوریا چرن لے گیا تھا. نہ سہی دینے والے نے صبح کا ناشتہ دے دیا۔ ضرورت کے مطابق کھانا بھی دے گا۔ اور بڑا اطمینان ہوا اس وقت جب مجھے دو تندوری روٹیاں اور پلیٹ سالن جو مٹی کے ایک برتن میں تھا. لاکر میرے سامنے رکھ دیا گیا۔ میں نے بڑے اعتماد سے کھایا۔ یہ جگہ بہت مناسب ہے بقیہ زندگی یہاں بآسانی گزاری جا سکتی ہے. رزق دینے والا انتظام کر رہا ہے. کھانا مل جاتا ہے اور پانی قریب ہی موجود ہے۔ میں نے وہیں اپنا بسیرا کرلیا۔ نجانے کتنے دن گزر گئے۔ لیکن دنوں کا حساب وہ رکھیں جنہیں دنوں سے دلچسپی ہو مجھے دن گننے سے کیا ملتا۔ داڑھی بڑھ گئی۔ بال بڑھ گئے۔ وقت نے شکل بدل دی۔ ہڈیاں ابھر آئیں۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے. صبر و سکون سے گزر بسر کرتا رہا. پاؤں بے جان تھے۔ قوت گویائی ختم ہوگئی تھی۔ گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا بس۔ لیکن اس دن صبر کا پیمانہ پھر چھلکا جب میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے میرا دل سینے سے نکال لیا۔

ابا جان تھے۔ ہاں بھلا انہیں بھول سکتا تھا۔ بینائی بھی ختم ہو جاتی تو تب بھی انہیں محسوس کرلیتا۔ ابا بوڑھے ہو چکے تھے۔ خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ دیکھ کر دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرنے کی کوشش کی۔ زبان سے انہیں پکارنا چاہا. رک گئے. مجھے دیکھا جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا میرے ہاتھ میں تھمایا اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ میں اس نوٹ کو دیکھنے لگا. انہیں آوازیں دینا چاہیں۔ نہ پہچان سکے تھے مجھے. یہ بھوریا چرن کا جادو نہیں تھا یہاں دل کی گہرائیاں پکار رہی تھیں کہ وہ میرے باپ ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں. نوٹ کو چومتا رہا. سینے سے بھینچ کر روتا رہا. پتہ نہیں آنکھوں سے آنسو نکل بھی رہے تھے یا نہیں۔ پیروں میں قوت ہوتی تو دوڑ تا ان کا پیچھا کرتا۔ کسی طرح انہیں بتا دیتا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں آپ کا مسعود ہوں۔ دل نجانے کب تک زخموں سے چور رہا. بدن کے زخم دل کے اس زخم کے سامنے بے جان ہو گئے تھے۔ تب ہی ایک احساس دل میں ابھرا. کسی نے میرے کان میں کہا۔

”اور اس کے باوجود تو شکر ادا نہیں کرتا۔ کم از کم تجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ تیرے باپ زندہ ہیں! تیرے سامنے سے گزرے ہیں, بے شک وہ تجھے نہ پہچان سکے۔ لیکن کیا یہ شکر کے لئے کافی نہیں ہے۔ تو نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ لیا۔“ آنکھیں بند ہو گئیں اور دل اندر ہی اندر شکر کے کلمات ادا کرنے لگا۔ آرزوئیں ہی تو اس جگہ تک لے آتی ہیں۔ یہ بھی ایک آرزو تھی لیکن اللہ کی طرف سے اسے یہیں تک رہنا تھا ورنہ باپ کا خون جوش مار سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابا جان اس شہر میں موجود ہیں نجانے کون سی جگہ ہے. نجانے کون سا شہر ہے۔ کسی سے پوچھنے کے لئے گویائی تو ساتھ ہی نہیں دے رہی تھی۔ صبر و سکون سے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گیا۔ وہ نوٹ میں نے سنبھال کر احتیاط سے سینے کے قریب رکھ لیا, جس میں مجھے اپنے باپ کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تھا اور سینے کے قریب اس نوٹ کی قربت نے بڑی ٹھنڈک بخشی تھی۔ جلتی ہوئی روح کو پیاسے بدن کو نہ جانے کیا دے دیا تھا اس نوٹ کے لمس نے. آہستہ آہستہ آسمان سے رات اترتی آرہی تھی۔ بڑی بے چین رات گزری تھی۔ بڑا بے کل تھا دن. تصورات نجانے کہاں کہاں پہنچ رہے تھے. اباجی مجھے پہچان نہ سکے. سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پتہ نہیں ان سب کے ذہنوں میں میرا کیا تصور رہ گیا ہے. اب اتنے عرصے کے بعد تو وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ سوچا تو ہوگا انہوں نے کہ کہیں سے میری کوئی خبر نہیں ملی. تو ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ اب اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے. میں یہاں سے جا چکا ہوں۔ اچھا ہے ایسا ہی ہوا ہو. کم از کم انہیں

آگیا ہوگا۔ میں تو ابھی امتحان کی منزل سے گزر رہا ہوں. مجھے اگر صبر مل جائے تو بات ہی کیا ہے۔ نجانے کس طرح آنکھوں سے نکل آتے تھے. نجانے یہ ذخیرہ بدن کے کون سے گوشے میں پوشیدہ تھا. پھر نیند نے آغوش مادر کا کردار ادا کیا اور اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ دوسرا دن معمول کے مطابق تھا. چلتے پھرتے انسان. انسانوں پر رحم کھاتے ہوئے. رزق عطا ہو جاتا تھا۔ ابھی تک اتنے دن گزر چکے تھے یہاں پڑے ہوئے. ایک رات بھی بھوکا نہیں سویا تھا۔ کبھی بے بسی سے بھوک سے ایڑیاں نہیں رگڑی تھیں. یہ معاملہ بھوریا چرن کا نہیں تھا بلکہ یہاں رزق عطا کرنے والے نے میرے لئے حکم صادر فرما دیا تھا کہ بھوکا نہ رہوں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کچھ فقیروں کو بھاگتے ہوئے دیکھا. ایک میرے قریب سے گزرا. رکا اور جھک کر بولا۔

”ابے کیوں مر رہا ہے یہاں. بھاگ جا پولیس فقیروں کو پکڑ رہی ہے. اٹھا کر لے جائے گی بیٹا اور ہڈیاں توڑ دے گی ابے پھوٹ وہ آرہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے دوڑ لیا۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آرہا تھا۔ درحقیقت تھوڑے فاصلے پر پولیس کے دو بڑے ٹرک کھڑے ہوئے تھے اور پولیس والے ڈنڈے لئے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے. جو فقیر ان کے ہاتھ لگتا اسے بازوؤں سے پکڑتے اور ٹرک میں ڈال دیتے۔ میں نے صبر و سکون کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔ نہ تو بھاگ سکتا تھا نہ ان سے کچھ کہہ سکتا تھا. دو موٹے تازے پولیس والے ڈنڈے ہاتھوں میں لئے میرے قریب پہنچے اور خونی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولے

”آپ یہاں براجمان ہیں مہاراج اب ذرا سرکاری بھیک اور لے لیجئے۔ ابے اٹھ یا لگاؤں ڈنڈا کمر پر۔“ میں نے ہاتھوں کے بل آگے کھسکتے ہوئے انہیں اپنے پیروں کی جانب متوجہ کیا۔ دوسرا پولیس والا کہنے لگا۔

”معذور ہے سالا. چلو اٹھا کر لے چلو۔“ انہوں نے بے دردی سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے. میں نے پاؤں سیدھے کر کے زمین سے ٹکائے اور ان کے ساتھ گھسٹنے لگا. ٹرک کے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے دو تین بار جھلایا اور پھر ٹرک پر پھینک دیا۔ دو فقیروں نے مجھے زور زور سے دھکے دیئے اور غراتے ہوئے بولے۔

”اندھے کے بچے. دیکھتا نہیں ہے ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابے سرک۔“ انہوں نے لاتوں سے مجھے ایک طرف سرکا دیا اور میں سمٹ کر ایک کونے میں جا بیٹھا. کئی اور فقیر یہاں سے پکڑے گئے. گالیاں دے رہے تھے پولیس والوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے. خوفناک بد دعائیں دے رہے تھے اور پولیس والے ہنس رہے تھے۔

”بیٹا اگر ان بد دعاؤں سے ہمارا یہ حال ہوتا تو تمہارا یہ حال کبھی نہ ہوتا اب چپ بیٹھو ورنہ ڈنڈے مار مار کر سر پھاڑ دیں گے۔“ دو پولیس والے ٹرک پر چڑھ آئے اور اس کے ایک گوشے میں خود بھی بیٹھ گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا اور میں اس نئی منزل کا انتظار کرنے لگا جو میرے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ یہاں اس درخت کے نیچے جیسی بھی گزر رہی تھی بہتر تھی. پانی بھی موجود تھا. غذا بھی اللہ تعالیٰ فراہم کر رہا تھا باقی سب کچھ اس کے اپنے اختیار میں تھا لیکن نجانے یہ نئی جگہ کیسی ہوگی۔ دل ہی دل میں توبہ کی جس نے یہاں زندگی عطا کی اور رزق پہنچایا. وہی قادر مطلق ہر جگہ موجود ہے. بھلا فکر کیوں کی جائے. جب اس نے یہ سانسیں بخشی ہیں تو ان سانسوں کے لئے یہ بھی متعین کر دیا گیا ہوگا کہ وہ کیسے گزریں گی۔ آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرک ایک بڑی سی عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر رک گیا۔ اس کے تختے کھول دیئے گئے اور فقیروں کو نیچے کودنے کے لئے کہا گیا۔ جو معذور تھے انہیں پولیس والے اتار اتار کر نیچے ڈال رہے تھے۔ پھر نیچے اتارنے کے بعد انہیں بھیڑ

بکریوں کی طرح ایک سمت ہانکنے لگے اور سب کو ایک کونے میں جمع کر دیا۔ ٹرک وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ سب طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے خدا کا خوف دلا رہے تھے۔ بھگوان، پرمیشور اور نجانے کیا کیا نام لے کر پولیس والوں کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔ پھر پولیس کا اعلیٰ افسر قریب آیا اس نے سب کو دیکھا اور کہا۔

"تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم میں تو بے شمار ایسے ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تندرست و توانا ہیں۔ میں معذوروں کو نہیں کہتا لیکن جو تندرست ہیں وہ تو اپنا کام محنت مزدوری کر کے چلا سکتے ہیں۔ یہ لعنت تم لوگوں پر کیوں سوار ہے ملک کو محنت کشوں کی ضرورت ہے اور تم ہو کہ حرام خوری کرتے ہو بھیک مانگتے ہو۔"

جو ہٹے کٹے مشٹنڈے تھے، وہ توبہ تلا کرنے لگے اور کہنے لگے کہ آئندہ وہ محنت مزدوری کر کے وقت گزاریں گے۔ جو معذور تھے وہ خاموش اور بے بسی سے پولیس والوں کو دیکھتے رہے۔ پولیس کے افسر اعلیٰ نے کہا۔

"تمہیں سزا ملے گی بھیک مانگنے کی۔ سرکار نے یہی حکم دیا ہے ایک ہفتے کی سزا کاٹو گے یہاں۔ اور اس کے بعد جو معذور ہیں انہیں ایسے اداروں کے سپرد کر دیا جائے گا جہاں معذوروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے لیکن انہیں وہاں کچھ کام دھندے کرنے ہونگے، یہ فیصلہ ہے سرکار کا۔ چلو انہیں کوٹھڑیوں میں بند کر دو۔"

فقیروں کو ایک بار پھر ہانکا جانے لگا۔ مجھے معذور تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بہرحال مجھے بھی سہارا دے کر ایک کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ کوٹھڑی میں میرے علاوہ دو تین فقیر اور بھی تھے۔ اور ایک دو ایسے ملزم تھے جنہیں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ ایک گوشے میں ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ان لوگوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ملزم نے پولیس افسر سے کہا۔

"حوالدار صاحب ان کوڑھیوں کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی، انہیں کہیں اور رکھا جائے، ورنہ ہم سب ہڑتال کر دیں گے۔"

"ابھی تری ہڑتال کراؤں۔ نکالو بے نکالو اسے باہر نکالو یہ لیڈر ہے ہڑتال کرے گا۔" پولیس کانسٹیبل نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور اس لیڈر کو باہر گھسیٹ لیا۔ پھر لاک اپ کے سامنے ہی ڈنڈوں سے اس کی خوب پٹائی کی گئی اور وہ چیخنے چلانے لگا۔ بعد میں اسے مار پیٹ کر دوبارہ لاک اپ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ میرے ساتھ بھی چار پانچ فقیر تھے جو بیٹھے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش تھا۔ فقیروں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ ایک نے کہا۔

"بات تو ایک ہی ہے سڑک پر زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ دھوپ ٹھنڈک برداشت کرنا پڑتی تھی۔ یہ پولیس کی بھیک ہے روٹی تو دیں گے نا سسرے، پھر رفاہی اداروں میں بھیج دیں گے وہاں بھی روٹی ملے گی۔ ارے بھئی بھیک مانگنا ہی کون چاہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ہی کام نہ کریں تو کیا کیا جائے کیوں بھائی میاں؟"۔

"ٹھیک ہے مگر یار ہوتی بری ہے۔ دیکھیں گے سسرے کب تک کھلاتے ہیں، ہونہہ، باپ دادا کا دھندہ ہے۔ ہم بھلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔"

جتنے منہ اتنی باتیں، میں تو ان میں حصہ ہی نہیں لے سکتا تھا چنانچہ سکون سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہا عجیب دنیا تھی ایک انوکھا تجربہ تھا میرے لئے۔ وہاں اس درخت کے نیچے تنہا ہی ہوتا تھا لیکن اب یہاں اس نئی برادری سے واسطہ پڑا تھا۔ اور خوب مزے مزے کے لوگ تھے یہ۔ رات ہوگئی سارے سارے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کراتے رہے۔ اپنی اپنی کہانیاں سناتے رہے اور میں سن کر حیران رہ گیا۔ وہ معذور تھے۔ کسی کے ہاتھ نہیں تھے کسی کے پاؤں مفلوج تھے اور کسی کو کوئی اور بیماری تھی لیکن زندگی

کے لئے کسی طرح ان لوگوں سے کم دلکش نہیں تھی، جو دنیا میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنی کمائی کے بارے میں بتا رہے تھے اور اس کے بعد اپنے مشاغل کے بارے میں۔ ایک نے کہا۔

"یار میرے پاس تو بڑی شاندار جگہ تھی۔ وہاں بیٹھ کر تو ڈیڑھ دو سو روپے چٹکیوں میں آجاتے تھے اور کبھی کوئی صدقہ خیرات مل جائے یا زکوۃ دینے والا آجائے تو سمجھ لو مزے آگئے۔ پچھلے مہینے پانچ فلمیں دیکھیں اور بال بچوں کے لئے بڑے کپڑے بنائے۔ کم بختوں نے وہ جگہ بھی چھڑوا دی، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں کوئی اور نہ وہاں بیٹھ جائے۔"

"ابے سارے شہر میں ہی فقیر پکڑے جا رہے ہیں، کوئی اور وہاں کیسے جا سکتا ہے۔"؟

"تو فقیر چھوڑے بھی تو جائیں گے، ابے ہم سب سمجھتے ہیں کوئی نیا حکم آیا ہوگا، کسی نئے افسر کو سوجھی ہوگی اس نے یہ حکم چلا دیا بعد میں بھول جائے گا۔ وہ بھولے گا تو باقی لوگ بھی بھول جائیں گے۔" تمام فقیر ہنسنے لگے تھے۔

شام ہوگئی۔ جھٹپٹے رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگے۔ میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فقیر نے دوسرے سے کہا۔ "ابے پہلوان، بیڑی ہوگی تیرے پاس۔"

"ابے میں خود مر رہا ہوں پورا بنڈل پڑا ہوا تھا جیب میں اٹھا پٹک میں نکل گیا کہیں۔"

"مارے گئے۔ اب کیا ہوگا؟"

"کوئی جگاڑ لگانی پڑے گی پیارے یہ پولیس والے بھی سارے کے سارے رام بھروسے ہوتے ہیں۔ چائے تک نہیں ملی سارا دن نکل گیا۔"

"بیڑی کی طلب ہو رہی ہے یار۔ ابے کسی کے پاس بیڑی ہے۔"

"سگریٹ پیو تو لے لو بادشاہ بیڑی نہیں ہے۔"

"لادیدے۔"

"ہفتے بھر کی خوشخبری سنائی گئی ہے مال احتیاط سے خرچ کرو۔" تیسرے فقیر نے باقی دو کو ہوشیار کیا اور سگریٹ کے کش بڑی ترتیب سے لگائے جانے لگے۔ پٹنے والا ملزم کراہ رہا تھا۔ دو پارٹیاں ہوگئی تھیں۔ ایک فقیروں کی تھی دوسری جرائم پیشہ افراد کی مگر کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا کیونکہ ایک بولنے والے کی کراہیں اب تک سنی جا رہی تھیں۔ رات کا کھانا دیا گیا۔ دو دو روٹیاں، دال وغیرہ۔ سب کھانے میں مصروف ہوگئے۔ لاک اپ کے سامنے راہداری میں ایک ملگجا بلب روشن تھا۔ جس سے لاک اپ میں بھی روشنی پھیلی ہوئی تھی کھانے سے فارغ ہو کر سب آرام کرنے زمین پر لیٹ گئے۔ میں بھی اپنی جگہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا ہوا تھا۔ لاک اپ میں ایک اور ملزم کا اضافہ ہوا۔ دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پورا بدن کرب سے چیخ اٹھا۔ زخموں کے منہ کھل گئے اور وہ چیخ گئے۔ پورے بدن کو ایسا ہی جھٹکا لگا تھا۔ وہ ماموں ریاض تھے۔ ماموں ریاض۔ انہیں اندر پہنچا کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور ماموں ریاض گھبرائے گھبرائے سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک خالی جگہ جا بیٹھے۔ وہ خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کلیجہ منہ کو آ گیا۔ پھر حواس نے کچھ کام کیا پہلے بھی بھوریا چرن نے یہ کھیل کھیلا تھا ماموں ریاض پہلے بھی میرے سامنے لائے گئے تھے بعد میں کچھ اور نکلا تھا۔ اس شیطان کے لئے یہ سب کچھ کر دینا مشکل نہیں تھا۔ وہ اس عالم میں پہنچانے کے

بعد بھی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ میں جلتی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ پریشان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ رات گزرتی رہی اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ قیدی سو گئے بھانت بھانت کے خراٹے ابھرنے لگے۔ سنتری بھی گشت ختم کر کے کہیں جا بیٹھے تھے میں مسلسل ماموں ریاض کو گھور تا رہا۔ اس قدر ہیجان کا شکار ہو گیا تھا کہ اپنی حالت کا احساس بھی نہ رہا زبان کو جنبش دی تو طویل عرصہ کے بعد اپنی سرگوشی سنی۔ اس ہیجان نے میری گویائی واپس کر دی تھی۔ میرے بدن میں زندگی دوڑا دی تھی۔ میں کھڑا ہو سکتا تھا میں بول سکتا تھا مگر سب کچھ بھولے ہوئے تھا ماموں ریاض پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ ماموں ریاض کی طرف بڑھا اور پھر ان پر گر پڑا۔ میرے مضبوط ہاتھ کے شکنجے نے ان کا حلقوم بھینچ لیا تھا۔ انہوں نے مداخلت شروع کر دی دونوں ہاتھوں سے میری کلائی پکڑی۔ مگر میرا پنجہ حلق سے نہ ہٹا سکے۔

"کلمہ۔ پڑھو۔" میں نے غرا کر کہا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ "میں گرفت ڈھیلی کر رہا ہوں کلمہ پڑھو۔ ورنہ۔ تمہاری زبان باہر نکال دوں گا۔" میں نے یہ کہہ کر گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گردن مسلنے لگے۔ پھر انہوں نے خوفزدہ آواز نکالی تو میں نے جھپٹا مار کر دوبارہ ان کی گردن پکڑ لی۔ "اگر تم مسلمان ہو تو صرف کلمہ پڑھو۔ دوسرا ایک لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو۔ تو"۔ میں نے پھر دباؤ ہلکا کر دیا۔

ماموں ریاض نے پھنسی پھنسی آواز میں کلمہ پڑھا۔

"دوبارہ۔" میں نے کہا اور انہوں نے دوبارہ، پھر میرے کہنے پر تیسری بار کلمہ پڑھا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ماموں ریاض مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ریاض احمد ہے آپ کا نام؟" میں نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔" وہ جانکنی کے سے انداز میں بولے اور میں ان سے لپٹ گیا۔ میں نے انہیں بھینچ لیا وہ گھبرا گھبرا کر مجھ سے خود کو چھڑا رہے تھے نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے وہ بہ مشکل تمام انہوں نے مجھے قدرے دور کیا۔ "کیا ہو گیا کیا بات ہے بھائی۔" وہ سہمی سہمی آواز میں بولے۔

"مجھے پہچانئے۔ مجھے پہچانئے ماموں ریاض۔!"

"مم۔ ماموں ریاض۔ کک کون ہو تم۔ میں۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔" وہ اسی انداز میں بولے۔

"میں مسعود احمد ہوں ماموں ریاض۔ آپ کا بھانجا مسعود۔ ماموں میں آپ کا بھانجا ہوں۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"مسعود .... مسعود۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورنے لگے۔ بہت دیر تک گھورتے رہے۔ پھر کھوئے کھوئے لہجے میں ہی بولے۔ "مسعود۔"

انداز ایسا تھا جیسے اس نام کو یاد کر رہے ہوں۔ مجھے گھورتے بھی جا رہے تھے پھر نہ سمجھنے والے انداز میں بولے۔ "مسعود احمد .... محفوظ احمد کے بیٹے؟"

"ماموں آپ کا مسعود۔ آپ کا چہیتا مسعود ....!"

"معاف کرنا بھائی کچھ عجیب سی بات ہے میرا بھانجا مسعود تھا تو سہی مگر وہ تو .... وہ تو ....۔"

"مر چکا ہے یہی نا۔" میں نے سسکی لے کر کہا۔

"تم مسعود کیسے ہو سکتے ہو۔ مسعود۔" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے

"تم واقعی مسعود۔ معاف کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر تم مسعود ہو تو .... تو۔" ان کا بدن تھرتھرانے لگا بہت زور کی تھرتھری طاری ہو گئی تھی ان پر۔

"ماموں۔ میں مسعود ہی ہوں۔" میں ان سے لپٹ کر سسکنے لگا اور ماموں کانپتے رہے یکایک ان کے انداز میں تغیر پیدا ہوا اور پھر انہوں نے بے اختیار مجھے بھینچ لیا۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔

"مسعود .... مسعود .... آہ میرے بیٹے میرے .... میرے۔" وہ زار و قطار رونے لگے "تم زندہ ہو مسعود، تم واقعی زندہ ہو۔"

"ہاں ماموں ریاض جتنا زندہ ہوں آپ دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بیٹے۔ کیا کر ڈالا تم نے مسعود۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہو۔ مسعود میرے بیٹے۔ یہاں ملنا تھا تمہیں یہ زخم بھی لگانا تھا میرے کلیجے پر۔"

"سنبھالئے ماموں خود کو۔ خدا کے لئے سنبھالئے۔"

"آہ کیسے سنبھالو۔ ؟ ہزاروں آنسو رکے ہوئے ہیں میری آنکھوں میں لاکھوں دعاؤں کا نتیجہ ہو تم۔ کیسے سنبھالوں۔"

"ضروری ہے ماموں۔ ضروری ہے خدا کے لئے خود کو سنبھالئے۔"

"آہ مسعود کیا بیت گئی ہم پر۔ اب تو عرصہ ہو گیا اب تو تمہاری یاد بھی کھو بیٹھے تھے ہم۔ مسعود کیا کہوں کیسے بتاؤں تمہیں میرے بچے کیا کیا گزری ہے ہم پر۔ باجی پر کیا گزری ہے سب پر کیا گزری ہے۔ ہم انسانوں کی طرح جینا بھول گئے بیٹے ہم ایسے نہیں جی رہے جیسے دنیا والے جی رہے ہیں۔ ہم .... ہم۔" میں نے اپنے لباس سے ماموں کے آنسو خشک کئے۔ ماموں بار بار میرا چہرہ سامنے کر لیتے تھے مجھے دیکھتے تھے۔ پھر سینے سے بھینچ لیتے تھے۔ تمام فقیر اور قیدی مزے سے سو رہے تھے کوئی ہم جیسا نہیں تھا ماموں نے کہا۔

"تم مسعود، کوئی تمہاری زندگی پر یقین نہیں کرے گا اگر میں کسی سے کہوں گا تو وہ مجھ پر ہنسے گا۔"

"ہاں ماموں، میں خود اپنی زندگی پر ہنستا ہوں تو دوسروں کا بھی یہی حال ہو گا۔"

"ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہو۔ کہاں تھے کیسی زندگی گزار رہے تھے؟"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیں ماموں۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں رات مختصر ہے صبح بہت جلد ہو جائے گی بعد میں نہ جانے کیا ہو پہلے مجھے سب کچھ بتا دیں ماموں مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے کچھ معلوم ہو سکے گا۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"امی؟"

"حیات ہیں۔ اندھی ہو چکی ہیں۔"

"اندھی ...." میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔

"ہاں رو رو کر بینائی کھو بیٹھی ہیں۔ اب تو طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم تو اسی وقت سے برباد ہیں جب سے تم نے ...." ماموں خاموش ہو گئے۔

"پھر کیا ہوا ماموں؟"

"پڑوسی خلاف ہو گئے۔ انہوں نے ہم پر گھناؤنے الزامات لگائے۔ یہ کہا کہ ہم سفلی علم کرتے ہیں، غیر مسلم ہیں، مرتد ہیں۔ محمود جھگڑ پڑا اور اس کے ہاتھوں سے ایک قتل ہو گیا۔ ہماری کیا اوقات تھی کچھ کرتے۔

پولیس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ عجیب عجیب سوالات کرتے تھے۔ مجھے سترہ دن تھانے میں رکھا۔ تمہارے اور محمود کے بارے میں پوچھتے رہے کہ تم کہاں چھپے ہوئے ہو۔ ہم نے گھر چھوڑ دیا اپنوں نے رشتے داری سے انکار کر دیا وہاں سے نکال دیئے گئے کئی شہروں میں جا کر رہے اور .... اور ...."

"اور ماموں ....؟"

"ایک اور المناک واقعہ ہوا۔"

"کیا ....؟"

"خورجے میں تھے ہم لوگ۔ گھر کے سامنے ایک اور خاندان رہتا تھا۔ انہوں نے شمسہ کا رشتہ مانگا۔ ہم قیامت زدہ بھلا کیا شادی بیاہ کر سکتے تھے۔ انکار کر دیا اور ...." ماموں نے سسکی بھری۔

"اور کیا؟"

"انہوں نے شمسہ کو اغوا کر لیا۔"

"پھر ....؟"

"وہ پھر کبھی نہیں ملی۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ماموں بھی خاموش تھے۔ بہت دیر کے بعد میں نے کہا۔ "ابو ....؟"

"ٹھیک ہیں۔ ایک دکان پر نوکری کرتے ہیں۔"

"آپ ....؟"

"میں بھی ایک اسٹور پر کام کرتا ہوں۔ اسٹور کے مالک کا بیٹا عیاش طبع ہے۔ مجھ سے رقمیں لے جاتا رہا ہے۔ حساب میں گڑبڑ ہوئی تو مالک نے مجھے غبن کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔"

"آپ نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"ہمیشہ ہی بتاتا رہا ہوں مگر .... لوگ کہاں مانتے ہیں خدا ہی اس کے دل میں رحم ڈالے تو میری گلوخلاصی ہو جائے ورنہ نہ جانے کیا ہوگا۔" میں خاموش ہو گیا کچھ دیر کے بعد ماموں نے کہا۔ "اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتا دو۔"

"اتنا کچھ سن چکے ہوں گے میرے بارے میں کہ اور کیا بتاؤں داستان اتنی لمبی ہے کہ .... جی ویسے ایک انکشاف کر دوں آپ کو خوشی ہوگی۔"

"کیا ...."

"محمود کے بارے میں کوئی خبر ملی آپ کو۔"

"آج تک پتہ نہیں چل سکا۔"

"وہ بیرون ملک ہے مجھے مل گیا تھا۔ ایک بھلے انسان کی مدد سے میں نے اسے بیرون ملک نکال دیا یقیناً بعد میں اس نے آپ سے رابطے کی کوشش کی ہوگی لیکن آپ کا پتہ نہ پا سکا ہوگا۔"

"آہ .... کیا سچ مچ ایسا ہے؟"

"ہاں امی اور ابو کو یہ بات ضرور بتا دیجئے انہیں خوشی ہوگی۔"

"مسعود تم ....؟ تم ...."

"نہیں ماموں میں شاید ابھی ان کے قدم بوسی کے قابل نہیں ہوں۔ شاید ابھی یہ سعادت میرے مقدر میں نہیں ہے۔"

"تمہارے اوپر جو مقدمات تھے ان کا کیا ہوا۔"

"بہت سے مقدمات کے اضافے ہو چکے ہیں فیصلے ہوں گے سب کے فیصلے ہوں گے۔ اللہ مالک ہے۔"

"ان سے ملو گے نہیں۔"

"امی ابو سے؟"

"ہاں۔"

"ضرور ملوں گا ان سے کہہ دیجئے زندہ رہیں میرے لئے زندہ رہیں میں ان سے ضرور ملوں گا۔"

"یہاں کس الزام میں آئے ہو۔"

"بس ماموں اور کچھ نہ پوچھیں خدا کے لئے اور کچھ نہ پوچھیں۔ اللہ آپ کو اس مشکل سے نکالے۔" ہم دونوں ساری رات روتے رہے تھے۔ باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنے بارے میں انہیں کیا بتاتا۔

صبح ہو گئی۔ دن کے دس بجے تھے کہ کچھ لوگ لاک اپ کے دروازے پر آئے ماموں ریاض انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک خاتون بھی تھیں۔ ایک عمر رسیدہ شخص۔ ایک نوجوان اور پولیس انسپکٹر۔ انسپکٹر نے کانسٹیبل سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا اور کانسٹیبل نے دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر نے ماموں ریاض سے باہر آنے کے لئے کہا اور ماموں ریاض باہر نکل آئے۔ معمر شخص نے ماموں ریاض کے ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور انہیں ساتھ لے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا قصہ تھا۔ خاموشی سے وقت گزرتا رہا۔ ماموں ریاض کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ واپس نہیں آئے۔ دوپہر کو تمام فقیروں کو نکالا گیا اور احاطے میں کھڑے ہوئے ایک ٹرک میں بٹھایا گیا ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ پھر اس نے کوئی چھ گھنٹے تک مسلسل سفر کیا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔ پولیس والے نیچے اترے اور انہوں نے ٹرک کا پچھلا حصہ کھول کر فقیروں سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ سب نیچے اترنے لگے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ویران اور لق و دق جگہ تھی۔ دور دور تک ریتیلی زمین اور اس میں اُگی ہوئی تھوہر کی جھاڑیاں۔ پرندے اور دوسرے جانور بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ لوگ یہاں لا کر ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے۔ فقیروں نے احتجاج شروع کر دیا اور چیخنے چلانے لگے۔ پولیس والوں نے ان میں چند کو ڈنڈوں سے مارا۔ ایک موٹا تازہ پولیس والا کہنے لگا۔

"شہر کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے اب رہو یہاں بھوکے پیاسے اور جاؤ سیدھے جہنم میں، کمبختو تمہیں کام کاج ہوتا نہیں ہے۔ ہٹے کٹے مسٹنڈے ہو اور بھیک مانگ کر ہماری حق تلفی کرتے ہو۔"

پولیس والے ٹرک میں چڑھنے لگے۔ کچھ معذور فقیروں نے کہا۔

"ارے اللہ تمہارا بیڑہ غرق کرے، واپس شہر پہنچنا نصیب نہ ہو تمہیں، ٹرک کا حادثہ ہو جائے، ارے ہم نے سوچا اور کہا تھا تم لوگوں نے۔ ارے یہاں کیا کریں گے ہم۔ تمہارا ستیاناس، تمہارا ستیاناس۔"

پولیس والے ہنستے ہوئے ٹرک پر چڑھ گئے اور ٹرک اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گیا۔ واقعی بڑا عجیب کام کیا تھا ان لوگوں نے اس ویرانے میں تو بھوک اور موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فقیر روتے پیٹتے رہے۔ پولیس والے ان کو گالیوں سے نوازتے رہے۔ کچھ ادھر ادھر منتشر ہو گئے ان میں سے کچھ فقیر اونچائی کی جانب

بڑھنے لگے پھر دفعتاً ان میں سے ایک نے کہا۔

"ادھر........ ادھر آبادی ہے۔ ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں، ارے چلو بھائیو! مزار ہے، ذرا اوپر چڑھ کر دیکھو بڑا سا جھنڈا نظر آرہا ہے اور مزار کا گنبد بھی۔" شوقین فقیر دوڑے، بلندی تھی تھوڑی سی، وہ بھی اوپر چڑھے اور شاید اطلاع دینے والے فقیروں کی بات کی تصدیق ہوگئی وہ سب ہنسنے مسکرانے لگے۔ قہقہے لگانے لگے۔ معذور فقیروں میں سے کچھ نے کہا۔

"ارے بھائیو! اگر لمبا فاصلہ ہے تو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو ہم وہاں تک کیسے پہنچیں گے؟"

"مزدوری کون دے گا۔" سودے طے ہونے لگے کچھ نے کچھ کو اپنے کندھوں پر لاد لیا۔ جن کی مزدوری طے نہیں ہوئی تھی وہ خود ہی بلندی کی جانب گھسٹنے لگے۔ میں خاموش اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فقیر نے جو سب سے آخر میں رہ گیا تھا میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تو نہیں چلے گا کیا........؟ ادھر یقیناً لنگر مل جائے گا۔ یہاں تو بیٹا کھانے کے لئے گھاس بھی نہیں ہے۔"

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ "تمہارا شکریہ بھائی چلا جاؤں گا، میرے تو پاؤں ٹھیک ہیں۔" فقیر نے شانے ہلائے اور بلندی کی جانب بڑھ گیا۔ میرے دل میں کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا تھا۔ شام جھکتی چلی آرہی تھی، ہوا میں خنکی پیدا ہونے لگی تھی، میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے بدن لاغر تھا، ہاتھ پاؤں بے شک سلامت تھے لیکن اتنی جان نہیں تھی کہ کوئی طویل فاصلہ طے کرتا۔ بدن کا خون نکل جانے کے بعد سے اب تک ایسی نقاہت بدن پر طاری رہی تھی۔ بہرحال شام کے جھٹپٹے رات کی سیاہیوں میں تبدیل ہونے لگے۔ کچھ فاصلے پر دو عجیب سے کالے رنگ کے مڑے تڑے پھل سے پڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کیا شے تھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اٹھا یا ٹٹول کر دیکھا۔ پھر ان میں ایک پھل توڑا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوسکا کہ کیا چیز تھی پھینک دیا اور اس کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر تھوڑا سا آگے بڑھ گیا۔ بلندی پر پہنچ کر میں نے بھی کافی فاصلے پر اندازے کے مطابق دو ڈھائی فرلانگ پر آبادیاں دیکھیں۔ غالباً کوئی مزار ہی تھا۔ قرب وجوار میں مکانات وغیرہ نظر نہیں آرہے تھے لیکن روشنیاں تھیں، عمارت بنی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچی پکی قبریں بھی نظر آرہی تھیں۔ پتہ نہیں کونسا علاقہ تھا غالباً بہت بڑا قبرستان تھا۔ زائرین کی گاڑیاں وغیرہ بھی کھڑی نظر آرہی تھیں وہ فقیر جو یہاں سے گئے تھے شاید یہ فاصلہ طے کر کے مزار شریف تک پہنچ گئے تھے کیونکہ اس جگہ سے وہاں تک کے راستے میں اب کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ علاقے کے بارے میں واقعی کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ چلو ضرورت مندوں کا کام تو بن گیا۔ مجھے تو بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی وہیں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دور جگمگاتی روشنیاں بھلی لگ رہی تھیں پھر ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اذان کی آواز سنائی دی۔ "اللہ اکبر........ اللہ اکبر۔"

"جل شانہٗ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اذان کی تکرار کرنے لگا۔ روحانی سکون محسوس ہوا تھا۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ لذت انگیز تھا۔ اذان ختم ہوگئی۔ پتھر کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ہچکیاں بندھ گئیں۔ لرزتی ہوئی آواز نکلی لڑکھڑاتی ہوئی غیر یقینی آواز میں نماز کی نیت باندھی الحمد شریف کا تصور کیا ذہن ساتھ دینے لگا۔ آیت یاد

ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ برسوں کا چھنا ہوا سرمایہ واپس عطا ہوگیا تھا۔ سب کچھ یاد آگیا تھا طہارت عطا ہوگئی تھی۔ رکوع، سجدہ۔ رو رو کر نماز پڑھتا رہا۔ سجدے سے سر اٹھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نماز پوری کرنی تھی اعتماد بڑھتا گیا۔ نماز مکمل کرلی۔ بدن تھا کہ آگ کی طرح تپ اٹھا تھا۔ کسی کمزوری کا نشان نہیں تھا۔ مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آہ مجھے میرا سرمایہ واپس مل گیا مجھے میرا سرمایہ واپس مل گیا۔ اور کچھ نہیں چاہئے تھا اسی جگہ بیٹھا رہا عشاء کی اذان سنائی دی پھر نماز کیلئے کھڑا ہوگیا رات بھیگتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیا وقت ہوگیا پلکیں جڑنے لگیں۔ وہیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ بدن سکوڑ لیا نیند آگئی غالباً نیم غنودگی کی کیفیت تھی کہ کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھا دو سائے نظر آئے اسی سمت آرہے تھے خاموش لیٹا رہا پھر ایک آواز سنائی دی۔

"ارے........ یہ کون ہے۔"

"کوئی سائل ہے۔"

"رکو........" کسی نے کہا اور وہ میرے پاس رک گئے۔

"میاں صاحب........ بھوکے ہو؟"

"شکر ہے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"روٹی کھاؤ گے؟"

"کھائیں گے۔"

"لو........ یہ لو........" ان میں سے ایک نے جھک کر دو روٹیاں جن پر دال رکھی ہوئی تھی میرے ہاتھوں پر رکھ دیں۔

"شکر الحمد للہ۔" میں نے کہا اور بڑے احترام سے رزق لے لیا۔

"یہ پانی ہے۔" دوسرے نے آبخورہ میرے حوالے کر دیا۔

"سردی ہے یہ کمبل اوڑھ لینا۔" پہلے نے کمبل اپنے شانے سے اتار کر میرے قریب رکھ دیا۔

"اللہ اجر عطا فرمائے۔" میں نے کہا۔

"آؤ۔" پہلے نے دوسرے سے کہا۔ اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

شکم سیری ہوگئی۔ آبخورہ سے پانی پیا۔ سردی اور بڑھ گئی۔ خنک ہوائیں تیز ہوگئی تھیں اور معدے کا وزن بڑھا تو دوسرے احساسات بھی جاگ اٹھے۔ کمبل یاد آیا جلدی سے اٹھا کر بدن کے گرد لپیٹ لیا نہ جانے کون خدا کے نیک بندے تھے۔ بڑے کام آئے۔ دل سے دعا نکلی وہیں لیٹ گیا۔ کمبل بدن کے گرد لپیٹ لیا مزید سردی لگی تو چہرہ بھی ڈھک لیا اور چہرہ ڈھکتے ہی ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوا۔ آنکھیں بند کرلیں لیکن روشنی کم نہ ہوئی۔ دیر تک ساکت رہا پھر بدن گرم ہوگیا۔ کمبل نے سردی سے نجات دلا دی۔ ماموں ریاض یاد آئے۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اوز ماموں کو کہاں لے گئے۔ منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ معمر شخص نے ماموں ریاض کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آئیے........" ماموں ریاض خاموشی سے ان کے ساتھ آگے بڑھ گئے وہ لوگ انہیں لے کر پچھلے کمرے میں آئے۔

"بیٹھیے۔" انسپکٹر نے کہا عورت اور لڑکا بیٹھ گئے پھر معمر شخص بھی۔ انسپکٹر نے ماموں ریاض سے

کہا۔ ”آپ بھی بیٹھئے۔“

”جی .... میں ....۔“

”ہاں تشریف رکھئے۔“ انسپکٹر نرمی سے بولا۔

”شش .... شکریہ ....۔“

”نجم الحسن آپ سے سخت شرمندہ ہیں۔“

”جی ....؟“ ماموں ریاض حیرت سے بولے۔

”جی ہاں انہوں نے غلط فہمی میں اور جذباتی ہو کر آپ کے خلاف رپورٹ درج کرادی تھی اور اب انہوں نے یہ رپورٹ واپس لے لی ہے۔ حالانکہ پولیس کے کام ذرا مشکل ہوتے ہیں لیکن نجم الحسن میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کے لئے کچھ لچک پیدا کرلی ہے۔ میری رائے ہے ریاض صاحب آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔“

”سر میں سمجھا نہیں۔“

”بھئی میں آپ کو یہاں لاک اپ سے رہا کرتا ہوں۔ باقی معاملات آپ خود نجم الحسن صاحب سے طے کرلیں۔“ ماموں ریاض کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔ انہوں نے آنسو بھری نگاہوں سے نجم الحسن کو دیکھا اور بولے۔ ”بڑے صاحب آپ۔ آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں بے گناہ ہوں۔“

”انسپکٹر صاحب ہمیں اجازت دے دیجئے۔ کوئی ایسی آفیشل کارروائی تو نہیں کرنی ہے جس کی ضرورت ہو۔“ نجم الحسن صاحب نے کہا۔

”نہیں نجم جاؤ، عیش کرو اور ان صاحب کو ذرا مطمئن کر دینا۔“ سب لوگ اٹھ گئے، معمر عورت نے ریاض ماموں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ریاض بھائی ہمارے ساتھ چلئے۔ آپ سے کچھ کام ہیں۔“ فوراً ہی ریاض ماموں کے ذہن میں میرا خیال آیا اور انہوں نے کہا۔

”انسپکٹر صاحب .... وہ .... وہ ....“ اسی وقت دو کانسٹیبل اندر داخل ہوئے اور انہوں سیلوٹ کر کے کہا۔ ”سر ڈی ایس پی کی گاڑی آ کر رکی ہے۔“

”اوہو، اچھا اچھا۔“ انسپکٹر جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے نجم الحسن صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”ڈی ایس پی صاحب آگئے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب، نجم الحسن صاحب سے پہلے اپنے آفس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ نجم الحسن صاحب نے ماموں ریاض کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”آیئے آیئے ریاض صاحب آئیں۔“ ماموں ریاض غالباً میرے بارے میں پھر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ موقع نہیں تھا چنانچہ وہ خاموشی سے نجم الحسن صاحب کے ساتھ باہر نکل آئے۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ نجم الحسن صاحب نے انہیں ڈرائیور کے ساتھ بٹھایا۔ پچھلے حصے میں وہ نوجوان لڑکا معمر خاتون اور نجم الحسن صاحب بیٹھے اور کار اسٹارٹ ہو کر تھانے کی عمارت کے احاطے سے باہر نکل آئی اس کے بعد یہ لوگ ایک خوبصورت بنگلہ نما عمارت میں داخل ہوئے کمرے میں پہنچے اور نجم الحسن صاحب نے نوجوان لڑکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارے خون میں شرافت کا ایک ذرہ بھی باقی ہے تو ریاض احمد صاحب کے قدموں میں گر کر

معافی مانگو، وہ اگر چاہتے تو تمہارا نام بھی لے سکتے تھے۔ کیا دھرا سب کچھ تمہارا تھا ہم نے انہیں بے عزت بھی کیا۔ تھانے بھی بھجوایا اور انہیں سزا بھی ہو سکتی تھی اس الزام میں، کچھ غیرت ہے تمہارے اندر۔“ نوجوان لڑکا آگے بڑھا اور اس نے جھک کر ریاض ماموں کے پیر پکڑنے چاہے۔ ریاض ماموں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کہنے لگے۔

”بیٹے میری مجبوریاں ہیں، میں نے تم سے کئی بار کہا کہ جو رقم تم مجھ سے لیتے ہو اس کا کسی نہ کسی شکل میں اندراج کرادو۔ تمہارے ابو تمہیں معاف کر سکتے ہیں، میرے لئے مشکل ہو جائے گی لیکن خیر تقدیر میں یہ بھی تھا اور پھر .... اور پھر ....“۔ ماموں ریاض کے ذہن میں میرا تصور ابھرا لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نجم الحسن صاحب سے وہ کیا کہیں تاہم انہوں نے اتنا ضرور کہا۔

”بڑے صاحب جو کچھ ہوا۔ وہ اللہ کی مرضی تھی اور اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہاں تھانے کے لاک اپ میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان لڑکے سے ہوئی جو وہاں بند تھا لیکن میرے اس سے ایسے رابطے ہیں کہ میں آپکو بتا نہیں سکتا، آپ میرے اوپر اگر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں تو صرف ایک کام کر دیجئے میرا۔“

”ہاں ہاں کہئے۔ آپ نے وہیں کیوں نہ کہا ریاض صاحب انسپکٹر میرا گہرا دوست ہے، آپ اسی وقت بتا دیتے تو میں اس لڑکے کو بھی چھڑا لیتا۔ کیا جرم کیا ہے اس نے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم، اس کا نام مسعود احمد ہے۔ حلیہ میں آپ کو تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔“ ماموں ریاض میرا حلیہ دہرانے لگے۔

”بالکل اطمینان رکھیں۔ میں کل ہی اس کے لئے کچھ کروں گا۔ آپ خلوص دل سے اسے معاف کر دیں اور مجھے بھی، جو کچھ ہوا غلط فہمی میں ہوا، میں دل سے شرمندہ ہوں۔“ نجم الحسن نے کہا۔

”تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پورا ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میری عزت بحال ہو گئی۔“

دماغ میں غنودگی طاری ہو گئی اور پھر گہری نیند آگئی۔ صبح اذان کی آواز نے جگایا تھا۔ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہی جگہ تھی مدہم مدہم اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا پانی دستیاب نہیں تھا۔ آب خورے کی شفاف مٹی سے تیمم کیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بدن توانا تھا۔ خشوع و خضوع سے نماز پڑھی۔ دل و دماغ شاد ہو گئے۔ سورج کی پاکیزہ کرنیں انہیں چھونے لگی تھیں۔ ادھر اُدھر دیکھا پھر مزار شریف کی طرف اور پھر کمبل کندھے پر ڈالا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ رخ مزار شریف کی طرف تھا فاصلہ محسوس ہی نہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ گو قرب و جوار میں باقاعدہ کوئی شہر یا بستی آباد نہیں تھی لیکن یہ خود بستی بھی کم نہیں تھی۔ زائرین کے لئے قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں لوگ ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ ایک بزرگ کو دیکھا۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دو بڑے تھیلے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے ہوئے تھے۔ میری طرح نڈھال نظر آ رہے تھے۔ مجھے امداد طلب نظروں سے دیکھا پھر اشارہ کیا تو میں قریب پہنچ گیا۔

”میاں مزدوری کرو گے؟“ وہ بولے۔

”ضرور کریں گے۔“

”یہ تھیلے وہاں پہنچانے ہیں۔“ انہوں نے کافی فاصلہ پر اشارہ کیا۔

"بسم اللہ۔" میں نے جلدی سے تھیلے اٹھائے۔

"پہلے پیسے بتا دو۔"

"جو عنایت فرمائیں گے۔ لے لیں گے۔"

"بعد میں جھگڑا نہ کرنا۔"

"نہیں کریں گے۔ آیئے۔" میں تھیلے سنبھال کر آگے چل پڑا۔ بزرگ میرے پیچھے پیچھے تھے۔ وزنی تھیلے مطلوبہ جگہ پہنچا کر میں سیدھا ہوا تو بزرگ نے دو روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"بے حد شکریہ ...."

"کم تو نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں اگر آپ نے خوشی سے دیئے ہیں۔"

"ناشتہ کرو گے۔؟"

"نہیں عنایت ہے۔ ناشتے کے لئے اللہ نے بندوبست کرا دیا ہے۔" میں نے دونوں روپے مٹھی میں دبا کر کہا۔ اسی وقت ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے سے کوئی گیارہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ایک عورت، ایک لڑکی اور ایک 30، 32 سالہ شخص دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ لڑکے نے چیخ کر کہا۔

"دادا میاں پکڑیئے۔" میرے ساتھ آنے والے معمر بزرگ چونک پڑے۔ ان کے حلق سے لایعنی سی آواز نکلی۔ میں نے بھی چونک کر لڑکے کو دیکھا اور اچانک لڑکا ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر بری طرح چیختا ہوا واپس اندر گھس گیا۔ اس کے پیچھے دوڑنے والے رک گئے۔ جیسے کچھ نہ سمجھ پائے ہوں۔ میرے وہاں رکنے کا جواز نہیں تھا۔ اس لئے میں پلٹ کر واپس چل پڑا۔ جہاں دکانیں لگی ہوئی تھیں وہاں پہنچا ڈیڑھ روپے کی دو پوریاں اور ترکاری لی۔ کاغذ پر رکھے ایک گوشے میں آ بیٹھا۔ پڑا کھول کر سامنے رکھا تو ایک بوڑھا فقیر نزدیک آ بیٹھا۔ اس نے کہا۔

"ارے واہ چپڑی اور دو دو۔ حصہ کر لو۔ مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک تم لے لو۔" میں نے ایک پوری پر آدھی ترکاری رکھ کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے خوشی سے پوری لے لی اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ہم فارغ ہو گئے۔

"پانی پیو گئے۔"

"ایں۔ ہاں آؤ تلاش کریں۔"

"نہیں، میں دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنی گدڑی سے ایک ٹوٹا پھوٹا سلور کا گلاس نکالا۔ گلاس خالی تھا۔ اس نے اسے میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "لو پہلے تم پی لو۔"

"ایں۔" میں حیرت سے بولا۔ "پانی کہاں ہے؟"

وہ ایک دم ہنس پڑا پھر بولا۔

"دیکھو تو پانی۔ دیکھنا تو ضروری ہوتا ہے نا۔" بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اچانک ہی ہاتھ میں تھما ہوا گلاس وزنی محسوس ہوا اور اس سے پانی چھلکنے لگا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جلدی سے بولا۔ "تم پیو بھائی، پھر مجھے دو۔"

مگر میں پانی پینا بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی گدڑی سے خالی گلاس نکالا تھا اور جب یہ گلاس میرے

ہاتھ میں آیا تھا تو بالکل ہلکا تھا لیکن اب وہ پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس نے پھر ایک قلقاری ماری اور بولا۔

"پوری تمہاری، پانی ہمارا، حساب برابر، دیکھو تو ملے سوچو تو پاؤ، ارے جلدی کرو، ہمیں پیاس لگ رہی ہے، مرچیں لگ رہی ہیں مرچیں۔" وہ اپنے دونوں گال پیٹتا ہوا بولا اور میں نے بادل نخواستہ گلاس منہ سے لگایا۔ طبیعت سیر ہو گئی اور پھر جب گلاس پیچھے ہٹایا تو وہ کناروں تک لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے گلاس میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

"نہ گلاس تمہارا، نہ کمبل ہمارا، اپنا راستہ ناپو۔ ہم بھی چلے۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس گدڑی میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں شدت حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ عجیب سا شخص تھا، پھٹے پرانے چیتھڑے لگے ہوئے لباس میں ملبوس۔ کاندھے سے جھولی لٹکائے ہوئے۔ ایک اونچی قبر کے کتبے کے پیچھے پہنچ کر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی، گردن جھٹکی اور پھر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ دن خوب چڑھ گیا تھا اور رات کی نسبت دھوپ میں تیزی پیدا ہونے لگی تھی جگہ جگہ بوسیدہ قبریں ٹوٹے پھوٹے لکھوری اینٹوں سے بنے مقبرے نظر آ رہے تھے۔ بہت سی جگہ چھاؤں تھی۔ کسی بھی جگہ کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ کچھ ایسا شکم سیر ہو گیا تھا اس ایک پوری سے کہ بدن بوجھل محسوس ہونے لگا تھا بہرحال وہاں سے ہٹا، کمبل کاندھے پر ڈالا اور اس کے بعد قبروں کے درمیان مارا مارا پھرتا رہا۔ دوپہر کو بڑے مزار پر جانا نصیب ہوا۔ بڑی ٹھنڈک تھی وہاں۔ بے شمار افراد گنبد کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ دل چاہا کہ فاتحہ خوانی کروں، چنانچہ مزار کے قدموں میں پہنچ کر فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپس نکل آیا۔ اسی جگہ پاؤں پسار کر لیٹنا کچھ اچھا نہ لگا، یوں محسوس ہوا جیسے مزار اقدس کی بے حرمتی ہو اگر میں وہاں لیٹ جاؤں بہت سی جگہیں خالی پڑی ہوئی تھیں، گھنے درختوں کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ باہر نکلا اور ایک گھنے درخت کے نیچے آ کر لیٹ گیا۔ کمبل کو تہہ کر کے تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھا اور درختوں کے پتوں کو گھورنے لگا۔ ننھے ننھے پرندے چہچہا رہے تھے۔ جگہیں تبدیل کر رہے تھے۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بڑی خوش نما لگ رہی تھی۔ طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت تھی جسے الفاظ نہیں دیئے جا سکتے تھے۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ آنکھوں میں کچھ بوجھ سا پیدا ہو گیا تھا۔ بھوک تو نام و نشان کو نہیں تھی لگتا تھا ایک پوری نے دن بھر کی کسر پوری کر دی ہے۔ پھر وہ شخص یاد آیا۔ ایسی جگہوں پر اللہ کے نیک بندوں سے ملاقاتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ کیا کہہ گیا تھا، دیکھو تو پاؤ، سوچو تو جانو۔ غور کرنے لگا اور یہی غور کرتے کرتے اچانک پچھلے دن کی باتیں یاد آ گئیں اور اچھل پڑا۔ ماموں ریاض تھانے میں ملے تھے اور وہ انہیں لے گئے تھے لیکن اس کے بعد جو کچھ علم میں آیا تھا وہ کیا حیثیت رکھتا تھا بالکل یوں لگتا تھا جیسے وہ واقعات میری نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں۔ میں خود بھی ان میں شریک ہوں، یہ کیسے ہوا تھا، یہ بات تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت دیر تک غور کرتا رہا اور پھر گردن ہلا کر کروٹ بدل لی۔ ماموں بیچارے۔ اگر جو کچھ میرے ذہن میں آیا، سچ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مصیبت سے نکل گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ذہن میں کیسے آیا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے آنکھوں کے پپوٹے بوجھل کر دیئے تھے اور غنودگی ذہن پر طاری ہو گیا تھا لیکن سوچوں کے دائرے محدود نہیں ہوئے تھے۔

سوچوں کا عظیم سرمایہ محفوظ تھا، دماغ بوجھل ضرور ہو گیا تھا لیکن حاضر تھا۔ ماموں ریاض کے دل میں

ضرور ہو گا کہ میرے لئے کچھ کریں ہرچند کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن
تھا کہ وہ بھی دیوانے ہوگئے ہوں گے اگر بڑے افسر نہ آجاتے تو.......... ہو سکتا ہے جو کچھ میرے
میں آیا اس کے بعد بھی انہوں نے کچھ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے انہوں نے گھر جا کر میرے بارے میں امی ا
کو بتایا ہو۔ کیا گزری ہو گی ان پر ماموں ریاض..........

ٹوٹا پھوٹا سا گھر تھا۔ بوسیدہ کواڑ جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ پلاستر کی دیواریں تھیں۔ درواز
دوسری طرف چھوٹا سا صحن، ایک بر آمدہ جس میں تخت پڑا ہوا تھا۔ ایک کمرہ جس میں بائیں سمت
خانہ اور بیت الخلاء دوسری طرف باورچی خانہ۔ ابو اور امی تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ امی کے سر
سفید ہوگئے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں بے نور تھیں اور وہ بار بار پلکیں جھپکا
تھیں ابو اچھل پڑے۔ انہوں نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"ریاض آگیا۔"

"آگیا۔" امی اچھل پڑیں۔

"ہاں۔"

"ریاض، ریاض بیٹے۔" امی کی لرزتی آواز ابھری۔

"ہاں باجی.......... میں آگیا۔"

"کہاں ہے، کہاں ہے۔ میرے پاس آ، ریاض میرے پاس آ۔" ماموں ریاض امی کے سینے
جا لگے تھے۔ "کیا ہوا تھا، مارا تو نہیں تجھے۔ انہوں نے تجھے مارا تو نہیں؟" امی ماموں ریاض کو ٹٹو
ہوئی بولیں۔

"ارے نہیں باجی، کوئی میں ڈاکو تھا، چور تھا، مارتے کیسے؟" ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ اللہ تیرا احسان ہے۔ کچھ کھایا ہے تو نے؟"

"پیٹ بھر کر کھایا ہے باجی۔ اطمینان سے بیٹھو۔"

"جھوٹ بول رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ سنئے، روٹیاں لے آیئے بازار سے، میں چائے بنا
ہوں، روٹیاں لے آیئے۔"

"باجی۔ میں نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"اور کھائیں گے۔ ریاض، ہم نے نہیں کھایا، کل سے نہیں کھایا۔"

"اوہو۔ میں لاتا ہوں۔ آپ بیٹھیے بھائی جان۔ میں لاتا ہوں۔" ماموں ریاض بولے۔

"نہیں ریاض، تو نہ جا بیٹے کہیں پولیس دوبارہ نہ پکڑ لے، تو نہ جا ریاض۔"

"باجی، پولیس کیوں پکڑے گی مجھے آخر، اسے دھوکہ ہوا تھا۔ بعد میں سب نے معافی مانگی ہے
دیکھیے نجم الحسن صاحب نے مجھے پانچ سو روپے بھی دیئے ہیں ہرجانے کے طور پر۔"

"تجھ پر اب الزام تو نہیں ہے؟"

"نہیں باجی، فیض الحسن بری صحبتوں میں ضرور پڑ گیا ہے مگر وہ برا لڑکا نہیں ہے جب اسے معلوم
اس نے جو رقمیں غائب کی ہیں ان کے الزام میں اس کے باپ نے مجھے گرفتار کرا دیا ہے تو وہ باپ کے پا
گیا اور اس نے ساری بات بتا دی۔ نجم الحسن خود تھانے گئے ان کی بیوی اور فیض بھی ساتھ تھا۔ انہوں

بڑا لیا بڑی معافیاں مانگی ہیں۔ انہوں نے دو سو روپے تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

"بھائی جان میں، میں کھانا لے آتا ہوں۔"

"روٹیاں لے آ.......... میں چائے بنا لیتی ہوں۔"

"نہیں باجی، مرغی کا سالن لاؤں گا۔ محنت کے پیسے ملے ہیں اور یہ آپ کو چائے بنانے کی کیا
پڑی، کیا آپ پھر چولہا جلانے لگی ہیں؟"

"نہیں مانتیں۔ مجھے بتاؤ کیا کروں..........؟" ابو بولے۔

"خدا کے لئے باجی چولہے کے پاس نہ جایا کریں۔ پورا دوپٹہ جلا لیا تھا۔ اللہ نے بچا لیا۔"

"اب بار بار ایسا تھوڑی ہو گا۔ جا کھانا لے آ۔" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ماموں دروازے سے نکل
گئے تھے۔ پھر میں نے ان سب کو دسترخوان پر دیکھا۔ امی ہاتھ والے پنکھے سے پنکھا جھل رہی تھیں۔

"اب یہ پنکھا رکھ دیں اور کھانا کھائیں۔" ابو بولے۔

"افوہ، کھاؤ تم لوگ مکھیاں بیٹھیں گی کھانے پر۔"

"ایک مکھی بھی نہیں ہے۔ رکھیے پنکھا کھانا کھایئے۔" ماموں بولے۔ "ذرا دیکھیے بھنی ہوئی مرغی کیا
مزا دے رہی ہے۔"

"کھا لوں گی نا۔ تم لوگ کھاؤ۔" امی بے اختیار رو پڑیں۔ ابو اور ماموں کے ہاتھ رک گئے۔
ماموں نے کہا۔

"باجی۔"

"کھا لوں گی میں۔ میرے پیچھے مت پڑو۔ مت پڑو میرے پیچھے۔ پتہ نہیں میرے بچے..........
میرے بچے.........." امی بلک بلک کر رو پڑیں۔ ابو بھی سسکنے لگے۔ ماموں عجیب سی کیفیت کا شکار
ہوگئے تھے۔ وہ ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ "رک گئے تم لوگ، نہ کھاؤ تو مجھے مردہ دیکھو۔ کھاؤ، میں کہتی
ہوں کھاؤ۔" امی ان کے ہاتھ ٹٹولنے لگیں۔ ماموں ریاض نے کہا۔

"آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا بھائی جان۔" ابو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر انہیں دیکھا۔

"آپ کے اور باجی کے سوا دنیا میں میرا اور کون ہے۔ آپ دونوں کی قسم کھا کر ایک بات کہہ رہا ہوں۔ یہ رزق
ہے میرے ہاتھ میں ہے میں جھوٹ نہیں بول رہا مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جو کہنا ہے باجی کے سامنے ہی کہہ دوں۔"

"بات کیا ہے؟" ابو نے آنکھیں خشک کر کے ماموں ریاض کو دیکھا۔

"مسعود زندہ ہے۔ خیریت سے ہے۔ بس ذرا کمزور ہو گیا ہے۔ حلیہ بدل رکھا ہے۔ داڑھی چھوڑ دی
ہے۔ کہتا ہے کہ کچھ مشکلات ہیں جن پر قابو پا لیا تو وہ واپس گھر آ جائے گا اس کی فکر نہ کی جائے۔"

"کیا.........؟" ابو اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

"آپ کی اور باجی کی قسم جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ زندہ سلامت ہے اور اسے محمود کے بارے میں بھی
معلوم ہے ہمارا محمود بھی خدا کے فضل سے خیریت سے ہے اور ملک سے باہر چلا گیا ہے اگر اسے ہمارا پتہ
معلوم ہوتا تو یقیناً وہ اب تک ہم سے رابطہ کر چکا ہوتا۔"

"ریاض.......... ریاض تجھے اللہ کا واسطہ۔ کلیجہ نکال لیا ہے تو نے۔ ہائے تو نے کلیجہ نکال لیا

ہے۔ ارے تجھے خدا کا واسطہ بتا تو دے بتا دے کہ دل رکھ رہا ہے یا سچ بول رہا ہے؟" امی نے جھک
ماموں ریاض کے پاؤں پکڑ لئے۔

"میں نے آپ دونوں کی قسمیں کھائیں ہیں باجی۔ اور بھی کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے بتائیں۔"

"کہاں ملا وہ، تیرے ساتھ گھر نہیں آیا؟"

"تھانے کے لاک اپ میں ملا تھا۔"

"ایں.........." ابو کے حلق سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔

"اللہ نے چاہا تو واپس آجائے گا۔ نجم الحسن کل اپنے تھانے دار دوست سے مل کر اسے رہا کرالیں گے۔"

"مجھے لے چل، مجھے لے چل ریاض، مجھے لے چل۔ اپنے، اپنے بچے کو چھونا چاہتی ہوں میں آ،
میں اسے چھونا چاہتی ہوں۔" امی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس طرح دل دکھا دیا باجی ورنہ میں ابھی آپ کو کچھ نہ بتاتا۔ مجھے اپنی یہ خاموشی جرم محسوس ہوئی تھی۔ ہر قیمت پر آپ کو انتظار کرنا ہوگا بھائی جان آپ غور کریں۔ اس پر قتل کا الزام ہے کہ جانے کس طرح اس نے خود کو چھپایا ہوا ہے۔ پولیس کی یادداشت اتنی خراب نہیں ہوتی سب یکجا ہوگئے تو کہیں تھانے دار کو ماضی یاد نہ آجائے۔ پھر ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

"ہیں.........." امی کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ باجی صبر کرنا ہوگا آپ کو۔ اللہ نے آپ کو ان دونوں کی زندگی کی خبر دی ہے ایک دن ہم سے آ بھی ملیں گے۔"

"کل نہیں.........؟" امی نے حسرت سے پوچھا۔

"سب کچھ اللہ جانتا ہے وہی سب کچھ.........."

ایک دم سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کوئی پاؤں پکڑ کر چلا رہا تھا۔ پھر ایک آواز سنائی دی تھی۔

"بابا جی .... بابا صاحب ...." میں چونک پڑا۔ چند افراد کھڑے ہوئے تھے۔ شکلیں جانی پہچانی سی تھیں۔ ان بزرگ کو میں نے فوراً پہچان لیا جن کا سامان اٹھانے کے دو روپے ملے تھے مجھے۔ میں جلدی سے اٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔

"بابا صاحب اٹھئے۔ اٹھئے بابا صاحب۔"

"کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے۔" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"غلطی ہم سے ہوئی ہے بابا صاحب۔ آپ کو پہچان نہ سکے۔"

"کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیں۔"

"اللہ کے نام پر آپ ہماری مدد کریں بابا صاحب۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

"آپ لوگ یقین کریں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہی خاندان تھا جو ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اب میں نے سب کو پہچان لیا تھا۔ وہ سب میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ بزرگ نے کہا۔

"عامر میرا پوتا ہے۔ میرے بیٹے کا ایک ہی بیٹا ہے، دوسری بیٹی ہے۔ یہ ہے وہ نسیمہ۔ عامر اسکول میں پڑھتا تھا۔ شوخ کھلاڑی مگر ذہین تھا کبھی کبھی بچوں کے ساتھ اسکول سے آوارہ گردی کرنے نکل جاتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے اسکول سے کافی فاصلے پر ایک جگہ کربلا کے نام سے مشہور

...ہے۔ دفن کئے جاتے ہیں۔ نزدیک ہی قبرستان بھی ہے آس پاس کھیت بکھرے ہوئے ہیں وہیں ...چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں چمک رہی تھیں، رات کو بخار آگیا وہ ہذیان بکتا رہا ...بعد میاں صاحب ہم زیر عتاب ہیں۔ سینکڑوں ایسے واقعات ہوچکے ہیں جن کی تفصیل طویل ہے ...سایہ ہوگیا ہے بابا صاحب۔ نہ جانے کیا کیا کر چکے ہیں ہم مگر کچھ نہیں ہوسکا۔ بابا صاحب اس وقت ...اس پر جنون طاری تھا جب وہ بھاگ کر باہر آیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر سہم گیا اس وقت سے اندر گھسا ہوا ...جبکہ اندر رہتا ہی نہیں تھا اب کہتا ہے باہر نہیں جاؤں گا باہر وہ ہے.........وہ!"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"آپ سے ڈر رہا ہے۔"

"مجھ سے؟"

"ہاں!"

"مجھ سے کیوں؟"

"اللہ جانتا ہے۔"

میں ہنسنے لگا۔ "عجیب ہیں آپ لوگ آپ کو پتہ ہے کہ میں خود ایک غریب آدمی ہوں۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتا ہوں۔ چچا میاں آپ کو خود علم ہے کہ میں نے آپ کا سامان اٹھا کر صبح کا ناشتہ کیا تھا!"

"اللہ کے نیک بندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھئے بابا صاحب۔ ہم بھلا آپ سے کچھ کہنے کی کہاں اہلیت رکھتے ہیں، اتنا ضرور کہیں گے کہ اللہ نے اپنی کوئی امانت آپ کو سونپی ہے تو اسے دوسروں کی بھلائی کیلئے ضرور استعمال کریں۔ آپ کی سربلندی میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہم پریشان حال لوگ ہیں نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ معصوم بچہ ہے کل گیارہ سال عمر ہے اس کی۔ پوری زندگی تباہ ہوجائے گی اس کی۔ ماں رو رو کر مر جائے گی اس کی۔ سولی پر لٹکے ہوئے ہیں ہم لوگ اللہ کے نام پر ہماری مدد کریں۔" بزرگ رونے لگے۔

"مگر محترم .... میں .... میں ایک عام آدمی ہوں۔ میں خود زندگی کا ستایا ہوا ہوں آپ کو ضرور میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"وہ صرف آپ سے خوفزدہ ہے۔ کہتا ہے باہر نہیں جائے گا۔ باہر کمبل والے بابا ہیں اور کمبل آپ کے پاس ہے۔"

"کمبل!" میرے پورے وجود میں بم سا پھٹا۔ کمبل .... کمبل میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ...کمبل کو دیکھا جسے ابھی سرہانے رکھے سو رہا تھا۔ یہ عطیہ انہی دو بزرگوں میں سے ایک نے مجھے دیا تھا۔ ...اس وقت میری اندھی آنکھوں نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ اب تک نہیں پہچانا تھا۔ یہ تو وہی کمبل تھا جو ...یہ سب پہلے بھی مجھے مل چکا تھا۔

میں بھلا اس کمبل کو بھول سکتا تھا جب یہ ملا تھا تو مجھے عروج ملا تھا اور پھر میں نے اسے کھو دیا تھا۔ آہ یہ ...کمبل تھا سو فیصد وہی تھا دماغ میں شیشے سے ٹوٹنے لگے۔ چھناکے ہونے لگے وہ دونوں بزرگ یاد آئے ...میں سے ایک نے مجھے کمبل دیا تھا۔ شکلیں یاد نہیں تھیں لیکن..........باقی سب کچھ یاد تھا کمبل اوڑھا تھا ...اس کے بعد امی اور ابو کو دیکھا تھا۔ ماموں ریاض کے بارے میں آگے کا سارا حال دیکھا تھا۔ کوئی تصو

اتنی جامع شکل نہیں اختیار کر سکتا۔ میں نے تو وہ سب کچھ دیکھا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"باباصاحب........." بزرگ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی.........میں..........وہ۔"

"خدا کے لئے باباصاحب۔ خدا کے لئے اللہ نے آپ کو کچھ دیا ہے تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ خدا کے لئے باباصاحب۔" بزرگ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور میں تڑپ اٹھا۔

"ایسا نہ کریں محترم، خدا کے لئے ایسا کر کے مجھے گنہگار نہ کریں۔"

"ہماری مدد کریں۔"

"آپ مجھے وقت دیجئے کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں خود حاضری دوں گا۔"

"بہت بہتر، ہم انتظار کریں گے۔"

"آپ جائیے میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ اگر آپ کا کام نہ کر سکا تو معذرت کرنے آجاؤں گا۔" میں نے کہا اور وہ سب امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر کمبل اٹھالیا اسے سینے سے لگالیا، سکون کا ایک سمندر سینے میں اتر گیا تھا دیر تک اس سکون سے بہرہ ور ہوتا رہا۔

شام کے سائے جھلک رہے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ پانی تلاش کر کے وضو کیا، نماز پڑھی اسی درخت کے نیچے بسیرا کرلیا تھا۔ رات ہوگئی عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تھا کہ کھانا آگیا۔

"باباصاحب لنگر لے لیجئے۔ صاحب مزار کے نام کا ہے۔" انکار نہ کرسکا تھوڑا بہت کھانا کھایا اس کے بعد کمبل اوڑھ لیا دل میں کہا۔

"مجھے اس نعمت سے سرفراز کرنے والو! مجھ سے زیادہ تم میرے بارے میں جانتے ہو میں کور بینا ہوں، میری نظر محدود ہے۔ میری عقل محدود ہے جو منصب مجھے عطا کیا گیا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے رہنمائی درکار ہے۔ میری عقل ناقص صحیح فیصلے کرنے سے قاصر ہے مجھے رہنمائی عطا ہو مجھے رہنمائی عطا ہو۔ مجھے رہنمائی درکار ہے۔ مجھے رہنمائی چاہئے۔" آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے کسی نے زور سے دھکیل کر کہا۔

"بڑا پھیل کر سو رہا ہے سرک جگہ دے۔" میں لڑھک گیا تھا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ بھی بچے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک بوڑھا آدمی تھا۔ "زمین اللہ کی ہے اس پر سب کا حق ہے۔"

"کیوں نہیں۔ آپ آرام سے لیٹ جائیں۔" میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا آدمی اطمینان سے لیٹ گیا کچھ دیر خاموشی سے گزر گئی پھر اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"پیروں میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ذرا دبا دے۔"

"جی.........!" میں نے اس کا پاؤں اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور اسے دبانے لگا۔

دفعتاً اس نے بڑی زور سے دوسرا پاؤں میرے سینے پر مارا اور میں بے اختیار لڑھک کر دور جا گرا۔

"ہاتھوں میں کانٹے اگے ہوئے ہیں، آہستہ نہیں دبا سکتا طاقت آزما رہا ہے میرے پیروں پر۔"

"اوہ نہیں باباصاحب معاف کر دیجئے اب آہستہ دباؤں گا۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ اس کے پاس آبیٹھا احترام سے دوبارہ اس کا پاؤں لے کر گود میں رکھا اور اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں، کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا تو اس نے کروٹ بدل کر دوسرا پاؤں میری گود میں رکھ دیا۔ میں دوسرا پاؤں دبانے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ اچانک وہ بولا۔ "قاتل بت ہیں کچھ زیادہ خطرناک کچھ کم۔ دشمن کے وار کرنے سے پہلے اس پر وار کردو۔ اسے مار ڈالو۔ دشمن نمبر ایک غرور ہے، خود پسندی ہے۔ تمہارے بدن کا لباس، تمہاری بینائی، تمہاری سوچ اور سب سے بڑھ کر تمہاری زندگی اپنی نہیں ہے پھر کس چیز پر حق جتاتے ہو۔ بیوقوفی ہے نا.........کیوں ہے نا..........؟"

"ہاں........." میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب کچھ قرض ہے ادھار ہے ادائیگی ضروری ہوتی ہے بچا کھچا اپنا ہوتا ہے دوسرے کے مال پر کیا اتراتا، کیوں ہے کہ نہیں؟"

"ٹھیک ہے باباصاحب۔"

"پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لو۔"

"کس سے باباصاحب؟"

"بتانے والا اندر ہوتا ہے پوچھو گے جواب ملے گا بھٹکنے کی ضرورت ہی کیا ہے مگر کرنے سے پہلے پوچھو۔"

"جی باباصاحب۔"

"خود غرضی ہمیشہ نقصان دیتی ہے پہلے دوسروں کے بارے میں سوچو پھر اپنے بارے میں۔ جذبات سنبھالنے پڑتے ہیں ورنہ کھیل بگڑ جاتا ہے کیا سمجھے اور کچھ پوچھنا ہے؟"

"آپ نے جتنا بتایا ہے اتنا تو سمجھ لیا باباصاحب۔"

"اتنا کافی ہے ضرورت پڑے تو اور پوچھ لینا۔"

"میں نابینا ہوں باباصاحب کچھ نہیں جانتا۔ سچائی سے سب کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر ناواقفیت کا شکار ہوجاتا ہوں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"چہرہ ڈھک لینا دل و دماغ روشن ہوجائیں گے بس کافی ہے۔"

بوڑھے شخص نے پاؤں سمیٹ لئے۔

"اور دباؤں باباصاحب؟"

"نہیں.........چلتا ہوں۔" بوڑھے نے کہا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں اسے دیکھتا رہا اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور پھر ایک اور درخت کی آڑ میں گم ہوگیا۔ دل بری طرح کانپ رہا تھا رہنمائی ملی تھی انعام عطا ہوا تھا ہدایت کی گئی تھی۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچ میں ڈوب گیا ساری باتوں کو یاد کرکے دل میں اتارتا رہا تھا پھر وہ لوگ یاد آگئے جن سے وعدہ کیا تھا۔ کیا کروں، کیا کرنا چاہئے؟ لیٹ کر کمبل چہرے پر ڈال لیا۔ ذہن میں ان کا تصور کیا تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ وہ سب نگاہوں کے سامنے آگئے بزرگ، ان کا بیٹا، بہو لڑکی اور وہ بچہ۔ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں دہشت رقصاں تھی نوجوان لڑکی نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اور خوف سے کانپ رہی تھی بچے کی ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ حسرت بھری نظروں سے بچے کو دیکھ رہی تھی اس کا شوہر سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اور وہی بزرگ تسبیح ہاتھوں میں لئے کچھ پڑھ رہے تھے۔

دفعتاً لڑکے کی زبان لمبی ہونے لگی۔ سرخ زبان کسی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی

اس کی لمبائی کوئی چار گز ہو گئی اور پھر اچانک اس نے ان بزرگ کے ہاتھوں میں دبی تسبیح کو لپک لیا تو لڑکی نے دہشت بھری چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گئی۔

"بات کر لو .... چلے جاؤ .... حال معلوم ہو جائے گا .... چلے جاؤ کام ہو جائے گا" مجھے اپنی آواز سنائی دی میں بول رہا تھا، میں سن رہا تھا۔ مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمبل تہہ کر کے شانوں پر رکھا اور تیز تیز قدموں سے اسی طرح چل پڑا کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا سب لوگ ریسٹ ہاؤس میں تھے میں نے دروازہ بجایا انہی بزرگ نے دروازہ کھولا تھا۔

"آپ .... آیئے، دیکھئے اندر کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آ سکتا ہوں؟"

"آجایئے۔" بزرگ دروازے سے ہٹ گئے میں اندر داخل ہو گیا بچہ اچھل پڑا تھا اس کی زبان فوراً اندر چلی گئی وہ اٹھ کر دیوار سے جا لگا وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور شاید بھاگنے کے لئے جگہ تلاش کر رہا تھا پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، اپنا کام کرو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

"ایک گلاس پانی دیجئے۔" میں نے بزرگ سے کہا اور وہ جلدی سے ایک طرف رکھی صراحی کی طرف بڑھ گئے۔

"تم سن نہیں رہے، میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" لڑکے نے بھاری آواز میں کہا۔

"یہاں تم سے جھگڑا کون کر رہا ہے، اللہ کے بندے ہو، اللہ کا نام لے کر بات کرو۔" میں نے بزرگ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس پر بسم اللہ پڑھ کر پھونکی اور اس کے بعد پانی کا گلاس لڑکے کی طرف بڑھا کر بولا۔

"لو میاں پانی پیو، محبت سے کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے محبت ہی سے قبول کرنا چاہئے۔"

"دیکھو آخری بار سمجھا رہا ہوں، ہمارے بیچ میں مت آؤ تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا سوائے نقصان کے۔"

"اللہ کے بندے ہو کے، اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچاؤ گے تو تمہارے ساتھ بھی تو بہتری نہیں ہوگی۔ جواب دو، ورنہ یہ پانی میں تمہارے جسم پر پھینک دوں گا اور تم سمجھتے ہو کہ یہ گناہ صرف تمہارے سر ہوگا۔"

"ارے واہ جھگڑا ہمارا ہے بیچ میں کود رہے ہو تم، ذرا اس سے پوچھو کیا کیا ہے اس نے۔ بچے کھیل رہے تھے اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا تھا، شرارت اپنی جگہ ہوتی ہے، پتھر مارنے شروع کر دیئے اور اچھا خاصا زخمی کر دیا میرے بچے کو، میں بھلا چھوڑ دوں گا اسے، اتنے ہی زخم نہ لگا دوں اسے تو میرا بھی نام نہیں۔"

"درگزر بھی تو ایک پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے بچپن ہے، بے شک تمہیں نقصان پہنچا ہوگا لیکن اس کی زندگی لے کر تمہیں کیا مل جائے گا۔"

"اور اگر میرا بچہ مر جاتا تو ....؟"

"اللہ نے اسے زندگی عطا فرمائی تم اس کے صدقے اس کی زندگی بھی قائم رہنے دو .... یہ ضروری ہے"

"کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری ہے، میں سمجھتا ہوں تم اپنی یہ ولایت لے کر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرا تمہارا جھگڑا ہو جائے گا اور ہاں پہچانتا ہوں تمہیں اچھی طرح، جانتا بھی ہوں ایک بار دیکھ بھی چکا ہوں مگر وہ معاملہ ذرا دوسرا تھا ہر ایک کے بیچ میں پہنچ جاتے ہو۔ تمہارا بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"اگر میرے سر پر پتھر مار کر تمہارا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو میں حاضر ہوں کچھ نہ کہوں گا تمہیں، لیکن بچوں

کے باپ ہو معاف کر دو اسے۔ میں اس کی طرف سے اور اس کے تمام اہل خانہ کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر کوئی جرمانہ کرنا چاہو تو جرمانہ کر دو ادائیگی ہوگی مگر اب اسے معاف ہی کر دو تو بہتر ہے۔"

"اور اگر نہ کروں تو ....؟"

"تو پھر بات دوسری شکل اختیار کر جائے گی۔" میں نے گلاس سیدھا کر لیا اور لڑکا دیوار کے سہارے ادھر سے اُدھر کھسکنے لگا پھر بولا۔ "یہ طریقہ ہوتا ہے دوستی کرانے کا، ان لوگوں سے کہو کہ آئندہ اگر یہ بچہ اس طرف دیکھا گیا تو پھر میں اسے نہیں چھوڑوں گا اور تم، ٹھیک ہے میں نہ سہی کوئی دوسرا تمہیں ٹھیک کر دے گا۔ ہر ایک کے بیچ میں ایسے ہی مت آجایا کرو۔"

"اب تم یہ بتاؤ کہ سچ مچ بات معاف کر رہے ہو یا یونہی عارضی طور پر مجھے ٹال رہے ہو؟"

"اور اگر یہ بچہ دوبارہ ادھر دیکھا گیا تو ....؟"

"اس کا وعدہ اس کے والدین کریں گے۔"

عورت جلدی سے بولی۔ "نہیں جائے گا ہم وہ شہر ہی چھوڑ دیں گے۔ وہ جگہ ہی چھوڑ دیں گے ہم کبھی نہیں جائیں گے اس طرف۔ کبھی نہیں جائیں گے۔"

"دیکھو میاں جی مشورے دے رہے ہیں تمہیں ہم ایسے معاملات میں ٹانگیں مت اڑایا کرو۔ ورنہ کسی وقت نقصان بھی اٹھا جاؤ گے۔ ارے ہاں پہنچ گئے ولی بن کر۔" لڑکے نے کہا اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ رفتہ رفتہ اس کا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا اور پھر وہ دیوار کے ساتھ نیچے کھسکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا بزرگ جلدی سے آگے بڑھے ان کا بیٹا بھی آگے بڑھا اور باپ نے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ لڑکا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ عورت کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "خدا نے اپنا کرم کر دیا میرے خیال میں اب سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں۔ اب خدا نے چاہا تو سب بہتر ہو جائے گا۔"

بزرگ جلدی سے میرے قریب پہنچے اور انہوں نے جھک کر میرے پاؤں پکڑنا چاہے تو میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں محترم، خدا کے لئے نہیں یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرے ساتھ دشمنی ہے، محبت کے جواب میں دشمنی۔" بزرگ ایک دم سیدھے ہو گئے تھے۔

"میرا دل کہہ رہا ہے، میرا بچہ ٹھیک ہو گیا۔ آہ ہم سب کو نئی زندگی ملی ہے اپنے جذبات کا اظہار میں کیسے کروں۔" وہ بولے۔

"بس ایک ہی التجا ہے۔"

"کہئے بابا صاحب۔"

"میرے حق میں دعائے خیر کیجئے۔"

"سنئے بابا صاحب سنئے کچھ خدمت کا موقع دیجئے ہمیں۔"

"اللہ نے آپ کو اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ بری باتیں نہ کیجئے خدا حافظ۔" میں نے کہا اور وہاں سے نکل آیا اس کے بعد رکنے کو دل نہیں چاہا تھا چنانچہ کسی سمت کا تعین کئے بغیر چلتا رہا۔

مزار شریف سے بہت دور آبادی تھی وہاں سے بھی گزر گیا لق و دق میدان شروع ہو گئے چاند نکل آیا

تھا ایک پر سکوت ماحول تھا اسی طرح چلتے رہنے میں لطف آرہا تھا چلتا رہا اور نہ جانے رات کا کونسا پہر
پاؤں کچھ وزنی محسوس ہوئے تو رک گیا. جھاڑیاں. پتھر مٹی کے تودے گڑھے جن میں پانی بھرا ہوا
جھینگر بے وقت کی راگنی الاپ رہے تھے۔ کسی قدر صاف ستھری جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور تھکن محسوس
وہیں آرام کرنے کی ٹھانی۔ ایک پتھر سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ نہ جانے کتنی دیر گزری
قدموں کی چاپ سنائی دی اور آنکھیں کھل گئیں. چار انسان نظر آئے۔ چاندنی میں انہیں صاف
جاسکتا تھا۔ دیہاتی تھے لاٹھیاں اٹھائی ہوئی تھیں, لمبے تڑنگے تھے۔ سہمے سہمے قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے
تھے میں انہیں دیکھتا رہا اور جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"سنو .... بات سنو۔" میں نے کہا اور وہ چاروں رک گئے انہوں نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا
اس لئے وہ چاروں طرف دیکھنے لگے۔ پھر سب ہی دہشت سے چیخنے لگے انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی
مگر ایک دوسرے میں الجھ کر گر پڑے۔

"ارے دیّا رے دیّا۔ رے شردھانند تیرا ستیاناس۔ ہے پربھو .... ہے بھگوان .... ارے
بھاگو .... ارے بھاگو۔" ان میں سے کسی نے چیخ کر کہا مگر ان کی ہمت پست ہوگئی تھی۔

"ڈرو نہیں بھائی. میں بھی تمہارا جیسا انسان ہوں. ڈرو نہیں۔" میں کھڑا ہوگیا۔

"ہرے مار دیو. رام دیال۔ ہرے بھاگو بھیا۔" کوئی اور چیخا اس دوران میں انکے بالکل قریب پہنچ گیا تھا

"دیکھو میں پھر کہہ رہا ہوں تم سے ڈرو نہیں میں کوئی بھوت پریت نہیں تمہارے جیسا انسان ہوں۔"

"ہرے بھیا بھوت ناہیں تو کا یہاں کھیت رکھا رہے ہو؟" ایک نے ہمت کر کے کہا۔

"مسافر ہوں سفر کر رہا تھا۔ تھک کر یہاں لیٹ گیا تھا۔"

"ایں۔" ان کی کچھ ہمت بندھی ایک ایک کر کے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
مجھے دیکھا اور پھر ڈرے ڈرے انداز میں ہنسنے لگے۔

"ارے تو ڈر کون رہا تھا ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے ہاں .... واہ رے رام دیال تو بھی بڑا ابکٹ ہے بھائی۔"

"بس بس چپ ہو جا شرم کر جان تو تیری نکل رہی تھی مگر بھائی مسافر لگو تو تم بھوت ہی رہو۔ ارے بھیا
اکیلے یہاں پڑے ہوئے تھے۔"

"تم لوگ کون ہو اور اس وقت کہاں جا رہے تھے۔"

"ارے بس کیا بتائیں یہ شردھانند ہے بس ہریالی بستی گئے تھے کام سے صبح کو چلتے مگر یہ گھر والی سے
کہہ آیا تھا کہ رات کو واپس آجائے گا۔ بس بھیا ہمیں کھینچ کر چل پڑا۔ حالانکہ راستے میں لال تلیا پڑتی
ہے مگر بھیا بیاہ کو چار مہینے ہوئے ہیں وعدہ کیسے نہ پورا کرتا ارے ہے نا شردھانند ...."

"اب چلو یا یہیں پڑے رہو گے۔" شردھانند نے کہا۔

"بھائی مسافر. تم کدھر جا رہے تھے۔"

"بس سیدھا ہی جا رہا تھا۔"

"کہیں دور سے آرہے ہو کا؟"

"ہاں۔"

"چلو گے ہمارے ساتھ یا یہیں جنگل میں مزے کرو گے؟"

"تم لوگ کہاں رہتے ہو؟"

"دھونی پور کے رہنے والے ہیں ہم۔"

"چلو. میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ تھکن تھی مگر پھر بھی ان سادہ دل
دیہاتیوں کے ساتھ جانے کو دل چاہا۔ وہ سب آگے بڑھ گئے تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" شردھانند نے پوچھا۔

"مسعود۔" میں نے جواب دیا۔

"میاں بھائی ہو؟"

"ہاں۔"

"پہلے کبھی دھونی پور نا گئے؟"

"کبھی نہیں۔"

"بڑھیا جگہ ہے مگر ...."

"مگر کیا؟"

"ارے نا بھائی نا۔ رات کا وقت ہے کچھ نا بولیں گے ہم۔ ویسے ہی اس سسرے شردھانند نے مروا
دیا ہے ہمیں۔" رام دیال نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد دیر تک خاموشی طاری رہی تھی۔ پھر
ان لوگوں کے قدم رکنے لگے سب ڈرے ڈرے سے لگ رہے تھے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے؟"

"لال .... لال تلیا۔"

"تم لوگ پہلے بھی اسکا نام لے چکے ہو۔ یہ لال تلیا کیا ہے۔"

"ارے بھیا یہاں سے نکل چلو. بعد میں بتا دیں گے۔"

"نہیں ابھی بتاؤ۔"

"جمناداس ...." شردھانند نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور سب رک گئے۔ شردھانند خوفزدہ انداز
میں ایک طرف اشارہ کر رہا تھا میں نے اس سمت دیکھا آگ روشن تھی اور کوئی شخص بیٹھا اس جلتی آگ
میں لکڑیاں ڈال رہا تھا۔ جس سے آگ اور بھڑک اٹھتی تھی۔

"کیا بات ہے آگے نہیں چلو گے۔" میں نے پوچھا مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سب
دہشت زدہ نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر ان کے ساتھ کھڑا رہا پھر میں نے آگے قدم
بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں چلتا ہوں تم یہاں آرام کرو۔"

"ارے کوئی دماغ خراب ہوا ہے تمہارا آگے نہ بڑھنا بے موت مارے جاؤ گے۔ گردن مروڑ کر
رکھ دیگا تمہاری۔"

"کون؟"

"مرکٹا .... ہرے رام غلطی سے منہ سے نام نکل گیا۔" رام دیال نے دانتوں تلے زبان دبالی۔

"مرکٹا کہاں ہے وہ۔"

"تلیا کنارے آگ کون جلا رہا ہے۔"

"وہ سر کٹا ہے۔"

"ارے تو کیا چاچا ہے ہمارا۔" سب کے سب دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔

"مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"تمہاری تو گھوم گئی ہے کھوپڑی۔ ہمیں کاہے کو مرواؤ ہو بھائی۔ ارے واپس چلو بھیا آج تو بڑی ہی مصیبت کی ہے۔ کہہ رہے تھے شردھانند سے آج گھر پہنچ جائیں تو جانو۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہاں رکو میں دیکھتا ہوں۔" میں آگے بڑھنے لگا تو چاروں نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔

"ساری شیخی نکل جائے گی میاں جی رک جاؤ۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔ دن نکل آئے گا تو آ گے بڑھیں گے۔ تمہیں اس کے قصے نہیں معلوم۔"

"بتاؤ گے تو پتہ چلیں گے نا۔"

"کوئی ایک ہو تو بتائیں جمناداس کے سارے کٹم کو کھا گیا ہے یہ۔ ہری داس کو اس نے مارا۔ سیم پو کا جوان بیٹا اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ کلو سنگھ کی لاش تال میں گل گئی۔ راتوں کو مستی میں نکل آتا ہے آوازیں لگاتا ہے۔ سنگھاڑے لے لو سنگھاڑے۔ کسی نے جھانک لیا تو سمجھو گیا۔ ہماری بستی تو اجڑی بستی ہو گئی ہے آج کل۔ بے چارے بنسی لعل پر تو مصیبت آئی ہوئی ہے۔"

"آؤ۔ بیٹھو۔ مجھے اس کے بارے میں مزید بتاؤ۔" میں نے کہا۔ بات دلچسپ تھی خلق خدا کو تنگ کیا جا رہا تھا تو ذمہ داری آتی تھی۔ ان لوگوں نے معصومیت سے مکمل کہانی سنائی۔ جمنا داس دھوبی پور کا تھا۔ دو بیٹے ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹا دکان کے کچھ پیسے جوئے میں ہار گیا۔ باپ کے خوف سے لال تلیا آ چھپا۔ صبح کو اس کی اکڑی ہوئی لاش ملی تھی۔ جمنا داس نے ایک منتر پڑھنے والے کو بلا کر تلیا کے کنارے جاپ کرایا بس غضب ہو گیا۔ منتر پڑھنے والا تو خیر بھاگ گیا مگر جمنا داس کی مصیبت آ گئی۔ بیوی مٹی کی آگ سے جل کر مر گئی۔ پھر دوسرا بیٹا پاگل ہو گیا۔ اور سب کے غم میں جمنا داس نے دھتورہ کھا کر خودکشی کر لی۔ ہری داس اہیر بھی تلیا کنارے مارا گیا۔ سلیم چاچا کا بیٹا پہلوانی کرتا تھا۔ مسلمان تھا سرکٹے کو تسلیم نہ کیا۔ تلیا کے کنارے آ کر سرکٹے کو للکار دیا۔ بہت سے لوگوں نے بے سر کے پہلوان کو اس سے کشتی لڑتے دیکھا۔ اور پھر نوجوان لڑکا خون تھوک تھوک کر مر گیا یہی ساری کہانیاں تھیں۔ میں نے بنسی لعل کے بارے میں پوچھا۔ "وہ دوسری بات ہے۔"

"کیا؟"

"ارے وہ اور واقعہ ہے بنسی لعل مہاراج بھی تو کسی سے کم نہیں ہیں۔"

"وہ اس سرکٹے کا قصہ نہیں ہے؟"

"نہیں وہ ان کے کرموں کا پھل ہے۔"

"چلو تم لوگ یہاں بیٹھو میں ذرا اس سے ملاقات کر لوں۔" میں نے کہا اس بار میں ان کے روکے سے نہ رکا تھا آگ کو نشان بنا کر ہی آگے بڑھا اور تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ خاصا قدرتی وسیع تالاب جس میں سنگھاڑوں کی بیلیں تیر رہی تھیں میں نے جلتی آگ کے پاس اسے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا بیگانہ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا اور درحقیقت اس کے شانوں پر سر موجود نہیں تھا۔ میری آہٹ پا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے رے تو۔" ایک منمناتی آواز سنائی دی۔

"مسعود ہے میرا نام۔ تمہارا بھی کوئی نام ہے؟"

"سورما بن کر آیا ہے؟"

"نہیں تمہیں سمجھانے آیا ہوں؟"

"کیا سمجھائے گا؟"

"تمہارا اصل ٹھکانہ کہاں ہے؟"

"تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔"

"تم خلق خدا کو پریشان کرتے ہو تمہیں یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

"لڑے گا؟" اس نے رانوں پر ہاتھ مار کر اچھلتے ہوئے کہا۔

"مجبور کرو گے تو لڑنا پڑے گا میں چاہتا ہوں ایسا نہ ہو۔" میں نے کہا۔ دل میں کہہ رہا تھا کہ جو کچھ کر رہا ہوں درست ہے وہ گندی روح ہے اور انسان کو نقصان پہنچاتی ہے اسے روکنا ضروری ہے وہ کئی بار اپنا ہاتھ مار کر اچھلا اور پھر اس نے اپنے بائیں شانے سے میرے سینے پر ٹکر ماری۔ لڑکھڑا گیا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ اس کے بدن کے درمیان سے نکل گئے۔ اس نے عقب میں آ کر پھر ایک ٹکر ماری اور میں پھر لڑکھڑا گیا مگر گرا نہیں تھا۔ ایک منمناتا بھیانک قہقہہ اس کے حلق سے نکلا اور وہ اچھل کود کرنے لگا۔ کبھی سو گز دور نظر آتا کبھی بالکل قریب اسے چھونے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور تیار ہو گیا۔ اس نے قریب آ کر میرے سینے پر لات ماری تو میں نے فوراً کمبل اس پر اچھال دیا اور کمبل پوری طرح پھیل کر اس پر چھا گیا ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ کمبل کے نیچے وہ بری طرح جدوجہد کر رہا تھا اور اس کی چیخیں بھیانک سے بھیانک تر ہوتی جا رہی تھیں وہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا پھر اس کی آواز مدہم ہوتی چلی گئی اور کچھ دیر کے بعد کمبل بالکل زمین پر پھیل گیا جیسے اس کے نیچے کچھ نہ ہو میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور نیچے کا منظر دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا زمین پر ایک بڑے انسانی جسم کا پورا سیاہ نشان بنا ہوا تھا جس سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا میں نے کمبل لپیٹ کر کندھے پر ڈال لیا نہ جانے کس طرح ان چاروں کی ہمت پڑی کہ وہ میرے قریب آ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھنے لگے۔

"بھسم ہو گیا۔" رام دیال نے کہا اور پھر سب نے مجھے دیکھا اور اچانک چاروں ہاتھ جوڑ کر میرے پیروں سے لپٹ گئے۔ "جے ہو مہاراج کی۔"

"مہاراج میاں ہیں۔" دوسرا بولا۔

"ہم سمجھے نہ تھے مہاراج۔" بمشکل تمام میں پیچھے ہٹا اور میں نے ان سے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

"آپ نے سرکٹا مار دیا مہاراج سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ہم نے۔ آپ دھرماتما ہیں۔ ہم سمجھے نہیں تھے آپ کو مہاراج۔ آپ نے سرکٹا مار دیا ارے دیا رے دیا۔ یہ بات تھی اور ہم نے پہچان نہیں پائے آپ کو مہاراج۔ کوئی بری بات منہ سے نکل گئی ہو تو معاف کر دیں۔" ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں تسلی دے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلئے آپ لوگوں کو

ایک گندی روح سے تو نجات مل گئی۔ ''

'' ارے مہاراج بستی والے سنیں گے تو چرنوں میں آ پڑیں گے آپ کے۔ سب کا ناک میں دم ... تھا اس سر کٹے نے اور مہاراج یہ تو بھسم ہو گیا دھرتی میں سما گیا۔ ہرے رام۔ ہرے رام۔ '' ان کی سمجھ میں ... آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔ میں نے کہا۔ '' چلو ٹھیک ہے یہ کام تو ہو گیا اب تو بستی چلو گے۔ ''

'' اب بھی نہ چلیں گے مہاراج۔ '' وہ چاروں بڑی عقیدت سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ... میں، میں نے ان سے بستی میں رہنے والوں کے بارے میں پوچھا۔

'' بڑی اچھی ہے ہماری بستی مہاراج۔ ہندو، مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہم اس بستی میں پیدا ہوئے جوان ہو گئے کبھی کوئی خرابی نہیں ہوئی۔ سنسار میں ادھر اُدھر لوگ لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، ہم بڑے پریم سے رہتے ہیں۔ جہاں ہم مولوی حمید اللہ کی باتیں سنتے ہیں وہیں پنڈت کرشن مراری کی کتھائیں بھی سنتے ہیں۔ بھگوان کا نام سب اپنے اپنے طور پر لیتے ہیں مہاراج۔ کیا ہندو کیا مسلم۔ ''

'' مولوی حمید اللہ کون ہیں؟ ''

'' دھونی پور کی مسجد کے مولوی صاحب ہیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں بیچارے۔ ''

'' مسلمان یہاں کتنے آباد ہیں؟ ''

'' ہمیں ٹھیک سے نہیں معلوم مہاراج پر بہت ہیں اور سب اپنے اپنے کام کرتے ہیں راستے بھر لوگ باتیں کرتے آئے اور پھر دھونی پور پہنچ گئے۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی پھر بستی کے ... میں قدم رکھا تو مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی اور میرے قدم رک گئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے ...

'' ذرا مسجد کا راستہ اور بتا دو مجھے۔ ''

'' وہ ہے، سیدھے ہاتھ کی سیدھ میں وہ جو روشنی جل رہی ہے۔ '' شردھانند نے کہا میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا اور پھر کہا۔ '' اچھا تو بھائیو! میری منزل وہ ہے۔ ''

'' دھونی پور میں رہیں گے تو مہاراج؟ ''

'' دیکھو جو اللہ کا حکم۔ ''

'' ہم آپ کی سیوا کرنا چاہتے ہیں۔ ''

'' نہیں بھائی تمہارا بے حد شکریہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اچھا اب تم لوگ اپنے گھر جاؤ میں بھی اپنے اللہ کے گھر کی جانب قدم بڑھاتا ہوں۔ '' میں نے کہا انہوں نے ہاتھ جوڑ کر سامنے گردنیں جھکا دیں اور عقیدت سے واپس چل پڑے۔ میرا رخ مسجد کی جانب ہو گیا تھا۔ مسجد زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ چھوٹی چھوٹی تقریباً پانچ فٹ ... دیواریں چاروں طرف بنی ہوئی تھیں۔ احاطہ وسیع تھا اور مسجد کی اصل عمارت بہت چھوٹی۔ اندر ... تھوڑے فاصلے پر ایک چبوترہ بلند ہو گیا تھا۔ بائیں طرف ہاتھ سے چلنے والا نلکا لگا ہوا تھا اور اس کے بعد ... سمت گھروں کا سا منظر تھا۔ یقینی طور پر مسجد کا حجرہ ہو گا۔ مولوی صاحب ابھی تک بلندی پر اذان دے ... غالباً یہ مسجد کی چھت کا حصہ تھا جہاں وہ موجود تھے۔ ایک سمت سے سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ میں نے ایک سمت رکھا جوتے اتارے، ہاتھ سے نلکا چلایا اور وضو کرنے بیٹھ گیا اذان ختم ہو چکی تھی غالباً مولوی ... نیچے اتر رہے تھے میں نے وضو سے فراغت حاصل کر کے کمبل سنبھال کر بغل میں ... اور اس کے بعد ...

... ہو گیا۔ مولوی صاحب میری ہی طرف آ گئے تھے۔ میں ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا چوڑا چکلا جسم اور ... تھے بڑی سی داڑھی سینے پر بکھری ہوئی تھی اور آنکھوں میں چمک تھی مجھ سے بولے۔

'' مسافر معلوم ہوتے ہیں حضرت۔ ''

'' جی مولوی صاحب۔ ''

'' ابھی ابھی بستی میں داخل ہوئے ہیں؟ ''

'' جی ہاں بس یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کے منہ سے اذان کی آواز نکلی اور میں نے آپ کی بستی میں ... قدم رکھا۔ ''

'' خوش آمدید .... میرا نام حمید اللہ ہے۔ ''

'' خاکسار کو مسعود احمد کہتے ہیں۔ ''

'' نمازی آنے والے ہیں ذرا انتظامات کر لوں اس کے بعد آپ سے گفتگو رہے گی۔ نماز کے بعد ... نہ جائیے گا۔ صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کیجئے گا۔ ''

'' بہتر ہے۔ '' میں نے جواب دیا اور ایک گوشے میں جا بیٹھا آنکھیں بند کیں اور درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ مولوی صاحب مجھ سے ملنے کے بعد کہیں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد مسجد کے دروازے ... نمازیوں کا داخلہ شروع ہو گیا۔ نلکا چلنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ کوئی بیس بائیس افراد جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب بھی تیار ہو کر واپس آ گئے اور پھر میں نے نماز با جماعت ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی چنانچہ وہیں بیٹھا رہا اور درود شریف کا ورد کرتا رہا۔ مولوی صاحب میرے قریب آ گئے تھے کہنے لگے '' آئیے مسعود صاحب تشریف ... چائے تیار ہو گئی ہے ناشتہ کچھ دیر کے بعد پیش کیا جائے گا۔ ''

'' زحمت ہو گی آپ کو .... ''۔

'' نہیں۔ مہمان رحمت خداوندی ہوتے ہیں اور پھر اتنی صبح ہماری بستی میں داخل ہونے والا مہمان تو ... لئے بڑا باعث رحمت و برکت ہو سکتا ہے۔ آئیے تکلف نہ کیجئے۔ مجھے میزبانی کا شرف بخشئے۔ ''

... مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ مسجد کا وہ بغلی حصہ جسے میں گھروں کا سلسلہ سمجھا تھا ایک سرے سے ... سرے تک مولوی صاحب ہی کے پاس تھا۔ اندرونی حصے میں شاید ان کے اہل خانہ کی رہائش تھی تھوڑا ... تھا اس کے بعد وسیع و عریض صحن، جس میں املی کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے تھے اور ان کی ... بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی سورج ابھی پوری طرح بلند نہیں ہوا تھا لیکن اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا مولوی صاحب نے کچی مٹی کے پیالے میں چائے پیش کی اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ مولوی حمید اللہ میرے سامنے ... تھے بغور مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ '' میاں برا نہ ماننے گا ہماری اور آپ کی عمروں میں جتنا فرق ہے ... اگر کوئی تھوڑی سی بے تکلفی کی گفتگو ہو جائے تو برا نہ محسوس کریں۔ ''

'' نہیں مولوی صاحب۔ بزرگ ہیں آپ میرے۔ ''

'' کہنا یہ چاہتے تھے کہ ویسے تو آپ ایک عام سے نوجوان ہیں، لیکن نجانے کیوں آپ کے چہرے میں ... بات محسوس ہوتی ہے ہمیں .... ''

'' کیا عرض کر سکتا ہوں؟ '' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مزید تعارف نہ ہوگا ....؟"

"کوئی شخصیت نہیں ہے میری جو قابل تعارف ہو بس یوں سمجھ لیجئے کہ صحرانورد ہوں. نجانے کہاں کہاں گھومتا رہتا ہوں۔ میں اچانک اس بستی کی جانب نکل آیا۔ علم بھی نہیں تھا کہ کون سی بستی ہے پھر آپ نے اذان دے دی ...."

"کہیں نہ کہیں تو رہائش ہوگی آپ کی۔ کوئی نہ کوئی تو مشغلہ ہوگا ....!"

"بس یہی مشغلہ ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں۔" مولوی حمید اللہ صاحب گہری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے چائے کے گھونٹ لیتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "میاں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی جی. کہئے"

"اب اس بستی میں تشریف لائے ہیں آپ تو کچھ وقت ضرور میرے ساتھ اس بستی میں قیام کیجئے، مجھے خوشی ہوگی۔"

"اور مجھے ندامت ...." میں نے کہا۔

"کیوں ....؟"

"اس لئے کہ آپ کو زحمت ہوگی۔"

"اب ان تکلّفات کی گنجائش نہیں ہے۔ مسعود صاحب میری درخواست ہے. جب تک بھی ممکن ہوسکا. آپ یہاں قیام فرمائیے گا۔ دیکھئے یہاں املی کے درخت کے نیچے چارپائی ڈلوادوں گا آپ یہاں آرام سے قیام کریں اور پھر ہمارا کیا جاتا ہے۔ اللہ کی سمت سے رزق حاصل ہوتا ہے اور ہم سب کھاتے ہیں آپ کا اضافہ ہوگا تو یقینی طور پر رزق میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔" میں نے مسکرا کر گردن ہلادی۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے حمید اللہ کے گھر سے پراٹھے اور ترکاری آگئی ساتھ میں چائے بھی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ ناشتہ کیا۔ حمید اللہ صاحب کہنے لگے .... "اور اگر صبح کے اس حصے میں آپ یہاں پہنچے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ رات بھر سفر کیا ہوگا۔ اب مناسب یہ ہے کہ ظہر کے وقت تک آرام فرمائیے گا اگر نیند گہری ہوگئی تو میں نماز کے وقت جگا دوں گا۔"

میں نے قبول کرلیا تھا۔ املی کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ کمبل سرہانے رکھا اور آنکھیں بند کر کے یہ تصور کرنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ذہن میں خیالات بیدار ہونے لگے۔ حکم ملا کہ ابھی یہاں قیام کرنا ہے۔ بڑی حیرانی ہوئی تھی۔ یہ میری اپنی آواز تھی جو میرے کانوں میں گونجی تھی۔ ایسا کون ہے۔ مجھے اپنی ہی آواز خود سے دور محسوس ہوتی ہے۔

"یہ سب کچھ جاننا ضروری نہیں ہے۔ کچھ باتوں کو جاننے کے لئے وقت متعین ہوتا ہے۔ سوجاؤ" مجھے پھر اپنی آواز سنائی دی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب کسی انحراف کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ دوپہر کو مولوی حمید اللہ نے جگایا اور میں اٹھ گیا۔ مولوی صاحب بولے۔

"مسعود میاں۔ ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ خوب سوئے اب جاگ جائیے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ساڑھے بارہ بج گئے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ غسل کریں گے ....؟"

"زحمت نہ ہو تو۔"

"نہیں۔ گرم حمام موجود ہے۔ زحمت کیسی۔ یہ اور بتادیں کہ کھانا نماز کے بعد کھائیں گے یا پہلے۔"

"بعد میں مناسب رہے گا ورنہ جو حکم ہو۔"

"میں خود بھی نماز کے بعد کھاتا ہوں۔ آئیے حمام بتادوں۔"

غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلا۔ مسجد کے دروازے کے باہر سے کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے توجہ نہیں کیا۔ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد مولوی حمید اللہ صاحب مسکراتے ہوئے آگئے۔

"ہوگئے نیند پوری ہوگئی۔"

"جی۔ کا احسان ہے۔"

"کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"

"ہاں فرمائیے۔"

"یہ سرکٹے کا کیا قصہ ہے۔"

"خیریت۔ کیا ہوگیا ....؟"

"صبح دس بجے سے لوگوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔"

"کیوں ....؟"

"آپ کو علم نہیں ہے۔ کسی سرکٹے کو جلا کر راکھ کر دیا آپ نے۔"

"اوہ .... وہ .... جی ہاں۔ بس وہ اللہ کے کلام سے ٹکرانے آگیا تھا۔ ویسے بھی خلق اللہ سے کھیل رہا تھا۔"

"میں ایک جاہل دیہاتی ہوں مسعود احمد صاحب۔ میرا کوئی امتحان نہ لے ڈالئے گا۔ اللہ کے واسطے۔"

"کیا گستاخی ہوگئی محترم ....؟" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"شرمندہ نہ کریں مسعود احمد صاحب. اپنے بارے میں عرض کر رہا ہوں مجھ سے گستاخی ہوجائے تو معاف فرمائیے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بزرگ ہیں اور پھر آپ نے بڑی خاطر داری کی ہے میری۔ مجھے بتائیے ...."

"ہاں۔ خبیث روح تھی۔ لال تالاب پر کوئی بیس سال سے قبضہ جمار کھا تھا۔ ذات کا دھوبی تھا اور کمینہ انسان تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ ماں اس واقعے سے کنوئیں میں کود کر مرگئی۔ بستی والوں نے بستی سے نکال دیا تو تالاب کے پاس جا کر رہنے لگا۔ پھر سانپ نے ڈس لیا اور کوئی بارہ پندرہ دن کے بعد اس کی سڑی ہوئی تعفن زدہ لاش کا پتہ چلا۔ کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور وہ وہیں مٹی ہوگئی۔ مگر پھر راتوں کو اور دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں اسے تالاب کے کنارے چھورام چھورام کرتے دیکھا جانے لگا۔ ادھر سے گزرنے والے بے شمار افراد کو اپنی شکار بنایا۔ کافی خوف و ہراس چھایا رہتا ہے اس کی وجہ سے مجبوری یہ ہے کہ بستی سے باہر کا راستہ یہی ہے۔ دھونی پور کے لوگ اس سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں۔ دوپہر کو بارہ بجے سے تین بجے تک کوئی ادھر سے گزرتا اور شام کو سورج چھپنے کے بعد سے صبح سورج نکلے ادھر سے سفر نہیں کیا

جاتا۔ کوئی بھولا بھٹکا گزر گیا تو بس اس کا شکار ہو گیا۔ ‘‘

’’خدا کا شکر ہے۔ موذی سے نجات ملی۔ ‘‘ میں نے کہا۔

’’لوگ صبح سے آ رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ‘‘

’’اوہ .... یہ ایک تکلیف دہ پہلو ہے۔ ‘‘

’’ٹالتا رہا ہوں کہ آپ سو رہے ہیں۔ مگر ملنا پڑ جائے گا آپ کو .... بڑی عقیدت سے آئے ہیں۔ کچھ مقامی لوگ آپ کے ساتھ تھے انہوں نے پورا واقعہ بتایا بستی والوں کو۔ یوں سمجھ لیں پوری بستی میں کاروبار بند ہے لوگ جوق در جوق لال تالاب جا رہے ہیں۔ وہاں اس کے زمین میں زندہ ہو جانے کا نشان موجود ہے ....! ‘‘

’’اللہ کا یہی حکم تھا اس کے لئے. مگر اب میں کیا کروں ....؟ ‘‘ میں نے پریشانی سے کہا۔

’’بس ایک بار مل لیں ان سے۔ ویسے بھی کسی کا دل رکھنا عبادت ہے۔ ‘‘

’’چلئے ....! ‘‘

’’ابھی مناسب نہ ہو گا۔ میں اعلان کئے دیتا ہوں کہ نماز کے بعد آپ باہر آئیں گے۔ ‘‘

’’نہیں۔ اس میں رعونت کا پہلو جھلکتا ہے۔ آیئے ان سے ملاقات کر لیں۔ ‘‘

’’سبحان اللہ آیئے۔ ‘‘ حمید اللہ صاحب بولے اور میں انکے ساتھ باہر نکل آیا بیس بائیس افراد تھے زیادہ تر ہندو تھے چند مسلمان۔ مولوی حمید اللہ نے کہا۔ ’’لیجئے ٹھاکر جیون کمار جی مل لیجئے مسعود میاں سے۔

’’ہیں .... یہ ہیں وہ مہان پرش۔ چرن چھوئیں گے ہم ان کے۔ ‘‘ ٹھاکر صاحب نے کہا اور آگے بڑھے۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

’’آپ مجھ سے ہاتھ ملائیں ٹھاکر صاحب میرے گلے لگیں۔ میں اتنا بڑا انسان نہیں ہوں کہ آپ میرے پاؤں چھوئیں۔ ‘‘

’’آپ نے جتنا بڑا کام کیا ہے میاں جی وہ تو ایسا ہے کہ ہم آپ کو سر پر بٹھائیں۔ دھونی بستی کو نیا جیون دیا ہے آپ نے۔ ‘‘

’’اس کے لئے آپ اپنے بھگوان کا اور مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں۔ میں تو بس ایک ذریعہ بنا ہوں مجھے تو اس خبیث کا علم بھی نہیں تھا۔ آپ کی بستی کے چار نوجوان مجھے اس کے سامنے لے آئے۔ ‘‘

’’وہ پھر تو نہ جی جائے گا مہاراج۔ ‘‘

’’انشاء اللہ اب ایسا نہ ہو گا ....! ‘‘

’’ہم بستی والے آپ کی کیا سیوا کریں مہاراج۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ‘‘

’’مجھے صرف آپ کی دعائیں درکار ہیں۔ ‘‘

’’آپ ابھی جائیں گے تو نہیں مہاراج۔ ‘‘

’’نہیں۔ مولوی حمید اللہ صاحب کے حکم کے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا ......

’’ہم آپ کے چرنوں میں کچھ بھینٹ کریں گے۔ ‘‘

’’مجھے آپ کی دعاؤں کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ ‘‘

’’ہم آپ سے پھر مل سکتے ہیں مہاراج ....؟ ‘‘

’’جہاں حکم دیں گے حاضری دوں گا! ‘‘

’’نماز کا وقت ہونے والا ہے ٹھاکر صاحب! اب اجازت دیجئے ....! ‘‘ حمید اللہ صاحب نے کہا سب مجھے سلام کر کے واپس چلے گئے۔ نماز پڑھی۔ کھانا کھایا اور اس کے بعد حمید اللہ صاحب املی کی چھاؤں میں میرے پاس آ بیٹھے ....

’’چراغ تلے اندھیرا ہے مسعود احمد صاحب۔ میں نے خود تو آپ کو خراج عقیدت پیش ہی نہیں کیا۔ اپنے بارے میں مختصر بتا دوں۔ اسی بستی میں پیدا ہوا۔ یہیں پروان چڑھا والد صاحب کا منصب سنبھالا دو جوان بیٹیوں کا باپ ہوں اہلیہ ہیں اور میں ہوں۔ بس اللہ کا نام جانتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں ....! ‘‘

’’اس سے زیادہ کچھ ہے بھی نہیں حمید اللہ صاحب۔ اللہ آپ کی مشکلات دور کرے۔ ‘‘

یہاں آکر خوشی ہوئی تھی جھگیوں کی بستی تھی۔ لوگوں نے بڑا احترام کیا تھا جوق در جوق ملنے آتے رہے تھے بہت کچھ چاہتے تھے مجھ سے۔ میں خود شرمندہ ہو گیا تھا۔ نماز وغیرہ سے فراغت کر کے رات کا کھانا کھایا بہت دیر تک لوگوں کے درمیان بیٹھا رہا۔ پھر زیادہ رات ہوئی تو آرام کرنے لیٹ گیا۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا .... پھر غنودگی طاری ہو گئی۔ دفعتہً ہی کچھ آہٹیں ابھریں اور آنکھیں کھل گئیں۔ نظر سامنے اٹھ گئی۔ احاطے کی دیوار پر دو پاؤں لٹکے ہوئے تھے۔ صرف دو پاؤں جو عجیب سے انداز میں جنبش کر رہے تھے باقی جسم کا وجود نہیں تھا۔

آنکھیں پوری طرح کھل گئیں .... پھر کوئی آ گیا .... پھر کچھ کرنا ہے .... غور سے دیکھنے لگا پھر کچھ تصور بدلا خالی پاؤں نہیں تھے۔ باقی بدن بھی تھا جس جگہ سے احاطے کی دیوار نظر آ رہی تھی، وہاں املی کے درخت کی گھنی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور جو کوئی دیوار پر تھا اس کا باقی جسم پتوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا یہ اس وقت پتہ چلا جب وہ نیچے کودا شاید کمزور بدن کا مالک تھا چونکہ زیادہ بلندی نہ ہونے کے باوجود وہ نیچے گر پڑا تھا میں خاموش لیٹا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر میری طرف بڑھنے لگا اور پھر میرے قریب آ گیا۔ آنکھوں میں جھری کر کے میں اسے دیکھنے لگا دھوتی کرتا پہنے ہوئے ایک سفید بالوں والا شخص تھا مونچھیں بڑی اور سفید تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کون ہے وہ میرے پلنگ کے پاس کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا اور اسکی آواز ابھری۔

’’مہاراج .... جاگیئے مہاراج .... سوالی آیا ہے اور آپ سو رہے ہیں جاگیئے مہاراج۔ ‘‘

اب اٹھنا ضروری تھا میں اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور زمین پر بیٹھ گیا تب میں جلدی سے اپنی جگہ سے اترا اور میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’ارے .... ارے .... یہ کیا کر رہے ہیں آپ یہاں بیٹھئے مجھے گناہگار کر رہے ہیں۔ ‘‘

’’بھگوان سکھی رکھے جسے بھگوان عزت دیتا ہے وہی دوسروں کو عزت دیتا ہے مگر میں آپ کے چرنوں میں بیٹھنا چاہتا ہوں. سوالی ہوں. مجبور ہوں. دکھی ہوں. آپ کے سائے میں سر جھکا کر آپ سے مدد مانگنے آیا ہوں۔ ‘‘

’’آپ آرام سے یہاں بیٹھیں اور مجھے بتائیں کیا بات ہے۔ ‘‘ میں نے اسے اٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

’’اتا کا مارا ہوا ہوں مہاراج .... پردوش اکیلے میرا نہیں ہے پرکھے ہی سکھا کر گئے تھے وہ تو ایک میر بنا کر چلے گئے نقصان مجھے ہوا اور اب سچ بولوں گا تو لوگ مذاق اڑائیں گے میرا کون سچ مانے گا سب

یہی کہیں گے کہ ٹھاکر پر بپتا پڑی تو سیدھا ہو گیا ہے بھگوان .... میرا کوئی ہمدرد نہیں رہا مہاراج .... اسی لئے مہاراج رات کی تاریکی میں آیا ہوں آپ کو دکھ دیا معاف کر دیں۔" اس نے آنسوؤں میں گندھی ہوئی تھی۔

"تمہارا معاملہ قدرت کے ہاتھ ہے خدا کا یہ گناہگار بندہ اگر تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہے تو اس سے گریز نہیں کرے گا۔"

"بپتا سنو گے میری؟" وہ بولا۔

"ضرور سنوں گا۔" میں نے کہا۔

"بنسی راج بہادر ہے میرا نام .... کھرا برہمن ہوں بیس باغ کا مالک ہوں اور ہزاروں بیگھے زمین چھوڑی ہے پرکھوں نے ساتھ میں یہ نصیحت بھی کہ اپنے علاوہ سب کو نیچ سمجھو دولت سنسار کی سب سے بڑی بڑائی ہے۔"

"کیسا پایا اس نصیحت کو۔"

"مار دیا سسروں نے مجھے یہ سوچ دیکر .... سنسار میں سب سے نیچا کر دیا مجھے۔"

"اب کیا ہوا۔"

"ایک بے بس اپرادھی .... جو کسی مدد کرنے والے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا ہے بیس باغ اور ہزاروں بیگھے زمین اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔"

اس کی سسکیاں جاری ہو گئیں میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے دھرم کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہتا لیکن میرا دین کہتا ہے کہ اگر کسی نے گناہ کیا ہے تو اس کی سزا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اگر تم کسی کے کام آ سکتے ہو تو اس سے گریز نہ کرو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارا معاملہ تمہارے اور خدا کے درمیان ہے۔ میری ذات سے اگر تمہیں کوئی فائدہ ہو سکتا ہے تو میں ضرور تمہارے لئے جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا کروں گا اب وقت ضائع نہ کرو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتانا چاہتے ہو بتا دو۔"

"تھوڑا بہت تو بتا چکا ہوں مہاراج اس سوچ نے مجھے سنسار سے دور کر دیا تھا ہر ایک کو نیچ سمجھنا میرا کام بن گیا تھا کسی کو اپنے خلاف پایا پکڑوا دیا جوتے لگوا دیئے، کسی نے زیادہ سرکشی کی تو ہاتھ پاؤں تڑوا دیئے بڑے بڑے عزت داروں کی عزت اچھال دی میں نے پانچ بیٹے تھے میرے دو بیٹیاں اور یہ سب کی نگاہوں میں دھونی پور کے سب سے اونچے لوگ تھے کیونکہ میری اولادوں میں سے تھے ایک بہن بھی ہے میری ہرناوتی نام ہے اس کا۔ میری بیٹیوں سے دو چار سال ہی بڑی تھی کہانی لمبی نہیں سناؤں گا مہاراج ہرناوتی بہک گئی جوانی کے جوش میں اس نے پرکھوں کے ریت رواج بھلا دیئے اور ایک نیچ ذات سے پیار کر بیٹھی ہریا تھا اس کا نام لاکھو کا بیٹا تھا۔ دھونی پور کے ایک مشرقی گوشے میں گھر بنا کر رہتا تھا نوکر تھا مہاراج ہماری زمینوں پر کام کرتا تھا باپ بیٹے ہمارا دیا کھاتے تھے پھر بھلا ٹھاکر بنسی راج بہادر یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ہیرا پوری آنکھیں کھول کر ہرناوتی کو دیکھے پر ایسا ہوا نجانے کب اور کہاں سے ملے وہ لوگ ہرناوتی، ہریا کے پریم میں گرفتار ہو گئی اور چھپ چھپ کر اس سے ملنے لگی بستی والوں نے دیکھا کسی کی مجال تو نہیں تھی کہ کوئی ہم سے آ کر یہ بات کہہ سکے۔ لیکن آپس میں کانا پھونسیاں کرتے تھے۔

ہمیں اس سمے تک کچھ معلوم نہیں تھا ہرناوتی کی یہ حرکتیں دیکھ لی گئیں۔ میری دھرم پتنی نے ایک رات ہرناوتی کو گھر سے چوری چوری نکلتے ہوئے دیکھا تو چونک گئی دن بھر اور رات بھر سوچتی رہی اور مجھے بتا دیا میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ مہاراج دوسری رات میں نے ہرناوتی کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ چاندنی رات میں میرے ہی باغ کے ایک گوشے میں وہ لاکھو کے بیٹے ہیرا کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے دونوں باتیں کر رہے ہیں اور سنسار سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ خون اتر آیا تھا میری آنکھوں میں سوچتا رہا کہ کیا کروں اور جب برداشت نہ کر سکا تو ان کے سامنے پہنچ گیا میں نے ان کے پاس پہنچ کر کڑکدار آواز میں دونوں کو مخاطب کیا تو وہ دونوں تھر تھر کانپنے لگے۔ ہیرا میرے قدموں میں گر گیا اور میں نے زوردار ٹھوکر مار کر اس کا سر پھوڑ دیا وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا لیکن میری بہن ہرناوتی نے اپنی ساڑھی کا پلو پھاڑ کر میرے ہی سامنے اس کے ماتھے پر پٹی کسی اور پھر آنکھیں نکال کر مجھ پر کھڑی ہو گئی اس نے کہا کہ مجھے یہ حق کس نے دیا ہے کہ میں اس کے پتی کو اس طرح ٹھوکر ماروں اس بات پر میں جو کچھ نہ کر ڈالتا کم تھا لیکن عقل سے کام لیا خون میرا ہی تھا ہرناوتی کی یہ مجال کبھی نہ ہوئی تھی کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی بھی ہو جائے لیکن اس سمے وہ جس طرح بات کر رہی تھی، وہ چونکا دینے والی بات تھی میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تیرا پتی کہاں سے ہو گیا ری کمینی۔؟"

"تم اسے پاپ کہہ سکتے ہو بھیا جی مگر اب یہ پاپ میں کر چکی ہوں۔"

"کب کیسے ....؟"

"ہیرا سے میں بہت پہلے سے پریم کرتی ہوں ہم دونوں کا پریم پوتر تھا اور جب میں نے ہیرا کو مجبور کیا کہ وہ میرے ساتھ پھیرے کر لے تو میرے مجبور کرنے سے ہیرا بھی مجبور ہو گیا اور اس نے رام مندر میں جا کر پجاری شو نارائن کے سامنے اگنی کے گرد میرے ساتھ پھیرے کر لئے اور میں اس کی پتنی بن گئی۔ ہم جانتے تھے مہاراج کہ آپ کو پتہ چلے گا تو آپ کا من سلگ اٹھے گا اس لئے چھپ کر یہاں ملتے ہیں اور اس سمے کا انتظار کر رہے ہیں جب آپ ہم دونوں کو ساتھ رہنے کی آگیا دیدیں گے۔"

"تو سچ کہہ رہی ہے ....؟"

"بھیا جی کی سوگند بالکل سچ ....۔"

"ٹھیک ہے گھر جا کر بات کروں گا میں تجھ سے پھر۔" میں نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ بہن کو بیٹی ہی کی طرح پالا تھا میں نے .... ماتا پتا جی تو پہلے ہی مر چکے تھے محبت بھی تھی مجھے اس سے لیکن اپنی انا، اپنا مان سب سے پیارا تھا۔ یہ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا کہ کل کا دن اگر بستی والوں کو یہ بات پتہ چلے تو میری کیا عزت رہ جائے گی کوئی کام تو کرنا تھا ایسا جس سے یہ بات راز میں رہ جائے چاہے اس کے لئے مجھے کتنی ہی انسانی زندگیوں کی قربانی دینی پڑے۔ بہرحال میں نے اپنے ایک خاص آدمی امرناتھ کو بلا کر اسے یہ کہانی سنائی تو امرناتھ گردن جھکا کر بولا کہ مہاراج مجھے تو یہ بات پہلے سے معلوم تھی بڑا غصہ آیا مجھے امرناتھ پر اور میں نے غرا کر اس سے کہا۔ "کمینے، نمک حرام، اگر تجھے یہ بات معلوم تھی تو مجھ سے کیوں نہ کہا تو نے؟"

"ہمت نہیں پڑی تھی مہاراج، ہمت نہیں پڑی تھی۔"

"اب یہ بتا کہ کیا کیا جائے۔"

"مہاراج سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہرناوتی جی ہی سب کے سامنے یہ سب کہنے کو تیار ہیں۔ نے پہلے کبھی غور نہیں کیا مگر میں دیکھ چکا ہوں کہ وہ اس شادی کو چھپانا نہیں چاہتی اور بڑی ہمت سے سنسار کے سامنے آنے کو تیار ہیں۔"

"نکال دوں گا اسے گھر سے باہر۔ ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج کر دوں گا۔"

"اگر آپ یہ بات ہرناوتی جی سے کہیں گے تو وہ آپ کے چرن چھوئیں گی اور خوشی خوشی گھر سے چلی جائیں گی محبت کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں مہاراج آپ کو اس سے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔"

"تو پھر میں کیا کروں امرناتھ مجھے بتا میں کیا کروں؟"۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا مہاراج آپ مجھ سے کہیں بڑا دماغ رکھتے ہیں۔"

"سب نے میرے ساتھ غداری کی ہے ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں اور وہ پجاری شونارائن اس نے پھیرے کرا دیئے میری بہن کے ایک نیچ ذات کے ساتھ جیتا رہ سکے گا وہ پہلے اسی کی زبان بند کروں گا امرناتھ پہلے میں اسی کی زبان بند کر دوں گا۔ جیتا نہیں چھوڑوں گا اسے۔"

"مندر کا معاملہ ذرا دوسرا ہوتا ہے مہاراج ویسے بھی آپ یہ بات جانتے ہیں کہ دولت مندوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا دھونی پور کے لوگ آپ سے زیادہ خوش نہیں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے اس قدم سے وہ آپ کو نقصان پہنچانے پر تل جائیں۔"

"ایک ایک کو مروا دوں گا ایک ایک کو ختم کرا دوں گا۔" میں نے غرا کر کہا۔

"نہیں مہاراج دھونی پور کے ساروں کو آپ نہیں مار سکتے۔ آپ کو کچھ اور ہی سوچنا ہوگا۔" امرناتھ کی بات سمجھ میں آنے والی تھی میں سوچتا رہا پھر میں نے کچھ فیصلے کر لئے میں نے کہا۔ "تو یہ کام خاموشی ہی سے کرنا ہوگا امرناتھ اور تجھے میرا ساتھ دینا پڑے گا اتنی دولت دوں گا کہ جاگیردار بن کر جیون بسر کرے گا میری عزت بچانا اس وقت تیرا بھی کام ہے۔"

"امرناتھ اپنی جان دینے کو بھی تیار ہے مہاراج منہ سے بول کر دیکھیں۔" تب میں نے امرناتھ سے مل کر ایک ایسا منصوبہ بنایا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہی کیا میں نے بادلوں بھری ایک رات ہم گھر سے باہر نکلے امرناتھ کو میں نے جو ہدایات دی تھیں وہ ان پر عمل کر رہا تھا اس بیچ میں نے ہرناوتی سے کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ جب دوسری رات وہ چوری چوری گھر سے باہر نکلی تب بھی میں نے اسے نہ روکا۔ حالانکہ میں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ اس پاپی اچھوت کے ساتھ وقت گزارتی رہی مگر میں اپنا کام آگے بڑھانے کا پورا پورا منصوبہ بنا چکا تھا میں اور امرناتھ رام مندر پہنچے۔ پجاری شونارائن جی کو اٹھایا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات سچ ہے پجاری جی سچے آدمی تھے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ دو پریم کرنے والے ایک ہونا چاہتے تھے انہوں نے سنسار کی ریت کے مطابق وہ سب کچھ کر دیا جو انہیں ایک کر دیتا تب میں نے زہر کی شیشی شونارائن جی کو دیتے ہوئے کہا۔

"اور آپ نے جو کچھ کیا شونارائن جی اس کے نتیجے میں آپ کو یہ موت قبول کرنا ہوگی۔" شونارائن مسکراتے ہوئے بولے۔

"موت اور جیون بھگوان کی لین دین ہے اگر اس زہر سے میری موت لکھی ہے تو مجھے یہ ہر حالت

پینا پڑے گا اور اگر ابھی کچھ جیون باقی ہے تو یہ زہر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" سو میں نے دیکھا کہ شونارائن جی زہر کی پوری شیشی حلق میں انڈیل گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے ہم نے پہلے سے سارا بندوبست کر رکھا تھا زہر نکلے ہوئے ایک سانپ کی دم مروڑ کر اسے شونارائن جی کے پاؤں سے چپکا دیا اور سانپ کے دانت شونارائن جی کے پاؤں میں گڑھ گئے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ پنڈت شونارائن مہاراج سانپ کے ڈسے سے مرے۔ اس طرح ہم نے ہرناوتی اور ہیرا کی شادی کے اس سب سے بڑے گواہ کو ختم کر دیا لیکن بات یہیں تک محدود نہیں رہنی تھی دوسرا انتظام بھی کرنا تھا شونارائن جی کی موت پر کسی نے کوئی شبہ نہیں کیا ہرناوتی چھ راتیں ہیرا سے ملتی رہی مگر ساتویں رات ہیرا کے جیون میں کبھی نہیں آئی۔ منصوبے کے مطابق ہرناوتی کو دوسرے گاؤں بھیجا گیا اور وہ سب کے ساتھ خوشی خوشی گئی تھی مگر میں اور امرناتھ آٹھ آدمیوں کے ساتھ تیار تھے ہم لوگ رات کی تاریکی میں لاکھو کے گھر پہنچے دروازہ بجایا تو لاکھو نے دروازہ کھول دیا میرے آدمیوں میں سے ایک نے اس کے سر پر لاٹھی ماری اور لاکھو "ہائے" کہہ کر ڈھیر ہو گیا تب ہیرا باہر نکلا اور ہم نے اسے بھی لاٹھیوں پر رکھ لیا پھر گھر کی تین عورتوں، باپ، بیٹے اور ایک بچے کو ہم نے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں ڈال دیا اور اس کے بعد پورے گھر پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی تھی اتنی تیز آگ لگائی تھی ہم نے اور اتنا تیل ڈالا تھا کہ کوئی ان کی مدد نہ کر پائے بیس گھر جلے تھے اس آگ سے اور ہیرا اور لاکھو اپنے مزید پانچ گھر والوں کے ساتھ جل کر بھسم ہو گئے تھے اس گھر میں تب میرے دل کو سکون ملا ہرناوتی واپس آ گئی بستی والے کبھی یہ نہ جان سکے کہ آگ کیسے لگی بس انہوں نے کوئلہ ہوئی لاشیں نکالی تھیں اور ان کا کریا کرم کر ڈالا تھا مگر ہرناوتی مجھے شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی اور پھر ایک رات وہ میرے پاس پہنچ ہی گئی میں اس وقت اپنے کسی کام میں مصروف تھا۔ ہرناوتی کا چہرہ دیکھ کر میں چونک پڑا اور میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا کیسے آنا ہوا تو اس نے پراسرار لہجے میں کہا۔ "میرا سہاگ کیسے بھسم ہوا مہاراج؟"

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے غصے سے کہا۔

"مگر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔"

"کیا معلوم ہو گیا ہے۔"

"میرے سسر لاکھو کے گھر میں آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی۔"

"لگائی گئی تھی، کس نے لگائی؟"

"امرناتھ، بھیل چند، شکتی لعل، پرسی رام، رگھو، شنکر، راجن اور سونا آگ لگانے والے تھے اور آپ آگ لگوانے والے۔"

"کیا بک رہی ہے۔" میں غصے سے دھاڑا۔ مگر میرے بدن میں سردی دوڑ گئی تھی سارے نام سچے تھے کسی نے مخبری کر دی نہ جانے کس نے زبان کھول دی۔ ہرناوتی حیرت انگیز طور پر پرسکون تھی اس نے کہا "شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا بھیا جی۔ آخر آپ میرے بھیا ہیں ہم نے ایک ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے مگر آپ نے جو انیائے کیا، وہ اچھا نہیں تھا سارے کنبے کو مروا دیا بچے کو بھی نہ چھوڑا۔ دوش تو ہیرا کا تھا مہاراج سب کا تو نہیں تھا۔ آپ کو رحم نہ آیا ان پر زندہ جلوا دیا آپ نے انہیں آگ میں۔"

"ہرناوتی، جو کچھ میں نے تیرے ساتھ آج تک کیا ہے اس کا یہ بدلہ دے رہی ہے مجھے الزام لگا رہی

ہے میرے اوپر ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو جا تھانے چلی جا میرے خلاف رپٹ درج کرا دے۔ گرفتار کرا دے مجھے ان سب کے قتل کے الزام میں۔ " ہرناوتی عجیب سے انداز میں ہنسی پھر بولی۔

"کہا تھا میں نے ہیرا سے بھیا جی کہا تھا مگر اس نے کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بنسی مہاراج بڑے اختیار والے ہیں پولیس کو اپنے جال میں پھانس لیں گے مال و دولت دیدیں گے اسے اور بات ختم ہو جائے گی لیکن اب اپنا کام ہیرا خود ہی نبٹائے گا بنسی راج مہاراج۔ "

"کک .... کیا بک رہی ہے تو .... تو .... تو کہتی ہے اور .... اور وہ ہیرا .... ہیرا۔ " بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی ہرناوتی نے آہستہ سے کہا۔

• " آیا تھا ہیرا میرے پاس بھیا پہلے مجھ سے اس نے اپنی ساری بپتا سنائی اور اس کے بعد کہنے لگا کہ اگر اکیلا مار دیا جاتا اسے تو یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ چلو ہرناوتی کے بھیا نے مارا ہے مگر سارے مار دیئے پتا جی کو بھی مار دیا۔ کہہ رہا تھا کہ سب نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بدلہ وہ خود لیں گے تم سے سمجھے بنسی راج مہاراج، میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی ہیرا تو کہہ رہا تھا کہ کیا فائدہ یہ سب کچھ کہنے سے جب بدلہ شروع ہوگا تو بنسی راج مہاراج خود ہی دیکھ لیں گے کہنے سننے سے کوئی فائدہ نہیں ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ " میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہرناوتی کو دیکھتا رہا شاید پاگل ہو گئی تھی وہ ہمدرد نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی واپس چل پڑی۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "کہاں جا رہی ہے تو .... ؟ "

"اب کہاں جاؤں گی بھیا جی، میرا سسرال تو ختم ہو گیا۔ " اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے حیا، بے شرم، نیچ ذات تھے وہ .... اس گھر کو اپنا سسرال کہتے تجھے شرم نہیں آتی؟ "۔ جواب میں اس نے مجھے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی مگر مجھے کچھ کرنا تھا اگر اس نے کسی اور کے سامنے زبان کھول دی تو میرے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں چنانچہ میں نے اسے دوسرے ہی دن ایک الگ تھلگ جگہ رکھ دیا، میری حویلی پرکھوں کی بنائی ہوئی ہے دو حصے ہیں اس کے ایک حصہ ویران پڑا رہتا ہے میں نے اسی ویران حصے کو صاف ستھرا کرایا اور اسے وہاں پہنچا دیا میری پتنی پہلے تو حیران ہوئی بعد میں مجھے اسے اپنا راز دار بنانا پڑا، امرناتھ وغیرہ سے میں نے ہرناوتی کی کہی ہوئی باتوں کی پوری تفصیل نہیں بتائی تھی کہ کہیں وہ ڈر نہ جائے لیکن ہرناوتی کی قید کی نگرانی کرنے کے لئے اسی کو منتخب کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ہرناوتی کو اس بات کا شبہ ہو گیا ہے کہ لاکھو کے گھرانے کو مارا گیا ہے امرناتھ میرا وفادار آدمی تھا آنکھیں بند کر کے اپنے کام میں لگ گیا مگر میری نیندیں حرام ہو گئی تھیں مہاراج میں یہ سوچتا تھا کہ ہرناوتی ہیرا کا نام کیسے لیتی ہے وہ یہ بات کیسے کہہ رہی تھی کہ ہیرا نے اسے یہ تفصیل بتائی تھی ویسے تو میں نہ مانتا مگر اس نے ان تمام لوگوں کے نام بالکل ٹھیک ٹھیک لئے تھے جو لاکھو کے گھر آگ لگانے گئے تھے پھر ایک خوفناک واقعہ پیش آیا امرناتھ اور اس کے دو ساتھی جو رات کو وہیں سویا کرتے تھے جہاں ہرناوتی قید تھی، اچانک ہی آدھی رات کو دہشت سے چیختے ہوئے دوڑتے نظر آئے ان تینوں کے جسموں میں آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے اتنے بلند تھے کہ حویلی کے دوسرے ملازموں نے انہیں دیکھ لیا سب اٹھ گئے لوگ کہتے ہیں میں تو اس وقت موجود نہیں تھا، کہ انہوں نے آگ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کے جسموں میں لگی آگ نہ بجھی اور تینوں کے تینوں ایسے جل گئے جیسے کوئلہ جل کر سخت ہو جاتا ہے پتہ ہی نہ چل سکا کہ ان کے جسموں میں آگ کیسے لگی اس واقعہ سے بڑا خوف پھیل گیا تھا میں ضروری کارروائیوں میں مصروف

ہتی والوں کو اس بارے میں بس اتنا ہی پتہ چل سکا تھا کہ کسی طرح تین آدمی جل کر بھسم ہو گئے اصل بات
کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی ہرناوتی سے میں خود ملا تو وہ مطمئن نظر آئی ہنس کر بولی۔
"باقیوں کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونا ہے مہاراج تھوڑا سا انتظار کر لیں اور اس کے بعد آپ کی
...ئے گی۔ "
"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، دشمن ہو گئی ہے تو ہماری۔ "
"نہیں مہاراج میں نے تو ایسا نہیں کیا ہیرا مجھے پہلے ہی بتا گیا تھا کہ ابتداء وہ امرناتھ اور ان دونوں
...ہوں سے کرے گا میرے اوپر پہرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے مہاراج بچا سکتے ہو تو ان کے گھروں کو
...نہیں بچا لینا جنہیں تم نے اس کام کے لئے آمادہ کیا تھا میں کہاں جاؤں گی۔ میرا کونسا ٹھکانہ ہے۔ "
...واقعی پریشان ہو گیا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ امرناتھ میرا مشیر تھا ہر طرح کے
...اری کے مشورے میں اسی سے کرتا تھا وہ نہ رہا تھا مجھے اس کی موت کا بہت افسوس تھا بہرحال
...نیوں کا آغاز تو اسی دن سے ہو گیا تھا مہاراج جس دن سے مجھے یہ پتہ چلا کہ ہرناوتی نے اس نیچ ذات
...ے شادی کر لی ہے اور اب یہ پریشانیاں عروج کو پہنچتی جا رہی تھیں میرے بیٹے عیش و عشرت کی زندگی میں
...پلان چڑھے تھے بڑے بیٹے کی شادی کرنے والا تھا میں مگر کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی پھر ایک
...نا پتہ چلا کہ رگھو اور شنکر جو کھیت پر کام کر رہے تھے، سانپ کے ڈسنے سے مر گئے۔ کسی ایسے ناگ نے
...ا تھا جو بہت زہریلا تھا دونوں کی لاشیں تک نہ اٹھائی جا سکی تھیں بدن کا سارا گوشت، گل کر پانی کی طرح
...ہ گیا تھا اور ہڈیوں کے ڈھانچے کھیتوں میں پڑے نظر آئے تھے جہاں جہاں ان کا پانی بہا تھا، وہاں زمین
...نا کالی ہو گئی تھی کہ جیسے آگ لگا دی گئی ہو اور اس کے بعد مہاراج وہ کھیت پھر سے، سرسبز نہ ہو سکے پھر
...کے بعد دوسرے لوگوں کی باری آئی بیرچند او. شکتی راج بھی مارے گئے، راجن اور سونا تو پہلے ہی
...ناتھ کے ساتھ بھسم ہو گئے تھے بیرچند اور شکتی کہیں سے آ رہے تھے کہ راستے میں ان کی گاڑی ٹکرا گئی
...اس طرح ان کا قیمہ قیمہ ہوا کہ ان کی لاشیں بھی نہ اٹھائی جا سکتی تھیں اب میرے، حواس جواب دینے
...ئے تھے میں بیمار ہو گیا تھا اتنا بیمار کہ بخار اترے نہ اترتا تھا کہ ایک دن میرے وید جی میرے پاس آئے
...شکل کے مالک تھے میرا بیٹا کپور چند انہیں لے کر آیا تھا دواؤں کا بکس ان کے پاس تھا کپور چند نے
...یہ بہت نامی گرامی وید جی ہیں اور بڑا اچھا علاج کرتے ہیں میں آپ کو انہیں دکھانا چاہتا ہوں پتا جی۔
...تیار ہو گیا وید جی نے کہا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے کچھ باتیں کریں گے سب چلے گئے وید جی نے مجھے اپنے
...بکسے دواؤں کی دو پڑیاں نکال کر دیں اور کہا کہ میں انہیں پانی کے ساتھ کھا لوں میں نے ایسا ہی کیا
...ا کھانے کی دیر تھی کہ مجھے اپنے بدن میں بڑی طاقت محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے، میں ٹھیک ہوتا جا رہا
...ہا۔ میں نے عقیدت بھری نگاہوں سے وید جی کو دیکھا تو وہ ہنسنے لگے پھر بولے۔
"اگر ابھی سے مر گئے ٹھاکر بنسی راج تو بعد کے کام کیسے دیکھ سکو گے۔ میرا تمہارے پاس آنا تو بہت
...ی تھا۔ تمہیں ابھی جیتا رہنا ہے مہاراج بہت عرصے تک جیتا رہنا ہے۔ تم نے میرے پریوار کو ختم کیا
...ہمارا پریوار ختم ہوتے ہوئے بھی تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ " اور جب میں نے حیران ہو کر وید جی کے
...ے پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی کہ وہ ہیرا تھا ہیرا جسے میں نے جلا کر بھسم کیا تھا وہ مجھے
...آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"بھگوان کے ہاں کوئی ذات نہیں بنائی جاتی نہ اونچی ذات نہ نیچی ذات اور دل تو بھگوان نے ہی دیا ہے ہم نے تو پھیرے کئے تھے آپ کی بہن سے مہاراج کوئی گناہ نہیں کیا تھا سوئیکار کر لیتے ہمیں تو ہم اور پھر دوشی تو ہم تھے ہمارے پتا جی کو بھی مار دیا تم نے ماتا جی کو بھی مار دیا ہمارے بھتیجے کو بھی مار دیا انیائے کیا تم نے مہاراج ہم تو ہرناوتی کی وجہ سے خاموش ہو جاتے۔ معاف کر دیتے تمہیں مگر دونوں معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں جیتے رہو وہ تو مارے گئے جنہوں نے ہمارا گھر پھونکا تھا اور اب تمہارے پریوار کی باری ہے مہاراج پانچ بیٹے ہیں تمہارے دو بیٹیاں ہیں بیٹیوں کی تو شادی کر دی تم نے ان کا نمبر سب سے بعد میں آئے گا پہلے اپنے ان پانچ ستونوں کو گرتے ہوئے دیکھ لو ہم ایسا کر دیں گے مہاراج کہ تمہارے گھر میں پھر کبھی روشنی نہ آئے ہم تمہاری ساری دیوالیاں بجھا دیں گے ہم سب نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں جینا ہے بیمار رہو گے یہ تمہاری مرضی ہے ذرا صحت مند رہو تا کہ اپنے کئے کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" یہ کہہ کر ہیرا دروازے سے باہر نکل گیا میرے پورے جسم میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں کوئی شبہ نہیں تھا، کوئی دھوکہ نہیں تھا جو کچھ دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جو کچھ سنا تھا اپنے کانوں سے سنا تھا اور دل خون ہو کر رہ گیا تھا اس نے میرے بیٹوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے اپنی اولاد اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی بد حواس ہو گیا تھا میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں میرا بیٹا جو سب سے بڑا تھا میری اس بیماری پر کافی توجہ دے رہا تھا ایک بار اس نے پوچھا کہ میرے من کو کیا روگ لگ گیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی میری دھرم پتنی بھی ضد پر آ گئی تو میں نے ساری کہانی ان لوگوں کو سنا دی میرا بڑا بیٹا ہنسنے لگا پھر بولا۔

"یہ آپ کا وہم ہے مہاراج آپ کے دل میں چور بیٹھ گیا ہے وہ سارے کے سارے جو مرے آپ کو ان کی موت کی وجہ معلوم ہے، حادثے ہی ہوئے تھے ان کے ساتھ۔"

"وہ کیسے حادثے ہوئے تھے ذرا مجھے بھی بتا دو انسانی جسموں میں آگ لگ جائے، ناگ ایسے کاٹیں کہ بدن پانی ہو جائے یہ سارے کھیل کیا تم انسانی کھیل سمجھتے ہو یا صرف حادثہ کہہ سکتے ہو۔" وہ لوگ بھی کچھ متاثر ہو گئے تھے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آ سکی اور پھر مہاراج میرا سب سے بڑا بیٹا آہ .... میرا سب سے بڑا بیٹا ایک صبح جب گھر والوں نے اسے نہ پایا تو اس کے کمرے میں اسے پکارنے گئے نوکر۔ نے اس کی لاش چھت کے کنڈے سے لٹکی ہوئی دیکھی تھی اس کی زبان اور آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں یہ نہیں پتہ چلا کہ کس نے اسے سولی پر لٹکایا ہے زمین سے آٹھ فٹ اونچا لٹک رہا تھا وہ گردن میں رسی ڈلی ہوئی تھی اور رسی کنڈے میں ہوئی بات سمجھ میں نہیں آئی پولیس کو بلا لیا گیا پولیس نے اپنا سارا کام کیا مگر مجھے ہیرا کی بات یاد تھی میرا دماغ اسی طرف جا رہا تھا جو حشر ہو سکتا تھا میرے من کا مہاراج آپ کو پتہ ہے اسی بیٹے کی شادی میں کرنے والا تھا سب کچھ چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا آہ .... مہاراج میں اپنی جیون بھر کی کمائی لٹا بیٹھا تھا اپنے ہاتھوں، ہرناوتی کے پاس پہنچا، ہاتھ جوڑ کر اس کے چرنوں میں جھک گیا اور اس سے میں نے کہا کہ اگر ہیرا اس سے ملتا ہے تو ہیرا سے کہے کہ وہ ہم پر رحم کرے ہرناوتی نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کسی پر رحم کیا ہے مہاراج آج تک، آپ رحم کا نام جانتے ہیں۔؟"

"تو بھی ان کی موسی ہے ہرناوتی تیرے بھی تو کچھ لگتے ہیں وہ۔" میں نے رو کر کہا۔

"کوئی رشتہ نہیں ہے تم سے میرا .... قیدی ہوں میں تمہاری .... میرا تمہارا صید و صیاد کا رشتہ ہے بس۔ تم نے اس کا پورا کٹم مار دیا .... اس نے سوگند کھائی ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کریگا۔"

"ہرے رام ایسا مت کہہ ہرنا .... ایسا مت کہہ بچا لے اپنے بھتیجی بھتیجوں کو .... بچا لے انہیں، خون کا بدلہ خون .... سب مریں گے، سب مریں گے کوئی نہیں بچے گا۔" وہ پاگلوں کی طرح بولی اور پھر ہنسنے لگی، پھر چیخنے لگی، پھر رونے لگی اور اس کے بعد کچھ کہنے کو باقی نہ رہا، کچھ نہیں بگاڑ سکا میں اس کا اس مہینے کے بعد میرا گوونداماردیا گیا وہ بھائیوں میں سب سے تگڑا جوان تھا سب سے خوبصورت تھا دیکھنے والے اسے دیکھتے تھے تو اس کی جوانی پر رشک کرتے تھے مہاراج میرا گوونداراتکو کھا پی کر رام سے سویا آدھی رات کو اس کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا سب کو پکار رہا تھا ہم سب اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے، دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے بند تھا بہت سے نوکروں نے مل کر اسے توڑا تو اندر کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا مہاراج۔ گہرا گاڑھا کالا دھواں جس میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور اب گوونداکی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے جب اس کی چیخیں سنائی دی تھیں تو پوری طاقت سے چیخ رہا تھا وہ بعد میں اس کی آواز مدہم ہوتی چلی گئی تھی دروازے کھڑکیاں سب بند تھے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ دھواں کہاں سے آیا۔ نوکروں نے روشنیاں جلائیں لیکن گہرے گاڑھے کالے دھوئیں کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا دروازے کھڑکیاں کھول دیئے گئے جس طرح بھی ممکن ہو سکا کمرے کا دھواں باہر نکالا گیا اور میں نے، میں نے اپنے گوونداکی لاش زمین پر اکڑی ہوئی پائی اس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا مہاراج یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن دبا کر اسے مار دیا ہو اور پھر ہمیں ایک قہقہہ سنائی دیا بھلا میں اس قہقہے کو نہ پہچانوں گا اسی پاپی کا تھا، اسی پاپی ہیرا کا قہقہہ تھا وہ جیسے اپنی کامیابی سے بڑا خوش ہو مہاراج ہم پر جو بیتی ہمارا من ہی جانتا ہے جو کر بیٹھے تھے وہ تو کر ہی بیٹھے تھے مگر اس کے بعد، اس کے بعد مہاراج جو ہو رہا تھا وہ سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا ایک بار پھر میں ہرناوتی کے پاس گڑگڑاتا ہوا پہنچا مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے وہ بھی پاگل ہو چکی ہے۔ من تو چاہتا ہے کہ سسری کو زندہ جلا دوں آگ میں۔ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا ہے مگر مہاراج ہمت نہیں پڑتی۔ گوونداکے بعد میرا ایک اور بیٹا میرے ہاتھوں میں دم توڑ گیا ایسا پاپی باپ ہوں مہاراج جو مرنا چاہتا ہے مگر موت بھی اسے نظر انداز کر چکی ہے۔ نہیں آتی موت بھی مجھے سمیٹنے، بھگوان کے لئے میری مدد کریں، دو بیٹے اور بیٹیاں ہیں میرے، تین بیٹوں کو صبر کر چکا ہوں بڑا دل پتھر کر لیا ہے میں نے مجھے جیون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے آج مرجاؤں تو سارے پاپ کٹ جائیں گے، مگر جیتے جی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ایک ایک کر کے سارے میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو جائیں۔ کھانا پینا ختم ہو چکا ہے میرا مہاراج۔ جب بہت بھوک لگتی ہے تو تھوڑی بہت کوئی چیز کھا لیتا ہوں چھ چھ دن کے فاقے کئے ہیں میں نے اس خیال سے کہ بھوک اور پیاس سے مرجاؤں مگر موت نہیں آتی میری ہی طرح میری دھرم پتنی کا بھی برا حال ہے حالانکہ وہ تو بے گناہ ہے اس نے کچھ نہیں کیا مگر مجھ سے زیادہ مر رہی ہے میری مدد کر سکتے ہیں تو اللہ کے نام پر میری مدد کریں۔ آپ مسلمان ہیں اور اللہ کے نام پر اگر آپ سے کوئی مدد مانگی جائے تو سنا ہے مسلمان اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں سوال کرنے والوں پر .... میں سوالی ہوں مہاراج آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے میں نے اگر بھگوان نے، اگر اللہ نے آپ کو کچھ دیا ہے تو مجھ پر خرچ کر دیں دعائیں ہی دے سکوں گا اس کے بدلے اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔ مہاراج ساری بستی والے مجھے ناپسند کرتے ہیں اگر آپ حکم دیں مسلمان ساری بستی والوں کے سامنے ان کے چرنوں میں گر جاؤں تو میں اپنی انا توڑنے کے لئے تیار ہوں یہ انا

مجھے ورثے میں ملی تھی مہاراج مگر میرے ورثے نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ "

وہ اس طرح بلک بلک کر رویا کہ میرا دل پانی ہو گیا جو کہانی اس نے سنائی تھی اس میں اس کے
داستان چھپی ہوئی تھی لیکن اب بنسی راج ایک تھکا ہوا انسان تھا ایک ایسا شخص جس سے کوئی
گناہ سمجھے۔ ایسے آدمی کو بھلا میں کیا کہتا، بہت دیر تک وہ روتا رہا۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا
کی بے بسی کی حالت کو محسوس کر رہا تھا اس نے پھر کہا۔

"اگر میں بستی والوں کے سامنے دن کی روشنی میں آپ کے پاس آتا تو جوتے مارتے میرے
باتیں کرتے وہ کہ مجھ سے سہی نہ جاتیں اس لئے مہاراج رات کا یہ سمے چنا ہے آپ کو جو تکلیف ہوئی
مجھے پتہ ہے مگر مجھے جو تکلیف ہے مہاراج ایک ڈوبتا ہوا آدمی ہر اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس
ہاتھ آسکے۔ میں بھی ویسا ہی ہوں۔ آپ کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف میں بھول گیا ہوں مجھے معاف
میری مدد کریں۔ " اس نے دونوں ہاتھ جوڑے، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا چہرہ حسرت
یاس کی تصویر بنا ہوا تھا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "آج کی رات مجھے
راج کل میں تم سے اس بارے میں بات کروں گا میں کسی نہ کسی طرح تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اس وقت
سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن کل میں تمہیں بتا سکوں گا کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں "

"ٹھیک ہے مہاراج دو بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئی ہیں میری، بیٹیاں اپنی سسرالوں میں ہیں ان کے
بھی ہو گئے ہیں جیسا کہ ہیرا کہتا ہے کہ میرے سارے پریوار کو میری آنکھوں کے سامنے ختم کر دے گا
مہاراج بیٹوں کے بعد بیٹیوں کا نمبر آئے گا اور اس کے بعد نواسے نواسیوں کا پتہ نہیں کیا کرے گا وہ کیا اب
مار دے گا مہاراج بڑی امید لے کر جا رہا ہوں بڑی آس لے کر جا رہا ہوں، دھونی پور والے آپ کا نام
لے رہے ہیں میں بھی بڑا سہارا رکھتا ہوں آپ کا مہاراج بڑا سہارا رکھتا ہوں۔ "

"تم جاؤ بنسی راج بس اب جاؤ۔ " میں نے کہا اور بنسی راج اسی راستے سے واپس چلا گیا جس راستے
سے آیا تھا۔ میرے لئے بڑی مشکلات چھوڑ گیا تھا وہ بہر طور مجھے اپنا فرض پورا کرنا تھا میں نے نیند کا خیال
ترک کر دیا پانی تلاش کر کے وضو کیا اور دو زانو بیٹھ گیا میں اپنے لئے رہنمائی چاہتا تھا اور میری رہنمائی ہوئی
میرے دل سے آواز ابھری کہ گناہ کرنے والا گناہ کر بیٹھتا ہے اس کا حساب کتاب اللہ کے حوالے ہے انسان
کو انسان پر رحم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اگر کوئی کسی کے ساتھ کچھ کر سکتا ہے تو اسے اس سے گریز نہیں کرنا
چاہئے بات اگر صرف بنسی راج کی ہوتی تو بنسی راج ہر سزا کا مستحق تھا اور وہ بھی جو اس کے ساتھ شریک تھے لیکن
شریک نہیں تھے جنہیں موت کے گھاٹ اتار گیا اور یہ ایک خبیث روح کا کارنامہ ہے جو بھٹک گئی ہے اور انتقام
کی آگ میں جل رہی ہے اور وہ عورت بھی بے قصور ہے جو ماں ہے باپ نے جرم کیا سزا بس اسی کو ملتی تو مناسب
تھا لیکن ماں اس جرم میں شریک نہیں تھی اور جو غم اس کو ہو رہا ہے وہ جاری نہیں رہنا چاہئے یہ روشنی کی رہنمائی
تھی مجھے اطمینان نصیب ہو گیا اس کا مطلب ہے کہ میں بنسی راج کی مدد کر سکتا ہوں اور اس کے بعد مجھے
کرنے کا طریقہ دریافت کرنا تھا اور میری رہنمائی ہو رہی تھی میں نے اپنے بستر پر بیٹھ کر کمبل اپنے چہرے
ڈھک لیا تھا اور تصورات کی ہوائیں مجھے اڑا کر نجانے کہاں سے کہاں لے گئی تھیں۔

صبح کی نماز کے بعد جب نمازی مسجد سے واپس چلے گئے تو حافظ حمید اللہ صاحب میرے ساتھ بیٹھ کر
ناشتہ کرنے لگے میں نے حمید اللہ صاحب کو بتایا۔

حمید اللہ صاحب رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا ٹھاکر بنسی راج دیوار پھلانگ کر میرے پاس پہنچا اور اس
نے کہانی سنائی شاید آپ کو اس بات کا علم ہو کہ دھونی پور کا ٹھاکر بنسی راج کسی مصیبت میں گرفتار ہے"
"ہاں مصیبت .... کئے کا پھل پا رہا ہے وہ، تین بیٹے ہلاک ہو چکے ہیں اس کے اور بڑی
داستانیں سنائی جا رہی ہیں اس کے سلسلے میں مگر وہ آپ کے پاس مدد کے لئے آیا تھا حیرت کی بات
ہے ویسے کبھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ "

"اس کی انا ٹوٹ چکی ہے اور اب وہ دھونی پور کے ہر شخص کے سامنے ناک رگڑنے پر تیار ہے۔ میرا خیال
ہے حافظ صاحب اس کے باقی بچوں کو زندہ رہنا چاہئے انتقام کا یہ طریقۂ کار مناسب نہیں ہے۔ سزا اگر صرف
اسے ملے جس نے گناہ کیا ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے جو بے گناہ ہوں انہیں کسی اور کے گناہوں کی سزا نہیں ملنی
چاہئے " حافظ حمید اللہ صاحب نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر بولے۔ "اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں
میاں صاحب تو ٹھیک ہے اس سلسلے میں میری جو خدمات ہونگی انہیں سرانجام دینے کیلئے تیار ہوں۔ "
ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی میں نے کہا۔ "بس آپ کی دعائیں درکار ہونگی مجھے اس کے
علاوہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ " حافظ حمید اللہ صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے پھر میں نے ان سے
کہا۔ "ویسے بستی والے بھی بنسی راج سے نفرت کرتے ہونگے، آپ کا کیا خیال ہے؟۔ "

"سب اس سے گھن کھاتے ہیں وہ بڑا سرکش آدمی رہ چکا ہے اور اس کے ہاتھوں ہمیشہ ہر ایک کو
نقصان پہنچا ہے آج بھی اس کے بہت سے کارندے اس کی کنجوسی سے تنگ ہیں کم بخت کچھ بھی نہیں
دیتا کسی کو اور سب کچھ ہڑپ کر لینے کے چکر میں رہتا ہے آپ دیکھ لیں مسعود میاں اگر آپ کا دل گواہی
دیتا ہے تو اس کے لئے کام کریں۔ "

"ہو سکتا ہے حمید اللہ صاحب اس سے بہتوں کی بہتری بھی ہو جائے یعنی انہیں کچھ مل جائے جنہیں
اس کے ہاتھوں سے کچھ نہیں ملتا وہ تو اپنے آپ کو اتنا مجبور و بے کس ظاہر کر رہا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے اب
اسے اپنے دھن دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو بہر حال دیکھے لیتے ہیں اس کی مدد تو کرنا ہی ہوگی، ہاں یہ
بتائیے کہ اس تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟"۔

"میں آپ کو اس کی حویلی تک لے جا سکتا ہوں یہ کونسا مشکل کام ہے۔ "
"نہیں میں ذرا لوگوں سے چھپ کر جانا چاہتا ہوں تاکہ بلا وجہ شہرت نہ ہو پائے اس سلسلے میں اس شہرت
سے بہت سی رکاوٹیں درمیان میں آجائیں گی۔ " میں نے کہا۔

"اس کے لئے تو میرے خیال میں رات کا وقت ہی مناسب ہوگا آج کا دن گزار لیجئے عشاء کے بعد
ویسے بھی رات کے ایک حصے میں دھونی پور کی بستی مکمل پر سکون ہو جاتی ہے اور یہاں راتوں کو
کسی کی آمد و رفت نہیں ہوتی میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔ "

"آپ مجھے وہاں تک کا پتہ بتا دیجئے گا۔ " میں نے حمید اللہ صاحب سے اتفاق کر لیا رات کو حمید
اللہ صاحب نے میرے ساتھ جانا چاہا لیکن میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے تنہا جانے دیں یہ
بات مجبوراً وہ رک گئے البتہ انہوں نے مجھے بڑی وضاحت سے حویلی کا پتہ بتا دیا تھا میں چل پڑا
حمید اللہ صاحب نے سچ کہا تھا پوری بستی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی۔ کتے تک نہیں بھونک رہے تھے اکا دکا
گھروں سے روشنی جھلک رہی تھی ورنہ زیادہ تر گھر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے کبھی کسی گھر سے بچے کے

رونے کی آواز سنائی دے جاتی اور پھر خاموشی پھیل جاتی میں بستی کے ایک کھلے میدان میں نکل آیا جہاں بیچوں بیچ ایک چبوترا نظر آ رہا تھا جس کے عین درمیان میں ایک بڑ کا درخت پھیلا ہوا تھا درخت کے نیچے دیا روشن تھا اور اس کی لرزتی روشنی میں کچھ لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ حمید اللہ صاحب نے اس درخت کے بارے میں بھی بتایا تھا سیدھے چلنا تھا اور میدان کے اختتام سے بائیں ہاتھ مڑ جانا تھا مگر میں نے سوچا بیٹھے ہوئے لوگوں سے اور تصدیق کر لوں۔ چنانچہ ان کی طرف بڑھ گیا قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہ عورتیں تھیں لہنگا اور چولی پہنے ہوئی سوگوار بیٹھی ہوئی تھیں ان سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ایک شخص گھٹنوں سے اونچی دھوتی باندھے اور شلوکا پہنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا درمیانی عورت کی گود میں ایک تقریباً سات سال کا بچہ پڑا ہوا تھا ان کے اس انداز پر مجھے حیرت ہوئی نہ جانے بے چارے کس مصیبت کا شکار تھے۔

"کیا بات ہے بہنو .... یہاں کیسے بیٹھی ہو۔"

"دھیرا ارتھی مانگ رہا ہے میں اسے ارتھی کہاں سے دوں۔" اس عورت نے کہا جو بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔

"کیا مانگ رہا ہے۔" میں کچھ نہ سمجھ کر بولا۔ میں نے جھک کر بچے کو دیکھا اور پھر بری طرح چونک پڑا بچے کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس کا جسم اکڑا ہوا تھا اور کوئلے کی طرح سیاہ ہو رہا تھا اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی چہرے کے نقوش تک جل کر بگڑ چکے تھے۔

"ارتھی .... ارتھی کہاں سے لاؤں ارتھی۔" عورت نے جھنجھنا کر کہا۔ دفعتہً بچے نے گردن اٹھائی اور پھٹی پھٹی آواز میں "ہیں .... ہیں" کر کے رونے لگا پھر بھیانک آواز میں بولا "بپو .... ارتھی .... ارتھی۔" پھر اس کی گردن اپنی جگہ پہنچ گئی اسی وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے شخص نے گردن اٹھا کر کہا۔

"میں بتاتا ہوں میاں جی .... سنو میں بتاؤں بستی کے بیس گھر جل گئے تھے چار ہمارے نانے داروں کے تھے وہ بے چارے اپنی مصیبت میں پڑ گئے کریا کرم کون کرتا ہمارا کتے کی طرح جلے ہوئے شو گھسیٹے اور شمشان ڈال آئے چتائیں تو جیتے جی پھنک گئی تھیں ہماری .... بڑے تو سمجھدار تھے مگر دھیرا بچہ ہے ضد کرتا ہے پگلا کہیں کا .... ! تم جاؤ اپنی گیل کھوٹی مت کرو خود چپ ہو جائے گا سسرا۔" اس نے کہا اور گردن دوبارہ گھٹنوں میں دبالی۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا میں دو قدم آگے بڑھ کر گھٹنوں میں سر دیئے آدمی کے قریب پہنچ گیا۔

"تم لاکھو ہو۔" میں نے پوچھا اور اس نے پھر سر اٹھا لیا اس بار اس کا چہرہ اور بھیانک نظر آنے لگا۔

"ہیں نا تھے۔ میاں جی تھے چھوڑا ایک نہیں اونچی ذات والے نے .... سب رے مار دیئے بھسم کر دیئے کتوں نے کھوپڑیاں پھاڑ دیں ہماری دیکھو یہ دیکھو۔" اس نے سر جھکا دیا اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر وہ اوندھے منہ چبوترے پر گر گیا اس کے بدن سے دھواں اٹھنے لگا فضا میں دہشت ناک چراند پھیل گئی تھی دھوئیں نے ان عورتوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور میں بدبو اور دھوئیں سے گھبرا کر کئی گز پیچھے ہٹ گیا۔ آنکھیں اور ناک بند کر لینے پڑے تھے پھر ناک بند کرنے سے دم گھٹا تو ہاتھ ہٹائے چبوترہ خالی پڑا تھا نہ عورتیں تھیں نہ بچہ نہ لاکھو اور نہ ہی چراغ .... تاریکی میں لپٹا بڑ کا درخت بھیانک سناٹے میں تنہا کھڑا تھا .... ! یہ منظر بہتوں کی جان لے سکتا تھا ہو سکتا ہے یہ خبیث روحیں ....

آئی ہوں۔ ٹھنڈی سانس لے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا میدان عبور کر کے جب بائیں طرف مڑا تو بڑی حویلی نظر آئی یقیناً دھونی بستی کی سب سے بڑی عمارت تھی حویلی کے دروازے پر روشنی نظر آئی لیکن پوری حویلی پر خاموشی طاری تھی میں آگے بڑھ کر حویلی کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔

"ارے بھائی میاں .... کوئی ہے۔" میں نے آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تیسری آواز پر کچھ آہٹیں سنائی دیں اور گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھل گئی سفید موٹے کھیس میں لپٹے ہوئے ایک شخص نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین اونچی کر کے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"کون ہو بھیا تم .... ؟"

"بنسی راج کی حویلی ہے؟"

"تمہاری ہے .... لے جاؤ اٹھا کر .... ارے تو ہو کون۔" چڑچڑے آدمی نے پوچھا۔

"مجھے بنسی راج سے ملنا ہے۔"

"کیوں ملنا ہے؟"

"بلایا ہے انہوں نے مجھے۔"

"آدھی رات کو بلایا ہے جھوٹ بولو ہو۔"

"اگر وہ حویلی میں موجود ہیں تو انہیں خبر دیدو کہ انہوں نے بلایا تھا، وہ آیا ہے۔"

"آؤ"۔ اس نے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا اتنی رات تو نہیں ہوئی ہے کہ یہاں یہ سناٹا قائم ہو جائے مگر ظاہر ہے چھوٹی آبادی ہے اور پھر حویلی کی فضاء میں خوف و ہراس چھایا ہوا ہے سب لوگ اپنے گدڑوں میں گھسے ہوئے ہونگے یہ شخص غالباً چوکیدار تھا اور خود بھی سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اسی لئے بگڑا ہوا تھا بڑے گیٹ سے حویلی کے اصل رہائشی علاقے کا فاصلہ اچھا خاصا تھا چوکیدار میرے آگے آگے چلتا رہا اور سامنے کی سمت سے جانے کی بجائے اس نے بغلی سمت اختیار کی غالباً مختصر راستے سے لے جا رہا تھا میرا اندازہ غلط نکلا اور وہ چند سیڑھیاں چڑھ کر اندر ایک غلام گردش میں داخل ہو گیا نیم تاریک راستے پر وہ آگے بڑھتا رہا اور مڑے آگے بالکل اندھیرا تھا اگر اس کے ہاتھ میں لالٹین نہ ہوتی تو آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا۔

"تم مجھے بنسی راج کے پاس لے جا رہے ہو یا پوری حویلی گھما رہے ہو۔"

"بڑی حویلی تو تم ساری رات میں نہ گھوم سکو گے مہاراج۔" چوکیدار نے عجیب سے لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔

"اور کتنا چلنا ہے؟"۔

"آؤ .... !" اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس نے لالٹین نیچے رکھی اور شاید دروازہ کھولنے لگا پھر دوبارہ لالٹین اٹھا کر بولا۔ "آؤ اندر چل کر بیٹھو .... مہاراج کو خبر کر دوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دروازے کو ٹٹول کر اندر داخل ہو گیا۔ "یہاں روشنی نہیں ہے" میرے منہ سے نکلا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگلا پاؤں خلاء میں لہرایا ایک دم توازن بگڑ گیا سنبھلنے کی کوشش کی لیکن نہ سنبھل سکا اور دوسرے لمحے میرا بدن خلاء میں نیچے جا رہا تھا میں نے بے اختیار دونوں ہاتھ مارے مگر پکڑنے کے لئے کچھ نہیں تھا میں کسی گہرے کنوئیں میں گر رہا تھا۔

چند لمحات کے لئے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئیں، کلیجہ حلق میں آ گیا میں پختہ کار نہیں تھا۔ جو کچھ

گزری تھی ناگہانی تھی اسی میں وہ سب کچھ ہو گیا تھا لوگ کچھ بھی سمجھ لیں لیکن میں ہر چیز سے متاثر
اس وقت بھی شاید اسی احساس کا شکار تھا کہ اتنی گہرائی میں گروں گا تو جسم کا کیا حشر ہو گا۔
ہوئیں مگر آخری لمحات میں جیسے بدن ٹھہر گیا، پاؤں سیدھے ہو گئے اور پیروں کے نیچے زمین
کوئی دباؤ نہیں پڑا تھا، بدن ساکت ہو گیا تھا لیکن گھور تاریکی تھی، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا یہ کیفیت
لمحات رہی پھر آہستہ آہستہ اجالا سا ابھرنے لگا، آس پاس نظر آنے لگا یہ کنواں تو نہیں تھا اچھی
عریض جگہ تھی گھسے ہوئے گول پتھر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے میں بھی ایک بڑے پتھر پر
البتہ اوپر کچھ نہیں نظر آ رہا تھا۔ آسمان کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا
تھا یہ سب .... چوکیدار کون تھا بدن کو جنبش دی، پاؤں آگے بڑھائے اور انہیں پتھروں پر
آگے بڑھا۔ کوئی تیس چالیس قدم نکل آیا اب چاروں طرف مدھم سی روشنی پھیل گئی تھی یہ روشنی
تاروں کی چھاؤں تھی نہ کسی مصنوعی شے سے پیدا ہوئی تھی۔ بس آنکھوں کو نظر آ رہا تھا لیکن آس پاس
بھی نہیں تھا پھر اچانک عقب سے کسی کے پتھروں پر چلنے کی آواز آئی اور میں چونک کر پلٹ پڑا
ایک انسانی جسم تھا لباس سے بے نیاز سیاہی مائل .... میری طرف آ رہا تھا .... میں اسے دیکھ
جب وہ قریب آیا تو دل پر جو ہلکا سا اثر پڑا سب کچھ مکمل تھا مگر چہرے پر کچھ نہیں تھا ناک نہ آنکھ
ہونٹ بس بے خدوخال کا ایک گول سا چہرہ نظر آ رہا تھا مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ رک گیا۔

"کون ہو ....؟" میں نے پوچھا۔

"ماما ہیں توہار .... تے کون رہے؟" آواز آئی۔

"بھانجا ہوں تمہارا۔" میں بے اختیار مسکرا پڑا ویسے یہ آواز اس چوکیدار کی بھی نہیں تھی جس
مجھے فریب دیکر یہاں پہنچایا تھا۔

"ٹھٹھول کرے ہے میاں جی .... ہمکا جانت نا ہے تے .... سارا ٹھٹھول نکال وئی ہے
ہاں .... منتر پڑھویں آئے رہے .... پڑھ منتر .... ہم او دیکھیں تورے منتروا ....!"

"ہیرا ہو تم ....؟" میں نہ پوچھا۔

"بھٹی میں گیا ہیرا .... تے حویلی ماں کا ہے آئے رہے ادھر توہار کام نا ہوئی ہے ....
دیت .... ارے اس پاپی کے لئے گرے ہے تے جس نے ہمارا کا ترسا دئی ہے ....
سب بدلہ لیں گے اس سے ہاں ....؟"

"تم کون ہو .... مجھے بتاؤ؟" میں نے کہا اور چند قدم آگے بڑھا کر اس کے پاس
.... لیکن اچانک ہوا کا ایک جھونکا سا آیا اور میں نے اس کے سیاہ جسم کو بکھر کر زمین پر گرتے
دیکھا۔ گول چکنے پتھروں پر جلے ہوئے کوئلے کی راکھ بکھری نظر آ رہی تھی۔

"تو کا کچھ بتانے کی جرورت نا رہے ہمکا .... تے اپنی سنبھال۔" دوسری طرف سے
.... میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی وہ دوسری طرف اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"حویلی ماں بہت سارے رہیں ہیں۔ تے ادھر اپنا چکر نا ہی چلائی سکت ....!"

"یہ کونسی جگہ ہے؟" میں نے پھر قدم آگے بڑھائے اور ہوا کے ساتھ پھر اس کی راکھ بکھر گئی مگر

آواز تیسری سمت سے سنائی دی تھی۔

"توہار ماما کی سسرال .... تے اب جیتے جی یہاں سے نا نکل سکت ....!"

میرا چہرہ اسی طرح گھوم گیا وہ موجود تھا۔

"تو مار دو مجھے ....!" میں نے کہا۔

"ارے ہم کا ہے ماریں سسر، بھوک پیاس سے کھود ہی مرجئی ہے۔" اس نے کہا۔

"پھر تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

"توہار باپ کی مڑھیار ہے نا .... ہو ہمکا آنے کو منع کرت ہے .... ابھی بڑا سب پتہ چل جئی
.... جب ناگ پھنکاریں گے .... بچھوا ناچیں گے توہار چاروں طرف ....!"

"ہوں .... میں نے تمہیں پہچان لیا سنا تھا تمہارے بارے میں آج دیکھ بھی لیا بتاؤں تم کون ہو ...."

"جا رے .... بنتی ہے .... ہونہہ۔" اس نے حقارت سے کہا۔

"چھلاوے ہو۔" میں نے کہا اور دفعتاً ہی ہوا کا جانا پہچانا جھونکا مجھے محسوس ہوا مگر اس بار اس جگہ
اس کی راکھ نہیں بکھری تھی بلکہ وہ غائب ہو گیا تھا چوتھی بار اس کی آواز کہیں سے نہ سنائی دی۔ یہ خیال
میرے ذہن میں ایسے ہی نہیں آ گیا تھا بہت پرانی بات تھی جب میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا میں
معصوم لیکن سمجھدار تھا اور کہانیوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ کسی بزرگ نے ایک چھلاوے کی کہانی سنائی تھی اور
بتایا تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے وہی کہانی یاد آ گئی تھی اور میں نے اسے چھلاوہ کہا تھا یہ بھی سنا تھا
میں نے اس کہانی میں کہ اگر چھلاوے کو پہچان لیا جائے تو وہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر نظر نہیں آتا اور اس
وقت یہ سب کچھ بالکل سچ ثابت ہوا تھا وہ سو فیصد چھلاوہ ہی تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں کیا کروں
کیا اس کے الفاظ یہ بتاتے تھے کہ حویلی میں باقاعدہ بری ارواح کا بسیرا ہے اور زیادہ تر لوگ بنسی راج کے
ستائے ہوئے ہیں اب یہ تو سوچ نہیں سکتا تھا کہ میں ایک ایسے ظالم آدمی کو نظر انداز کر دوں جس نے بہت
سے لوگوں پر مظالم کئے ہیں اور اب ان کی سزا بھگت رہا ہے کیونکہ مجھے ہدایت مل چکی تھی بعض معاملات میں
سالہا سال بھی کسی کی وجہ سے کسی طرح بچ جاتا ہے۔ اس کے تینوں بیٹوں کی تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا باقی میں نہیں
جانتا تھا کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے میں نے وہاں سے قدم آگے بڑھا دیئے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس جگہ کی وسعت
کتنی ہے پتھروں پر سے گزرتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا اور ایک بار پھر مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں .... ذرا سی
روشنی نظر آئی تھی اور میں نے کنارے سے اس سمت میں دیکھا تھا وہی خاندان موجود تھا جس سے میں بڑ کے
درخت کے نیچے مل چکا تھا لڑکے نے آنکھیں، کھول کر میری طرف دیکھا اور لاکھو سے بولا۔

"بپو .... ارتھی چاہئے، سیندور چاہئے، گھی چاہئے، لکڑیاں جلا دو بپو، بھوک لگ رہی ہے۔"
لاکھو نے ویسے ہی گردن اٹھائی، ادھر اُدھر دیکھا اور پھر جھڑک کر لڑکے سے بولا۔ "ارے چپ کر جا
.... بھوک لگ رہی ہے، ارتھی چاہئے، ارے ہم سب کو نا دیکھ رہا کا، ہمارے پاس کا رہے؟"

"بپو، بھوکا ہوں۔" لڑکا بولا۔

"تو پھر اُدھر دیکھ .... وہ کھڑا ہے اُسے کھا لے اسی کو کھالے میں کا کروں۔" لاکھو نے کہا اور
اس نے بھاڑ سا منہ کھول دیا .... عجیب و غریب منظر تھا یہ بھی بار بار یہ کہنا مجھے خود اچھا نہیں لگ رہا
تھا اس قدر مضبوط ہو گیا تھا کہ ایسے مناظر سے بند نہیں ہو جاتا تھا ورنہ یہ سب کچھ ہوشمندی کی نگاہ

سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

لڑکے کا سر بہت بڑا تھا، بدن سوکھا ہوا تھا اور اتنا سوکھا ہوا تھا کہ یقین نہ آئے، سر اسی مناسبت سے بڑا تھا
نے گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھا اور منہ کھول دیا اتنا بڑا منہ، اتنا بڑا.......... اتنا بڑا کہ اچھی خاصی چیز
کے منہ میں چلی جائے چہرے پر انتہائی خوفناک تاثرات لئے وہ اپنے سوکھے سوکھے قدموں سے چلتا ہوا میری
جانب بڑھا شاید انہیں توقع ہو کہ میرے حلق سے اب دلخراش چیخ بلند ہوگی اور میں پلٹ کر بھاگ نکلوں گا لیکن
میں اسے دیکھتا رہا۔ لڑکا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور میرے قریب پہنچ گیا میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور
"آؤ آؤ آگے آؤ، کھالو مجھے۔" ہوا کا بالکل ویسا ہی جھونکا محسوس ہوا اور لڑکا میری نگاہوں کے
سامنے سے غائب ہوگیا۔ میرے چاروں طرف کچھ بھی نہیں تھا یہ سب دہشت سے مار دینے والے تماشے
ہورہے تھے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن یہ محسوس کررہا تھا کہ یہ سب بے کار سی باتیں ہیں
مجھے جو عمل کرنا ہے اس کے لئے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا اور اب میں جہاں بھی آپھنسا ہوں مجھے یہاں
سے نکل جانا چاہئے ایک ہی ذریعہ تھا میرے پاس حقیقت یہ ہے کہ بڑا اعتماد تھا مجھے اپنے اس ذریعہ پر انسانی
فطرت کے تحت کسی بھی غیر متوقع بات پر ایک لمحے کے لئے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ بے شک دوڑ جاتی تھی
لیکن اس کے بعد وہ اعتماد بحال ہوجاتا تھا جو مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں نے شانے سے کمبل اتارا اور اسے اپنے بدن
لپیٹ کر اپنا چہرہ اس میں چھپالیا اور میرا خیال بالکل درست ثابت ہوا چند لمحات اسی طرح گزرے اس کے بعد میں
نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور منظر بدلا ہوا دیکھا حویلی کے بڑے دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا دروازے کا آدھا
پٹ کھلا ہوا تھا اور وہ پراسرار جگہ جہاں چوکیدار نے مجھے پہنچا دیا تھا نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھی۔

میں اس شان کریمی کے قربان ہونے لگا، مجھے جو اعتماد بخشا گیا تھا وہ ناقابل تسخیر تھا۔ بڑے اعتماد کے
ساتھ قدم آگے بڑھائے اور حویلی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ چھلاوے اور ارواح
خبیثہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوچکی تھیں اور مجھے اس سمت روانہ کردیا گیا تھا جہاں آنا تھا۔

حویلی کی راہداریاں سنسان پڑی ہوئی تھیں، بے شک مجھے، کسی رہنما کی ضرورت تھی جو مجھے بنسی راج
تک پہنچا دے لیکن، شاید یہاں کے لوگوں پر بھی خوف وہراس طاری تھا جیسا کہ اس چھلاوے نے مجھے بتایا
کہ یہاں وہ اکیلا نہیں رہتا۔ بہت سے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے حویلی میں رہنے والوں کا خون ویسے ہی
خشک ہوتا رہتا ہوگا یہی بڑی بات ہے کہ وہ اب بھی اس حویلی میں موجود تھے۔ غرض یہ کہ میں اپنی دھن
میں آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک ایسے کمرے کے قریب پہنچ گیا جہاں روشنی جھلک رہی تھی۔

گو یہ سب کچھ ایک غیر مناسب عمل تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے تو باقاعدہ
چوکیدار کے ذریعے یہاں آنے کی کوشش کی تھی۔ اب چوکیدار کی جگہ کون تھا، مجھے معلوم تھا۔

روشن کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر میں نے دستک دی اندر بے شک روشنی تھی لیکن کوئی
آواز نہیں سنائی دی۔ دوسری بار اور تیسری بار دستک دی تو اندر سے ڈری ڈری آوازیں سنائی دینے لگیں
پھر کسی نے انتہائی ہمت کر کے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کک کون ہے، کون ہے۔" آواز اس قدر ڈری اور سہمی ہوئی تھی کہ ایک لمحے کے لئے تو سمجھ میں
بھی نہیں آئی کہ کسی مرد کی ہے یا عورت کی، لیکن میں نے پھر دستک دی اور آواز سنائی دی۔

"ارے کون ہے کون ہے..........؟" اور اس بار میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا، وہ بنسی راج ہی تھا جس سے

بلا جارہا تھا۔ میں نے صاف لہجے میں کہا۔ "دروازہ کھولو بنسی راج مہاراج، میں مسعود ہوں۔"

"کک کون بھائی۔ کون؟"

"مسعود۔ مسعود۔ جس کے پاس تم مولوی حمید اللہ کے گھر ملنے گئے تھے۔" میرے ان الفاظ نے غالباً
بنسی راج کے دل سے خوف دور کردیا بلکہ کچھ زیادہ ہی دور کردیا ہلکی سی گرنے کی آواز سنائی دی۔ یوں محسوس
ہوا جیسے بنسی راج اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگا ہو اور کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑا ہو، پھر دروازے پر آہٹیں سنائی دیں
اور ساتھ ہی کسی عورت کی ڈری ڈری آواز.......... "ارے دیکھ تو لو گردن نکال کر دیکھنا، پھر دروازہ
کھولنا۔" یقیناً بنسی راج کی دھرم پتنی ہوگی۔ بنسی راج نے تھوڑی سی جھری کی اور مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔ "بنسی راج میں ہی ہوں، میں نے تم سے تمہاری حویلی آنے کا وعدہ کیا تھا نا..........؟"

"ہاں، ہاں، ہاں، مہاراج۔ آجایئے آجایئے۔" بنسی راج نے کہا اور پورا دروازہ کھول دیا۔ بڑی
مسہری کے ایک گوشے میں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک عورت سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے
چہرے پر خوف و دہشت کے آثار منجمد تھے، اور آنکھوں سے انتہائی ہراس ٹپک رہا تھا، بنسی راج نے تیز
روشنی جلادی اور عورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن خم کرتے
ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں اس وقت آنے کی لیکن یہی وقت میرے لئے مناسب تھا۔"

"ارے مہاراج پدھاریئے، پدھاریئے، بھگوان کی سوگند آپ کے بارے میں نجانے کیا کیا سوچتا رہا
ہوں میں نے پورا دن انتظار کیا، اب تک انتظار کرتا رہا ہوں میں، من ٹوٹ گیا تھا اور میں اپنی دھرم پتنی
سے کہہ رہا تھا کہ شاید بھگوان نے ہماری تقدیر میں کوئی اچھائی نہیں لکھی ہے ورنہ مہاراج مسعود ضرور
آجاتے۔" بنسی راج نے مخصوص بناوٹ کی ایک قیمتی کرسی اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی اور میں بیٹھ گیا۔

"یہ میری دھرم پتنی چندراوتی ہے مہاراج بہت دکھی ہے یہ تین بیٹوں کا دکھ بھوگ رہی ہے۔"

"برا مت ماننا بنسی لعل تم نے بھی تو بہت سی ماؤں کو انکے بیٹوں کا دکھ دیا ہے۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے"

"نا مہاراج نا۔ ایسا مت کہو۔ بڑی آس لگا رکھی ہے ہم نے۔ ارے انیائے میں نے کیا ہے۔
بھگوان کی سوگند، کوڑھی ہوجاؤں، سانپ بچھو لپٹ جائیں میرے شریر سے، آنکھیں بہہ جائیں پانی بن کر
کوئی بھی سزا ملے مجھے مل جائے۔ بھگوان میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو بچالے۔ سمے لوٹ آئے اور میں اپنے
سارے پاپو کا پرائشچت کرلوں۔ کچھ ایسا ہوجائے مہاراج۔ وہ بچ جائیں بس۔ اب کوئی اور دکھ مجھ
سے نہ سہا جائے گا۔" وہ بلک بلک کر رونے لگا ایسا کرب تھا اس کی آواز میں، کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ یہ
پچھتاوا تھا۔ ندامت تھی۔ اب کچھ اور کہنا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا بنسی راج، پورا کرنے آگیا دل چھوٹا نہ کرو اللہ مالک ہے میں کوشش کرونگا۔"

"بڑی دیا ہوگی مہاراج۔ بڑی دیا ہوگی۔"

"چلتا ہوں۔"

"حویلی میں رک جاؤ بھگوان۔ ہمیں ڈھارس ہوجائے گی۔" بنسی راج نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"پھر آؤں گا بنسی راج۔ ضرورت پڑنے پر پھر آؤں گا۔" میں اٹھ گیا بنسی راج مجھے حویلی کے باہر
تک چھوڑنے آیا تھا میری منت سماجت کرتا رہا تھا۔ میں اسے دلاسے دے کر آگے بڑھ گیا۔ مسجد تک
راستے میں کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔ حجرے میں تاریکی تھی۔ میں درخت کے نیچے اپنے ٹھکانے پر آگیا۔

مختصر وقت میں ہی بڑے انوکھے واقعات پیش آئے تھے۔ بیشک وہ ارواح خبیثہ تھیں لیکن ان کے ساتھ بھی ظلم ہوا تھا ان سب نے بنسی راج کی حویلی میں بسیرا کر لیا تھا۔ اور وہ اپنا انتقام لینا چاہتی تھیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ واضح اشارہ مل چکا تھا کہ میں بنسی راج کی مدد کروں۔ لیکن ان ارواح خبیثہ کے ساتھ مجھے کیا کرنا چاہئے یہ میرے علم میں نہیں تھا.......... نیند آنکھوں سے دور ہو گئی تھی۔ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ بنسی راج کے ہاتھوں چوٹ کھائے ہوئے آسیب میری طرف سے ہوشیار ہو گئے تھے جس کا ثبوت مجھے حویلی میں داخل ہوتے ہی مل گیا تھا۔ بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر نماز پڑھنے کو دل چاہا یوں بھی تہجد کا وقت تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر صحن مسجد میں آیا وضو کیا اور عبادت کرنے لگا۔ دل کو ناقابل بیان سکون ملا تھا۔ سلام پھیرا تو ایک اور تہجد گزار پر نظر پڑی۔ ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میری دائیں سمت بیٹھا ہوا تھا اس نے بھی سلام پھیرتے ہوئے مجھے دیکھا اور نماز سے فارغ ہو کر مجھے سلام کیا میں نے احترام سے اسے جواب دیا تھا۔

"موسم خوشگوار ہے۔" اس نے کہا۔

"بیشک۔ رحمت الٰہی سے منور۔" میں نے جواب دیا۔

"کلام الٰہی کا ایک ایک حرف کائنات کی عبادت کرتا ہے جہاں اس کا ورد ہو وہاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ ہر مد، ہر جزر میں کائنات سمٹی ہوئی ہے۔ ان کی کیا مجال کہ وسعتوں کے تصور کو بھی سمیٹ سکے۔ ایک مد، ایک جزر ایک تشدید حیات مختصر سے کروڑوں گنا آگے ہے۔ اور کوئی دعویدار نہیں کہ ایک آیت سمجھ سکا ہو، سمجھ سکے اور پالے تو اس کا مقام نہ جانے کیا ہو۔ لیکن اشارے کئے گئے ہیں اور علاج مقدر کر دیا گیا ہے گو امراض مختلف ہوتے ہیں۔ اور جب دل بے چین ہو اور دماغ فیصلہ نہ کر پائے تو گیارہ بار درود پاک پڑھ لیا کرو اور آنکھیں بند کر کے رہنمائی طلب کر لیا کرو۔ اور اتنا کافی ہے ہر مرض کے علاج کے لئے کہ یہ سب کچھ کبھی نہ سمجھ پاؤ گے لیکن بہت کچھ ہے اتنا کچھ کہ مشکل کم اور حل زیادہ۔ اور اس وقت جو فیصلہ ہو اس پر غور نہ کرو کیونکہ دماغ کی کیا مجال کہ ان وسعتوں کے تصور کو بھی پالے۔ اچھا سپرد رحمت۔ السلام علیکم۔" وہ صاحب اٹھے اور صحن مسجد کے باہر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ میرے منہ سے بلند آواز میں سلام کا جواب نکلا تھا اور بس یوں لگا جیسے خواب سے آنکھ کھل گئی ہو۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات کے خزانے سامنے بکھر گئے ہوں۔ ہر شے جواہرات کی طرح جگمگانے لگی۔ اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ وہاں سے اٹھ آیا۔ درخت کے سائے سے الگ ہو کر زمین پر دوزانو بیٹھا اور درود شریف پڑھنے لگا۔ دماغ نے تصور دیا کہ گناہ کو تائید شیطانی حاصل ہے اور شیطان کو شیطنت کی قوت حاصل ہے۔ اسے لاحول سے بھگایا جا سکتا ہے لیکن اس کی ذریات کا خاتمہ عمل سے گزر کر ہوتا ہے اور عمل یہ ہے کہ اس کفر زادے کو اہل خاندان کے ساتھ دریا پار کرا دیا جائے اور دریا پار اس کا گھر ہے یہاں اس عمل کا اختتام ہو چکا ہے لیکن کسی کو نہ چھوڑا جائے۔ سو وہ جو مظلوم ہے کچھ طلب کرے گا اس کی طلب اسے دینا ضروری ہو گا جسے عقل قبول نہیں کرے گی لیکن..........؟

کھٹاک کی آواز آئی اور جیسے ایک روشن خانہ بند ہو گیا بالکل ویسے ہی جیسے بجلی کا بلب بجھا دیا جائے لیکن مجھے رہنمائی مل گئی تھی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوتی ایک ناواقف کو جس طرح نوازا گیا تھا اس کے لئے سجدۂ شکر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور سجدے کر کے جی نہ بھرا یہاں تک کہ مولوی حمید اللہ آ گئے۔

"فجر کا وقت ہو گیا ہے مسعود میاں۔" انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ میں اٹھ گیا۔

"سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ جوانی کی اس عبادت کو قبول فرمائے۔ میاں نماز کے بعد باتیں ہوں گی۔ اذان کا دوں وقت ہو گیا ہے۔" وہ مسجد کے مینار کی طرف چل پڑے اس طرح تازہ دم تھا جیسے جی بھر کے سویا ہوں۔ خمار کا نشان بھی نہ تھا۔ اذان ہوئی، نمازی آئے۔ مجھ سے بہت محبت سے ملے پھر فراغت ہو گئی۔ مولوی صاحب چائے لے آئے مجھے پیش کی اور خود بھی لے کر بیٹھ گئے۔

"رات کو بہت دیر تک جاگتا رہا تھا کس وقت واپسی ہوئی؟"

"دیر ہو گئی تھی۔"

"حویلی مل گئی تھی؟"

"جی ہاں۔"

اور بنسی راج لعل؟"

"وہ بھی مل گیا تھا۔"

"کچھ اندازہ لگایا؟"

"ہاں! حمید اللہ صاحب.......... ظالم انسان تھا۔ خود پر بیتی تو آنکھ کھلی، مگر بہت نقصان اٹھا چکا ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔ جو کیا ہے بھر رہا ہے۔"

"مشکل فلسفہ ہے حمید اللہ صاحب۔ کیا اس نے ہے۔ لیکن اس کے تین بیٹوں کو بھگتنا پڑا۔"

"ہاں میاں، باپ کا گناہ اولاد کے سامنے آتا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" حمید اللہ صاحب چونک کر بولے۔

"عقل تسلیم نہیں کرتی۔"

"مگر سامنے کی بات ہے۔"

"ہمارے آپ کے سامنے کی بات، عقل اس کی نفی کرتی ہے۔"

"مجھے سمجھاؤ۔"

"میرے خیال میں گناہ کی سزا صرف گناہ گار کو ملتی ہے اس گناہ گار کو جو اللہ کا مجرم ہوتا ہے اور اللہ سچا منصف ہے جو دنیا سے گئے انکی زندگی اتنی ہی تھی مگر مجرم کو اس وقت تک ان کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑے گا جب تک وہ زندہ ہے۔ میں نے کہا نا مشکل فلسفہ ہے، حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"کہانی تو سچ ہے۔"

"اور وہ روح خبیث۔"

"حویلی ان سے بھری ہوئی ہے جو اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے حویلی کو حصار میں لیا ہوا ہے۔"

"بالکل درست کہتے ہیں۔ کئی واقعات ہو چکے ہیں۔"

"کیسے؟"

"بنسی راج نے ہندوستان بھر سے سادھو پنڈت اور جوگی بلائے۔ زر و جواہر کے انبار لگا دیئے انکے سامنے ہر کوشش کی گئی مگر کچھ نہ ہوا بلکہ ان سب کو نقصان ہوئے۔ مہاشے در گاداس تو ابھی کچھ دن پہلے مرے ہیں۔"

"یہ کون تھے۔"

"گیانی دھیانی تھے۔ الٰہ آباد سے آئے تھے حویلی میں جاپ کیا تین بار اٹھا کر پھینکے گئے۔ چوٹیں لگیں باز نہ آئے یہاں تک کہ پاگل ہو گئے۔ ننگ دھڑنگ دھونی پور کی گلیوں بازاروں میں بھاگے پھرتے تھے۔ بچے در گا باؤلا کہہ کر پتھر مارتے تھے۔ الٰہ آباد سے ان کے گھر والے انہیں لے گئے۔ مگر دو مہینے بعد پھر واپس آ گئے۔ اس کے بعد کئی مہینے یہاں رہے۔ تھوڑے دن قبل لال تلیاں میں ان کی لاش تیرتی ہوئی ملی اسی سرکٹے کا شکار ہو گئے تھے۔"

"اوہ افسوس۔" میں نے کہا۔

"کیا ارادہ ہے مسعود میاں؟"

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا کچھ کام کرنا پڑے گا۔"

"اللہ کامیاب کرے۔ امان میں رکھے۔" حمید اللہ صاحب خلوص سے بولے لیکن کچھ تشویش بھی تھی ان کے لہجے میں۔

دوپہر کو دوبارہ بنسی راج کی حویلی میں پہنچا۔ بنسی راج موجود تھا۔ راستے میں اچھا خاصا مجمع میرے ساتھ حویلی پر جا کر منتشر ہوا۔ بنسی راج نے ہاتھ جوڑ کر میرا استقبال کیا تھا۔

"کہئے بنسی جی۔ سب خیریت رہی؟"

"نہیں مہاراج۔ رات تو بڑی دھما چوکڑی رہی۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بڑا اودھم مچا ہے رات کو۔ آگ کے گولے گرے حویلی پر۔ خوب شور مچا کئی نوکر بھاگ گئے۔ میرے کمرے کا دروازہ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ چار فانوس توڑ دیئے گئے چیخیں اور آوازیں سنائی دیں۔"

"ہوں۔ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔"

"نہیں مہاراج .... مگر اب کچھ اور مشکلیں نظر آ رہی ہیں۔"

"کیا؟"

"نوکر تو اب کوئی نہیں ٹکے گا یہاں۔"

"آپ کے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟"

"ونود اور راجیش یہیں ہیں۔ پہلے تو وہ نہیں ڈرتے تھے مگر اب پیلے پڑ گئے ہیں۔"

"بیٹیاں۔"

"وہ سسرال میں ہیں۔"

"کہاں؟"

"ایک دلی میں ہے دوسری جے پور میں۔"

"انہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا کبھی۔"

"نہیں۔ بھگوان کی دیا ہے۔"

"یہاں آس پاس کوئی ندی ہے۔"

"نیلا ندی ہے۔ بڑی مشہور ہے۔"

"اس کے پار آپ کی کوئی حویلی ہے؟"

"سونا باغ ہے ہمارا، سونا باغ میں پورن نے حویلی بنائی تھی۔ اسکی موت کے بعد ہم وہاں نہیں گئے۔"

"پورن آپ کا بیٹا تھا۔؟"

"ہاں ...." بنسی راج نے بھاری آواز میں کہا۔

"ہمیں وہاں چلنا ہے۔"

"ہیں .... کب؟"

"جو وقت بھی آپ بتائیں جلد سے جلد۔"

"آپ حکم دیں مہاراج۔"

"تیاریاں کرلیں، آج ہی چلیں۔"

"نوکر کو کھتوریہ مانجھی کے پاس بھیجے دیتا ہوں ناؤ تیار کر لے۔ میری اپنی ناؤ ہے۔"

"بھیج دیں اور اپنے گھر والوں کو تیار کرلیں۔"

"کسے کسے لے چلنا ہے مہاراج۔"

"دونوں بیٹے۔ آپ کی بیوی اور بہن۔"

"ہرناوتی؟" بنسی راج چونک کر بولا۔

"ہاں اس کا بھی جانا ضروری ہے آپ یہ ہدایت دیدیں اور پھر مجھے اس سے ملائیں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔" بنسی راج نے کہا۔ مجھے وہیں انتظار کرنا پڑا۔ پھر بنسی راج مجھے لیکر ہرناوتی سے ملانے چل پڑا۔ حویلی کا یہ حصہ کھنڈر بنا ہوا تھا ایک کمرے میں ہرناوتی موجود تھی۔ سفید ساری میں ایک پاکیزہ چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"یہ کون ہیں بھیا جی۔"

"میرے دوست ہیں ہرنا۔"

"لگتے تو نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"ہمیں لینے آئے ہیں۔"

"کہاں لے جائیں گے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب جا رہے ہیں تمہیں بھی چلنا ہے ہرناوتی۔" میں نے کہا۔

"میری قید ختم ہو گئی۔"

"تو قید کہاں تھی ہرنا۔ میں ہی اندھا ہو گیا تھا، پاگل ہو گیا تھا مگر اب۔" بنسی راج نے سسک کر کہا۔

"پرائی پیر جانو سو مانیں۔ لے چلو جہاں من چاہے ہم اپنے میں ہیں ہی کب۔" اس نے اداسی سے کہا۔ بنسی راج نے نوکر کو کشتی کے انتظام کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ میں ہرناوتی سے مل چکا تھا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ملازم بہت دیر میں آیا۔

"کھتوریہ ہریاپور گیا تھا مہاراج۔ دیر میں آیا میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔"

"آگیا۔"

"ہاں ناؤ تیار کر رہا ہے کہتا ہے۔ مہاراج گھاٹ آجائیں نیا تیار ملے گی۔"

ملازم شام کو چھ بجے واپس آیا تھا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ ہم لوگ گھاٹ چل پڑے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج چھپ گیا۔ بنسی راج اس کے دونوں بیٹے، بیوی اور ہرناوتی میرے ساتھ تھے۔ میری ہدایت پر کسی ملازم کو نہیں لیا گیا تھا۔ گھاٹ پر بڑی سی کشتی ڈول رہی تھی اسی پر بادبان باندھا گیا تھا۔ بنسی راج قریب آگیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ونود نے رسی کھینچ کر کشتی کو کنارے لگایا اور عورتوں کو سہارا دے کر کشتی پر اتار دیا گیا۔

"یہ کھتوریہ کہاں مرگیا۔ ویسے ہی رات ہوگئی۔" اسی وقت کھتوریہ کھیس سنبھالے دوڑتا نظر آیا۔ ونود نے خود بھی کشتی میں بیٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"کہاں چلا گیا تھا رے تو۔ چل جلدی کھونٹا کھول دیر کر دی بیوقوف نے۔" کھتوریہ نے کھونٹا کھولا رسی لپیٹ کر بادبان میں پھینکی اور خود کشتی میں کود کر بادبان کا رخ بدلنے لگا۔ کشتی پانی میں آگے بڑھنے لگی۔ کھتوریہ پتوار سنبھال کر کشتی کے دوسرے سرے جا بیٹھا تھا۔ کشتی بہاؤ پر چل پڑی۔ سب خاموش تھے۔ بہت دیر تک یہ خاموشی طاری رہی پھر بنسی راج بولا۔

"سونا باغ سونے کا باغ کہلاتا ہے۔ کچھ بھی لگوا دو ایسی فصل ہوتی ہے وہاں کہ کہیں نہیں ہوتی، آم ناریل اور پپیتا تو اتنا اگتا ہے کہ بس مگر اسے لگانے والا نہ رہا۔"

"پتا جی ان باتوں کو یاد نہ کریں۔" راجیش نے کہا۔

"جب سے پورن نے سنسار چھوڑا، میں آج اس باغ میں جا رہا ہوں۔" بنسی راج درد بھرے لہجے میں بولا اور اس کی معصوم پتنی سسکنے لگی۔

"پتا جی۔" راجیش نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"کیسے بھولوں اسے۔ کیسے بھول جاؤں اپنے تین ہاتھیوں کو.......... کیسے بھول جاؤں۔ وہیں جا رہا ہوں۔ ایک ایک چیز سے اس کی یادیں برستی ہیں۔"

میں نے افسردہ نظروں سے سب کے چہرے دیکھے آخر میں میری نظر ہرناوتی کی طرف اٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں چمک رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"کون بھولتا ہے، کوئی نہیں بھولتا۔" آہستہ بولی تھی۔ لیکن میں نے سن لیا تھا۔ نہ جانے کیوں راجیش کو غصہ آگیا۔

"آپ تو چپ ہی رہا کریں بوا جی۔ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا۔"

"راجیش چپ بیٹھ!" بنسی راج بولا۔

"آپ نے سنا نہیں پتا جی۔ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"خاموش بیٹھ!" بنسی راج بولا۔ اور راجیش منہ بنا کر بیٹھ گیا۔ ہرناوتی آہستہ آہستہ ہنس رہی تھی۔

"اپنی چوٹ سب کے دکھتی ہے۔ دوسرے کو کون جانے۔" وہ پھر بولی۔ کھتوریہ بادبان کا رخ

بت کر رہا تھا۔

"یہ رخ کیوں بدل رہا ہے کھتوریہ۔ وہ سامنے تو ہے سونا باغ۔" ونود نے کھتوریہ سے کہا اور اس نے بدن سے لپٹا کھیس اتار دیا ایک تو نیم تاریک ماحول تھا۔ دوسرے کھتوریہ نے چہرہ ڈھکا ہوا تھا اس سے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ کھیس اتارنے سے اس کا چہرہ نظر آیا۔ کالا سیاہ چہرہ۔ خون کی سرخ آنکھیں مگر یہ سیاہ چہرہ بالکل جلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کھتوریہ کو دیکھا بھی نہیں تھا ہو سکتا وہ ایسا ہی ہو لیکن اچانک پوری کشتی پر چیخیں گونجنے لگیں۔ بنسی راج کی بیوی نے چیخ کر اپنے دونوں بیٹوں کو سینے سے لپٹا لیا تھا۔ بنسی راج تھر تھر کانپ رہا تھا اور ہرناوتی کی ہنسی کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی.......... گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میری نظریں سب سے ہوتی ہوئی کھتوریہ پر آگئیں۔ اس نے دونوں گال پھلائے تھے اور منہ سے ہوا نکال رہا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں شیطانی چمک لہرا رہی تھی اور منہ سے اتنی تیز ہوا نکل رہی تھی کہ اس کا احساس اتنے فاصلے پر بھی ہو رہا تھا میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ہوا بادبان میں بھرتی جا رہی ہے اور کشتی کی رفتار بھی تیز ہونے لگی ہے۔ صورتحال پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نے بنسی راج کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہے؟" بنسی راج نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اسکے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ہیرا.......... ہیرا.........."

میں تمام صورتحال سمجھ گیا تھا۔ ہرناوتی کی ہنسی اب سمجھ میں آرہی تھی اور یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کشتی کی برق رفتاری کسی خوفناک حادثے کو جنم دینے والی ہے، وہ تو ایک خبیث روح تھی لیکن باقی سب انسانی روح تھے اور رفتار پکڑنے والی بے آسرا کشتی کسی بھی لمحے تیز رفتار دریا میں الٹ سکتی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑی۔ چند قدم آگے بڑھا اور ہیرا کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے بادبان کی طرف سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی شرارت سے مسکراتی ہوئی سرخ آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیں دوڑنے لگیں، اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور رخ تبدیل کر لیا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی ہوا اب میرے سینے پر پڑی اور مجھے ایسا ہی محسوس ہوا، جیسے کوئی سخت اور موٹی سل میرے سینے پر آ لگی ہو اور پوری قوت سے مجھے پیچھے دھکیل رہی ہو۔ یہ ہوا کی طاقت تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی یہ ہمت عطا کی کہ میں اس شیطانی طاقت کا مقابلہ کر سکوں۔ تیز ہوا بے شک میرے جسم میں سوراخ کئے دے رہی تھی لیکن میرے قدموں کو ایک تل برابر بھی پیچھے نہ ہٹا سکی۔ ہیرا مسلسل کوشش کرتا رہا۔ تب میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "بس ہیرا رک جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے نقصان کی باری آتی ہے۔" وہ رک گیا، ہوا بند ہوگئی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جتنا کچھ تم کر چکے ہو ہیرا، میرے خیال میں وہ بہت زیادہ ہے اور اب تمہیں یہ سلسلہ ترک کر دینا چاہئے۔" اس نے خونخوار انداز میں منہ کھولا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے او میاں.......... او میاں جی۔ زیادہ باتیں نہ بنا ہمارے سامنے بڑا مہاتما ہے تو، بڑا علم والا ہے۔ نہ مہاتما ہیں نہ علم والے، ہم تو مظلوم ہیں، انیائے ہوا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ پاپی یہ ہتھیارا، ہمارے پورے خاندان کو ختم کر چکا ہے ارے تیرا ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے میاں، بیچ میں مت آ ہمارے، جو سوگند ہم نے کھائی ہے اسے پوری کئے بغیر ہم نہیں رہ سکیں گے۔ بیچ کا جھگڑا مت نکال میاں جی۔ بیچ کا جھگڑا مت نکال۔"

"تم اس سے انتقام لے چکے ہو۔ تین بیٹے مار دیئے ہیں تم نے اس کے اور کیا کرو گے۔ بس اتنا کافی ہے اور تم تو اس کے خاندان کے ایک فرد ہو، ہرناوتی سے شادی ہوئی ہے تمہاری، کچھ بھی ہے یہ خاندان ہے تمہارا، بس اتنا کافی ہے جو تم کر چکے، بس اس کے بعد تم اپنی یہ کارروائیاں بند کر دو۔"

"ارے جا رے جا۔ کارروائیاں بند کر دو۔ ہم اس کے خاندان کے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے خاندان والوں کے ساتھ رہے ہمیں بھی تو اس کی طرح اس سنسار میں بھیجا گیا تھا۔ کون نیچا ہے، کون اونچا ہے۔ چار پیسے انسان کو اتنا اونچا بنا دیتے ہیں کہ وہ نیچا دیکھ ہی نہیں سکتا، ہم بھی اس کی بہن کو عزت دیتے ہم بھی عزت سے جی لیتے۔ بیچ میں مت آ میاں، بیچ میں مت آ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"اور اگر اب تم نے کوئی کارروائی کی تب بھی اچھا نہیں ہو گا ہیرا۔"

"ٹھیک ہے پھر، ہم تو ہمیں جو کرنا ہے ہم کر رہے ہیں یہ لے۔" اس نے پھر بادبان کی جانب رخ کیا۔ کشتی کی رفتار اب بھی بہت تیز تھی اور اسے کوئی سنبھالنے والا نہیں تھا چنانچہ خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ اب میرے لئے ضروری تھا کہ میں خود بھی اپنے آپ کو عمل میں لاؤں۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بادبان کی جانب دیکھنے لگا۔ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ بادبان جل جائے اور دوسرے لمحے بادبان سے شعلے ابھرنے لگے۔ بادبان کسی سوکھے ہوئے کاغذ کی طرح جل اٹھا تھا۔ اور اس میں ایک دم آگ بھڑک اٹھی تھی، آگ کے بھڑکتے ہی بادبان کی ساری ہوا نکل گئی اور کشتی کی رفتار سست ہو گئی۔ ہیرا نے میری طرف دیکھا اور پھر خونخوار انداز میں آگے بڑھا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے کر لئے اور آہستہ سے کہا۔

"اب تم جل کر راکھ ہو جاؤ گے ہیرا۔ آگے نہ بڑھنا ورنہ یہی آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ سوچ لو ہیرا، جو کچھ نقصان تمہیں پہنچایا جا چکا ہے میں اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا لیکن اگر تم نے ان لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈالی تو مجبوراً مجھے بھی تمہارے ساتھ بد سلوکی کرنی پڑے گی۔ ہاں اگر تم اپنی شیطانی قوتوں کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہو تو کر دو اگر ناکام ہو جاؤ تو میری بات مان لینا اور مجھے جوابی کارروائی کے لئے مجبور مت کرنا .... وہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر دفعتہً اس نے اپنے جلے ہوئے کالے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔

"سب مرے کو مارتے ہیں سب مرے کو مارتے ہیں جو ظالم ہوتا ہے اس کے لئے کوئی کچھ نہیں کرتا۔ کوئی کچھ نہیں کرتا ...."

"ہیرا مجھے تم سے ہمدردی ہے، مجھے سچ مچ تم سے ہمدردی ہے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، میں اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا لیکن اب تم اپنی انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ ترک کر دو۔ تم اپنے آپ کو پرسکون کرو ہیرا، جس دنیا سے تمہارا تعلق ختم ہو چکا ہے اب اس سے تعلق مت رکھو۔"

"تعلق ختم ہو چکا ہے چتا تک نہ ملی ہمیں، سارا پریوار جلا دیا ہمارا چتا تک نہ دی پاپیوں نے ...."

"میں تمہیں چتا دلوا سکتا ہوں ہیرا، میں تمہیں چتا دلوا سکتا ہوں سمجھے یہ کام بنسی راج کو کرنا ہو گا بنسی راج تم اپنے باغ کی طرف جا رہے ہو نا، پہلا کام تمہارا یہ ہو گا کہ ہیرا کے لئے چتا بناؤ اس کی چتا جلاؤ۔" بنسی راج نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں تیار ہوں مہاراج، سچے من سے تیار ہوں، جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے مجھے اس کا بڑا دکھ ہے ہیرا، میرا دل کبھی خوش نہ ہو سکے گا میری وجہ سے میرے تین بچے مجھ سے چھن گئے میں تیار ہوں، ہیرا میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔" بنسی راج رونے لگا، ہیرا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے پتوار

لئے، کشتی کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ سب ہونٹوں میں کپکپاہٹ تھی ایک بدروح کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بنسی راج کی دھرم پتنی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس پر نیم غشی کی کیفیت طاری تھی ہرناوتی جو کچھ دیر پہلے ہنس رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے رخساروں پر دو لکیریں چل رہی تھیں۔

عجیب سی کیفیت تھی شیطانی روحوں سے واسطہ پڑ چکا تھا مگر یہ پہلا شیطان تھا جو مظلوم تھا۔ کشتی اپنی اصل جگہ سے دور نکل آئی تھی بنسی راج کا سونا باغ دور رہ گیا تھا۔ ہیرا خشکی پر کود گیا میری ہدایت پر وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح خشکی پر اتر آئے بنسی راج کی دھرم پتنی سے چلا نہیں جا رہا تھا میں نے کہا۔ "اپنا وعدہ پورا کرو بنسی راج۔"

"ہاں .... ہاں میں تیار ہوں مگر یہاں .... یہاں میں کیا کروں باغ تک جانا ہو گا۔"

"چلو .... !" میں نے کہا۔ سب گرتے پڑتے باغ کی طرف چل پڑے۔ ہیرا چند گز ہمارے پیچھے آ کر غائب ہو گیا میں نے ہی پلٹ کر دیکھا تھا اور مجھے اس کے غائب ہونے کا علم ہوا تھا مگر میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ باغ واقعی خوبصورت تھا .... بیچوں بیچ ایک عمارت بنی ہوئی تھی جس میں باغ کا رکھوالا تیجا رہتا تھا۔ تیجا نے اپنے مالکوں کا استقبال کیا اس وقت بنسی راج کو ہیرا کے موجود نہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔

"گیا .... ؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہ ہونی چاہئے بنسی راج .... !"

"اب میں کیا کروں .... ؟"

"چتا تیار کراؤ .... !" بنسی نے گردن جھکا دی ہرے بھرے باغ کے ایک گوشے میں لکڑیاں جمع کی جانے لگیں ملازم تیجا کے ساتھ بنسی راج کے دونوں بیٹے اور خود بنسی راج بھی مصروف ہو گئے موٹی اور پتلی لکڑیوں کے انبار کا احاطہ بنا دیا گیا تب میری نگاہ اس درخت کے چوڑے تنے کی طرف اٹھ گئی جس کے قریب وہ سب بیٹھے تھے بوڑھا لاکھو، تین عورتیں ایک بچہ .... میں نے بچے کی آواز سنی۔

"بس .... ارتھی نہیں ہے۔"

"چپ ہو جا پوت، پاپی کے ہاتھ سے چتا ہی مل جائے تو کافی ہے۔" عقب سے ہیرا بھی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ خاموش تھیں کوئی اجنبی شخص تو اس منظر کو سمجھ بھی نہ پاتا مگر جو شخص بھی ہوتا وہ ہوش و حواس میں نہیں رہ سکتا تھا بنسی راج کی دھرم پتنی کو اندر عمارت میں بھجوا دیا گیا تھا پھر تیجا نے انہیں دیکھ لیا اور ایک لمحے پہلے میں نے جو سوچا تھا وہ سامنے آ گیا یقیناً تیجا ان کے بارے میں جانتا ہو گا اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا بنسی راج اور اس کے بیٹوں نے اب انہیں دیکھ لیا تھا اور بری طرح کانپنے لگے تھے۔

"تم کام جاری رکھو بنسی راج وعدہ پورا نہ ہو سکا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا"۔ بنسی راج پہلے سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کرنے لگا تھا مگر اس طرح کہ دہشت سے ان سب کی بری حالت تھی چتا کے لئے لکڑیوں کا انبار جمع ہو گیا بیچ میں جگہ تھی ....

"چلو چاچا .... چلو ماسی چتا تیار ہو گئی، سب اندر چلے جاؤ۔" ہریا نے کہا اور درخت کے پیچھے سے نکل کر ... کچھ دیر کے بعد وہ لکڑیوں کے ڈھیر میں پوشید ہو گئے۔ ہیرا نے ہرناوتی کو دیکھا وہ پتھرائی ہوئی

بیٹھی تھی۔ ہیرا نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ ”ہرنا.......... ہرنا..........!۔“ مگر ہرناوتی نے
کوئی جواب نہیں دیا وہ اسی طرح بیٹھی رہی تب ہیرا آہستہ سے بولا۔ ”چلتا ہوں ہرنا دیر ہو رہی ہے
دیر ہو گئی تھی مگر.......... میں کیا کرتا.......... ٹھیک ہے بنسی راج۔ سوچا تو یہ تھا کہ جب تک
رہوں گا تجھے رلاتا رہوں گا مگر.......... میاں جی بیچ میں آ گئے میاں جی۔ منش کو جیتے جی سنسار
ملے یا نہ ملے مگر اس سے اس کی چتا بھی چھین لی جائے تو.......... تو.......... اچھا چلتا ہوں ہرنا
بنسی راج.......... یہ باغ تیرے بیٹے پورن نے لگایا تھا نا..........؟“

”ہاں..........“ بنسی راج نے کہا۔

”اب یہ تیرا نہیں ہے ہمارا ہے ان سب کا ہے جو تیرے ہاتھوں مارے گئے اس کے ایک ایک
اب کوئی پھل نہ لگے گا سب سوکھ جائیں گے تو جب بھی نیا سے گزرے گا اسے دیکھے گا اور تجھے اپنا پاپ
یاد آ جائے گا۔ دیکھ پتے سوکھنے لگے۔ شاخیں سلگنے لگیں۔ ساری آتمائیں پہنچ گئی ہیں ہم سب یہ
رہیں گے منع کر دینا اپنوں کو، کبھی ادھر سے نہ گزریں نہیں تو ہمیں سب کچھ یاد آ جائے گا تیرے پریوار
کوئی ادھر سے گزرا تو جیتا نہ جائے گا۔“

وہ منظر میں نے بھی دیکھا درخت پتوں سے خالی ہوتے جا رہے تھے ان کی شاخیں ٹنڈ منڈ ہوتی جا رہی
تھیں۔ لمحوں میں ایسا انوکھا اجاڑ کسی نے نہ دیکھا ہو گا ہرا بھرا باغ منٹوں میں سوکھ گیا تھا یہ سب میری
آنکھیں دیکھ رہی تھیں میں ان ہولناک ناقابل یقین واقعات کا گواہ ہوں ہیرا نے آخری نظر ہرناوتی پر ڈالی
اور پھر چتا کی طرف بڑھ گیا۔

”اپنا کام کرو بنسی راج.......... اپنا کام کرو..........“ بنسی راج کپکپاتے قدموں سے آگے بڑھا
جیب سے ماچس نکالی اور سوکھی لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ آہستہ آہستہ آگ بھڑکنے لگی اور پھر لکڑیوں کا
ڈھیر جہنم بن گیا شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

”چلو ونود.......... چلو راجیش اپنی ماتاجی کو سنبھالو، چلیں یہاں سے مہاراج، ہرنا اٹھو بیٹی..........!“

”میں.......... میں کہاں جاؤں گی بھیاجی یہ میرا سسرال ہے میکے میں بہت رہ لی اب تو سسرال میں
رہنے دو نا بھیاجی کوئی رکھیل نہیں تھی میں ہیرا کی پتنی تھی۔ پھیرے کئے تھے میں نے بدائی تو نہ کی تم نے
ستی بھی نہ ہونے دو گے کیا ارے واہ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”ہرنا.......... ہرنا.......... تو.......... نہیں نہیں.......... نہیں میری بیٹی..........!“

”جاؤ جاؤ بھیا۔ ماتا پتا ہوتے تو وہ نہ کرتے جو تم نے کیا وہ جہیز میں آگ نہ دیتے بھیا ہونہہ۔“ اس
نے کہا اور چتا کی طرف بڑھ گئی..........!

”ارے.......... ارے ونود.......... راجیش پکڑو.......... پکڑو اسے.......... ارے.......... ارے
..........!“ بنسی راج چیخا۔

بنسی راج کے دونوں بیٹے ہرناوتی کی طرف لپکے مگر وہ دوڑتی ہوئی آگ کے حصار میں داخل ہو گئی۔ شعلوں
کی خوفناک تپش اتنے فاصلے سے جلائے دے رہی تھی۔ ایسی ہولناک آگ میں کسی کے داخل ہو جانے کا تصور
بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر میں نے یہ منظر بھی دیکھا اور یہ ایسا مرحلہ تھا کہ میں خود بھی کچھ نہیں کر سکا۔ انسانی
گوشت کے جلنے کی چراند اٹھی اور معدوم ہو گئی۔ بھڑکتی آگ آن کی آن میں ہرناوتی کو چٹ کر گئی۔

بیٹی اور ونود دیکھتے رہ گئے۔ پھر وہ شعلوں کی تپش سے گھبرا کر پیچھے ہٹ آئے۔ بنسی راج بلک بلک
کر رو رہا تھا۔ ”ہرنا ستی ہو گئی میری ہرنا ستی ہو گئی، ہائے رام میری چھوٹی سی بھول نے مجھے کتنوں سے دور
کر دیا۔ دوش میرا بھی نہیں تھا۔ یہ اونچ نیچ کا فرق مجھے سکھایا گیا تھا۔ بھگوان کے بنائے سارے ایک جیسے
ہیں۔ یہ ہم ہی پاپی ہیں جو ان میں فرق کر دیتے ہیں۔ میری بہن جل مری مہاراج. میری بہن جل
مری۔“ وہ روتا رہا۔ میں خاموش کھڑا تھا پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجیش اور
ونود کو دیکھا۔ انہیں آواز دی۔ دونوں قریب پہنچے تو اس نے لپک کر انہیں اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ ”تم بچ
گئے۔ سن رہی ہے تو ہمارے راجیش اور ونود بچ گئے۔ ہماری کسم اور شردھا بچ گئیں۔ ہمارے چار بچے بچ گئے
مہاراج۔ مہاراج آپ نے میرے بچوں کو بچا لیا۔“ وہ میرے پیروں پر گرنے لگا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔

”نہیں بنسی راج، میرے دین میں یہ حرام ہے۔ ایسا نہ کرو۔“

”آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے مہاراج۔ بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے وہ کسی کو ذریعہ بنا دیتا ہے۔ میں ذریعہ بنا، تمہیں
تمہارے گناہوں کی سزا ملنی تھی۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں تمہارے جتنے بچے دنیا سے چلے گئے انہیں اسی عمر
میں جانا تھا ایسے نہ ہوتا تو کچھ اور ہوتا۔ مگر یہ تمہارے لئے سزا تھی۔ ہو سکے تو انسانوں سے محبت کرنا سیکھو
بنسی راج۔ اسی میں نجات ہے۔“

”میں اپنے پاپوں کا پرائشچت کروں گا مہاراج چلئے۔ واپس چلیں جو ہوا بہت ہو گیا۔ چلئے مہاراج“

”تمہارا کام ہو گیا بنسی راج، اب تم کشتی میں بیٹھ کر واپس جاؤ۔ میری منزل کہیں اور ہے۔“

”نہیں، نہیں مہاراج، اب تو میرے باغ میں پھول کھلے ہیں۔ ہم آپ کی سیوا کریں گے۔ ایسے نہ
جانے دیں گے آپ کو مہاراج۔“

”نہیں بنسی راج بس اب تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا مگر میں تیار نہیں ہوا۔ معصوم لوگوں
کی آبادی تھی۔ یہ واقعہ مشہور ہو گا لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر دوڑ پڑیں گے پوجا شروع کر دیں گے میری،
پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا اور یہ سب کچھ مناسب نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے بنسی راج کو راضی کر سکا تھا۔

”ہم سے کچھ بھی نہ لو گے مہاراج۔“ وہ بولا۔

”جو کچھ مجھے دینا چاہتے ہو خاموشی سے مولوی حمید اللہ کو دے دینا ان کی دو جوان بیٹیاں ہیں۔ غریب
اور مفلس انسان ہیں ان کی بیٹیوں کی شادی کا بوجھ بانٹ لینا۔ سمجھو مجھے سب کچھ مل جائے گا۔“

”بھگوان کی سوگند۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں اپنے ہاتھوں سے انکا بیاہ کروں گا سارا خرچہ اٹھاؤں گا انکا۔“

”انہیں میرا سلام کہہ دینا۔“ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ جو کچھ ہوا تھا خوب ہوا تھا۔ بہت سے
مناظر حیران کن تھے۔ اچانک ہرا بھرا باغ سوکھ گیا تھا۔ کسی درخت پر ایک پتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ مظلوم
روحوں کا انتقام تھا۔ نجانے یہ راستہ کس طرف جاتا ہے۔ کچھ پوچھا نہیں تھا بنسی راج سے مگر کیا فرق پڑتا
تھا۔ چنانچہ چلتا رہا۔ جب سورج کی نارنجی کرنیں زمین پر ایک عجیب سے اداسی بکھیر رہی تھیں مجھے ایک ٹوٹا
پھوٹا کھنڈر نظر آیا۔ آبادی اس کے اطراف میں بھی نہیں تھی۔ بلکہ دور دور تک نہیں تھی۔ لیکن یونہی
قدم اس کھنڈر کی جانب اٹھ گئے۔ .... نہ جانے کون سی جگہ ہے، کبھی یہاں بھی کچھ ہو گا اب کچھ
نہیں تھا۔ لال رنگ کی اینٹوں کے ڈھیر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ بہت سی جگہیں صاف بھی تھیں۔

قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ مسجد جیسی کوئی جگہ ہے اور یقینی طور پر انسانوں کے استعمال میں رہتی ہے۔
اگے ہوئے تھے اور ایک وسیع و عریض چبوترے پر درختوں کے بے شمار سوکھے پتے اڑتے پھر رہے
ان سے سرسراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے ہی منبر بنا ہوا تھا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ قدیم مسجد ہے
دوسرے لوازمات بھی نظر آ گئے ایک جانب گہرا کنواں تھا اس کے کنارے چرخی لگی ہوئی تھی اور
رسی لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی قریب ہی چمڑے کا ایک ڈول رکھا ہوا تھا۔ دیکھ کر تقویت ہوئی یقیناً آس
کوئی بستی موجود ہے۔ رات کی تاریکی میں جب روشنیاں ہوں گی تو بستی نظر آ جائے گی۔ لیکن مجھے کسی
سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ دل میں کچھ خیالات جاگے۔ کنویں کے نزدیک پہنچا اور جھک کر کنویں
جھانکنے لگا۔ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن رسی کا ڈھیر بتاتا تھا کہ کنواں کافی گہرا ہے۔ بہرطور
پانی میں ڈالا اور اس کے بعد تھوڑا سا پانی نکال لیا۔ سامنے ہی ایک ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں نمازیوں
پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مٹی کے لوٹے قطار سے رکھے ہوئے تھے بس جی میں سما گئی، بہت سا پانی نکا
اور اس جگہ کو بھر دیا۔ لوٹے دھو کر قرینے سے رکھے اور اس کے بعد صحن مسجد کی جانب متوجہ ہو گیا
جھاڑو موجود نہیں تھی۔ بڑے بڑے تنکے سمیٹے اور انہیں اپنی قمیض کے دامن سے ایک دھجی پھاڑ کر باندھ
پھر صحن مسجد سے سوکھے ہوئے پتے صاف کرنے میں مصروف ہو گیا اور اس کام میں سوچ بالکل چھپ
گیا۔ مسجد کا فرش صاف ہو چکا تھا۔ پتے سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیئے تھے، کچھ ایسا سکون ملا اس کام
میں کہ ذہن بھی بٹ گیا اور دل بھی مسرور رہا۔

پھر اچانک ہی مسجد کی چھت کی بلندیوں پر سے اللہ اکبر کی صدا ابھری اور پہلی ہی آواز پر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں نے کسی کو مسجد کی جانب آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں ویسے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اگر مؤذن مسجد ہی کے کسی حصے میں رہتا ہو گا تو کم از کم مجھے اس کی آہٹیں تو سنائی دینی چاہئے تھیں۔

اذان کہی گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی میں دیر تک مؤذن کے بلندی سے اترنے کا انتظار کرتا رہا لیکن مؤذن کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی۔ تب میں خود ہی اس جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں وضو کیا جا سکتا تھا۔ وضو کیا اور ابھی وضو سے فراغت ہی ہوئی تھی کہ مجھے انسانوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے نمازیوں کو چبوترے پر چڑھ کر آتے ہوئے دیکھا اور اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ میں نے کیا وہ بہ مناسب فرض تھا صفیں درست ہونے لگیں، لوگ بیٹھ گئے وہ آپس میں مدھم گفتگو کر رہے تھے، میں نے سوچا کہ نماز کے بعد کسی سے قریب کی بستی کے بارے میں پوچھوں گا اور اگر بستی زیادہ دور نہیں ہوئی وہیں چلا جاؤں گا کچھ دیر کے بعد نماز شروع ہو گئی اور امام صاحب منبر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ صفیں بندھ گئیں اور نماز شروع ہو گئی۔ نماز سے فراغت ہوئی اور نمازی واپس جانے لگے۔ میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے لگا جس سے بستی کے بارے میں معلوم کروں۔ اسی وقت عقب سے آواز ابھری۔

"مسعود میاں .... " میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہاں کون رہتا ہے جو میرا شناسا ہے؟ سفید لباس میں ملبوس ایک نورانی شخصیت مجھے مخاطب کر رہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا اور میں آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "انہیں متوجہ نہ کرو .... " بزرگ نے کہا۔

"میں کسی سے .... " میں نے کہنا چاہا اور انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

"ہاں ہاں علم ہے، لیکن آبادی بہت دور ہے۔ "

"میں ششدر رہ گیا۔ میں نے زبان سے پوری بات بھی نہیں ادا کی تھی اور وہ سمجھ گئے تھے۔
"نمازیوں کو چلا جانے دو پھر بات کریں گے۔ آؤ ادھر آ جاؤ۔ " اس ہستی نے اشارہ کیا اور میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے مسجد کے مشرقی گوشے میں لے آئے۔ یہاں پتھر کی ایک صاف ستھری چوکی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ اور اور میں پتھر کی سل پر بیٹھ گیا۔ بزرگ میرے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ "ہمارا نام جلال حسین ہے۔ "

"آپ مجھے جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جانتے ہیں۔ "

"مگر میں پہلے آپ سے نہیں ملا۔ "

"بہت سے لوگ بہت سے لوگوں سے نہیں ملتے۔ "

"پھر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"میاں یہ بات ہمارے سینے میں رہنے دو۔ "

"بہتر ہے۔ " میں نے ادب سے کہا۔ نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل گئے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اچانک مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے کہا۔ " آپ نے فرمایا تھا کہ آبادی بہت دور ہے۔ "

"انسانوں کی آبادی یہاں سے ساٹھ ستر کوس ہے۔ "

"مگر یہ نمازی؟"

"یہ دوسرے بندۂ خدا ہیں۔ چلو کھانا کھا لو۔ " کھانا آ گیا۔ جلال حسین نے دو آدمیوں کو دیکھ کر کہا۔ انہوں میں سینیاں اٹھائے قریب آ گئے تھے ایک نے کپڑے کا دسترخوان بچھایا دوسرے نے سینی اس پر رکھ دی۔ پانی کا کٹورہ اور صراحی بھی قریب رکھ دی گئی۔ سینی سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اس بھاپ کے ساتھ چاولوں کی خوشبو شامل تھی۔ موتی کی طرح بکھرے چاولوں کا انتہائی خوشبودار پلاؤ تھا۔ جلال حسین نے کہا۔ "چلو میاں بسم اللہ کرو .... اول طعام بعدۂ کلام .... "

کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جلال حسین بھی میرے ساتھ اسی سینی میں شریک ہو گئے۔ کھانے کی لذت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی تا ہم اعتدال سے کام لیا۔ ہاتھ روکا تو جلال صاحب مزید کھانے پر اصرار کرنے لگے۔ "مکمل شکم سیری بیشک غیر مناسب ہے لیکن تم بہت بھوکے ہو کھاؤ .... " کچھ دیر کے بعد کھانے سے فراغت ہو گئی جلال حسین نے کہا۔ "نماز عشاء سے فراغت ہو جائے، اسکے بعد نشست رہے گی۔ "

"آپ یہیں قیام فرماتے ہیں؟"

"ہاں۔ "

"اذان آپ نے کہی تھی .... ؟"

"نہیں امیر احمد نے .... "

"وہ بھی یہیں رہتے ہیں۔ "

"ہاں۔ "

"جب میں آیا تھا تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ "

"ہاں نہ دیکھا ہوگا۔"

"آپ نے مجھے دیکھ لیا تھا..........؟"

"کیوں نہیں.........." جلال حسین مسکرائے۔ پھر بولے۔ "تم خانۂ خدا کی خدمت میں مصروف تھے ہم نے مداخلت نہیں کی۔ تھوڑی دیر چہل قدمی کر لو۔ ہم کچھ ضروری امور نمٹالیں۔" وہ اٹھ گئے۔

"بہتر ہے۔" میں نے کہا اور جلال حسین وہاں سے چلے گئے کچھ دور تک نظر آتے رہے پھر کے ایک ڈھیر کے پیچھے روپوش ہوگئے۔ میں مسجد سے دور نکل آیا۔ تاریکی، حشرات الارض کی سرسراہٹ، کبھی کبھی پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ، بڑا پراسرار ماحول تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا جلال حسین کی شخصیت اور ان کے الفاظ بھی یاد آ رہے تھے۔ یہ دوسرے بندۂ خدا ہیں۔ انسانوں کی یہاں سے ساٹھ ستر کوس دور ہے۔ یہ لوگ انسان نہیں تھے۔ یقیناً جنات تھے..........! بدن میں پھریریاں اٹھنے لگیں۔ ایک سرد احساس پورے وجود میں دوڑ گیا۔ کیا جلال الدین بھی.......... جن ہیں۔ یہی لگتا تھا مگر مہربان تھے اور محبت سے پیش آ رہے تھے..........! چہل قدمی ہی کر رہا تھا کہ عشاء کی اذان سنائی دی اور کے لئے قدم اٹھادیئے۔ عشاء کی نماز میں نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور پورا صحن بھر گیا تھا۔ بالآخر نماز سے فراغت ہوگئی۔ اس سرخ سل پر جا بیٹھا اور کچھ دیر کے بعد جلال حسین وہاں پہنچ گئے۔

"میاں کسی شے کی حاجت تو نہیں ہے۔"

"الحمد للہ..........!"

"سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔"

"اللہ کا فضل ہے.........."

"کچھ باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد..........!"

"اول اپنی شناخت سے گریز کرو..........!"

"وضاحت کا طلبگار ہوں۔"

"اب تمہیں اس کمبل کی ضرورت نہیں ہے، رہنمائی کرنے والی ذات الٰہی ہے۔ اللہ کا کلام میں ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ اس کی رہنمائی طلب کرو۔ یہ کھیل شناخت بنے گا تو خود نمائی کے میں آ جاؤ گے اسے خود سے دور کرو تو اعتماد پیدا ہوگا۔"

"جی..........!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"دل میں وسوسہ نہ لاؤ۔ اعتماد سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی!"

"درست فرمایا..........!"

"یہ چار روپے رکھ لو۔ ضروریات پوری کریں گے۔ تمہارا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔" جلال حسین نے چار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"رزق حلال ہوگا۔"

"عطیہ ہے۔ اس وقت تک ملے گا جب تک ضرورت ہوگی۔"

"بسم اللہ!"

جمال گڑھی چلے جاؤ۔ ادھر سے بلاوا ہے۔"

راستے کی نشاندہی کر دیں۔"

"ہاں.......... بس سیدھے چلے جانا مگر صبح سفر کا آغاز کرنا اب آرام سے سو جاؤ۔ اچھا اب ہم بھی اللہ کی امان اللہ..........!" جلال الدین نے کہا اور سلام کر کے وہاں سے چلے گئے۔ میں بہت دیر پتھر کی سل پر پالتی مارے بیٹھا رہا۔ جلال حسین کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ بہت فرحت بخش ہوا چل رہی تھی میں وہیں لیٹ گیا اور تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا رہا۔ دل کی وادیوں میں بہت سے پھول کھلنے لگے۔ ذہن میں سرسرانے لگیں۔ کچھ لوگ یاد آئے اور سسکی بن گئے۔ ان یادوں پر پابندی تھی۔ وقت تک خود آواز نہ دے۔ نیند مہربان ہوگئی۔ رات کے آخری حصے میں خنکی ہوگئی تھی۔ کئی بار آنکھ نیم خوابی کی شکل میں ان تہجد گزاروں کو دیکھا جو عبادت میں مصروف تھے پھر سو گیا۔ فجر کے وقت آنکھ کھل گئی۔ اذان کے آخری بول سنائی دے رہے تھے لیکن اس وقت صحن میں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے وضو کیا۔ انتظار کرتا رہا مگر کوئی نہیں آیا تھا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فراغت پائی اور رخ پتھر کی سل کی طرف کیا۔ وہاں سینی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں دو پراٹھے، آلو کی ترکاری اور چائے کا پیالہ رکھا ہوا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور میرا کمبل موجود نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لئے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پہلے یہ کمبل میری نادانی سے چھن گیا تھا اور اب واپس لے لیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ میں نے ناشتے پر توجہ دی۔ تمام ناشتہ صاف کیا اس کے بعد یہاں رکنا مناسب نہیں تھا چنانچہ وہاں سے سیدھ اختیار کی اور چل پڑا۔ تین دن اور رات کے کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک آبادی نظر آئی۔ اس وقت بھی صبح کے کوئی پانچ بجے تھے میں رات کو ہی ادھر چل پڑا تھا اور جب رات کی سیاہیاں ختم ہوئیں تو مجھے درخت کھیت اور ان سے پرے ٹمٹماتے چراغ نظر آئے تھے جن سے آبادی کے قریب آنے کا احساس ہوا تھا۔

آبادی کے پہلے درخت کے پاس رک گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹنڈ منڈ درخت پر کئی گدھ بیٹھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر انہوں نے پر پھڑپھڑائے اور پھر ان میں سے ایک گدھ بھیانک آواز کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہوا گیا جیسے کسی کو اس کی آمد کے بارے میں اطلاع دینے گیا ہو۔ نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ درخت کے تنے کی آڑ میں، میں نے ایک صاف جگہ تلاش کر کے فجر کی نماز پڑھی اور درود شریف کا وظیفہ کرنے لگا۔ جب اس سے فراغت حاصل ہوئی تو اپنے دائیں بائیں بہت سے مردہ خوروں کو منتظر بیٹھے دیکھا، غالباً میرے بدن کے سکوت سے وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنے بڑے بڑے پیروں سے اچھل اچھل کر پیچھے ہٹنے لگے اور پھر مایوس ہو کر فضا میں بلند ہوگئے یہ مردہ خور بعض اوقات زندہ انسانوں پر بھی حملے کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں سے آگے بڑھ جانا ضروری تھا۔ ذرا بستی پہنچ کر یہ معلوم کیا جائے کہ یہی بستی جمال گڑھی ہے، ایک سمت اختیار کر کے چل پڑا۔ دفعتہً کچھ فاصلے پر مجھے ایک انسانی جسم نظر آیا، جو پشت کئے ایک جھاڑی کے قریب بیٹھا ہوا تھا، اس سمت قدم بڑھا دیئے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ہوسکتا ہے یہی میری رہنمائی کر دے، کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی تو بیٹھی ہوئی شخصیت اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ تب میں نے اسے دیکھا.......... ایک بھیانک

صورت عورت تھی جس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے بھی میلا لاتھا اور اس پر جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ جسم پر لباس بھی نہ ہونے کے برابر تھا ضرورت سے زیادہ لمبے تھے جب اس نے میری سمت نگاہیں اٹھائیں تو میرے قدم ٹھٹھک گئے خوفناک شکل تھی۔ ساتھ ہی اس نے بھیانک چیخ ماری اور ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کچھ فاصلے پر باجرے کے کھیتوں میں جا گھسی۔ چند لمحات اپنی جگہ ساکت رہا۔ پھر بے اختیاری طور پر اس سمت نگاہ اٹھ گئی جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے بری طرح چونک پڑا۔ یہ انسانی جسم وہاں بھی موجود تھا اور زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور خوف سے اچھل پڑا۔ نو یا دس سالہ بچے کا جسم تھا۔ جس کا پھٹا ہوا لباس اس سے چند قدم کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا، اس کا پیٹ چاک تھا، اور جسم کی آلائش قرب وجوار میں بکھری ہوئی تھی جگہ جگہ زمین پر خون نظر آرہا تھا۔ گردن مڑ کر دوسری سمت اختیار کر چکی تھی اس کے سینے کی جو کیفیت نظر آئی اسے دیکھ کر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس میں زندگی ہو سکتی ہے۔ میں بچے کے قریب بیٹھ گیا اس کی مڑی ہوئی گردن سیدھی کی، معصوم شکل کا بچہ تھا جسے اس وحشی عورت نے اپنی درندگی کا شکار بنایا تھا لیکن کیوں؟ ایک اتنے معصوم بچے سے اس بدبخت کو کیا دشمنی تھی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں لیکن فرض تھا کہ بستی والوں کو فوراً ہی اس حادثے کی خبر کردوں، یہ خدشہ بھی تھا کہ ابھی چند لمحات میں مردہ خور آجائیں گے اور اس کی لاش کو نوچنا شروع کر دیں گے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، لاش کی بکھری ہوئی آلائش کو جمع کرنا بھی ایک مشکل کام تھا اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہ بنی کہ بستی کی جانب دوڑوں، سو میں دوڑنے لگا، زیادہ فاصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ پریشان حال انسان نظر آئے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، میں نے زور زور سے انہیں پکارا .... "سنو بھائیو، ادھر آؤ، میری بات سنو، سنو۔" اور وہ جلدی سے میرے قریب آگئے۔

"وہاں اس طرف جھاڑیوں میں ایک بچے کی لاش پڑی ہوئی ہے جس کا جسم ادھیڑ دیا گیا ہے۔"

"کیا؟" ان میں سے ایک شخص نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا اور شاید اسے غش آگیا اس نے لاٹھی زمین پر ٹکا کر اپنا سر اس سے لگا دیا۔ دوسرے نے اسکا بازو تھام کر مجھ سے پوچھا۔ "کدھر .... کہاں .... ؟"

"آؤ میں تمہیں اس سمت لے چلوں ...."

"جنک رام، خود کو سنبھال بھائی، آؤ ذرا چلیں، ہمت کر۔" جس شخص کو جنک رام کے نام سے پکارا گیا تھا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "آہ وہی ہوا، وہی ہو گیا جس کا اندیشہ تھا، میرا بھائی تو بے موت مر جائے گا۔ اجڑ گیا یہ گھر، اجڑ گیا برباد ہو گیا، ہائے کیسے دیکھوں گا میں اپنے بھتیجے کی لاش ...."

"ہمت کر جنک رام، آؤ چلیں تو سہی۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا ....

"چلو بھیا ذرا بتاؤ ہمیں وہ جگہ ...."

"یہاں مردہ خور گدھ بھی ہیں۔ میں دوڑتا ہوا جاتا ہوں تم میرے پیچھے پیچھے آجاؤ، کہیں مردہ خور بچے کی لاش کو خراب نہ کریں۔ ویسے بھی لاش بہت خراب ہو چکی ہے۔" میں نے کہا اور واپس دوڑ لگا دی وہ دونوں بھی ہانپتے کانپتے میرے پیچھے آرہے تھے۔ میرا خیال درست تھا۔ گدھ بلندی پر منڈلانے لگے تھے۔ میں نے ایک سوکھی ٹہنی اٹھائی اور لاش کے پاس جا کھڑا ہوا۔ منڈلاتے مردہ خوروں کو میں نے منہ سے آوازیں نکال

کر لکڑی ہوا میں لہرانے لگا۔ چند لمحات کے بعد وہ دونوں بھی میرے پاس پہنچ گئے۔ جنک رام نے بچے کو دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ دوسرا اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمت کر جنک رام تو سوچ رگھبیر بھیا کا کیا حال ہو گا۔ بھابھی کیسے جیئے گی۔ بڑی مصیبت آپڑی یہ تو ...."

"ارے لٹ گئے ہم تو ہیرا بھیا۔ ارے جیون برباد ہو گیا ہمارا، میرا پرکاشی، میرا پرکاش۔" جنک رام روتا ہوا لاش سے لپٹ گیا۔

"تمہارا نام ہیرا ہے؟" میں نے دوسرے آدمی سے کہا۔

"ہاں بھیا، ہیرا لال ...."

"ہیرا لال لاش کو یہاں سے اٹھانے کا بندوبست کرو۔ تم بستی جا کر دوسرے لوگوں کو خبر کر دو ...."

"جاتا ہوں بھیا جی، بڑی بپتا پڑی ہے جمال گڑھی پر۔ تم یہاں رکے رہو بھیا جی۔ ذرا سنبھالنا جنک رام کو۔" ہیرا نے کہا۔

"تم جاؤ۔" میں نے کہا اور ہیرا لال جنک رام سے بولا۔ "جنک رام سنبھال خود کو۔ ابھی تو تجھے بھابھی کو سنبھالنا ہے۔ میں بستی جا رہا ہوں، سنبھال جنک رام خود کو ...."

"جا .... بھیا ...." جنک رام نے روتے ہوئے کہا اور ہیرا اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوا بستی چلا گیا۔

"جنک رام خود کو سنبھالو۔ یہ بچہ تمہارا کون ہے؟"

"بھتیجا ہے ہمارا، اکلوتا تھا اپنے ماتا پتا کا، لاڈلا تھا ہمارا، بڑا انیائے ہو گیا، بھیا بڑا انیائے ہو گیا۔"

"یہ یہاں کیسے آگیا؟"

"بھگوان جانے۔ رات کو کھیلنے نکل گیا تھا بچوں کے ساتھ۔ رات گئے تک واپس نہ آیا تو سب پریشان ہوئے۔ سب کے سب ڈھونڈتے پھرے ہیں رات بھر۔ ساری رات تلاش کیا ہے بھیا۔ ملی تو اس کی لاش!"

"تمہارے خیال میں اسے کس نے مارا ....؟"

"نا معلوم بھیا، کوئی ڈائن لگے ہے۔ ہائے دیکھو اس کا بھی کلیجہ نکال کر کھا گئی ہے۔"

"ڈائن ...." میری سانس رکنے لگی۔

"تم خود دیکھ لو بھیا۔ پہلے بھی چار کا یہی حال ہوا ہے۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ میں نے پریشان نظروں سے ان کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں وہ خوفناک عورت جا گھسی تھی۔ کیا وہ ڈائن تھی۔ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جانے والی۔

"تم جمال گڑھی کے نا ہو کیا بھیا۔"

"نہیں .... میں تو مسافر ہوں۔"

"تبھی تو .... جمال گڑھی میں کوئی ڈائن گھس آئی ہے بھیا۔ چار بچوں کو مار چکی ہے جان سے ...."

"خدا کی پناہ۔ تمہیں ایک بات بتاؤں جنک رام۔"

"بتاؤ بھیا۔" اس نے انگوچھے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں صبح ہونے سے پہلے اس علاقے میں داخل ہوا تھا۔ بستی کے بارے میں کسی سے معلوم کرنا چاہتا تھا ...." میں نے جنک رام کو پوری کہانی سنائی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کونسے کھیتوں میں...........؟" اس نے اپنی لاٹھی مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور میں نے کھیتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ جنک رام لاٹھی ہلاتا جوش کے عالم میں چیختا کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ میری نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنک رام کھیتوں میں گھس گیا تھا۔ پھر اس کی دھاڑ سنائی دی۔ "رک جا سسری بھاگ کہاں رہی ہے۔ اری رک جا تیرا ستیاناس..........." پھر میں نے خوفناک لمبی عورت کو لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے دیکھا۔ جنک رام لاٹھی پکڑے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا پھر اس نے لاٹھی گھما کر پوری قوت سے عورت پر پھینکی عورت بال بال بچی تھی۔ جنک رام جوش غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ عورت اگر اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ یقیناً اسے ریزہ ریزہ کر دیتا۔ جنک رام اس کے پیچھے بھاگتا ہوا دور نکل گیا تھا اتنا دور کہ اب مجھے نظر بھی نہیں آرہا تھا البتہ بستی کی طرف سے بے شمار لوگ دوڑتے آرہے تھے۔ ہیرا لال سب سے آگے آگے تھا۔ کچھ دیر کے بعد بستی والے قریب آگئے اور کہرام مچ گیا۔ مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ایک آدمی جس کی حالت بہت خراب تھی آگے بڑھا لوگ اسے پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بچے کی لاش دیکھی اور غش کھا کر گر پڑا۔

"جنک رام کہاں گیا..........." ہیرا لال نے مجھ سے پوچھا مگر جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جنک رام جوش سے لاٹھی گھماتا ہوا واپس آرہا تھا وہ دوڑتا ہوا قریب پہنچ گیا۔

"پتہ چل گیا آج سب کچھ معلوم ہو گیا۔ بھیا سوگندھ آج ساری باتیں پتہ چل گئیں۔ ارے کہاں ہے وہ سسر انلسیا۔ کہاں چھپا ہے رے سامنے آ..........."

"نلسیا نے کیا کر دیا جنک رام۔" کسی نے پوچھا۔ "ڈائن پتہ چل گئی رمبھا چاچا۔ ڈائن پتہ چل گئی..........."

"کون ہے.......... کون ہے.......... کون ہے..........؟" بہت سی آوازیں ابھریں۔

"بھاگ بھری۔ ارے وہی سسری بھاگ بھری۔ خون سے رنگی ہوئی تھی کمینی۔ ارے آنکھوں سے دیکھ لیا اپنی۔"

"بھاگ بھری.......... باؤلی بھاگ بھری۔"

"بنی ہوئی باؤلی ہے بھیا آج دیکھ لیا آنکھوں سے۔ ارے جائے گی کہاں۔ کئی دیے بجھا دیئے ہیں اس نے۔ پوت کہاں چھپا ہوا ہے اسکا، ارے دیکھ لے اپنی میا کے کرتوت..........!" جنک رام کا سانس پھول رہا تھا.......... پھر اس نے لاش کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور ایک بار پھر دھاڑیں مارنے لگا!

"ارے بھیا، ہمارا چراغ بھاگ بھری نے بجھایا ہے، وہی ڈائن ہے بڑے بھیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی جنک رام.........."

"سب ڈھونڈ رہے تھے پرکاش کو۔ مسافر نے خبر دی۔ ہم نے لاش دیکھی ہیرا خبر کرنے گیا۔ مسافر دوسری بستی کا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے ڈائن کو کلیجہ چباتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کھیتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ارے ہم دوڑے کھیتوں میں وہاں چھپی ملی بھاگ بھری۔ ہمیں دیکھ کر نکل بھاگی۔ خون سے رنگی ہوئی تھی سسری۔ نکل گئی مگر جائے گی کہاں۔ ارے نا جانے دیں گے سسری کو..........!"

سب سکتے کے عالم میں سن رہے تھے اور میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ کیا ہے یہ سب کچھ۔ مگر کچھ تھا۔

کچھ تھا۔ مجھے یہاں بھیجا گیا تھا یقیناً اس کا کوئی مقصد ہو گا..........

میں نے اس عورت کو دیکھا صورت واقعی خوفناک تھی۔ میں نے خود اس کے چہرے پر خون کے دھبے دیکھے تھے مگر وہ ڈائن تھی اور پہلے بھی یہ بھیانک عمل کر چکی تھی بچپن میں جو باتیں کہانیوں کی شکل میں سنی تھیں، سب ہی تو سامنے آتی جا رہی تھیں نہ جانے مستقبل اور کیا کیا دکھائے گا۔

جنک رام رو رو کر ساری رام کہانی سنا رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا ایک بار پھر میں نے اس مظلوم بچے کی لاش کو بغور دیکھا اب صحیح اندازہ ہو رہا تھا لوگوں کا کہنا درست تھا اس کا اوپری جسم برہنہ تھا اور سینے کے مقام ہی سے کھلا ہوا تھا دوسری آلائش بکھری ہوئی تھی کلیجہ موجود نہیں تھا لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

"پر وہ گئی کہاں جنک رام..........؟"

"ارے بھیا کیا بتائیں مسافر نے کہا، کھیتوں میں چھپی ہے سسری ہم لٹھیا لے کر لپکے تو ہمیں دیکھ کر نکل بھاگی اور بھیا کیا تیز دوڑی مسافر سے پوچھ لو پیروں میں پنکھے بندھے ہوئے تھے ذرا سوچو، ڈائن نہ ہوتی تو اتنی تیز بھاگتی، ہم تو پیچھا ہی نہ کر پائے اور وہ یہ جا وہ جا کیسی بڑھیا بنی پھرتی تھی۔ ہرے رام ہرے رام ہمارے بھیا کے پوت کو کھا گئی ارے اب کچھ کرو بھیا کو اٹھا کر لے چلو دیکھو تو سہی کہیں دل کی دھڑکن بند تو نہیں ہو گئی ارے بھیا ہمارے بڑے بھیا ارے رگھبیر بھیا۔"

"ہاں ہاں چلو رے چادر بچھاؤ پرکاش کو اس میں ڈالو اب تو وہ اس سنسار سے چلا ہی گیا۔ ساری باتیں کر لو پرنت جسے جانا تھا وہ تو جا چکا۔"

بہت سے لوگ مل کر لاش کی آلائش سمیٹنے لگے اور اس کے بعد بچے کے جسم کو اٹھا کر چادر پر لٹا دیا گیا اور وہ اپنے عقیدے کے مطابق اشلوک پڑھ رہے تھے۔ چند لوگوں نے رگھبیر رام کو سنبھال کر ہاتھوں پر اٹھایا اور پھر یہ سارا قافلہ آبادی کی جانب چل پڑا تھا میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن بہت ہی کم باتیں سمجھ میں آرہی تھیں جمال گڑھی کا نام لیا جا چکا تھا اس لئے اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جس بستی کی جانب میں جا رہا ہوں، وہ جمال گڑھی ہی ہے جہاں جانے کی مجھے ہدایت کی گئی تھی۔ تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہی کام میرے سپرد کیا گیا ہے وہ تمام باتیں ذہن میں محفوظ تھیں جو بتائی گئی تھیں مجھ سے خود پر اعتماد کرنے کو کہا گیا تھا اور وہ عطیہ واپس لے لیا گیا تھا جو میرے لئے بڑی تقویت کا باعث تھا لیکن دل کو ایک اعتماد تھا وہ یہ کہ میری امداد سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ میں کونسا عالم تھا کہ ہر مرض کی دوا میرے پاس ہوتی، بس یہ تو ایک امتحانی منزل تھی جس سے بازو پکڑ کر گزارا جا رہا تھا دل میں یہی دعا تھی کہ اللہ مجھے اس منزل تک پہنچا دے جو میرے لئے متعین کی گئی ہے۔ بڑی ہمت اور بڑے صبر سے اپنے فرائض کی بجا آوری کر رہا تھا اور کہیں بھی سرکشی ذہن میں نہیں ابھری تھی اپنے یاد آتے تو زبان کو دانتوں میں دبا لیتا اپنے جسم کو نوچنے لگتا کہ یاد یں پیچھا چھوڑ دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بات ناگواری کی منزل میں پہنچ جائے اور ایک بار پھر مصائب کا شکار ہو جاؤں اپنے طور پر جس حد تک ممکن ہو رہا تھا ان ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔

بستی کا سفر انہی خیالات میں کٹ گیا میں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی جنک رام کے گھر کے دروازے پر پہنچا تھا اور اس کے بعد وہاں جو کچھ ہونے لگا تھا وہاں رکنا میرے لئے بے کار سی بات تھی۔ لوگ جنک رام کے گھر کے باہر جمع ہو گئے تھے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ان آوازوں میں عورتوں کا شور بھی تھا مردوں کی آوازیں بھی تھیں میں وہاں سے واپس پلٹا تقریباً ساری بستی

والوں کو اس واقعہ کی خبر ہوگئی تھی کوئی اپنے کام پر نہیں گیا تھا سب کے سب جنک رام کے دروازے پر
ہوگئے تھے میں نے ایک شخص کو روکا تو وہ فوراً ہی رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"تم مسافر ہونا بھیا.........؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بھائی یہ بستی جمال گڑھی ہی ہے نا.........؟"

"ہاں بھیا یہی ہے۔"

"یہاں کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے جہاں میں کچھ وقت قیام کر سکوں۔"

"دھرم شالہ موجود ہے پنڈت رام نارائن کے پاس چلے جاؤ ارے ہاں یہ تو بتاؤ ہندو ہو یا مسلمان.........؟"

"مسلمان ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر مسجد میں چلے جاؤ یا سنو وہ سیدھے ہاتھ جا کر جب الٹے ہاتھ مڑو گے تو تلسیا کا گھر نظر آئے گا تمہیں......... اللہ دین بھٹیارے کی سرائے اسی کے سامنے ہے وہاں تمہیں رہنے کی جگہ مل جائے گی۔ مسجد تو ابھی نامکمل ہے دوبارہ بن رہی ہے سارا سامان پڑا ہوا ہے وہاں کہاں ٹھہرو گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے جواب دیا اور اس شخص کے بتائے ہوئے پتے پر چل پڑا۔ اللہ دین بھٹیارے کی سرائے شاید اس بستی کی واحد سرائے تھی کچا احاطہ بنا ہوا تھا اور اس میں کچھ کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک سمت تندور لگا ہوا تھا جس کے کنارے بنی ہوئی بھٹیوں میں آگ سلگ رہی تھی مگر کوئی موجود نہیں تھا البتہ زیادہ دیر نہیں گزری کہ دس بارہ سال کے ایک لڑکے نے اندر سے گردن نکال کر جھانکا اور پھر اندر واپس گھس گیا۔ میں نے زور زور سے آوازیں دیں۔ تو ایک درمیانی عمر کی عورت باہر نکل آئی موٹی تازی تھی شلوار قمیض پہنے دوپٹہ اوڑھے ہوئے مسلمان عورت معلوم ہوتی تھی میں نے اسے سلام کیا تو وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "کیا بات ہے؟"

"اللہ دین بھٹیارے کی سرائے یہی ہے نا؟"

"ہاں یہی ہے مگر تو کون ہے بھیا؟"۔

"اللہ دین کہاں ہے؟"۔

"ارے بس نکل کھڑا ہے تماشا دیکھنے کے لئے ساری ہنڈیا جلا کر خاک کر دی پورا کا پورا تین سیر گوشت تھا......... مگر تو کون ہے بھیا؟"۔

"مسافر ہوں بہن اس سرائے میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے کلو او......... کلو تیرا ستیاناس کہاں مر گیا ارے باہر نکل۔"

"اماں تو نے ہی تو منع کر دیا تھا کہ باہر نہ نکلوں ڈائن کھا جائے گی۔" لڑکے نے کہا۔

"ارے ڈائن کے پلے باہر آ، دیکھ مسافر آیا ہے۔" عورت نے کہا اور وہی لڑکا جو مجھے جھانک کر اندر گھس گیا تھا، باہر نکل آیا۔

"جا ابا کو بلا کر لا، کہہ دے تماشا ختم ہوگیا مسافر آیا ہے اور وہ باہر مستا رہا ہے ارے بھیا مجھ سے بات کرو میں اللہ دین کی گھر والی ہوں۔"

"مجھے یہاں رہنے کیلئے جگہ مل سکتی ہے؟"

"لو بھیا پورے کے پورے چار کمرے خالی پڑے ہیں جس میں جی چاہے ٹھہر جاؤ مگر ڈیڑھ روپے روز

ہر کمرے میں ٹھہرنے کا اور کھانے پینے کے پیسے الگ صبح کی چائے دو آنے کی جب بھی چائے پیو گے آنے دینے پڑیں گے دوپہر کو کھانا کھاؤ گے تو دس آنے الگ ہونگے رات کو کھاؤ گے تو بھی دس آنے لگیں گے۔ سوچ لو منظور ہو تو ٹھیک ہے۔"

میری جیب میں چار روپے موجود تھے جو مجھے وظیفے کے طور پر عطا کئے گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر یہ دیکھے اور تین روپے نکال کر خاتون کو دے دیئے۔

"یہ دو دن کا کرایہ رکھ لیجئے کھانا کھاؤں گا تو اس کے پیسے الگ دوں گا۔"

"آؤ بھیا کوٹھا دکھا دیں تمہیں۔" عورت نے کہا جو کوٹھا مجھے دکھایا وہ بھی کچی مٹی کا ہی بنا ہوا تھا اوپر پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا مٹی میں تین روشندان نکالے گئے تھے جن سے کمرہ خوب روشن ہوگیا تھا ایک طرف بانوں سے بنی ہوئی چارپائی پڑی تھی دوسری جانب ایک گھڑونچی جس پر مٹکا پانی نکالنے کا ڈونگا اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ یہ تھی کل کائنات اس کمرے کی......... میرے لئے بھلا اعتراض کی کیا بات ہو سکتی تھی میں نے فوراً ہی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ عورت کہنے لگی۔ "ہم دری بچھائے دے رہے ہیں تکیہ اور کھیس بھی مل جائے گا ہمارے ہی ہاں ہے۔ یہ کمرے کے کرائے میں ہوگا۔ اب بتاؤ ناشتہ کرو گے.........؟"

"نہیں بہن......... ہاں ایک پیالی چائے اگر مل جائے۔"

"چار پیالی پی لو اٹھنی نکال لو۔" عورت نے کھرے کاروباری لہجے میں کہا اور میں نے ہنستے ہوئے اسے مزید چار آنے دیدیئے اور بارہ آنے واپس لے لئے اس میں رات کا کھانا کھایا جا سکتا تھا دن کا اللہ مالک ہے۔ غرض یہ کہ مجھے جمال گڑھی میں ایک عمدہ قیام گاہ مل گئی اور کچھ دیر کے بعد چائے بھی.........

میں چائے پی رہا تھا کہ ایک دبلے پتلے آدمی نے جو کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور سر پر کپڑے کی ٹوپی لگائی ہوئی تھی، اندر جھانکا، سلام کیا تو میں نے اسے سلام کا جواب دیا اور وہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

"تم وہی مسافر ہونا بھیا جی جس نے ڈائن کو بے چارے پرکاش کا کلیجہ چباتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ہاں میں وہی گنہگار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بھیا تم ہماری سرائے میں ٹھہرے ہو۔"

"تمہارا نام اللہ دین ہے۔"

"ہاں بھیا......... اپنی ہی سرائے ہے یہ بڑا اچھا ہوا تم یہاں آگئے ہماری گھر والی نے ہمیں بتایا تو ہم سمجھ گئے کہ تم ہی ہو سکتے ہو اور بڑی اچھی بات ہے کہ مسلمان ہو بھیا ذرا ہمیں پورا واقعہ تو بتاؤ۔" وہ بڑے اطمینان سے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"بہت افسوسناک واقعہ ہے اللہ دین اب کیا بتاؤں میں تمہیں جو کچھ تم نے باہر سے سنا بس اتنا ہی ہے۔"

"اری زبیدہ او......... زبیدہ اری اندر آ میں نے کہا تھا تجھ سے وہی مسافر بھیا ہیں جنہوں نے ڈائن کو دیکھا ہے۔" اللہ دین نے بیگم صاحبہ کو بھی طلب کر لیا اور بیگم صاحبہ دوڑتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"اری......... اری......... میرے اوپر نہ گر پڑیو۔" اللہ دین ایک طرف کھسکتا ہوا بولا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیگم اللہ دین کے مقابلے میں وہ بہت کمزور تھا بیگم صاحبہ ہانپتے ہوئے کہنے لگیں۔

"یہی ہیں......... وہی ہیں.........؟"۔

"تو اور کیا......... میں نے کہا تھا تجھ سے کہ بستی میں ایک ہی مسافر داخل ہوا ہے ہو سکتا ہے یہ وہی

مسافر بھیا ہوں۔ " محترمہ بھی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ "بھیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو یقین نہ آوے ہے ہمیں۔ "

"اری چھوڑ، یقین نہ آوے ہے تجھے بستی والے مار مار کر بھرکس نکال دیں گے تیرا سب غصے پر بھرے ہوئے ہیں اب بے چارے تلسیا کی شامت آ گئی۔ " بھٹیارے نے کہا میں ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا میں نے کہا۔ "مگر یہ بھاگ بھری ہے کون ....؟"۔

"ارے بھیا پہلے تم ہمیں قصہ تو سناؤ بعد میں بتا دیں گے بھاگ بھری کون ہے۔ " اللہ دین نے کہا۔

"قصہ بس یہ تھا بھائی اللہ دین کہ میں ایک دوسری بستی سے آ رہا تھا تمہاری جمال گڑھی میں کھیتوں کے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے میں نے اس عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا اس کی پشت میری جانب تھی اس لئے میں نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا کر رہی ہے میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی مجھے دیکھ کر زور سے چیخ ماری اور بھاگ کر کھیتوں میں جا گھسی اس کے بعد دوسرے لوگ آ گئے؟" میں نے باقی واقعات ان لوگوں کو سنائے اور اللہ دین دونوں کانوں کو ہاتھوں کی قینچی بنا کر چھونے لگا اور گالوں پر درمیانی انگلیاں مارنے لگا جبکہ بیگم اللہ دین کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"اللہ بچائے رکھے میرے کلو کو .... اے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ڈائن بستی ہی میں کوئی ہے بھلا باہر سے کہاں سے آئے گی۔ " مسز اللہ دین نے کہا اور میں ان دونوں کی احمقانہ حرکتیں دیکھتا رہا دونوں ہی سیدھے سادھے معصوم دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔

"اب آپ لوگ مجھے اس ڈائن کے بارے میں بتائیں۔ "

"ارے بھیا اللہ جانے کیا ہو گیا وہ پگلی تو تھی، جانے ڈائن کیسے بن گئی ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ سارا جیون ہمارے سامنے گزرا ہے بھاگ بھری کا میرے سامنے بیاہ کر آئی تھی رتن لال کے ہاں سارے کام یہیں کے یہیں ہو گئے ہے رے تقدیر۔ "

"تمہارے سامنے بیاہ کر آئی تھی وہ یہاں؟"

"ہاں مسافر بھیا سامنے کا گھر ہی تو ہے رتن لال کا بھرا پرا گھر تھا ہم جی چھوٹے ہی سے تھے رتن بھیا سے بچپن ہی سے یاد اللہ تھی۔ بھلا آدمی تھا بے چارہ کام سے کام رکھنے والا شادی ہوئی تھی اس کی گونا پور میں، بھاگ بھری بے چاری وہیں کی تھی ایک بہت ہی غریب آدمی کی بیٹی جس نے پتہ نہیں جیسے تیسے کر کے اپنی بیٹیا کی شادی کری تھی۔ بھاگ بھری رتن لال کے گھر آ گئی۔ رتن لال بے چارہ خود بھی غریب آدمی تھا بس محنت مزدوری کرتا تھا اور زندگی گزارتا تھا پر ٹھیک ٹھاک زندگی چل رہی تھی ان کے بیٹے ہوئے تے ایک ایک کر کے تین رتن لال کے ہاں اور پل بڑھ رہے تھے بھاگ بھری کو سب ہی اچھا کہتے تھے۔ ہماری اماں تو اسے بہت ہی پسند کرتی تھیں۔ ہماری شادی میں بھی اس نے گھر کے سارے کام کاج کرے تھے بھیا۔ بہت اچھی تھی وہ اللہ جانے کس کی نظر کھا گئی بے چاری کو بڑا بیٹا کوئی آٹھ سال کا ہو گا، چھوٹا کوئی چھ سال اور اس سے چھوٹا کوئی تین سال کا .... رتن لال کام پر گیا ہوا تھا تینوں بچے نکل گئے پوکھر پر بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر پوکھر میں گھس گئے بس بھیا وہیں سے کام خراب ہو گیا بھینس پوکھر میں بیٹھ گئی بچے جو اس کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے تھے، پوکھر ہی میں ڈوب مرے وہ تو رمضان گھسیارے نے دور سے بچوں کو بھینس کی پیٹھ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا مگر تیرنا وہ بھی نہیں جانتا تھا دوڑا دوڑا بستی آیا۔ گھر

خبر دی پھر رتن لال کو بتایا پوری بستی ہی پہنچ گئی تھی پوکھر پر............ رتن لال کے تینوں پوت پوکھر میں ڈوب گئے تھے۔ معمولی بات تو نہیں تھی رتن لال پاگل ہو گیا کھٹ سے چھلانگ لگا دی پوکھر میں اور بھیا پوکھر میں چھ کنوئیں ہیں دیکھا تو کسی نے ناہیں البتہ پرکھے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ بارہ سال کے بعد بھینٹ لیتے ہیں یہ کنوئیں اور کوئی نہ کوئی ڈوب ہی جائے ہے بارہ سال پورے ہو چکے تھے بھینٹ لے لی مگر اس بار تین بچوں کی بھینٹ لی تھی ان سسرے کنوؤں نے اور جو تھا رتن لال نیچے گیا تو واپس اوپر نہ آیا بھلا کس کی مجال تھی کہ پوکھر میں گھس کر رتن لال اور اس کے بچوں کی لاشوں کو تلاش کرتا وہیں کے وہیں دفن ہو کر رہ گئے۔ بچارے تین بیٹے اور ایک باپ۔ تم خود سوچ لو مسافر بھیا کیا بیتی ہوگی ماں پر اس بیچ بے چارہ تلسی بھی آ چکا تھا تلسی اصل میں بھاگ بھری کا چھوٹا بھائی تھا جب گونا پور میں اس کے پتاجی مر گئے تو رتن لال خود جا کر تلسیا کو اپنے ساتھ لے آیا اور اپنے بچوں ہی کی طرح پالنے پوسنے لگا اسے .... تلسیا یہیں رہتا تھا اور بھاگ بھری کو بس اسی کا سہارا مل گیا تھا تینوں بچے اور پتی کے مر جانے کے بعد بھلا ہوش و حواس کیسے قائم رکھتی۔ سر پھوڑ لیا اپنا اور اس کے بعد پاگل ہو گئی سر میں چوٹ لگ گئی تھی۔ بھیا غریب غرباء کی بستی ہے کون کس کو سہارا دے سکے ہے لوگوں نے کہا کہ اس کا علاج ہو سکتا ہے دماغ ٹھیک ہو جائے گا مگر غریبوں کے لئے تو پیٹ بھرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے دوا دارو کہاں سے کریں۔ بے چارہ تلسیا محنت مزدوری کرتا ہے بستی بھر کی چاکری کر کے جو چار روٹی کما لے ہے اس سے پاگل بہن کا پیٹ بھرتا تھا اور اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ سنسار میں اس کا بھی کوئی نہیں ہے اپنی اس پگلی بہن کے سوا بھاگ بھری پوری بستی میں بھاگتی پھرتی ہے۔ کبھی بچے اس کا پیچھا کر لیں تو انہیں پتھر مار دیتی تھی بس اس سے زیادہ اس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا مگر بھیا پھر یہ ہوا کہ سب سے پہلا چھوکرا رام لال کا تھا جو بے چارہ ڈائن کا شکار ہوا۔ رات کا وقت تھا مغرب کی اذان ہوئی ہوگی تیل لینے باہر نکلا تھا غائب ہو گیا۔ بے چارہ رام لال ایک ایک سے پوچھتا پھرا کہ کسی نے اس کے چھورا کو تو نہیں دیکھا۔ کسی نے نہ بتایا صبح کو بھیا ہریا کے کھیت کی مینڈھ پر رام لال کے چھوکرے کی لاش ملی ساری چھاتی اُدھیڑ کر رکھ دی تھی کسی نے، سب یہی سمجھے کہ بگھرا لگ گیا کبھی کبھی بھیا بستی کے آس پاس جنگلوں سے بگھرا نکل آوے ہے اور اگر انسانی خون کا لاگو ہو جاوے تو پھر گھروں سے بچے اٹھا لے جائے ہے چرواہوں کی بکریوں کو مار ڈالے ہے بچوں کو لے جا کر کھا پی کر برابر کر دیوے ہے پہرہ دینا پڑے ہے ایسے دنوں میں چار پانچ بگھرے مارے جا چکے ہیں اس طرح سب ہی یہی سمجھے کہ بگھرا لگ گیا رام لال کا گھر تو لٹ ہی گیا تھا راتوں کو پہرے ہونے لگے لوگ لٹھیا لے کر رات بھر اپنے اپنے حساب سے بستی کے چاروں طرف پہرہ دیا کرتے تھے لیکن کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد ہی دوسرا واقعہ بھی ہو گیا اور اس بار منشی امام دین کا بیٹا بگھرے کے ہاتھ لگا تھا لوگوں نے دیکھا کہ اس کا بھی کلیجہ نکال لیا گیا تھا پھر دھنو نے بتایا کہ یہ کام بگھرے کا نہیں ہے کیونکہ بگھرا کسی گھر میں نہیں گھسا تھا چرواہوں کی بکریوں کو اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا کہیں اس کے پنجوں کے نشان نہیں ملے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے تو پتہ چلتا جہاں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں پر بھی بگھرے کے پیروں کے نشان نہ ملتے تھے اور پہلے کبھی ایسا ہوا تھا جگہ جگہ بگھرے کے پیروں کے نشانات دیکھے گئے پھر جب تیسری لاش ملی تو دھنو نے آخری بات کہہ دی کہ یہ کام کسی ڈائن کا ہے جو بچوں کے کلیجے نکال کر چبا جاتی ہے بھیا جمال گڑھی والوں کو پہلے کبھی کسی ڈائن کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ خوف پھیل گیا پوری بستی میں لوگ کام دھندے

چھوڑ کر ڈائن کی تلاش میں لگ گئے بھاگ بھری کی طرف تو کسی کا خیال بھی نہیں گیا تھا۔ کسی کو کیا پتہ تو کہ وہ بھاگ بھری نہیں بھاگ جلی ہے اور وہی ڈائن بن گئی ہے۔ بستی کی پگلی کہلاتی تھی۔ کسی نے دیدی تو کھالی کسی نے کپڑے پہنا دیئے تو پہن لئے ورنہ اسے اپنا ہوش کدھر تھا۔ بے چارہ نسیا تو بہن کو سنبھالے پھرتا تھا ادھر چاکری کرتا تھا ادھر بہن کی تیمارداری پر بھیا یہ تو بڑا ہی غضب تھا چوتھا بچہ اس کا شکار ہو گیا............ اور جمال گڑھی میں ان دنوں بھیا بس یوں سمجھ لو شام ڈھلی ہو گیا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کئے دن میں سونا شروع کر دیا گیا اور راتوں میں جاگنا مگر نظر نہیں آئی۔ کیا پتہ تھا کسی کو کہ بھاگ بھری ڈائن ہو گی۔ بے چارے رگھبیر رام کا بیٹا پرکاش بھی ہی کو کھویا تھا اور چاروں طرف ڈھونڈ مچی ہوئی تھی۔ سب ڈھنڈیا کر رہے تھے۔ سارے بستی والے لاٹھیاں سنبھالے رات بھر ادھر سے اُدھر پھرتے رہے اور اب صبح کو اس کی لاش مل گئی مگر تم نے بستی والوں کو کہ ڈائن کون ہے ارے بھیا ہاتھ نہیں لگی وہ جنک رام کے............ جنگ رام بھی بڑا ہے اگر مل جاتی کہیں بھاگ بھری تو لٹھیا مار مار کر جان نکال لیتا اس کی بڑا پریم کرتا تھا اپنے بھتیجے ....اور رہتا بھی تو رگھبیر رام کے ساتھ ہی تھا رگھبیر رام بے چارے کا بھی اکیلا ہی بیٹا تھا پرکاش ہوا مگر اب............ اب سمجھ میں نہ آوے آگے کیا ہو گا یہ تو پتہ چل گیا کہ بھاگ بھری ڈائن ہو گئی ہے نہیں کیوں ہم نے تو پہلے کچھ سنا بھی نہیں۔" میں خاموشی سے یہ کہانی سنتا رہا بڑی دردناک کہانی تھی لمحے کے لئے یہ احساس بھی دل سے گزرا کہ کہیں میرا انکشاف غلط تو نہیں ہے اور ایک انسان بلکہ دو انسان میرے اس انکشاف کا شکار ہو جائیں گے خدا نہ کرے ایسا ہو، خدا کرے جو کچھ میں نے دیکھا ہے نکلے یہاں کسی خبیث روح کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ایک انسان ہی کا معاملہ تھا پتہ نہیں اب کیا ہو گا بھٹیارے اللہ دین نے یہ کہانی سنائی مجھے خاص نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اللہ دین واپس آیا اور ایک روپیہ میرے حوالے کر گیا۔ کہنے لگا۔ "بھیا ڈیڑھ روپے روز کا کوٹھا ملا ہے تمہیں نے اٹھنی کی رعایت کر دی ہے۔ اب ایک روپے روز پر تم یہاں رہ سکتے ہو دیکھو بھیا ہمارے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے مجبوری ہے ورنہ تم سے کچھ نہ لیتے۔"

"نہیں اللہ دین تمہارا شکریہ کہ تم نے رعایت کر دی میرے ساتھ اب کھانا کھلوا دو۔"

دوپہر کا کھانا جو دال روٹی پر مشتمل تھا، کھا کر فراغت حاصل کی تھی کہ شور شرابہ سنائی دیا باہر نکل کر دیکھا تو بہت سے لوگ سامنے کے گھر پر جمع تھے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ یہ گھر تلسی یا بستی والے کہتے تھے، کا ہے شاید بھاگ بھری واپس آئی تھی اور پکڑی گئی تھی اللہ دین اور زبیدہ بیگم بھی باہر نکل آئے پتہ یہ چلا کہ جنک رام اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا تھا اور تلسی کو پکڑ کر لے گیا ہے۔

"یہ تو نا انصافی ہے اللہ دین، جنک رام تلسی کو کیوں پکڑ کر لے گیا؟"

"بھیا خون سوار ہے جنک رام پر بھی، بھتیجا مر گیا ہے کریا کرم کر کے لوٹے تھے بے چارہ تلسی مل گیا لے گئے اسے پکڑ کے............۔"

"اب وہ کیا کریں گے اس کا............؟۔"

"اللہ جانے............ تم بیٹھو میں معلوم کر کے آؤں۔"

"میں بھی چلوں؟"

"مرضی ہے تمہاری چلنا چاہو تو چلو۔"

"نا بھیا مسافر تمہاری بڑی مہربانی ہو گی یہیں پر ٹک جاؤ میری تو جان نکلی جاوے ہے ارے کہیں بھاگ بھری میرے ہی گھر میں نہ گھس آئے۔ اللہ میرے کلو کو اپنی امان میں رکھے۔" کلو، اللہ دین اور زبیدہ بیگم کی واحد اولاد تھا۔

وقت گزرتا رہا میں سرائے کے کوٹھے میں آرام کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے جمال گڑھی آنے کی ہدایت کیا اسی سلسلے میں کی گئی ہے اور اگر یہی بات ہے تو میرا کیا عمل ہونا چاہئے یہ تو بالکل ہی الگ سا واقعہ ہو گیا ایک زندہ عورت انسانی خون کی لاگو ہو گئی تھی میں اس کے خلاف کیا کر سکوں گا کوئی بھوت پریت کا معاملہ تو تھا نہیں۔ شام کے تقریباً ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ باہر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی نے میرے اس کوٹھے یا کمرے کی کنڈی بجائی باہر نکلا تو بیگم اللہ دین کھڑی ہوئی تھیں چہرے پر خوف کے آثار تھے کہنے لگیں۔ "مسافر بھیا ٹھاکر جی کے آدمی آئے ہیں تمہیں بلانے کیلئے، باہر کھڑے ہوئے ہیں۔"

"کون ٹھاکر جی............؟۔"

"ارے اپنی بستی کے مکھیا ہیں کوہلی رام مہاراج۔" زبیدہ بیگم نے بتایا، میں نے جلدی سے جوتے وغیرہ پہنے باہر نکل آیا دو آدمی کھڑے ہوئے تھے کہنے لگے۔ "بھائی صاحب آپ کو ٹھاکر جی نے بلایا ہے بھاگ بھری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے۔"

"اچھا اچھا چلو چل رہا ہوں............۔" اللہ دین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا واقعی مست مولا آدمی تھا۔ گھر کی کوئی پروا نہیں تھی اسے............ زبیدہ بیگم نے میرے باہر نکلتے ہی دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا میں ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور جمال گڑھی کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک بڑے سے گھر کے سامنے رکا جو لال رنگ کی اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور یقیناً یہی کوہلی رام جی کا گھر تھا۔ بڑے سے گھر کے سامنے جمال گڑھی کے سینکڑوں افراد جمع تھے ہر ایک اپنی اپنی کہہ رہا تھا دونوں آدمی میرے لئے ان کے درمیان راستہ بنانے لگے اور میں گھر کے سامنے پہنچ گیا بڑی سی پتھر کی چوکی بنی ہوئی تھی۔ جس پر مکھیا جی بیٹھے ہوئے تھے صورت ہی سے مغرور آدمی نظر آتا تھا دوسرے تخت کے نیچے ہی کھڑے ہوئے تھے بائیں طرف ایک مفلوک الحال نوجوان نظر آیا جسے رسی سے کس دیا تھا اس کا رخسار نیلا پڑا ہوا تھا ایک آنکھ بھی نیلی ہو رہی تھی ہونٹ سوجھے ہوئے تھے پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ اسے بہت مارا گیا ہے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ تلسی یا ان لوگوں کی زبان میں تلسیا تھا قابل رحم اور شریف معلوم ہوتا تھا۔

"سلام کرو ٹھاکر جی کو۔" مجھے لانے والوں نے کہا میں نے سرد نظروں نے ان دونوں کو دیکھا پھر ٹھاکر کو جو مجھے دیکھتے ہوئے بائیں مونچھ پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

"ٹھاکر جی............ یہ مسافر ہیں۔" مجھے لانے والے دوسرے آدمی نے کہا۔

"کہاں سے آئے ہو............؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"بہت دور سے۔"

"جگہ کا نام تو ہو گا۔"
"ہاں ہے مگر بتانا ضروری نہیں ہے۔"
"ارے.......... ارے ٹھاکر جی پوچھ رہے ہیں بتاؤ۔" انہی دونوں میں سے ایک نے سرگوشی کی۔
"تم بکواس بند نہیں رکھ سکتے۔" میں نے غرا کر کہا اور وہ شخص بغلیں جھانکنے لگا۔
"داروغہ لگے ہو کہیں کے کوئی نام تو ہو گا تمہارا.......... ۔" ٹھاکر نے کہا۔
"تم نے مجھے میرے بارے میں پوچھنے کے لئے بلایا تھا، ٹھاکر..........؟۔"
"پوچھ لیا تو کیا برائی ہے۔"
"بس مسافر ہوں اتنا کافی ہے اصل بات کرو۔"
"کہاں ٹھہرا ہے یہ۔" ٹھاکر نے دوسرے لوگوں سے پوچھا۔
"اللہ دین کی سرائے میں۔"
"ہوں مسلمان ہے۔" ٹھاکر نے دوسری مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ "کیا دیکھا بھئی تو نے؟۔"
"ان لوگوں نے تمہیں بتا دیا ہو گا۔" مجھے اس شخص پر غصہ آ گیا تھا۔
"تو بتا۔"
"بس اتنا دیکھا تھا کہ وہ عورت لاش کے پاس بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور چیخ مار کر بھاگی پھر کھیتوں میں جا گھسی بعد میں جنک رام نے اسے وہیں دیکھا تھا۔"
"وہ لڑکے کا کلیجہ چبا رہی تھی؟" ٹھاکر نے پوچھا۔
"یہ میں نے نہیں دیکھا اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔"
"ٹھاکر جی اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے منہ پر بھی خون لگا ہوا تھا۔" جنک رام نے کہا جب میں نے اسے دیکھا وہ بھی مجمع میں موجود تھا۔
"چلو مان لیا میں نے بھاگ بھری ڈائن بن گئی ہے مگر تلسی کا اس میں کیا دوش ہے؟"
"یہ اس کا بھائی ہے۔" ہیرا بولا۔
"ارے تو یہ تو نہیں کہتا اس سے کچھ۔ اس بیچارے کو تم نے کیوں مارا۔" ٹھاکر بولا۔
"اس سے کہو ٹھاکر تلاش کر کے لائے اپنی بہن کو اسے پکڑ کر لائے بستی والوں کے سامنے۔" جنک رام بولا۔
"اور تم سب چوڑیاں پہن کر گھروں میں جا گھسو۔" ٹھاکر آنکھیں نکال کر بولا۔
"ہمارے دل میں جو چتا سلگ رہی ہے ٹھاکر.......... تم اسے نہیں دیکھ رہے۔" جنک رام بولا۔
"سب کچھ دیکھ رہا ہوں بہت کچھ خبر ہے مجھے دل کا حال بھی جانتا ہوں مگر یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سب مل کر ڈھونڈو اسے یہ بھی ڈھونڈے گا تمہارے بیچ میں کچھ نہیں بولے گا کھولو اسے اور خبردار اس کے بعد کسی نے اسے ہاتھ لگایا ارے مادھو کھول دے اسے۔" ایک دبلا پتلا آدمی تلسی کے بدن سے رسی کھولنے لگا۔ "اور تم جاؤ داروغہ جی بس پوچھ لیا ہم نے تم سے۔" اس بار ٹھاکر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے نوکر مادھو سے بولا۔ "اسے اندر لے جا ہلدی چونا لگا دے مار مار کر حلیہ بگاڑ د

ے کا.......... اے شکل کیا دیکھ رہا ہے میری لے جا اندر۔" آخر میں ٹھاکر جی نے کڑک کر مادھو
ہا اور مادھو تلسی کا ہاتھ پکڑ کر اندر جانے کے لئے مڑ گیا ٹھاکر صاحب دوسروں سے بولے۔
"جاؤ بھائیو گھروں کو جاؤ پہلے بھی برا ہوا تھا اب بھی برا ہوا ہے مگر بات ایسے کیسے بنے گی۔ گدھے پر
نہیں چلا گدھیا کے کان اینٹھے۔ اب تو ڈائن کا پتہ بھی چل گیا بھاگ بھری کو پکڑ لو مگر سنو جو میں کہہ رہا
ہوں سنو۔ میں کھیا ہوں جمال گڑھی کا خود فیصلہ مت کر بیٹھنا پولیس بلوا لوں گا بھاگ بھری مل جائے تو
باندھ کر میرے پاس لے آنا سسری کو۔"
لوگ منتشر ہونے لگے۔ میں بھی پلٹ پڑا تھوڑی دور چلا تھا کہ اللہ دین میرے قریب آ گیا۔ "خوب
رے بھیا مسافر تم ہماری جمال گڑھی میں کھیل ہی نیارے ہو گئے۔"
"ارے تم اللہ دین کہاں غائب ہو گئے تھے۔"
"ارے بس مسافر بھیا۔ بہتیرے کام تھے رگھبیر رام کے بیٹے کے کریا کرم میں شمشان گئے تھے پھر بے چارے تلسیا کی گھڑنت دیکھتے رہے ٹھاکر کے آدمی نہ پہنچ جاتے تو جنک رام اس کا بھی کریا کرم کر دیتا بڑا لٹھیت ہے وہ۔"
"تلسی کو مارنا تو غلط تھا۔" میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"وہ تو ہے پر جنک رام پر تو خون سوار ہے۔"
"میرے خیال میں بری بات تھی۔ تمہارا یہ کھیا عجیب نہیں ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ اسی نے تلسی کو پڑا یا ہو گا۔"
"ارے وہ مسافر بھیا تم نے تو اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔" اللہ دین نے قہقہہ لگایا۔ "منہ دیکھا رہ گیا تمہارا۔"
"متعصب آدمی معلوم ہوتا ہے عجیب سے انداز میں کہہ رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔"
"نا مسافر بھیا نا.......... آدمی برا نہیں ہے اصل بات بتاؤں۔"
"کیا۔"
"ذات کا ٹھاکر نہیں ہے بنا ہوا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"اہیر ہے ہرنام پور کا۔ ٹھکرائن گیتا نندی کا من بھایا تھا انہوں نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لی ان سے.......... ہرنام پور کے ٹھاکر سدھا نندی نے دولت جائیداد دے کر دور جمال گڑھی پھنکوا دیا یہاں ٹھاکر بلایا اپنے آپ کھیا بن گیا۔ دولت کے آگے کون بولے سب نے کھیا مان لیا لوگوں کے کام آ جاوے ہے ن خون کھرا ہے اس لئے سوچے ہے سب سلام کریں سر جھکائیں اور کوئی بات نہیں ہے۔"
"اور کوئی سر نہیں جھکائے تو۔؟"
"خود جھک جائے ہے۔ سب کو پتہ چل گیا ہے کیسا آدمی ہے اس لئے لوگ اس کا مان رکھ لیں ہیں۔"
"دلچسپ بات ہے۔ اب ہو گا کیا؟"
"یہ تو مولا ہی جانے ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بھاگ بھری پاگل تو ہے مگر.......... ! مولا جانے

ایسی کیوں ہوگئی۔ چھوڑیں گے نا یہ لوگ اسے سسری بستی سے بھاگ ہی جائے تو اچھا ہے۔ " اللہ دین نے دکھی لہجے میں کہا۔ سرائے آگئی تھی۔

"زبیدہ بہن کھانا پکایا ہے کیا؟"

"ہاں مونگ کی دال میں پالک ڈالا ہے۔ مگر پیسے نہیں دیئے تھے تم نے۔ "

"اری خدا کی بندی۔ اری خدا کی بندی۔ کچھ تو آنکھ کی شرم رکھا کر!"

"لو گھوڑا گھاس سے یاری کرے تو کھائے کیا۔ "

"بہن ٹھیک کہہ رہی ہیں اللہ دین بھائی۔ آپ نے ویسے ہی میرے ساتھ رعایت کرادی ہے۔ پیسے بہن۔ " میں نے مطلوبہ پیسے دیدیئے بلکہ باقی پیسے بھی دیدیئے اور کہا کہ کل مزید پیسے دوں گا۔ ورنہ یہاں سے چلا جاؤں گا۔

رات ہوگئی۔ چاروں طرف سناٹا پھیل گیا۔ باہر مٹی کے تیل کا اسٹریٹ لیمپ روشن تھا جس کی روشنی ایک کھڑکی کے شیشے سے چھن کر آرہی تھی میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حکم ملا تھا جمال گڑھی جاؤں وہاں سے بلاوا ہے۔ آگیا تھا۔ واقعہ بھی میرے ہمرکاب تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہئے نہ جانے کتنا وقت انہی سوچوں میں گزر گیا پھر ذہن نے فیصلہ کیا اور اٹھ گیا۔ مٹکے میں پانی موجود تھا لوٹا بھی تھا۔ بے آواز عمل کرنے لگا تاکہ اللہ دین کو پریشانی نہ ہو۔ وضو کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ بری طرح اچھل پڑا۔ "لینا پکڑنا۔ جانے نہ پائے۔ پکڑو۔ " کی بھیانک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بے اختیار باہر لپکا اور دوازہ کھول کر نکل آیا۔ دس پندرہ افراد پتھراؤ کر رہے تھے کوئی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ غور سے دیکھا تو ایک دلدوز منظر نظر آیا۔ وہی عورت بھاگ بھری تلسی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ تلسی شاید اسے بچانے کے لئے اس کے اوپر گر پڑا تھا اور پتھر کھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں بازوؤں میں چھپا رکھا تھا اور پتھر اس کے بدن پر پڑ رہے تھے۔ پورا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ کیا کرتا۔ اچانک تلسی اچھل کر دور جا گرا۔ بھاگ بھری نے اسے اچھال دیا تھا۔ پھر اس نے بھیانک چیخ ماری اس کا چہرہ اور سر کے بال خون سے رنگین ہو رہے تھے اور اتنی بھیانک لگ رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے ایک دوسری منمناتی ہوئی چیخ ماری اور پتھراؤ کرنے والوں کی طرف لپکی سارے کے سارے سورما اس طرح پلٹ کر بھاگے کہ ہنسی آجائے۔ دس بارہ تھے مگر سب جی چھوڑ بھاگے۔ بھاگ بھری نے دو تین لمبی لمبی چھلانگیں ماریں اور پھر ایک طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا میرے پیچھے اللہ دین آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہو گیا کیا ہوا مسافر بھیا؟"

"شاید بھاگ بھری آئی تھی۔ "

"پھر............ "

"لوگوں نے اسے پتھر مارے جب وہ ان پر دوڑی تو وہ بھی بھاگ گئے اور بھاگ بھری بھی غائب ہوگئی۔"

"ارے۔ وہ تلسی ہے اسے کیا ہو گیا۔ تلسی ارے او تلسیا؟"

"ٹھور مار دئی بھیا سب ری دئی توڑ دئی ہمار۔ ہائے رام۔ " تلسی رونے اور کراہنے لگا۔ اللہ دین اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ارے ارے یہ پتھر، کیا انہوں نے پتھر مارے ہیں تجھے بھی؟" اللہ دین نے اتنا ہی کہا تھا کہ مارنے والے شور مچاتے ہوئے دوبارہ آگئے وہ سب غصے سے پھنکار رہے تھے۔

"کہاں گئی بھاگ بھری کہاں چھپا دیا ہے۔ "

"گھر میں گھسی ہے۔ نکال لاؤ۔ ہاں نہیں تو مار مار کر ہماری جان نکال دئی۔ ہاں۔ " تلسی نے روتے ہوئے کہا۔

"تو نے اسے بھگا دیا ہے تو نے اسے پتھروں سے بچایا ہے نہیں تو آج وہ ماری جاتی۔ " کسی نے کہا۔

"تو رک کا ہے گئے مار مار پتھر ہماری چورن بنائے دیو کون روکے ہے تم کا۔ " تلسی بولا۔

"تو نے مکھیا جی کے سامنے وعدہ کیا تھا تو بھاگ بھری کو پکڑوا ئے گا۔ بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح اور تو نے اس کی حفاظت کی۔ " ایک اور شخص نے الزام لگایا۔

"ارے تو ہار حفاجت۔ چلو جرا تم لوگ مکھیا کے پاس ہم اسے بتائیں کہ ہم بھاگ بھری کو دبوچ لیئں کہ وہ ہم پہ ہو جائے پر ای سب نے ہمکا پتھر مار مار کر ہٹا دین اور او کا نکلوا دین۔ " تلسی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

اس بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر تلسی سے ہمدردی سے کہا۔ "تو نے اس لئے پکڑا تھا تلسی۔ ؟"

"ارے جاؤ بس جاؤ تم لوگ بڑے سورما ہو، مرے کو مارو ہو۔ " لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ تلسی اب بھی رو رہا تھا، بچوں کی طرح ہیں ہیں کر کے اور نہ جانے کیوں میرا دل کٹ رہا تھا اللہ دین آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

"اٹھ تلسیا۔ " اس نے تلسی کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا اور وہ اٹھ گیا۔

"بڑا مارا ہے ہمکا سب روں نے دینو بھیا صبح سے مار رہے ہیں!۔ " وہ بدستور روتا ہوا بولا۔

"آ۔ میرے ساتھ اندر آ۔ آجا۔ " اللہ دین اسے سرائے میں لے آیا۔ اندر لا کر بٹھایا اور پھر آواز دی۔ "زبیدہ اری کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہے ایک پیالہ دودھ لے آ............ "

"ہم ناہی ہے دینو بھیا جی نا چاہ رہا بھیا کی سوگند نا چاہ رہا۔ " تلسی اب بھی اسی طرح رو رہا تھا۔

"چپ تو ہو جا تلسی کیا زیادہ چوٹ لگی ہے۔ " اللہ دین نے ہمدردی سے کہا۔

"ارے ہم چوٹ پر نا رو رہے۔ ہمار من تو بہنیا کے لئے رووے ہے ماتا کی سوگند دیکھو بھیا ہمار بہنیا ہے۔ ہم اسے جانیں ہیں۔ او سسری تو کھود بھاگ جلی ہے اولاد کے دکھ کی ماری تم خود دیکھت ہو بچے اسے پتھر ماریں ہیں وہ ان سے کچھ کہے ہے کبھی۔ "

"پر تلسی صبح کو اسے مسافر بھیا نے دیکھا تھا۔ " اللہ دین بولا۔

"ارے پگلیا تو ہے ہی ڈولت ڈولت پھرے ہے۔ شریر پڑا دیکھا ہوگا گھبیر کے چھورا کا بیٹھ گئی ہوگی ٹٹولنے ... خون لگ گیا ہاتھ منہ پر کسی نے اسے کلیجہ کھاتے ہوئے دیکھا۔ " میرا دل دھک سے ہو گیا۔ ایسا ... ممکن تھا یہ انکشاف میں نے کیا تھا بستی والوں کو میرے ذریعہ یہ سب معلوم ہوا تھا میں پتھرا گیا۔ تلسی ... "اب کا ہووے گا اللہ دین بھیا اولا گو ہو گئے ہیں مار ڈالیں گے ہمار بہنیا کو سب مل کر............ "

"تلسی۔ ایسا نہیں ہو گا۔ " میرے منہ سے نکلا۔

"ایسا ہی ہو گا ہم کا پتہ ہے۔"

"اگر بھاگ بھری نے دیوانگی میں، ان بچوں کو مار کر ان کا کلیجہ نہیں کھالیا ہے تلسی تو میں بھی ہوں جمال گڑھی والوں کی یہ غلط فہمی دور کردوں گا ہاں اگر اس نے ایسا کیا ہے تو پھر ہے۔"

"تو یہیں سو جا تلسی اپنے گھر مت جا۔"

"نا دینو بھیا گھر جانے دے اگر وہ پھر آ گئی تو۔ دینو بھیا ہم کوئی اسے پکڑ تھوڑ رہے تھے، ہم تو اسے رہے تھے اس پر پڑنے والے پتھر کھا رہے تھے بھنیا ہے ہمار وہ۔ ارے ہم اسے نا مرنے دیں گے اسے چلے بھیا تمہاری مہربانی۔" وہ وہاں سے چلا گیا۔

بہت دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا۔ "اللہ دین بھائی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ ڈائن ہے۔"

"مولا جانے"۔ اللہ دین گہری سانس لے کر بولا۔

"ایک بات بتاؤ اللہ دین۔"

"ہوں۔"

"بستی والے مکھیا کی بات مانتے ہیں؟"

"بہت۔ کسی بات پر ٹیڑھا ہو جائے تو سب سیدھے ہو جاتے ہیں۔"

"میں مکھیا سے ملوں گا۔ اس سے کہوں گا کہ وہ بستی والوں کا جنون ختم کرے ان سے کہے کہ وہ خود کھوج کر رہا ہے۔ پتہ چل گیا کہ بھاگ بھری ڈائن ہے تو وہ خود اسے سزا دے گا اس نے بستی والوں سے یہ بات کہی بھی تھی۔" میں نے یہ جملے کہے ہی تھے کہ اندر سے زبیدہ کی آواز سنائی دی۔

"ارے اب اندر آؤ گے یا باہر ہی رہو گے۔ میں کب سے بیٹھی ہوں۔"

"جاگ رہی ہے اچھا مسافر بھیا آرام کرو۔" اللہ دین اندر چلا گیا میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ باوضو تھا اور اس ہنگامے سے پہلے ایک ارادہ کر کے اٹھا تھا چنانچہ اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا۔ ایک صاف ستھری جگہ منتخب کی اور وہاں دوزانو بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے درود شریف بخشا گیا تھا یوں تو کلام الٰہی کا ہر زبر زیر پیش مدد جزم اپنی جگہ سمان ہے مگر مجھے رہنمائی کے لئے درود پاک عطا کیا گیا تھا۔ چنانچہ آنکھیں بند کر کے میں نے درود شروع کر دیا۔ پڑھتا رہا۔ ذہن سو سا گیا مگر ہونٹوں سے درود پاک جاری رہا۔ تب میرے ذہن میں کچھ خاکے ابھرنے لگے ایک بندر کی شکل ابھری جو تاج پہنے ہوئے تھا پھر ایک عمارت کا خاکہ ابھرنے لگا بندر کے قدموں میں کوئی سیاہ سی شے پھڑک رہی تھی سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ عمارت کے محراب دروازے پھر ایک چہرہ پہلے آنکھیں پھر ناک اور ہونٹ پھر پورا چہرہ۔ ایک مکمل چہرہ کسی عورت کا تھا اس کے بعد دماغ کو جھٹکا سا لگا اور میں جیسے جاگ گیا۔ میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ چہرہ یاد تھا عمارت کے نقوش یاد تھے اور بس۔ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا اس کے بعد دوبارہ درود شریف پڑھنا شروع کیا اور وضاحت چاہتا تھا لیکن شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا جانا تھا اس لئے نیند آ گئی۔ اور وہیں لڑھک کر سو گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا سوئے ہوئے کہ اچانک ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ اور پھر مسلسل چیخیں ابھرنے لگیں ایک لمحے تو دماغ سناٹے میں رہا پھر احساس

ہوا کہ یہ آوازیں زبیدہ اور اللہ دین کی ہیں۔ اٹھا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ زبیدہ ہی کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

"ہو۔ ہو۔ ہو۔" اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا چہرہ خوف کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں ایک ہاتھ کمرے کے دروازے کی طرف اٹھا تھا اور وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر دہشت نے زبان بند کر دی تھی۔ اور چیخوں کی آواز کے سوا کچھ منہ سے نہیں نکل پا رہا تھا۔ اللہ دین بھیا کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ان دونوں کو سنبھالنا تو مشکل تھا مگر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے اس کمرے میں ہے جس میں یہ سوتے ہیں چنانچہ اللہ کا نام لے کر کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور اسکی مدہم ملگجی روشنی کمرے کے ماحول کو اور خوفناک بنا رہی تھی۔ بستر پر کلو پڑا ہوا تھا۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کلو .... کلو ساکت ہے اتنے شور شرابے کے باوجود اس کے بدن میں جنبش نہیں ہے۔ تو کیا وہ .... ؟ سوچ مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک چوڑے پلنگ کے نیچے سے دو ہاتھ باہر نکلے اور انہوں نے برق رفتاری سے میرے دونوں پاؤں پکڑ کر کھینچے میں توازن نہ سنبھال سکا اور دھڑام سے نیچے آ رہا۔ میرے گرتے ہی ایک بھیانک وجود پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں میرے سینے پر آ چڑھا تھا اور میرے اعضا بالکل ساکت ہو گئے تھے۔

خوفناک وجود ایک لمحے میرے سینے پر سوار رہا۔ پھر اس نے ایک اور چیخ ماری اور میرے سینے سے اتر کر دروازے کی طرف لپکا اور جھپاک سے باہر نکل گیا۔ اللہ دین دوبارہ چیخا زبیدہ دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ دین خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"نکل گئی، نکل گئی۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پہلے اللہ دین کے بیٹے کلو کو دیکھا، بغور دیکھنے سے اندازہ ہو گیا کہ بچہ گہری نیند سو رہا ہے اور کوئی بات نہیں ہے اندازے سے میں نے ایک خوفناک وجود کو پہچان لیا تھا وہ بھاگ بھری ہی ہو سکتی تھی۔ اللہ دین ایک طرف بیوی کو سنبھال رہا تھا اور دوسری طرف بیٹے کے لئے فکر مند تھا۔

"تمہارا بیٹا سو رہا ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"ارے زبیدہ ہوش میں آ .... کلو ٹھیک ہے اسے کچھ نہیں ہوا۔" اللہ دین نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور پھر میرے پاس آ کر کلو کو دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا .... "مولا تیرا شکر ہے۔"

"وہ بھاگ بھری تھی نا .... ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے ہاں، اس سسری نے تو ناک میں دم ہی کر دیا۔ لو یہاں بھی آ گھسی اب کیا ہو گا۔ مولا نہ کرے اگر ہم جاگ نہ جاتے تو ...."

"کیا ہوا تھا .... ؟"

"مسافر بھیا یہ دھما چوکڑی ہوئی تو دروازہ کھلا رہ گیا۔ ہم سو گئے تھے کسی کھٹکے سے آنکھ کھلی تو اس کو دیکھا، کلو پر جھکی ہوئی تھی۔ ہم سمجھے کہ مولا نہ کرے .... مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اللہ دین شکر کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد زبیدہ بیگم ہوش میں آ گئیں۔ چیخیں مار کر رونے لگیں۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین آیا کہ کلو زندہ ہے۔ نہ جانے کیا اول فول بکنے لگیں۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ رات تو پوری گزر چکی تھی۔ اس کے بعد نیند نہیں آئی۔ نماز سے فراغت پا کر باہر نکل آیا بڑی خوشگوار صبح تھی۔ ننھے منے پرندے چہلیں کر رہے تھے۔ اللہ دین بھی میرے پاس آ گیا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو فکر مندی سے بولا۔ ”بڑی مشکل آ گئی ہے مسافر بھیا............ اب ہو گا کیا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا فکر مت کرو............“

”گھر والی تو بری طرح ڈر گئی ہے۔ بخار آ گیا ہے بے چاری کو............ ویسے اب تو کچھ گڑبڑ لگے ہی ہے مسافر بھیا............“

”کیا؟“

”بھاگ بھری ڈائن بن ہی گئی۔ بال بال بچ گیا ہمارا کلو۔“ اللہ دین نے کہا، میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ کیا کہتا کوئی فیصلہ کن بات کہنا مشکل ہی تھا۔

”چائے بنا لیں ناشتے میں کیا کھاؤ گے؟“

”جو بھی مل جائے............“ میں نے کہا اور اللہ دین چلا گیا۔ میں خیالات میں کھو گیا۔ وہ چہرہ اور وہ عمارت یاد تھی جسے مراقبے کے عالم میں دیکھا تھا۔ ہدایت کی گئی تھی کہ اب خود پر بھروسہ کروں۔ کمبل واپس لے لیا گیا تھا، امتحان تھا مگر دل کو یقین تھا کہ امتحان میں پورا اتارنے والی بھی وہی ذات باری ہے جس نے اس امتحان کا آغاز کیا ہے۔ خیالوں میں جیب میں ہاتھ چلا گیا۔ کوئی مانوس شے نظر آئی۔ نکال کر دیکھا تو چار روپے تھے یہ تائید غیبی تھی۔ مجھے اس اعتماد پر یقین دلا یا گیا تھا جو میرے دل میں تھا۔ میرا وظیفہ مجھے عطا کر دیا گیا تھا۔ بڑی تقویت ملی دل کو۔ اور اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ ہو گا بہتر ہو گا۔ چائے پیتے ہوئے تین روپے اللہ دین کو دیدیئے وہ بولا۔ ”شرمندہ کر رہے ہو مسافر بھیا مگر اتنے کاہے کو............؟“

”بس حساب رکھنا، کل پھر دوں گا۔“ اللہ دین نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ کوئی نو بجے ہوں گے کہ تلسی کراہتا ہوا آ گیا۔

”بخار چڑھ گیا ہے سسرا، بھیا دینو ایک اٹھنی ادھار دیدو گے............؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ لو۔“ اللہ دین نے جیب سے اٹھنی نکال لی۔

”یہ روپیہ بھی لے لو تلسی فالتو پڑا ہے میری جیب میں۔“ میں نے جیب سے روپیہ نکال کر تلسی کو دیا جو اس نے بڑی مشکل سے لیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں بستی گھومنے نکل گیا۔ آبادی بہت چھوٹی تھی۔ ایک مسجد بھی بنی ہوئی تھی مگر نہایت شکستہ حالت میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں نظر آیا۔ اندر داخل ہو گیا صفائی ستھرائی کی۔ اذان بھی نہیں ہوئی۔ میں نے خود اذان دی لیکن ایک نمازی بھی نہ آیا۔ نماز سے فارغ ہو کر گھومنے نکل گیا۔ کھیتوں اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہاں کافی دور نکل آنے کے بعد ایک مٹھ نظر آیا۔ اس کے عقب میں ایک سیاہ رنگ کی عمارت بھی نظر آئی تھی قدم اس جانب اٹھ گئے۔ عمارت کے اطراف میں انسانی قد سے اونچی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان پتلی سی پگڈنڈی بھی پھیلی ہوئی تھی جو اسی عمارت تک جاتی تھی۔ میں اسی پگڈنڈی پر آگے بڑھتا رہا۔ راستے

میں جگہ جگہ سانپوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی تھی، یقیناً ان جھاڑیوں میں سانپ موجود تھے۔ پتھر کی بنی ہوئی یہ عمارت بڑی عجیب نظر آ رہی تھی۔ لیکن میرے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھی۔ میں آگے بڑھتا ہوا اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اور پھر اچانک ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ استغراق میں جو عمارت میں نے دیکھی تھی۔ اس وقت یقیناً وہی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ کم از کم اس سلسلے میں مجھے اپنی یادداشت پر بھروسہ تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مقصد ہے کہ جو عمارت دکھائی گئی تھی وہ بالکل مکمل تھی اور یقینی طور پر مجھے یہاں سے کوئی رہنمائی ملے گی۔ وہی محرابیں وہی ... میں آگے بڑھتا ہوا اس بڑے سے ٹھنڈے ہال میں پہنچ گیا۔ جو نیم تاریک تھا۔ بس کچھ روشن دانوں سے چھلکنے والی روشنی نے ماحول کو تھوڑا سا منور کر دیا تھا ورنہ شاید نظر بھی نہ آتا۔ درمیان میں ہنومان کا بت ایستادہ تھا۔ ہاتھ میں گرز لئے ہنومان کا بت بہت خوفناک نظر آ رہا تھا اور اس سنسان ماحول میں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بت اپنی جگہ سے آگے بڑھے گا اور مجھ پر حملہ کر دے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک دیکھی۔ حالانکہ پتھر کا تراشا ہوا بت تھا لیکن آنکھیں جاندار معلوم ہوتی تھیں۔ میں ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا لیکن بت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ یہ صرف تنہائی اور ماحول کا پیدا ہوا ایک تصور تھا۔ البتہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میری رہنمائی بے مقصد نہ کی گئی ہو گی۔ آگے بڑھ کر بت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہلکی ہلکی سرسراہٹوں سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے آس پاس کہیں کوئی موجود ہے لیکن نظر کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بت کے قدموں میں دیکھا اور دوزانو بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ عالم استغراق میں مجھے ان قدموں کے نزدیک کوئی سیاہ شے پھڑکتی ہوئی نظر آئی تھی۔ لیکن اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا۔ ہاں خون کے چند دھبے نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ حالانکہ ان کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ سے خون کو تھوڑا سا رگڑ کر دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے چھٹ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ذرات میری انگلی میں لگے رہ گئے اس کے بعد میں نے اس ہال کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا۔ دوسری سمت ایک دروازہ بنا ہوا تھا ہمت کر کے میں اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا لیکن بالکل خالی کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی۔ وہاں سے باہر نکل آیا اور یوں لگا جیسے کوئی بھاگ کر دروازے سے باہر نکل گیا ہو۔ تیزی سے دوڑتا ہوا باہر آیا اور دور دور تک نگاہیں دوڑائیں لیکن اگر کوئی تھا بھی تو اسے تلاش کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ آس پاس بکھری ہوئی جھاڑیوں میں تو اگر سینکڑوں انسان بھی چھپ جاتے تو ان کا سراغ لگانا مشکل ہوتا، یہ جگہ یقینی طور پر بہت پراسرار تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کا تعاقب کرتا ہوا میں باہر نکلا تھا لیکن ابھی وہاں بہت سی چیزیں جائزہ لینے کے لئے موجود تھیں چنانچہ پھر اندر داخل ہو گیا اور ایک بار پھر ہال میں ادھر ادھر دیواروں کونوں کھدروں کو تلاش کرنے لگا۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ جگہ انسانی پہنچ سے دور نہیں ہے دیوار میں دو مشعلیں گڑھی ہوئی تھیں جن میں نجانے کیا چیز جلائی جاتی تھی۔ روئی سے بنی ہوئی بتیاں ان مشعلوں میں تراشے ہوئے دیوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک سفید سے رنگ کا موم جیسا مادہ بھی موجود تھا۔ یہ بتیاں یقیناً روشن کر دی جاتی ہوں گی ہو سکتا ہے یہاں پوجا ہوتی ہو، ظاہر ہے مذہب کے متوالے اپنے اپنے دھرم کے مطابق یہ عمل کرتے ہی ہیں لیکن جگہ بے حد بھیانک اور پراسرار تھی۔ میں نے اس کا پورا پورا جائزہ لیا اور اس کے بعد وہاں سے بھی باہر نکل

آیا۔ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک بار پھر کھیتوں کے قریب پہنچا۔ چار پانچ افراد پر مشتمل ایک گروہ نظر آیا جو ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب غیر مانوس شکلیں تھیں۔ لیکن شاید وہ مجھے جانتے تھے، تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے اور میری طرف اشارہ کرکے باتیں کرنے لگے میں خود ہی ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا کر رہے ہو بھائی۔“

”اسی چڑیل کو تلاش کر رہے ہیں، ڈائن بچ کر کہاں جائے گی ہمارے ہاتھوں سے۔ ارے بستی میں آگ لگا دی ہے اس نے، ہر گھر میں رونا پیٹنا مچا ہوا ہے سسری کی وجہ سے۔ بھگوان کی سوگند نظر آ جائے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ پھر جان بوجھ کر نہیں گیا تھا اس طرف، بس ایسے ہی کچے پکے مکانوں کے بیچ سے نکلا تھا کہ سامنے مکھیا کا گھر نظر آ گیا۔ غالباً یہ عقبی راستہ تھا، یونہی ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور اس گھر کے قریب پہنچ گیا، لیکن آج بھی وہاں تماشا ہو رہا تھا۔ بیچارے تلسی کو دیکھا جسے دو آدمی پکڑے ہوئے لا رہے تھے اور چار پانچ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ چوپال پر ٹھاکر صاحب بدستور بیٹھے ہوئے حالانکہ دوپہر کا وقت تھا لیکن ٹھاکر صاحب قصہ نمٹانے آ گئے تھے، میں بھی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا، ٹھاکر صاحب کسی قدر ناخوشگوار انداز میں ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے ”ارے تم اس بیچارے کے پیچھے کاہے پڑ گئے ہو آخر، مار دو سسرے کو، دو لٹھیاں مارو، بھیجا نکال باہر کرو، جان تو چھوٹے ....“

”ٹھاکر جی، جھوٹ نہیں کہہ رہے ہم لوگ، سوگند لے لو ہم سے بھی اور اس سے بھی، اس سے پوچھو، رات کو بھاگ بھری اس کے پاس آئی تھی یا نہیں ....“

”کیوں رے، بتا بھائی بتا، کیا کریں تیرا ہم، ارے بستی چھوڑ کر ہی چلا جا پاپی کہیں، مارا جائے گا ان لوگوں کے ہاتھوں، دھت تمہارے کی، ارے آئی تھی وہ کیا تیرے پاس۔“

”آئی تھی ٹھاکر۔“

”تو پھر تو نے پکڑا اسے۔؟“

”پکڑا تھا، مگر ان لوگوں نے پتھر مار مار کر ہمارا ستیاناس کر دیا، وہ ہمیں دھکا دیکر نکل بھاگی۔“

”یہ جھوٹ بولتا ہے ٹھاکر، اس نے اسے پتھروں سے بچانے کیلئے اپنے بدن کے نیچے چھپا لیا تھا۔“

”تو پاپیو! بھیا تو ہے نا کیا کرتا، ارے تم لوگوں کو بھگوان کا خوف ہے کہ نہیں، ساری بستی پر تباہی لاؤ گے۔ تم مجھے بتاؤ ٹھنڈے من سے بتاؤ سوچ کر بتاؤ، تمہاری بہن پاگل ہو جائے، کوئی اس پر الزام لگا دے کہ وہ ڈائن ہے اور تم نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو تو کیا مروا دو گے اسے بستی والوں کے ہاتھوں، پتھر مار کر سر کھلوا دو گے اس کا، ارے اس نے اگر ایسا کیا بھی ہے تو کونسا برا کام کیا، کیا تم یہ بات کہنا چاہتے ہو کہ بھی اپنی بہن کے ساتھ بچوں کو مارتا ہے، بولو جواب دو، اگر ایسا نہیں ہے تو اس بیچارے کے پیچھے کیوں پڑے ہو، جاؤ پکڑ لو کہیں سے بھاگ بھری کو، لے آؤ سسری کو میرے پاس، میں خود تم سے کہوں گا کہ جان نکال دو اس کی۔ ارے کسی نے ٹھیک سے دیکھا تو ہے نہیں اور پڑ گئے پیچھے۔ دیکھو میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب جیسے کہہ رہا ہوں اسے سمجھ لو، تلسی کو اس کے بعد اگر کسی نے ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہو گا اور بھاگ بھری کے بارے میں بھی میں تم سے یہی کہتا ہوں۔ دیکھ لو پکڑ لو تو جان سے مت مارنا، پہلے میرے سامنے

...ے کسی کو نہیں کھا جائے گی سمجھے سوروں، اس بیچارے کو بار بار پکڑ کر لے آتے ہو۔“

...انصاف نہیں ہے ٹھاکر صاحب۔“ یہ آواز جنک رام کی تھی ....

...ے جنک رام، بھیا ہم جانیں ہیں تیرے من میں آگ لگی ہے پر ایسا تو نہ کر جیسا تو کر رہا ہے، بھاگ ...بار بھی پکڑ کر لے آئے گا تو ہم تجھ سے کچھ نہیں کہیں گے، اس بیچارے کی جان کے پیچھے کیوں لگ ...اؤ، دیکھو بھیا، بھاگ بھری اگر تیرے پاس آ جائے تو بھیا مت بتیو اس کا، پکڑ کر ہمارے پاس لے ...ے ہم بھی تو دیکھیں ذرا ڈائن کو کھلی آنکھوں سے۔ پتہ تو چل ہی جائے گا، سسری کب تک چھپے گی، تم ...نے تو بھیا مغز خراب کر کے رکھ دیا۔“ ٹھاکر کوہلی رام دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا۔

...ے کچھ نہیں کہو گے ٹھاکر۔“ جنک رام بولا۔

...یا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ بتاؤ اور کیا کہیں ادھر آ رے تلسیا۔ ادھر آ ہمارے پاس۔“ تلسی آگے بڑھ ...ے پاس آ گیا۔ ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چونک پڑا۔ ”ارے تجھے تو تاپ چڑھا ہوا ہے۔“

...ل سے پٹ رہا ہوں ٹھاکر۔ دن بھر مارا، رات کو مارا۔ تاپ نہ چڑھے گا تو کیا ہو گا۔“ تلسی ...بت سے بولا اور ٹھاکر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”...پو جان لیئے بنا، نا چھوڑو گے اسے ارے کچھ شرم کرو، کچھ شرم کرو۔ سنو رے۔ کان کھول کر ...ب کے سب، جنک رام تو بھی سن لے بھیا، تیرا دکھ اپنی جگہ مگر تم سب نے مل کر ہمیں مکھیا بنایا ...مکھیا کا مان بھی دے دو۔ اس کے بعد تلسی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ ورنہ ہم پولیس کو بلائیں گے اور پھر ...ے ایک ایک کو۔“

”...اس کا پاٹ نے رہے ہو ٹھاکر۔“ کسی نے کہا۔

”چورسیا او۔ چورسیا“ ٹھاکر نے کسی کو آواز دی اور ایک قوی ہیکل آدمی آگے بڑھ آیا۔ ”دیکھ تو کون ...بولا۔ پکڑ لے اسے اور بیس جوتے لگا دے اس کی کھوپڑی پر۔ کون بولا تھا پاٹ والی بات۔“ ٹھاکر نے ...نکال کر مجمع کو گھورتے ہوئے کہا۔ لیکن دوبارہ کوئی نہ بولا۔ ٹھاکر نے اس وقت شاید مجھے دیکھا تھا پھر ...بات سمجھ میں آ گئی ہو تو جاؤ، اپنے گھروں کو جاؤ۔ جو کہا ہے اسے یاد رکھنا ورنہ ذمے دار خود ہو ...زبان چلاؤ ہو حرام خور ہم سے۔ جاؤ سب جاؤ۔“ لوگ گردنیں جھکائے چل پڑے۔ میں بھی واپسی ...ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ”ارے او داروغہ جی تم کہاں چلے۔ ذرا ادھر آؤ ہمارے پاس۔“ ...جا رہا تھا داروغہ کسے کہا گیا ہے رک گیا۔ مڑ کر ٹھاکر کوہلی رام کے پاس پہنچ گیا۔ ”جی ٹھاکر صاحب“۔

”...مہربانی تمہاری بھائی کہ عزت سے نام لے لیا، ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بھنگی چمار کہو گے ہمیں۔“

”...آپ یہ کیوں سمجھ رہے تھے ٹھاکر صاحب۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

...ے ہمیں بیٹھو۔ جمال گڑھی میں مہمان آئے ہو ہم بھی یہیں کے رہنے والے

”...آپ حکم دے کر بلوا لیتے ٹھاکر صاحب۔ اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرا ہوں۔“

”...تمہارا حکم کاہے مانتے بھیا۔ دبیل میں بسو ہو ہماری کیا۔ دو پور سے سلام تو کیا نا تم نے۔“

”...سلام اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے ٹھاکر، آپ کی بستی میں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ آپ ضرور

جانتے ہوں گے کہ مسلمان کسی کے حکم پر نہیں جھکتے۔"

"ارے بیٹھو تو دو چار گھڑی کچھ جل پان کرو؟"

"شکریہ۔ میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

"تم خوب پھنسے اس پھیر میں۔ بستی میں کسی سے ملنے آئے تھے یا ایسے ہی گزر رہے تھے"

"بس گزر رہا تھا ٹھاکر، پتہ نہیں میری بدقسمتی تھی یا کسی اور کی۔ کہ میں نے وہ منظر دیکھ"

"بھگوان جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ فیصلہ تو بھگوان ہی کرے گا۔ بھاگ بھری باؤلی ہو گئی بچے مرگئے تھے اس کے۔ پتی بھی مر گیا بے چارہ، مگر۔ ایسا کیسے ہو گیا۔ ایسی عورت ڈائن کیسے وہ باؤلی تو ہے۔ ہو سکتا ہے بچے کی لاش پڑی ہو اور وہ پاگل پن میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے ہو۔ تم نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ بچے کو مار رہی تھی۔"

"پہلے بھی بتا چکا ہوں اس کی پیٹھ تھی میری طرف۔"

"بھگوان جو کرے اچھا کرے۔ بستی والے اسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہم تو کچھ اور سوچ ہیں۔ پولیس لا کر بھاگ بھری کو پکڑوا دیں۔ پولیس جانے اور اس کا کام؟" ابھی ٹھاکر نے اتنا ہی کہ اندر سے ایک لمبی تڑنگی عورت نکل آئی اور کرخت لہجے میں بولی۔

"تمہیں پنچایت لگانے کے علاوہ اور کوئی کام بھی ہے جب دیکھو پنچایت لگائے بیٹھے ہو۔ کالا ہیں اتی دیر سے۔" میں نے عورت پر نگاہ ڈالی اور دفعتاً دل دھک سے ہو گیا۔ یہ چہرہ اجنبی نہیں تھا یہ وہی چہرہ تھا جسے میں نے مراقبہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھے نقوش مگر کرختگی لئے ہوئے۔ ٹھاکر بولا جلدی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"ہاں ہاں بس آ ہی رہے تھے۔ اچھا بھیا۔ پھر کبھی آؤ۔ آدمی بھیجیں گے تمہارے پاس۔ پان کرو ہمارے ساتھ۔ اچھا!" وہ اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن میرا ذہن چکرایا ہوا تھا۔ وہی چہرہ وہی چہرہ۔ مندر کی عمارت بھی نظر آ گئی تھی اور وہ عورت بھی۔ اب کیا کروں۔ کیسے کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آیا۔ سرائے واپس آ کر بھی میں سوچتا رہا اور کئی دن سوچتا رہا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

جمال گڑھی میں قیام کی پانچویں رات تھی۔ میں پریشان تھا۔ بات کسی طور آگے نہیں بڑھ تھی۔ تین دن سے خاموشی تھی۔ بھاگ بھری بھی شاید دور نکل گئی تھی۔ تین دن سے اسے نہیں دیکھا گیا تھا۔ تلسی البتہ ملتا رہتا تھا اداس اور ملول تھا۔ بات بات میں سسکنے لگتا تھا۔ مجھے اس پر ترس آتا تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا بے چارے کیلئے۔ ٹھاکر کوہلی رام کے پاس بھی بہت سے چہرے تھے۔ وہ اچھا آدمی تھا ظاہری کیفیت سے بالکل برعکس۔ تلسی کیلئے خود بھی افسردہ تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔

"ہم اسے کسی دوسری بستی بھیج دیں گے۔ انتظام کر رہے ہیں۔ یہاں رہا تو مارا جائے گا۔ بھگوان نہ کرے اور کوئی ایسا واقعہ ہو گیا تو پھر میں بھی شاید بستی والوں کو نہ روک سکوں۔"

رات کے کوئی دس ہی بجے ہوں گے لیکن یوں لگتا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔ جمال گڑھی میں

بجے ہی رات ہو جاتی تھی۔ پانچ چھ بجے تک سارے کاروبار بند ہو جاتے تھے اور لوگ اپنے جا گھستے تھے بس بھولے بھٹکے مسافر آٹھ نو بجے تک نظر آ جاتے تھے ورنہ خاموشی۔ سرشام ہی ئے تھے اور اس وقت بھی آسمان تاریک تھا۔ اللہ دین رات کے کھانے کے بعد مجھے خدا حافظ کمرے میں جا گھسا تھا۔ وہ مضبوطی سے سارے دروازے بند کر کے سوتا تھا اور اس نے مجھ دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے رات کو اس کا دروازہ نہ بجاؤں وہ دروازہ نہیں کھولے گا۔ یہ زبیدہ ہٹ تھی۔

اہٹ کا دورہ پڑا تھا۔ اس وقت عجیب سی بے کلی محسوس ہو رہی تھی۔ چار پائی کاٹنے کو دوڑ خاموشی سے سرائے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ تلسی کا گھر بھی تاریک پڑا ے چل پڑا سوچا کہاں جاؤں اور اس ویران مندر کا خیال آیا۔ کوئی کتنا ہی بہادر ہوتا اس مندر کی طرف رخ کرنے کے تصور ہی سے خوفزدہ ہو جاتا۔ لیکن دل اس سمت جانے کو چاہ رہا چل پڑا۔ پوری بستی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی۔ کتے تک نہیں بھونک رہے تھے فاصلہ کم نہیں تھا راستے میں کسی ذی روح کا نشان بھی نہیں نظر آیا تھا۔ گھنی اور خوفناک جھاڑیاں خاموش تھیں۔ ان کے درمیان سے احتیاط سے گزرا تھا کیونکہ وہاں سانپ موجود تھے رات میں تو وہ تے لیکن اس خوف سے اپنا ارادہ ترک نہیں کر سکا۔ کوئی انجانی قوت مجھے وہاں لے جا رہی یہ مندر تاریکی میں اور بھیانک نظر آ رہا تھا لیکن اس کے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی بری پڑا۔ کسی بچے کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ روتے ہوئے کہہ رہا

ماں کھول دو، بھگوان کی سوگند.............اب باہر نہیں جاؤں گا۔ ماں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تمہاری بات مانوں گا. باہر نہیں جاؤں گا۔ ماں رسی میرے پیر کاٹ رہی ہے۔ ماں پیٹھ ہے، کھول دو ماں۔"

دھاڑ کرنے لگا۔ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ خون کی روانی طوفانی ہو گئی، کنپٹیاں آگ اگلنے ہوا۔ اندر داخل ہو جاتا یقیناً وہ نہ ہوتا جو دوسرے لمحے ہوا۔ اندر یک بیک روشنی ہو گئی مشعلیں روشن ہوئی تھیں جو اس دن دیکھی تھیں۔ میں فوراً ایک محراب کے ستون کی روشنی نے اندر کا ماحول اجاگر کر دیا تھا اور میں اس ماحول کو دیکھ سکتا تھا۔ ہنومان کا بت اسی تھا۔ اس کے پیروں کے نزدیک ایک آٹھ نو سالہ بچہ رسی سے بندھا ہوا پڑا تھا۔ روشنی ساکت ہو گیا تھا۔ ہنومان کے بت سے کوئی پانچ قدم کے فاصلے پر کالے اور ڈھیلے س میں ملبوس ایک وجود سر نیہوڑائے بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مرد نظر آ رہا تھا جس نے ڈھا ہوا تھا.............! سیاہ لباس میں ملبوس وجود کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ بے حد پراسرار اور ....! دم روک دینے والا سناٹا طاری تھا۔ بچے کی سہمی سفید آنکھیں گردش کر رہی کھل گیا تھا۔ تب ایک آواز ابھری۔ "نندا.............!"

"جے دیوی............!" دوسری آواز ابھری، پہلی آواز نسوانی تھی اور میں نے اسے فوراً پہچان لیا تھا دوسری بھاری مردانہ اور اجنبی آواز تھی ....!

"ہاتھ پاؤں کھول دے اس کے ...."

"جے دیوی............" مردانہ آواز نے کہا۔ روشنی میں ایک آبدار خنجر کی چمک ابھری اور باندھے ہوئے شخص آگے بڑھ کر بچے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک لمحے میں بچے کے ہاتھوں اور پیروں میں بندھی رسیاں کاٹ دیں۔ بچہ تڑپ کر اٹھا تو مرد نے خوفناک آواز میں کہا............

"لیٹا رہ، اپنی جگہ لیٹا۔ ہلا تو گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔" سہما ہوا بچہ جیسے بے جان ہو کر وہ اپنی جگہ لڑھک گیا۔ سیاہ پوش عورت اٹھ کھڑی ہوئی وہ لمبے قد و قامت کی مالک تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خنجر مرد کے ہاتھ سے لے لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر بچے اور ہنومان کے بت کے قریب گئی۔ پھر اس کی بھیانک آواز ابھری۔

"جے بجر نگا............! ساتویں بلی دے رہی ہوں۔ اسے سوئیکار کر، بجرنگ بلی۔ میری بھینٹ سوئیکار کر، میری منو کامنا پوری کر دے، تیرا وچن ہے۔ آخری بلی کے بعد میری گود ہری کر دے۔! بچہ دے دے بجرنگ بلی، مجھے بیٹا دے دے جے بجرنگ بلی ...."

صورتحال سمجھ میں آ گئی۔ پتہ چل گیا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا جس قدر بھیانک آواز بنا سکتا تھا بنا کر چیخا............! "بھاگ بھری۔ وہ مندر میں گھسی ہے، نہیں پکڑا رہی، وہ رہی۔" ایک چھوٹا سنگی مجسمہ رکھا تھا جو میری ٹکر سے زور سے اپنی جگہ سے گرا اور نیچے آ کر چور ہو گیا۔ اس کے ٹکڑوں کے گر کر بکھرنے کا چھنا کا مندر میں گونج اٹھا مجھے خود یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ بے شمار لوگ چیخ رہے ہوں اور نتیجہ نکل آیا۔ عورت سے پہلے مرد باہر بھاگا اور اس کے پیچھے عورت قلانچیں لگاتی ہوئی باہر نکل گئی وہ مشعلیں جلی چھوڑ گئے تھے۔ اپنے عمل کو پختہ کرنے کیلئے میں نے اور زور زور سے چیخنا شروع کر دیا اور رات کے پر ہول سناٹے میں میری چیخیں دور دور تک گونج گئیں۔ بچے نے دہشت سے دوبارہ رونا شروع کر دیا............ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ چیخ پڑا۔

"مت مارو، مجھے مت مارو............ مت مارو مجھے۔"

"اٹھ بیٹے............ میں تجھے نہیں ماروں گا۔ اٹھ میں تو تجھے بچانے آیا ہوں۔" کوئی بڑا ہوتا تو شاید زندہ ہی نہ رہ پاتا خوف کے مارے، لیکن بچہ تھا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب باہر نہیں کھیلوں گا۔ مجھے مت مارو چاچا............"

"بالکل نہیں ماروں گا۔ آ میرے ساتھ چل ....!" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ جانتا تھا کہ باہر خطرہ ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ جھاڑیوں میں چھپے ہوں اور اکیلا پا کر حملہ کریں۔ مندر میں رکنے سے اور خطرہ تھا۔ آسانی سے پکڑا جاؤں گا۔ کسی نے اگر خبر کر دی اور مجھے اس بچے کے ساتھ دیکھ لیا گیا تو حالات بگڑ سکتے تھے۔ نکل جانا

ہی بہتر ہے۔ اللہ کا نام لے کر باہر نکل آیا۔ رات کے بیکراں سناٹے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ میں اس وقت تک خاموش رہا، جب تک جھاڑیوں کے کھیت سے باہر نہ نکل آیا۔ پھر میں نے بچے سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تیرا بیٹے؟"

"للو۔"

"پتا کا نام کیا ہے۔"

"گنگو۔"

"تیرا گھر کہاں ہے؟"

"پچھائی پلے!"

"راستہ جانتا ہے اپنے گھر کا؟"

"ہاں۔"

"یہاں تجھے کون لایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ بچے نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

"معلوم نا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو کھیل رہا تھا کہیں؟"

"سو رہا تھا۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر میں۔ ماتا جی نے کہا تھا کہ ڈائن پھر رہی ہے باہر کلیجہ نکال کر کھا جائے گی۔ باہر مت کھیلیو۔ ہم تو سو رہے تھے چاچا۔"

"پھر تو یہاں کیسے آ گیا۔"

"بھگوان کی سوگند، ہمیں نا معلوم۔ ہم تو سمجھے ماتا جی نے پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ اس نے یہی کہا تھا کہ کھیلنے باہر گئے تو وہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دے گی۔"

میں نے گہری سانس لی، سمجھ گیا تھا کہ بچے کو بے ہوش کر کے لایا گیا تھا۔ اور یقیناً وہی کھیل ہونے والا تھا جو پہلے پانچ بچوں کے ساتھ ہوا پھر چھٹے بچے کے ساتھ اور اب یہ ساتواں بچہ۔ بستی میں داخل ہو کر بچے سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا اور وہ بتانے لگا۔ گھر والوں کو ابھی تک اس کی گمشدگی کا علم نہیں ہوا تھا کیونکہ گھر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ یقیناً انہی لوگوں نے کھولا ہو گا جنہوں نے بچے کو اغواء کیا تھا۔ میں نے للو سے کہا۔

"تیرے گھر والوں کو ابھی کچھ نہیں معلوم، جا دروازہ اندر سے بند کر لینا جا اندر جا............" بچہ اندر چلا گیا اور میں فوراً وہاں سے واپس چل پڑا۔ میری آج کی بے کلی نے بہت اہم انکشاف کیا تھا۔ ایک بچے کی جان بچ گئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ یہاں سرائے میں بھی وہی کیفیت تھی کسی کو نہ میرے جانے کی خبر ہوئی تھی نہ واپس آنے کی۔ اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر بستر پر لیٹ کر اس بارے میں سوچنے لگا۔ ڈائن کا

معمہ حل ہوگیا تھا۔ بھاگ بھری بے قصور تھی۔ اس پر جھوٹا الزام لگ گیا تھا۔ بستی والے اس کے دشمن ہوگئے تھے۔ جو آواز میں نے سنی تھی اسے پہچان لیا تھا۔ میری سماعت نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ یہ فیصد کوہلی رام کی بیوی کی آواز تھی۔ دوسرا نام نندا کا تھا جو اس کا شریک کار تھا۔ اس کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ ساتویں بلی دے رہی ہوں۔ میری گودہری کردے۔ مجھے بچہ دے۔ مجھے بیٹا دیدے۔ تو یہ تھا ہے۔ وہی کالا جادو، وہی مکروہ علم، کم بخت عورت نے ایک اولاد کی خاطرہ چھ چراغ گل کردیئے تھے۔ اب سب کچھ معلوم ہوگیا تھا میری رہنمائی کی گئی تھی۔ پہلے مجھے جمال گڑھی بھیجا گیا اور پھر ہنومان مندر اور اس عورت کی شکل دکھائی گئی اور اب۔ سارے انکشافات ہوگئے تھے اور اب اس برائی کا خاتمہ کرنا تھا۔ مگر اس کیلئے کوئی عمل درکار تھا۔

باقی رات سوچوں میں گزر گئی تھی۔

صبح کو اللہ دین کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں نے کہا۔

"تم نے ٹھاکر کوہلی رام کے بارے میں خوب کہانی سنائی تھی اللہ دین۔"

"کونسی کہانی بھیا۔"

"یہی کہ وہ کھرا ٹھاکر نہیں ہے۔"

"ہاں۔ وہ مگر کسی سے کہنا نہیں مسافر بھیا، دشمنی ہوجائے گی ٹھاکر سے!"

"نہیں مجھے کیا ضرورت ہے۔ ویسے کوئی بچہ نہیں ہے اس کا۔"

"نہیں! بچہ نہیں ہے۔"

"اسے آرزو تو ہوگی۔"

"ہاں ہوگی تو، پوجا پاٹھ کراتا رہتا ہے۔ رشی منی آتے رہتے ہیں ٹھکرائن گیتا ٹونے ٹوٹکے کرتی رہتی ہیں۔"

"ہوں۔" میں نے کہا اور خاموش ہوگیا۔ اس سے زیادہ کیا کہتا۔ اچانک میں نے کچھ یاد کرکے کہا۔

"یہ نندا کون ہے۔"

"نندا............؟"

"کسی نندا کو جانتے ہو۔"

"نندا............ ہاں تین نندا ہیں جمال گڑھی میں۔"

"کوہلی رام کے ہاں کوئی نندا ہے۔"

"جگت نندا............ ہاں نندا چمار نوکری کرتا ہے وہاں۔ کوئی کام ہے اس سے۔"

"نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ پتہ نہیں بے چارے تلسی کا کیا حال ہے۔"

"بخار میں پڑا ہوا ہے۔ میں صبح منہ اندھیرے چائے روٹی دے آیا تھا بے چارے کو۔"

"ارے اتنی صبح، مجھے تو پتہ ہی نہ چلا حالانکہ میں جاگ گیا تھا۔" اللہ دین مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

"کیا کریں مسافر بھیا۔ عورت چھوٹے دل کی ہووے ہے۔ بیوی کے ڈر کے مارے ایسے کام چھپ کر کرنے پڑتے ہیں۔"

"اوہ۔ اچھا۔ تم ڈرتے ہو اپنی بیوی سے۔"

"ارے کچھ تو ڈرنا ہی پڑے ہے۔" اللہ دین نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی ہنسنے لگا تھا۔ یہاں پڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا ایسے ہی گھومنے نکل گیا۔ پھر کسی خیال کے تحت کوہلی رام کے گھر کا رخ کیا۔ سامنے سے گزر رہا تھا کہ کوہلی رام نے کہیں سے دیکھ لیا۔ ایک آدمی اندر سے دوڑا آیا اور بولا۔

"ٹھاکر جی بلا رہے ہیں۔" میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ کوہلی رام دروازے کے بعد بغلی سمت بنی ڈیوڑھی میں موجود تھا۔

"آؤ داروغہ جی، کہاں ڈولت گھومت ہو۔؟"

"بس آپ کی جاگیر میں گھوم رہے ہیں ٹھاکر۔"

"بیٹھو............ تم بھی ہمیں من موجی ہی لگو ہو۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟" میرے منہ سے بے اختیار اپنے شہر کا نام نکل گیا۔ طویل عرصے کے بعد یہ نام نہ جانے کیوں میری زبان پر آگیا تھا۔ کہہ تو دیا مگر دل میں اینٹھن سی ہوئی تھی۔ مگر ٹھاکر میرے ہر احساس سے بے نیاز تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں بستی میں کوئی جان پہچان ہے کیا، کیسے آنا ہوا؟"

"بس ٹھاکر صاحب، ایسے ہی سیر سپاٹے کیلئے نکل آیا تھا ہوسکتا ہے جمال گڑھی سے آگے بڑھ جاتا مگر یہاں جو واقعات دیکھے دلچسپ لگے، سو یہاں رک گیا، میں نے کبھی کوئی ڈائن نہیں دیکھی تھی۔ بڑا عجیب سا لگا مجھے اور میں یہ دیکھنے کیلئے رک گیا کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔" ٹھاکر کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے اس نے کہا۔

"بس داروغہ جی کیا بتائیں، بستی پر آفت ہی آگئی ہے، ہماری تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے دل دکھتا ہے ان سب کیلئے جن کے بچے مارے گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھاگ بھری کو کیا ہوگیا، ارے انسان پاگل تو ہو ہی جاتا ہے، اس کے ساتھ تو بری بیتی تھی، مگر اس کے بعد جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا، ہم کہتے ہیں بھگوان اسے اپنی طرف سے موت دیدے، بستی والوں کے ہاتھ لگ گئی تو کچل کچل کر مار دیں گے۔ بستی کی عورت ہے، اس کا پتی بھی برا آدمی نہیں تھا۔ پر بیچاری کا گھر بگڑا تو ایسے کہ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں سوچ سوچ کر۔"

"جی ٹھاکر صاحب کیا کہا جاسکتا ہے ویسے ٹھاکر صاحب یہ بات تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ بھاگ بھری کو کسی نے یہ سارے کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا، میں بھی بتا چکا ہوں کہ اس دن وہ پیٹھ کئے بیٹھی تھی میری نظر میں پاگل ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لاش دیکھ کر بیٹھ گئی ہو، دماغ میں کچھ نہ آیا ہو۔" ٹھاکر خاموشی سے سنتا رہا، پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی اور جس کا شاید انتظار بھی تھا۔ ٹھکرائن اندر داخل ہوگئی،

مجھے دیکھ کر ٹھٹکی، دیکھتی رہی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سوچ کے آثار نمودار ہوئے ہیں، لیکن ٹھاکر صاحب کسی قدر حواس باختہ ہوگئے. جلدی سے بولے۔ "آؤ آؤ. ان سے ملو یہ ہمارے مہمان ہیں یہاں آئے ہوئے ہیں سیر سپاٹے کیلئے اور داروغہ جی یہ ہماری دھرم پتنی ہیں۔ بڑی مہمان نواز ہیں یہ...... " میں نے گردن خم کی، ٹھکرائن کے چہرے پر خشونت کے آثار بکھرے ہوئے تھے مجھے جیسے جانتی ہی نہیں تھی، میں نے خود ہی کہا۔ "ابھی ابھی ٹھاکر جی سے باتیں ہو رہی تھیں، آپ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ " وہ پھر چونکی اور مجھے دیکھنے لگی، میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹھاکر سے بولی۔

"آج لکشمی پوجا ہے، کچھ انتظام و نتظام بھی کیا تم نے؟"

"ارے ہمیں کیا کرنا، ہماری ٹھکرائن جیتی رہیں، بھلا گھر کے کام کاج میں ہم کبھی کوئی دخل دیتے ہیں۔ "

"ہاں بس بیٹھ کر باتیں بنانے لگتے ہو اس کے علاوہ اور کوئی کام کرنا آتا ہے تمہیں۔ " ٹھاکر عجیب سے انداز میں ہنسنے لگا، وہ پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی گئی، میری طرف دیکھ کر بولا۔

"دوش اس کا نہیں ہے پہلے ایسی نہیں تھی، مگر عورت جب تک ماں نہ بنے اپنے آپ کو پورا نہیں سمجھتی یہ بھی ادھوری ہے اور اپنے آپ کو ادھورا ہی سمجھتی ہے۔ "

"ہاں ہوسکتا ہے، میں اب چلوں۔ "

"برا تو مان گئے ہوگے، یہ کہنا تو بیکار ہے کہ برا ہی نہ مانے ہوگے مگر معاف کر دینا اسے۔ بس جو بھگوان کی مرضی اچھا چلتے ہیں۔ " ٹھاکر خود بھی اٹھ گیا، ٹھکرائن کے انداز سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس کے ذہن میں میرے لئے کوئی خاص بات ضرور گونجی ہے۔ میں خود بھی یہاں بے مقصد ہی آیا تھا لیکن اب دن کی روشنی میں ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا تھا۔ اس کی آواز سنی تھی اور ہر طرح کا شبہ مٹ گیا تھا ہنومان مندر میں اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں وہاں سے باہر نکل آیا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ گھومتا پھرتا کھیتوں کی سمت نکل آیا۔ باجرہ پک رہا تھا اور کھیتوں کے رکھوالے ہو ہو کی آوازیں نکال رہے تھے، میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ کھیتوں کی مینڈھ کے پیچھے سے ایک لمبا چوڑا آدمی باہر نکل آیا اور اس طرح میرے سامنے کھڑا ہوگیا جیسے میرا راستہ روکنا چاہتا ہو وہ کڑی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا، میں دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

"کوئی بات ہے بھائی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"تم اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہو نا؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں.........."

"تلسی کا گھر تمہارے سامنے ہے۔ "

"ہاں اللہ دین نے یہ بتایا تھا.........."

"بھاگ بھری تو نہیں آئی وہاں..........؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں کیوں؟"

"بس اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں اس بات کا علم ہوگا، ساری بستی بھاگ بھری کی تلاش میں لگی ہوئی ہے، وہ پاپی عورت ڈائن بن گئی ہے۔ میں بھی اس کی تلاش کرتا پھر رہا ہوں، سبھی کے بال بچے ہیں، مسافر تمہارا بستی میں رہنا اچھا نہیں ہے، کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تمہیں۔ " میں ہنسنے لگا میں نے کہا۔ "کیا بھاگ بھری میرا بھی کلیجہ نکال کر کھا جائے گی۔ ؟"

"نہیں اور کوئی بات ہوسکتی ہے، پچھلی رات تم ہنومان مندر کی طرف کیوں گئے تھے۔ ؟" ایک لمحے کیلئے میرے ذہن میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی، میں نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "میں اور ہنومان مندر، نہیں بھائی میں مسلمان ہوں، تمہیں اسی سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرا ہوں، میرا بھلا ہنومان مندر میں کیا کام اور یہ ہنومان مندر ہے کہاں؟"

"ادھر سیدھے ہاتھ پر کھیتوں کے بیچ بیچ چلے جاؤ، کافی دور جاکر ہنومان مندر نظر آتا ہے۔ پرانا مندر ہے، بھوت پریت کا بسیرا ہے کوئی نہیں جاتا اس طرف مگر میں نے تو رات کو تمہیں ادھر دیکھا تھا۔ "

"بھول ہوئی ہوگی تم سے میں تو آج تک اس طرف نہیں گیا، لیکن کبھی دیکھوں گا ضرور جاکر یہ ہنومان مندر ہے کیسی جگہ۔ "

"بھول کر بھی نہ جانا، بھوت بہت سے لوگوں کو مار چکے ہیں۔ "

"تمہارا شکریہ مگر تمہیں، میرا مطلب ہے یہ خیال کیسے آیا کہ میں تمہیں بھاگ بھری کے بارے میں بتاؤں گا۔ "

"بس ایسے ہی مجھے شبہ ہوا تھا کہ رات کو میں نے تمہیں ہنومان مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ " وہ چلا گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا ان لوگوں کو مجھ پر شبہ ہوگیا ہے۔ البتہ اب مجھے پورا پورا یقین ہوگیا تھا کہ ان وارداتوں کے پیچھے ٹھکرائن ہی ہے۔ سرائے پہنچا تو اللہ دین کہنے لگا۔

"گنگو اور جنک رام دو دفعہ آچکے ہیں تمہیں پوچھتے ہوئے، نہ جانے کیا بات ہے کہہ گئے ہیں کہ جیسے ہی تم آؤ میں تمہیں گنگو کے گھر لے آؤں۔ مجھے یاد آگیا کہ بچے نے اپنے باپ کا نام گنگو ہی بتایا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے یہ بات کھول دینی چاہئے۔ اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ گنگو اور جنک رام نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ گنگو نے سیدھے سیدھے بچے کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور بچے نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہی تھے بابو۔ "

"تم نے میرے بچے کو بچایا ہے مسافر بھیا، یہ احسان تو مر کر بھی نہ بھولیں گے ہم، مگر تمہیں یہ تو پتہ چل گیا ہوگا کہ بھید کیا ہے۔ " گنگو نے کہا۔ اللہ دین حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا بولا۔ "ارے

ہمیں تو کچھ نہیں پتہ۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔ " جواب میں گنگو نے اسے پوری تفصیل بتائی اور بولا۔ " یہ کام تو دیوتا ہی کریں ہیں، مسافر بھیا ہمارے لئے تو دیوتا ہی ہیں نہیں تو ہم بھی گئے تھے کام سے۔ چھورا نے انہیں پہلے بھی دیکھا تھا پہچان لیا اس نے ہمیں ساری کتھا سنائی۔ انہوں نے تو دیوتاؤں ہی جیسا کام کرا تھا خاموشی سے۔ احسان تک نہ جتایا ہم پر۔ "

" دوستو............ تم نے مجھ پر اعتماد کر ہی لیا ہے تو مجھے زبان کھولنی پڑ رہی ہے۔ بے چاری پاگل بھاگ بھری کو بلاوجہ ہی ڈائن سمجھ لیا گیا ہے۔ اصل ڈائن کوہلی رام کی بیوی گیتا ہے۔ مجھے اس کے ڈائن بننے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی ہے۔ پچھلی رات میں بے چین ہو رہا تھا اس لئے ٹہلتا ہوا ہنومان مندر جا نکلا اور وہاں میں نے یہ کھیل دیکھا۔ قصہ یہ ہے کہ گیتا کے ہاں اولاد نہیں ہوتی جس کیلئے وہ جادو ٹونوں کا سہارا لے رہی ہے۔ اپنی آرزو پوری کرنے کیلئے اس نے چھ بچوں کی قربانی دیدی ہے اور ساتویں قربانی آخری ہوگی۔ میں اکیلا تھا ورنہ اسے اس جگہ پکڑ لیتا اس لئے میں نے بچے کی جان بچانے کیلئے شور مچا دیا اور وہ بھاگ گئی۔ پھر میرے لئے یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ البتہ تم لوگ ایک بات ضرور دماغ میں رکھو وہ ساتویں قربانی کیلئے دوبارہ کوشش کرے گی۔ " میرے انکشاف سے سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر جنک رام نے کہا۔

" مسافر بھیا ٹھیک کہتے ہیں۔ بات سمجھ میں آگئی، بالکل سمجھ میں آگئی۔ " ٹھکرائن بڑی ٹوٹکن ہے یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھا مگر وہ ڈائن ایسا کرے گی یہ نہیں سوچا تھا۔ ارے ہوگی ٹھکرائن اپنے گھر کی ہم اس کا دیا کھاویں ہیں کیا۔ چلو گنگو جمع کرو سب کو لٹھیاں لے کر چلو مار مار بھیجا نکال دیں گے اس کا دیکھا جائے گا جو ہوگا کوئی دبیل میں نہیں ہیں ہم، اٹھو ساروں کو بتا دیں جن کے کلیجے چھن گئے ہیں دیکھ لیں گے سب کو............ "

" اگر تم میری بات سن لو تو اچھا ہے۔ " میں نے کہا۔

" بولو مسافر بھیا۔ "

" دیکھو............ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے ٹھاکر کہہ دے گا مسافر جھوٹ بول رہا ہے پھر کیا کرو گے۔ "

" ارے ہمارا چھورا بتا دے گا۔ ہم اسے لے چلیں گے۔ " گنگو نے کہا۔

" میری کچھ اور رائے ہے۔ تم اسے ہنومان مندر میں پکڑو۔ اس وقت جب وہ یہ عمل کر رہی ہو۔ نندا چمار اس کے لئے بچوں کو اٹھاتا ہے۔ تمہیں کسی ایسے بچے کو چھوڑنا پڑے گا جسے نندا اٹھالے۔ ہم سب ہوشیار ہوں گے۔ نندا پر نظر رکھیں گے جیسے ہی نندا اس بچے کو اٹھائے گا ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ اور عین اس وقت دونوں کو پکڑیں گے جب وہ اپنا کام کر رہے ہوں۔ "

" اور اگر چوک ہوگئی تو۔ " جنک رام بولا۔

" چوک ہوگی کیسے، بڑا اچھا مشورہ دیا ہے یہ پھر کوئی کیا بولے گا۔ " اللہ دین نے کہا۔

" سو تو ٹھیک ہے۔ مگر بچہ کونسا ہوگا۔ " لڑکھڑا ا کہ کوئی

" میرا بچہ ہوگا۔ میرا کلو ہوگا۔ " اللہ دین سینہ ٹھونک کر بولا اور میں چونک کر اسے دیـ تھے دین نے کہا۔

" ارے ہم مسلمان ہیں۔ اللہ پر بھروسہ ہے ہمیں جو کچھ ہوتا ہے مولا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پیچھا تو چھوٹے اس ڈائن سے۔ ساری بستی مصیبت میں پھنسی ہے۔ میں تیار ہوں مسافر بھیا۔ "

" ہم سب جان لڑا دیں گے کلو کیلئے، فکر مت کرا اللہ دین بھیا۔ " جنک رام نے کہا۔ اس آمادگی کے بعد اس منصوبے کے نوک پلک سنوارے جانے لگے۔ بالآخر تمام باتیں طے ہوگئیں۔ اس سنسنی خیز عمل کا آغاز آج ہی رات ہونے والا تھا۔

گنگو اور جنک رام کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سارے کام آج ہی نمٹا لینا چاہتے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ گیتا نندی آج ہی دوبارہ یہ کوشش کرے گی۔ اگر ہمارے اندازے بالکل درست تھے اور وہی ان وارداتوں کے پس پشت تھی تو اس نے اس عمل میں جلد بازی نہیں کی تھی۔ ہنومان دیوتا کے چرنوں میں اس نے چھ بچوں کی بلی دی تھی۔ ان لوگوں سے گفتگو کے دوران، میں ان وارداتوں کے درمیانی وقفے معلوم کر چکا تھا۔ ان میں دنوں کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ اسے جب بھی موقع ملا تھا اس نے یہ کام سرانجام دے ڈالا تھا اور شاید پہلی بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ وہ چالاک تھی۔ نہ جانے اسے مجھ پر شبہ کیسے ہوا تھا یا پھر ہو سکتا ہے اس شخص نے اندھیرے میں تیر پھینکا ہو جو مجھے وہاں ملا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نندا ہی تھا خود جتنا چالاک تھا اس کا اندازہ اس کی بات سے ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے مجھے ہنومان مندر کے پاس دیکھا تھا۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ خود وہاں کیا کر رہا تھا۔ اب یہ تو مجھے ہی معلوم تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ گنگو کے گھر سے واپسی پر اللہ دین نے کہا۔

" واہ مسافر بھیا۔ اتنا بڑا کام کر لیا اور ہمیں خبر بھی نہ دی۔ "

" کوئی اتنا بڑا کام بھی نہیں تھا اللہ دین۔ "

" بے چارے گنگو کے بیٹے کو ڈائن کے منہ سے نکال لیا اور کہتے ہو بڑا کام ہی نہیں کیا۔ "

" اللہ کو اس کی زندگی بچانی تھی، وہ بچ گئی میں کیا اور میری اوقات کیا۔ "

" مگر اتی رات گئے تم ادھر نکل کیسے گئے تھے۔ "

" بس دل بے چین ہو رہا تھا۔ سوچا ذرا گھوم آؤں۔ "

" اتی دور، ہنومان مندر کوئی یہاں دھرا ہے۔ بھیا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہمت والے ہو اور پھر ہمیں تو کچھ اور ہی لگے ہے۔ "

" کیا؟ "

" پیر فقیر لگو ہو ہمیں تو۔ راتوں کو نماز پڑھتے دیکھا ہے تمہیں۔ " اللہ دین سادگی سے بولا۔

تو دیوتا ہی کریں و. توبہ، میں ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں!"
انہیں پہلے بھی دیتم نے ہم سے نندا کا نام پوچھا تھا؟"
خاموشی سے ہں، ہنومان مندر کا واقعہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ میں نے بلاوجہ ان دونوں کا نام نہیں لے دیا ہے۔" میں نے کہا۔ اور اللہ دین سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ "سو تو ہے۔ ایک کام تم نے گنگو کے بیٹے کو بچا کر کرا، دوسرا بڑا کام اور کر رہے ہو بھیا۔ بہت بڑا۔"

"وہ کیا؟"

"ارے تم نے بھاگ بھری کا جیون بچالیا، تلسی بے چارے کو بچالیا۔"

"یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ اپنی عقل سے کچھ نہیں سوچتے بھاگ بھری اور تلسی کی جان کے دشمن ہو رہے تھے ایک لمحے میں پلٹ گئے۔ اگر میں نہ روکتا تو شاید سوچے سمجھے بغیر لاٹھیاں لے کر چڑھ دوڑتے کھیا کے گھر پر۔"

"برے نہیں ہیں مسافر بھیا۔ دن رات پریشان ہو رہے ہیں بچوں کو چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔ کیا کریں آخر، اولاد سے بڑھ کر کون ہووے ہے۔ اس کیلئے پاگل ہو رہے ہیں۔"

"مجھے ایک خطرہ ہے۔"

"کیا؟"

"وقت سے پہلے زبان نہ کھول دیں۔ وہ ہوشیار نہ ہو جائے۔ ورنہ پھر اسے پکڑنا مشکل ہو گا۔"

"سمجھا تو دیا ہے۔ اتنے باؤلے نہیں ہیں۔ ساری بات سمجھا دی ہے انہیں۔"

"اس کے علاوہ، زبیدہ بہن تو کلو کو سینے میں چھپائے چھپائے پھرتی ہیں تم اسے خطرے میں ڈال دو گے۔"

"اللہ پر بھروسہ کریں گے بھیا۔ کون تیار ہوتا۔ بستی کے بچے مر رہے ہیں سب ہی اپنے ہیں وہ بھی جو مارے گئے اپنے ہی تھے۔"

"زبیدہ بہن تیار ہو جائیں گی؟"

"وہ عورت ہے، ماں ہے۔ اس سے چار سو بیسی کرنی ہو گی کوئی۔ ہم یہی سوچ رہے تھے۔" اللہ دین کے جذبے کو میں نے سراہا تھا۔ خود بھی مستعد رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا معاملہ ہی ایسا تھا۔ سر شام وہ کلو کو لے کر باہر نکل آیا۔ نہ جانے اس نے بیوی سے کیا کہا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیا تھا، میں بھی احتیاط سے باہر نکل آیا اور سیدھے راستے پر چل پڑا، کافی فاصلے پر اللہ دین مجھے مل گیا، مسکرانے لگا۔

"کیا کہا زبیدہ بہن سے؟" میں نے سوال کیا۔

"ارے بھیا، دیہاتی عورتیں دیہاتی ہی ہووے ہیں، بس میاں نے جو کچھ کہا مان لیا، ہم نے بھی بڑی چار سو بیسی کری، کلو کو چلتے ہوئے دیکھا تو ہم نے آنکھیں پھاڑ دیں اور ایسا منہ بنا لیا جیسے ہماری جان نکل

وہ سامنے ہی موجود تھی، ہم سے پوچھنے لگی کیا ہوا، تو ہم نے اسے کان میں بتایا کہ کلو کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں اور لگتا ہے لقوہ مار جائے گا، بھیا ڈر گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ہم نے اس سے کہا کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، بچے اگر کھیلیں کودیں نہیں تو ایسا ہی ہو جاتا ہے. ایک ڈاکٹر صاحب آئے تھے ایک دفعہ ہماری بستی میں، پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے، وہ پولو پولو کا مرض، کوئی مرض ہووے ہے پولو ....؟"

"پولیو کا........"

"ہاں ہاں بالکل وہی وہی .... تو ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بچوں کو یہ کرنا چاہئے وہ کرنا چاہئے، ہم نے اسے وہی یاد دلا دیا، ڈر گئی کہنے لگی کہ اب کیا کریں۔ باہر کھیلنے دینے کا مطلب یہ ہے کہ کلو کو خطرہ ہو جائے ہم نے کہا ہم کیا مر گئے ہیں، ہم خود ساتھ لے جائیں گے، کھیلنے کودنے کیلئے چھوڑ دیں گے........ رو رو کر کہنے لگی ذرا خیال رکھیو........ ہم نے کہا باؤلی وہ تیرا ہی بیٹا ہے کیا۔ ہمارا کچھ نہیں لگتا، بس یوں بہلا پھسلا کر نکال لائے۔" میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔

"ویسے تم بہت ہمدرد انسان ہو بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو؟"

"بھیا سچی بات بتائیں تمہیں، بستی کے رہنے والے ہندو ہوں یا مسلمان، سارے کے سارے ایک دوسرے کا دکھ اپنا ہی دکھ سمجھے ہیں۔ ہم بھی کوئی ان سے الگ تھوڑی ہیں، ارے ستیاناس ہو اس ٹھکرائن کا، اپنے ہاں اولاد نہیں ہوئی، ایک بیٹا ہو گیا۔ فرض کرو ٹونوں ٹوٹکوں سے، تو سات ماؤں کی گودیں اجاڑے گی، ارے وہ انسان ہے۔ جی تو ہمارا ابھی یہی چاہے ہے بھیا کہ کچا چبا جاویں اس سسری کو دانتوں سے ٹھکرائن کہیں کی، ایسی نہ ہوتی تو ماتا پتا گھر سے باہر نکال کریوں جمال گڑھی میں کیوں پھنکوا دیتے، پتہ نہیں کہاں سے آگئی ڈائن ہماری بستی میں، ہمارا تو جی چاہے ہے کہ ٹھاکر کو ساری باتیں بتا دیں اور اس سے کہیں سب بول، کیا کہہ دے ہے، مگر وہی تمہاری بات سچی ہے کہ وہ مکر جائے گی بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے سب کی سمجھ میں بات آگئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑیں تو پھر دیکھیں کہ کیسے مکرتی ہے ارے بھیجہ باہر نکال دیں گے اس کا، وہیں توڑ مروڑ کر پھینک دیں گے حرام خور کو۔" اللہ دین چلتا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "باقی لوگوں سے ملاقات تو نہیں ہوئی ہو گی؟"

"سب کے سب لگے ہوں گے بھیا۔ معلوم ہے ہمیں، پوری بستی کی مصیبت ہے، کسی ایک آدمی کی نہیں ہے اور اللہ دین کا کہنا سچ ہی نکلا تھا۔ جنک رام اور گنگو ساتھ ہی تھے۔ دو آدمی اور بھی ان کے ساتھ تھے، جنک رام نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

"اللہ دین بھیا، تمہاری یہ بات بستی والوں کو جیون بھر یاد رہے گی، لے آئے کلو کو........؟"

"ہاں بھیا، کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو چھ بچھڑ گئے ہیں ہم سے، ہماری کیا مجال تھی کہ انہیں بچا لیتے، بھگوان کی مرضی تھی، مگر اب کسی اور کو نہ بچھڑنے دیں گے، اللہ کرے ہمارا کلو خیریت سے رہے، مگر کام تو

کرنا ہی تھا نا کسی کو، ہاں بس تم ایک بات بتا دو؟"

"پوچھو بھیا۔" گنگو بولا۔

"سمجھا بجھا دیا ہے سب کو، ارے کہیں کوئی زبان نہ کھول دے، ٹھکرائن ہوشیار ہو جائے گی اور اس کے بعد الٹی ہی گلے پڑ جائے گی، کون مانے گا؟"

"اس کی تو تم چنتا ہی مت کرو بھیا۔ دیکھو اصل بات بس ان لوگوں تک پہنچائی ہے جن کے سینوں میں آگ لگی ہوئی ہے مطلب سمجھ گئے ہوگے اور ان سے کہہ دیا ہے کہ جب پہرے پر نکلیں تو سب سے یہی کہیں کہ بھاگ بھری کی تلاش ہو رہی ہے اور کوئی بات نہیں ہے سب کو اچھی طرح بتا دیا ہے اور یہ بھی سمجھا دیا ہے انہیں کہ کہیں سے بے چاری بھاگ بھری مل جائے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں، ارے ویسے ہی بڑے پاپ ہو چکے ہیں ہم سے ایک بے زبان کو ستایا ہے ہم نے۔ باؤلی تو تھی ہی بے چاری کیا کرتی بول بھی تو نہیں سکتی اپنے بارے میں۔ ہرے رام ہرے رام، ویسے اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"میرا خیال ہے نجو کی بگیا ٹھیک رہے گی۔ ہنومان مندر کا راستہ بھی ادھر ہی سے پڑتا ہے۔" پھر اللہ دین نے آنکھ دبائی کلو کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا "اور نندا کا کیا کیا ہے تم لوگوں نے؟"

"اس کی تم بالکل چنتا نہ کرو۔ چھمن اور شنکر اس پر نظر رکھ رہے ہیں۔ چھمن کے بارے میں تو تمہیں پتہ ہے کہ نندا کا یار ہے مگر اس مسئلے میں اس نے ساری یاری ختم کر دی۔ چھمن شنکر کو اشارے دے گا۔ ظاہر ہے نندا جب اس طرف آئے گا تو چھمن کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کام پکے ہیں بھیا جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ظاہر ہے ہم اس میں کسر تھوڑی چھوڑیں گے۔"

بہرحال یہ لوگ اپنی اپنی جگہ مستعد تھے، میں اور اللہ دین آگے بڑھ گئے۔ جنک رام وغیرہ دوسری سمت مڑ گئے تھے جس جگہ کو نجو کی بگیا کہا گیا تھا وہ ایک چھوٹا سا باغ تھا آموں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ کلو تو آموں کے درختوں کو دیکھ کر ہی مچلنے لگا۔

"ابا کیری کھا لوں............؟"

"ارے ہاں ہاں جا مزے کر، گھوم پھر، کوئی بات نہیں ہے۔" بچہ تھا، خوشی خوشی آگے بڑھ گیا اور اس کے آگے بڑھتے ہی اللہ دین کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے، اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "بھیا ذرا نظر رکھیو............ اللہ کے حوالے کر دیا ہے پر کیا کریں باپ کا دل ہے، ڈرتا تو ہے ہی۔"

"جگہیں بدل لو اللہ دین، تم ایک طرف ہو جاؤ۔ میں ایک طرف ہوا جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ درحقیقت ہم لوگوں نے بڑی مہارت سے کلو کو نظر میں رکھا تھا۔

جھٹپٹے تاریکی میں بدل گئے۔ کلو مزے سے کیریاں توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ بہت دن کے بعد باہر نکلنے کا موقع ملا تھا کھیلنے سے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ پھر جب اچھی خاصی رات ہو گئی اور کوئی واقعہ نہیں ہوا تو اللہ دین

...نے بجائی، میں جواب میں اس کے قریب پہنچ گیا وہ بولا۔ "کیا خیال ہے بھیا اور انتظار ...؟"

"میرا خیال ہے اب بے کار ہے۔ مگر اب یہ کام سرشام ہی شروع ہو جانا چاہئے، رات کو تو خاص طور ...ہو سکتا ہے کہ آخر اتنی دیر تک ان حالات میں کلو باہر کیسے موجود ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو مسافر بھیا، تمہارا دماغ بہت تیز ہے۔" غرض یہ کہ ہم واپس چل پڑے۔ سرائے ...ایک ایک کر کے کئی آدمی آئے، مسکوٹیں ہوئیں اور یہ سلسلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا پھر دوسرے ...شام کے چار بجے ہی کلو کو باہر لے آیا گیا شام تک انتظار کیا گیا آج مزید احتیاط برتی گئی تھی، میرے ...میں مایوسی پیدا ہوتی جا رہی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہوشیار ہو گئی ہو اور اب اپنا عمل بدل دے۔ ویسے ...رام، گنگو اور دوسرے چند لوگوں کو زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگوں نے مستقل ہنومان ...کے گرد ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور ایسی جگہوں پر پوشیدہ ہو گئے ہیں جہاں سے آنے جانے والے پر ...رکھیں اور ان کے بارے میں کسی کو پتہ نہ لگے یہ اطلاع بھی تسلی بخش تھی اور تیسرے دن وہ ہو گیا جس ...پچھلے دو دنوں سے تگ و دو کی جا رہی تھی۔

اس وقت کلو کیریاں توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ یہ جگہ اسے بہت پسند تھی۔ آتے ہوئے اس نے کئی ...رے بچوں کو بھی دعوت دی تھی۔ مگر بچے اسے حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے گھروں میں ...گھسے تھے۔ کسی نے کلو کا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود ہی یہاں آ گیا تھا۔ میں اور ...اللہ دین ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔ کلو کو پتہ نہیں تھا کہ ہم درخت پر ہیں۔ وہ اس درخت سے ...صرف دو تین گز کے فاصلے پر کیریاں اکٹھی کر رہا تھا کہ دفعتہً ہی اللہ دین نے میرے کان میں سرگوشی ...کی۔

"مسافر بھیا۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور میں نے اس طرف دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا ...میں نے ایک نظر میں پہچان لیا نندا ہی تھا، وہ اسی سمت آ رہا تھا، کمبل اوڑھے ہوئے تھا، لیکن صرف کاندھوں ...تک حالانکہ موسم کمبل کا نہیں تھا، میرے چہرے پر خون سمٹ آیا۔ نندا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلو کے ...پاس پہنچ گیا ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں اور کلو کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ارے تو اللہ دین کا چھورا ہے نا؟"

"ہاں نندا چاچا، مجھے نہیں پہچانتے؟"

"کیوں نہیں............ مگر یہاں اکیلا کیا کر رہا ہے............؟"

"کیریاں چن رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا............ تجھے اکیلا چھوڑ دیا اللہ دین نے............ تجھے پتہ ہے کہ بستی میں ڈائن پھرتی ہے۔"

"ڈائن کیا ہوتی ہے نندا چاچا؟"

"کتنی کیریاں جمع کرلیں تو نے..........؟"

"بس یہ ہیں۔"

"بس تھوڑی سی اور جمع کرونگا، پھر تو رات ہونے ہی والی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ چل ٹھیک ہے اور جمع کرلے، وہ دیکھ وہ درخت کے نیچے پڑی ہوئی ہیں۔"

"کدھر؟" کلو نے معصومیت سے پوچھا! اور اس سمت دیکھنے لگا اور اسی وقت نندا نے شانوں پر پڑا ہوا کمبل کلو پر ڈال دیا اور اسے بھینچ لیا۔ اللہ دین کے حلق سے آواز نکلنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کا منہ بھینچ لیا۔ اس کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نندا کلو کو دبوچے ہوئے تھا اور کلو کمبل میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اللہ دین نے سرگوشی میں کہا۔ "بب بھیا۔ کک کہیں دم ہی نہ نکل جائے میرے بچے کا۔"

"نہیں۔ وہ لوگ بچوں کو زندہ رکھتے ہیں۔" اس کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی۔ میں نے اس کے بدن میں تھرتھری محسوس کی اور میرا دل دکھنے لگا۔ بہر حال ساری باتوں کو بھول کر میں بھی مستعد ہو گیا تھا۔ نندا کلو کو کندھے پر ڈال کر تیزی سے ہنومان مندر کے راستے کی جانب چل پڑا میں اور اللہ دین نیچے اترے ہی تھے کہ چھمن اور شنکر پہنچ گئے انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"ساری خبر تھی ہمیں کام ہو گیا نا، مگر چنتا نہ کرنا بھیا، بیس آدمی ہیں مندر کے آس پاس۔ سارے کے سارے لمبے لمبے چکر کاٹ کر وہاں پہنچ چکے ہیں۔ ایک ایک جگہ نظر رکھی جا رہی ہے، اور تو اور دو تین تو مندر کے اندر موجود ہیں اور ستونوں کے بیچ چھپے ہوئے ہیں جیسے ہی نندا اس طرف چلا، چھمن نے مجھے خبر کری اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے ان سارے آدمیوں کو جو تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ تو پروا مت کریو بھیا۔ بال بیکا نہیں ہوگا ہمارے کلو کا۔ پہلے ہماری جان جائے گی۔"

"ارے بھیا خدا کرے، ڈائن سے ہمارا پیچھا چھوٹ جائے چلیں چلیں۔؟"

"ایک ایک کرکے، ادھر ادھر گھوم کر۔ نندا بڑا چالاک ہے اور سنو، بات ابھی یہیں ختم تھوڑی ہوئی ہے، چلو چلو ہم بھی چل رہے ہیں۔" جنک رام نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ بڑی احتیاط سے نندا کو نگاہوں میں رکھے ہوئے چل رہے تھے وہ محتاط قدم اٹھاتا ہوا مندر کی طرف جا رہا تھا جنک رام نے کہا۔

"مکھیا جی کی حویلی پر بھی پہرہ لگا ہوا ہے اور سارے لوگ نگرانی کر رہے ہیں جیسے ہی گیتا نندی باہر نکلیں گی اس کی بھی خبر ہمیں مل جائے گی۔" ہم اس طرح باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، جھٹپٹے تیزی سے رات میں تبدیل ہو گئے۔ نندا مندر میں داخل ہو گیا تھا۔ ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ اللہ دین بے چارہ تو ابھی تک تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ آواز بھی اتنی مدھم ہو گئی تھی اس کی کہ مجھے حیرت تھی۔ غرض یہ کہ نندا تو مندر میں داخل ہو گیا میں اور اللہ دین مندر کے بالکل قریب دیواروں کے ساتھ آگے بڑھ گئے دفعتاً ہی اللہ دین نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اِدھر اُدھر دیکھو۔ اُدھر دیکھو۔" میں نے اللہ دین کا اشارہ سمجھ لیا۔ مندر کا اس سمت کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اینٹیں ایک دوسرے پر ڈھیر کی شکل میں پڑی ہوئی تھیں اور ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ تو مندر میں اندر جانے کا راستہ بھی ہو سکتا تھا میں انتہائی محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اللہ دین سے سرگوشی کر کے میں نے اسے بھی محتاط رہنے کیلئے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ ہم لوگ ایک ایک انچ سرک رہے تھے کہ کہیں کوئی اینٹ اپنی جگہ سے سرک نہ جائے اور نندا ہوشیار نہ ہو جائے۔ لیکن ایک بات اور بھی تھی اگر نندا ہوشیار ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا وہ بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن جتنے آدمیوں کی اطلاع ملی تھی کہ وہ مندر کے گرد چھپے ہوئے ہیں۔ وہ اسے بھاگنے کہاں دیں گے۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا کہ گیتا نندی کو یہاں کے بارے میں اطلاع مل جائے۔ بہر طور ٹوٹے ہوئے حصے سے ہم مندر کے ایک پتلے سے حصے میں داخل ہو گئے اور اس پتلی سی راہداری میں جہاں کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے اور چوہے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے آگے بڑھتے ہوئے ہم سامنے کے حصے میں پہنچ گئے جہاں سے تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس علاقے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ جہاں ہنومان کا بت ایستادہ تھا۔ میں نے اللہ دین کے کان سے منہ جوڑ کر آہستہ سے کہا۔ "دیکھو بھیا، ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو ساری کارروائی بیکار ہو جائے گی سنبھل کر رہنا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اللہ دین نے کہا اور ہم ستونوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے سامنے نظر ڈالی جا سکتی تھی، لیکن ہمارے عقبی ستون میں بھی کچھ لوگ پوشیدہ تھے۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ سرسراہٹیں سنائی دی تھیں اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ پوری طرح ہوشیار ہیں۔ نندا مزے سے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا اور ہنومان کے بت کے قدموں میں کلو پڑا ہوا نظر آ رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کی مدھم مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے اس آواز پر کان لگا دیئے کہہ رہا تھا۔

"نندا چاچا۔ نندا چاچا چھوڑ دو مجھے، کیوں لے آئے ہو یہاں۔ نندا چاچا یہ میرے ہاتھ پاؤں، یہ میرے ہاتھ پاؤں کیوں باندھ دیئے ہیں تم نے..........؟"

"آواز بند کر۔ نہیں تو چھری پھیر دونگا تیری گردن پر جیسے کہ رمضان بکرے کی گردن پر چھری پھیرتا ہے بات سمجھ میں آئی۔"

"نہیں نہیں نندا چاچا چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو مجھے نندا چاچا۔"

"ارے چپ ہوتا ہے یا نہیں۔" نندا نے سچ مچ اپنے لباس سے وہ خنجر نکال لیا جس کا میں پہلے بھی دیدار کر چکا تھا۔ اللہ دین نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے تھے۔ میں نے اس کے شانے پر آہستہ آہستہ تھپکیاں دیں اور وہ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جن میں بے کسی اور بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے بچے کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ کلو چیختا رہا، چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا اور نندا مزے سے بیڑی پر بیڑی سلگاتا رہا بڑا صبر آزما وقت تھا۔ ایسے لمحات گزارنا زندگی کا سب

سے مشکل کام ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جن لوگوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا تھا کہ ڈائن و میں لاکر رہیں گے وہ بھی بڑے صبر ہی سے وقت گزار رہے تھے۔ کیا مجال کہ کسی کو چھینک آجائے۔

پھر اچانک ہی سر سراہٹیں بلند ہوئیں۔ یوں لگا جیسے غیر محسوس طریقے سے ایک نے دوسرے دوسرے نے تیسرے کو خبر دی ہو لمحہ لمحہ سنسنی خیز تھا اور میرا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔ یہ سرسراہٹیں در حقیقت ایک پیغام ہی تھیں اور اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب گیتا نندی مندر کے احاطے میں داخل ہوئی۔ کالے رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اوپر سے شال اوڑھے ہوئے تھی اکیلی تھی اور پر اعتماد قدموں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ نندا چوک کر سیدھا ہو گیا۔

"جے دیوی۔" گیتا نندی نے کوئی جواب نہیں دیا آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور قریب پہنچ گئی اس نے بھاری لہجے میں کہا۔ "نندا اگر آج ہمیں کامیابی نہ ہوتی تو یوں سمجھ لے کہ میری ساری تپسیا چلی جاتی۔"

"میں جانتا ہوں دیوی۔" نندا نے کہا۔

"سوامی ادھیرنا چندو ساتویں دن درشن دیں گے اور بس پھر میرا کام بن جائے گا۔"

"ہاں دیوی سات دن رہ گئے ہیں۔"

"بستی والے الگ ہوشیار ہیں۔ خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" نندا نے کہا۔

"چل ہاتھ پاؤں کھول دے اس کے۔" گیتا نندی نے کہا اور نندا نے خنجر نکال لیا۔ اس نے کلو کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹ دیں۔ کلو نے بھی اسی طرح تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر نندا نے اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ گیتا نندی نے خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اللہ دین در حقیقت صابر تھا۔ اس کی جو حالت ہو رہی تھی مجھے اندازہ تھا مگر ضبط کئے ہوئے تھا۔ گیتا نندی کی آواز ابھری۔

"جے بجر نگا۔ ساتویں بلی دے رہی ہوں اسے سوئیکار کر بجرنگ بلی۔ میری گود ہری کر دے۔"

"ٹھکرائن، کمینی، کتیا۔ میں تیری بلی دیدوں گا۔ ڈائن شیطان۔" اللہ دین کی بھیانک آواز سے مندر گونج اٹھا اور اس نے دیوانوں کی طرح لمبی چھلانگ لگائی۔ گیتا نندی اچھل پڑی۔ اس نے خونی نظروں سے اللہ دین کو دیکھا پھر کلو کو۔ پھر وہ بھیانک آواز میں بولی۔

"تو بھی مارا جائے گا بھٹیارے۔ پیچھے ہٹ جا۔ مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔ نندا اسے سنبھال۔" لیکن صبر کرنے والوں سے کہاں صبر ہوتا وہ سب بیک وقت نکل پڑے۔ نندا کو انہوں نے دبوچ لیا۔ ٹھکرائن نے اللہ دین پر وار کیا مگر اللہ دین کی تقدیر اچھی تھی۔ اس کے سینے پر بس ہلکی سی خراش لگی۔ مشتعل

نے ٹھکرائن کے لمبے بال پکڑ کر اسے پیچھے سے گھسیٹ لیا تھا ورنہ اللہ دین ضرور مارا جاتا گیتا نندی نے لوگوں کو زخمی کر دیا۔ مگر کیونکہ بے شمار افراد تھے اس لئے وہ زیادہ دیر خنجر نہ گھما سکی کسی نے اس پر لاٹھی مار کر خنجر گرا دیا۔ اور جونہی خنجر اس کے ہاتھ سے نکلا لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ بھول گئے کہ وہ ٹھکرائن ہے۔ اس کے بال نوچ ڈالے گئے۔ کپڑے تار تار کر دیئے گئے۔ نندا کی تو شکل ہی پہچانی جارہی تھی۔ باہر سے بہت سی آوازیں ابھریں۔

"ٹھاکر جی آگئے، کوہلی رام جی آگئے۔" ٹھاکر بہت سے لوگوں کے ساتھ اندر آگیا تھا۔

"کیا ہے، کیا ہو رہا ہے۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔ ارے یہ۔ یہ گیتا نندی، چھوڑ دو اسے۔ چھوڑ دو ورنہ گولی چلوا دوں گا۔" ٹھاکر کے دو آدمیوں کے پاس بندوقیں تھیں۔

"انصاف سے کام لو ٹھاکر۔ کتنی گولیاں چلاؤ گے۔ آخر میں تمہارے پاس گولیاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر کیا ہوگا، جانتے ہو۔" پیچھے سے کسی نے کہا۔

"ہم تمہیں گولیاں چلانے کیلئے نہیں لائے ٹھاکر، اس لئے بلا کر لائے ہیں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

"سب کچھ تو کر ڈالا تم نے۔ اب میں کیا دیکھوں۔" کوہلی رام بولا۔

"اس بھول میں نہ رہنا ٹھاکر، یہ سب کچھ نہیں ہے۔ زندہ جلائیں گے ہم اس ڈائن اور اس چمار کو۔ بھگوان کی سوگند اسے زندہ نہ جلایا تو ماں کا دودھ حرام ہے ہم پر۔" رگھبیر نے کہا۔

"دیکھو کتنوں کے گھاؤ لگائے ہیں اس نے۔ اپنی پھوٹی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ارے تم دھن والے کیا ہوا اپنے آپ کو۔ چلواؤ گولی۔ چلواؤ ٹھاکر..........!" رام پال نے کہا۔ اس کا بیٹا بھی مارا گیا تھا۔

"گیتا نندی۔ کیا ہے یہ سب کچھ..........؟ یہ سب کیا ہے، گیتا..........!"

"جھوٹے ہیں پاپی سارے کے سارے۔ سب کچھ اس مسافر کا کیا دھرا ہے۔ یہ سب اس کی سازش ہے۔" ٹھکرائن نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"نام مت لینا اس دیوتا کا ٹھکرائن۔ بھگوان کی سوگند زبان کاٹ لیں گے تمہاری۔" گنگو دھاڑا۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں ٹھکرائن..........؟" کوہلی رام نے پوچھا۔

"ہنومان پوجا کرنے آئی تھی۔ سپنے میں درشن دیئے تھے انہوں نے بلایا تھا مجھے، سو نندا کو ساتھ لے آئی!" گیتا نندی بولی۔

"تمہارا منہ ہے ٹھاکر جو رکے ہوئے ہیں۔ نہیں تو لاٹھیاں مار مار کر بھیجہ باہر کر دیتے اس کا۔" پرجوش آدمی بولا۔

"ارے تم منہ دیکھو ٹھاکر کا۔ ہم نہیں دیکھیں گے مارو اس حرام خور کو، جان سے مار دو..........!" لوگ ایک بار پھر بے قابو ہو گئے۔ چند افراد نے بندوق برداروں پر حملہ کر کے بندوقیں

چھین لیں۔ صورتحال بگڑتے دیکھ کر میں نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر چیخ کر کہا۔

”سنو بھائیو! کلو کی جان بچ گئی ہے۔ اللہ نے گنگو کے بیٹے للو کو بھی بچالیا ہے گیتانندی اور نندا کو پ
کر حویلی لے چلو، پوری بات ٹھاکر کو بتاؤ۔ پھر دیکھو وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔“

”فیصلہ ہم کریں گے ٹھاکر نہیں۔“

”پھر بھی کوہلی رام کو تفصیل تو بتاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ لے چلو اس ڈائن کو۔ لے چلو۔“ لوگوں نے میری اتنی بات مان لی۔

”کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تم نے اس کے۔ یہ چادر اڑھادوں میں اسے۔“ ٹھاکر نے کہا۔

بندوقیں اب دوسروں کے ہاتھوں میں تھیں اس لئے کوہلی رام بھی بے بس ہو گیا تھا۔ گیتانندی اور نندا چمار کو مندر سے باہر لایا گیا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اور پھر پورا جلوس ہی واپس چل پڑا۔ جنک رام، گنگو اور اللہ دین میرے ساتھ تھے۔ راستے میں جنک رام نے کہا۔

”ہم کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ٹھاکر پولیس کو بھی بلا سکتا ہے۔ اور اگر پولیس آگئی تو ٹھکرائن بچ جائے گی۔“

”سو تو ہے............“

”بستی میں گھستے ہی دس بیس آدمیوں کو دوڑا دو، پوری بستی جمع کر لو، سب کے سب ٹھاکر کی حویلی کو گھیر لیں کسی کو بستی سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ جس کے پاس جو ہتھیار ہے لے کر آجائے۔ ٹھاکر کوئی چال نہ چل جائے کہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہا تو نے جنکیا۔ میں دوڑ کر بستی جاتا ہوں۔ ارے آؤ رے آؤ دو چار میرے ساتھ............“ گنگو نے کہا۔ فوراً چند لوگ اس کے ساتھ ہو لئے اور گنگو جلوس سے آگے دوڑ گیا............ پھر جب بستی میں داخل ہوئے تو بستی کے تمام گھر روشن ہو چکے تھے۔ لوگ چیختے پھر رہے تھے۔ ”ڈائن پکڑی گئی بھائیو۔ سب کے سب گھروں سے نکل آؤ۔ ٹھاکر کی حویلی کے سامنے جمع ہو جاؤ۔ ڈائن پکڑی گئی۔“ جلوس ٹھاکر کی حویلی پہنچا تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا ملا۔ گنگو حویلی کے دروازے پر بندوق لئے جما ہوا تھا۔ بیس پچیس آدمی اس کے ساتھ تھے۔ جو لوگ حویلی میں تھے انہیں نہتا کر کے باہر جمع کر لیا گیا تھا اور دو آدمی ان پر بندوقیں تانے ہوئے تھے............! ٹھاکر آگے بڑھا تو گنگو نے اس پر بندوق تان لی۔

”تم اندر نہیں جاؤ گے ٹھاکر۔ جب تک فیصلہ نہیں ہو جائے گا اندر نہیں جاؤ گے۔“ گنگو نے کہا۔

”تم لوگوں نے میرے گھر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ جانتے ہو اس کے جواب میں پولیس کیا کرے گی۔“

”یہ کام اب پولیس نہیں کرے گی ٹھاکر، ہم کریں گے۔ بھول جاؤ پولیس کو، بچے ہمارے مارے گئے ہیں پولیس کے نہیں۔“ گنگو نے کہا۔

”میں مکھیا ہوں تمہارا............!“

”یہیں پنچایت ہوگی۔ یہیں فیصلہ ہوگا۔ پھر اندر جاؤ گے تم............“

”تو پھر فیصلہ تم ہی کر لو، میری کیا ضرورت ہے۔“

”فیصلہ تو ہو گیا ہے ٹھاکر۔ زندہ جلائیں گے ہم ان دونوں کو............!“ کوہلی رام کو اندازہ ہو گیا کہ ...رتحال بہت بگڑی ہوئی ہے۔ وہ پریشانی سے دوسروں کی صورت دیکھنے لگا۔ بستی کے لوگ چاروں ...ف سے آکر جمع ہو رہے تھے۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا اور میرا ...جواب دے رہا تھا۔ کوئی شک نہیں ہے گیتانندی کے مجرم ہونے میں۔ چھ معصوم بچوں کی جان لی ہے اس نے۔ اس کے ساتھ یہی سب ہونا چاہئے۔

”اللہ دین۔ کلو کو گھر پہنچا دو۔“ میں نے کہا۔

”کلیجہ نکل گیا ہے میرا مسافر بھیا۔ ہائے کیا حالت ہو رہی تھی میرے بچے کی ارے میں تو چاہتا تھا وہیں ...رڈالتے ان دونوں کو۔ یہ ٹھاکر وہاں کیسے پہنچ گیا۔“

”یہ بات تو پہلے ہی طے کر لی گئی تھی کہ کچھ لوگ ٹھاکر کو بلا لائیں گے تاکہ وہ بھی دیکھ لے۔“

”اب کیسے رنگ بدل رہا ہے سسرا۔ گنگو نے ٹھیک کرا بھیا نہیں تو سسرا پولیس بلا لیتا اور پھر ہماری ...دال نہ گلتی، بچا لیتا وہ کسی نہ کسی طرح ٹھکرائن کو، ٹھیک ہے مسافر بھیا، ہم کلو کو گھر پہنچا دیں ابھی آتے ہیں۔“ اور اللہ دین وہاں سے چلا گیا۔ مجھے صورتحال کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ بستی والے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ حیران تھے اس بات پر کہ ڈائن بھاگ بھری نہیں تھی اور اس کی طرف شبہ ایسے ہی چلا گیا تھا۔ ٹھکرائن اصل ڈائن ہے، بات آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھی، لوگ ایک دوسرے کو تفصیل بتا رہے تھے، وہ لوگ سب سے زیادہ مشتعل تھے جن کے بچے ٹھکرائن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ سب کچھ وہیں کر ڈالتے، لیکن جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی طرح ٹھکرائن اور نندا کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ بہت سے لوگ جنگل اور کھیتوں کی طرف بھی نکل گئے تھے ان کی آمد کے بعد ان کے ارادوں کا پتہ چلا، لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے اور حویلی کے سامنے ہی ایک صاف ستھرے حصے میں انبار کرنے لگے تھے ٹھکرائن کو حویلی میں نہیں جانے دیا گیا تھا بلکہ وہیں ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا، نندا بھی تھوڑے فاصلے پر موجود تھا، گیتانندی جتنا شور مچا سکتی تھی، مچا چکی تھی اور اب اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ٹھاکر کوہلی رام لوگوں سے صلاح و مشورے کر رہا تھا۔ تقریباً ساری بستی ہی امنڈ آئی تھی بس عورتیں اور بچے ہی گھروں میں رہ گئے تھے۔ تلسی بھی موجود تھا۔ مگر اتنے فاصلے پر کہ میں اس کے چہرے کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ بہر طور، یہ ہنگامہ آرائیاں جاری رہیں۔ لوگوں کی زبانی ان فیصلوں کا پتہ چل رہا تھا جو کوہلی رام اور دوسرے لوگوں کے درمیان بات چیت کرنے سے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ صبح کو پنچایت ہوگی اور ساری باتیں سننے کے بعد فیصلے کئے جائیں گے۔ بستی میں جیسے کوئی تہوار منایا جا رہا تھا۔ پوری بستی روشن تھی، لوگ آ جا رہے تھے ٹھاکر کوہلی رام بھی ایک طرف بیٹھ گیا تھا تھک کر۔ غرض یہ کہ ہنگامے ساری رات

جاری رہے۔ اللہ دین میرے پاس واپس آگیا تھا اب وہ خاصی بہتر حالت میں نظر آرہا تھا۔ جنک رار
اور گنگو وغیرہ بھی میرے پاس ہی موجود تھے۔ ان دونوں کو مجھ سے بڑی عقیدت ہوگئی تھی۔ خاص طور
سے گنگو کو جس کا بچہ قربان ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ اللہ دین کیلئے بھی بڑی عقیدت کے الفاظ ادا کئے
جارہے تھے کہ اس نے اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نہ تو ٹھاکر کوہلی
رام یہ بات مانتا کہ اس کی دھرم پتنی ڈائن ہے اور نہ ہی ٹھکرائن رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی۔ جن لوگوں نے
اندر کا منظر دیکھا تھا وہ تو خیر کسی اور بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ لیکن بعض لوگوں کے دلوں
میں شک وشبہ بھی پایا جاتا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی، آخر کار صبح ہوگئی۔ ٹھاکر کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے بندھ
کر رہ گیا تھا وہ، پتہ نہیں اس کے اپنے دل میں کیا تھا۔ ٹھکرائن بھی اب مضمحل نظر آرہی تھی غالباً اب اسے
اپنی تقدیر کا فیصلہ معلوم ہوگیا تھا۔ صبح کو لوگ منتشر ہوئے اور کچھ دیر کے بعد پنچایت جم گئی۔ جمال
گڑھی کے بڑے بوڑھے ایک جگہ بیٹھ گئے ٹھاکر کو اس وقت مکھیا کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت
سے لوگ ایسے تھے جو اس کی عزت کرتے تھے۔ ٹھاکر کے ملازم اس بات پر حیران بھی تھے اور شرمندہ
بھی کہ ٹھکرائن کی نوکری کرتے رہے تھے۔ اب ان کے خیالات بھی بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔
بالآخر لوگوں سے خاموش ہونے کیلئے کہا گیا اور پھر میری پکار پڑی۔ اللہ دین نے کہا۔

"میں جانتا تھا بھیا، پنچایت تمہیں ضرور بلائے گی گنگو جنک رام اور وہ بہت سے آدمی جن کے بچے
مرے تھے میرے ساتھ ہی آگے بڑھے تھے۔ پنچایت والوں نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا اور میں ان کے سامنے
بیٹھ گیا ٹھکرائن غضبناک آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، نندا کی حالت اب کافی خراب ہوگئی تھی۔ اس کی
نظریں بار بار لکڑیوں کے اس ڈھیر کی جانب اٹھ جاتی تھیں، جسے اب چتا کی شکل دیدی گئی تھی، ایک راستہ
رکھا گیا تھا ٹھکرائن اور نندا کو اندر پہنچانے کیلئے۔ باقی پوری چتا ایسے بنادی گئی تھی جیسے مردوں کو جلانے
کیلئے شمشان گھاٹ میں بنائی جاتی ہے۔ ایک بزرگ نے کہا۔

"ٹھاکر کوہلی رام ساری باتیں ہمیں پتہ چل گئی ہیں، اور اب فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا ہے تو اگر مکھیا کی
حیثیت سے اس چوکی پر بیٹھنا چاہے تو اب بھی بیٹھ سکتا ہے۔ لیکن فیصلہ انصاف سے کرنا ہوگا، کوئی ایسی
بات نہیں مانی جائے گی جو جھوٹی ہو۔"

"تمہاری مرضی ہے دھرمو چاچا، جیسا من چاہے کرو۔" ٹھاکر کوہلی رام نے اداس لہجے میں
کہا۔

"مسافر بھیا تم کسی اور بستی سے ادھر آئے اور تم نے بھاگ بھری کو اس لاش کے پاس بیٹھے دیکھا۔
کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں بالکل سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ بھاگ بھری صرف بیٹھی ہوئی تھی، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم
ہوا کہ وہ پاگل ہے ایک پاگل عورت لاش کو دیکھ کر اس طرح بیٹھ بھی سکتی ہے۔ اسے ٹٹول بھی سکتی ہے
اور یہی بات میں نے دوسروں سے کہی تھی۔"

"اچھا بھیا اب تم لوگ ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہیں پتہ کیسے چلا کہ ٹھکرائن گیتا نندی ہنومان مندر میں بچوں کی

بلی دیتی ہے۔"
"میں بتاتا ہوں دھرمو چاچا۔ مسافر بھیا کو شبہ ہوگیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور بھاگ بھری ڈائن
نہیں ہے، سو وہ ایک رات ہنومان مندر کی طرف نکل گئے جہاں انہوں نے گیتا نندی اور نندا کو دیکھا وہ
میرے بچے کو پکڑ کر لے گئے تھے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے انہوں نے اور وہی سب کچھ ہو رہا تھا
جو آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا بیٹا للو وہاں پڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے
تھے، مسافر بھیا اکیلا تھا اس لئے اس نے شور مچادیا۔ گیتا نندی اور نندا چمار بھاگ گئے وہاں سے اور میرا
بچہ مسافر بھیا کی وجہ سے بچ گیا۔ وہی اسے لے کر آئے اس سے گھر کا پتہ پوچھا اور چپ چاپ اسے گھر
میں چھوڑ گئے، میرے گھر والوں کو اور مجھے تو اس کا پتہ بھی نہیں تھا۔ لیکن صبح کو جب ہم نے للو کی حالت
دیکھی تو وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا اور بار بار چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے نہ مارو مجھے گھر جانے دو۔ بری
حالت ہوگئی ہماری، بڑی مشکل سے ہم بچے کو سمجھا بجھا کر اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوئے تو اس
نے یہ کہانی سنائی مسافر بھیا کے بارے میں بھی بتایا، ہم نے معلومات کیں تو مسافر بھیا نے ہمیں اصل بات
بتادی۔ وہ باہر کے آدمی ہیں۔ لیکن ہمارے لئے تو دیوتا سمان ہیں۔ میرے بچے کا جیون بچایا ہے انہوں
نے۔ میں تو ان پر ہزار جیون قربان کرسکتا ہوں سمجھے دھرمو چاچا۔ بعد میں ہم سب نے مل کر یہ طے کیا کہ
ایسا کام کیا جائے جس سے سب کو اصل بات معلوم ہوجائے ایسے ہی اگر ہم کوہلی رام کو یہ باتیں بتاتے تو
بھلا چلتی ہماری۔ اور پھر میں جنک رام اور دوسرے کچھ سر جوڑ کر بیٹھے۔ اللہ دین نے اپنے بیٹے کی قربانی
دینے کا فیصلہ کیا اور ایسا موقع دیا کہ نندا کلو کو اغواء کرلے اور ہم سب اس کی تاک میں لگ گئے۔ اس کی
گواہی بہت سے لوگ دیں گے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بس کچھ دیر ہی تھی گیتا نندی کلو کو مار
ڈالتی مگر ہم سب تیار تھے۔"

"گیتا نندی ایسا کیوں کرتی تھی؟"

"اسی سے پوچھو۔"

"بتائے گی ٹھکرائن؟"

"جھوٹ بول رہے ہیں سب، سب جھوٹے ہیں۔ سب پاپی دشمن ہوگئے ہیں میرے، ایک ایک کو
ٹھیک کردونگی۔ دیکھتے رہو تم سب۔ مہاراج ادھیرنا چندو چلّے میں نہ بیٹھے ہوتے
تو......... تو.........!"

"ادھیرنا چندو.........!" ٹھاکر کوہلی رام حیرت سے بولا۔

"وہ کالا جادوگر.........!" دھرمو چاچا نے کہا۔ "اس سے تیرا کیا واسطہ؟"

"گیتا نندی۔ اس سے تیرا کیا سمبندھ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں بتاؤں گی کسی کو!"

"نندا بتائے گا ارے او پاپی روٹی کے کچھ ٹکڑوں کے لئے تو نے کتنے گھر اجاڑ دیئے زبان کھول دے
شاید بچ جائے نہیں تو زندہ پھونک دیا جائے گا زبان کھول دے پاپی اپنی چتا دیکھ رہا ہے تو۔"

نندا کی قوت برداشت جواب دے گئی دھاڑیں مارنے لگا چیخ چیخ کر رونے لگا "ہم نردوش ہیں کھیا جی۔ ہمارا دوش نہیں ہے۔ ہمیں تو............ ہمیں تو ٹھکرائن نے مجبور کر دیا تھا۔" گیتا نندی چونک پڑی۔ اس نے گھور کر نندا کو دیکھا۔

"کیا بک رہا ہے نندا؟"

"ارے ارے چِتا تو بنوا دی تم نے ہماری ٹھکرائن اب بھی چپ رہیں۔"

"ادھیرنا چندو تجھے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ بھسم کر دینگے تجھے۔"

"وہ تو بعد میں بھسم کریں گے ابھی جو بھسم ہو رہے ہیں اسے کون روکے گا؟"

"ارے بولنے دے گیتا نندی۔ پنچایت کے بیچ دخل نہ دے۔"

"سب جھوٹے ہیں۔ سب کائر ہیں اور............ اور تم دیکھ رہے ہو کوہلی رام............ تم چپ دیکھ رہے ہو۔ بندوقیں نکالو، بھون دو سسروں کو۔" ٹھکرائن غضب ناک لہجے میں بولی۔

"تو نے یہ کر کیا دیا ہے گیتا۔ جیون بھر مجھے دبائے رکھا۔ میں انہیں کیسے دباؤں؟" ٹھاکر بے بسی سے بولا۔

"رہے نا نیچ ذات۔ اچھی ذات کے ہوتے تو بہادری دکھاتے۔ پتا جی نے سچ کہا تھا۔" ٹھکرائن نفرت سے بولی۔

"ارے اونچی ذات والی تو نے اپنی ذات خوب دکھائی۔" ٹھاکر کو بھی غصہ آ گیا۔ گیتا نندی اسے خونی نظروں سے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ نندا مسلسل رو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہم تو نوکر تھے بھائیو مالکن نے جو کہا سو کیا۔ گود سونی تھی اس کی، ٹونے ٹوٹکے کرتی تھی۔ ہمیں کئی جگہ لے گئی نہ جانے کیا کیا کرم کرائے پھر ادھیرنا چندو مہاراج مل گئے۔ انہوں نے یہ کرم بتائے۔ سات بھینٹ دینی تھی ہنومان کے چرنوں میں، سو ہم سے یہ بھی کرایا مالکن نے۔ اپنی گود ہری کرنے کیلئے اس نے ہم سے چھ بچے اٹھوائے ساتویں بلی گنگو کے چھورا کی تھی سو ہم لے گئے اسے اور مسافر نے دیکھ لیا۔ بلی نہ ہو سکی۔ ادھرنا جی چلّے میں بیٹھے ہیں نہیں تو ضرور آ جاتے۔ بڑا سمبندھ ہے اس کا............؟"

"اور کچھ سننا ہے ٹھاکر............" دھرمو چاچا نے کہا۔

"میں کیا کہوں دھرمو چاچا مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔"

"ختم کرو یہ پنچایت ختم کرو۔ اسے چتا میں لے جاؤ۔ نندا کو بھی بھسم کرنا ہو گا۔ مالکن کے کہنے سے اس نے جو کچھ کیا اس کیلئے خود نہیں سوچا اس نے، اسے بھی بھسم کر دو، مارو، ختم کر دو جلا دو۔" لوگ بے قابو ہو گئے تصدیق ہونے کے بعد لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے نندا کو گھیر لیا گیا لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی اور پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لوگوں نے نندا کو اٹھا کر آگ میں جھونک دیا تھا۔ پھر گیتا نندی کی طرف بڑھے۔ گیتا نندی بھی اب خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ نندا کے گوشت کی چراند دور فضا میں پھیل رہی تھی اور اسے اپنا حشر نظر آ رہا تھا۔

دفعتہً عقب میں کچھ بھگدڑ سی مچی۔ لوگ چیخنے چلانے لگے۔ میں نے بھی چونک کر دیکھا۔ ایک بے تحاشا بیل دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی ننگی پیٹھ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سادھوؤں جیسا حلیہ بنائے ہوئے

بہت سے لوگ بیل کی زد میں آ کر کچل گئے تھے۔ گیتا نندی نے اسے دیکھا تو بے اختیار چیخ پڑی۔

"مہاراج۔ ادھیراج۔ ادھیرنا چندو۔ مجھے بچاؤ مہاراج۔ مجھے بچاؤ۔"

بپھرے ہوئے لوگ رک گئے۔ ان کی نظریں بیل کی پیٹھ پر بیٹھے سادھو پر تھیں اور اس کی آمد پر وہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس نے جس طرح لوگوں پر بیل دوڑا دیا تھا اس سے اس کی سنگدلی کا بھی پتہ چلتا تھا اور سرکشی کا بھی جیسے اسے کسی کا خوف نہ ہو اور وہ ان جیتے جاگتے انسان کو گھاس کوڑا سمجھتا ہو۔ آن کی آن میں وہ نزدیک آ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ گیتا نندی نے اس کا نام لے کر مجھے اس سے روشناس کرا دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں درود پاک کا ورد شروع کر دیا کیونکہ ہر مشکل کے حل کیلئے مجھے یہی بخشا گیا تھا۔ ادھیرنا چندو نے خونی نگاہوں سے یہاں موجود لوگوں کو دیکھا اور لوگ دہشت سے کانپنے لگے۔ سفلی علوم کے اس ماہر کے بارے میں بستی بھر کے لوگ جانتے تھے۔ اس سے نفرت بھی کرتے تھے اور خوفزدہ بھی رہتے تھے۔

"کیا ناٹک رچایا ہے رے کم ذات تو نے۔ کیا کہہ رہی ہے یہ............!" اس نے کوہلی رام کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے، میں نے نہیں مہاراج۔ سب بستی والوں نے............" کوہلی رام ہاتھ جوڑ کر کانپتا ہوا بولا۔ لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے دور تک ادھیرنا کیلئے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

"کاہے رے حرام خورو............ کاہے موت کو آواز دی تم نے۔ جانتے ہو ہماری رن بیرتا ہے گیتا نندی ہماری شکتی کے سائے میں ہے۔ ارے او بڈھے سرپنچ تو بتا کیا ہے یہ سب کچھ۔" ادھیرنا چندو شاید بستی والوں کو جانتا تھا اس نے دھرمو چاچا کو مخاطب کیا تھا۔

"گیتا نندی۔ ٹھکرائن، ڈائن بن گئی ہے مہاراج۔" دھرمو نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ارے او ڈائن کے سگے۔ باؤلے بن گئے ہو کیا تم سارے کے سارے............ ہنومان بلی دے رہی تھی وہ، اس کی گود بھی تو سونی تھی۔"

"اس نے چھ پریوار سونے کر دیئے مہاراج۔ چھ بچوں کو مار کر ان کے کلیجے چبا گئی۔" جنک رام ہمت کر کے بولا۔

"ارے پاپیو۔ ارے باؤلو۔ ارے جنم کے اندھو، امر ہو گئے وہ ہنومان کے چرنوں میں بھینٹ ہو کر۔ تم سب بال بچوں والے ہو، ایک ایک کے گھر میں چھ چھ کھیل رہے ہیں۔ ایک کے چلے جانے سے کونسا فرق پڑ گیا۔ یہ چراندھ کیسے اٹھ رہی ہے اگنی سے۔ کیا جلا رہے ہو تم اس میں؟"

"انہوں نے نندا کو زندہ بھسم کر دیا ہے مہاراج۔ زندہ آگ میں جھونک دیا ہے اسے اور مجھے بھی یہ اگنی میں جھونکنے والے تھے۔" گیتا نندی شیر ہونے لگی۔

"تمہارا ستیاناس پاپیو، اپنا نرکھ تم نے دھرتی پر ہی بنا لیا۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نندا ہمارا سیوک تھا۔ ٹھیک ہے تم نے جو کیا اس کا پھل بھگتو گے۔ نندا نے بھوت بن کر تم سب کو ایسے ہی بھسم نہ کیا تو ہمارا نام بھی ادھیرنا چندو نہیں ہے۔ کون سورما جھونکے گا اسے آگ میں آؤ آگے بڑھو، اسے چھو کر

دکھاؤ............ اور تو رے نر تجھ کم ذات کھڑا دیکھ رہا ہے سب کو۔ دیکھ لیا گیتا نندی، یہ فرق ہوتا ہے ذات کا۔ تیرے ماتا پتا کیتے تھے تجھ سے۔" ادھیرنا نے کوہلی رام کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ انیائے ہے مہاراج۔ ہمارے من سلگ رہے ہیں۔ ہم بدلہ لیں گے۔ ہمیں بدلہ لینے دو............" کچھ لوگوں نے کہا اور ادھیرنا چندو کی گردن ان کی طرف گھوم گئی۔

"آؤ آؤ۔ آگے آؤ، ہم نیائے کردیں۔ یہ اگنی تم نے جلائی ہے۔ بہت بڑی چتا بنائی ہے تم نے۔ لاؤ پہلے اسے بجھادیں، پھر تمہارے سلگتے من بھی بجھادیں گے۔" ادھیرنا چندو بیل کی پیٹھ سے اتر آیا۔ اس نے تیزی سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھا پھر ہونٹ سکوڑ کر ان پر پھونک مارنے لگا۔ تیز سنسناہٹ کے ساتھ آگ دبنے لگی۔ جلتی ہوئی موٹی لکڑیاں ہوا کے دباؤ سے جگہ چھوڑنے لگیں اور لوگ گھبرا کر اس رخ سے ہٹ گئے جدھر لکڑیاں سرک رہی تھیں۔ شعلے بجھنے لگے۔ لکڑیاں اس طرح بجھ گئیں جیسے ان پر اوس پڑ گئی ہو۔ نندا کی لاش بھی نظر آنے لگی تھی۔ کوئلہ ہوگیا تھا جل کر۔

میرے لئے اب عمل ضروری تھا۔ میں نے ایک تصوراتی حصار ادھیرنا چندو کے گرد قائم کردیا۔ ادھیرنا نے آگ ٹھنڈی کرکے اپنا کام ختم کیا۔ پھر بولا۔ "اب بولو کس کس کا من سلگ رہا ہے۔" لوگوں کے چہرے فق تھے مگر بھاگا کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے پیچھے سے کچھ لوگ کھسک گئے ہوں یا پھر وہ چلے گئے تھے جو زخمی ہوگئے تھے۔ گیتا نندی کی نظر اچانک مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف اشارہ کرکے بولی۔

"یہ سب سے آگے آگے تھا مہاراج۔ مسلمان کا چھوکرا۔ اس نے بڑی ہتھیا مچائی ہے۔" ادھیرنا چندو مجھے گھورنے لگا۔ پھر کسی قدر حیرانی سے بولا۔ "یہ کون ہے؟ کون ہے رے تو؟"

"میری کہانی تو بہت لمبی ہے ادھیرنا چندو مگر تونے بہت برا کیا ہے۔ گیتا نندی کو تونے ہی اس برے کام پر آمادہ کیا تھا۔"

"ہاں کیا تو تھا۔ سزا دے گا کیا تو مجھے۔" ادھیرنا کے لہجے میں غرور اور انداز میں تمسخر تھا۔

"مجرم تو، تو بستی والوں کا ہے وہی تجھے سزا دیتے تو اچھا تھا مگر یہ معصوم لوگ تجھ سے ڈرتے ہیں مجبوراً مجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔"

"اچھا۔" ادھیرنا مسکرا کر بولا۔ "کیا جرم کیا ہے ہم نے مہاراج؟" وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

"تم تینوں مجرم ہو۔ تم نے گیتا نندی کو گمراہ کیا اور گیتا نندی شیطان بن گئی۔ اس نے چھ بچوں کی جان لے لی۔ نندا نے اس کے ساتھ مل کر ان بچوں کو اغواء کیا۔ اسے تو سزا مل گئی تم دونوں باقی ہو۔"

"تو ہمیں بھی سزا دے دو مہاراج۔ تمہاری چتا تو بجھ گئی۔"

"ایسی ایسی ہزاروں چتائیں بھڑک سکتی ہیں ادھیرنا۔ تو نے اسے بجھا کر کوئی بہت بڑا کام کیا ہے؟"

"جے ہنومان گورما چوکیہ۔ یہ مہاراج ادھیراج کیا کہہ رہے ہیں۔ جاؤ مہاراج پہلے تم بجرنگ بلی کی لنکا کی سیر کرلو............" اس نے میری طرف رخ کرکے ہونٹ گول کرلئے۔ تیز ہوا کی سنسناہٹ سنائی دی۔ غالباً وہ مجھے پھونکوں سے اڑا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں سے خارج ہونے والی ہوا کسی ٹھوس شے سے ٹکرا کر واپس ہونے لگی۔ یہ ٹھوس شے میرا قائم کیا ہوا حصار تھا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ ہمت بندھ گئی۔ تیز ہوا حصار میں گھٹ گئی تھی اور اندر منتشر ہو رہی تھی جس سے گیتا نندی اور خود ادھیرنا چندو کے بال اور کپڑے اڑنے لگے۔ ساتھ ساتھ اندر موجود کوڑا کرکٹ اور جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ بھی۔ ادھیرنا حیران ہوکر رک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

"بجرنگ بلی کی لنکا تو مجھے نظر نہیں آئی ادھیرنا۔ مگر اب تیرا یہ بیل تجھے سیر کرانے لے جارہا ہے۔" میں نے بیل کو گھورتے ہوئے کہا۔ اچانک بیل کے تیور بگڑنے لگے۔ اس نے اپنی جگہ اچھلنا کودنا شروع کردیا اور ادھیرنا ایک طرف ہٹ گیا۔ بیل نے کھر زمین پر گھسے اور پھر گردن جھکا کر ادھیرنا پر حملہ آور ہوگیا۔ ادھیرنا بدحواس ہوکر ایک طرف ہٹ گیا۔ بیل آگے بڑھ کر حصار کی دیواروں سے ٹکرایا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے سر سے خون بہا تو وہ شدت جوش سے دیوانہ ہوگیا اور پھر اس نے ادھیرنا کو تاک لیا وہ پھنکاریں مار مار کر اس پر قلانچیں بھرنے لگا۔ گیتا نندی دہشت زدہ ہوکر بھاگی لیکن وہ حصار کے قیدی تھے وہ بھی نادیدہ دیوار سے ٹکرائی اور چیخ مار کر گر پڑی۔ ادھر بیل نے ادھیرنا کو گھیر لیا اور سینگوں پر اٹھا کر بری طرح رگیدنے لگا۔ ادھیرنا کا داہنا گال پھٹ گیا مگر بیل اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ادھیرنا جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کرتا وہ اگلے پاؤں اٹھا کر پوری قوت سے ٹکر مارتا اور ادھیرنا کئی کئی فٹ اچھل کر گرتا۔ ادھر گیتا نندی مسلسل کوشش کررہی تھی۔ بستی والے دم بخود کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ادھیرنا چندو کے حلق سے دلدوز چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر گیتا نندی بھی بیل کی لپیٹ میں آگئی۔ کوہلی رام کے منہ سے آواز نکل گئی جسے اس نے جلدی سے دبالیا۔ بستی والوں کا سکوت ٹوٹ گیا وہ شور مچانے لگے۔ خوشی سے اچھلنے لگے قہقہے لگانے لگے۔ شور کی آواز سے بیل اور بپھر گیا۔ اس نے ٹکریں مار مار کر ان دونوں کا قیمہ بنا دیا۔ وہ گوشت کے لوتھڑے بن گئے تھے۔ بیل بھی کئی بار حصار سے ٹکرایا تھا اور بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ پھر وہ بھی گر پڑا اور اس نے پاؤں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا۔

کچھ منٹ گزر گئے تو میں آگے بڑھا اور ان لاشوں کے قریب پہنچ گیا۔ بستی والے میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کررہے تھے۔ پھر ان کی ہمت بڑھ گئی اور دوسرے لمحے وہ "مسافر مہاراج کی جے، مسافر مہاراج کی جے" کرتے ہوئے قریب آگئے۔ وہ میرے پاؤں چھو رہے تھے، ہاتھ چوم رہے تھے۔ انہیں روکنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے بے بسی سے دل میں کہا۔

"معبود کریم............ میں مجبور ہوں، کتنا ہی شور مچاؤں، یہ میری نہیں سنیں گے جس طرح ممکن ہوسکتا تھا ان سے بچ رہا تھا۔"

جنک رام چیخ کر بولا۔ "رک جاؤ بھائیو۔ رک جاؤ۔ پریشان نہ کرو مسافر مہاراج کو۔ بعد میں مل

لیناان سے .... پریشان مت کرو............ " لیکن کون مانتا۔ کوہلی رام اس بھیڑ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ ادھیرنا سے بھی نفرت کرتے تھے چنانچہ چتا پھر جلادی گئی اور ان کے جسموں کے لوتھڑے گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیئے گئے اس عمل کے دوران مجھے ان سے بچ نکلنے کا موقع مل گیا، اور میں وہاں سے سرائے کی طرف بھاگا، سرائے میں آکر دم لیا تھا لیکن اندازہ تھا کہ اب کیا ہوگا۔ کھیل ختم ہوگیا تھا۔ گیتا نندی ختم ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ایک خبیث بھی جو سفلی علوم کا ماہر تھا۔ نہ جانے مزید کتنے انسانوں کو اس کے ہاتھوں نقصان پہنچتا لیکن جو کچھ اس کے بعد ہوا تھا اور ہونے والا تھا وہ میرے لئے بھیانک تھا۔

اللہ دین آگیا۔ بیوی کو پکارتا ہوا اندر گھسا تھا۔ "زبیدہ اری نیک بخت کہاں گئی۔"

"کیا ہے؟" زبیدہ کی آواز ابھری۔

"غضب ہوگیا۔ وہ مسافر شاہ صاحب تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ اری معمولی آدمی نہیں ہیں وہ۔ ولی ہیں، ساری بستی ان کا نام لے رہی ہے۔ مقدر پھوٹ گیا ہمارا۔ پیسے نہ لیتے ان سے یونہی خدمت کرتے تو بیڑا پار ہوجاتا۔ خوش ہوکر کچھ ایسی چیز دے دیتے ہمیں کہ وارے نیارے ہوجاتے۔"

"مسافر بھیا کی بات کر رہے ہو؟"

"تو اور کیا۔"

"کیا ہوا؟" زبیدہ نے پوچھا اور اللہ دین اسے کوہلی رام کے گھر پر پیش آنیوالے واقعات بتانے لگا۔ یہ جگہ بھی مخدوش ہوگئی۔ بعد میں جب عقیدت مند یہاں پہنچیں گے تو نہ جانے کیسی کیسی مشکلیں پیش آئیں گی۔ خود اللہ دین زبیدہ سے جو کچھ کہہ رہا تھا اس سے مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ زبیدہ کو میرے یہاں آنے کا علم تھا۔ چنانچہ بس کچھ دیر جارہی تھی کہ وہ مجھ تک پہنچ جاتے۔ نکل جانا چاہئے۔ آج کے تین روپے زبیدہ کو دے چکا تھا۔ ایک روپیہ پاس موجود تھا اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز چلتا ہوا بستی سے باہر جانیوالے راستے پر چل پڑا۔ چند لوگوں نے مجھے دیکھا لیکن یہ وہ تھے جنہیں میرے بارے میں معلوم نہیں تھا اس لئے وہ مشکل نہ بنے اور میں ان کے درمیان سے نکل آیا۔ کھیتوں وغیرہ کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر ہنومان مندر کی عمارت نظر آئی۔ ویران اور سنسان، اس عمارت میں بہت بھیانک ڈرامے ہوتے رہے تھے۔ رات یہاں گزاری جاسکتی ہے۔ بستی کے لوگ مجھے تلاش کرنے کم از کم یہاں نہیں آئیں گے۔ کل دن کی روشنی میں یہاں سے کسی سمت کا تعین کرکے نکل جاؤں گا۔ حالانکہ بھیانک جگہ تھی لیکن میرے لئے بے حقیقت تھی۔ اندر داخل ہوگیا۔ ایک پرسکون گوشہ منتخب کرکے آرام کرنے لگا۔

سامنے ہی ہنومان کا بت ایستادہ تھا اسے دیکھتا رہا۔ بے جان پتھر جسے انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا۔ ایک بے ضرر سی شے۔ ذہن نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ تاریکیاں گہری ہوتی گئیں۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ ہنومان کے بت کا ہیولا بھی نہیں نظر آرہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اگر مجھے تلاش کیا جاتا

تو کسی نے ادھر آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ویسے بھی لوگ اس جگہ سے خوفزدہ رہتے تھے۔ چنانچہ سکون تھا۔ رات گزرتی رہی۔ نہ جانے کیا وقت تھا۔ کئی بار نیند کے جھونکے آئے تھے لیکن ہر بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ چت لیٹا ہوا تھا اس لئے مندر کی چھت سامنے تھی اور چھت پر دو ننھی ننھی آنکھیں متحرک تھیں۔ پیلی بدنما آنکھیں۔ شناسا آنکھیں۔ آنکھیں آہستہ آہستہ جگہ چھوڑ رہی تھیں۔ مکڑی............ میرے ذہن میں خیال ابھرا۔ ایسی مکڑیاں بھوریا چرن ہی کی فرستادہ ہوتی تھیں۔ آہ کاش یہاں روشنی ہوتی۔ ایسی کوئی چیز ہوتی جسے روشن کرکے میں مکڑی کو دیکھ سکتا۔ یہ خیال دل میں گزرا تھا کہ اچانک ہی ماحول روشن ہونے لگا۔ دیواریں نظر آنے لگیں۔ ہنومان کا بت صاف نظر آنے لگا۔ ہر چیز اتنی نمایاں ہوگئی کہ عام حالات میں بھی نہیں ہوتی تھی لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ روشنی کہاں سے آرہی ہے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ مکڑی روشنی ہوتے ہی تیز تیز چل پڑی اور پھر ایک سوراخ میں گھس کر روپوش ہوگئی۔ پیلے رنگ کی مکڑی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مکڑی تو غائب ہوگئی تھی لیکن روشنی بدستور تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ روشنی میرے دل سے پھوٹی ہے۔ میرے دل نے روشنی طلب کی میرے اطراف منور ہوگئے۔ یہ عطیۂ الٰہی تھا۔ یہ کرم نوازی تھی میری ذات پر............ دل سرور سے بھر گیا۔ بڑے انعام سے نوازا گیا تھا مجھے۔ بڑے انعام سے۔ شکر نہیں ادا کرسکتا تھا۔ کچھ رقت سی طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ مندر سے باہر کھلی جگہ نکل آیا۔ باہر سنسان خاموشی طاری تھی۔ ایک صاف سی جگہ دیکھی اور سجدہ ریز ہوگیا۔ دل شکر گزار تھا اور ذکر الٰہی نے ساری تنہائیاں دور کردی تھیں کسی کی آواز کانوں میں ابھری۔

"تم تنہا کہاں ہو۔ ہم سب تو ہیں تمہارے ساتھ۔ کبھی خود کو تنہا نہ سمجھنا۔" دور دور تک کوئی نہ تھا لیکن لگ رہا تھا جیسے بہت سے لباس سرسرا رہے ہوں، بڑی تقویت ملی تھی اور اس احساس نے بہت خوشیاں بخشی تھیں کہ میری پذیرائی ہورہی ہے۔ کیا کم تھا یہ سب کچھ، اتنا بڑا مرتبہ دے دیا گیا تھا۔ مجھ گنہگار کو، میں سرشار ہوگیا تھا اور تھوڑی دیر پہلے جو کیفیت ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی تھی۔ نجانے کب تک اسی جگہ سجدہ ریز رہا، یہ سجدۂ شکر تھا۔ یہاں تک کہ پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں سنائی دینے لگیں صبح کا آغاز ہوگیا تھا اور فجر کی نماز کا وقت بھی، نماز پڑھی اس سے پہلے کہ بستی کے لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے اس طرف نکل آئیں، میرا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ چنانچہ نماز کے فوراً بعد چل پڑا اور تیز رفتاری سے اس جانب بڑھتا رہا، جدھر رخ ہوگیا تھا۔ منزل کے بارے میں تو پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ جانتا تھا کہ کوئی منزل نہیں ہے، سفر کرتے کرتے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ نجانے کون سے راستے تھے، نجانے کس سمت رخ تھا۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی کے قریب پہنچا تو سامنے سے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ ایک دیہاتی تھا جس نے پیچھے سبزیوں کا ڈھیر لاد رکھا تھا مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی اور زور سے آواز دی۔

"ارے او بھیا۔ بھیا رے کدھر جارہے ہو؟"

اس کو دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر اس پر غور کیا اور پھر کہا۔ "بس بھیا مسافر ہوں، کسی بستی کی تلاش میں تھا۔"

"کسی بستی کی کیوں؟"

"راستہ بھول گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"پر دن پور تو نہیں جانا.........؟"

"کہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"پردن پور.........."

"چلے جائیں گے اگر تم لے جاؤ تو.........." میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لو ہم کون سی اپنی کھوپڑی پر بٹھا کر لے جائیں گے بھیا۔ بیل گھسیٹ لیں گے تمہیں بھی۔ آجاؤ بیٹھ جاؤ۔" بیل گاڑی میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ خوش مزاج سانوجوان معلوم ہوتا تھا کہنے لگا..........

"کہاں سے آرہے ہو، کہاں کا راستہ بھول گئے تھے؟"

"اللہ جانے کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جارہے ہیں، بس چل پڑے تھے ایسے ہی۔"

"ارے گھر والی سے لڑکر بھاگے ہو یا ماں باپ سے ناراض ہوکر گھر چھوڑا ہے؟"

"ہاں بس ایسا ہی سمجھ لو، اپنی تقدیر سے ناراض ہوکر گھر چھوڑ دیا ہے بلکہ تقدیر نے گھر چھین لیا ہے۔"

"دیکھو بھائی ہم ٹھہرے دیہاتی آدمی، ہماری کھوپڑیا ہے چھوٹی، کھری کھری صاف صاف باتیں تو سمجھ میں آجاتی ہیں، باقی باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں، لوگ ویسے ہی للو کہتے ہیں، حالانکہ نام ہمارا رشید ہے، چونکہ باتیں ذرا کم سمجھ مین آتی ہیں اس لئے سارے کے سارے للو کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"تم برا نہیں مانتے اس بات کا.........."

"ارے نہیں بھیا، جو بھی کہتا ہے پیار سے کہتا ہے۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"مسعود.........." میں نے جواب دیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ مسلمان ہے، پھر میں نے اس سے کہا۔ "تم پردن پور میں رہتے ہو؟"

"نہیں بھیا۔ ہم تو کھیری بستی کے رہنے والے ہیں۔ سبزیاں اگاتے ہیں اور پردن پور جاکر بیچ آتے ہیں، لگے بندھے گراہک ہیں اپنے کھرا مال دیتے ہیں، کھرے پیسے لیتے ہیں۔ اب پردن پور جائیں گے ان لوگوں کو سبزی دیں گے پیسے وصول کریں گے اور بھیا گھر کا سودا لے کر واپس چلے آئیں گے۔ رات تک کھیری پہنچ جائیں گے۔"

"اچھا۔ عزت سے کمائی کرتے ہو۔ یہ عبادت ہے۔" میں نے کہا.......... ! اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بس بھیا اللہ کا کرم ہے روزی دے دیتا ہے اور سنو، اگلی عید میں ہماری شادی ہو رہی ہے۔

...کا نام بشیرن ہے بھیا بڑی نیک لڑکی ہے۔ پتہ ہے اس کا باپ پچھلے دنوں پالا لگنے سے معذور ہوگیا ...ے۔ بے چارہ شریف آدمی ہے بخشو بھی۔ رونے لگتا ہے مجھے دیکھ کر، کہتا ہے کہ دل میں پتہ نہیں کیا کیا ...بیٹی کے بیاہ کیلئے مگر اب کیا کر سکتا ہے، میں نے بھی کہہ دیا۔ بھیا کہ لڑکی دے دے دو کپڑوں میں۔ ...کا دیا سب کچھ ہے تیرے للو کے پاس، عزت سے رکھے گا تیری لونڈیا کو۔ بس بھیا انسان کو انسان سے ...بت ہونی چاہئے، یہ روپیہ پیسہ ہے کیا چیز، آج کسی کا کل کسی کا، کیسے مریں ہیں لوگ اس پر.......... بھیا اپنی تقدیر لے کر آئے گی دور روٹی کھائے گی اللہ اللہ کرے گی ہمارا بھی گھر بس جائے گا کیوں ہے کہ ....؟"

"بالکل بالکل ٹھیک کہا تم نے رشید بھیا۔" میں نے جواب دیا تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔ "جب کوئی ہمیں رشید کہتا ہے تو ہم ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں جیسے رشید ہمارا نام ہی نہ ہو، تم بھی للو ہی کہو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"پردن پور میں کس کے پاس جاؤ گے؟" باتیں کرنے کا شوقین معلوم ہوتا تھا، مجھے بھی برا نہیں لگ رہا تھا میں نے کہا۔ "کسی سرائے میں ٹھہروں گا جاکر؟"

"اچھا اچھا.......... کوئی ہے نہیں وہاں تمہارا..........؟"

"نہیں۔"

"کوئی کام ہے وہاں کسی سے۔"

"ہاں بس ایسے ہی۔"

"ہماری مانو تو واپس ہمارے ساتھ کھیری چلو، تھوڑے دن ہمارے مہمان رہو، اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو اور بھی یار دوست ہیں وہاں ہمارے ساتھ مزہ آئے گا تمہیں۔"

"بہت بہت شکریہ رشید بھیا لیکن مجھے وہاں سے کہیں اور بھی جانا ہے۔"

"اچھا اچھا تمہاری مرضی اس نے کہا اور اس کے بعد خاموش ہوگیا جیسے اب اس کے پاس باتیں ...رنے کیلئے کچھ نہ رہا ہو لیکن اتنی دیر کی خاموشی میں اس نے غالباً یہی سوچا تھا کہ اب آگے کیا باتیں کرے یا ہوسکتا ہے کچھ سوچ رہا ہو۔ بہرحال تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ "ارے ہاں تمہاری شادی ہوگئی۔ ؟"

"نہیں۔"

"ماں باپ بہن بھائی تو ہوں گے۔ ؟"

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ کھایا پیا ارے لو.......... اصل بات تو بھول ہی گئے ارے بھیا کچھ کھایا پیا تم نے یا نہیں.........." میں نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں للو صبح سے کچھ نہیں کھایا؟"

"لو تو پھر کہا کیوں نہیں۔ ارے واہ بھیا اب ایسا بھی کیا کہ آدمی بھوکا ہو اور منہ سے کچھ نہ

بولے۔ ” اس نے بیل گاڑی روکی پیچھے ہاتھ کرکے کپڑے کی ایک پوٹلی سی اٹھائی، اسے کھولا چار روٹیاں پکی رکھی تھیں، ساتھ ہی گڑ کی ڈلیاں بھی تھیں اس نے دو روٹیاں میرے سامنے رکھ دیں اور دو اپنے سامنے رکھ لیں۔ گڑ بھی آدھا آدھا تقسیم کیا اور مسکرا کر بولا۔ ”غریب کا کھاجا تو یہی ہے، چلو اللہ کا نام لے کر شروع ہو جاؤ۔ ” میں نے بسم اللہ کہا اور کھانے میں مصروف ہو گیا مسلمان کے گھر کی پکی ہوئی روٹیاں تھیں، اس لئے کوئی تکلف نہیں ہوا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا پانی کا بھی اس نے بندوبست کر رکھا تھا چنانچہ پانی پینے کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

ہرون پور اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا بلکہ اسے چھوٹا موٹا شہر ہی کہنا درست تھا۔ آبادی میں داخل ہونے کے بعد میں اس سے رخصت ہو گیا۔ اللہ نے یہاں تک پہنچانے کا ذریعہ پیدا کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ رزق سے بھی نوازا تھا لیکن یہاں اس علاقے میں میری آمد کا کوئی اہم مقصد نہیں تھا۔ جمال گڑھی کے بارے میں تو حکم ہوا تھا اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں مجھے کس لئے بھیجا گیا تھا۔ ایک معصوم عورت مصیبت سے بچ گئی تھی اور دوسری شیطان صفت عورت جو چھ انسانوں کا خون کرکے ساتویں کی زندگی کی گاہک بنی ہوئی تھی ایک شیطان کے ساتھ فنا ہو گئی تھی۔ لہٰذا گیہوں کے ساتھ گھن کی حیثیت سے پس گیا تھا۔ ظاہر ہے شریک جرم بھی اتنا ہی مجرم ہوتا ہے جتنا کہ اصل مجرم۔ نندا نے صرف مالکن کی خوشنودی کیلئے ان چھ بچوں کو اغواء کیا تھا اور برابر کا اس جرم میں شریک رہا تھا اس طرح تین شیطان کیفر کردار کو پہنچ گئے تھے۔ ادھیرنا چندو بھی اپنے سفلی علم کے ذریعے نجانے کسے کسے نقصان پہنچاتا۔ گندے علوم کے یہ ماہر جو غلاظتوں کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اس روئے زمین پر بدنما دھبے ہیں۔ شیطانی جنتر منتر پڑھ کر وہ معصوم انسانوں کو نقصان پہنچاتے تھے چنانچہ ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ اور اس کیلئے ضروری نہیں تھا کہ میں اشاروں کا انتظار کروں ایک سپاہی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی جگہ قانون شکنی دیکھے تو اپنا فرض پورا کرے قانون اسے اختیار اسی لئے دیتا ہے چنانچہ نگاہ رکھنا ضروری ہے آبادی وسیع تھی کوئی جگہ ٹھکانہ بن سکتی تھی شہر گردی کرنے لگا ریلوے اسٹیشن کے قریب مسجد نظر آئی ظہر کی نماز وہاں پڑھی۔ مسجد کے سامنے وسیع میدان تھا جہاں گھنے درخت بکھرے ہوئے تھے ٹھکانہ کوئی مشکل ہی نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے دو روٹیاں عطا کر دی تھیں۔ کام چل گیا تھا رات کا کھانا ایک نان بائی کی دکان پر کھایا ڈیڑھ روپیہ خرچ ہوا تھا ادھر ادھر دیکھا۔ دو افراد نظر آئے جو شاید بھکاری تھے اور کھانا کھانا چاہتے تھے۔ پچھلے کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے انہیں دیدیئے اور فراغت ہو گئی۔ مسجد کی قربت سے عمدہ جگہ اور کونسی ہو سکتی تھی چنانچہ وہیں ڈیرہ جمالیا۔ رات ہو گئی۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کرنے لیٹ گیا اور نیند آگئی صبح ہی آنکھ کھلی تھی دن بھر شہر کا گشت کیا شام کو راستہ بھول گیا دیر تک چکراتا رہا لیکن اسٹیشن نہ پہنچ سکا کسی سے پوچھ لینا مناسب سمجھا کچھ فاصلے سے ایک شخص گزر رہا تھا لمبی داڑھی میلے کچیلے لباس میں تھا۔

”سنو بھائی۔ ” میں نے اسے پکارا اور وہ رک گیا میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

”ریلوے اسٹیشن جانا چاہتا ہوں۔ ”

”تو میں کیا کروں؟ ” وہ ترش لہجے میں بولا۔

”رستہ بھول گیا ہوں۔ ”

”تو یہاں کیوں مر رہے ہو۔ ”

”جی۔ ” میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے سمجھے وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے ریل میں بیٹھو اور سالم نگر چلے جاؤ۔ بابا شاہجہاں کا عرس ہو رہا ہے۔ ” میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میں حیرت سے اس شخص کو دیکھنے لگا اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور پھر بند مٹھی میری طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹکٹ کے پیسے سنبھالو۔ ”

”آپ۔ آپ کون ہیں؟ ”

”کوتوال، سمجھے جاؤ اپنا کام کرو زیادہ بک بک نہیں کرتے لو پیسے لو۔ ” اس نے زبردستی پیسے میری جیب میں ٹھونسے اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا میں حیران نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ اور کیا ہوتے سالم نگر چلے جاؤ وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے۔ میں نے چونک کر اس سمت دیکھا اور ششدر رہ گیا ریلوے اسٹیشن سامنے نظر آ رہا تھا ماحول ہی بدل گیا تھا میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں کچھ دیر قبل کھڑا تھا اور جہاں سے میں نے پہلے اسٹیشن کا پتہ پوچھا تھا سوچنا بیکار تھا آگے قدم بڑھا دیئے۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا سالم نگر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا بکنگ ونڈو پر پہنچ گیا۔

”سالم نگر جانا ہے۔ ” میں نے اندر جھانکتے ہوئے کہا جہاں چند لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”خدا حافظ۔ ” ایک نے کہا اور دوسرے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”ریل کس وقت آئے گی؟ ”

”جب اللہ کی مرضی ہوگی۔ ”

”ٹکٹ مل جائے گا۔ ” میں نے حیرت سے پوچھا۔

”پیسے دو گے تو ضرور مل جائے گا۔ ” وہ شخص مسلسل مذاق کر رہا تھا۔

”کتنے پیسے ہوں گے۔ ”

”یار جان کو ہی آگیا تو تو.......... لطیفہ بیچ میں رہ گیا۔ تیس روپے نکالو۔ ” میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تیس روپے تو اسے دیدیئے اور اس نے چھبیس روپے کا ٹکٹ میرے حوالے کر دیا۔ ٹکٹ پر درج شدہ رقم دیکھ کر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس پر چھبیس روپے لکھے ہیں۔ ”

”چار روپے ٹیکس ہوتا ہے۔ ” اس نے کہا میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی چھوڑ دی تھوڑی ہی

دور پہنچا تھا کہ اچانک اندر دھماکہ سنائی دیا پتہ نہیں کیا ہوا تھا میں آگے بڑھ آیا ریلوے اسٹیشن پر بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے میں ایک ستون کے سہارے بیٹھ گیا ابھی لائن خالی پڑی ہوئی تھی کسی سے پوچھ لوں گا ریل کے بارے میں بیٹھے بیٹھے کوئی بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک آدمی تیزی سے میرے قریب آ گیا میں نے اسے غور سے دیکھ کر پہچان لیا یہ وہی ریلوے بکنگ کلرک تھا۔ میرے قریب بیٹھ گیا۔ "معافی چاہتا ہوں معاف کر دیں گے۔"

"کیا ہو گیا بھائی۔"

"بس مجھے معاف کر دیں میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی مجھے سزا مل گئی آپ نے بددعا دی ہوگی مجھے۔"

"خدا نہ کرے اتنی سی بات پر کسی کو بددعا کیسے دی جا سکتی ہے؟"

"میرے دل نے یہی کہا میں نے آپ سے مذاق کیا اور آپ سے چار روپے زیادہ لے لئے یہ دیکھئے میرا ہاتھ زخمی ہو گیا اور دوسری مصیبت الگ گلے پڑ گئی۔"

"ارے یہ کیا ہو گیا۔" میں نے اس کے ہاتھ پر کسے ہوئے رومال کو دیکھ کر کہا جو خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

"بس بھائی صاحب ایک ریک گر پڑا، جو بالکل ٹھیک رکھا ہوا تھا شیشہ کا کچھ سامان رکھا ہوا تھا اس پر وہ بھی ٹوٹ گیا اور شیشہ میری کلائی پر لگا اچھا خاصا خون بہہ گیا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تین آدمیوں کے بھی اچھی خاصی چوٹ لگی ہے ہم سب کے دل میں ایک ہی خیال آیا وہ یہ کہ ہم لوگوں نے آپ سے بلاوجہ مذاق کیا اور میں نے چار روپے زیادہ لے لئے۔ میں انتہائی عاجزی سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں اور یہ رہے آپ کے چار روپے اس نے چار روپے میری جانب بڑھا دیئے میں نے شرمندہ سی نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا۔ "آپ کے چوٹ لگنے کا مجھے افسوس ہے اگر تھوڑی سی دل آزاری ہوئی ہے میری تو اس کیلئے میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب میری طرف سے آپ ایک پیالی چائے ہی پی لیجئے مجھے خوشی ہوگی۔"

"نہیں بھائی چائے کی حاجت نہیں ہے۔"

"میری خوشی کیلئے۔" وہ شاید بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا تھوڑے فاصلے پر چائے بیچنے والے سے اس نے دو پیالی چائے کیلئے کہا میں نے اس سے پوچھا۔

"اب اگر احسان ہی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے یہ بتا دیجئے کہ سالم نگر جانے کیلئے ریل کتنی دیر میں آئے گی۔"

"بس اب سے تقریباً پونے گھنٹے کے بعد اگر لیٹ نہ ہوئی ہو تو۔"

"کدھر سے آئے گی۔" میں نے سوال کیا اور اس نے اشارے سے مجھے سمت بتا دی۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی تھی میرے ساتھ بیٹھ کر اس نے چائے پی اور اٹھتا ہوا بولا۔ "میرے حق میں دعائے خیر کیجئے

آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ہے۔"

ریل ٹھیک پونے گھنٹے کے بعد آ گئی اور میں اس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا مسافر زیادہ تر سو رہے تھے ایک مسافر نے مجھے شی شی کر کے اپنی طرف مخاطب کیا اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا ریل کا ڈبہ بھرا ہوا تھا سونے والوں نے زیادہ تر جگہ پر قبضہ کر لیا تھا اس شخص نے مجھے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ تم نے ریلوے بابو سے یہ نہیں پوچھا کہ سالم نگر کا فاصلہ کتنا ہے اور تم کس وقت وہاں پہنچو گے۔" میں نے حیرانی سے اس شخص کو دیکھا صورت شکل میرے لئے اجنبی تھی سادہ سا چہرہ تھا میں ششدر کھڑا ہی ہوا تھا کہ وہ بولا۔

"بیٹھ جاؤ یہ جگہ تمہارے لئے محفوظ رکھی گئی ہے اور ہاں سنو صبح فجر کی اذان جیسے ہی سنائی دے نیچے اتر جانا وہی سالم نگر کا اسٹیشن ہوگا۔ مسجد اسٹیشن پر ہی ہے صاف نظر آ جائے گی اچھا خدا حافظ۔" وہ دروازے کی جانب بڑھا پھر وہاں سے رک کر پلٹا اور میری طرف رخ کر کے کہنے لگا۔

"کسی سے اس کے بارے میں پوچھتے نہیں ہیں ہاں جو لوگ تم سے متعارف ہونا چاہیں ان کی بات اور ہے ورنہ ان کی پیشانی پر اس چمک کو دیکھ لیا کرو جو انہیں اعزاز کے طور پر ملتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا اور میں ایک عجیب سی کپکپی اپنے وجود میں محسوس کرنے لگا یہ ساری رمزی باتیں تھیں مجھے اس شخص نے اپنے آپ کو کوتوال کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا جس نے میری رہنمائی سالم نگر کی جانب کی تھی اور اب یہاں بھی میرے لئے انتظامات موجود تھے ریل ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ سیٹیوں کی دو آوازوں پر میں نے غور نہیں کیا تھا میری نگاہیں کھڑکی سے پرے تاریکی میں بھٹکنے لگیں لیکن کوئی اور مجھے نظر نہیں آیا ایک عجیب سا احساس دل میں جاگزیں تھا آنکھیں بند کر لیں اور ان دو رہنمائیوں کے بارے میں سوچتا رہا، دل کو وہی احساس ہوا تھا جو اس وقت میرے دل میں آ بسا تھا، جب میں ہنومان مندر کے باہر ویران جگہ سربسجود تھا یعنی تنہا نہ ہونے کا احساس۔ ہر جگہ رہنمائی ہوئی تھی دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان محبتوں کو برقرار رکھے۔ میں تو لاچار ہوں سرکشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سفر جاری رہا سالم نگر کے بارے میں سوچتا رہا جہاں بابا شاہجہاں کا عرس ہو رہا تھا مجھے وہاں عرس میں شریک ہونا تھا۔

رات کا وقت خاموشی، باہر دوڑتے اندھیرے، خیالات کی ریل چلتی رہی وہ پیلی مکڑی یاد آئی جو مندر کی چھت میں نظر آئی تھی۔ یقیناً بھوریا چرن کی جاسوس ہوگی۔ بھوریا چرن طویل عرصہ سے سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس نے مجھے نظر انداز بھی نہیں کیا تھا مسلسل میری تاک میں رہتا تھا ہو سکتا ہے اس مکڑی کے بھیس میں وہی ہو اور ہو سکتا ہے یہاں کسی مقصد سے آیا ہو۔ شکر تھا میں مندر میں سویا نہیں تھا ورنہ اسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہر جگہ مجھ سے محتاط رہتا تھا۔ کم بخت میرا مسلسل دشمن تھا مگر اس کی وجہ سے کیا کچھ نہ چھن گیا تھا میرا بھرا پرا گھر بہن بھائی، ماں باپ، سب برباد ہو گئے تھے سب کے سب تباہ ہو گئے تھے تمام شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔ دل میں پھر وہی احساسات ابھر آئے۔ آنکھیں تو آنسو برسانے کیلئے تیار رہتی تھیں۔ دل الٹنے لگا اس احساس کی منادی تھی اس کیلئے نہیں رونا تھا منہ پر تھپڑ مارنے لگا خود کو سمجھانے لگا آہ مجھے اس سے باز رہنا ہے دعائیں مانگنے لگا مدد مانگنے لگا اور یوں لگا جیسے کسی نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا ہو پھر

یہ مہربانی وسیع ہوگئی نیند آگئی تھی پھر بدن کو جھٹکا لگا کانوں میں اذان کی آواز ابھری بری طرح چونک پڑا بدن کو جھٹکا ریل رکنے سے لگا تھا اذان کی آواز اسٹیشن کی مسجد سے آرہی تھی اور مجھے یہی جگہ بتائی گئی تھی۔ دیوانوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگا اور نیچے اتر گیا فوراً ہی ریل کی سیٹی سنائی دی تھی پلیٹ فارم پر کودا ہی تھا کہ ریل چل پڑی اللہ نے مدد کی تھی چند لمحے اور سو کر گزار دیتا تو سالم نگر نہ اتر پاتا اس وقت کچھ اور سوچنا ممکن نہیں تھا مسجد کے گنبد نظر آرہے تھے انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور مسجد میں داخل ہوگیا وضو کیا نمازی آنے شروع ہوگئے تھے نماز فجر سے فراغت ہوئی اور باہر نکلتے ہوئے نمازیوں میں سے ایک سے پوچھا۔ "بھائی یہ سالم نگر ہے۔"

"ایں بابا۔ ہے تو۔" وہ حیرت سے بولا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"تمہیں نہیں معلوم تھا۔"

"ہاں مسافر ہوں کچھ دیر قبل ریل سے اترا ہوں۔"

"کہاں جارہے تھے؟"

"یہیں آیا تھا۔"

"کونسے محلے جارہے ہو؟"

"مجھے بابا شاہجہاں کے مزار پر جانا ہے۔"

"اوہو عرس میں آئے ہو۔"

"ہاں!"

"میرا تانگہ باہر موجود ہے چلو گے۔"

"ضرور چلوں گا کیا مزار شریف دور ہے۔"

"یہاں سے پانچ کوس کا فاصلہ ہے۔"

"کتنے پیسے لوگے؟"

"جو جی چاہے دیدینا۔"

"پھر بھی بتادو۔"

"ڈیڑھ روپیہ دیدینا ویسے پورے تانگے کے چار روپے ہوتے ہیں مگر باباجی کے مہمان ہو اس لئے ڈیڑھ روپیہ لوں گا جیب میں ہاتھ ڈالا وہی چار روپے تھے جو بکنگ کلرک نے واپس دیئے تھے یعنی آج کا وظیفہ بڑا کھرا حساب تھا بے چارہ۔ بکنگ کلرک میرا وظیفہ کیسے روک سکتا تھا ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تانگے والے کے ساتھ باہر نکل آیا تانگے میں بیٹھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"نعمت خان!" اس نے گھوڑے کو ٹخٹخاتے ہوئے کہا اور تانگہ آگے بڑھا دیا۔

"باباشاہجہاں کے عقیدت مند ہو۔؟"

"کون نہیں ہے بھائی صاحب کیا ہندو کیا مسلمان ان کے عقیدت مند تو سب ہیں۔"

"ہندو بھی؟"

"مسلمانوں سے زیادہ باباجی سب کے ہیں ہندو پاک صاف ہوکر ننگے پاؤں مزار پر جاتے ہیں چادریں چڑھاتے ہیں منتیں مانگتے ہیں اور اللہ ان کی مرادیں بھی پوری کر دیتا ہے بڑا فیض ہے بابا شاہجہاں کا سالم نگر پر۔"

"ٹھیک۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا لیکن تانگے والا شروع ہوگیا تھا راستے بھر وہ مجھے بابا شاہجہاں کی کرامتیں سناتا رہا اور بتاتا رہا کہ سالم نگر پر ہی نہیں بلکہ یہاں آنے والوں کو باباصاحب کے مزار سے کیا کیا فیض حاصل ہوتے ہیں۔ پانچ کوس کا فاصلہ معمولی نہیں تھا خوب سورج چڑھ گیا تب ہم بابا شاہجہاں کے مزار پر پہنچے درحقیقت پرنور مزار تھا کس قدر بلندی پر بنا ہوا تھا اطراف میں گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا لیکن جنگل میں منگل ہورہا تھا دکانداروں نے اپنی تھڑیں الگ جمار کھی تھیں جگہ جگہ خیمے نظر آرہے تھے صاحب حیثیت لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں آئے تھے اور اپنے ساتھ چھولداریاں لائے تھے۔ ہر جگہ یہ چھولداریاں نصب تھیں جو اپنے خیمے اور چھولداریاں نہیں لاسکے تھے انہوں نے گھنے درختوں کی چھاؤں میں پناہ لی ہوئی تھی۔ چولھے گرم ہورہے تھے جگہ جگہ دھواں اٹھ رہا تھا لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے زیارت کرنے والے مزار پر آجارہے تھے اور ان کے چہروں سے عقیدت کا اظہار ہوتا تھا بہت سے دھوتی برداروں کو بھی دیکھا۔ ننگے پاؤں مزار سے نکل رہے تھے چہروں پر عقیدت تھی ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی صاحب کرامات شخصیت ہیں مجھے بھلا کسی پناہ گاہ کی کیا ضرورت تھی جہاں شب ہوتی وہیں شب بسری کی جاسکتی تھی۔ فوراً ہی مزار اقدس کی جانب بڑھ گیا اور سب سے پہلے مزار پاک پر فاتحہ خوانی کی بہت دیر تک دوزانو بیٹھا رہا اور صاحب مزار سے رہنمائی طلب کرتا رہا اپنی آخرت کی بہتری کیلئے اپنی عاقبت کیلئے پھر وہاں سے واپس پلٹا بس وہی کھایا ہوا تھا جو پچھلی رات کو کھایا تھا۔ چنانچہ شدید بھوک لگ رہی تھی۔ پانی تک نہیں پیا تھا جیب میں ڈھائی روپے تھے جو ہلکی پھلکی چیزوں سے گزارہ کرسکتے تھے چنانچہ دوپہر کا کھانا ایک جگہ سے دو روٹی اور تلی ہوئی مچھلی لے کر کھائی پھر بھی جیب میں ایک روپیہ باقی بچ گیا تھا اسی میں مجھے شب کی خوراک حاصل کرنی تھی، آرام کیلئے ایک جگہ منتخب کی اور گھنے درخت کے سائے میں جا بیٹھا۔ یہ سوچنے لگا کہ یہاں مجھے کیوں بھیجا گیا ہے۔ آنکھیں بند کرکے راہنمائی کا طلب گار ہوا لیکن کوئی بات نہ بتائی گئی چنانچہ خاموشی اختیار کرلی۔ وقت خود فیصلے کرے گا اور وقت پر ہی راہنمائی ہوگی۔ ابھی کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے تو جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہئے۔

دوپہر سر پر سے گزر گئی اور شام کی چہل پہل کا آغاز ہوگیا مزار شریف پر قوالوں کا قبضہ تھا چنانچہ وسیع و عریض صحن میں قوالوں کی محفل جم گئی ہر ایک اپنی اپنی عقیدت کا اظہار کرنے آیا تھا اور ان کی حاجت بھی پوری ہورہی تھی۔ میں خود بھی اندر داخل ہوگیا اور ایک سمت جا بیٹھا قوالوں کو لوگ حسب توفیق کچھ نہ کچھ دے رہے تھے اور قوال بڑے جوش و خروش سے گارہے تھے لیکن بدقسمتی سے میرے پاس صرف ایک

روپیہ موجود تھا جس کے بارے میں میں دیر تک سوچتا رہا تھا۔ پھر نجانے کیوں جی چاہا اور میں نے وہ روپیہ نکال کر ایک قوال کو پیش کر دیا زیادہ سے زیادہ رات کا فاقہ ہی ہو جائے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے کل صبح وظیفہ ملے گا تو پیٹ بھر لوں گا بآسانی گزارہ ہو سکتا ہے اور پھر بہت زیادہ کھانا پینا بھی انسان کے ذہن کو عبادت سے غافل کر دیتا ہے اس احساس سے مطمئن ہو گیا۔

رات ہو گئی تقریباً دن بھر ہی یہاں لوگوں کے درمیان رہا تھا اور اب ساڑھے دس بج رہے تھے کہ میں نے مزار شریف پر لگی ہوئی گھڑی میں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا چنانچہ سو جانے کا فیصلہ کیا اور صحن مزار سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف چہل پہل تھی سب کے اپنے اپنے چراغ روشن تھے میں ایک بے چراغ درخت کے نیچے پہنچ گیا یہیں تھوڑی سی جگہ ہاتھ سے صاف ستھری کی اور بازوؤں کا تکیہ بنا کر درخت کی ایک ابھری ہوئی جڑ پر سر رکھ کر لیٹ گیا کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کا خواہشمند تھا کہ سوچوں کو ذہن سے نکال سکوں سوچیں تو بڑا الجھا دیتی ہیں اور ان سوچوں میں نجانے کیا کیا تصورات شامل ہو جاتے ہیں۔ جو ذہن کو پراگندہ کر دیتے ہیں بچنا چاہتا تھا دماغ کو ان آوازوں پر مرکوز کر دیا جو اندر سے آرہی تھیں قوال گا رہے تھے۔

تیری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام
الٰہی میری سحر کی بھی شام ہو جائے

دل رو پڑا الٰہی میری سحر کی بھی شام ہو جائے جھلس گیا ہوں اس دھوپ میں سارا وجود جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اور کتنا جلتا رہوں گا اور کتنا۔ ! ہونٹ دانتوں میں دبا کر زخمی کر لئے خون کا نمک زبان پر پھیل گیا توبہ کر رہا تھا اس احساس سے پناہ مانگ رہا تھا بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا کان بند کر لئے کیسا شعر تھا دل پر ایسی ضرب پڑی تھی کہ کم بخت بے قابو ہو گیا تھا۔ الٰہی میری سحر کی بھی شام ہو جائے۔

کچھ لوگوں کی آمد نے سکون بخشا مجھے بیٹھے دیکھ کر آ گئے تھے دو آدمی ایک بوری پکڑے ہوئے تھے بوری پر دیگ رکھی ہوئی تھی تیسرا آدمی دیگ سے کچھ نکال رہا تھا۔

"لنگر کے چاول ہیں بھائی میاں کوئی برتن ہے۔"

"نہیں۔" میں نے آواز سنبھال کر کہا۔

"رکابی دیدو۔" اس نے کہا اور بوری پر رکھی ایک پلیٹ میں مجھے میٹھے چاول دے کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے بابا شاہجہاں کا مہمان تھا بھوکا کیسے سونے دیتے۔ شکر تھا قوال اس شعر سے آگے بڑھ گئے تھے پیٹ بھرا تو ذہن بوجھل ہو گیا۔ پریشانی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر کے سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی مجھے سوتے ہوئے کہ اچانک آنکھ کھل گئی سینے پر ایک زبردست بوجھ محسوس ہوا تھا وحشت زدہ ہو کر آنکھیں پھاڑ دیں ایک انسانی جسم سینے پر سوار تھا اس نے مجھے اپنی رانوں میں دبوچ رکھا تھا۔ پھر آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور اس کے ساتھ ہی شانے کے قریب سینے کے گوشت میں بجلیاں اتر گئیں۔ کسی تیز دھار والے خنجر نے شانے کے قریب کا گوشت کاٹ دیا اور شدید تکلیف کے باعث حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

دماغ نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوش و حواس قائم نہیں ہوئے تھے۔ حلق سے آزاد ہونے والی چیخ تکلیف کی وجہ سے نکل گئی تھی۔ اس میں کوشش شامل نہیں تھی کیونکہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ اگر بغل میں آگ نہ سلگ اٹھی ہوتی تو شاید اسے خواب ہی سمجھتا، لیکن تکلیف نے ایک لمحے میں حواس جگا دیئے۔ میرے سینے پر سوار شخص نے دوبارہ خنجر بلند کیا۔ وہ پوری طرح مجھ پر حاوی تھا اور یقیناً میں اس کا یہ وار نہیں روک سکتا تھا لیکن اسی وقت کچھ فاصلے سے چیخیں ابھری۔

"ہرے رام ہرے رام، خون، ہتھیا، خون ہو گیا۔ ارے دوڑو، پکڑو، خونی بھاگ نہ جائے، رام جی، ماتھر، دھرما، دوڑو پکڑو۔"

ان آوازوں نے میرے سینے پر سوار دشمن کو بوکھلا دیا۔ اور وہ دوسرا وار نہیں کر سکا۔ میں نے بھی اس کی گرفت سے نکلنے کیلئے جدوجہد شروع کر دی تھی چنانچہ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور پھر قلانچیں بھرتا ہوا تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے سینے سے اترتے ہی میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زخم شدید تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ خون بری طرح بہہ رہا تھا پورا ہاتھ چپچپا رہا تھا۔

جس طرف سے چیخیں ابھری تھیں وہاں چہل پہل تو ہو گئی تھی مگر کوئی آگے نہیں بڑھا تھا۔ مجھ پر وار کرنے والا اگر سمجھ داری سے کام لیتا تو دوسرا کامیاب وار کرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوتی کیونکہ چیخنے والے بہادر اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ البتہ کسی نے کئی بار ماچس کی تیلیاں روشن کیں اور پھر پیٹرومیکس روشن ہو گیا۔ اس کے مینٹل نے چند بار شعلے اگلے پھر تیز روشنی بکھیر دی۔

"ارے ہنڈا اٹھاؤ، دھت تمہاری جوانی کی، ہتھیارا بھاگ گیا کوئی آگے نہیں بڑھا۔ ارے اب تو اسے دیکھو سور ماؤ۔ میرے پیچھے پیچھے تو آ جاؤ۔ ہے رے تمہاری ...." کوئی کسی کو لعنت ملامت کرنے لگا، گیس کا ہنڈا اٹھایا گیا اور چند افراد میری طرف بڑھنے لگے۔

یہ خاندان مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھولداری میں مقیم تھا۔ یہاں قیام کرتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں کو محسوس کیا تھا مگر ان پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ سب میرے قریب آ گئے۔ سب سے آگے دھوتی کرتے میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص تھا اس کے پیچھے تین چار افراد اور تھے جن میں سے ایک پیٹرومیکس اٹھائے ہوئے تھا۔ میں بھی ہمت کر کے اٹھ گیا۔

"ارے..... ارے..... زندہ ہے۔ ارے بچ گیا بے چارہ۔ ارے کون ہے بیرا تو۔ گھاؤ لگا ہے کیا۔ ؟" ہمدرد انسان نے پوچھا، پھر ہنڈا اٹھانے والے سے کڑک کر بولا۔ "تیرا ستیاناس دھرما۔ ہنڈے کو دھوتی میں کیوں ٹھونسے لے رہا ہے روشنی تو آگے لا، دیکھنے تو دے۔ پوت گھاؤ لگا ہے کیا تیرے۔ ؟"

"ہاں چاچا جی۔ بغل کے پاس کٹ گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہیں..... ؟ ہاں اٹھاؤ رے اسے۔ منڈوے میں لے چلو۔ ارے رکمنی او رکمنی۔ جاگ گئی کیا بٹیا۔ ذرا اپنی ڈاکٹری نکال لے۔ اٹھاؤ رے سنبھال کر اٹھاؤ۔"

"وہ پھر نہ آ جائے گنگا جی۔" ہنڈے والے نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"لات دیں گے تیری کمر پر، اچھل کر منڈوے میں جا کر گرے گا۔ سنبھال کے رام جی، سنبھال کے ماتھر۔"

دو افراد نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔ اور پھر چھولداری کی طرف لے چلے تھے جہاں اندھیرے میں کچھ اور لوگ نظر آ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر شخص مسلسل چیخ رہا تھا۔

"رکمنی بیٹا، جاگ گئی تو۔ رکمنی............ اری او رکمنی۔"

"جاگ رہی ہوں تاؤ۔ کون ہے، کیا ہوا............؟" ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"اری ڈاکٹری نکال اپنی، گھائل ہے بے چارہ، کوئی پاپی ہتھیا کر رہا تھا اس کی، بھگوان نے بچا لیا، مگر گھاؤ لگ گیا ہے۔"

"چیخو مت تاؤ جی، دوسرے لوگ بھی آس پاس موجود ہیں۔ مجمع لگ جائے گا۔" میرے ساتھ چلنے والے ایک شخص نے کہا۔ اتنی دیر میں ہم چھولداری کے پاس آ گئے۔

"اندر لے چلو اندر............!" ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

"چلو اندر قدم بڑھاؤ............" مجھے سنبھالنے والوں نے کہا۔ میں بادل ناخواستہ ان کے ساتھ چھولداری میں داخل ہو گیا۔ چھولداری کافی وسیع تھی۔ اس میں جگہ جگہ گدے پڑے ہوئے تھے۔ ان گدوں پر یہ لوگ سو رہے ہوں گے لیکن اب کوئی ان پر نہیں تھا البتہ سکڑی سمٹی چادریں پڑی ہوئی تھیں تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہنڈے کی روشنی چھولداری میں پھیل گئی۔ عمر رسیدہ شخص نے کہا۔

"بیٹھ جا پوت بیٹھ جا۔ رکمنی، رکمنی ری۔ ارے کہاں ہے ری تو۔"

"یہ کیا ہوں تمہارے پیچھے تاؤ۔" کسی لڑکی نے جواب دیا۔

"ارے کیا کہا تھا میں نے۔ اونچا سننے لگی ہے کیا۔"

"آپ ہٹیں سامنے سے تو میں کچھ دیکھوں تاؤ۔" لڑکی بولی۔

"ارے بٹھاؤ اسے، تو بیٹھ جا بیٹا، کیا تیرے بھی کان خراب ہیں ارے یہ تم نئے لڑکی لڑکوں کو کیا ہو گیا ہے۔ بیس بیس بیری کوئی بات کہو تو اکیسویں بیری سنتے ہو۔ ارے بیٹھ جا۔"

"گدا خراب ہو جائے گا، خون بہہ رہا ہے میرے بدن سے۔" میں نے کہا۔

"خون۔" ایک اور نسوانی آواز ابھری۔

"بیٹھ جا میرے بیٹا، بیٹھ جا، میری آواز بیٹھی جا رہی ہے۔" معمر شخص نے کراہتے ہوئے کہا اور میں بیٹھ گیا۔

"لو ڈوب گئی لٹیا۔" دوسری نسوانی آواز پھر سنائی دی۔

"گیس لیمپ قریب لاؤ۔ دھرما آگے آ جا، نیچے بیٹھ جا۔" رکمنی نامی لڑکی نے کہا۔ وہ فرسٹ ایڈ بکس لے کر میرے پاس بیٹھ چکی تھی۔ دھرما نے پیٹرومیکس قریب رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ "اوپر اٹھا رے دھرما۔" لڑکی بولی، اور دھرما کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔

"رام............ رام جی .... رام جی۔ تم اٹھا لو۔ مم۔ مجھ سے خون نہیں دیکھا جاتا۔"

...آدمی نے پیٹرومیکس اٹھا کر قریب کر لیا اور لڑکی میرا زخم دیکھنے لگی۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ بکس ...ینڈیج کا سامان نکال لیا۔ مکمل ڈاکٹر معلوم ہوتی تھی پہلے اس نے کوئی لیکوئیڈ میرے زخم پر اور اس کے ... اسپرے کیا۔ اس کے بعد خون صاف کر کے کوئی مرہم لگایا۔ پھر فل بینڈیج کرنے لگی۔ اس ...ے میری قمیض اتار دی گئی تھی۔ خود معمر آدمی ہر کام میں پیش پیش تھا۔ بینڈیج ہو گئی تو معمر آدمی

"...ثریا، اری ثریا بیٹی، دودھ گرم کر لے چندو، ایک گلاس گرم گرم دودھ پلاؤ اسے۔ جان پکڑے گا، ...خون بہہ گیا۔ رام رام............ رام رام............!"

"مجھے بلایا گنگا جی............" رام جی نے کہا۔

"ارے چپ بیٹھ نہیں تو............ اتنا خون نکل گیا۔ تو لیٹ جا پوت۔"

"خون میں بھرا ہے پورے کا پورا۔ گدا خراب ہو جائے گا۔ ارے ثریا دوسری دری بچھا دے۔" ...ارت نے کہا۔

"...دو دوسری دری۔"

"تیری آواز پھر نکلی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" معمر شخص جسے گنگا جی کہہ کر پکارا جا رہا تھا بگڑ کر ... پھر اس نے سینے پر دباؤ ڈال کر مجھے لٹا دیا۔ میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"آپ لوگوں کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔"

"صبح اٹھ کر چار جوتے مار دینا ہمارے منہ پر............ اور چلے جانا۔ احسان اتر جائے گا۔" معمر ...نے کہا۔

"...جی............!" میں حیرانی سے بولا۔

"تاؤ جی، چپ رہنے دیں انہیں۔ زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوگا، آپ دودھ پی لیں پھر میں آپ کو ...انجکشن دوں گی آپ آرام سے سو جائیے صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ہاں۔" عورت کی آواز پھر ابھری۔

"...پھر بولی۔" گنگا جی غرائے۔ اتنی دیر میں دودھ کا گلاس آ گیا۔ اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا گیا۔ ...ہیں ہچکچاہٹ ابھری تھی لیکن کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ دودھ پینا پڑا۔ رکمنی انجکشن تیار کر چکی تھی۔ اس ...نے انجکشن لگایا اور پھر مجھے دوبارہ لٹا دیا گیا۔

"...آنکھیں بند کر لو۔ ابھی نیند آ جائے گی۔"

"...کا انجکشن ہے؟" گنگا جی نے پوچھا۔

"...خواب آور ہے۔" رکمنی بولی۔ میں نے اس کی ہدایت پر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں ہلکی سی ...ابھری تھی لیکن نیند یا بے ہوشی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ سب لوگ چھولداری ہی میں تھے

لیکن رکمنی نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی اس لئے ایک دم خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ کئی پر
منٹ گزر گئے لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ جاگ رہا تھا پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ پھر رکمنی نے
"بس ٹھیک ہے کام ہوگیا۔"

"ایں، کیا کام ہوگیا۔" معمر شخص کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوہ، تاؤ جی، میرا مطلب ہے یہ گہری نیند سوگیا بلکہ بے ہوش ہوگیا۔"

"ارے بھیا، تو بے ہوش ہوگیا کیا۔ بتا رے بھائی۔ ارے بولے گا نا کیا؟"

"تاؤ جی، تاؤ جی۔ وہ بے ہوشی میں بولے گا کیا؟" اس بار نوجوان نے کہا۔

"ایں، ہاں سوتو ہے۔" تاؤ جی نے کہا۔

"بھگوان نے اتنی عقل دی ہوتی تو وارے نیارے نہ ہوگئے ہوتے۔ کچھ کما نہ کھاتے۔" نسوانی آواز نے کہا۔

"ہاں تو تو جیسے کمنڈل ہاتھ میں لے کر بھیک مانگتی ہے سڑکوں پر اسی طرح سب کا پیٹ بھرتا ہے۔" معمر شخص نے کہا۔

"ارے ارے، آپ لوگ پھر لڑنے لگے۔" یہ آواز رکمنی کی تھی۔

"تو خود دیکھ رکمنی۔ اتنا تھ آشرم بنا رکھا ہے انہوں نے ایک کے بعد ایک کو بھرے لے رہے ہیں۔ گدا خون سے خراب کر دیا، چادر بھگو دی خون میں، نقصان پہ نقصان۔ اس کے سوا اور کیا کرنے ہیں یہ۔ ارے میں پوچھتی ہوں یہ ہے کون............؟"

"دیکھتی نہیں ہے انسان ہے۔"

"یہ تو آپ ہمیں بھی پتہ ہے تاؤ جی۔؟" نوجوان نے کہا۔

"ارے ہمیں کیا معلوم بھیا۔ تم سب لوگ لمبے پڑے تھے منڈوے میں اور یہ گیا بھیا کر رہی تھی سوتے میں اتنی زور سے خراٹے لے رہی تھی جیسے کوئی ناڑ پر گنڈا سا مار گیا ہو۔ ہماری نیند اڑ گئی اور ہم باہر نکل آئے۔ ارے بھیا کیا دیکھا کہ ایک پاپی خونی چڑھ بیٹھا اس بے چارے چھورا پہ، خنجر لیا ہم نے بس چل پڑے ہم اور بھگوان نے دیا کہ وہ اسے چھوڑ بھاگا۔ نہیں تو مارا گیا تھا بے چارہ۔ تم سسر، گٹی بیٹھ گئی تمہاری۔ ایک بھی آگے بڑھ کر نہ دیا۔ ارے واہ جوانو، یہ ہے تمہاری جوانی۔ جوانی دیکھنی تھی تو ہماری دیکھتے سسر بیسیوں ڈکیت پکڑ پولیس کے حوالے کر دیئے۔ پچاسیوں خونی کے پولیس کو دیدیئے۔"

"اے لالہ جی، اے لالہ جی، ذرا میری طرف دیکھو۔" اس عورت کی طنزیہ آواز ابھری۔ گنگا جی کی مسلسل چل رہی تھی۔ غالباً وہ اس کی دھرم پتنی تھی۔

"مرکر بھی نہ دیکھوں تیری صورت تو............ صبح دیکھ لو تو دن بھر مصیبت اٹھاؤ رات کو بگھترے ہی اٹھا لے جائیں۔"

"ہیں، میری طرف دیکھو گے تو شرم جو آئے گی، کونسے ڈکیت پکڑے تم نے، ذرا بتاؤ تو

...ں کا جھگڑا ہوا تھا تو کیا ہوا تھا۔ ذرا بتاؤ ان بچوں کو۔"

"اچھوت جاتی کی ہے تو پکی اچھوت جاتی کی، ایک بات پکڑ کر بیٹھ گئی ہزار بار بتا چکے ہیں بچوں کو، ... تھا وید جی کے کہنے سے، جنگل پانی کو گئے تھے ہوگیا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا۔ لٹھیاں چل رہی تھیں ... نہیں تو کیا کرتے۔ ایں، کالی کبوتری، بھگوان نے جیسی شکل دی ویسی ہی زبان بھی۔" لالہ جی بگڑ کر بولے۔

"جلتی پر کیسا تیل پڑا اب۔ ہیں۔"

"بات پوری ہونے دیں تائی جی۔" نوجوان بولا۔ "پھر کیا ہوا تاؤ جی؟"

"لے پھر جو ہوا تمہارے سامنے نہیں ہے کیا۔"

"اوہ، اب کیا کریں گے۔" رکمنی بولی۔

"کریں گے کیا، سونے دے بے چارے کو، صبح کو دیکھیں گے۔"

"اور چھورے چھوریاں کہاں سوئیں گے۔" دیوی جی بولیں۔

"تیرے سر پر، ارے ایک گدا ہی تو ملا ہے بے چارے کو، میرے لئے دری بچھا دے اس کے پ..."

"صبح کو بھگا دینا اسے۔ کے دے رہی ہوں، اچھا نہ ہوگا۔"

"جا تو جا پڑ کونے میں، صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔"

"ہنڈا بجھا دوں گنگا جی۔؟"

"نا میرے سر پر پھوڑ دے۔ لے کھوپڑی جھکا رہا ہوں۔" لالہ جی بولے۔ دھرما نے ہنڈا ... دیا۔ پھر شاید ایک ایک کر کے سب لیٹ گئے۔ میں دم سادھے خاموش لیٹا ہوا تھا۔ رکمنی نے زخم پر ... لگائی تھی، غالباً اسے سن بھی کر دیا تھا کیونکہ کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کا لگایا ہوا ... مجھ پر بے اثر تھا۔ نہ نیند آئی تھی نہ بے ہوشی طاری ہوئی تھی۔ مکمل سناٹا چھا گیا اور میں اس شخص ... میں سوچنے لگا جو خنجر سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ کون تھا وہ، کیا چاہتا تھا، کوئی چور، لٹیرا، لیکن یہ ... کوئی نہیں جی، میں تو گہری نیند سو رہا تھا۔ میری جیبیں ٹٹول کر بھاگ جاتا۔ یہ جان لیوا حملہ کیوں کیا ... نہ جانے کون تھا۔ کیا چاہتا تھا۔ میں تو صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر ذہن ان لوگوں پر چلا ... ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ معمر شخص دلچسپ انسان ہے۔ تلخ مزاج تلخ زبان لیکن ... بیوی سے خوب چلتی ہے۔ نام شاید گنگا ہے، آگے پیچھے بھی کچھ ہوگا۔ خوب آدمی ہے مگر ایک ... چبھنے لگا۔ اس نے جس لڑکی سے دودھ لانے کیلئے کہا تھا اس کا نام ثریا لیا تھا۔ یہ تو مسلمان نام ... ایسا ہے تو ایک مسلمان لڑکی ان کے ساتھ کیوں ہے۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ وہ ہندو ہونے ... بابا شاہجہاں کے مزار پر فروکش تھے۔ تانگے والے نے مجھے بتایا تھا کہ بابا صاحب کے عقیدت ... میں ہندو بھی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہو............ مگر وہ مسلمان لڑکی نہ جانے کون ہے۔

دماغ کی تھکن سے ہی نیند آئی تھی۔ اور نہ جانے کب تک سوتا رہا تھا۔ جاگا تو بدن پر کمبل ڈھکا ہوا تھا۔ معمر شخص کی آواز سنائی دی۔

"جاگ گیا رکمنی۔"

"آئی تاؤ........." چھولداری کے باہر سے آواز سنائی دی تھی۔ میں نے کمبل سمیٹ کر اٹھنا چاہا معمر شخص نے جلدی سے کہا۔

"ارے او......... ارے او سورما، ارے لیٹا رہ بھائی۔ بڑا سورما ہے تو مان لیا ہم نے لیٹا رہ کمبل نہ اتار، ہوا لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"میں ٹھیک ہوں گنگا جی۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے تو......... اس......... ارے۔ ارے تجھے ہمارا نام کیسے معلوم ہو گیا۔ ارے بھیا تو ہمیں کیسے جانتا ہے۔" معمر شخص نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"رام جی نے آپ کو گنگا جی کہہ کر پکارا تھا۔"

"لے اور لے، رام جی کا نام بھی معلوم ہے۔ چل اس نے ہمیں گنگا کہہ کر پکارا تھا مگر رام جی کو تو کیسے جانے ہے۔"

"آپ نے اسے رام جی کہہ کر پکارا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اس وقت ایک خوبصورت لڑکی جس نے سفید ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ دراز قامت اور شوخ مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور بسکٹوں کا پیکٹ لئے اندر آگئی۔ گنگا جی نے آہستہ سے کہا۔

"اری رکمنی بٹیا یہ تو تمہارے پورے کٹم کو جانے ہے۔"

"کیسے۔" رکمنی میرے پاس بیٹھ کر بولی۔

"سب کا نام لے کر بتا رہا ہے۔ اچھا اس بٹیا کا نام بتا۔" گنگا جی نے معصومیت سے رکمنی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور مجھے پھر ہنسی آگئی۔ رکمنی نے غور سے مجھے دیکھا دیکھتی رہی پھر خود بھی ہنس دی اور بولی۔ "کیا قصہ ہے۔"

"کچھ نہیں رکمنی جی۔ گنگا جی اس بات پر حیران ہیں کہ میں سب کے نام کیسے جانتا ہوں حالانکہ بار بار آپ کو رکمنی کہہ کر پکار رہے ہیں اور اب مجھ سے آپ کا نام پوچھ رہے ہیں۔"

"تاؤ جی بہت سادہ لوح ہیں، بہت معصوم، چلو تھوڑے سے اٹھو یہ چائے اور دودھ ملا ہوا ہے خالص دودھ ہے نہ چائے۔ کچھ بسکٹ کھا لو اس کے ساتھ پھر تمہیں دوا دوں گی۔ خالی پیٹ دوا نہیں دی جا سکتی........."

"آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے میری وجہ سے، ویسے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے، صرف ایک سو چار بخار ہے آپ کو، چلئے اٹھئے بھوک نہیں لگی کیا۔"

... بخار آ گیا مجھے، تعجب ہے۔" میں نے اٹھ کر دودھ اور بسکٹ لے لئے۔ باقی لوگ چھولداری میں نہیں نظر آ رہے تھے کئی بسکٹ کھانے کے بعد میں نے دودھ نما چائے پی لی۔ ایک بار پھر ان لوگوں کا ... آیا اور پھر رکمنی سے پوچھا......... "کیا وقت ہو گیا رکمنی دیوی.........!"

"چار بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔" رکمنی نے اپنی کلائی پر بندھی چھوٹی سی گھڑی میں وقت دیکھ کر ...

"جی۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ آپ پورے سولہ گھنٹے سوتے رہے ہیں انجکشن کے اثر سے نہیں بخار کی غفلت ہے۔"

"اوہ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"او کے دوائیں لے آؤں آپ کیلئے۔" رکمنی گلاس اور بسکٹ سنبھال کر اٹھ گئی گنگا جی نے کہا۔

"میں بات کر لوں اس سے ڈاکٹرنی صاحبہ؟"

"ضرور تاؤ جی۔" وہ باہر نکلتے ہوئی بولی۔ اور گنگا جی میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"تو بڑا گیانی ہے بھائی تجھے سب کے نام معلوم ہو گئے۔ ہم ٹھہرے بدھو کے بدھو، تو نے سن ہی لیا ہری بٹیا کے منہ سے۔ ہمیں تیرا نام نہیں معلوم۔"

"میرا نام مسعود ہے گنگا جی۔"

"مسلمان ہے؟"

"الحمد للہ!"

"تیرا دشمن کون تھا۔"

"میں بالکل نہیں جانتا۔"

"دشمنی چل رہی ہے کسی سے۔؟"

"نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو کوئی اچکا ہوگا۔ سسرا جان لینے پر تل گیا تھا وہ تو ہم نے دیکھ کر شور مچا دیا نہیں تو پاپی دوسرا وار ..."

"میں خلوص دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں گنگا جی۔"

"... بھگوان کو تیری جان بچانی تھی۔ ہمیں کارن بنا دیا اور پھر بہت بڑی سرکار دوارے آیا ... گھاؤ ضرور لگ گیا مگر بابا جی کسی کو ایسے مرنے دیتے۔ اس پاپی کو ضرور سزا ملے گی جس نے تجھے بابا ... پر گھائل کیا۔ زیارت کو آیا ہے؟"

"..."

"... ہے؟"

"..."

"... بتا ہے۔" میں نے جواب میں اپنے شہر کا نام بتایا۔

"بڑی دور سے آیا ہے۔ مگر بابا شاہجہاں کے دوارے تو نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں اور ہم تو پرکھوں سے باباجی کے داس ہیں۔ سال کے سال آتے ہیں عرس میں اور سال بھر کیلئے شانتی لے جاتے ہیں۔"

"آپ ہندو ہو کر اتنی عقیدت رکھتے ہیں باباجی سے؟"

"ارے بیٹا سارے کھیل سنسار کے ہیں۔ کون کہاں سے آتا ہے کہاں چلا جاتا ہے یہ کوئی اور ہی جانتا ہے روتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ہندو کہہ لو، سکھ کہہ لو، عیسائی کہہ لو، مسلمان کہہ لو۔ یہ ساری باتیں بس کہنے کیلئے ہوتی ہیں۔"

"بہت بڑے ہیں آپ گنگاجی۔ صرف انسان ہیں آپ! آپ کا پورا نام کیا ہے؟"

"تو بتا گیانی تو جانیں۔" گنگاجی نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے جتنا سنا ہے اتنا ہی جانتا ہوں۔"

"ہیں آ گیا نا کنیڈے پر۔ ہمارا نام گنگا دھر ہے پتا کا نام مرلی دھر تھا ہماری دھرم پتنی کا نام پریم وتی ہے۔ پریما دیوی کہتے ہیں سب اسے۔ ہری مرچ کے کھیت میں اگی تھی کیا ہوئی، ہری مرچ، ہمیں پرلے سرے کا گدھا سمجھتی ہے مہا کنجوس ہے دانے دانے پر جان دیتی ہے۔ دونوں بچے ماتھر اور رکمنی ہمارے سورگباشی بھائی کے بچے ہیں پتی پتنی ریل گاڑی کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ تب سے بچوں کو ہم نے پالا پوسا، پڑھایا، لکھایا رکمنی ڈاکٹر بن چکی ہے اور اسپتال میں نوکر ہو گئی ہے ماتھر انجینئرنگ کا امتحان پاس کر چکا ہے نوکری ڈھونڈ رہا ہے۔ منت مانگنے آیا ہوں بابا شاہجہاں کے مزار پر۔ رام جی پرانے نوکر ہیں ہم سب عزت کرتے ہیں ان کی دھرے بھی کوئی چھ سال سے نوکری کرتا ہے سب سمجھ میں آ گیا یا کچھ رہ گیا۔"

"کچھ رہ گیا گنگاجی۔"

"کیا؟" گنگاجی غرا کر بولے۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"ایں۔ ہاں۔ سچی مچی رہ گیا۔" گنگاجی مسکرا کر بولے۔

"خورجے کے رہنے والے ہیں ہم لوگ۔"

"اور بھی کچھ رہ گیا گنگاجی؟"

"وہ کیا؟"

"ثریا کون ہے؟" میں نے پوچھا اور گنگا دھر کی آنکھیں پھر پھٹ گئیں۔ وہ مجھے گھورنے لگے پھر بولے۔ "بڑا ایکٹ لگے ہے بھائی تو.......... اب کہہ دے کہ ثریا کا نام بھی لیا تھا ہم نے۔"

"لیا تھا۔" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رکمنی دوبارہ اندر داخل ہوئی تھی ٹھٹھک کر رکی ایک لمحے مجھے دیکھا پھر آگے آ گئی۔

"کس بات پر ہنسا جا رہا ہے۔ نام کیا ہے تمہارا؟" اس نے دوبارہ میرے قریب بیٹھ کر کہا۔

"ثریا کو بھی جانتا ہے۔ رات کو گھائل ہوا تھا۔ سب کے نام سن لئے تھے اس نے اور پھر تو نے بے ہوش کر دیا مگر پھر بھی یہ سنتا رہا۔ اب ثریا کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔" گنگا دھر جی نے عجیب انداز میں کہا۔

"واقعی ثریا کا نام کہاں سے سن لیا تم نے؟" رکمنی بولی۔

"رات کو گنگاجی نے یہ نام لے کر دودھ منگوایا تھا۔ میں بدستور ہنستا ہوا بولا اور رکمنی بھی ہنس پڑی۔

"تاؤ جی آپ نے دودھ تو ثریا ہی سے منگوایا تھا۔ لو یہ گولیاں کھا لو یہ پانی پکڑو۔ نام نہیں بتایا تم نے؟"

"مسعود" میں نے جواب دیا اور گولیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ گولیاں معدے میں اتار کر میں نے پانی کا گلاس واپس کر دیا پھر کہا۔ "گنگا دھر جی اب مجھے اجازت دیں گے؟"

"کام پر جانا ہے؟" وہ بولے۔

"نہیں لیکن جانا تو ہے۔"

"اچار نہیں ڈالیں گے ہم تمہارا اچھے ہو جاؤ تو چلے جانا کیسا برا سے گیا ہے رکمنی اگر ہم مسلمان ہوتے تو یہ یہاں ضرور رک جاتا۔ سوچ رہا ہو گا ہمارے ہاں کھائے پیئے گا تو دھرم بھرشٹ ہو جائے گا ارے بھائی ثریا ہے ہمارے پاس تیرے دھرم کی ہے وہی دو روٹی پکا دے گی تیرے لئے مت کھانا ہمارے ہاتھ کا۔ سالن کسی مسلمان کی دکان سے منگوا لینا یہاں کیا کمی ہے اتنی جلدی تو نہ بھاگ۔"

"آپ مجھے اتنا گرا ہوا نہ سمجھیں گنگاجی۔ آپ کی محبت اور احسان کا تو میں صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ آپ سب کو میری وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"ارے تو ہمیں ہو رہی ہے تکلیف، تجھے تو نہیں ہو رہی۔"

"تاؤ جی۔ ان کے کان بہت لمبے ہیں سب کچھ سن لیا ہے تو تائی جی کی باتیں بھی سن لی ہوں گی۔ لیکن مسٹر مسعود آپ کے ابھی یہاں سے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا آپ کا زخم گہرا ہے چلیں گے پھریں گے تو خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپ کمزور بھی ہو گئے ہیں اسی لئے آپ کو کہہ گیا ہے میں آپ کی ڈاکٹر ہوں اور ابھی آپ کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"یہ اب بول۔" گنگا دھر خوش ہو کر بولے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ سوچ لیں آپ کو کیسی پریشانی ہو گی۔"

"اگر آپ کے خیال میں ہماری پریشانی صرف تائی جی ہیں تو ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ کسی طرح انہیں انجوائے کریں۔"

"بہتر ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"سمجھا؟"

"تاؤ جی!"

"مزار شریف پر جائے گی کیا؟"

"آپ بتائیے۔"

"تو تو دن میں ہو آئی ہے۔ میں چلا جاؤں تھوڑی دیر کیلئے۔"

"ضرور چلے جائیں تاؤ جی۔"

"ٹھیک ہے تو اسے سنبھالو سب کے ساتھ ہی واپس آؤں گا۔"

"او کے۔"

"کیا۔" گنگا دھرجی آنکھیں نکال کر بولے۔ اور رکمنی ہنس پڑی پھر بولی "ٹھیک ہے تاؤ جی ہو جائیے۔" گنگا دھرجی اٹھ کر باہر نکل گئے تھے رکمنی میری طرف دیکھ کر بولی۔ "ویسے آپ کو برا تو برا نہ لگا ہوگا مسعود۔ بڑے دلچسپ ہیں تاؤ جی۔ دن رات بولتے رہتے ہیں مگر من کے بڑے اچھے سچے ہیں۔ جو جی میں آیا زبان سے نکال باہر کیا دل میں کچھ نہیں رہ جاتا ایسے لوگ برے نہیں ہوتے۔"

"یقیناً۔" میں نے اعتراف کیا۔ اس کے بعد رکمنی نے بھی مجھ سے میرے دشمن کے بارے میں وہی سوالات کیے جو گنگا دھرجی نے کیے تھے۔ وہ بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ کسی بات پر مجھے ہنسی آئی تو پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"ایک بات کہوں۔"

"جی، ضرور کہئے۔"

"کم ہنسا کرو اور اکیلے میں ہنسا کرو۔"

"سمجھا نہیں۔"

"یوں تو آپ نے اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ نہ جانے کیا ناٹک ہے آپ کا مگر ہنستے ہیں تو بڑے پیارے لگتے ہیں۔ ایسے کہ انسان دیکھتا رہ جائے نظر لگ جائے گی کسی کی۔ ایک بات اور ان الفاظ کو کچھ اور سمجھنا بڑے مان سے دیدی کہہ سکتے ہیں مجھے۔ ماتھر سے الگ نہیں ہیں میری نگاہ میں کیا سمجھے۔؟"

"جی۔" میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

رکمنی کی بات پھر ادھوری رہ گئی چھولداری کے باہر آوازیں ابھریں۔ پہلے داخل ہونے والی پریما تھیں مجھے دیکھا۔ رکمنی کو دیکھا پھر بولیں۔ "کہاں گئے تمہارے تاؤ؟"

"آپ کو نہیں ملے تائی جی۔"

"چلے گئے کیا؟"

"ہاں۔" ماتھر، رام جی اور دھرما آ گئے۔ پریما دیوی نے ایک دونا آگے کرتے ہوئے کہا پرساد لے لو۔ اس کا بخار کیسا ہے۔؟"

"کچھ کم ہے۔"

"آج بھی یہیں رہے گا کیا؟"

"ہاں تاؤ جی یہی کہہ رہے ہیں۔" رکمنی شرارت سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ دھرما، رام جی اس کا گدا کونے میں کرا دو۔ اور چلو کھانے پینے کا ڈول بتاؤ۔" ماتھر اور رکمنی نے حیرانی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی پھر رکمنی بولی۔

"آپ تاؤ جی سے بات کر لیں تائی جی۔ آخر نیا مہمان کب تک ہمارے ساتھ رہے گا اور پھر ہماری تو کوئی ناتے داری بھی نہیں ہے اس سے۔"

"ارے تو ہم پر کونسا بوجھ ہے جو بھگوان دے گا کھا لے گا اپنے بھاگ کا کیسا لوہے کی طرح تپتا رہا ہے بے چارا دن بھر اری ثریا ارے یہ ثریا کہاں رہ گئی ہے۔" میری نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں اس کردار کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ثریا اندر آ گئی دبلی پتلی جسامت کی دراز قامت لڑکی۔ عمر کوئی بیس اکیس سال الجھے بال لیکن گھٹاؤں کی طرح امنڈتے ہوئے، بڑی بڑی انتہائی حسین آنکھیں خوف میں ڈوبی ہوئی۔ ہونٹوں پر قدرتی گلاب کھلے ہوئے۔ ایسے جاذب نقوش کہ دل کی حرکت بند ہونے لگے لیکن مجسم حسرت و یاس سارے جہاں کا کرب خود میں سمیٹے ہوئے چال میں بھٹکا بھٹکا پن۔ سادہ سی قمیض شلوار میں ملبوس۔

"ثریا بٹیا۔ مہمان کے نیچے چادر بدل دے۔ صبح کو اسے دھو ڈالیو۔"

"ہرے رام۔ ہرے کرشن۔ ہرے رام۔" ماتھر منہ ہی منہ میں گنگنانے لگا۔ ثریا ایک طرف چلی گئی میں غیر اختیاری طور پر اسے دیکھتا رہا۔ رکمنی نے کہا۔

"دھرما۔ ایک برتن میں پانی گرم کر کے لے آؤ۔ میں بینڈیج تبدیل کروں گی۔"

"جی رکمنی بٹیا۔" پریما دیوی چھولداری سے باہر نکل گئیں تو ماتھر آلتی پالتی مار کر میرے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور آنکھیں بند کر کے جے بھگوتی۔ جے پربھو کی گردان کرنے لگا!

"ماتھر بھیا کیا کر رہے ہو۔ تائی جی آ جائیں گی۔"

"ارے آنے دو۔ پربھو پدھارے ہیں ہماری کٹیا میں ایسے مہمان پرش دیکھے نہ سنے۔ ارے ایک ظالمن پریم وتی دیوی کی کایا پلٹ دی انہوں نے وہ جو چیونٹیوں کو ایک چٹکی آٹا نہ کھلاویں کہہ رہی ہیں کہ بھگوان دے گا کھا لے گا اپنے بھاگ کا۔ جے بھگوتی جے شنکرا جے بھگوتی ماتھر پر شرارت سوار تھی۔ ثریا سوٹ کیس سے نئی چادر نکال لائی۔ مجھے سہارا دینے کیلئے دھرما اور رام جی آگے بڑھے لیکن میں خود ہی جلدی سے گدے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رکمنی زور سے چیخی۔ "ارے ارے سورما جی۔ زیادہ بہادری نہ دکھائیں زخم کھل جائے گا چکر آ جائے گا گر پڑیں گے۔"

"نہ زخم کھلے گا نہ چکر آئیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں رکمنی جی۔"

"بالکل ٹھیک کہا مہاراج نے۔ جے بھولے ناتھ۔ آپ جو کچھ کہیں گے ہم مانیں گے پربھو، ہماری بھوجی نے آج جو کچھ آپ کیلئے کہہ دیا وہ ہم نے جیون بھر ان کے منہ سے نہ سنا۔ آج پہلی بار جے

" دھرما۔ ارے رام جی۔ کام ہو گیا اندر کا۔ اب باہر بھی آ جاؤ۔ " باہر سے پریما دیوی کی آواز سنائی دی۔

" جاؤ جاؤ۔ اندر کے کام ہم کرلیں گے۔ " رکمنی نے کہا۔ ثریا نے چادر بچھادی پرانی چادر لے کر وہ باہر نکل گئی۔ میں نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی یہ گناہ تھا لیکن نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ یہ چہرہ میری آنکھوں میں بیٹھ گیا تھا۔ ایک ایک نقش ازبر ہو گیا تھا۔

رکمنی نے ماتھر کو میرا نام بتادیا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے مسعود مہاراج کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ بڑے بڑھے لکھ لوگ تھے کافی حد تک معلوم ہو گیا تھا ان کے بارے میں ثریا کے بارے میں بعد میں یہی سوچا میں نے کہ وہ ان کے ہاں نوکری کرتی ہوگی۔ اس خیال سے دل میں عزت بھی ہو گئی ان لوگوں کیلئے اول تو وہ بابا شاہجہاں کے اتنے عقیدت مند تھے کہ ہر سال عرس میں آتے تھے دوم انہوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ میں مسلمان ہوں، مجھ سے احتراز نہیں کیا اور پھر کشادہ دلی کی یہ انتہا کہ ایک مسلمان لڑکی کو نوکر رکھا ہوا تھا۔

گنگا دھر مہاراج آ گئے۔ بگڑ کر بولے۔ " تم لوگوں نے انتظار بھی نہیں کیا میرا۔ ؟ "

" جتنا انتظار کرنے کو کہا تھا اتنا کرلیا۔ کیا تمہارے لئے بیٹھے رہتے وہاں۔ " پریما دیوی بولیں۔

" پھیرے کرنے کیلئے تو پانچ سال بیٹھی رہی تھی یہاں گھنٹہ بھر بھی انتظار نہ کیا۔ "

" ارے وہی تو ایک غلطی ہوئی تھی جو آج تک بھگت رہی ہوں۔ "

" تو بھگت رہی ہے کہ میں ؟ "

" تم کیا بھگت رہے ہو ایک میرے ہی ماتا پتا بھولے تھے کہ آنکھیں بند کرلیں بعد میں سب نے کہا کہ بھاگ پھوڑ دیئے بٹی کے۔ "

" کسی ایک کہنے والے کا نام تو بتا ذرا۔ "

" تاؤ جی تائی جی، مہمان کا تو خیال کریں کیا سوچے گا وہ اپنے دل میں۔ " رکمنی بولی۔

" ارے ثریا۔ ثریا چندو مسعود جی تیرے دھرم کے ہیں بٹیا تو ان کیلئے کچھ پکا لے۔ ان کی مہمانداری تیرے سپرد۔ رکمنی تو بتا کیا کھلائے گی اپنے مریض کو ؟ " پریما دیوی چونک کر بولیں۔

" ایں۔ " گنگا دھر جی چونک کر بولے۔

" تائی جی دلیہ مل جائے یا کھچڑی ہلکی غذا ہو تو اچھا ہے۔ "

" دلیہ تو ہے۔ لو ان کیلئے برتن بازار سے منگوالو، نہیں تو دیر ہو جائے گی۔ " پریما دیوی نے پلو سے پیسے نکال کر دھرما کو دیئے۔

" جے بھگوتی۔ " ماتھر گردن پٹختا ہوا بولا۔ گنگا دھر جی بھاڑ سا منہ کھولے کھڑے تھے پھر وہ آہستہ سے بولے۔ " رکمنی۔ یہ تیری تائی ہے نا؟ "

رات ہوئی۔ سب نے کھانا کھالیا۔ سب مجھ سے باتیں کر چکے تھے لیکن میں نے ثریا کو بالکل خاموش پایا تھا۔ اس نے کسی سے ایک بار بھی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ ان لوگوں کے انداز میں اس کیلئے محبت

اور اپنائیت تھی لیکن وہ اداس ملول اور خاموش تھی۔

دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ یہ سب بہت اچھے تھے۔ بڑے سادہ لوح اور محبت کرنے والے۔ میرے ساتھ بہترین سلوک کیا انہوں نے لیکن ثریا بہت پراسرار تھی خاموش اور بے سکون۔ نہ جانے کیوں ؟ میں نے اسے راتوں کو مضطرب دیکھا تھا۔ مگر وہ بولتی بھی تو نہیں تھی کئی بار میں نے براہ راست اس کا نام لے کر اس سے اپنے کام کرائے تھے وہ بڑی خوش دلی سے میرے کام کر دیتی تھی اب تک میں نے اس کی آواز ایک بار بھی نہیں سنی تھی۔

رکمنی نے بینڈیج کھول کر میرا زخم دیکھا اور خوش ہو کر فخریہ انداز میں بولی۔ " دیکھیں تاؤ جی ہماری ڈاکٹری۔ تین دن میں زخم بھر دیا ہم نے۔ کوئی کر کے تو دکھادے۔ "

" یہ تو ہم مانتے ہیں رکمنی دیوی۔ "

" اب میں باہر جا سکتا ہوں رکمنی بہن۔ " میں نے پوچھا۔

" کہاں باہر ؟ "

" مزار پر۔ "

" ہوں۔ آہستہ آہستہ جا سکتے ہیں۔ ابھی تیز چلنا منع ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ میں اس جگہ گھسنا منع ہے جہاں دھکم پیل کا امکان ہو۔ کسی طرح کی بھاگ دوڑ کی اجازت نہیں ہے۔ "

خیال رکھوں گا۔ "

" دھرما یا رام جی آپ کے ساتھ جائیں گے۔ "

" میں چلا جاؤں گا مجھ سے زیادہ کون خیال رکھے گا۔ " گنگا دھر جی بولے۔

" یہ اجازت اس لئے دیدی گئی ہے کہ آپ کا دل گھبرا گیا ہو گا۔ ورنہ ابھی دو چار دن اور اجازت نہ ملتی۔ " رکمنی بولی۔

" بے حد شکریہ۔ " میں نے کہا یہ سچ تھا ان لوگوں کی محبت کی وجہ سے میں نے ان کے احکامات مان لئے تھے ورنہ میں تو نہ جانے کیسے کیسے گھاؤ کھا چکا تھا۔ یہ معمولی زخم میرے لئے کیا حیثیت رکھتا تھا لیکن یہ سب کچھ ایسا تھا کہ مجھ سے روگردانی نہیں کی جا رہی تھی۔ گنگا رام جی کے ساتھ باہر نکل آیا اور مزار شریف کی طرف چل پڑا۔ خوب چہل پہل تھی۔ میلہ سا لگا ہوا تھا۔ نئے نئے زائرین آ گئے تھے۔ مزار شریف کے پاس بھی خوب رونق تھی رکمنی نے احتیاط کی ہدایت کی تھی لیکن حقیقتہً مجھے نہ تو کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی زخم میں تکلیف تھی اطمینان سے مزار کے احاطے میں پہنچ گیا۔

" آپ اندر جاتے ہیں گنگا دھر جی ؟ "

" کیوں نہیں، شاہجہاں بابا کے چرن چھونے جاتے ہیں۔ "

" میں فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ "

" تو چلو تم فاتحہ پڑھ لینا۔ ہم چرن چھولیں گے۔ " جوتے اتارے اور عقیدت سے مزار شریف کے احاطے میں پہنچ گئے بہت سے لوگ موجود تھے پھول اور چادریں چڑھائی جا رہی تھیں۔ مرد عورت بچے

بھی موجود تھے میں ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا اور آنکھیں بند کر کے فاتحہ خوانی کرنے لگا کچھ دیر بعد فراغت ہوئی تو میں نے گنگا دھر کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پہلی ہی نظر نے چونکا دیا۔ کچھ فاصلے پر ثریا نظر آئی تھی۔ تنہا سوگوار دونوں ہاتھ بلند کئے دعا مانگ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سفید دھاریں امنڈی آ رہی تھیں رخسار جل تھل ہو رہے تھے۔ ایسا کرب سمٹا ہوا تھا اس کے چہرے پر کہ دیکھنے والے کا کلیجہ ہل جائے۔

میں پتھرا گیا دل جیسے بند بند ہو گیا تھا۔ بدن میں رعشہ سا آ گیا تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہیں سے اسے دیکھتا رہا عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ دل پھڑپھڑا رہا تھا خواہش ہو رہی تھی کہ آگے بڑھوں اور .... اور اس کا سارا کرب خود میں سمولوں۔ اسے ہر دکھ سے آزاد کر دوں لیکن ایک قدم آگے نہ بڑھا سکا! تبھی گنگا دھر میرے پاس آ گیا۔

"دعا پڑھ لی پوت؟"

"ایں......... " میں نے چونک کر کہا۔

"دعا پڑھ لی؟"

"ہاں!" میں نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"رکو گے یہاں، یا چلو گے۔"

"گنگا جی۔ وہ۔ وہ۔" میں نے اشارہ کیا اور گنگا دھر میرے اشارے پر اس طرف دیکھنے لگے۔ ثریا آنسو خشک کر رہی تھی پھر وہ پلٹ کر تیزی سے چل پڑی۔

"ثریا کی کہہ رہے ہو؟"

"ہاں!"

"دعا پڑھنے آئی ہو گی۔ آتی رہتی ہے کوئی منادی تھوڑی ہے اسے۔"

"آیئے چلیں۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "ثریا کون ہے گنگا جی آپ نے مجھے سب کے بارے میں بتا دیا اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ آپ کے ہاں نوکری کرتی ہے۔"

"ارے رام۔ رام۔ نا بیرا وہ تو ہمارے لئے رکمنی جیسی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"سچی بات یہ ہے بیرا کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"رکمنی کے اسپتال میں داخل تھی۔ کسی پاپی نے اس کی زبان کاٹ دی تھی۔ انگلیوں کے پور بھی کاٹ دیئے تھے۔ رکمنی کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ لاوارث ہے کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے۔ انگلیوں کے پوروں کا تو علاج ہو گیا مگر زبان ٹھیک نہ ہو سکی۔"

"گونگی ہے وہ؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"تو اور کیا تم نے اسے بولتے سنا ہے کبھی؟"

"پھر کیا ہوا۔"

"ٹھیک ہو گئی تو رکمنی اسے ساتھ لے آئی۔ اپنے گھر رکھ لیا ہم نے اسے سنسار میں اس کا کوئی نہیں ہے اور اب تو وہ گھر کی سی ہو گئی ہے۔ ہماری طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسے۔ مگر۔"

"مگر کیا؟"

"بے چین ہے۔ بے سکون ہے۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔ حالانکہ سارے چھورے اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ہنسنے کے بجائے رو پڑتی ہے کوئی گہرا گھاؤ ہے من میں ضرور کسی نہ کسی نے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو گا۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہے۔ کبھی کہیں بیٹھے بیٹھے دیواروں کو گھورتی رہتی ہے کبھی رات رات بھر نماز پڑھتی رہتی ہے۔ گھنٹوں سجدے میں پڑی رہتی ہے۔"

گنگا رام جی بتا رہے تھے اور میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں آج انکشاف ہوا تھا کہ وہ گونگی ہے کون ہے وہ کیا کہانی ہے اس کی کیا مجھے علم نہیں ہو سکتا۔ اچانک خیال آیا اور میں نے کہا۔

"ان کا نام کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"اس کے پاس ایک رومال تھا جس کے کونے پر تارکشی سے اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ اس نے اس پر انگلی رکھ کر اپنے سینے پر اشارہ کر کے بتایا تھا کہ یہ اس کا نام ہے۔" گنگا جی نے کہا اور پھر چونک کر بولے۔ "ارے یہ دھرما اور رام جی کیسے بھاگے بھاگے آ رہے ہیں۔ کوئی بات ہو گئی کیا؟" میں نے بھی ان کے اشارے پر دیکھا۔ دونوں بری طرح گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"ضرور کچھ ہو گیا۔" گنگا دھر ان کی طرف لپکے۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

دھرما اور رام جی تو گنگا دھر جی کو نہیں دیکھ سکے تھے لیکن ہم ہی ان کے قریب پہنچ گئے۔ گنگا جی قریب پہنچ کر دھاڑے۔

"ارے او بیل کے دیدے والو کہاں اونٹ کی طرح ناڑھ اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو۔" دونوں اچھل پڑے ایک ساتھ پلٹے اور پھر ایک ساتھ بولے۔ "گنگا جی وہ......... ! وہ سادھو مہاراج۔"

"جٹا دھاری......... " دھرما بولا۔

"کالا کمنڈل ہاتھ میں لئے۔" رام جی نے کہا۔

"گلے میں مالائیں اور .... " دھرما آگے بولنا چاہتا تھا کہ گنگا دھر جی غصے سے لال پیلے ہونے لگے۔ انہوں نے غرا کر کہا۔

"سرو جوتی اتاروں گا اور بیس ماروں گا سر پر......... ارے بھجن گا رہے ہو کیا تم دونوں، ایک بھی بات کیوں نہیں بتاتا۔"

"میں بتاتا ہوں گنگا جی۔" رام جی بولا۔ "ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک دم ایک سادھو مہاراج

منڈوے میں گھس آئے۔ ہم سب ہرے ہرے کرتے رہ گئے مگر انہوں نے دیوی جی سے کہا کہ وہ
کچھ بتانے آئے ہیں۔ ماتھر جی نے غصے سے کہا کہ وہ منہ اٹھائے اندر کیوں گھس آئے تو سادھو
نے گھور کر انہیں دیکھا اور اپنا کمنڈل آگے بڑھا کر بولے۔ ”اسے دیکھ بالکا۔“ اور مہاراج اچھل
جی چیخ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پتہ نہیں ماتھر کو اس میں کیا نظر آیا جبکہ کمنڈل میں کچھ نہیں تھا۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کمنڈل میں کچھ نہیں تھا۔“ گنگا دھر نے پوچھا۔

”بعد میں انہوں نے کمنڈل پھر لٹکا لیا اور وہ الٹا ہو گیا۔ کوئی چیز ہوتی تو اس سے گرتی نا۔“

”ارے تو آگے تو بولو رام جی۔ بک بک لگائے ہوئے ہو۔“

”سنت مہاراج نے دیوی جی سے کہا کہ کل صبح یہاں سے گھوڑی آگے بڑھا دیں۔ نہیں تو نقصان کی
ذمہ دار خود ہوں گی۔“

”گھوڑی آگے بڑھا دیں............؟“

”مطلب یہ تھا کہ سالم نگر سے چلے جائیں۔“

”کہاں چلے جائیں............؟“

”یہ نہیں بتایا۔“

”دھت تیرے کی۔ ارے آگے تو بولو بھگوان کے داس۔“

”بس آگے کیا بولیں۔ دھمکیاں دیں اور چلے گئے۔“

”تو پھر تم یہاں کیوں آگئے............“

”پریما دیوی بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ آپ کو تلاش کر کے فوراً واپس لا
لائیں۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ آؤ مسعود چلیں۔“ اور ہم واپس چل پڑے کچھ دیر کے بعد چھولداری
پہنچ گئے۔ پریما دیوی کا منہ اترا ہوا تھا۔

”نکل چلو جلدی۔ نہیں تو کچھ ہو جائے گا۔ تمہیں بتایا ان لوگوں نے۔“ وہ بولیں۔

”ہاں بتا دیا۔ مگر بات کیا تھی تو نے پوچھا نہیں بھاگوان۔“

”خود ہوتے تو پوچھ کر دیکھ لیتے۔“ پریما دیوی نے کہا۔

”کیوں............ کیا تیرے میکے سے آئے تھے............؟“

”نہیں سسرال سے آئے تھے۔ ورنہ ایسے نہ ہوتے۔“

”کیسے............؟“ گنگا دھر جی نے کہا۔

”آنکھیں چیپڑ بھری ہوئی۔ دانت کتے کے کیلوں جیسے پیلے۔ گنجی کھوپڑی سوکھا بدن چہرے سے بننے
لگ رہے تھے پورے۔“ پریما دیوی نے کہا اور گنگا رام جی جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر بولے
”زبان بہت لمبی ہو گئی ہے تیری۔ تھوڑی سی کاٹنی پڑے گی۔ ہیں۔“

”وہ بھی کاٹ لینا۔ مگر بستر اسمیٹو۔“

”اری چپ بیٹھ. تو باؤلی ہو گئی ہے تو کیا سب باؤلے ہو گئے ہیں۔ رکمنی بٹیا تو بتا کون تھا۔

”وہ............؟“

”عجیب تھا تاؤ۔ صورت سے واقعی شیطان نظر آتا تھا۔“

”ارے نا بٹیا نا............ ایسے نہیں کہتے حلیہ تو سادھوؤں جیسا تھا۔ ارے ہاں ماتھر بیٹا............ تو نے
اس کے کمنڈل میں کیا دیکھا تھا............؟“

”ایں............ ہاں تاؤ جی............ اس کا کمنڈل مکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پیلی پیلی بجبجاتی ہوئی
مکڑیاں۔ رام رام............“ ماتھر نے کراہیت سے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔ مگر میں چونک پڑا۔

”مکڑیاں............؟“

”ہاں مسعود بھیا۔ ابھی تک من الٹ رہا ہے۔“ ماتھر سینہ ملتا ہوا بولا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔ مگر تم لوگوں سے بھولے سے بھی عقل کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ارے جب ہمیں
بلایا تھا تو انہیں روک لیتے کسی طرح بہلا پھسلا کر ہم بھی ملتے ان سے پوچھتے کہ مہاراج یہاں سے جانے کو
کیوں کہہ رہے ہو۔ کوئی بھول ہوئی ہے ہم سے، کوئی کشٹ پڑنے والا ہے ہم پر............ آخر تمہاری اس
چتاؤنی کا کارن کیا ہے۔ مگر تم لوگوں کو اتنی عقل ہو تب نا۔“

”عقل تو سب تمہارے حصے میں آگئی۔ ہم میں کہاں سے ہوگی۔ ارے وہ تو خود ہوا کے گھوڑے پر
سوار تھے۔ یوں آئے اور یوں چلے گئے۔ چلو یہاں سے ورنہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ پریما دیوی
بولیں۔

”یوں آئے............ یوں چلے گئے۔ اور اب ہم چلیں یہاں سے۔ عرس ختم ہونے سے پہلے کوئی
نہیں جائے گا۔ سادھو سنتوں کی سیوا کرنی چاہئے۔ مگر تو نے سوچا ہو گا خرچہ ہو گا۔“
گنگا جی نے منہ بگاڑ کر کہا۔ پھر خاموش ہو کر ثریا کو دیکھنے لگے جو جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔

”دیکھو، میں کہتی ہوں چلنا اچھا ہو گا۔ کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔“

”تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دوبارہ ملیں گے وہ مہاراج تو ان سے پوچھ لیں گے۔“
وہ باتیں کر رہے تھے مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ مکڑیاں، پیلی پیلی مکڑیاں، بھوریا چرن کا نشان تھیں
اور جو حلیہ بتایا گیا تھا وہ بھی اس کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا لیکن وہ ناپاک جادوگر یہاں............ اور
.... پھر اس کا اس جگہ آنا۔ یقیناً وہ میری یہاں موجودگی سے واقف ہو گا۔ کیا اس نے میری وجہ سے
ان لوگوں کو یہاں سے جانے کو کہا ہے۔ پریما دیوی اور گنگا دھر جی حسب عادت لڑ رہے تھے۔ رکمنی نے
کہا۔

”حد ہے تاؤ جی............ آپ لوگوں میں تو جنم جنم کا بیر ہے۔ بس کوئی بات مل جائے لڑنے
کیلئے۔“

”ہاں سارا دوش میرا ہوتا ہے۔ اس ساوتری کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اری ثریا تو چائے کا پانی چڑھا جا کر
.... اس عورت نے تو بھیجہ پگھلا کر رکھ دیا ہے۔“

"ہم واپس چلیں گے بس..........!" پریما دیوی نے کہا۔

"اکیلی چلی جاؤ.......... ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ کہہ دیا ہم نے۔" گنگا دھر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اکیلی ہی چلی جاؤں۔"

"سیدھی میکے جانا۔ میرے گھر میں وہ رہے گا جو میری مرضی پر چلتا ہو۔" بات آگے بڑھنے لگی تو ماتھر گنگا دھر کو چھولداری سے باہر لے گیا۔ رکمنی نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پسند آئے ہمارے تاؤ اور تائی۔ ساری باتیں کرلیں گے مگر ایک دوسرے کے بنا پل بھر نہیں رہ سکیں گے۔ ارے آپ ہی ہنس دیں۔ رت بدل جائے گی۔"

"بات سوچنے کی ہے رکمنی جی..........!" میں نے کہا۔

"ہاں ہے تو.......... خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔"

"میرے خیال میں گنگا رام جی کو مان لینا چاہئے۔ کوئی بات بلاوجہ نہیں ہوتی آخر اس سادھو کے آنے کا کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔ مگر.......... دیکھ لیا تم لوگوں نے۔ کیا سلوک ہوتا ہے میرے ساتھ۔" پریما دیوی بسورتے ہوئے بولیں۔

"آپ چنتا نہ کریں ہم تاؤ جی کو سمجھائیں گے۔"

"ارے جسے بھگوان نہ سمجھا سکا اسے کون سمجھائے گا۔"

پریما دیوی نے بدستور بسورتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں ثریا چائے لے کر آگئی۔ میری نگاہیں بے اختیار اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ میرے سامنے ٹرے لے کر آگئی جس میں تین پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ کپکپا سی گئی جس کا احساس پیالوں سے چائے چھلکنے سے ہوا تھا۔ میں نے اپنا پیالہ اٹھالیا۔ ثریا نے پریما دیوی اور رکمنی کو چائے دی اور کسی قدر لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"میں باہر جاؤں رکمنی جی..........؟"

"ہاں ضرور.......... میں بھی آرہی ہوں۔" رکمنی نے کہا اور میں پیالہ سنبھالے ہوئے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر ماتھر، دھرما اور رام جی گنگا دھر جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گنگا دھر پرجوش لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"چلے جاتے مگر ہم بھی ہٹ کے پکے ہیں۔ اب تو عرس کے ختم ہونے کے بعد ہی جائیں گے۔"

"عرس بھی ختم ہونیوالا ہے گنگاجی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ رے بھائی۔ تو آیا ہے اندر سے۔ کان بھرے ہوں گے تیرے گنگاجی اگر ضدی نہ ہوتے تو آج نہ جانے کیا ہوتے۔ اب تو عرس ختم ہونے کے بعد ہی جائیں گے۔ کوئی بھیج کے تو دیکھ لے ہمیں۔"

گنگارام کا کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ پریما دیوی نے بھی ساری کوششیں کر دیکھیں گنگا دھر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ سب ہار گئے۔ رات ہو گئی۔ کھانا وغیرہ کھایا گیا۔ ماتھر اور رکمنی خوب شرارتیں کرتے تھے۔ وہ شرارتیں کرتے پریما دیوی کو گنگا دھر سے لڑاتے رہے میں بھی ہنس رہا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے باتیں ہوئیں مکڑیوں والے سادھو کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے لیکن میرے ذہن میں کچھ اور ہی خیال تھا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ سادھو بھوریا چرن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کم بخت نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ہوسکتا ہے مجھ پر حملہ بھی اسی کی سازش ہو۔ اب وہ میری موت کے سوا اور کیا چاہتا تھا۔

وہ لوگ اپنے طور پر باتیں کرتے رہے اور میں بھوریا کے بارے میں سوچتا رہا اور سب سونے لیٹ گئے میں الجھا ہوا تھا۔ کسی قدر بے چین تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اٹھا اور چھولداری سے باہر نکل آیا۔ دھرما اور رام جی باہر گہری نیند سو رہے تھے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مزار شریف پر قوالیاں ہو رہی تھیں۔ قوالوں کی آواز ہوا کے دوش پر آرہی تھی اور سو جانے کو جی نہ چاہا فاصلہ کافی تھا۔ پھر بھی کافی دور نکل آیا اور بے مقصد گھومتا رہا۔ بھوریا چرن اگر یہاں موجود ہے تو میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ جانے ان لوگوں کو یہاں سے بھگانے کا کیا مقصد ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ میں ہی ہوں۔ مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹہ بے مقصد گھومتا رہا۔ پھر واپس چل پڑا۔ چھولداری سے کچھ فاصلے پر کسی سائے کو متحرک دیکھا اور ایک دم ساکت ہو گیا۔ کون ہے؟ میں نے گھاس پر نگاہیں جمادیں اور اسے پہچان لیا۔ ثریا تھی۔ نماز پڑھ رہی تھی۔ یہ آخر کون ہے کس کے ظلم کا شکار ہو گئی ہے۔ قدم خود بخود آگے بڑھ گئے اور اس سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ دو زانو بیٹھ گئی۔ دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ اور دیر تک اسی عالم میں رہی پھر میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔ میرا دل پھلنے لگا۔ اس کا درد سینے میں محسوس ہو رہا تھا۔ دل بری طرح اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھائے سسکتی رہی۔ میں بے اختیار ہو کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے جب میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ ایک دم سہم کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں وحشت تھی۔

"نہیں ثریا۔ ڈرو نہیں۔ میں مسعود ہوں۔"

اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ "میں تمہارے سبب بے حد افسردہ ہوں ثریا۔ کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔ ہیں ثریا ہیں۔ میں نے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کیا دکھ ہے۔ ثریا میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے تمام دکھ سمیٹ لوں۔ میں نے تمہیں مزار پر بھی دیکھا تھا۔ تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم مجھے۔ نہ جانے وہ کون ظالم تھے جنہوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا۔ کاش مجھے ان کے بارے میں معلوم ہو۔"

...سے میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں میں اس

کے بالکل قریب آگیا۔ ”مجھے بتاؤ ثریا کیا کروں میں تمہارے لئے۔“ وہ روتی آنکھوں سے مجھے تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ جھکا۔ اس نے میرے سینے سے ٹکادی۔ دل پھٹنے لگا۔ ایک دم خواہش پیدا ہوئی کہ اسے سینے میں چھپالوں، تھا میں اس کا۔ پہلی بار براہ راست مخاطب ہوا تھا۔ مگر اس طرح میرے سینے سے سر لگانے اپنائیت تھی۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے۔ مگر میرے ہاتھ نہ اٹھ سکے۔ وہ اپنی آنکھیں میرے سے رگڑتی رہی پھر ایک دم چونکی گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”ثریا .... تم لکھنا پڑھنا جانتی ہو۔“ اس نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔ ” لکھ کر کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ ”کیوں ....؟“ نے پوچھا .... اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے کر دیئے۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری انگلیاں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ کیا اس لئے کہ تم کسی کو لکھ کر سکو۔“ اس نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔ ”مگر اب تو تمہاری انگلیاں ٹھیک ہیں۔ اب تو تم ہو۔“ وہ مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگی۔ ”کیوں .... پر ظلم کرنے والوں سے ڈرتی ہو؟“ اس نے گردن جھکالی۔

”انہیں جانتی ہو تم ....؟“ میں نے پوچھا۔ اور اس نے انکار کر دیا۔ ”اوہ .... آہستہ سے بولا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ”تمہیں ایک کام کرنا ہوگا ثریا۔ کل میں لکھنے کا سامان فراہم کروں گا۔ تم پر جو بیتی ہے وہ لکھ کر مجھے بتادینا۔ ثریا مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ ثریا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے دکھ دور کر کے رہوں گا۔“ چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اسے آنکھوں سے لگایا تیزی سے مڑ کر چھولداری میں چلی گئی۔

میرے ہاتھ کی پشت میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جلن جیسے میرے ہاتھ سے تھی۔ میں اپنا ہاتھ پکڑ کر مسلنے لگا۔ ایک انوکھی لذت پوشیدہ تھی اس جلن میں۔ دنیا سے بے خبر ہو پتھرا گیا تھا۔ دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوگئی تھی ایک بالکل اجنبی احساس جاگا تھا سینے سے پہلے کبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ کون ہے۔ نہ جانے کون ہے۔ خاموش تھی۔ ساکن تھی۔ طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ کیا ان چند دنوں میں اس کے سینے میں کوئی جذبہ جاگا کونسا جذبہ تھا وہ۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگایا تھا۔ کیا مجھے اس کے بارے میں پتہ چل کیا اس کے بارے میں میری رہنمائی ہوسکتی ہے۔ خیال ہی نہیں آیا تھا اس کا یہ خیال بھی نہیں خود پر حملہ کرانے والے کے بارے میں کلام الٰہی سے راہنمائی حاصل کروں کوئی حرج تو نہیں میں۔ خود سے سوال کیا۔ اور پھر آنکھوں میں اس کا چہرہ ابھر آیا۔ نہ جانے کتنی دیر اس کے بارے سوچتا رہا دل مچل رہا تھا اس کیلئے۔ آرزو کر رہا تھا کہ وہ دوبارہ باہر آجائے۔ اسے زبان مل جائے باتیں کرے۔ آہ شاید اس بار کوئی اور ہی جذبہ جاگا تھا سینے میں۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کبھی

میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ ہاں ایسا ہوگیا تھا۔ ایک انوکھی بے کلی طاری ہوگئی۔ ایک ... کیا۔ وہاں بیٹھ گیا۔ درود شریف کا ورد کیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل سے آواز ابھری۔ ... نہیں ہے۔ نافرمانی کے راستے اپنا رہا ہے۔ کیا تجھے اجازت ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات ... اپنے لئے کچھ کرے۔ اگر کسی کیلئے تیرے دل میں آگ ابھرے تو وہ تیرے ماں باپ بہن ... ہوں کہ .... وہ اول ہیں۔ ان سے گریز کر کے اپنی خواہشوں کی طرف لپک رہا ہے۔ پھر بھٹک ... ہے۔

... بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آنکھیں خوف سے کھل گئیں۔ دل اچھل رہا تھا۔ خود کو سنبھالے سنبھال پا رہا تھا۔ اچانک کانوں میں ایک چیخ ابھری۔

”آگ۔“ دماغ بھک سے اڑ گیا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ پھر فوراً ہی نتھنوں سے کپڑا جلنے کی بو ... اور چھولداری سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ”آگ لگ گئی۔ آگ ارے اٹھو۔ دھرما۔ رام ... ماتھر۔ ارے اٹھو۔ آگ۔ آگ۔“ آواز پریما دیوی کی تھی۔ !

اعصاب پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ ایک طرف دل میں ابھرنے والی آواز، دوسری طرف پریما دیوی کی ... عجیب اعصاب شکن ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ اندر مدھم لیمپ ہمیشہ جلتا رہتا تھا اس وقت بھی روشنی ... دھرما اور رام جی بدحواس ہوکر اندر بھاگے۔ میں بھی خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال کر اندر داخل ... گیا۔ عجیب منظر تھا۔ آگ کا ایک شعلہ بھی نہیں تھا لیکن آگ لگی ہوئی تھی بالکل ایسے جیسے جلی ہوئی ... کی تیلی سلگتی ہے۔ یہ آگ ہر طرف تھی۔ گدے جل رہے تھے۔ سوٹ کیس پگھل رہے تھے۔ ... پھیل رہی تھی لیکن شعلہ نہ تھا۔ سب دہشت سے آنکھیں پھاڑے یہ آگ دیکھ رہے تھے۔ اور کسی ... سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

”بجھاؤ۔ ارے بجھاؤ۔ ہائے سب جل گیا۔ ارے سب جل گیا۔“ پریما دیوی چیخیں۔

”تو نے آواز بند نہ کی تو تیری منڈیا پکڑ کر اسی سوٹ کیس پر رکھ دوں گا۔ آس پاس کے لوگوں کو جمع ... کرے گی کیا۔“

”ارے کرلو ظلم، جتنا من چاہے کرلو۔ ہائے سب جل گیا۔ ارے آگ تو بجھا دو۔ سب کھڑے ... دیکھ رہے ہو۔“

... جیسے ہوش آگیا۔ رام جی، ماتھر اور دھرما پانی لینے دوڑے اور پھر ہر چیز پر پانی انڈیل دیا گیا۔ ... بجھ گئی۔ مگر سچ مچ سب تباہ ہوگیا تھا۔ گدے جل گئے سوٹ کیسوں میں رکھے کپڑے جل گئے۔ ... چھولداری بچ گئی تھی۔ پریما دیوی رونے لگیں۔

”دیکھا نتیجہ ضد کا۔ دیکھ لیا۔ نہ جاؤ۔ جمے رہو یہاں جل مرو سب کے سب۔ بھسم ہو جاؤ میرا کیا ... ارے ایسی آگ دیکھی نہ سنی۔ دیکھو یہ دیکھو ہر چیز جل گئی۔ ارے اب بھی سوچو گے کیا۔ اب ... پہنچو گے۔ ارے رام جی۔ دھرم ارے۔ ارے چل بھیا۔ میکے میں پہنچا دے مجھے۔ ارے آگے ... نہ پیچھے لگا۔ اکیلی میں جی لوں گی۔ ہائے سب جل گیا۔ میری ساڑھیاں بچوں کے کپڑے اور ضد

کرو۔ ‘‘

’’رام رام رام۔ بھیا عورت ہے کہ بھونپو، رکے بغیر بولے جارہی ہے۔ کیا دشمنی ہے سادھو مہاراج سے ہماری۔ ارے کوئی کارن تو بتائے ایسے ہی چل پڑیں۔ ‘‘ گنگا جی بولے۔

’’گیانی مہاراج۔ اے گیانی مہاراج۔ تم پوچھتے رہو دشمنی دوستی۔ چلو رے بچہ۔ چلو رے مروادیں گے۔ ‘‘

’’تو کترنی کو لگام دے گی کہ نہیں۔ تم بھی تو کچھ بولو رے مگر یہ بولنے دے تب نا۔ ‘‘

’’چلنا چاہئے تاؤ جی۔ ایسی آگ دیکھی نا سنی۔ ‘‘

’’ٹھیک ہے رہے مہان آتما۔ ٹھیک ہے صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ بس سورج نکل آنے دو‘‘ گنگا دھر نے ہاتھ جوڑ کر سر سے اوپر کرتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے ثریا کو دیکھ رہا تھا۔ خاموش تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ رو رہا تھا اس کیلئے۔ تڑپ رہا تھا سسک رہا تھا۔ کیا ہو گیا مجھے۔ کیا ہو گیا ہے۔ سب کچھ چھنا جارہا ہے سرکشی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سب کچھ فراموش تھا۔ سب کچھ بھول جانا تھا۔ آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔

گنگا دھر جی باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ گنگا دھر نہ جانے کیا بڑبڑا رہے تھے دیکھ کر بولے۔ ’’تو ہمارے ساتھ چلے گا پوت۔ ‘‘

’’میں؟ ‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تو کہاں جائے گا تجھے کیا چنتا۔ ‘‘

’’ہاں میں یہاں رکوں گا۔ ‘‘

’’اچھے بھگائے جارہے ہیں ہم۔ ارے کیا بگاڑ رہے تھے کسی کا۔ جانا تو تھا آرام سے جاتے۔ ٹھیک ہے جو بابا کی مرضی۔ ‘‘ اندر اٹھا پٹخ ہو رہی تھی۔ ویسے میں دیکھ چکا تھا سارا سامان جل چکا تھا۔ چاروں کو یہ نقصان میری وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔ ’’تم خورجے آؤ گے مسعود۔ آؤ تو ہمارے پاس آنا۔ ‘‘

گنگا دھر نے نہ جانے کیا کیا کہا۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ بس سوچ رہا تھا کہ یہاں رکنے سے فائدہ۔ جانا ہے تو انتظار کیسا ابھی چلا جائے۔ بیکار ہے رکنا۔ کچھ نہیں ہے۔ یہ دنیا میرے لئے ہے۔ سب کچھ چھن گیا ہے مجھ سے۔ سب کچھ چھن گیا ہے۔ بیکار ہے سب بیکار ہے وہیں سے آگے بڑھ گیا۔ گنگا دھر سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اس طرح چل پڑوں گا۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہیں آس پاس جارہا ہوں۔ واپس جاؤں گا۔ مگر میں چلتا رہا۔ بہت دور نکل آیا۔ اتنا دور کہ کوئی تلاش نہ کرسکے۔ مزار کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ ایک گوشے میں پناہ لی۔ یہاں بھی ڈیرے جمے ہوئے تھے۔ خلقت ہر جگہ موجود تھی۔ ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ رونے کو جی چاہ رہا تھا بلک بلک کر روتا گیا۔ ثریا یاد آرہی تھی۔ سینے پر اس کے سر کا لمس، ہاتھ پر اس کی آنکھوں کا لمس زندہ تھا۔ بے کلی ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اٹھا آنسوؤں سے وضو کرچکا تھا۔ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اور پھر

نماز پڑھتا گیا۔ سورج نکل آیا۔ دھوپ نکل آئی۔ دوپہر ہو گئی۔ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر کسی نے شانہ ہلایا۔

’’میاں صاحب یہ لے لیجئے۔ ‘‘ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بینائی ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔ دھندلا نظر آرہا تھا۔ چند خاکے سامنے کھڑے تھے۔

’’کیا ہے؟ ‘‘ بمشکل کہا۔

’’دال دلیا ہے میاں صاحب۔ ‘‘

’’شکریہ بھائی۔ حاجت نہیں ہے۔ ‘‘

’’لے لو میاں صاحب۔ غریب کا دل نہ توڑو۔ قسم اللہ کی۔ ‘‘

’’بھائی بہت شکریہ۔ ضرورت نہیں ہے۔ ‘‘

’’نہیں میاں صاحب۔ رات سے اسی طرح بیٹھے ہو۔ ہلے بھی نہیں ہو اپنی جگہ سے۔ انتڑیاں اینٹھ گئی ہوں گی ایمان کی قسم۔ ‘‘

’’ایں۔ ‘‘ میں نے چونک کر کہا۔

’’ہاں رات کو قوالیوں سے لوٹا تو دیکھا تھا تمہیں۔ تین بار آنکھ کھلی تو ایسے ہی دیکھا۔ صبح سے ایسے ہی بیٹھے ہو۔ لو میاں صاحب لے لو۔ ہم بھی مسلمان بھائی ہیں۔ ‘‘

’’جی ضرورت نہیں ہے۔ ‘‘

’’لے لو میاں صاحب۔ تمہیں بابا شاہجہاں کا واسطہ۔ اماں اتنی خوشامد کر رہے ہیں مان لو۔ ہماری بھی خوشی ہو جائے گی۔ ‘‘

دل ڈوبا ڈوبا تھا۔ پیٹ بے شک خالی تھا لیکن کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن وہ شخص اس طرح اصرار کر رہا تھا کہ مجبور ہو گیا۔ کیا لایا تھا وہ جانتا ہو گا جو دیا کھانے لگا اور کچھ دیر کے بعد شکم سیر ہو گیا۔ اس نے پانی بھی پلایا تھا۔

’’ہمارے حق میں دعائے خیر کرنا میاں صاحب اٹھارہ سال ہو گئے تھے بیاہ کو اولاد نہیں ہوئی تھی بابا جی کے مزار پر منت مانی بیٹا مل گیا اللہ کے فضل سے۔ منت پوری کرنے آئے تھے۔ لونڈے کا نام فضل دین رکھا ہے۔ ہمارا نام کمال الدین پہلوان ہے۔ خورجے کے رہنے والے ہیں۔ نام ہے اپنا۔ ہماری خورجے کے اسٹیشن پر اتر کر کمالے پہلوان کا اکھاڑہ پوچھ لو سیدھے پہنچ جاؤ گے اور کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ ‘‘

’’نہیں بھائی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ ‘‘

’’دعا ضرور کرنا۔ بس چلتے ہیں۔ ‘‘ وہ سلام کر کے واپس مڑ گیا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔ ’’اماں پہنچا ہوا ہے تو کیا۔ دیکھتے نہیں کتنے عبادت گزار ہیں۔ پہنچے ہوئے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ‘‘ اس کی آواز دور ہو گئی۔ پیٹ بھرا تو آنکھوں میں کچھ روشنی جاگی۔ دل کو سنبھالنے لگا کیا ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے اتنا بے تاب کیوں ہو گیا۔ اس دشت ویراں میں کسی کا بسیرا نہیں ہونا چاہئے جو کیا گیا درست ہی تو ہے ماں باپ،

بہن بھائی کیلئے تو دل کو سمجھالیا مگر ایک صورت آنکھوں میں بسی تو اتنا بے بس ہوگیا اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ ثریا کیلئے دل میں صرف ہمدردی نہیں تھی۔ جس طرح بے اختیار ہوگیا تھا اس سے کچھ اور ہی احساس ہو رہا تھا۔

کراہتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور مزار شریف کی طرف چل پڑا۔ بابا صاحب کے قدموں میں ہی سکون مل سکتا تھا۔ چلتا رہا سوچتا رہا۔ گنگا دھر نے سوچا ہوگا کہ خود غرض اور ناسپاس ہوں، بے مروت ہوں۔ ملے بغیر خاموشی سے چلا آیا۔ مگر ان سے رخصت ہونے کے لمحات شاید کچھ اور زخم لگا دیتے نہ جانے کس طرح بے اختیار ہو جاتا۔ کچھ اور گناہ ہو جاتے۔ اور .... اور نہ جانے ثریا نے کیا سوچا ہوگا۔ رفتار تیز کر دی۔ جلد از جلد باباجی کے قدموں میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پہنچ گیا بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دہائی دینے لگا۔ سکون مانگ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ قرار آنے لگا۔ زائرین جوق در جوق آرہے تھے۔ رات ہوگئی۔ خوب رات ہوگئی۔ قوالی جم گئی۔ لوگ مزار سے ہٹ گئے۔ ہارمونیم اور ڈھولک کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ قوالوں کے سر سنائی دینے لگے۔ کیا گا رہے تھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ٹوٹا ٹوٹا تھا خود پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ سب کچھ پانے کے بعد سب کچھ کھونے کا خوف دل میں بیدار ہوگیا تھا۔ تھک گیا تو اٹھ گیا۔ ایک پرسکون گوشہ تلاش کیا۔ لیٹ گیا۔ نیم غشی سی طاری تھی۔ سو جانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح کو جاگا۔ حالت کسی قدر بہتر ہوگئی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو چار روپے موجود تھے۔ بڑا کھرا حساب کتاب تھا جن دنوں گنگا دھر جی کے ذمے کھا رہا تھا۔ وظیفہ نہیں ملا تھا مگر آج چار روپے موجود تھے۔ ایکدم دل میں خوشی جاگ اٹھی۔ وظیفہ ملا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ناخوشی نہیں ہے۔ قابل معافی ہوں بروقت سنبھل گیا ہوں۔ حکم ماننے والوں میں تصور کیا گیا ہوں۔

"باباجی ناشتہ کرو گے"

"نہیں بھائی فقیر نہیں ہوں۔" جواب دیا اپنی جگہ سے اٹھا چائے ڈبل روٹی خریدی، ناشتہ کیا کل بارہ آنے خرچ ہوئے تھے۔ دن آسانی سے گزرے گا کوئی اور حکم نہیں ملا تھا۔ جب تک دوسرا حکم نہ ملے یہیں رہنا ہے کوئی کام نہیں سونپا گیا تھا۔ رہنمائی ضرور ہوگی یقین تھا۔ دن گزرا، کوئی شام کے پانچ بجے ہوں گے آس پاس لوگ موجود تھے۔ سب اپنے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے تھے۔ اچانک عقب میں ایک سایہ سا محسوس ہوا پلٹ بھی نہیں پایا تھا کہ ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ ایک آواز سنائی دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دوسرا دھماکہ ہوا۔ کوئی شے دوسری بار ذہن پر لگی تھی۔ ایکدم شور مچا کچھ لوگ دوڑے۔ میں بادل ناخواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ نوجوان آدمی تھا۔ ہاتھ میں چری ہوئی لکڑی کا بڑا سا کندہ تھا آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے تیسری بار اس کے کندے سے میرے سر کا نشانہ بنایا۔ اس سے پہلے بھی شاید اس نے دوبار مجھ پر اس لکڑی سے بھرپور وار کیا تھا مگر اللہ کو بچانا مقصود تھا دونوں وار خالی گئے تھے۔ تیسرا وار ان لوگوں نے روک لیا جو میری مدد کو پہنچے تھے۔ ایک آواز ابھری۔

"ابے پیچھے سے وار کرتا ہے بزدل کی اولاد یہ لکڑی پھینک دے بھوتنی والے نہیں تو قینچی لگا کر رکھ دوں گا۔

گے۔ زندگی بھر گردن سیدھی نہیں کر سکے گا۔ ابے کمالے پہلوان کی قینچی ہے۔ ایرے غیرے کی نہیں۔" آواز بھی پہچان لی تھی، صورت بھی۔ کمال الدین پہلوان خورجے والے تھے۔ مجھے کھانا کھلا چکے تھے مگر یہ نوجوان کون ہے۔ میں نے کمال الدین پہلوان کے شکنجے میں پھنسے نوجوان کو دیکھا انہوں نے دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گردن پر ہاتھ جما رکھے تھے اور نوجوان بے بس ہوگیا تھا۔ مگر یہ شکل یہ صورت جانی پہچانی تھی۔ اسے بھی کہیں دیکھا تھا، کہاں، کہاں، کہاں؟۔

"ابے گدّا ابھی تک نہیں گرایا، کام کر ہی دیں تیرا کیا۔" کمالے پہلوان نے کہا۔ پھر برابر کھڑے ہوئے شخص سے بولا۔ "اماں چمن بھائی گدّا لے لو اس کے ہاتھ سے ورنہ میرے کو غصہ آرہا ہے۔" دوسرے آدمی نے نوجوان کے ہاتھ سے لکڑی چھین لی اور کمالے پہلوان نے نوجوان کو جھٹکا دے کر چھوڑ دیا وہ اوندھے منہ گرا تھا اور اس کے بعد سیدھا نہیں ہوا تھا۔ "جان ہوتی نہیں سسروں میں اور خون خرابہ کرنے نکل پڑتے ہیں۔" پھر کمالے پہلوان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میاں صاحب تم سے کیا دشمنی ہوگئی اس کی۔ تم تو بڑے اللہ والے ہو؟"

"اللہ جانے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اماں دیکھو چمن میاں، کیا ہوگیا اسے۔ منکا تو نہیں ٹوٹ گیا کہیں۔" پہلوان نے کہا اور لکڑی چھیننے والے صاحب آگے بڑھ کر اوندھے پڑے ہوئے نوجوان کو سیدھا کرنے لگے مگر بجلی سی چمک گئی۔ نوجوان سیدھا ہوتے ہی اچھلا اور اٹھ کر بری طرح بھاگا۔

"پکڑیو۔" چمن میاں چیخے، مگر میں نے ان کا راستہ روک لیا۔

"جانے دیجئے۔ بھاگ گیا بھاگ جانے دیجئے۔"

"ہاں چھوڑ دو چمن میاں۔ مگر جھگڑا کیا تھا میاں صاحب۔؟"

"عرض کیا نا اللہ ہی جانتا ہے۔"

"تمہیں نہیں معلوم۔؟"

"نہیں۔"

"عجیب بات ہے حالانکہ لکڑی اس نے ایسی تاک کر ماری تھی کہ اگر پڑ جاتی کہیں تو کتر گئے تھے قسم خدا کی۔ کمال ہے لوگ اللہ والوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔"

جمع ہونے والے منتشر ہوگئے۔ مگر میرا ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ رات یاد آئی جب مجھ پر خنجر سے حملہ ہوا تھا۔ کیا اس رات بھی حملہ آور یہی نوجوان تھا۔ وہ حملہ بھی جان لیوا تھا۔ اگر گنگا دھر جی شور نہ مچاتے تو سوتے میں دوسرا وار ضرور کارگر ہو جاتا۔ اور اس وقت بھی اس نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کیوں آخر کیوں ....؟ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ خون تھا۔ جیسے وہ مجھے ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتا ہو۔ اور اس کا چہرہ، وہ چہرہ دیکھا دیکھا کیوں لگ رہا تھا۔ کہاں دیکھا تھا میں نے اسے ....؟ کچھ یاد نہیں آیا۔ ہوگا۔ کیا کہا جا سکتا ہے ....؟ ذہن اس طرف سے ہٹا لیا۔ خود بھی وہاں سے ہٹ گیا۔

رات ہوگئی، حملہ آور بھاگ گیا تھا۔ وہ پھر کوشش کرے گا۔ زندگی ہوئی تو پھر اللہ بچنے کے اسباب پیدا کر دے گا اور اگر موت اسی طرح کسی کے ہاتھوں لکھی ہے تو کیا بری ہے، البتہ کھاپی کر لیتا تو... متضاد خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ ثریا دل میں کسکی، پھر اس نوجوان کا چہرہ آنکھوں میں اٹک گیا۔ اچانک کچھ مناظر اجاگر ہوئے یہ کونسی جگہ ہے۔ غالباً کالی کنڈ تھا۔ مہاوتی کا کالی کنڈ.........! مہاوتی ہاتھ میں خنجر لئے آگے بڑھ رہی تھی اور کالی کے مجسمے کے قریب کوئی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا پھر بھوریا چرن نظر آیا۔

"لنگڑی پورنی .... سسری کچونڈی ہے نری .... اے چھورا .... ہوش ٹھکانے آئے تیرے۔ اٹھ کھڑا ہو......... یہ اماوس کی رات پیدا ہوا ہے اور پائل ہے .... میرے پاس سے بھاگا ہوا ہے یہ .... اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں آگئے۔"

دماغ کو اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ پورا بدن ہل گیا۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل سینہ توڑ کر باہر نکلنے کیلئے بے تاب تھا۔ پہچان لیا تھا میں نے اسے۔ اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہی نوجوان تھا جسے میں نے کالی کنڈ میں مہاوتی کا قیدی دیکھا تھا اور بھوریا چرن اسے وہاں سے لے گیا تھا۔

"کمنڈل میں مکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ پیلی پیلی بے شمار مکڑیاں۔" ماتھر نے یہی کہا تھا۔ وہ بھوریا چرن ہی تھا۔ وہ یہاں موجود ہے .... سب کچھ سمجھ میں آگیا سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ میں نے اٹھ کر پاگلوں کی طرح دوڑنا شروع کر دیا رخ مزار کی طرف تھا پیروں میں کسی طاقتور گھوڑے جیسی قوت آگئی تھی اور میں قلانچیں بھر رہا تھا۔ مزار پر قوالیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ قوالوں کے گرد جمع تھے میں مزار مبارک کے پاس جا پہنچا۔ بے چین نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا۔ سب قوالیوں میں مگن تھے۔ میں نے ایک ایسے ستون کی آڑ میں جگہ بنالی جہاں سے مزار پر نظر رکھی جاسکے۔ مزار شریف کے عقب میں طاق بنے ہوئے تھے۔ میری نگاہوں نے ان طاقوں کا طواف کیا۔ تمام طاق خالی تھے۔ دل میں بہت کچھ تھا یہاں آکر سکون ہوا تھا۔ وقت سے پہلے آگیا تھا۔ یقیناً وقت سے پہلے آگیا تھا۔ سب کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ بہت کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ سانسیں درست کرتا رہا۔ رات گزر گئی صبح ہوگئی۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ ایک لمحہ نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ انتظار کروں گا خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے۔ شام ہوگئی۔ بھوکا پیاسا تھا مگر فکر نہیں تھی عادت تھی، کوئی پریشانی نہیں تھی بس نگرانی کر رہا تھا۔ وقت آگیا۔ میرا خیال درست نکلا۔

مغرب کا وقت تھا۔ نمازیوں نے کچھ فاصلے پر صفیں بنالی تھیں۔ ایک شخص اذان کہہ رہا تھا۔ میں نے اس جگہ نماز ادا کی اور پھر آخری رکعت کے بعد سلام پھیرا ہی تھا کہ میں نے اسے آتے ہوئے دیکھا۔ سفید رنگ کی ملگجی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ شبہے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اکثر ایسے لوگ مزار پر آتے تھے۔ لیکن میرے دل نے کہا کہ انتظار ختم ہوگیا ہے عمل کا وقت آگیا ہے۔ اس کا پورا جسم چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بھی چادر کے اندر تھے۔ مزار مقدس کے عقب میں پہنچ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کسی بھوکے عقاب کی مانند

اور پھر جونہی اس نے اپنا ایک ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ میرے حلق سے ایک غضب ناک چیخ نکل گئی اور میں برق کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ پہچان لیا اور پھر ایک سمت چھلانگ لگادی۔ اپنا عمل مکمل نہیں کر سکا تھا۔ سامنے کی سمت بھاگنے کے بجائے وہ مزار کے عقبی حصے کی طرف دوڑا تھا۔ ایک پتلی سی جگہ مزار کے عقب میں جانے کیلئے بنی ہوئی تھی۔ پیچھے ایک چھوٹا سا احاطہ تھا چونکہ مزار ایک بلند ٹیلے پر بنا ہوا تھا، اس لئے احاطے کے بعد ڈھلان پھیلے ہوئے تھے۔ اس سمت بلندی تک آنے کیلئے سیڑھیاں نہیں بنائی گئی تھیں تاکہ لوگ اس طرف سے نہ آسکیں۔ احاطے میں کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا۔ پھر اچھل کر احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا۔ پلک جھپکتے وہ دوسری طرف ڈھلان میں کود گیا۔ میں جس جگہ تک پہنچا تھا۔ وہیں سے احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے میں نے اسے ڈھلان میں لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ بدحواسی کے عالم میں نیچے کودتے ہوئے وہ اپنا توازن نہیں قائم رکھ سکا تھا اور بری طرح گرا تھا۔ لیکن میں نے اس کی طرح بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مناسب جگہ دیکھ کر نیچے کودا اور تیزی سے اس کے عقب میں اترنے لگا۔ دوسرے لوگوں کو اس بھاگ دوڑ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں قدم جما کر نیچے اترتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ دامن میں پہنچ گیا۔ وہ جس طرح گرا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ بری طرح زخمی ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ ٹیلے کے دامن میں پہنچ کر وہ ساکت ہوگیا مگر میں نے اس پر توجہ دینے کے بجائے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور اس سے کچھ فاصلے پر وہی منحوس گڈا پڑا ہوا تھا۔ وہی گڈا جو میری تباہی کا باعث بنا تھا۔ بھوریا چرن کا وہ ناپاک پتلا جسے وہ مزار مقدس پر پہنچانا چاہتا تھا۔ ناقابل شکست سفلی قوتوں کے حصول کیلئے۔ خدا کا احسان تھا کہ اسے ایک بار پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے شدت غضب سے دانت بھینچ کر اس پتلے کی طرف دیکھا میں اس کے ناپاک وجود کو فنا کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ میرے ارادے سے واقف ہوگیا۔ دوسرے لمحے اس ننھے سے پتلے نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگادی۔ وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا مگر میں بھی کسی گھوڑے کی رفتار سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور نشانہ لے کر اس پر دے مارا نشانہ ٹھیک لگا اور وہ اچھل کر گرا۔

لیکن نیچے گرتے ہی وہ بری طرح لوٹنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ اس کے شدید چوٹ لگی ہے لیکن لوٹتے ہوئے اس کا جسم گھٹنے لگا اور چشم زدن میں اس نے پیلے رنگ کی ایک بدشکل مکڑی کا روپ دھار لیا اور پھر تیزی سے رینگتا ہوا وہ قریب کی چٹان کے ایک ننھے سے سوراخ میں داخل ہوگیا تب میں اس کی شیطانیت سمجھا۔ میں سوراخ کے قریب پہنچ گیا۔ نیچے جھک کر میں نے سوراخ میں انگلی داخل کر دی مگر سوراخ بہت باریک تھا۔ مجھ پر دیوانگی طاری تھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کچھ فاصلے پر پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اٹھا کر میں اس سوراخ میں مارنے لگا۔ میں ہر قیمت پر اسے باہر نکالنا چاہتا تھا مگر اس پتھر کی ضربیں چٹان پر اثر انداز نہ ہوئیں اور میرے ہاتھ میں دبا پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس ناکامی پر مجھے شدید جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ ... کچھ ہو سکتا۔ کیا کروں۔ اس سوراخ کے قریب آگ جلا دوں مگر کیسے، کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر اتنا

ضرور کیا میں نے کہ ٹوٹے پتھروں کے ٹکڑے سوراخ کے منہ پر رکھ کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا کسی کسی نے اس بھاگ دوڑ پر توجہ نہیں دی تھی۔ کوئی سمجھ نہیں پایا ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں سوراخ کو گھورتا رہا۔ بھوریا چرن کو باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور پھر کم بخت پراسرار شیطانی علوم کا ماہر ہے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا ہوگا وہ تو صرف میری پہنچ سے نکلنے کیلئے اس نے سوراخ کی پناہ حاصل کی تھی ورنہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ پھر مجھے اس شخص کا خیال آیا جسے اس نے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ زخمی ہوگیا تھا۔ پلٹ کر نگاہ دوڑائی تو اسے وہیں ساکت پایا۔ میں پلٹ کر اس کی طرف چل پڑا اور چند لمحات کے بعد اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے وہاں بیٹھ کر اس کے زخموں کو دیکھا نیچے گرنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے بدن چھل گیا تھا۔ کپڑے خون میں ڈوب گئے تھے۔ سر میں بھی چوٹ لگی تھی اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اپنے لباس سے کچھ پٹیاں پھاڑ کر میں نے اس کے زخموں پر باندھیں۔ ابھی اس کام سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ اوپر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ شاید کسی نے ادھر دیکھ لیا تھا۔ چند افراد سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگے۔

"کیا ہوا.......... کیا ہوگیا۔" بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

"گر پڑا ہے۔"

"کیسے۔؟"

"غلطی سے اس طرف آگیا تھا..........!" میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں کیا۔"

"پتہ نہیں۔"

"ہٹو.......... میں دیکھتا ہوں۔" ایک شخص نے کہا اور لڑکے کے قریب بیٹھ کر اس کا بدن ٹٹولنے لگا اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں لڑکے کے بدن کو ٹٹول رہے تھے پھر وہ بولا۔

"نہیں ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

"تمہارا کون ہے یہ..........؟"

"بھائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر آ کیسے گیا تھا..........؟"

"دماغی توازن خراب ہے۔" میں نے جواب دیا اور بہت سے انسانوں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ مذہب کے رشتے سے میرا بھائی تھا اور اسی مشکل کا شکار ہوا تھا جس سے میں عرصۂ دراز سے گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھوریا چرن کے طلسم کا شکار تھا اور اس کا ذہن اس کے قبضے میں نہیں تھا۔

سب ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ بے ہوش نوجوان کو اٹھایا گیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں سے دور مزار شریف کے سامنے والے حصے میں لے آیا گیا، اس کے تمام زخم دیکھ کر ان پر پٹیاں کسی گئیں

جس شخص نے اس کی ہڈیاں دیکھی تھیں وہ ہڈیوں کا علاج کرنے والا ایک پہلوان تھا۔ اس نے اپنے طور پر نوجوان کی دیکھ بھال کی اور دوائیں اور پتے وغیرہ اس کے زخموں پر کس دیئے۔ اسی اثنا وہ ہوش میں آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے انداز میں وحشت ابھری لیکن میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی اور شفقت سے کہا۔

"آرام سے لیٹے رہو۔ تمہارے چوٹیں لگی ہیں۔ شاباش، کوئی فکر مت کرو.......... سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ میں نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ میرے بھائی کو تنہا چھوڑ دیں ان کی مہربانیوں کا شکریہ۔ ایک ایک کر کے لوگ چلے گئے اور میں نوجوان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔ آیا اس وقت بھی بھوریا چرن کے سحر کا شکار ہے یا آزاد ہے۔ اس کا جسم مسلسل کپکپا رہا تھا.......... "سردی لگ رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا منہ سے کچھ نہ بولا۔ "کچھ کھاؤ گے۔" میں نے پھر سوال کیا۔

"مار دو.......... مار دو تم ہی مجھے مار دو.......... خدا کیلئے.......... خدا کیلئے مجھے اس اذیت سے نجات دلا دو۔ خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو.......... مجھے مار دو مجھے ہلاک کر دو۔ تمہارا بھلا ہوگا۔ ثواب ہوگا تمہیں۔ مجھے مار دو۔" وہ کپکپاتی آواز میں ہولے ہولے رو رہا تھا حد سے زیادہ سہمے ہوئے انسان کی مانند جسے کسی سے ہمدردی کی توقع نہ ہو، جسے کہیں سے زندگی کی امید نہ ہو۔

میں محبت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے نرم اور شفیق لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں یاد ہے کہ تم نے دوبار مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اگر تمہیں یاد ہے کہ اس رات تم نے خنجر سے حملہ کر کے مجھے شدید زخمی کر دیا تھا۔ تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ان دونوں حملوں کیلئے میں نے خلوص دل سے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں تم سے کوئی بدلہ نہیں لوں گا۔ مکمل اطمینان رکھو۔ دوسری بات یہ کہ کسی کی زندگی لینے سے کبھی ثواب نہیں ملے گا کیا تم مسلمان ہو..........؟"

"ہاں، ہاں میں ایک مسلمان کا بیٹا ہوں مگر، مگر.........." وہ رک کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"کلمۂ طیبہ یاد ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" وہ بدستور سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"پڑھو.........." میں نے کہا وہ مجھے دیکھنے لگا۔ میرے بار بار کہنے سے اس نے کلمہ شریف پڑھا۔ ایک بار دوسری بار اور پھر تیسری بار میں نے اسے کلمۂ طیبہ پڑھایا پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم اللہ رب العزت کی پناہ میں ہو۔ دل سے یہ خوف نکال دو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیا نام ہے تمہارا..........؟" اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بھوریا چرن کا شکار ضرور ہے مگر اس کے حواس درست ہیں۔

"اکرام......... اکرام احمد.........!" اس نے جواب دیا۔

"میرا نام مسعود احمد ہے۔" تم میرے چھوٹے بھائی کی مانند ہو......... بالکل پریشان نہ ہو۔ خود کو سنبھال لو۔"

رات چھا گئی تھی جگہ جگہ روشنیاں جل اٹھی تھیں جس جگہ ہم موجود تھے وہاں بھی روشنی آ رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ پھر بولا۔ "تم......... تم مجھے معاف کر دو گے لیکن......... لیکن وہ تھوڑی دیر گزرے گی......... اور......... وہ چاروں طرف سے آ جائیں گی......... وہ......... وہ......... میرے جسم کو نوچیں گی۔ مجھے کاٹیں گی۔ تم تم خود دیکھ لینا......... تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ آہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا تمہیں میری مجبوری پتہ چل جائے گی۔" اس نے سہمی ہوئی نظریں زمین پر ڈالیں اور اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے دوبارہ شدید خوف نمودار ہو گیا۔ "دیکھو......... وہ دیکھو......... وہ دیکھو......... وہ......... وہ......... وہ آ گئیں۔ دیکھ لو وہ آ گئیں۔ آہ......... آہ......... وہ آ گئیں......... میں نے جھوٹ تو نہ کہا تھا۔ دیکھ لو......... خود دیکھ لو........."

وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے سردی سے بخار چڑھ رہا ہو لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ بے شمار ننھی ننھی سرخ چنگاریاں ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ زمین پر رینگتی اسی سمت بڑھ رہی تھیں۔ میرے منہ سے حیران سے لہجے میں نکلا۔ "یہ کیا ہے؟"

"پیلے رنگ کی زہریلی مکڑیاں۔ یہ......... یہ سب میرے پورے بدن سے چمٹ جائیں گی اور......... اور میرے۔ آہ۔ سوئیاں۔ میرا گلا بند ہو جاتا ہے۔ آواز......... آواز نہیں نکلتی۔ یہ میرا خون پیتی ہیں۔ آہ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دیکھ لو بس اب۔ اب" وہ نڈھال ہونے لگا۔

بے اختیار میرے منہ سے درود شریف جاری ہو گیا۔ صرف تین بار درود شریف پڑھ کر میں نے انگلی سے زمین پر ایک وسیع دائرہ بنا دیا وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان مکڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اب وہ تمہارے قریب نہیں آئیں گی۔" میں نے پر یقین آواز میں کہا۔

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں روک سکتا انہیں۔ وہ۔ آہ دیکھو وہ آ گئیں۔"

"وہ آگے نہیں آئیں گی اکرام۔ جہاں تک وہ پہنچی ہیں وہاں سے آگے نہیں آئیں گی۔ دیکھ لو وہ میرے بنائے ہوئے حصار کو عبور نہیں کر پا رہیں دیکھ لو۔ دیکھا.........!" مکڑیاں رک گئی تھیں وہ ایک دائرے کی شکل میں پھیل گئی تھیں اور حصار کی لکیر کو واقعی عبور نہیں کر رہی تھیں حالانکہ ان میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ اندر گھس آنے کیلئے بے چین تھیں۔

"یہ تو واقعی رک گئیں۔" اکرام کے منہ سے نکلا۔ "اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"تمہیں ان کا حشر دکھاؤں۔" میں نے بے خیالی کے عالم میں کہا۔ پھر میرے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور میرے ہونٹوں سے ہوا خارج ہونے لگی۔ حالانکہ ہونٹوں سے خارج ہونے والی ہوا

تھی ہی کتنی لیکن جہاں ہوا لگی تھی وہاں کی مکڑیاں روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئی تھیں۔ میں نے رخ بدل کر پھونک ماری اور مکڑیوں کی صفیں اکھڑ گئیں۔ باقی مکڑیاں سہم کر بھاگنے لگیں اور میں مسلسل ان پر پھونکیں مارتا رہا۔ پھر وہاں کسی مکڑیاں کا نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا خیال آیا۔ بہت انوکھا خیال مکڑیوں کو دیکھ کر حصار بنانے کا خیال میرے دل میں نہیں آیا تھا بلکہ اچانک ہی بغیر سوچے سمجھے بغیر میرے ہونٹوں سے درود پاک جاری ہو گیا تھا۔ اس میں میری کسی سوچ سمجھ کوشش کا دخل نہیں تھا اس کے بعد میں نے پھونکیں مار کر ان مکڑیوں کو اڑا دیا تھا۔ ایسا بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ یہ خود بخود ہوا تھا اور اس سے ایک نتیجہ اخذ ہو رہا تھا۔ میری رہنمائی ہو رہی تھی خدا کے فضل سے مجھے جو کرنا ہوتا تھا وہ مجھ سے خود بخود سرزد ہو جاتا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں زخمی ہونے کے بعد خود پر حملہ کرنے والے کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرتا اور ممکن تھا کہ مجھے اس کے بارے میں معلوم بھی ہو جاتا لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں تھی میری اپنی ذات کا معاملہ تھا۔ جب وقت آیا تو سب کچھ منکشف ہو گیا۔ اور یہ تو بڑا احسان ہے اس ذات باری کا۔ دل کو خوشی ہوئی تھی۔

"مسعود بھائی۔" اکرام کی لرزتی ہوئی آواز ابھری اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ پھر خوف زدہ ہو گیا۔

"کہو.........!" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"آپ نے۔ آپ نے خود مجھے اجازت دی تھی۔"

"کیسی اجازت؟"

"آپ نے کہا تھا کہ......... کہ میں آپ کے چھوٹے بھائی کی مانند ہوں۔ اس لئے میرے منہ سے مسعود بھائی نکل گیا۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

"تو پھر.........؟" میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ میرے مسعود بھائی کہنے سے ناراض ہوئے ہیں نا.........!"

"پاگل ہو تم.........؟" میں مسکرا کر بولا۔

"آپ ناراض نہیں ہوئے؟"

"یہ ناراض ہونے کی بات ہے بھلا۔"

"آپ نے میری مجبوری پر یقین کر لیا۔" وہ کسی قدر خوش نظر آنے لگا۔

"ہاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ میرا رویہ مختلف ہوتا۔"

"خدا کی قسم مسعود بھائی، خدا کی قسم، میں ایک شیطان کے زیر اثر تھا۔ میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن......... لیکن........." وہ سسکی لے کر بولا۔

"میں جانتا ہوں اکرام مجھے معلوم ہے۔"

"میں نے اسے پہلی بار ناکام دیکھا ہے۔ یہ شیطان مکڑیاں میری آنکھوں کے سامنے کئی زندہ انسانوں کو چپکے چپکے ہڈیوں کا پنجر بنا چکی ہیں۔ یہ اس کے اشارے پر عمل کرتی ہیں۔ اگر وہ انہیں حکم دیتا ہے کہ

انسانی گوشت کھاجاؤ تو یہ مکڑیاں اسے نوچ نوچ کر کھا جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کا خون پی لو تو آہ.......... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مسعود بھائی۔ انسانی جسم میں خون کا ایک قطرہ باقی نہ رہتا اور یہ پیلی سے سرخ ہو جاتی ہیں ان کا جسم بڑھ جاتا ہے۔ یہ خون پی کر پھول جاتی ہیں۔ میں اگر ذرا بھی انحراف کرتا تھا تو یہ مکڑیاں میرے بدن میں اپنے ڈنک چبھوتی تھیں اور.......... آہ آہ۔" وہ کراہنے لگا۔

"اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں مسعود بھائی آپ اللہ والے ہیں خدا کیلئے مجھے پناہ میں لے لیں۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی۔ بری بات ہے توبہ کرو۔ اللہ کے سوا کسی سے پناہ نہ مانگو کسی میں کسی کو پناہ دینے کی قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے۔"

"میں۔ میں تھک گیا ہوں۔ آہ میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔"

" اپنے دل سے اس کا خوف بالکل نکال دو۔ اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ آؤ یہاں سے چلتے ہیں۔ آؤ۔" میں نے اسے دلاسہ دیا اور پھر اسے ساتھ لے کر مزار سے بہت دور نکل آیا اتفاق سے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں گنگا دھرجی کی چھولداری لگی ہوئی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی صرف چند نشان نظر آرہے تھے۔ میرے قدم وہیں رک گئے اور پھر میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اکرام کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اب میں کیا کروں مسعود بھائی..........؟"

"یہیں آرام کرو..........!"

"آپ، آپ اب سو جائیں گے اور اگر وہ آگیا تو.......... تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا!"

"میں تمہارے گرد حصار بنائے دیتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا نماز آتی ہے تمہیں؟"

"ہاں۔"

"نماز پڑھا کرو۔ ہر بلا تم سے دور رہے گی۔ ٹھہرو پہلے میں تمہارے گرد حصار بنادوں۔" میں نے درود پاک کا تحفظ اپنے اور اس کیلئے حاصل کیا اور بھرپور اعتماد کے ساتھ حصار میں بیٹھ گیا۔ "مجھے خوشی سے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گے اکرام احمد..........؟"

"آپ حکم دیں گے تو ضرور بتاؤں گا۔"

"حکم نہیں۔ اگر تمہارا دل چاہے تو.......... ورنہ کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

"میرا دل چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے اس کے طلسم میں گرفتار ہو کر دوبار آپ کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔"

"میں نے تمہیں بے گناہ قرار دیا ہے۔"

"شکریہ مسعود بھائی۔ آپ نے مجھ پر اعتبار کر لیا ورنہ آپ کی جگہ اور کوئی ہوتا تو نہ جانے میرا

کرتا۔ اپنا نام بتا چکا ہوں۔ میں نے اور میری بہن نے بچپن ہی سے دکھ اٹھائے ہیں۔ بڑی انوکھی کہانی ہے میری۔ میں بستی جونا پوری کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد نظام احمد مرحوم ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ اپنے اصولوں میں بہت سخت تھے وہ۔ پھر گھر والوں کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ ہولی کے موقع پر کسی ہندو نے ان پر رنگ پھینک دیا۔ انہوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ والد صاحب گرفتار ہوئے اور انہیں موت کی سزا ہو گئی۔ ان کی موت کے بعد ہم بے سہارا ہو گئے۔ ہمارے جینے کا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ ماں والد صاحب کی گرفتاری کے بعد سے ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ فاقہ کشی اور بے کسی کی زندگی گزرنے لگی اور ہم بستی کے ہندوؤں کی نفرت کا الگ شکار تھے۔ رشتے کے ایک ماموں بھرسنڈہ میں رہتے تھے مجبور ہو کر بھرسنڈہ چلے گئے۔

"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ بھرسنڈہ کے نام کے ساتھ مجھے مہاوتی یاد آگئی تھی مگر پھر یہ بھی یاد آگیا کہ عالم استغراق میں اس نوجوان کو میں نے مہاوتی کی قید میں دیکھا تھا۔

"بھرسنڈہ.........." اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔ پھر؟"

"ماموں خود غریب آدمی تھے بال بچوں والے تھے۔ ہمارے ساتھ مہربانی سے پیش آئے مگر ہمارے لئے کچھ کر نہ سکے۔ ماں کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ماموں بھی مر گئے اور میں محنت مزدوری کر کے اپنی بہن کا پیٹ بھرنے لگا۔ بھرسنڈہ ماموں کی وجہ سے آیا تھا نہ وہ رہے نہ ماں رہی۔ چنانچہ میں بہن کو لے کر جونا پوری واپس آگیا۔ یہاں زندگی کچھ بہتر گزرنے لگی مگر بہن کا خیال دل میں چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ وہ اب میری ذمہ داری تھی اور اس کے مستقبل کیلئے میں پریشان رہتا تھا مگر کچھ نہیں بن پا رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا مگر میرے حالات خراب تر ہوتے گئے۔ جہاں نوکری کرتا تھا، وہاں کچھ دوست بن گئے تھے۔ یہ جوا اور سٹہ کھیلتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی سٹہ کھیلنے کی لت لگا دی اور میں باقاعدہ سٹہ کھیلنے لگا۔ کبھی تھوڑا بہت جیت بھی جاتا تھا مگر اس طرح کہ بعد میں سب برابر ہو جاتا تھا۔ دیوان لال میرا دوست تھا، وہ سٹے کا نمبر معلوم کرنے کیلئے جنتر منتر کرتا رہتا تھا۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور سادھو سنتوں کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔ ایک دن شمشان گھاٹ پر ایک سادھو دھونی رمائے نظر آگیا۔ بڑا بدشکل آدمی تھا۔ دیوان لال وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

سادھو مہاراج کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک نئی جلی ہوئی چتا موجود تھی۔ جس میں بہت سی انسانی ہڈیاں نظر آرہی تھیں، سادھو مہاراج کچھ دیر تک منتر پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے بند مٹھی کھولی اور چتا کی طرف ہاتھ اٹھا دیا ہم نے دیکھا کہ جلا ہوا مردہ جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں اپنی ہڈیاں سمیٹ کر اٹھنے لگا اور پھر چتا سے نکل کر سادھو مہاراج کے سامنے پہنچ گیا۔ دیوان لال تو دہشت سے چیخ مار کر بھاگ گیا تھا۔ لیکن میرے اعصاب شل ہو گئے تھے، میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور وہیں بیٹھا تھر تھر کانپنے لگا لیکن دیوان لال کی چیخ پر سادھو مہاراج چونک پڑے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے دیوان لال کو دیکھا۔ پھر ان کی نظریں مجھ پر آکر ٹک گئیں، ان

کی آنکھوں میں شدید غصے کے آثار تھے اور وہ بری طرح سرخ ہو رہی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں کا غصہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور ان کے چہرے پر حیرت کے آثار بکھر گئے ہیں۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر سامنے کھڑے ہوئے مؤدب مردے کو اشارہ کیا اور بولے۔ ”جا جا، بھاگ جا، بھاگ جا۔“ اور مردہ خاموشی سے واپس جا کر اپنی چتا میں لیٹ گیا۔ سادھو مہاراج دلچسپی کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔

”کیا بات ہے بالکا، کیسے آ بیٹھا میرے پاس اور کون تھا وہ کم دلا جو بھاگ گیا............“ میرے منہ سے خوف کے مارے آواز نہیں نکل پا رہی تھیں، بمشکل تمام میں نے ہاتھ اٹھائے اور انہیں جوڑ کر عاجزی سے بولا۔

”معافی چاہتا ہوں سادھو مہاراج معافی چاہتا ہوں۔ وہ کم بخت دیوان لال مجھے اپنے ساتھ لے آیا تھا ورنہ .... ورنہ میں آپ کو پریشان نہ کرتا............“

”نہیں نہیں کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ سٹے کا نمبر معلوم کرنے آیا ہے نا............؟“

”جی جی .... جی مہاراج ....“

”دولت کمانا چاہتا ہے ایں، دولت کمانا چاہتا ہے۔“ سادھو مہاراج ہنستے ہوئے بولے۔ میری ہمت بندھ گئی، وہ مجھ سے مہربانی سے پیش آ رہے تھے، میں نے گردن جھکا کر کہا............

”بہت غریب آدمی ہوں مہاراج، بڑا غریب آدمی ہوں۔ اگر آپ مہربانی کر دیں تو میری مشکل دور ہو سکتی ہے۔“

”مشکل تو ہماری بھی دور ہو سکتی ہے بالک چل ٹھیک ہے نام کیا ہے تیرا............؟“

”اکرام احمد۔“ میں نے جواب دیا اور سادھو مہاراج کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بڑی مکروہ اور خوفناک ہنسی تھی ان کی، مجھے بے حد ڈر لگا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ہو سکتا ہے دیوان لال کی تقدیر میں دولت نہ ہو اور میرا کام بن جائے، ایسے لاتعداد واقعات سنے تھے میں نے۔ اور اس وقت سادھو مہاراج کی نرمی یہی بتا رہی تھی کہ میرا کام بننے والا ہے ان کی ہنسی کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ انہوں نے کہا۔

”سات اور نو کھیل لے، جا سات اور نو کھیل لے، اور یہ لے پیسے سات اور نو پر لگا دے، جا چل بھاگ جا، یاد رکھنا ہمیں، یاد رکھنا............“

میں نے اپنے دل میں بے پناہ خوشی محسوس کی، سادھو مہاراج نے مجھے مٹھی بھر کے چاندی کے روپے دیئے تھے، جنہیں میں نے بڑی عقیدت سے قبول کر لیا تھا۔ اتنے روپے سچی بات یہ ہے کہ سالہا سال سے نہیں دیکھے تھے میں نے، سٹے کا نمبر نہ بھی لگتا تو یہ روپے ہی میرے لئے بہت دن تک کام دے گئے تھے۔ لیکن وہاں سے پلٹا، خوشی سے قدم بوجھل ہو رہے تھے، بنواری لال کی دکان پہ آ کر میں نے سات اور نو کے نمبر لگا دیئے، سارے روپے لگا دیئے اور وہ بھی جو اپنے پاس موجود تھے اس خیال کے تحت کہ شاید میرا کام بن ہی جائے اور یہی ہوا، نمبر نکلا اور اتنی دولت مل گئی مجھے کہ میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں

مرتبہ داخل ہوا۔ بہن کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے تو اس پر بھی نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی ... نے کہا۔

”بھیا کہاں سے لے آئے یہ پیسے، خدا کیلئے سچ بتاؤ، کہیں، کہیں کوئی غلط کام تو نہیں ....؟“

”پاگل ہے تو، بس یہ سمجھ لے، ہمارے دلدر دور ہو گئے، تو بھی عیش کرے گی اور اب دیکھنا کہ میں ... کرتا ہوں۔ کھانے پینے کا سامان لایا۔ مجھے وہ شام یاد ہے مسعود بھائی، میری بہن بہت خوش تھی ... بے پناہ خوش تھا۔ ہم نے پیسے زمین میں ایک ہنڈیا میں رکھ کر دفن کر دیئے، بس اتنے نکال لئے ... ہمارا کام چلتا رہے تھوڑے سے پیسے میں نے دیوان لال کیلئے بھی نکال لئے تھے اور دوسرے دن دیوان لال میرے پاس آ گیا اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں سٹے میں بہت بڑی رقم جیتا ہوں وہ افسوس کرنے لگا ... ڈر کر کیوں بھاگ آیا۔ بہرحال اچھا آدمی تھا، کوئی خاص بات نہ کی اس نے بلکہ پیسے لینے سے بھی انکار کیا جو میں نے اس کیلئے نکالے تھے۔ لیکن میں نے اپنے دوست کو محروم نہیں رکھا اور دیوان لال کو مجبور کر دیا۔ دوسرا اور تیسرا دن گزر گیا، سٹے کا نمبر ایک بار لگ گیا تھا اور میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ خدا کرے سادھو مہاراج پھر سے مل جائیں۔ وہاں پہنچا جہاں سادھو مہاراج کو دیکھا تھا لیکن شمشان گھاٹ کے پاس وہ جگہ خالی پڑی ہوئی تھی البتہ دیوان لال مجھے وہاں مل گیا تھا، مجھے دیکھ کر کھسیانی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ سادھو مہاراج کی تلاش میں آیا ہے، لیکن اب وہ موجود نہیں تھے۔ رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ سردیوں کی راتوں میں ساڑھے آٹھ بجے کا مقصد یہ ہے کہ رات آدھی کے قریب ہو گئی۔ بستی سنسان پڑی تھی کسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی .... میں نے دروازہ کھولا اور سادھو مہاراج کو دیکھ کر حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ مسکرا دیئے اور بولے............

”اندر آنے کو نہیں کہے گا بالک............؟“

”آپ .... آیئے .... آیئے .... آیئے سادھو مہاراج۔ آیئے آیئے مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میرے اس غریب خانے پر بھی تشریف لے آئیں گے............“ سادھو مہاراج اندر آ گئے، ... سے گزر کر انہوں نے کوٹھے کے دروازے سے قدم رکھا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ یوں لگا جیسے ان کے بدن کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو............ ایک لمحے کیلئے ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولے............

”باہر آ، تجھ سے بات کرنی ہے۔“

”آپ اندر آ جایئے مہاراج۔ آپ کا گھر ہے۔ آ جایئے اندر“ مگر مہاراج اندر آنے کے بجائے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔ کافی دور پہنچ کر وہ ایک پلیا پر بیٹھ گئے۔ پھر مجھے دیکھ کر بولے۔ ”نمبر لگا تھا؟“

”ہاں مہاراج۔ آپ کی مہربانی سے میرے دن پھر گئے۔“

"ہونہہ ۔ دن پھر گئے ۔ تو انہیں دن پھرنا کہتا ہے ۔ چار پیسوں میں کہیں دن پھرتے ہیں۔" مہاراج نے کہا۔

"ہم بہت غریب لوگ ہیں مہاراج۔ ہمارے لئے تو یہ پیسے بڑا خزانہ ہیں۔"

"ماتا پتا مر چکے ہیں تیرے ؟"

"ہاں مہاراج۔"

"اور کون ہے گھر میں ؟"

"بس ایک بہن ہے۔"

"ہوں۔ بہت محبت کرتا ہو گا تو اس سے ؟"

"جی سادھو جی ، دنیا میں اب میرا اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ آپ اندر آئیے۔ بڑی خوشی ہوگی۔"

"نہیں۔ وہاں تیری عبادت کی کتاب رکھی ہے دھرم کتاب۔ تیرے پتا کیا کرتے تھے؟"

"مسجد میں پیش امام تھے۔"

"چل چھوڑ ، ایک بات بتا۔"

"جی مہاراج۔"

"جنتر منتر سے لگاؤ ہے تجھے۔ کوئی چلہ کھینچے گا۔ کچھ سکھاؤں تو سیکھے گا یہ بھاگ ہیں تیرے کہ ہم کچھ سکھانا چاہتے ہیں ورنہ ہزاروں ہمارے پیچھے ہاتھ باندھے پھرتے ہیں۔"

"چلے سے کیا ہو گا سادھو مہاراج؟"

"پھر تجھے کسی سے سٹے کا نمبر نہیں پوچھنا پڑے گا۔ لکشمی تیری داسی ہوگی۔ جدھر انگلی اٹھا... سونے کے انبار لگ جائیں گے۔ راج رانی ہوگی تیری بہن ، جیون سوارت ہو جائے گا تیرا۔ ا... بدلے میں تجھے ہمارے کچھ کام کرنے ہوں گے۔"

"کیا .... ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بعد میں بتادیں گے ، تجھے۔"

"میں منتر سیکھنا چاہتا ہوں مہاراج۔"

"ہاتھ دے ہمارے ہاتھ میں ...." سادھو نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور میں نے اپنا ہاتھ ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ بولا "بہت بڑا کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو نے نبھا سکے گا؟"

"کیوں نہیں مہاراج۔"

"بیچ سے تو نہیں بھاگے گا؟"

"نہیں۔"

"پھر یوں کرنا۔ کل شمشان گھاٹ آجانا۔ دن کے بارہ بجے سے کچھ پہلے ٹھیک بارہ بجے ہم وچن لیں گے ، اور سن اپنی بہن سے کہہ کر آنا کہ کچھ دنوں کیلئے کہیں جا رہا ہے ۔ کوئی چالیس

...گے واپسی میں۔"

"چالیس دن .... !" میں نے گھبرا کر کہا۔

"پورے چالیس دن۔"

"مگر میری بہن اکیلی رہے گی !"

"سو تو ہے مگر اس کے بعد تو کیا ہو گا یہ سوچ بھی نہیں سکتا تو .... جتنی چاہے گا دولت حاصل کرے گا۔ جس طرف نظر اٹھاوے گا لوگ نظریں جھکا دیں گے تیرے سامنے۔ تیرا بڑا مقام ہو گا۔ بڑے امیروں اور امیروں کو پلک جھپکتے غریب بنا دے گا تو .... کوئی دم نہ مارے گا تیرے سامنے، بہن کی پسند سے جہاں چاہنا بیاہنا۔ بول کیا کہتا ہے؟"

میری آنکھوں میں نہ جانے کیا کیا خواب سما گئے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تیار ہوں۔"

"کل تک اور سوچ لینا !"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

"وچن دینا پڑے گا تجھے سوگند کھانی پڑے گی اور جب سوگند کھائے گا تو اسے نبھانا پڑے گا۔ نہیں نبھائے گا تو مصیبتوں میں پھنس جائے گا پھر چھٹکارا مشکل ہو گا۔"

"میں تیار ہوں مہاراج .... !"

"کل بارہ بجے آجانا .... !"

"آجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور سادھو ایک دم واپسی کیلئے مڑ گیا۔ میں نے اس کے پیچھے قدم اٹھانے چاہے مگر ہل بھی نہیں سکا میرے قدم جم گئے تھے پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میرے پاؤں کھل گئے۔ مجھے بڑا خوف محسوس ہوا تھا مگر میں نے خود کو سنبھال لیا اور گھر کے اندر آ گیا۔ بہن کو میں نے اصل صورت حال نہیں بتائی تھی اور سادھو مہاراج کے بارے میں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ دیوان لال کے رشتے دار تھے اور میری نوکری کیلئے آئے تھے۔

"نوکری کیلئے ؟" میری بہن نے پوچھا۔

"ہاں دیوان لال کے کہنے پر انہوں نے میرے لئے ایک بڑی اچھی نوکری تلاش کی ہے۔"

"سچ بھیا۔ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔"

"ہاں کل مجھے جانا ہو گا۔ بستی کے باہر شاید چندوسی۔ واپسی میں مہینہ سوا مہینہ لگ جائے گا۔"

"اور میں اکیلی رہوں گی کیا؟"

"شمشاد چچا سے کہہ جاؤں گا۔ حسینہ چچی تیری خبر رکھیں گی۔ پیسے تیرے پاس موجود ہیں کسی کو ہوا نہ لگنے دینا۔ آرام سے نکال نکال کر خرچ کرتی رہنا سوا مہینے کے بعد میں واپس آجاؤں گا اور اگر نوکری اچھی ہوئی تو تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔" میری معصوم بہن تیار ہوگئی۔ شمشاد چچا اور حسینہ چچی ہمارے پڑوسی تھے اور بڑے ہمدرد لوگ تھے۔ ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو بھی یہی

کہانی سنائی اور اس طرح اپنی بہن کیلئے بندوبست کر دیا۔ ساری رات خوشی کے مارے نیند نہیں آئی تھی نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا میں مسعود بھیا۔ خوبصورت کوٹھیاں، شاندار کاریں اور نہ جانے کیا کیا۔ دوسرے دن اسی طرح تیاریاں کیں جیسے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ بارہ بجے سے پہلے شمشان گھاٹ پہنچ گیا مگر وہاں بہت سے لوگ موجود تھے نئی چتا بنائی گئی تھی اور کسی مُردے کی ارتھی لائی جا رہی تھی۔ میں وہاں سے دور ہٹ گیا اور ایک سنسان گوشے میں جا بیٹھا۔ ٹھیک بارہ بجے اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی اور میں نے سادھو کو وہاں کھڑے پایا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"آ گیا بالک؟"

"ہاں مہاراج۔"

"ادھر تو مُردہ جلایا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کی وجہ سے آپ یہاں نہ آئیں۔" جواب میں سادھو نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"تماشا دیکھے گا؟"

"تماشا؟"

"ہاں۔ میری شکتی کا تماشا۔ شاید تو مجھے کوئی معمولی جوگی یا سنیاسی سمجھتا ہے۔ باؤلے میں شنکھ ہوں۔ پدم شنکھا۔ بھوریا چرن ہے میرا نام، کالے جادو کے سنسار کا سب سے بڑا نام ہے یہ۔ تجھے تماشا دکھاتا ہوں ادھر دیکھ۔" اس نے مجھے ان لوگوں کی طرف متوجہ کیا جو چتا کے قریب تیاریوں میں مصروف تھے۔ ارتھی چتا کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اچانک ارتھی پر پڑے ہوئے مُردے نے ایک چنگھاڑ ماری اور آس پاس کھڑے لوگ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ یہاں سے مُردہ صاف نہیں نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بدن میں جنبش محسوس ہو رہی تھی پھر اس نے اپنے بدن پر بندھے ہوئے کپڑے کے بند توڑ دیئے اور دوسری چنگھاڑ مار کر کپڑے اتار کر پھینکے قریب کھڑے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چیختے چلاتے ایک دوسرے کو پھلانگتے جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑے۔ اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے کہ وہ بتا نہیں سکتا۔ مردہ ارتھی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ آن کی آن میں لوگوں کا صفایا ہو گیا اب وہاں چڑیا کا بچہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا بس اکیلا مُردہ ساکت کھڑا تھا۔ سادھو نے ہنس کر کہا۔

"اب بول .... !" مگر میں کیا بولتا خوف کے مارے خود میرا بدن پسینہ چھوڑ رہا تھا۔ "ان لوگوں کو بھگا دینا کچھ مشکل ہوا ہمارے لئے۔"

"نن۔ نہیں مہاراج .... مگر وہ مُردہ .... کیا وہ زندہ ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"پھر .... ؟"

"ہماری شکتی سے کھڑا ہے اس کے اندر ہمارا بیر گھس گیا ہے اس نے سب کو ڈرا کر بھگا دیا۔" وہ

ہنس کر بولا۔

"اب کیا ہو گا؟"

"اسے چتا میں پہنچائے دیتے ہیں اس بے چارے کی تپسیا بھنگ کرنے سے کیا فائدہ۔" وہ بولا۔ میری نظریں اسی طرف تھی اچانک میں نے مُردے کے بدن میں جنبش دیکھی وہ جھکا اور اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹنے لگا۔ اس نے خود ہی انہیں اپنے بدن پر لپیٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا چتا میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ چتا پر لیٹ گیا۔ پھر اچانک سادھو کے منہ سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور پرواز کرتا ہوا چتا کی لکڑیوں سے جا لگا۔ میں نے لکڑیوں کو آگ پکڑتے دیکھا۔ سادھو مسلسل منہ سے شعلے اگل رہا تھا اور میں چتا میں ہر طرف آگ لگتے دیکھ رہا تھا۔ خوف سے میری بری حالت تھی۔ یہ سادھو تو میری توقع سے کہیں زیادہ

اول تو مجھے کالے جادو جیسی کسی چیز سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، اس قسم کے سٹے کے نمبر بتانے والے سادھو اور سنیاسی تو کبھی کبھی سڑکوں پر بھی مل جاتے ہیں، میں اسے ایسا ہی کوئی سادھو سمجھا تھا لیکن اب جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ ناقابل بیان تھا۔ وہ کالی قوتوں کا مالک تھا اور اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں، میں سوچ رہا تھا لیکن جو کچھ اس نے مجھ سے کہا تھا اور جو سبز باغ دکھائے تھے اگر واقعی میری کوششوں سے وہ مجھے حاصل ہو جائے تو کتنا لطف آ جائے گا، زندگی کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ اس خیال کے تحت اپنے آپ کو سنبھالا اور چتا کا جائزہ لینے لگا، جس نے مُردے کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ سادھو کہنے لگا۔

"اب چھوڑ ان باتوں کو، تو نے کہا تھا کہ ان لوگوں کے آجانے کی وجہ سے کہیں ہمارا کام بھنگ نہ ہو جائے، سو میں نے تجھے یہ بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میری مہان شکتی ہر وہ کام کر سکتی ہے، جو میں چاہوں سو بالکا اب جو کچھ میں تجھے بتا رہا ہوں وہ کر، تاکہ تو میری پناہ میں آ جائے .... تو مسلمان کا بچہ ہے نا .... ؟"

"ہاں مہاراج ...."

"تیرے دھرم نے تجھے کیا دیا .... ؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ دین دھرم ڈھکوسلے ہوتے ہیں اور منش بس ان کی لکیر پر چلتا رہ جاتا ہے، ...م تو کالی شکتی ہے جس سے منش کو طاقت حاصل ہوتی ہے، دین دھرم بعد کی باتیں کرتے ہیں، کہ ...ت کا وہ ملے گا مگر کالی شکتی وہ چیز ہے جس سے فوراً ہی من کی منو کامنا پوری ہو جاتی ہے۔ تو بتا وہ بڑی یا ...؟"

مسعود بھیا میری معلومات بہت زیادہ نہیں تھیں، کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا ایسی معلومات سے، یہ ...س وقت میرے ذہن میں نہیں آئی کہ شیطان اسی طرح تو بہکاتا ہے اسی طرح تو وہ انسان کو مذہب

سے منحرف کرتا ہے، یہی تو شیطنت ہے، انسان اسی سے بچ جائے تو انسان رہتا ہے ورنہ شیطان
ہے اور اس وقت میں ایک شیطان کے قبضے میں تھا مکمل طور پر، اس کی باتیں میرے دل میں تو نہیں
تھیں لیکن میں سوچ ضرور رہا تھا ان باتوں پر۔ اس نے کہا۔

"بیٹھ جا، جیسے ہم بیٹھے ہیں ویسے بیٹھ جا۔ اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔" سورج آسمان
بیچوں بیچ اٹکا ہوا تھا، دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سادھو کو پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھا غالباً اس
سے بیٹھنے کو آسن رمانا کہتے ہیں، اس نے آسن رمایا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے، گردن سیدھی
سینہ تانا اور مجھ سے بھی ایسے ہی بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ وہ میری آنکھوں
دیکھنے لگا، بڑی مقناطیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں، مجھے ان سے شعلے اگلتے ہوئے محسوس ہو رہے
تھے۔ بدن میں بار بار تھرتھری پھیل جاتی تھی لیکن میں خود کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔
نے کہا۔

"بول سوجے لم ...." میں نے اپنے منہ سے وہی لفظ ادا کیا پھر اس نے کچھ اور ایسے
میرے منہ سے نکلوائے اور اس کے بعد کہنے لگا۔

"سوگند کھا سات سڑی ہوئی لاشوں کی، سات پوترنیوں کی راجہ اندر کی، دھیرنا مکندی کی کہ آج
تو میرے چیلوں میں شامل ہوا اور جو کچھ میں کہوں گا اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرے گا منہ سے بول
میں کہہ رہا ہوں.........."

میں اس کے کہنے کے مطابق دہرانے لگا۔ اس نے تین بار مجھ سے یہ الفاظ کہلوائے اور پھر مسکرا
بولا۔

"اس طرح تو میرا چیلا بن گیا۔ اب میں تیرے ماتھے پر تلک لگاتا ہوں اس نے زمین پر تھوکا۔
پیلے رنگ کا یہ بودار تھوک تھا، اس نے انگوٹھا ڈبویا اور میرے ماتھے پر لکیر کھینچ دی۔ مجھے اپنی پیشانی
ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کوئی جلتی ہوئی چیز میرے ماتھے سے لگا دی ہو۔
کر بولا۔

"تو رہے گا تو مسلمانوں کے بھیس میں مگر ہو جائے گا شدھی نہ ہندو نہ مسلمان، کالی شکتی کا
کالے علم کا خادم، تو ہمیشہ بیر چتروں کی سیوا کرے گا انہی کے کرموں پر چلے گا سمجھا۔ لوگ تجھے مسلمان
سمجھیں گے پر تو کچھ اور ہی ہو گا۔ مسلمانوں کی طرح پوجا پاٹ کرے گا۔ نمازیں پڑھے گا دیکھنے والے
سمجھیں گے کہ تو مسلمان ہے مگر تو ہو گا کالی شکتی کا سیوک، سمجھا بالک تو کالی شکتی کا سیوک بن چکا ہے
اپنے آپ پر مان کر بہت سی طاقتیں تیری مٹھی میں آنے والی ہیں اچانک ہی دل اندر سے الٹنے لگا۔
وہ کہہ رہا تھا یہ تو مجھے قبول نہیں ہے، میرے کانوں میں تو پیدا ہوتے ہی اذان کی آواز پڑی تھی
نا ہوشی کے عالم میں اللہ کا نام سنا تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کی ذات کو دھوکا دوں۔ نماز کیلئے جائے
کھڑا ہوں اور میرا دل گندگی میں ڈوبا ہوا ہو۔ اندر سے شدید ترین ہلچل پیدا ہونے لگی۔ میں نے
سے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر میری نگاہیں اس پر گڑ گئیں وہ مسکرا رہا تھا میری اندر کی کیفیت سے بے

کامیابی پر پھر وہ مجھ سے بولا۔ "اسی طرح بیٹھ جا۔ اس طرح بیٹھا رہ۔"
"مم مگر مہاراج.........."
"نہیں بالک، اس سمے تک اب تو کچھ نہیں بولے گا جب تک میں تجھے بولنے کو نہ کہوں۔" وہ اپنی
جگہ سے اٹھ کر ایک سمت چلا گیا۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور انہیں
آہستہ آہستہ نیچے اتارنے لگا۔ پھر میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک سفید رنگ کی گائے آ کھڑی ہوئی ہے۔
ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی۔ پیتل کی ایک چمکدار گڑوی قریب رکھی ہوئی تھی۔ اس نے گائے کے سر پر
ہاتھ پھیرا اور پھر اسے اس کی کمر تک پھیرتا چلا گیا۔ گائے نے پیشاب کر دیا تھا۔ اس نے وہ گڑوی نیچے
رکھ دی اور اس میں غلاظت بھر لی۔ پھر وہ مسکراتا ہوا گڑوی لئے میرے قریب پہنچ گیا۔
"لے.......... امرت جل کچھ نہیں ہے اس کے سامنے ہزار امرت مل جائیں گے تجھے۔ لے پی جا
اسے.........."

دوسرے لمحے میرے بدن میں جیسے چنگاریاں بھر گئیں۔ اچانک ہی میری پیشانی کی لکیر جلنے لگی،
اچانک ہی میرے پورے وجود میں گڑگڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ اچانک ہی میری آنکھوں سے شرارے ابلنے
لگے۔ اچانک ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ میں نے غراتے ہوئے
کہا.......... "کیا بک رہا ہے تو، یہ گائے کا پیشاب ہے۔"
"یہ امرت جل ہے، یہ ساری شکتیوں سے زیادہ شکتی مان ہے، اسے پی کر تو امر ہو جائے گا سمجھا
.... یہیں سے تو کالی شکتی کی ابتدا ہوتی ہے، باؤلے اس کا اپمان کر رہا تو..........؟"
"سنو سادھو لعنت بھیجتا ہوں میں تمہاری اس کالی قوت پر لعنت بھیجتا ہوں اس کالے جادو پر، تھوکتا
ہوں اس دولت پر جو مجھ سے میرا ایمان چھین لے، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خبردار اس کے بعد اگر تم نے
اس قسم کی کوئی بدتمیزی مجھ سے کی۔" میں نے اچھل کر اس کے ہاتھوں پر لات ماری اور پیتل کی چمکدار
گڑوی اچھل کر کافی دور جا گری۔ وہ ایک دم خونخوار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی سے اس کا غلیظ تھوک
بھی صاف کر دیا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔
"نہیں سادھو، دنیا کی ہر چیز دے سکتا ہوں اپنے دین کے علاوہ۔ میں اپنے مذہب سے کسی بھی طرح
نہیں ہٹ سکتا میں اپنے دھرم کو کبھی بھی فریب نہیں دے سکتا۔ کیا ہے میرے پاس، زندگی ہی گزارنی
ہے نا گزار لوں گا، غریب رہ کر، محنت مزدوری کر کے۔ سوکھے ٹکڑے کھا کر، لیکن وہ نہیں کروں گا جو تو
کہہ رہا ہے۔ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ ان سونے چاندی کے ٹکڑوں کے عوض تو مجھ سے میرا ایمان
چھیننا چاہتا ہے، لعنت ہے تیری شکل پر، غلطی میری ہی تھی شیطان کے بچے کہ میں دولت کی وجہ سے
تیرے فریب میں آ گیا، اب مجھے یہ دولت نہیں چاہئے۔"
اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں خون اگلنے لگی تھیں اس نے غرائے ہوئے لہجے میں
کہا۔

"دھت تیرے کی۔ سارے کے سارے ایسے ہی کمینے نکلتے ہو تم سارے کے سارے ایسے ہی ہو۔

ایک وہ تھا جس نے جیون ختم کر لیا اپنا آج تک کتوں کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے مگر دھرم شکتی چاہئے دھرم شکتی، کالی شکتی چھوڑ کر دھرم شکتی چاہئے۔ ٹھیک ہے رے ٹھیک ہے۔ دیکھوں گا تم لوگ کب تک مجھے شکست دیتے رہتے ہو، ارے تم ہو ہی کمینے، کسی کا احسان نہیں مانتے۔ میں نے تجھے سوکھے ٹکڑوں کے سنسار سے نکال کر عیش و عشرت کی دنیا میں لانا چاہا مگر، مگر، اب ایسے نہیں۔ اس دن مجھے کچھ نہیں معلوم تھا مسعود بھیا کہ وہ یہ بکواس کس کے بارے میں کر رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہے، وہ تم ہو۔ ”

” یہ کیسے پتہ چلا۔ ؟ “ میں نے پوچھا

” حالات سے .... “

” حالات کیا تھے۔ “

” تھوڑی سی کہانی اور رہ گئی ہے۔ اس سے پتہ چل جائے گا۔ “

” ایں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ “ اکرام چند لمحات خاموش رہا پھر بولا۔ وہ گرجتا برستا رہا۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایک دم ہنس پڑا۔

” واہ رے واہ۔ واہ رے واہ۔ تو نے تو ایک نیا راستہ دکھا دیا مجھے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تجھے ایک نیا روپ دوں اوپر سے مسلمان، اندر سے کچھ اور، پھر جب تو اس پاپی کے سامنے آئے تو وہ آسانی سے تجھ سے دھوکا کھا جائے تیرے ہاتھوں ماروں اسے۔ مگر نہ سہی، تو مسلمان رہ، پکا مسلمان بس میرا ایک کام کرنا ہو گا تجھے۔ “

” میں اب تجھے سمجھ چکا ہوں شیطان، کوئی کام نہیں کروں گا میں تیرا یہاں رکوں گا بھی نہیں۔ “

” کرے گا، کرے گا، کرنا پڑے گا تجھے۔ نہ رک، بھاگ جا.......... ٹھیک ہے بھاگ جا۔ “ وہ فوراً ایک طرف چل پڑا۔ میں نے بھی بستی کی طرف رُخ کیا۔ خود پر لعنت ملامت کر رہا تھا۔ لالچ نے اندھا کر دیا تھا ایمان کھونے جا رہا تھا۔ تھو ہے ایسی دولت پر۔ بستی میں داخل ہو گیا۔ اپنے گھر کی طرف چل پڑا لیکن نہ جانے کیوں سر چکرا رہا تھا۔ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا تھا اور یہ جگہ۔ میرا گھر ہی یہاں موجود نہیں تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ نہ جانے میرا گھر کہاں گیا۔ پاگلوں کی طرح اپنا گھر ڈھونڈنے لگا۔ پھر ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔ ” بھائی صاحب۔ یہ کونسا محلہ ہے۔ “

” گاچھی ٹولہ.......... “

” یہاں میرا گھر تھا۔ “

” کہاں۔ “

” وہ سامنے۔ یہی جگہ ہے۔ برابر میں چچا شمشاد رہتے تھے.......... ! “

” کتنے سال پہلے کی بات ہے۔ “

” سال نہیں، کل، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ “

” اس گھر میں رہتے ہیں پنڈت سدھا شنکر۔ برابر میں لالہ امرناتھ بزاز۔ کوئی بیس سال سے تو ہم یہ رہے ہیں کہیں اور ہو گا تمہارا گھر۔ “ وہ شخص مجھے پاگل سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ آہ میرا گھر کھو گیا تھا، میرے دوست کھو گئے تھے۔ پورے جونا پوری میں کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ دیوان لال کے گھر گیا بھی نہ ملا.......... اس کے گھر میں بھی کوئی اور رہتا تھا خون کے آنسو رویا مسعود بھیا جونا پوری میں پیدا ہوا تھا یہیں پلا بڑھا تھا مگر کوئی جاننے والا نہیں تھا وہاں۔ بہن بھی کھو گئی تھی میری، سب کچھ گم ہو گیا تھا۔ مہینہ گزر گیا پورا، حلیہ بدل گیا ایک دن اس ظالم سادھو کا خیال آیا۔ شمشان گھاٹ چل پڑا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

” آ گئے مکتی میاں۔ “

” میرا گھر کہاں گیا۔ ؟ “ میں نے پوچھا۔

” ہمیں کیا معلوم .... ؟ “

” تجھے معلوم ہے، تجھے سب کچھ معلوم ہے ذلیل۔ “

” اوہو۔ ابھی تک بگڑے ہوئے ہو، ہم تو سمجھے تھے کہ دماغ ٹھکانے آ گیا۔ ہم سے سمجھوتہ کرنے آئے ہو۔ “

” تو نے اپنے مکروہ علم سے میرا گھر گم کر دیا ہے۔ مجھے بتا میرا گھر کہاں ہے۔ “

” چلو ٹھیک ہے ہم نے ایسا کر دیا ہے کیا کر لو گے تم ہمارا۔ “

” میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ “ میں نے غیظ کے عالم میں کہا اور وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا ” ٹھیک ہے پہلے تم ہمیں جان سے مار دو۔ پھر تم سے بات کریں گے۔ “

” میری بہن کا پتا تو بتا دے ظالم، کچھ تو بتا دے مجھے۔ “

” سب کچھ بتا دیں گے جو کہو گے کریں گے تمہارے لئے۔ مگر ابھی نہیں اس وقت جب تم ہمارا کام کر دو گے۔ “

” کیا کام ہے تمہارا۔ “

” ایسے نہیں بتائیں گے۔ جب تک تم من سے تیار نہ ہو جاؤ گے اور اب تو تمہیں سمجھنا پڑے گا۔ ارے کچھ کئے بنا سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے ہیں وہ کمینہ بھی ایسے ہی آیا تھا گھوڑے دوڑانے۔ ریس جیتنے۔ ہڑ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ سن رے.......... تجھے ایسے سارے کام کرنے پڑیں گے جو تیرے دھرم کے خلاف ہوں چھوڑوں گا نہیں کیا سمجھتا ہے تو مجھے۔ بھوریا چرن ہے میرا نام سمجھا ہوں میں۔ تجھے سب کچھ کرنا پڑے گا ہمارے لئے ورنہ اس بار وہ کریں گے ہم، جو پہلے نہ کیا تھا، وہ بھی تیری طرح تھا بالکل تیری طرح۔ ہم نے کہا پیر پھاگن دوارے پہنچا دے پر دھرم مہاتما ابھر گیا تھا بنا دیا سسرے کو ہم نے بھی۔ یہی حشر تیرا ہو گا۔ “ اور مسعود بھیا اس نے اس وقت مجھے تمہارے بارے میں تفصیل بتائی پھر بولا۔

” پہلے ہم نے سوچا تھا کہ تجھے مسلمان بنائے رکھیں اور کالی شکتی سے ماریں پھر تو مسلمان بن کر اسے

مارے۔ لوہے کو لوہا کاٹے۔ مگر تو نے ایک نیا راستہ دکھا دیا ہمیں۔ جو کام وہ نہ کرسکا وہ تو کر سکے گا کیونکہ تو اماوس کی رات کو پیروں کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔ ”

” دیکھ بھوریا چرن میرا پیچھا چھوڑ دے۔ کوئی بھی مسلمان، اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، غلیظ کام نہیں کرے گا۔ کالا جادو کفر ہے۔ ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں کسی اور سے اپنا کام کرالے میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔ ”

” ارے چل پاجی۔ تو ہمارا کام نہیں کرے گا تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے تیرے کام آنے کی جو ہو یہاں سے۔ ”

” مجھے میرا گھر بتادے بھوریا چرن۔ ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا تجھے۔ ” میں نے زچ ہو کر روتے ہوئے کہا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس پر کھینچ مارا۔ مگر پتھر اس کے بدن سے گزر کر دور جا گرا۔ پھر جتنے پتھر آس پاس پڑے تھے میں اٹھا اٹھا کر اس پر مارنے لگا مگر سارے پتھر اس میں سے گزر گئے اور وہ ہنستا رہا۔

” اب ہمارا کھیل دیکھ۔ ” وہ بولا۔ ” یہ ہے تیرا گھر............ ہے نا............ ” اس نے کہا اور منظر بدل گیا۔ میں نے اپنا گھر دیکھا۔ اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ گھر کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ” اور یہ رہے ہم............ ” اس نے کہا۔ میں نے بھوریا چرن کو دیکھا جو اچانک میری بہن کے سامنے پہنچا تھا اور وہ اسے دیکھ کر دہشت سے کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر میں نے بھوریا چرن کو............ میں نے مسعود بھیا میں نے دیکھا کہ اس نے میری بہن کو دبوچ کر اس کا منہ کھولا اور اس کی زبان چھری سے کاٹ دی۔ اس نے مزاحمت کی تو............ اس نے چھری اس کے ہاتھوں پر ماری اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں۔ بہن کے منہ سے ”اکرام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا کٹی ہوئی انگلیاں کٹی ہوئی زبان۔ میں ایسی ایک شخصیت کا شناسا تھا۔

صرف شناسا ہی نہیں تھا بلکہ زندگی سے نفرت کرنے کے باوجود............ کائنات کی ہر خوشی سے محروم ہونے کے باوجود، وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ وہ ہر سانس کے ساتھ میرے دل میں کسکتی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائی سے جدائی ہی میرے لئے کیا کم تھی کہ وہ میری زندگی میں ایک دکھ بن گئی تھی۔ مجھے متنبہ کیا گیا تھا۔ مجھے اس کی طرف بڑھنے سے روکا گیا تھا۔ مجھے احساس دلایا گیا کہ خود کو سنبھالوں اور میں نے سینے پر پتھر رکھا تھا لیکن، لیکن مشکل لگ رہا تھا۔ آہ بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ اکرام کے منہ سے یہ سن کر ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

اکرام نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ ” یہ سب کچھ دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مکروہ آواز میں ہنس پڑا۔

” نراش ہو گئے تھے ہم مگر تو نے ہمارے من میں نئی جوت جگا دی ہے کرم بھنڈار سے ایک موقع مل گیا ہے کھنڈولا بننے کا، ایک پاپی یہ کام کر سکتا ہے۔ ”

” بھوریا چرن۔ ” میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

” بول، بول، کیا کہتا ہے۔ ”

” جونا پوری سے میرا گھر کہاں گیا۔ ؟ ”

” گھر کہاں جا سکتا ہے باؤلے بس تجھے نہیں ملے گا چاہے جیون بھر کوشش کرتا رہے۔ ”

” اور وہ جو میں نے دیکھا۔ ”

” کیسا لگا............ ؟ ” وہ ہنس کر بولا۔

” کیا وہ سچ تھا۔ ؟ ”

” کیا سچ ہے کیا جھوٹ، ایسے تو نہیں پتہ لگتا بالک ہے، سچ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اگر ہے تو ” نہیں ” میں بدل سکتا ہے اور اگر نہیں ہے تو ” ہے ” میں ڈھل سکتا ہے جیسے تو جہاں تھا وہاں نہیں ہے اور جہاں نہیں تھا وہاں ہے اصل بات یہ ہے کہ کیا لینا ہے اور کیا دینا ہے۔ ”

” میں تیری باتیں سمجھ نہیں سکتا بھوریا چرن۔ ”

” ہائے یہی تو رونا ہے۔ بھاگ پھوٹے تو کس نسل کے ہاتھوں میں مگر کوئی کیا کرے، کالی شکتی اپنا دھرم کھونے سے نہیں مل جاتی، کھنڈولا بننے کیلئے کسی مہان دھرمی کے دوار بھرشٹ کرنے پڑتے ہیں۔ کسی کا دھرم چھیننا پڑتا ہے خود یہ کام کر سکتے تو ہزار بار کر لیتے۔ پاپیو یہ کام تمہارا ہے ارے سنسار میں کروڑوں ایسے ہیں جو ٹکے ٹکے کیلئے دھرم بیچتے پھرتے ہیں مگر مجھے ملے تو سسرے سب ایک جیسے۔ ”

” میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا بھوریا چرن۔ ”

” اپنے چاروں طرف دیکھ۔ ”

” کیا ہے؟ ” میں حیرت سے بولا۔

” ارے دیکھ تو۔ کھوپڑی مت گھما ہماری۔ ” وہ جھلا کر بولا اور میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ نہ شمشان گھاٹ تھا اور نہ وہ جگہ جہاں میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ کوئی اور ہی جگہ تھی۔ چاروں طرف ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے۔ بھوری بھوری چٹانیں نظر آرہی تھیں۔ میرا سر چکرا گیا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا اور میں بیٹھ گیا۔ بھوریا چرن پھر ہنسنے لگا تھا اس نے کہا۔ ” اب یقین آگیا ہو گا تجھے جو ہے وہ نہیں میں بدل سکتا ہے اور جو نہیں ہے وہ ہو سکتا ہے تو نہ مان ہماری اور نتیجہ دیکھتا رہ۔ ”

” میری جان بخش دے بھوریا چرن۔ ”

” بڑی آسان بات ہے۔ ”

” کیا؟ ”

” ہمارا ایک کام کر دے سچے من سے، جو چاہے مانگ لے ہم سے۔ راج کھنوتی کی سوگند کھا کر وچن دیتے ہیں جو مانگے گا سو دیں گے۔ ”

” میں گائے کا پیشاب نہیں پیوں گا۔ ”

” کون پاپی کہتا ہے۔ ”

"میں نماز پڑھ کر کسی کو دھوکا نہیں دوں گا۔"

"سچے من سے اپنے دھرم کے مطابق عبادت کر۔ ہم تجھے نہ روکیں گے۔"

"پھر کیا کام کرنا ہوگا مجھے۔"

"اپنے دھرم کی سوگند کھا کر کہہ کہ ان دونوں کاموں کے علاوہ ہم جو کہیں گے کردے گا بول کھائے گا سوگند۔؟"

"میں کوئی قسم نہیں کھا سکتا تو جادوگر ہے مجھ سے کوئی ایسا ہی کام کرائے گا جو ایمان کے خلاف ہوگا۔" میں نے کہا اور بھوریا چرن غصے سے سرخ ہوگیا کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"چل آگے بڑھ، بعد میں باتیں ہوں گی۔" مسعود بھیا بری طرح پھنس گیا تھا اس کے جال میں۔ اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کہ اس کے کہنے سے آگے بڑھوں۔ نہ جانے کونسی جگہ تھی۔ میں اس سے بہت خوفزدہ تھا۔ سورج ڈھلے تک وہ چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ رک گیا۔ کچھ دیر کیلئے میری نظروں سے غائب ہوگیا۔ پھر واپس آگیا "بھوکا ہے؟"

"نہیں۔"

"مرتا رہ مجھے کیا۔ بھوک لگے تو مجھے بتا دینا۔"

"بھوریا چرن، مجھے میری بہن کے بارے میں بتادے۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ کیا تھا۔"

"نوکر لگا ہوں تیرے پتا کا، یہ کردے، وہ کردے، اور تو میرا ایک کام بھی نہ کرے۔"

"آخر کیا کام ہے تیرا مجھے بتا تو سہی۔"

"دھرم کی سوگند کھا، تب بتاؤں گا۔"

"نہیں بھوریا چرن۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کام پوچھے بغیر میں قسم نہیں کھاؤں گا۔"

وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور بولا۔ "صبح کو ہم یہاں سے چلیں گے۔ آگے ایک بستی ہے۔ شاہ گڑھی وہاں ملنگ شاہ کا مزار ہے تجھے ایک چیز ملنگ شاہ کے دوار پہنچانی ہے۔"

شاہ گڑھی کے بابا ملنگ شاہ کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا تھا بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ بڑی کراماتیں ان کے نام سے منسوب تھیں۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا چیز؟ وہ۔؟"

"ارے بس، ہمارا دھرم دوسرا ہے، ان کا دوسرا۔ مگر ہم بھی انہیں کچھ بھینٹ دینا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر۔؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بری بات ہے بالکا، انسان کے اندر اتنی کھوج نہیں ہونی چاہئے ہر بات میں کیا، پھر کیوں، ارے تیرا فائدہ ہی ہوگا، ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارا کام کردیا تو سمجھ لے کہ پار لگ گیا، ہم گندے ہیں تیرا دھرم اور ہے ان کا اور ہم گندے لوگ ایسی جگہ کب جاسکتے ہیں، تو مسلمان ہے، تیرے لئے یہ کام مشکل نہیں ہوگا

ہری منو کامنا پوری ہوجائے گی.........."

"وہ کیا چیز ہے بھوریا چرن اور مجھے کیا کرنا ہوگا، میں نے کسی قدر آمادہ ہوتے ہوئے کہا اور وہ بھی ایک دم نرم ہوگیا.........

"ابھی چلیں بالکا، تو کہے تو ابھی چلیں، تو تھکا ہوا نہ ہو تو ایسا کریو ہم شاہ گڑھی چلتے ہیں، تو وہاں سے پہلے پیٹ پوجا کریو اور پھر ہم تجھے بتادیں گے وہ جگہ جہاں تجھے جانا ہے اور جو کرنا ہے۔ ارے تو تیار تو ہو اور پھر دیکھ تماشا۔"

میں نے گردن جھکائی اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے کہا......... "ٹھیک ہے اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن اب اس وقت شاہ گڑھی، یہاں سے ہے کتنی دور......؟"

جواب میں بھوریا چرن ہنسنے لگا۔ پھر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے میری کمر پہ ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے دھکا دے دیا۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی، گرتے گرتے بچا۔ زمین پر ہاتھ ٹکا دیئے تھے ورنہ چہرے پر چوٹ لگ جاتی۔ میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا اس حرکت کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ اس نے خود ہی میرے بازو کو سہارا دے کر مجھے کھڑا کردیا اور ہنستا ہوا بولا۔

"لے آگیا تو شاہ گڑھی، بس اتنی سی بات تھی، ایسے ہی پریشان ہو رہا تھا ارے باؤلے تیرے سارے کام ایسے ہی پورے ہوجائیں گے پلک بھی نہ جھپک پائے گا اور دیکھے گا کہ جو تیرے دل میں آیا وہ پورا ہوگیا........."

میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور سر چکرا گیا۔ کہاں تو ایک ایسا ویران علاقہ تھا جہاں کوئی انسانی وجود ہی نہیں تھا اور کہاں اب میرے چاروں سمت آبادی نظر آرہی تھی۔

اس بھیانک جادوگر کی بھیانک جادوگری کا تو پہلے ہی قائل ہوگیا تھا، جانتا تھا کہ بری طرح اس کے جال میں جکڑ چکا ہوں۔ بہت دور سے شاہ گڑھی کے شاہ بابا کا مزار نظر آرہا تھا۔ یہاں اچھے خاصے لوگ ہوا کرتے تھے، کبھی آیا تو نہیں تھا اس مزار شریف پر۔ لیکن باپ دادا سے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تو۔ بھوریا چرن نے کہا.........

"جیب میں ہاتھ ڈال پیسے موجود ہیں تیری جیب میں۔ ہم دیں گے تو برا مانے گا، جا سامنے دکانیں بنی ہوئی ہیں کھا پی لے۔" بھوک واقعی لگ رہی تھی اور ذہنی طور پر بھوریا چرن سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوگیا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو واقعی اچھے خاصے پیسے پڑے ہوئے نظر آئے......... میں نانبائی کی دکان پر پہنچ گیا۔ سالن روٹی خرید کر کھائی، پانی پیا، خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے بعد وہاں سے باہر نکلا تو بھوریا چرن میرے ساتھ ساتھ چل پڑا، ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر اس نے مجھے رکنے کیلئے کہا اور پھر بولا۔

"دیکھ وہ جو سامنے پیڑ نظر آرہا ہے اس کے پیچھے لکڑی کا ایک صندوقچہ رکھا ہوا ہے، صندوقچہ کے ... میں پتلا رکھا ہوا ہے۔ اس پتلے کو چپ چاپ شاہ بابا کے مزار کے پیچھے جو بھی ایسی جگہ ہو، جہاں کوئی نہ جاسکے رکھ کر چلا آ۔ بس اتنا سا کام ہے تیرا اور بات ختم۔"

"پتلا کیسا ہے.........؟"

"اب دیکھ تو نے پھر وہ باتیں شروع کر دیں جس سے دماغ خراب ہو جائے۔ باؤلے یہ کام کر کے آ۔ پھر بتائیں گے تجھے کہ پتلا کیسا تھا اور ہم نے ملنگ بابا کو کیا بھینٹ دی ہے............" بھوریا چرن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے اشارے پر میں درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو واقعی لکڑی کا ایک صندوقچہ رکھا ہوا تھا، اسے کھولا تو اس میں ربڑ جیسا ایک پتلا رکھا ہوا تھا۔ چہرے کے قریب کر کے دیکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں یہ پتلا بالکل بھوریا چرن کی شکل کا تھا۔ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا میں نے چند لمحات سوچا، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پتلا لے کر آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے پیروں میں کانٹے چبھ رہے ہوں، جیسے جیسے مزار اقدس کی جانب بڑھتا جا رہا تھا نجانے کیسی کیسی کیفیتوں کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی، کوئی ایسا احساس نہیں ہوا تھا جو الفاظ کی شکل اختیار کر سکتا۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی انجانی قوت مجھے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، تھوڑی دیر تک میں ان کیفیتوں کو برداشت کرتا رہا، لیکن پھر یہ چیز عروج کو پہنچ گئی، تو میں رک گیا، میرا دل الٹ رہا تھا اور مسلسل یہ آوازیں آ رہی تھیں کہ مجھے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، یہ ایک ناپاک وجود ہے، مزاروں پر تو پھول چڑھائے جاتے ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں عقیدت کے آنسو نچھاور کئے جاتے ہیں۔ کسی انسانی پتلے کو مجھے مزار شریف تک نہیں پہنچانا چاہئے۔ یہ بت پرستی ہے۔ یہ گناہ عظیم ہے۔ میں نے رک کر صندوقچی کھولی اور عجیب سی نظروں سے پتلے کو دیکھنے لگا۔ تب ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صندوقچی میں پتلا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنی ننھی ننھی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر اس کی غرائی ہوئی باریک سی آواز سنائی دی۔

"کتے کے پلے جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر، یہاں تک آ گیا ہے تو اب بے کار باتوں میں نہ پھنس، اب آگے بڑھ پاپی کیوں بہکاووں میں آ رہا ہے۔" وہ بول رہا تھا اور میرا دل خوف و دہشت سے کانپ رہا تھا اس کا مطلب ہے کہ بھوریا چرن خود اس پتلے کی شکل میں موجود ہے۔ جب میں درخت کے پیچھے پہنچا تھا اور وہاں سے باہر نکلا تو وہ موجود نہیں تھا، یقینی طور پر وہ اس صندوقچی میں یہ شکل اختیار کر گیا تھا۔ میرے دل نے آخری فیصلہ کر لیا اور میں نے صندوقچی کو پوری قوت سے دور پھینک دیا۔ دل ہی دل میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ غلیظ کام میں نہیں کروں گا، کسی مزار مقدس کی بے حرمتی کسی مسلمان کے ہاتھوں ممکن نہیں ہے اور میں اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان ہوں، میرے اس عمل کا کوئی رد عمل نہیں ہوا، صندوقچی دور پڑی تھی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ بھوریا چرن کا کیا ہوا۔

میں وہاں سے تیزی سے بھاگا اور بھاگتا رہا، نجانے کہاں کہاں نجانے کب تک۔

صبح ہو گئی، پھر دوپہر، تب ایک آبادی نظر آئی اور میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ آبادی میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھٹنڈہ ہے۔ گھنی آبادی تھی مگر میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو میری مدد کر سکے۔ مگر بدقسمتی نے میرا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی نظر آیا اور میں نے اسے آواز دی۔ وہ رک گیا تھا۔

"بھائی صاحب، میری مدد کریں، میں ایک مجبور مسافر ہوں بھائی صاحب۔" اس شخص نے ناگواری سے مجھے دیکھا اور پھر چونک سا پڑا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا تھا۔ اچانک وہ نرم لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے، کیا پریشانی ہے تجھے۔"

"مجھے کوئی ٹھکانہ چاہئے، کچھ پیسے چاہئیں، میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں ہے تیرا گھر.........؟" میں نے اسے اپنے بارے میں مختصر الفاظ میں بتایا لیکن بھوریا چرن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ہمدردی سے سنتا رہا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔

"آ میرے ساتھ۔" میں اس کے ساتھ چل پڑا لیکن آبادی میں جانے کے بجائے وہ آبادی کے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا تھا میں کسی قدر گھبرا گیا۔

"سنئے باباجی۔"

"کیا ہے؟"

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"مہاوتی کا نام سنا ہے کبھی تو نے؟"

"نہیں۔"

"رانی مہاوتی کا نام نہیں سنا۔؟"

"افسوس نہیں۔"

"بہت بڑی سرکار ہے۔ ان کے پاس لے جا رہا ہوں، تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"خاموش رہ، تیری تقدیر اچھی ہے کہ مجھے مل گیا۔ رانی تیری ساری پریشانیاں دور کر دے گی۔ بڑی مہان بڑی نرم دل ہے وہ۔" بوڑھے نے کہا۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر وہ مجھے لئے ہوئے ایک عجیب سی جگہ پہنچ گیا۔ یہاں بدنما اور بدصورت پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ سوراخ بھی نظر آ رہے تھے یہ پہاڑی غار تھے اور ایک پہاڑی غار کے دہانے سے وہ اندر داخل ہو گیا۔ مجھے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ تو ایک عظیم الشان غار تھا۔ جو جگہ باہر سے بس ایک ٹیلہ نظر آتی تھی اندر سے اتنی کشادہ تھی کہ یقین نہ آئے۔ مجھے ایک نگاہ میں یہ بھی کوئی جادو نگری ہی معلوم ہوئی۔ غار کے بیچوں بیچ طلسم کی دیوی کالی دیوی کا ایک بھیانک مجسمہ ایستادہ تھا اور اطراف کا ماحول بے حد خوفناک تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"باباصاحب......... یہ کونسی جگہ ہے۔"

"شکتی کنڈ.........!" بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں صاف شیطنت جھلک رہی تھی۔

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں ؟"

"یہ عجیب سی جگہ ہے۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"کالی کنڈ ہے یہ باؤلے۔ یہاں مکتی ملتی ہے۔ ہر پریشانی سے مکتی مل جاتی ہے یہاں، یہ مہاوتی کا نواس ہے۔"

"مگر میرا تو تھوڑا سا کام ہے۔ میں.......... میں یہاں نہیں رک سکتا۔"

"مہاوتی سے نہیں ملے گا۔ ؟"

"کہاں ہے مہاوتی۔"

"وہ ہے رانیوں کی رانی مہارانی مہاوتی۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک بڑے سے پتھر کے چبوترے پر میں نے ایک عجیب اور خوفناک چیز دیکھی، تم نے کالا چیتا دیکھا ہے مسعود بھیا۔ ایک نگاہ میں مجھے ایسا ہی لگا جیسے کوئی کالا چیتا بیٹھا ہو۔ مگر وہ چیتا نہیں انسان تھا۔ ایک عورت، کالی بھجنگ لال لال خوفناک آنکھوں والی جو اسی انداز میں پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے بلی بیٹھتی ہے۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔

"میں جانا چاہتا ہوں۔" میں نے وحشت میں کہا۔ اور غار کے دہانے کی طرف چھلانگ لگادی۔ مگر دہانہ غائب ہو چکا تھا۔ وہاں اب سپاٹ پہاڑی دیوار نظر آرہی تھی۔ بوڑھے شیطان کا مکروہ قہقہہ غار میں گونج اٹھا۔ وہ ہنستا ہوا بولا۔

"یہ کالی کنڈ ہے باؤلے۔ یہاں لوگ آتے ہیں، جاتے نہیں، تو بھی نہیں جائے گا!"

"مجھے جانے دو بابا جی۔ میں بہت مظلوم ہوں۔ میں پہلے ہی بہت ستایا ہوا ہوں۔"

"اسی لئے تو میں تجھے مکتی نواس لایا ہوں۔ یہاں ساری مصیبتوں سے مکتی مل جاتی ہے!"

اس وقت ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "کیا بات ہے شمبھو ناتھ.......... کون ہے یہ..........!" میری گردن گھوم گئی۔ شاہانہ جھلملاتے ہوئے لباس میں مجھے ایک حسین اور بلند و بالا قامت کی عورت نظر آئی جو صورت سے ہی رانی معلوم ہوتی تھی۔

"تیرے لئے ایک تحفہ لایا ہوں مہاوتی۔"

"کون ہے یہ..........؟"

"اماوس کی رات کا پائل۔ مہا کالی کیلئے تیری بھینٹ۔" بوڑھا مسکراتا ہوا بولا۔ میری نگاہ اس چبوترے کی طرف اٹھ گئی جہاں وہ کالی بلی بیٹھی ہوئی تھی اب وہاں کچھ نہیں تھا اور چبوترہ خالی پڑا ہوا تھا۔ بوڑھے کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ مگر عورت کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ وہ بولی۔ "ارے ہاں شمبھو جی۔ کہتے تو ٹھیک ہو.......... کہاں سے مل گیا یہ..........؟"

"بس مل گیا، ہم نے کھوجا ہے۔" بوڑھا بولا۔

"کون ہے یہ؟"

"مصیبتوں کا مارا ہے بے چارا۔"

"ساری مصیبتوں سے نجات مل جائے گی اسے۔ بالکل نجات مل جائے گی۔" وہ بھی ہنس کر عجیب ماحول تھا وحشت سے دل بند ہوا جارہا تھا۔ پاؤں لرز رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ دونوں کی ہنسی میرے کانوں میں گونجی تھی۔ اور پھر وہ دونوں غائب ہوگئے۔ آہ مسعود بھیا۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا تھا باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جب تک بدن میں جان رہی راستہ تلاش کرتا رہا پھر تھک کر بیٹھ گیا۔ غشی سی طاری ہوگئی تھی۔ وقت کا کوئی احساس نہ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں مجھے نظر آئے کچھ تیاریاں کر رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو وہاں بھوریا چرن موجود تھا۔ عورت کے اور اس کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں۔ بھوریا چرن عورت کو بتا رہا تھا کہ میں اس کا مفرور قیدی ہوں۔ پھر وہ مجھے اس غار سے نکال لایا۔ اور میں تیورایا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ کہانی بے حد طویل ہے۔ مسعود بھیا۔ وہ مجھے کئی مزاروں پر لے گیا۔ اس نے مجھے اس مکروہ عمل پر مجبور کیا اب اس نے ایک اور اذیت دینا شروع کر دی تھی مجھے۔ میں کہیں بھی ہوتا۔ جونہی سورج چھپتا نہ جانے کہاں سے پیلے رنگ کی بے شمار مکڑیاں آجاتیں اور میرے بدن سے چمٹ جاتیں۔ آہ ان کے زہریلے ڈنک میرے بدن میں آگ روشن کر دیتے۔ وہ مجھے کاٹتیں میرا خون چوستیں اور میں اذیت سے دیوانہ ہو جاتا۔ بھوریا چرن کہتا۔

"سوگند کھا کتے، سوگند کھا، میرا کام کرے گا!" مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا وہ مجھے لئے مارا مارا پھرتا رہا اور ایک دن اس اذیت کے سامنے میں نے سر جھکا دیا میں نے کہا۔

"بھوریا چرن، میں تمہارا کام کر دوں گا۔ مگر میں کیا کروں، میں نے اس وقت مزار پاک کی طرف قدم بڑھائے تھے تو میرا دل الٹنے لگا تھا۔

"سوگند کھالے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور میں نے قسم کھالی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اب میں اس کا کام کر دوں گا۔"

"ایک مسلمان کا وعدہ ہے یہ؟" بھوریا چرن نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"پگلے.......... بلاوجہ اتنی مصیبت اٹھائی..........!" وہ نرمی سے بولا۔

"اب بتا میں کیا کروں؟"

"پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کر، دیکھ کتنا کمزور ہوگیا ہے۔ ایک بار پھر شنکھا یقین دلاتا ہے کہ تجھے مہان بنا دے گا۔ سنسار میں جو خواہش کرے گا وہ پوری ہو جائے گی۔"

"میری بہن مل جائے گی مجھے..........؟"

"راج کرے گی وہ۔ راج.......... بادشاہوں کی بیٹیوں کی طرح بیاہ کرنا اس کا" اور اس کے بعد مسعود بھیا۔ اس نے میرا حلیہ بدل دیا۔ خوب عیش کرائے مجھے۔ پھر وہ مجھے لے کر یہاں آگیا۔ یہاں وعدے کے مطابق اس کا منحوس پتلا مزار پاک پر پہنچانا تھا۔ آہ، میں بالکل بے بس تھا اس کے سامنے۔ وہ خونخوار مکڑیاں مجھ سے میرا حوصلہ میرا صبر چھین چکی تھیں، وہ اتنا خوفزدہ کر چکی تھیں مجھے کہ

راتوں کو خوابوں میں ان کے تصور سے میں دہشت زدہ ہو جاتا تھا اور اس کے بعد مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ اتنا ہی سہم گیا تھا میں ان مکڑیوں سے اور اس کی ہر بات ماننے پر آمادہ تھا۔ غرض یہ کہ اب میں اس کے کام کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اس نے مجھ پر عنایتوں کی بارش کر دی تھی پھر یہاں پہنچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑا آرام کروں عرس ہو رہا ہے یہاں ان بزرگ کا۔ اس لئے بہت زیادہ رش رہتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ عرس ختم ہو جائے، زائرین چلے جائیں تو اس کے بعد اپنا کام سرانجام دوں ...."

میں تو اب اس کی اس خواہش پر آمادہ ہو ہی گیا تھا چنانچہ اس پر بھی میں نے اعتراض نہ کیا اور وقت گزرتا رہا .... دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر مجبوریاں دامن گیر تھیں۔ اگر دل میں بھی خیال لاتا کہ اس کی خواہش پر عمل نہیں کروں گا، تو مکڑیاں آنکھوں کے سامنے کلبلانے لگتی تھیں۔ اچانک ہی ایک دن بھوریا چرن میرے پاس بڑا سہما سہما سا آیا اور کہنے لگا۔

"سن رے تجھے ایک اور کام بھی کرنا ہے مجبوری ہو گئی ہے یہ مت سمجھنا کہ میں کام پر کام تیرے ذمے ڈالے جا رہا ہوں۔ مجبوری ہو گئی ہے۔"

"کیا بھوریا چرن میں نے سوال کیا ....؟"

"وہ پاپی یہاں بھی آ گیا ہے، وہ کمینہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے .... اور .... اور ...." ہمارے راستے ضرور روکے گا۔ ضرور روکے گا وہ ہمارے راستے ...."

"کون ہے وہ ؟" میں نے حیرت سے سوال کیا .... بھوریا چرن کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا منحوس شیطان کسی سے خوفزدہ بھی ہو سکتا ہے اس نے جلا کے کہا۔ "ارے وہی پاپی .... مسعود .... مسعود کا بچہ ...."

"وہ کون ہے ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"کہہ تو دیا دشمن ہے میرا۔ دشمن نمبر ایک ...."

"مجھے کیا کام کرنا ہے .... ؟"

"تو اس کو مار دے گا، یہ کام تو کر سکتا ہے، مار دے اس کو سمجھا۔ مار دے اسے ...."

"مگر بھوریا چرن .... ؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ جو میں نے کہا وہی کرنا ہے تجھے۔ مار ڈال اسے، لے یہ چھرا لے لے .... میں تجھے بتا دوں گا کہ وہ کون ہے، رات کو وہ جہاں بھی سوئے، یہ چھرا اس کے سینے میں گھونپ دیجیو اور سن اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو میں، میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتا رے .... دیکھ میں گھبرایا ہوا ہوں، جھلایا ہوا ہوں، اور مجبوری میں یہ بات کہہ رہا ہوں تجھ سے .... مارنا ہے اسے ہر قیمت پر مارنا ہے اسے سمجھا ...."

"ٹھیک ہے بھوریا چرن، جب میں ایک گندا کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں تو دوسرے گندے کام پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ارے کہہ لے جو تیرا من چاہے۔ گندا کہہ لے، اگھور کہہ لے مگر اسکے بعد تجھے جو کچھ مل جائے

گا جیون بھر یاد کرے گا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"ہم جیون کی بات نہیں کرتے بھوریا چرن۔ ہماری اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ چند لمحاتی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہم تو عاقبت کی زندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ یہ زندگی اگر مجھے عیش و عشرت دے بھی دے گی تو ہے ہی کتنی نہ اپنی مرضی سے آیا نہ اپنی مرضی سے جاؤں گا .... لیکن اپنی عاقبت خراب کر جاؤں گا یہاں رہ کر .... خیر اگر تقدیر میں یہی لکھا ہے تو یہی سہی۔"

"زیادہ عالموں کی سی بات نہ کر .... عالموں کا کام عالموں پر چھوڑ دے۔ سنسار میں سب ہی اپنا من پسند جیون گزار رہے ہیں تو بہت مہان بن رہا ہے ارے جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کر ...." اور مسعود بھیا اسی رات اس نے آپ پر اس چھرے سے حملہ کیا۔ میرے دل میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ میرا دل رو رہا تھا .... مگر خوف نے مجھے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا اور میں اس گناہ کا مرتکب ہوا .... مگر ڈرا ہوا تھا دوسرا وار نہیں کر سکا آپ پر .... اور اللہ کے فضل و کرم سے آپ زندہ بچ گئے۔ اس بات پر وہ مجھ سے بہت ناراض ہوا تھا .... مگر یہ بھی جانتا تھا کہ میرا قصور نہیں ہے پھر اس کے بعد سے وہ مسلسل گھبرایا ہوا ہی رہا۔ کبھی کچھ کہتا تھا کبھی کچھ۔ مجھے بھی آپ سے خوفزدہ کرتا رہتا تھا۔ کہتا تھا آپ بہت خطرناک ہیں۔ پھر وہ دوسرا مرحلہ آیا آپ بچ گئے اور وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ خود وہ آپ کے قریب نہیں آتا تھا۔ بالآخر اس نے کہا کہ اب میں آپ کا خیال چھوڑ دوں اور اس کا کام کر دوں چنانچہ یہ سب کچھ ہوا۔ یہ سب کچھ ہو گیا۔ آہ۔ یہ میری کہانی مسعود بھائی یہ میری کہانی ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مجسم آنسو تھا۔ بہت تھوڑا سا فرق تھا اس کی اور میری داستان میں .... ہم دونوں ایک ہی شیطان کے شکار تھے۔ مجھ سے زیادہ اس کا درد اور کون محسوس کر سکتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو اکرام ....؟"

"کیا بتاؤں مسعود بھائی۔ کیا کہوں۔"

"تمہاری بہن کا کیا نام تھا ....؟"

"ثریا!" اس نے جواب دیا۔ اور میرے دل میں پھر کسک ہونے لگی۔ میرا خیال درست ہی نکلا تھا۔ ثریا ہی تھی اور اس کتے بھوریا چرن نے اس کی زبان کاٹ دی تھی۔

"تمہارے دل میں کوئی خیال تو ہو گا اکرام ....!"

"میری کہانی سن لی ہے آپ نے مسعود بھائی۔ بہن کے سوا اور کیا ہے میری زندگی میں، مگر میرا گھر ہی کھو گیا ہے۔"

"بہن کو تلاش کرنا چاہتے ہو۔ ؟"

"ہاں!"

"اس کے بعد کیا کرو گے ....؟"

"اللہ جانے .... مگر کیا وہ مل سکتی ہے ....؟"

"مگر بھوریا چرن ...."

"وہ کچھ نہیں ہے اکرام ...... شیطان کو ایک حد تک قوتیں دی گئی ہیں اس سے آگے وہ کچھ نہ ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

"آہ ...... خدا مجھے اس سے نجات دے دے۔ آہ میری بہن مجھے مل جائے بس اس کے مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

"انشاء اللہ۔ ایسا ہو جائے گا!"

"مسعود بھیا۔ ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"آپ کون ہیں؟"

"تمہیں میرا نام معلوم ہے۔"

"وہ تو ہے مگر .... کیا آپ اس کے دشمن ہیں۔"

"ہاں کائنات میں مجھے صرف اس سے دشمنی ہے اور تم دیکھ لینا اس کا خاتمہ میرے ہی ہاتھوں ہو گا۔"

"آپ کی اس سے دشمنی کیوں ہوئی؟"

"وہ کافر ہے۔ کالے جادو کا ماہر ہے۔ میں اللہ کے فضل سے مسلمان ہوں اور اس کا شیطانی طلسم ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ عالم ہیں ....؟"

"نہیں اکرام۔ جسے علم مل جائے اس سے زیادہ خوش نصیب اس کائنات میں اور کون ہو سکتا ہے۔ بس مجھے کچھ سہارے حاصل ہیں انہی پر چل رہا ہوں۔"

"وہ .... وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ بہت ڈرتا ہے وہ آپ سے۔ آپ کے سائے سے بھی بھاگتا ہے مگر اب وہ میری تاک میں رہے گا۔ مجھے نہیں چھوڑے گا وہ۔ آپ کب تک مجھے اس سے بچائیں گے۔"

"پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں اکرام۔ تحفظ کرنیوالی ذات اللہ کی ہے۔ وہی سب کا محافظ ہے۔ انشاء اللہ وہ تمہیں اس کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا دنیا ایک شیطان کے وجود سے پاک رہے گی۔ نماز پڑھتے ہو ....؟"

"نہیں ...." اس نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔

"آج سے شروع کر دو۔ دن میں پانچ مرتبہ تم اللہ کے حضور حاضری دو گے اور اس شیطان کو اس کا احساس رہے گا .... پھر وہ تمہارے قریب آنے سے کترائے گا .....!"

"مجھے آپ کی رہنمائی چاہئے۔"

"اللہ تمہاری رہنمائی کرے ....!" میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے آرام کرنے کیلئے

مگر اکرام خوف سے ساری رات نہیں سویا تھا۔ چار بجے میں اسے ساتھ لے کر احاطۂ مزار

رتی ....

خل ہوا۔ وہاں حمام بنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے غسل کرنے کیلئے کہا۔ غسل سے فراغت ہوئی تھی کہ فجر کی اذان ہوئی اور اس کے بعد وہاں موجود نمازی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے ہم دونوں بھی صف شامل ہو گئے تھے۔ نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں اسے ساتھ لے کر مزار شریف سے باہر عرس اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ زائرین کی واپسی شروع ہو گئی اور کافی لوگ کم ہو گئے تھے اس وقت کی بت جب میں یہاں آیا تھا۔ میں نے ابھی تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہاں آنے کا مقصد ایک حد تک میرے علم میں آ چکا تھا، جو واقعات پیش آئے تھے ان کے تحت یہی سوچ سکتا تھا کہ مزار کی بے حرمتی سے روکنے کیلئے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے لیکن ابھی تک واپسی کا کوئی اشارہ نہیں ہوا تھا اور لئے کسی بھی شکل میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں واپس چل پڑوں۔ جہاں تک ثریا کے تصور کا تعلق تھا تو اس وقت میں اپنی تمام دعاؤں میں اس دعا کو اولیت دیتا تھا کہ میرے دل و دماغ سے اس کا تصور مٹ جائے۔ میں تو خود ہواؤں کا مسافر تھا۔ قدم نہ زمین پر تھے اور نہ آسمان پر۔ بس خلا میں کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ڈول رہا تھا۔ کہیں بھی گر سکتا تھا ذرا سی لغزش ایک بار پھر مجھے پستیوں کے انہی گڑھوں میں دھکیل سکتی تھی جن میں گرنے کی اب سکت باقی نہیں رہی تھی .... بے چارہ اکرام میری ہی طرح مصیبت کا شکار تھا .... مگر میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسی کیسی مصیبتوں سے گزر چکا ہوں .... اسے تو ان کے عشر عشیر کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا .... لیکن خدا کا شکر تھا کہ اس نے ہی مجھے یہ قوت بخشی تھی، کہ میں اب تک زندگی سے لڑ رہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وظیفہ تلاش کیا تو یہ دیکھ کر آنکھیں حیرت و خوشی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ آج چار روپے کی جگہ میری جیب سے آٹھ روپے برآمد ہوئے تھے اس احساس سے دل سرشار ہو گیا کہ میرے اقدام کو برا نہیں تصور کیا گیا ہے اور از راہ کرم مجھے اکرام کا وظیفہ بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ دل بڑھ گیا گویا میرا عمل ناپسندیدہ نہیں رہا ہے۔ ایک جگہ اکرام کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا اور ناشتے سے فراغت ہوئی تھی کہ عرس کے خاتمے کا اعلان ہونے لگا، سجادہ نشین نے زائرین کو واپسی کی اجازت دے دی تھی اور عرس کی تقریبات مکمل ہونے کا اعلان کیا تھا، اس کا مقصد تھا کہ اب سب کی بھی واپسی ہو جائے۔ اکرام کو ساتھ رہنے کی اجازت ان آٹھ روپے کی موجودگی سے مل گئی تھی۔ چنانچہ اکرام نے ہی مجھ سے سوال کر دیا۔

"مسعود بھائی .... اب کیا کریں گے ہم ....؟"

"تم کیا چاہتے ہو ....؟"

"جونا پوری جانا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" اور اس کے بعد ہم نے جونا پوری کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ایک یہاں سے جونا پوری بھی جاتی تھی۔ تین تین روپے کرایہ تھا، میں ڈیڑھ روپیہ خرچ کر چکا تھا ناشتے میں جو موجود تھے میرے پاس باقی چھ روپے کے ٹکٹ خرید لئے اور ہم لاری میں بیٹھ کر جونا پوری چل

پڑے۔ میں تھوڑی سی الجھن کا شکار تھا۔ اصل بات اسے نہیں بتا سکتا تھا، غرض یہ کہ جونا پوری
اور وہ بھی نشاندہی کرتا ہوا اپنے محلے میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس کے منہ سے مسرت بھری
نکلی۔

"مسعود بھیا وہ ہے.......... وہ ہے میرا گھر، آہ میں اس شیطان کے چنگل سے آزاد ہو گیا آہ وہی میرا گھر ہے۔" وہ دیوانہ وار اپنے گھر کی جانب دوڑنے لگا۔ گھر کے دروازے پر زنجیر تھی۔ میں جانتا تھا کہ ثریا اسے اس گھر میں نہیں ملے گی۔ لیکن اس کے احساس کی تکمیل کیلئے میں خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی۔ زنجیر کھول کر وہ دیوانہ وار اندر گھس گیا اور زور زور سے بہن کو آواز لگا۔ میں دروازے پر ہی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگ آ گئے اس کی آوازیں سن کر انہی میں سے ایک معمر نے اندر داخل ہو کر اسے پکارا۔

"اکرام.......... اکرام.......... آ گیا تو.......... کہاں غائب ہو گیا تھا دیوانے.......... کہاں چلا گیا تھا بہن کو چھوڑ کر..........؟"

"چچا ثریا کہاں ہے، ثریا کہاں ہے چچا۔" اکرام نے دیوانہ وار پوچھا اور معمر شخص کی گردن جھک گئی۔ اکرام پھر چیخا۔

"چچا میں اسے آپ کے حوالے کر کے گیا تھا۔ کہاں چلی گئی وہ.......... وہ کہاں۔ وہ..........؟" معمر شخص نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے اکرام.......... ہم اس کی حفاظت نہیں کر سکے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ چچا خدا کیلئے جلدی بتائیے مجھے، کیا ہوا۔"

"تو تو واپس ہی نہیں آیا۔ ہم تیرا انتظار کرتے رہے، سب لوگ اس کی خبر گیری کرتے تھے، مگر ایک صبح جب شبراتن اس کے گھر گئی تو چیختی ہوئی باہر نکل آئی اس نے بتایا کہ ثریا کے منہ سے خون بہہ بہہ کر سینے پر جم چکا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کٹی ہوئی ہیں اور وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ سارے کے سارے دوڑ پڑے اسے اٹھا کر ڈاکٹر کی دکان پر لے گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی زبان کاٹ دی گئی ہے اور اس کی انگلیوں کو بھی چھری سے کاٹ دیا گیا ہے نجانے کس ظالم نے یہ کام کیا تھا۔ آہ بے چاری ثریا.......... بے چاری ثریا کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تھا۔ بھیا ڈاکٹر نے کہا کہ یہاں اس کا علاج نہیں ہو سکتا، شہر لے جانا پڑے گا اسے۔ محلے والوں نے آپس میں چندہ کیا اور اسے لے کر شہر چل پڑے۔ شہر کے ایک اسپتال میں اسے داخل کر دیا گیا۔ چھ سات دن تک تو شبراتن بے چاری اس کے ساتھ رہی، خیراتی اسپتال تھا ہم نے اسپتال والوں سے بات کی اور اسپتال والوں نے کہا کہ اس کا علاج تو بہت عرصے تک کیا جائے گا۔ بھیا سچی بات ہے کہ ہم بھی غریب لوگ تھے۔ تو نے تو واپس مڑ کے ہی نہ دیکھا۔ جب تک ہو سکا اس کی خبر گیری کرتے رہے۔ آخری بار جب رشید خان شہر جا کر اس کی خبر لینے گئے تو پتہ چلا کہ وہ اسپتال میں نہیں ہے کہیں چلی گئی تھی وہ وہاں سے کسی کے ساتھ چلی گئی تھی، کچھ اور نہیں چل سکا بھیا۔ بس یہ ہے بے چاری ثریا کی کہانی۔"

اکرام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ ایسا بلک بلک کر رو رہا تھا وہ کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو رہے تھے بہت سے لوگ سسکیاں لے رہے تھے اور میں خاموش ایک کونے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بعد کی کہانی میرے علم میں تھی اور میں اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں سوچوں میں گم رہا اور اکرام دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ محلے والے ہمدردی ظاہر کر رہے تھے مگر اکرام کو قرار نہیں تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ آرام کریں۔ میں اکرام کو سنبھال لوں گا۔ ایک ایک کر کے لوگ چلے گئے اکرام سسکتا ہوا بولا۔ "اس نے یہی دکھایا تھا مجھے مسعود بھیا۔ جو کچھ اس نے مجھے دکھایا تھا وہی سچ تھا آہ میری پیاری بہن.......... کیا ہو گیا اسے۔ آہ وہ گونگی ہو گئی۔ مسعود بھیا اب میں.......... کیا اب بھی مجھے جینا چاہئے۔"

"جینا تو ہے تمہیں اکرام۔"

"کس کیلئے جیوں، کیا کروں جی کر..........؟"

"تو کیا خود کشی کرو گے؟"

"اب تو یہی کرنا چاہئے۔ آہ اب تو..........؟"

"توبہ کرو اکرام، توبہ کرو خود کشی حرام ہے۔"

"پھر میں کیا کروں بھیا۔ بتاؤ میں کیا کروں..........؟"

"ثریا کو تلاش کرنا ہے تمہیں۔"

"کہاں تلاش کروں۔ آہ میں اسے کہاں تلاش کروں۔"

"صبر کرو.......... اللہ سے روشنی طلب کرو، وہ سب کو روشنی دکھاتا ہے۔" بمشکل میں نے سمجھایا بجھایا۔ بے چارے محلے والے پرسش کو آ رہے تھے کچھ اس کیلئے کھانے پینے کی اشیاء بھی لائے تھے وہ تمام افراد اس کی دلجوئی کر رہے تھے۔ ہم نے تین دن وہاں قیام کیا۔ اکرام باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا تھا۔ وہ تہجد بھی پڑھنے لگا تھا۔ اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے تھے۔ گھنٹوں دعا کیلئے ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ بہن کی سلامتی کیلئے دعائیں کرتا ہے۔ اسے اس کیفیت میں دیکھ کر میرا سینہ بھی پھٹنے لگتا تھا۔ میری بھی بہن تھی، بھائی تھا ماں باپ تھے بھرا کنبہ تھا۔ بھرا گھر تھا۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں تھا۔ اور.......... اور جو کچھ تھا اس کے بارے میں جاننے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔ ان تین دنوں میں مجھے آٹھ روپے روز ملتے رہے تھے کھانے پینے کی اشیاء محلے والے بدستور لا دیتے تھے یہ پیسے جمع ہو گئے۔ میں نے اکرام سے کہا۔

"اکرام.......... یہاں رکو گے یا.......... میرے ساتھ چلو گے۔؟"

"مجھے اپنے ساتھ رکھو گے مسعود بھیا۔؟"

"ہاں.......... اس وقت تک جب تک تمہاری بہن تمہیں مل جائے۔"

"وہ مل جائے گی مسعود بھیا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ وہ خوش ہو گیا اور بولا۔

"آپ کہتے ہیں تو وہ ضرور مجھے مل جائے گی۔" ہم نے تیاریاں کیں اور اس کے بعد میں نے خورجہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ثریا گنگا دھر کے پاس تھی مجھے علم تھا مگر میں نے مصلحتاً اکرام کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ خدا کرے وہ محفوظ ہو۔ وقت سے پہلے آس دلا کر اسے ہیجان میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خورجے کے بارے میں سن کر اکرام نے پوچھا۔

"خورجہ کس کام سے جارہے ہیں مسعود بھیا۔"

"وہاں کچھ کام ہے۔" میں نے کہا اور وہ خاموش ہوگیا۔ بھوریا چرن کا پھر کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ مگر جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور وار کرنے سے نہیں چوکے گا۔ میری وجہ سے اسے پھر ناکام ہونا پڑا تھا اور اس ناکامی نے اسے دیوانہ کردیا ہوگا۔ چنانچہ اس سے ہوشیار بھی تھا۔ ہم خورجے پہنچ گئے ایک سرائے میں قیام کیا اور پھر میں نے گنگا دھرجی کے بارے میں معلومات شروع کردیں۔

"کیا کام کرتے ہیں گنگا دھرجی۔؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ ان کی بیٹی رکمنی ڈاکٹر ہے۔ اور بیٹا۔"

"خورجہ چھوٹی سی جگہ تو نہیں ہے۔ کچھ اتہ پتہ ہوتا تو............" مگر کوئی اتہ پتہ نہیں تھا میرے پاس۔ بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ ان سے پتہ تو پوچھ لیتا مگر اس وقت احساسات مختلف تھے۔ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ............ کیونکہ ثریا ان کے پاس تھی اور مجھے سرزنش کی گئی تھی۔ کیا پتہ تھا کہ اسے طرح تلاش کرنا پڑے گا۔ واقعی خورجہ چھوٹا نہیں تھا۔ ہم گنگا دھرجی کو تلاش کرتے پھرے۔ کہیں سے پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میری نگاہیں سڑکوں پر چلتے ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں مگر نہ دھرما نہ رام جی............ کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اب کیا کروں............ کیا کرنا چاہئے۔

"کوئی بہت ضروری کام تھا اس سے۔" اکرام پوچھتا۔

"ہاں۔"

اس شام خورجے کے ایک تنگ بازار سے گزر رہا تھا کہ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک آواز ابھری۔ "اماں تم............ تم یہاں کہاں............؟"

چونک کر پیچھے دیکھا پہچان لیا۔ کمال الدین پہلوان تھے۔ بابا شاہجہاں کے مزار پر انہوں نے مجھ پر بڑے احسان کئے تھے۔ "اماں پہچانا ہمیں یا نہیں میاں صاحب۔ وہ باباجی کے مزار پر............ ایں یہ تو وہی لونڈا ہے جس نے تم پر وار کئے تھے گدے سے۔" اس بار کمالے پہلوان نے اکرام کو دیکھ کر کہا۔ میں نے کمالے پہلوان کو سلام کیا اور کہا۔ "کیوں نہیں پہلوان صاحب۔ پہچان لیا میں نے۔!"

"اماں خورجہ کب آئے؟"

"تین چار دن ہوگئے۔"

"اور ہمارے پاس نہیں آئے۔ اماں قسم اللہ کی، حد ہوگئی بے مروتی کی اور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی پیارے دشمن کو گلے لگائے لگائے پھر رہے ہو!"

"دوستوں کو سب گلے لگاتے ہیں پہلوان صاحب. مزا دشمنوں کو گلے لگانے میں ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔

"ہائے ہائے، لاکھ روپے کی بات کہہ دی ایمان کی قسم، میاں اللہ والوں کے درجے کو کون پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پہنچے ہوئے ہو............ مگر ایک شکایت ہے قسم اللہ کی۔"

"کیا پہلوان صاحب؟"

"خورجے آئے اور ہمیں نہ پوچھا کسی سے حالانکہ دعوت دے کر آئے تھے۔"

"آپ کی بے حد مہربانی ہے۔ ایک کام سے خورجے آیا تھا۔"

"میاں سارے کام ہوں گے مولا کے فضل سے۔ چلو ہمارے ساتھ ایمان کی قسم اب نہیں چھوڑنے کے۔"

"کمالے پہلوان............" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہ............ بالکل نہ۔ جو کہنا ہے گھر چل کر کہنا۔" وہ کچھ اس طرح پیچھے پڑے کہ ایک نہ چلنے دی۔ مجبوراً ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ کمالے پہلوان ہم دونوں کو اپنے گھر لے گئے۔ صاحب حیثیت معلوم ہوتے تھے گھر بھی بڑا تھا۔ مہمان خانہ الگ تھا اسی سے متصل اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں لے پہنچے............! "یہ تمہاری قیام گاہ ہے میاں صاحب۔"

"ہم آپ کے حکم سے یہاں آگئے ہیں۔ کچھ دیر رک کر چلے جائیں گے۔"

"میاں بڑی مشہور کہاوت ہے کہ مہمان آئے اپنی مرضی سے ہے جائے کمالے پہلوان کی مرضی سے ہے۔ ابھی تو تم سے بڑی برکتیں سمیٹنی ہیں میاں صاحب چھری تلے دم لو۔ تم تو ایسے بھاگ رہے ہو جیسے بجار پیچھے لگا ہو۔"

"ہمارا سامان سرائے میں ہے۔"

"چمن خان آتے ہوں گے۔ اٹھا لائیں گے۔"

"سرائے کا مالک دیدے گا؟"

"کمالے پہلوان کا نام لیں گے چمن خان، میاں صاحب آپ کی دعا سے اللہ نے بڑی بنا رکھی ہے۔" غرض کمالے پہلوان کسی طور آمادہ نہ ہوئے مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جگہ بہت عمدہ تھی۔ کمالے پہلوان سرائے کا نام پوچھ کر نکل گئے۔ اکرام خاموش تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چائے کے ساتھ واپس آئے۔ لیکن ساتھ میں اتنا کچھ لائے تھے کہ دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ تین سینیاں بھری ہوئی تھیں جن میں مٹھائی پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا............!

"ارے یہ آپ نے کیا کیا............؟" "اماں مولا قسم............ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اللہ نے تمہارے لئے بھجوایا ہے۔ وہ ایک لونڈے نے شاگردی کی ہے بڑے آدمی کا لونڈا ہے وہی سب کچھ لایا ہے۔ کرم ہے مولا کا............" اس کے بعد کمالے پہلوان کا اصرار کہ سب کچھ کھائیں ناک میں دم کردیا۔ نہ کھانے سے ناراض ہونے لگے۔ ناک تک ٹھونسنا پڑا۔ چمن میاں سرائے سے سامان اٹھا لائے۔ بدقسمتی سے رات ہوگئی۔ بدقسمتی سے اس لئے کہ پھر کھانے کا وقت آگیا تھا۔ کمالے پہلوان

کھانے کے دیوانے تھے اور کھلانے کے شوقین۔ ان کا خیال تھا کہ تکلف کر رہے ہیں۔ نہ جانے کس طرح پیچھا چھوٹا۔ رات کو نو مولود کو اٹھا لائے۔ "میاں صاحب دم درود کر دو .... تم اللہ والے ہو۔"

"میں گنہگار بندہ ہوں کمالے پہلوان۔ غلط فہمی میں نہ پڑو۔"

"سب پتہ ہے مولا قسم ہمارے کو۔ جو دشمنوں کو گلے لگا لے وہ کیا ہو سکتا ہے۔ آہاہاہا............ لاکھ روپے کی بات کہہ دی ہے تم نے میاں صاحب۔" یہ مرحلہ بھی گزرا اور پھر دوسری صبح ان سے مدعائے دل کہا۔

"یہاں ہمیں ایک صاحب کی تلاش ہے پہلوان صاحب۔"

"نام بولو۔"

"گنگا دھر ہے ان کا نام۔ بیٹے کا نام ماتھر ہے۔" میں نے بتایا۔

"سمجھ گئے۔ ویسے ایک بات کہیں میاں صاحب! خورجے میں کوئی پچاس گنگا دھر ہوں گے مگر ہم اس لئے سمجھ گئے کہ باباجی کے مستانے وہی گنگا دھر ہیں جن کا تم نام لے رہے ہو۔ شاہجہاں کے مزار پر ملے تھے نا؟"

"ہاں۔"

"بس اسی لئے سمجھ لیا ہم نے۔ کیا کام ہے ان سے۔ ؟"

"ملنا ہے۔"

"دوپہر کا کھانا کھا کر چلیں گے۔ ابھی کچھ لونڈوں کو زور کرانا ہے۔"

"بس پتہ بتا دیں۔"

"جلدی ہے۔ ؟"

"ہاں۔"

"شکور کو بھیج دیں تمہارے ساتھ ؟"

"کون شکور۔"

"شاگرد ہے اپنا میاں صاحب، بڑے کام کا لونڈا ہے۔ کھٹیا کھلی اور کلاجنگ تو ایسی مارتا ہے کہ پلک نہ جھپکے۔"

"وہ پتہ جانتا ہے۔ ؟"

"سمجھا دیں گے اسے۔"

"عنایت ہوگی آپ کی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ کمالے پہلوان نے اپنے کلاجنگ کے ماہر شاگرد کو بلایا اور بولا۔

"شکورے چندا۔ ذرا میاں صاحب کو گنگا دھر کے گھر لے جا۔ دیکھ چھپی کی تلیا دیکھی ہے نا............ ؟"

"ہاں استاد۔"

"بس اس کے پیچھے دھنیا رام کا کوٹھا ہے۔ برابر کا گھر گنگا دھر جی کا ہے۔"

"وہ ڈاکٹرنی کے تاؤ............ ؟" شکورے نے پوچھا۔

"بس بس وہی۔" کمالے پہلوان نے کہا اور شکورے تیار ہو گیا۔ میں نے اکرام کو ساتھ لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ کسی قدر پریشانی سے بولا............ "کتنی دیر میں آپ کی واپسی ہوگی مسعود بھائی اور تو کوئی پریشانی نہیں بس پہلوان صاحب کھلا کھلا کر ہلاک کر دیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں بس رات کو چند گھنٹے گئے تھے ورنہ ہر تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہ کچھ آ رہا ہے۔ ناشتے ہی نے حلیہ خراب کر دیا ہے۔" میں نے وعدہ کیا کہ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ بس دل نے کہا تھا کہ اسے ساتھ نہ لے جاؤں خدا جانے کیا صورتحال پیش آئے۔ ہاں وہاں سے روانہ ہو کر جب کافی دور نکل آیا تو دل کئی بار بری طرح دھڑکا۔ میں نے استغفار پڑھی خود کو سمجھایا۔ دل کو سمجھایا، بیکار ہے اسے دل میں بسانا بیکار ہے۔ میں انسان ہوں ہی کہاں، میں تو بس ایک گناہ ہوں۔ زندگی کی جتنی سانسیں باقی ہیں بس کفارہ ہیں۔ صرف کفارہ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ثریا کے بارے میں گنگا دھر جی کو بتا دوں گا کہ وہ کون ہے بس ضروری باتیں بتا دوں گا تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ دوں گا کہ اس کا بھائی موجود ہے۔ یہ بھی کہوں گا کہ ان بے چاروں کو کہیں رکھوا دیں۔ بلکہ اس کیلئے کمال الدین پہلوان زیادہ موزوں ہیں۔ ان دونوں کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی جائے یا اگر اکرام کچھ اور پسند کرے تو پھر اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے میں انہیں کہاں ساتھ لئے پھروں گا اور پھر مناسب بھی نہیں ہوگا بھٹکتا رہوں گا۔

راستہ انہی سوچوں میں گزر گیا۔ اس وقت چونکا جب کسی نے قریب آ کر کہا۔

"ارے تم بھیا............ تم .... ؟" چونک کر دیکھا۔ رام جی تھے انہوں نے مجھے پہچان لیا۔

"چولہے میں گئے رام جی۔ ہم تمہارے کون ہیں؟"

"ناراض ہو رام جی۔ !"

"ارے ٹھنگڑیاں سوجھوا دیں ہماری۔ سارا دن تلاش رہی تمہاری۔ دھرما الگ ہم الگ کم پریشان کیا تم نے۔ ؟"

"اوہ۔ وہاں ؟"

"تو اور کیا۔ ؟"

"ہم جائیں یا ہمارے ساتھ چلو گے؟" شکورے نے پوچھا۔

"تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ رام جی تم کمالے پہلوان کو جانتے ہو۔ ؟"

"لو انہیں کون نہ جانے............ !"

"گھر پتہ ہے ان کا۔ ؟"

"پتہ ہے۔ ؟"

"بس ٹھیک ہے شکور، تم جاؤ، میں آجاؤں گا۔" شکور کو روانہ کر کے میں نے رام جی سے کہا۔

”اب شکایتیں کئے جاؤ گے یا گنگا دھر کے پاس لے جاؤ گے۔ “

”سو تو لے جانا ہی ہے مگر ہم تمہیں ایک بات اور بتائیں۔ “ رام جی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سامنے کے دروازے سے پریما دیوی باہر نکل آئیں۔ رام جی کو آواز دینا چاہتی تھیں کہ مجھے دیکھ کر رک گئیں۔ پھر تیزی سے آگے بڑھیں اور مجھے بغور دیکھ کر بولیں۔

”ارے، تم یہاں بھی آ گئے۔ جان چھوڑ دو ہماری بھیا، بھر پائے ارے بھر پائے سب سے۔ “ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”گنگا جی سے مل کر چلا جاؤں گا چاچی جی۔ “

”پھر چلے گئے تم۔ ضرور چلے گئے۔ ارے بھیا۔ مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں ہم شما کرو ہمیں۔ “

”مالکن .... مالک سنیں گے تو ناراض ہوں گے۔ اندر لے چلیں انہیں میری بھی موت آ جائے گی۔ “ رام جی نے کہا۔

”لے جا۔ لے جا۔ بس آ گئی شامت۔ آؤ۔ “ وہ برا سا منہ بنا کر بولیں اور میں رام جی اور پریما دیوی کے ساتھ چل کر اندر داخل ہو گیا گنگا دھر ایک مسہری پر لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ کھلے ہوئے منہ میں نہ جانے کیسے حقے کی نے اٹکی رہ گئی۔ پھر وہ زور سے اچھل کر سیدھے ہو گئے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر بڑے غصے سے حقے کی نے منہ سے نکالی اور سنبھل کر بولے۔

”تم .... تم یہاں کیسے آ گئے میاں جی ....؟ “

”گنگا جی .... میں .... میں مسعود ہوں .... “

”ارے تو کیا ہم باؤلے ہو گئے ہیں، اندھے ہو گئے ہیں کیا، کہ تمہاری شکل بھی نہ پہچانیں، ارے ہمارا تمہارا واسطہ کیا۔ مل گئے تھے رستے میں، رشتے ناتے تو نہیں تھے، وہ تو انسانی ہمدردی تھی جو تم نے سمیٹی اور اس کے بعد کہے سنے بنا رفو چکر ہو گئے .... بھیا میل جول تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی رشتہ ناتا ہو، یہاں تو دھرم بھی ایک نہیں ہے، پھر یہاں کیسے آ گئے تم ....؟ “

”اگر آپ میرے کہے سنے بغیر چلے جانے پر ناراض ہیں گنگا دھر جی تو خدا کیلئے مجھے معاف کر دیجئے گا۔ آپ لوگوں سے کچھ اتنا پیار ہو گیا تھا وہاں کہ جدا ہوتے ہوئے دل دکھ رہا تھا۔ بس میں نے سوچا کہ آپ مجھے وہاں سے اپنے ساتھ لے جانے کیلئے کہیں گے، میں جا نہیں سکتا تھا، بس اسی الجھن کا شکار ہو کر خاموشی سے آپ سے دور ہو گیا .... “

”خاموشی سے آپ سے دور ہو گیا۔ ارے کتنے پریشان رہے تھے ہم تمہارے لئے۔ یہ تو سوچ ہوتا .... انسان انسان سے ملتا ہے کون کسی کو روک سکتا ہے بھیا۔ نہ دھرم نہ ناتا، زیادہ سے زیادہ کہہ دیتے کہ خورجے آؤ تو ہم سے مل لینا۔ پیار ہو ہی جاتا ہے انسان کو انسان سے .... مگر تمہیں نہیں ہوا بھیا اب کیسے آ گئے یہاں گنگا دھر کے ہاں .... “

”گنگا دھر جی بڑی عجیب سی کہانی ہے، آپ کی ناراضگی کو دل سے مانتا ہوں، مگر آپ یقین کیجئے، میرا پ سے دور ہو جانا ہی مناسب تھا کیا آپ کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ وہاں آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا میری ہی وجہ سے ہوا۔ وہ سادھو میرا دشمن ہے، میری ہی وجہ سے اس نے آپ کو وہاں سے واپس جانے کیلئے کہا تھا کیونکہ آپ مجھ سے ہمدردی کر رہے تھے۔ وہ اسی کا ہرکارہ تھا گنگا دھر جی جس نے مجھ پر حملہ کیا تھ۔ میں نے اس رات کے واقعات کے بعد یہی سوچا کہ آپ سے دور ہو جاؤں کہیں آپ کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائیں .... “

”تمہاری کیا دشمنی ہو گئی تھی اس سے۔ ارے وہ تو اس بے چاری بچی کا دشمن تھا، لے گیا پاپی اسے، بھگوان اس کا ناس کرے۔ سادھو نہیں تھا بھیا وہ۔ ارے وہ تو کوئی جادوگر تھا، مہا پاپی، گندا، اگھوری، چھی .... “ گنگا دھر جی نے زمین پر تھوک دیا۔ مگر ان کے الفاظ نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔

”لے گیا، کک، کسے؟ “ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا ....

”ارے وہ بچی تھی نا ہمارے پاس، بے چاری ثریا، تمہارا بھی دشمن تھا وہ اور اس کا بھی۔ ہمیں تو یہ لگتا ہے کہ اس کی جیب بھی اس پاپی نے کاٹی تھی اور انگلیوں کے پور بھی۔ بھیا نجانے کیا دشمنی چل رہی تھی، بچی تو بڑی معصوم تھی۔ “

”وہ ثریا کو لے گیا، کب، کیسے، کہاں۔ “ میں نے بے اختیار سوالات کئے۔

”لمبی کہانی ہے بیٹھ جاؤ مسعود، بھگوان کی سوگند، دل کے اتنے نرم نہ ہوتے تو سچ مچ پریما کے کہنے کے مطابق کچھ بن گئے ہوتے، مگر یہ پاپی جو سینے میں دھڑکتا ہے نا بڑا پیار کرتا ہے انسانوں سے سارے کرودھ دھل جاتے ہیں بس کیا بتائیں تمہیں، ارے بیٹھو، اونٹ کی طرح منہ اٹھائے کیوں کھڑے ہو، جب آئے ہو کچھ سمجھ کے تو تھوڑی دیر بیٹھو، کچھ جل پان کرو .... “

”گنگا دھر جی، مجھے، مجھے ثریا کے بارے میں بتائیے۔ “ میرا دل سینے میں بیٹھا جا رہا تھا اس وقت بھلا گنگا دھر کی باتوں میں کیا دلچسپی لے سکتا تھا ....

”بتاتے ہیں بتاتے ہیں۔ ہم دن بھر تمہیں وہاں تلاش کرتے رہے۔ رام جی سے پوچھ لو دھرما سے پوچھ لو، ماتھر سے پوچھ لو۔ ارے سب سے پوچھ لو۔ نہیں ملے تم۔ ادھر گھر والی کی جان نکلی جا رہی تھی، سو چل پڑے بھیا، گھر آ گئے اپنے دو تین دن تک تمہیں یاد کرتے رہے اور پھر اپنے منہ پر تھپڑ لگائے کہ ہر ایک کو دل میں بسا لیتے ہو۔ ارے کوئی کہیں کا کوئی کہیں کا۔ پھر وہی بات کہیں گے کہ نہ دھرم کا ناتا نہ خون کا، ملے کام نکلا چلے گئے، بس بھول گئے تمہیں، مگر اس پاپی نے پھر یاد دلا دیا۔

شام کا وقت تھا گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، دروازہ کھٹکھٹایا کسی نے۔ ماتھر نے کھولا تو وہ اس سادھو کو دیکھ کر ڈر گیا۔ پاپی گھسا ہی چلا آیا۔ ہم بیٹھے تھے برآمدے میں۔ دھرم پتنی بھی ساتھ تھیں۔ وہ تو بس سمجھو بھگوان کی گئیا۔ چیخ مار کر اندر بھاگ گئی۔ سادھو مہاراج نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا کہ وہ لڑکی کہاں ہے سچ بتائیں ہمیں ہماری بھی سٹی گم تو ہو گئی تھی مگر ہم نے اپنے آپکو سنبھالا اور بولے۔

”کون .... تم بھائی ....؟ “

"بھوریا چرن ہے ہمارا نام۔"

"ہم سے کیا کام ہے مہاراج ....؟"

"تمہاری دھرم پتنی جانتی ہے کہ ہمیں تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔"

"ارے تم وہی سادھو تو نہیں ہو جس نے ہمیں شاہجہاں بابا کے مزار سے بھگایا تھا ....؟"

"لعنت ہے تم پر .... ہندو دھرم کے ہو اور مزاروں کی باتیں کرتے ہو .... آخر تمہارے دھرم سے ان مزاروں کا کیا واسطہ ....؟" بھیا ہمیں بھی غصہ آ گیا۔ بات یہ ہے کہ بابا شاہجہاں پر تو ہم جان دیتے ہیں۔ اے کوئی بھی دھرم ہو کسی کا انسان تو انسان ہی ہوتے ہیں بابا جی کے مزار پر جا کر ہمیں ہمیشہ سکون ملتا ہے تو چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بتائے وہ کیا چاہتا ہے اور ثریا سے اس کا کیا واسطہ ہے، تو اس نے کہا کہ خاموشی سے ثریا کو اس کے حوالے کر دیا جائے .... اس کا یہاں رہنا ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے، کہہ کے گیا کہ ثریا کو خاموشی کے ساتھ پیتل کنڈ پہنچا دیا جائے۔ وہ وہاں موجود ہو گا ہم نے کہا جاؤ جاؤ ہو گے سادھو سنت اپنے گھر کے ہمارا نام بھی گنگا دھر ہے، وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر ثریا پیتل کنڈ نہ پہنچی تو نقصان کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے پیتل کنڈ ایک پرانا کھنڈر مندر ہے، کبھی اس میں کرشن بھگوان کی پیتل کی بہت بڑی مورتی لگی ہوئی تھی، مگر کچھ پاپی چور اسے چرا کر لے گئے، اور اس کے بعد سے وہاں طرح طرح کے کھیل ہونے لگے، چنانچہ بھیا لوگوں نے ادھر آنا جانا بند کر دیا۔ ہم بڑے حیران کہ آخر یہ سادھو بے چاری ثریا کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ گھر والی اندر کھٹیا پر جا پڑی تھی۔ پوچھا اس سے تو کہنے لگی وہی سادھو تھا جو وہاں خیمے میں آ گھسا تھا اور جس کی وجہ سے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ سب پوچھنے لگے ہم سے کہ اب وہ یہاں کیوں آیا تھا تو ہم نے ثریا کے بارے میں بتا دیا۔ رکمنی تو جان کو آ گئی کہنے لگی۔ پران دے دے گی ثریا کو گھر سے نہیں جانے دے گی۔ ماتھر خاموش تھا۔ مگر پریما دیوی کی زبان چل پڑی تھی کہ ثریا کو فوراً گھر سے نکال دیا جائے .... جو دیکھا ہے اس کے بعد خطرہ مول نہ لیا جائے۔ بھیا انسان تھی، گونگی تھی بے چاری، سیدھی سادی تھی، ہم تو ہیں ہی پریم کے مارے۔ لڑ گئے گھر والی سے کہ ثریا نکلی تو ہم بھی گھر سے باہر نکل جائیں گے، رکمنی ہمارے ساتھ تھی۔ باقی لوگ کوئی رائے نہیں دے رہے تھے مگر رات کو بھیا بھونچال آ گیا۔ گھر کا گھروا ہو گیا۔ ارے رات بھر انگارے برسے جو چیز کھلے میں پڑی تھی جل کر راکھ ہو گئی۔

رکمنی کے کمرے میں اندر سے آگ لگ گئی، سارا سامان جل گیا۔ اس کا، کپڑے، پلنگ، بستر۔ وہ تو ہماری بٹیا بچ گئی۔ نہیں تو وہ بھی بھسم ہو جاتی، بڑی پریشانی ہو گئی رکمنی تو رونے لگی تھی۔ مگر پریما دیوی نے سارے ہاتھ پاؤں نکال لئے، مرنے مارنے پر تیار ہو گئیں، آتم ہتھیا کرنے پر تل گئیں، ثریا بے چاری کو بھی صورتحال کا پتہ چل گیا تھا، سادھو کو تو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ مگر روئے جا رہی تھی مسلسل۔ پھر اس نے اشاروں میں کہا کہ اسے سادھو کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کا یہاں رہنا گھر والوں کیلئے خطرناک ہے۔ بھیا ہماری زبان بھی بند ہو گئی، اب اپنے گھر میں کون آگ لگاتا ہے تم خود سوچو .... پھر یہ بلا ٹلی تو دوسری رات گھر میں مکڑیاں گھس آئیں، جدھر دیکھو مکڑیاں، جدھر دیکھو مکڑیاں ہر چھت سے مکڑیاں

زمین پر، پاؤں رکھنا مشکل ہو گیا تھا، چھت پر سے جالے بنا بنا کر نیچے اتر رہی تھیں، دیواروں پر، کے کندھے پر تو کسی کے سر پر، گھر سے نکل بھاگے سارے کے سارے بھلا کیسے ٹکتے، بات سمجھ گئی تھی، ثریا بھی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور رو رو کر اشارے کر رہی تھی کہ اسے سادھو کے حوالے کر دیا جائے۔ بھیا کوئی چارہ نہ رہا اس کے سوا کہ ثریا کو پیتل کنڈ پہنچا دیں۔ روتے پیٹتے چھوڑ آئے اسے اور کیا کرتے۔ مجبوری تھی بالکل ہی مجبوری تھی۔"

گنگا دھر جی کی آواز بھرا گئی۔ لیکن میرا دل بری طرح دکھ رہا تھا، میں خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک بار دل میں ثریا کی محبت سینہ توڑ کر ابھر آئی تھی اور میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا ....

"گنگا دھر جی، پیتل کنڈ کہاں ہے؟"

"جاؤ گے وہاں ....؟"

"ہاں اسے تلاش کروں گا۔"

"مگر .... مگر تمہارا اس سے کیا واسطہ ہے ....؟"

"گنگا دھر جی بس آپ یہ نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔"

"ارے بھیا ہمیں بھی انسان سمجھو۔ تم تو چار گھنٹے کی ملاقات میں اس کیلئے آنسو بہا رہے ہو۔ ہم سے پوچھو .... رکمنی سے پوچھو جو بیمار پڑی ہوئی ہے۔ بستر سے لگ گئی ہے اس کے غم میں، پریما بھی خوش تھوڑی ہے اسے نکال کر۔ پریم سے رکھا ہوا تھا بیٹیوں کی طرح۔ مگر کیا کریں۔ اپنے گھر پر جب مصیبت ٹوٹے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" گنگا دھر جی دکھ سے بولے ....

"گنگا دھر جی وہ بڑی مظلوم لڑکی ہے، اس کا بھائی میرے ساتھ آیا ہے، بے چارہ بھائی اپنی بہن کی تلاش میں سرگرداں ہے یوں سمجھ لیجئے ایک لمبا چکر ہے اور آپ اس کے بارے میں نا ہی جانیں تو زیادہ اچھا ہے۔ آپ کا ہنستا کھیلتا گھرانہ تباہ ہو جائے گا، اچھا ہی ہوا آپ نے اس بے چاری کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ مگر اس کا بھائی اس کیلئے دیوانہ ہو رہا ہے، میرے ساتھ ہی یہاں تک آیا ہے میں شاید خورجہ نہ آتا لیکن آپ کو تلاش کرتا ہوا آیا ہوں ثریا کی وجہ سے تاکہ وہ اپنے بھائی کو مل جائے ...."

گنگا دھر جی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے، پھر بولے۔ "ہم ہی لے چلتے ہیں تمہیں، پیتل کنڈ بہت دور ہے آبادیوں سے .... مگر اب وہ تمہیں وہاں کہاں ملے گی، بے کار ہی ہے سب کچھ بے کار ہی ہے۔"

رکمنی کو بھی میری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ خود ہی اٹھ کر گنگا دھر کے کمرے میں آ گئی .... میں نے دیکھا وہ پہلے کی نسبت کافی لاغر ہو گئی ہے۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "میرے ساتھ آؤ گے، کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے ...."

"جی ...." میں نے کہا۔

"جاؤ ہو آؤ اس کے ساتھ، جب سے بیمار پڑی ہے، سمجھاؤ اسے کچھ نہیں ملے گا بھیا، یہ جادو ٹونے کے چکر ہیں، ارے ہم کیا اور ہماری اوقات کیا کہ ان جھگڑوں سے نمٹیں، پریما جی ٹھیک کہتی ہے، جاؤ چلے جاؤ اس کے ساتھ ...."

میں رکمنی کے کمرے میں آ گیا۔ رکمنی کافی غمزدہ معلوم ہوتی تھی کہنے لگی۔ "تاؤ جی نے تمہیں ساری باتیں بتادی ہوں گی مسعود ...."

"ہاں رکمنی دیوی ...."

"قصہ کیا ہے ایک ہندو جوگی کو، جو گندے علم کا ماہر بھی معلوم ہوتا ہے ثریا کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے بھی مسعود وہ بڑی پراسرار لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ جان ہی نہیں سکی میں۔ لیکن یقین کرو مجھے محبت ہو گئی تھی مجھے اس سے۔ تم بھی اس معاملے میں کچھ ملوث ہو کم از کم دل کے سکون کیلئے یہ تو بتا دو کہ اصل قصہ کیا ہے ....؟"

"میں اس معاملے میں ملوث نہیں ہوں رکمنی دیوی .... بس یوں سمجھ لیجئے کہ وقت نے مجھے اس سے ملوث کر دیا۔ یہ سب کالے جادو ہی کا چکر ہے۔ وہ بدمعاش جوگی جس کا نشان مکڑی ہے ایک گھٹیا جادوگر ہے اور ثریا کے بھائی اکرام سے وہ اپنے جادو کی تکمیل کیلئے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ اکرام نے وہ کام نہیں کیا تو اس نے اکرام کو قیدی بنا لیا۔ ثریا کی زبان بھی اس نے کاٹی صرف اس شخص کو اپنے کام کیلئے آمادہ کرنے کی وجہ سے .... غرض یہ کہ وہ نوجوان لڑکا مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے اپنی بہن کی کہانی سنائی اور مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ثریا ہی اس کی بہن ہے۔ بس میں اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا اور یہاں آ کر یہ غم ناک خبر سنی کہ ثریا کو وہ جوگی ایک بار پھر لے گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔"

"کیا وجہ ہے؟" رکمنی نے بے اختیار پوچھا۔

"جب اس جوگی نے دیکھا کہ وہ اپنے کام میں ناکام ہو گیا ہے تو اس لڑکی کے ذریعے اس کے بھائی کو مجبور کرنے کے لئے اس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس بات کا مجھے علم ہے کہ بھوریا چرن اب وہی سب کچھ کرے گا اس شخص کے ساتھ جو اس نے .... جو اس نے۔" اور پھر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بے خیالی میں، میں رکمنی کو اپنے بارے میں بتانے جا رہا تھا۔ رکمنی نے بھی شاید میری بات پر توجہ نہیں دی تھی، کہنے لگی۔

"یہ تو ظلم ہے ایک انسان کا انسان پر ظلم۔ کوئی اس بے چاری کو اس ظالم سے نہیں بچا سکتا۔"

"اللہ بچانے والا ہے، یقینی طور پر وہ اس کی مدد کرے گا۔" رکمنی مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"ہنسو ایک بار .... تمہاری ہنسی کائنات کا نقشہ بدل دیتی ہے۔"

"نہیں ہنس سکتا رکمنی دیوی نہیں ہنس سکتا ...."

"کیوں ....؟" اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس نہیں ہنس سکتا، ہنسی میری تقدیر سے نکل چکی ہے۔"

"تو کیا تم بھی۔" رکمنی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی۔؟" میں سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا ....

"تو کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہو، کیا تم بھی اسے چاہنے لگے ہو۔" رکمنی کے سوال نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تو وہ بولی۔

"میں دعوے سے کہتی ہوں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ وہ تمہیں چاہنے لگی تھی .... وہ .... وہ عورت ہوں میں اور عورت ہی عورت کو صحیح طور پر سمجھ سکتی ہے۔ ایسی اداس اداس رہتی تھی ہمیشہ، جیسے اس سے کوئی بہت ہی قیمتی شے چھن گئی ہو۔ میں نے ایک بار تمہارا نام لے دیا تھا اس کے سامنے، پوچھا تھا اس سے کہ کیا وہ تمہیں چاہنے لگی ہے تو ایسی بلک بلک کر روئی تھی کہ دل پھٹنے لگا تھا۔ بھگوان کی سوگند مسعود وہ تمہیں چاہنے لگی تھی .... بہت زیادہ .... بہت ہی زیادہ .... عورت ایسی ہی چیز ہوتی ہے، گھائل ہوتی ہے تو ایک ہی نظر میں اور نہیں ہوتی تو اس کے پورے بدن کو داغدار کر دو، کبھی گھائل نہیں ہوتی۔ اب کیا کرو گے یہ بتاؤ۔ کیسے مدد کرو گے اس کی، کہاں ملے گی وہ ....؟"

"اللہ جانتا ہے، میں کیا کہوں ...." رکمنی کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ پھر گنگا دھر جی نے ہی آواز دی تھی۔ "ارے چل رہے ہو کیا .... میں نے تانگہ منگا لیا ہے۔" میں رکمنی سے اجازت لے کر گنگا دھر جی کیساتھ باہر نکل آیا اور تانگہ اس سمت چل پڑا جسے پیتل کنڈ کا نام دیا گیا تھا۔ پرانا مندر تھا اور اب کھنڈر بن چکا تھا اس کے عقب میں مرگھٹ تھا مگر میں خود بھی جانتا تھا کہ یہاں آنا بیکار ہے بھوریا چرن یہاں بیٹھا تھوڑی ہو گا پھر بھی ہم نے مندر کا ایک ایک گوشہ چھان مارا گنگا دھر نے تو حلق پھاڑ پھاڑ کر ثریا کو آوازیں بھی دی تھیں ان کی آواز میں محبت تھی، درد و کرب تھا۔

"بھگوان ناس کرے اس کا کہ جانے کہاں لے گیا نہ جانے۔"

"چلیں۔" میرے حلق سے بمشکل آواز نکل سکی تھی۔

"تو اور کیا .... بس نہ جانے کیوں .... من چاہا تھا تمہارے ساتھ ادھر آنے کا۔" تانگے والے کو روکے رکھا گیا تھا وہ انتظار کر رہا تھا ہم اس میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔

"پتہ ہی نہیں چل سکا کچھ کون تھی، کیا پتا پڑی تھی بے چاری پر تم نے بتایا تھا اس کا بھائی ملا ہے نہیں۔"

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ؟۔"

"یہیں میرے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔"

"کہاں۔؟"

"کمال الدین پہلوان کے ہاں آپ مجھے وہیں اتار دیں۔"

"میرے پاس نہیں رکو گے؟"

"ابھی نہیں گنگا دھر جی اسے سنبھالنا بھی ضروری ہے۔" میں نے کہا اور گنگا دھر خاموش ہوگئے... تک خاموشی طاری رہی پھر گنگا دھر نے کہا۔

"ایک بات کہیں بیٹا پوری کر دو گے۔"

"کہئے گنگا جی۔"

"وچن دو ہمیں اگر ثریا مل جائے تو ایک بار بس ایک بار اسے ہمارے پاس ضرور لانا بیٹی سمجھنے لگے تھے ہم اسے ہمارے بھیا کے یہ دو بچے تھے ہمارے ہی پاس رہے سسری گونگی تھی مگر بھول نہ سکیں گے اسے جیون بھر۔" گنگا دھر رونے لگے میرے بھی آنسو آگئے تھے ان سے وعدہ کر کے میں اپنی منزل پر اتر گیا۔ اچھا ہوا تھا کہ اکرام کو ساتھ نہیں لے گیا تھا اس سے اس بارے میں بات بھی نہیں کی تھی ورنہ اسے آس ہو جاتی اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا پتہ چل جاتا تو اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ کمال پہلوان کے گھر میں داخل ہو گیا کمالے پہلوان موجود نہیں تھے کچھ شاگرد اکھاڑے میں کام کر رہے تھے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا شاید کمالے پہلوان نے انہیں میرے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بتا دیا تھا اکرام کمرے میں موجود تھا مجھے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا ورنہ دل تو اندر سے بری طرح زخمی تھا۔

"کہاں ہو آئے مسعود بھائی۔ ؟"

"بتایا تھا تمہیں گنگا دھر جی سے ملاقات ہوگئی۔"

"اوہو کام ہو گیا آپ کا؟۔"

"ہاں۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور اکرام ہنسنے لگا میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ "یہاں سے کب چلنا ہے مسعود بھائی۔"

"کیوں .... کیا بات ہے۔ ؟"

"کمالے پہلوان ہمیں کھلا کھلا کر ہلاک کر دیں گے بڑا دلچسپ نظریہ ہے ان کا۔"

"کیا .... ؟" میں نے بیٹھ کر پوچھا۔

"کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین پر اتاری ہیں، ان سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے ورنہ روز قیامت ایک اور گناہ کا جواب دینا پڑے گا۔"

"کچھ اور کھلایا ہے۔ ؟" میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی کیونکہ صبح کا ہولناک ناشتہ مجھے یاد تھا جو استاد کمال الدین نے ہمیں ناک تک ٹھنسا دیا تھا۔

"آپ کے جانے کے کچھ دیر کے بعد سرخ سرخ ٹماٹر نمک چھڑکے ہوئے سینی بھر کے لے آئے اور بیٹھ گئے کھلانے کہنے لگے خون کی کمی پوری ہوتی ہے ٹماٹروں سے بڑی مشکل سے خاصے ٹماٹر کھانے کے

...چھا چھوڑا تھا کہ کچھ دیر کے بعد سیر سیر بھر کی شکر قندیوں کے ساتھ نازل ہوگئے فرمایا کہ بھاڑ پر بھنوا کر ...ئی ہیں خاص طور سے ہمارے لئے نہ کھانا گناہ .... بلکہ اگر زیادہ انکار کیا جائے تو دھوبی پاٹ مار ...ت کر دیں اور سالم شکر قندی حلق میں اتار دیں ایسے ہی تیور ہوتے ہیں ان کے کسی چیز کے کھانے ...انکار کرنے پر..........!" ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔ اکرام نے کہا۔ "ہنس لیجئے آپ کیلئے بھی احکامات ...یئے گئے ہیں۔"

"کیا.......... ؟۔" میں نے سہم کر پوچھا۔

"کافی بچ گئی تھیں مگر شاگردوں میں تقسیم کر دی گئیں ساتھ ہی ایک شاگرد کو حکم دیا گیا کہ شتین بھڑ ...نجے سے کہہ دے کہ شام کو کچھ اور شکر قندیاں بھون دے میاں صاحب کیلئے .... ٹھنڈی ہو کر ...ب ہو جاتی ہیں۔"

"واقعی خوب ہیں ہمارے پہلوان۔"

"ماشاء اللہ ان کی خوراک بھی قیامت ہے حالانکہ جسامت ایسی نہیں مگر خوب کھاتے ہیں۔"

تھکن ہوگئی تھی اپنی بپتا کسی کو نہیں سنا سکتا تھا دل پر بھاری بوجھ تھا بھوریا چرن نے جوابی کارروائی کی تھی ...جانے بے چاری ثریا کس حال میں ہو وہ جانتا تھا کہ اکرام میرے پاس ہے اور یقیناً اپنی داستان بھی ...ئے گا اور اس کے بعد میں خور جے کا رخ ضرور کروں گا چنانچہ وہ ثریا کو لے گیا تھا۔ زیادہ دیر آرام ...یں کر سکا تھا کہ کمال الدین پہلوان کی دھاڑ سنائی دی۔

"اماں۔ آگئے کیا میاں صاحب .... ابے کچھ کھلایا پلایا میاں صاحب کو یا سوکھا ہی ڈال رکھا ہے۔" یہ الفاظ انہوں نے اپنے کسی شاگرد سے کہے تھے پھر اندر آگئے تھے۔

"ملاقات ہوگئی میاں صاحب گنگا دھر سے۔ ؟"

"جی پہلوان صاحب۔"

"ایک خوشخبری لایا ہوں آپ کیلئے۔"

"کیا پہلوان صاحب۔"

"وہ تمنا خان پہلوان میرٹھ والے کو سنا ہے کبھی۔ ؟"

"نہیں۔"

"جادو ہے آواز میں پاگل کر دیتے ہیں سننے والے کو کل شام کو آرہے ہیں صوفی جبار کے ہاں قوالیوں ...جے گی صوفی جبار کے پوتے کا عقیقہ ہے بتایا تھا میں نے آپ کے بارے میں بے چین ہوگئے ملنے ...انتظام میں لگے ہوئے ہیں شام کو خود آئیں گے دعوت دینے۔" مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر ...نے کلائی الٹی کر کے گھڑی میں وقت دیکھا اور بولے۔ "ابے لو .... کھانے کا ٹیم ہو گیا اور ...ں بیٹھا ہوں کھانا لگواتا ہوں میاں صاحب ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ۔"

...نے سے فراغت پانے کے بعد اکرام نے پوچھا۔

"...رجے میں کب تک قیام کریں گے مسعود بھائی؟"

"اب یہاں کوئی کام نہیں رہا ہمارا۔"

"کل عقیقے میں شرکت کریں گے؟"

"نہیں۔"

"کمال الدین پہلوان چھوڑ دیں گے ہمیں۔؟"

"ہاں اکرام .... یہ مشکل پیش آئے گی مگر اس کا یہی حل ہے کہ خاموشی سے نکل جائے۔"

"اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔" اکرام نے کہا۔ میں خاموشی سے کچھ سوچتا رہا پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔

"اکرام .... تمہارا اب کیا ارادہ ہے۔؟"

"کیا ہوسکتا ہے بھائی .... میری زندگی تو کھلی کتاب ہے، بہن کی تلاش کی حسرت ہے وہ مل جائے تو جینے کی سوچوں ورنہ زندگی کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے۔"

"میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں اکرام۔" میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "مجھے خود سے جدا کرنا چاہتے ہیں مسعود بھائی۔"

"یہ تو کرنا پڑے گا اکرام .... تم میرا ساتھ کہاں دو گے۔" میں نے کہا اور وہ چھلک پڑا پھر ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"میرا بھی تو دنیا میں کوئی نہیں ہے بھائی .... کوئی منزل بھی نہیں ہے میری، کوئی نشان بھی نہیں ہے کہ بہن کو تلاش کروں بھٹکنا ہی ہے مجھے اپنے ساتھ رہنے دیں مجھے بھائی جہاں بھی جائیں آپ کے ساتھ چلوں گا، کبھی آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دوں گا، آپ کا ہر حکم چھوٹے بھائی کی طرح بجالاؤں گا آپ پر کبھی بوجھ نہیں بنوں گا میں اکیلا کیسے جی سکتا ہوں بھائی۔" وہ زار و قطار رونے لگا اور میرا دل بھی بھر آیا میں نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔

"تجھے میرا غم نہیں معلوم اکرام .... تجھے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم میرے بھائی میں بھی، میں بھی سینے میں طوفان چھپائے پھر رہا ہوں میرا بھی بہت کچھ کھو گیا ہے اتنا کچھ کھو گیا ہے کہ تو تصور بھی نہیں کرسکتا میرے سینے میں بھی زخم ہی زخم ہیں مگر میرے لئے کچھ ہدایات ہیں آہ میں، میں ابھی تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتا میرا دل تیرے لئے دکھا ہوا ہے لیکن شاید، میرے پاس تیرے درد کا درماں نہ ہو خیر اللہ مالک ہے دیکھیں گے، سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے تو اکرام تو اپنی بہن کو تلاش نہیں کرے گا۔؟"

"کہاں تلاش کروں اتنا بے دست و پا ہوں کہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کرسکتا ہاتھ بندھے ہوئے ہیں میرے پیر بندھے ہوئے ہیں، کوئی منزل نہیں ہے میرے سامنے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا دیکھو بھائی اگر تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تو مر جاؤں گا میں، مجھے سہارا درکار ہے ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنے رہیں تو

وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے کسی کام میں کبھی مداخلت نہیں کروں گا کبھی تمہیں شکایت کا موقع دوں گا۔" میں نے اکرام کا شانہ تھپتھپایا حالانکہ اپنے طور پر میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہاں ساتھ لے جاتا اسے، بے چاری ثریا، بھوریا چرن کے قبضے میں تھی ہاں بھوریا چرن کا جب بھی سامنا ہوا میں اس لڑکی کو اس کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کروں گا لیکن اس کے بعد، اس کے بعد کیا ہو گا دوران اکرام نجانے کہاں سے کہاں نکل جائے جی سکے یا نہ جی سکے بیچارے کمالے پہلوان اپنی ... سے مجبور تھے نچلا بیٹھنا ہی نہیں آتا تھا خاطر مدارات کے چکر میں دیوانے ہو گئے تھے کچھ سوچنے سمجھنے ... ایک بار پھر نازل ہوئے اس بار ایک بڑی سی سینی میں گنڈیریاں اور سنگھاڑے رکھے ہوئے تھے لا کر ... سامنے رکھ دیئے۔

"کالی تال کے سنگھاڑے ہیں کیوڑے کے رس گلے کھا کر دیکھو، کمرے بھر میں خوشبو نہ پھیل جائے ... نام کمالے پہلوان نہیں ہے اور یہ گنے لالہ بنواری لعل کے کھیت کے ہیں جن کی ہم نے گنڈیریاں ... ہیں آپ کیلئے میاں صاحب چلو شروع ہو جاؤ دیر نہ کرو۔"

"کمالے پہلوان ابھی تو کھانا کھایا ہے۔"

"اماں تو کھانے کے بعد ہی کی تو چیز ہے یہ چلو چلو تکلف نہ کرو کچھ بھی ہے جوان تو ہو یہی کھانے پینے کی عمر ... ہے اس عمر میں نہ کھایا تو پھر کیا بڑھاپے میں کھاؤ گے جب منہ میں دانت ہونگے نہ پیٹ میں .... چلو بھائی شروع ہو جاؤ تم کیسے ہو شکل دیکھنے لگتے ہو کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر جب ہم جوان تھے ناں تو بس یوں سمجھ لو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے کھا جائیں۔"

کمالے پہلوان کا انداز ایسا تھا کہ پھر کچھ دیر کیلئے ذہن سے سارے خیالات ہٹ گئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اکرام کا تو دم نکلنے لگا تھا اب کمالے پہلوان کی صورت دیکھ دیکھ کر ہم نے ان کے کہنے سے ... گنڈیریاں اٹھا لیں اور انہیں چبانے لگے، کمالے پہلوان گنڈیریوں کی افادیت پر لیکچر دینے لگے تھے جو ... مسوڑھوں اور دانتوں کے بارے میں تھا پھر خدا کے فضل سے کسی نے انہیں باہر سے آواز دے لی اور وہ چلے گئے اکرام خاموش خاموش تھا میں نے بھی کوئی گفتگو نہیں کی بہر حال مسئلہ تو گمبیھر تھا اور اس بارے ... فیصلہ کرنا میرے لئے بھی مشکل .... ہاں میں نے یہ ضرور سوچ لیا تھا کہ اب مدد طلب کئے بغیر ... کار نہیں ہے مجھے ہدایات ضرور لینا پڑیں گی اور اس کیلئے کشف کرنا پڑیگا یہ وہ عام بات نہیں تھی جس کا ... فیصلہ کر لیا جائے چنانچہ گنڈیریاں اور سنگھاڑے مصیبت بنے رہے اور اس کے بعد کمالے پہلوان ایک بار پھر آ گئے۔

"اماں ایک خوشخبری سنائیں آپ کو میاں صاحب، گنے کا رس نکلوایا ہے رساول پکا رہی ہے گھر والی ... رات کے کھانے میں مزہ آئے گا میں نے کہہ دیا ہے کہ ساتھ میں گوبھی گوشت پکا لے کیسا رہے گا۔"

"بہت اچھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اب ساری توجہ اس بات پر ہو گئی تھی کہ اکرام کو ساتھ رکھا

جائے یا نہیں خود کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ رساول اور گوبھی گوشت معدے میں ٹھونسنا پڑا میزبان کی دل آزاری بھی گناہ تھی پھر جب رات بھیگ گئی اکرام سو گیا تو اٹھ کر وضو کیا ایک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ گیا درود پاک کا ورد مبارک کیا رہنمائی کی دعا مانگی اور انتظار کرنے لگا ملعون بھوریا چرن ایک بڑی سی مکڑی کی شکل میں نظر آیا زمین سے آسمان تک اس نے جالا تان رکھا تھا اور بڑے بڑے بدنما پیروں سے اس پر دوڑ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں کسی خاص سمت دیکھ رہی تھیں میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور سے اکرام نظر آیا وہ حیران پریشان اس جالے کے تاروں پر چل رہا تھا اس کے بھٹکے قدم کبھی ایک سمت اٹھتے کبھی دوسری سمت .... مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اکرام کو شکار کرنا چاہتا ہے اپنے گھناؤنے مقصد کیلئے ظاہر ہے وہ میرے ذریعے اس مقصد کی تکمیل میں ناکام رہا تھا اور اب اکرام اس کی امید کا مرکز تھا وہ آسانی سے اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا اس کیلئے وہ سب کچھ کرے گا پھر میں نے اسے اکرام کے عقب میں پہنچتے دیکھا اکرام اس کی گرفت میں آنے والا تھا اچانک ہی میں نے آگے بڑھ کر اکرام کا ہاتھ پکڑ لیا اور بھوریا چرن مجھے دیکھ کر واپس بھاگ گیا اس کے ساتھ ہی یہ منظر ختم ہو گیا یہ گویا اکرام کو ساتھ رکھنے کی اجازت تھی میں نے اسے ذہن نشین کر لیا اس کے بعد پھر ذہن میں ریل چلنے لگی میں خود کو ریل میں سفر کرتا محسوس کر رہا تھا باہر مناظر دوڑ رہے تھے اسٹیشن آ رہے تھے اور ٹرین ان سے گزر رہی تھی پھر ٹرین کی رفتار ست ہونے لگی اور پھر وہ رک گئی۔

بدن کو جھٹکا لگا۔ چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔ رات کا آخری پہر گزر رہا تھا رہنمائی ہو گئی تھی سفر کرنا تھا یہی حکم تھا لیکن کمالے پہلوان آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ خاموشی سے نکل جانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا اکرام کو جگایا وہ مزاج شناس ہو چکا تھا سمجھ گیا اور خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا سیدھے اسٹیشن پہنچے ٹکٹ خریدے اور ریل میں بیٹھ گئے۔ سفر شروع ہو گیا دماغ میں رات کے واقعات کا تصور تھا شام ہوئی کوئی اسٹیشن آیا تھا وہیں اترنے کو جی چاہا اتر گئے چھوٹی آبادی تھی بستی کی دکانیں بند ہو رہی تھیں قیام کیلئے مسجد سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی مسجد بستی سے باہر تھی جگہ پوچھتے پوچھتے پہنچ گئے مسجد کے ایک حد میں قیام کیا بستی کے مسلمان کھانا لے آئے ضرورت کے مطابق لے لیا اللہ کا شکر ادا کر کے کھایا اور پھر وہیں آرام کیلئے جگہ تلاش کر لی اکرام بھی کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ اس لئے سونے کی اجازت طلب کی اور سونے لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں بھی سناٹے اتر رہے تھے۔

اسی رات، رات کے کوئی دو بجے تھے۔ کچھ عجیب سی تھکن سوار تھی۔ گہری نیند سو گیا تھا۔ اچانک کسی نے پاؤں پکڑ کر زور سے ہلایا اور میں چونک کر جاگ گیا۔

"باہر کوئی بلا رہا ہے۔" آواز سنائی دی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر اکرام سو رہا تھا۔ جگانے والا نظر نہیں آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا محسوس ہوا جو آگے بڑھ رہا تھا۔ الفاظ بھی سنے تھے میں نے، پاؤں پر لمس کا احساس بھی تھا۔ سوتے ہوئے ذہن نے چند لمحوں میں کوئی فیصلہ کیا۔ لیکن پھر فوراً ہی بات سمجھ میں آ گئی۔ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے میں نے جلدی سے آنکھیں بھینچ کر ذہن کو جھٹکا اور پھر مسجد کے دروازے کی جانب چل پڑا۔

بالکل درست بات تھی۔ باہر میں نے ایک بیل گاڑی دیکھی ایک آدمی بھی اس میں سوار تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر بیل گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا اور میں نے بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کیا جواب میں وعلیکم السلام سنائی دیا اور پھر اس شخص نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ، طلبی ہوئی ہے، چلو آ جاؤ دیر نہ کرو.........." ایک عجیب سا تحکمانہ انداز تھا۔ ایک لمحے کیلئے تو ذہن سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر کسی احساس نے گاڑی میں لا بٹھایا۔ بیل گاڑی ہانکی جانے لگی تھی .... اور میں اپنے ذہن سے نیند کے اثرات دور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیل گاڑی چلانے والے کی صورت دیکھنا چاہی لیکن پتہ نہیں بینائی میں کوئی فرق آ گیا تھا یا پھر آنکھیں رات کی تاریکی کی وجہ سے صحیح صورتحال کا اندازہ نہیں لگا پا رہی تھیں۔ بیل گاڑی ہانکنے والے کے خدوخال ایک بار بھی واضح نہیں ہو سکے، سیدھا سادا سا معمولی سا لباس بدن پر تھا اور وہ اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔ میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ زیادہ تجسّس بھی بہتر نہیں ہوتا، مدھم مدھم روشنیاں گھروں سے جھانک رہی تھیں اور رات کے اس پہر کا صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ انسان کی فطرت میں تجسّس بے پناہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ضرورت سے زیادہ تجسّس بھی مسائل کا باعث بن جاتا ہے جس غیر متوقع انداز میں یہ سب کچھ ہوا تھا اس نے کچھ دیر تک تو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ پھر گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ میں نے اپنا ذہن آزاد چھوڑ دیا۔ جوالا پور کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں، اب دونوں سمت کھیت تھے اور ان کے درمیان ایک پگڈنڈی پر یہ گاڑی چل رہی تھی، کوئی ڈیڑھ گھنٹے یہ سفر جاری رہا۔ بدن کو خوب جھٹکے لگے اور ہوش و حواس اب بالکل بیدار ہو گئے۔ گاڑی چلانے والا بالکل خاموش تھا، میں نے بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ پھر کافی فاصلے پر درختوں کے جھنڈ نظر آئے اور ان کے درمیان مدھم مدھم روشنی، عجیب سی سفید روشنی، میں نے ایک گہری سانس لی۔ گاڑی کا رخ اسی جانب تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ لوگ محسوس ہو رہے تھے، سفید سفید سائے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ میں بھی گاڑی سے نیچے اتر آیا اور گاڑی والا میری رہنمائی کرتا ہوا درختوں کے جھنڈ کے بیچ لے گیا مجھے .... یہاں ایک جگہ صاف ستھری کر کے اس پر قالین بچھایا گیا تھا اور میرے پہنچنے کے بعد وہاں گردش کرتے ہوئے تمام سائے گول دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے گردنیں جھکا لیں تھیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کے درمیان پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو اچانک ہی ایک شخص نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک دیا۔

"نہیں یہ قطب اور ابدالوں کی محفل ہے، تم ان کے درمیان نہ بیٹھو، تمہاری جگہ ان کے عقب میں ہے، خاموشی سے انہی کی مانند بیٹھ جاؤ۔" میں نے ان الفاظ پر غور کیا اور ہدایت کے مطابق بیٹھ گیا۔ قطب اور ابدال! .... میں نے دل ہی دل میں سوچا، بڑے مرتبے ہوتے ہیں۔ بھلا میرا ان کے درمیان کیا دخل، تاہم دو زانو بیٹھ کر گردن اسی انداز میں خم کر لی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے ان بند آنکھوں میں بہت سے مناظر روشن ہو گئے ہوں میں نے ان تمام سایوں کو کھڑے

ہوتے ہوئے دیکھا۔ مدھم مدھم آوازیں کانوں میں ابھر رہی تھیں اور گفتگو کی جارہی تھی پھر چند افراد
جانب متوجہ ہوئے اور ایک شخص نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہ تم قطب ہو نہ ابدال .... اور یہی تجویز کیا گیا ہے تمہارے لئے کہ ابھی رکنیت اختیار
رہو، ایک کارکن کی قدر و قیمت بھی بہت ہوتی ہے اور جو تجویز کیا جائے وہی زیادہ بہتر کہ ترک دنیا کیلئے
کچھ ترک کرنا پڑتا ہے لیکن برا نہیں کہ دنیا سے تمہارا تعلق رہے۔ ہاں جو ذمہ داریاں سونپی جائیں ان
انجام دہی کے بعد ہی منزل مل سکتی ہے۔ سو ذمہ داریاں نبھانے کیلئے ابھی بہت کچھ ہے، وقت مختصر
نہیں ہوتا، سوچ مختصر ہوتی ہے عمل طویل اور اس عمل طویل سے گزرے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ لیکن ترک
کرنا چاہو تو آرزو کرنا اور نہ چاہو تو نقصان نہیں، تمہارا واسطہ چند افراد سے ہے اور جہاں سے ابتداء ہوئی
وہاں واپسی لازم ہوگی اور اس کے بعد چھوڑنا چاہو گے تو قبول کیا جائے گا وہ بھی فیصلے کے بعد اور عمل کی
گن کر........... چنانچہ تمہارے لئے طے پایا کہ جہاں ذمہ داریاں سونپی جارہی ہیں وہاں تمہاری بھی کچھ
ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جو تم سے زیر ہوئے بے شک لیکن وہ ابھی حیات ہے، تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے
سات کھونٹے گاڑے ہیں اس نے اور یہ ساتوں کھونٹے اکھاڑنے ہیں تمہیں، کہ ذمہ داریاں تم پر ہے
کردی گئی تھیں جو پوریاں تم نے اپنی حماقت سے خود پر چڑھا رکھی تھیں وہ ایک گندی روح کا شکار ہوگئیں
اور تم خوش قسمتی سے اپنے وقت کی طوالت کو کم کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن وقت مختصر نہیں ہوتا اور
تمہیں اس طوالت سے گزرنا ہے۔ وہ سات کھونٹے رفتہ رفتہ تمہارے سامنے آئیں گے اور یہ تمہارا فرض
ہوگا کہ انہیں اکھاڑ پھینکو، بڑی بڑی باتیں ہی نہیں چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوتے ہیں اور صرف بڑے
کاموں کی طرف توجہ دینا بالکل غیر مناسب۔ سو یوں کرو کہ چل پڑو اور اسے ساتھ رکھنے میں کوئی حرج
نہیں ہے کم از کم اس وقت تک جب تک کہ ایک شیطان اس کا پیچھا کر رہا ہے تمہیں اس کی مدد کرنی
ہے۔ اسے بچائے رکھو اور جو چھوٹے چھوٹے ضرورت مند تم تک پہنچیں ان کی ضرورت میں کام آؤ
لیکن خاموشی سب سے بہتر ہوتی ہے اور تمہیں ہر کام خاموشی ہی سے کرنا ہے۔ خبردار کسی ستائش سے
نڈھال نہ ہوجانا کہ وہیں سے برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ہاں دلوں کو رکھنا بھی ایک عبادت ہے اس سے
گریز نہ کرنا اور جو دل میں آئے اسے زندہ رکھو ابھی تمہیں قتل کی اجازت نہیں ملی ہے اس کیلئے تو بڑے
مدارج طے کرنا ہوتے ہیں، بس اتنی ہی ذمہ داریاں تھیں تمہاری۔ واپسی میں وہ جگہ چھوڑ دو اور ضروری
نہیں کہ تم اس کا اعلان کرو کہ لوگ معصوم ہوتے ہیں اور عقیدت وسیع، لیکن اس میں کچھ برائیاں
بھی شامل ہوجاتی ہیں اور تمہیں اس سے گریز کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ بس اب واپسی اور نہ سمجھ پائے ہو
تو سمجھا دیا جائے گا کہ ابھی طالب علم ہو اور علم کے سمندر سے ایک قطرہ بھی حاصل نہیں کرسکے، تاہم جو
فرض پورا کر رہے ہو اس کا صلہ ضرور ملتا ہے، سو ملے گا۔ بس اب جاگ جاؤ۔“

مجھے زور دار جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے اچانک ہی بلندی سے نیچے گر پڑا ہوں۔ اسی طرح دوزانو
بیٹھا ہوا تھا لیکن آنکھوں کے سامنے نہ وہ جھنڈ تھا اور نہ وہ روشنی اور نہ ہی ابدالوں کی محفل بلکہ جہاں میں

سویا تھا وہی جگہ تھی اور کچھ فاصلے پر اکرام نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر دل و دماغ سنبھالتا رہا۔ دوبارہ آنکھیں
بند کرلیں اور ذہن میں وہ ہدایات تازہ کرنے لگا جو دی گئی تھیں۔ یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ فیصلہ کیا کہ فجر
کی نماز سے فراغت حاصل ہوتے ہیں سفر کا آغاز کردوں گا۔ فجر کی اذان دی تو اکرام جاگ گیا۔ کچھ دیر
کے بعد نمازی آنے شروع ہوگئے نماز پڑھی اور پھر اکرام کو صورتحال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

”اکرام یہاں سے چلنا ہے۔“

”کہاں مسعود بھائی؟“

”اللہ کی زمین وسیع ہے۔“

”بے شک لیکن کب؟“

”اب سے چند لمحات کے بعد۔“

”اوہ، تیاریاں کروں؟“

”تیاریاں کیا کرنی ہیں۔ بس اٹھیں گے اور چل پڑیں گے۔“

نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے اور میں اکرام کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ پھر ایک سمت
اختیار کر کے ہم تیز رفتاری سے چل پڑے۔ ذہن آزاد چھوڑ دیا تھا رفتار تیز تھی چلتے رہے دوپہر ہوگئی۔
دھوپ چلچلا رہی تھی۔ گرمی کے مارے بدن جلا جارہا تھا۔ ایسی شدید پیاس لگ رہی تھی کہ چکر آنے لگے
تھے۔ پھر یک بیک اکرام نے کہا۔

”وہ، وہ مسعود بھائی۔ وہ“ میں نے اس کے اشارے پر نگاہ دوڑائی۔ بہت دور گہرائیوں میں کچھ
درخت نظر آرہے تھے۔ میں نے ادھر کا رخ کرنے سے احتراز نہیں کیا۔ لیکن کافی فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔
خدا کی قدرت کا تماشا نظر آیا۔ درحقیقت اسے چشمۂ حیات کہا جاسکتا تھا۔ بے آب و گیاہ چٹانوں میں
انسان سے اللہ کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ ایک چٹان سے چشمہ رس رہا تھا اور پتھریلی شفاف گہرائیوں
میں ننھی سی جھیل ہلکورے لے رہی تھی۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ تہہ کے پتھر تک نظر آرہے تھے۔ ساتھ
ہی تاڑ کے درخت اگے ہوئے تھے۔ پیلے پکے تاڑ کے پھل دور دور تک زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔
اکرام نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”اللہ کی ملکیت ہے اور ہمیں اجازت ہے۔“ پانی پیا، تاڑ کے پھل کھائے اور آرام کرنے لیٹ
گئے۔ چشمے کے پانی سے چھو کر چلنے والی ہواؤں نے پلکیں جوڑ دیں اور سورج ڈھلے تک سوتے رہے
اکرام نے بدحواسی سے مجھے جگایا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”عصر کی نماز نکل گئی۔“

”ابھی وقت ہے؟“

ہم نے عصر کی اور کچھ دیر کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر سفر کیلئے تیار ہوگئے۔ پانی پیا اور چل
پڑے۔ دن کا سفر رہ گیا تھا اس لئے کسر پوری کی اور آدھی رات تک سفر جاری رکھا۔ اس طرح چار دن سفر

میں گزر گئے۔ پانچویں رات بھی ایک دشت میں قیام کیا تھا، لیکن یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر روشنی نظر آئی اور میں نے اکرام کو ادھر متوجہ کیا۔ اکرام نے ایک درخت پر چڑھ کر دور تک دیکھا پھر نیچے آکر بولا۔ ”پوری آبادی ہے اور کوئی اچھا خاصا شہر ہے۔“

”کیسے اندازہ ہوا.........؟“

”وہ جو روشنی سامنے نظر آرہی ہے کس قدر بلندی پر ہے۔ اس کے پس منظر میں بہت سی روشنیاں جل رہی ہیں۔ آسمان پر دن کا عکس یہاں سے بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔“

”گویا ہماری منزل۔“

”یہیں آنا تھا ہمیں؟“

”شاید۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”پھر اکرام سے پوچھا کہ آگے بڑھنے کی ہمت ہے۔“

”کیوں نہیں مسعود بھائی۔“

”آؤ پھر اس پہلی روشنی میں قیام کرتے ہیں۔ دیکھیں وہاں کیا ہے۔“ ہم چل پڑے۔ روشنی ایک خانقاہ کے چراغ کی تھی جو طاق میں جل رہا تھا۔ پہاڑی پتھروں کو چن کر ایک بلند کمرہ جیسا بنایا گیا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ انہیں پتھروں کا ایک قد آدم دیواروں والا احاطہ بنایا گیا تھا جس میں کسی انسان کا پتہ نہیں تھا البتہ کچھ اور چیزیں یہاں موجود تھیں مثلاً ایک سمت پتھروں ہی کو چن کر ایک چبوترا سا بنایا گیا تھا۔ دوسری سمت چند مٹکے رکھے ہوئے تھے جن میں پینے کا پانی تھا کیونکہ گلاس اور پانی نکالنے والا برتن بھی وہاں موجود تھا، احاطے کی وسعت اچھی خاصی تھی۔ چند درخت بھی لگے ہوئے تھے جن کی چھاؤں زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر کچھ جھنڈے جیسے بھی لگے ہوئے تھے جن سے یہ اظہار ہوتا تھا کہ یہ خانقاہ کسی کا مزار بھی ہے مگر مکمل ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی یہاں موجود نہیں تھا یا اگر کوئی ہو گا تو پھر اس وسیع و عریض کمرے کے اندر ہو گا ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہم تو روشنی دیکھ کر چلے آئے تھے اور اکرام کے بیان کے مطابق دوسری سمت ایک وسیع و عریض آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ مدہم مدہم روشنیاں اس آبادی میں زندگی کا پتہ دیتی تھیں۔ یہ جگہ خاصی الگ تھلگ تھی اور کسی پہاڑی کٹاؤ کی بلندی پر واقع تھی، بستی نیچے کی سمت آباد تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لیکر اکرام کو دیکھا اور کہا۔ ”اکرام اچھی جگہ ہے۔ کیا خیال ہے۔؟“

”ہاں مسعود بھائی آپ کے کہنے کے مطابق اللہ کی وسیع و عریض زمین پر ہر جگہ اچھی ہے۔“

”تو بس پھر یہیں قیام کرنا زیادہ مناسب ہو گا آؤ وہ گوشہ اپنالیں، درختوں کی پناہ میں پہنچ جائیں۔“

اکرام نے حسب عادت گردن ہلادی اور ہم نے ایک صاف ستھری جگہ ڈیرہ ڈال لیا، وقت گزر رہا تھا سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نجانے رات کا کونسا پہر تھا کہ اچانک کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور اکرام اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کوئی آرہا ہے بھیا۔“ اس نے کہا۔

”آنے دو، خدا کے بندے ہی ہوں گے۔“ میں لاپرواہی سے بولا۔

”معلوم کیا جائے کونسی جگہ ہے۔؟“

”میرا خیال ہے مناسب نہیں ہے، صبح سورج نکلے گا خود بخود پتہ چل جائے گا جو کوئی بھی ہے نجانے کس مقصد کے تحت آیا ہے۔“ اکرام خاموش ہو گیا اور ہم انتظار کرتے رہے۔ پھر یکے بعد دیگرے اوپر آنے والی سیڑھیوں سے چند سر ابھرے۔ مدھم روشنی میں ان کے خدو خال تو واضح نہیں ہوسکے تھے، آنے والوں کی تعداد غالباً سات تھی، کوئی سامان اٹھائے ہوئے آرہے تھے، خانقاہ کے دروازے کے بغلی حصے سے گزرتے ہوئے وہ غالباً خانقاہ کے عقب میں چلے گئے ہم خاموشی سے بیٹھے انہیں دیکھتے رہے تھے، جو کچھ بھی سامان لدا ہوا تھا ان کے شانوں پر۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ واپس آئیں انتظار کرتے رہے، لیکن کوئی واپس نہیں آیا اور پھر آہستہ آہستہ آنکھوں میں نیند رینگ آئی اور ہم دونوں ہی سو گئے۔ صبح کو معمول کے مطابق آنکھ کھل گئی تھی۔ فجر کی نماز کا وقت قریب آرہا تھا۔

”نماز پڑھ لیں اکرام۔“

”ہاں مسعود بھیا۔“

وضو کا انتظام تھا۔ نماز پڑھی اور پھر وہاں سے آگے بڑھ آئے۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ آسمان سے نور برس رہا تھا۔ تاحد نگاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس سمت آکھڑے ہوئے یہاں سے گہرائیوں میں بکھرا شہر نظر آرہا تھا۔

”نہ جانے کونسا شہر ہے۔“

”معلوم ہو جائے گا لیکن وسیع ہے اور خوبصورت ہے۔“

”اوہ۔ وہ دیکھئے۔“ اچانک اکرام نے اشارہ کیا۔ دو آدمی جو خانقاہ کے بغلی گوشے سے ٹہلتے ہوئے باہر آئے تھے۔ ہم ان سے زیادہ دور نہ تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا دونوں ٹھٹھک گئے۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے پاس آگئے۔ جوان آدمی تھے اور آنکھوں میں کسی قدر شبے کے آثار۔

”کیا کر رہے ہو یہاں۔“ ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

”ارے بھائی نہ سلام نہ دعا۔ عجیب سوال کیا ہے تم نے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”نماز سے فارغ ہوئے ہیں اور حسن خداوندی دیکھ رہے ہیں۔“

”نماز سے فارغ ہوئے ہو۔“ دوسرے نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

”کیا رات کو یہاں رہے ہو۔“ پہلا بولا۔

”ہاں۔ مسافر ہیں۔ سفر کر رہے تھے۔ روشنی دیکھ کر ادھر آگئے اور پھر یہاں پڑ رہے۔“

”کہاں تھے۔؟“

"اس درخت کے نیچے۔"

"کہاں سے آئے ہو۔"

"جوالا پور سے۔"

"اس خانقاہ کے بارے میں کیا جانتے ہو۔؟"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ تم پہلے انسان نظر آئے ہو۔ تم سے یہاں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ پھر ایک بولا۔

"بڑی غلطی کی ہے تم نے یہاں رات گزار کر۔"

"کیوں۔؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بہت خطرناک جگہ ہے۔"

"مگر ہمیں تو.......... ہمارا خیال تو تھا کہ یہ کسی بزرگ کا مزار ہے۔ یہ جھنڈا اور یہ.........."

"وہ تو ٹھیک ہے۔ یہ بھورے شاہ کا مزار ہے۔ لیکن۔"

لیکن کیا۔؟"

"بے وقوف۔ یہاں مغرب کے بعد کسی کا آنا منع ہے۔ مغرب سے پہلے پہلے لوگ چلے جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یہاں شیر آجاتے ہیں۔"

"شیر۔؟"

"ہاں۔ بھورے شاہ کے غلام۔ احاطے کی صفائی کرتے ہیں۔ بھورے شاہ کے دربار میں حاضری دیتے ہیں ہم لوگوں نے خود دیکھا ہے۔ ایسے میں اگر یہاں انسان موجود ہوں تو تم خود سوچو کیا ہوسکتا ہے۔"

"کیا ہوسکتا ہے۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"خوش نصیب ہو بچ گئے۔ ورنہ پتہ چل جاتا کہ کیا ہوتا ہے۔" دوسرا ہنس پڑا۔

"شیروں نے کسی کو ہلاک کیا ہے کیا۔"

"لوگ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ دھوپ چڑھے منتیں، مرادیں مانگنے آتے ہیں اور دھوپ ڈھلے چلے جاتے ہیں۔ کوئی ہو تو شیر اسے ہلاک کرے۔ آئندہ یہاں نہ رکنا۔"

"آپ لوگ کون ہیں؟"

"ہم خدام ہیں بھورے شاہ کے۔"

"شیروں نے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا۔؟"

"ہم تو اندر رہتے ہیں۔ مگر تم بحث کیوں کر رہے ہو۔" دوسرا تیز لہجے میں بولا۔

"اس لئے کہ ہمیں تم سے اختلاف ہے۔"

"کیسا اختلاف۔"

"شیر اگر یہاں آتے ہیں تو عقیدت مند بن کر۔ اس وقت وہ شیر نہ ہوتے ہوں گے بزرگ کے خادم ہوتے ہوں گے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ویسے یہ شہر کونسا ہے۔"

"عازم آباد۔ تم یہ بھی نہیں جانتے۔"

"ہاں۔ معلوم نہیں تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے اب معلوم ہوگیا۔ شام ہونے سے پہلے یہاں سے بھاگ جانا۔" وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے مسکرا کر اکرام کو دیکھا۔

"کیا کہتے ہو اکرام؟"

"عجیب سی باتیں ہیں، مگر ہمیں کیا؟"

"نہیں اکرام، اب یہی ہمارا ٹھکانہ ہے، جب تک۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اکرام نے چونک کر مجھے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔

عقیدت مندوں نے آنا شروع کر دیا تھا۔ پھول، ہار، چادریں، خانقاہ کا دروازہ کھل گیا۔ ہم نے بھی اندر موجود مزار کی زیارت کی ایک وسیع قبر بنی ہوئی تھی جو پھولوں اور چادروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد رش بڑھ گیا۔ کچھ خوانچے والے بھی آگئے۔ میری جیب میں آٹھ روپے موجود تھے جوالا پور سے نکل آئے تھے اس لئے خرچ پھر ملنے لگا تھا۔ جو کچھ ملا خرید کر پیٹ بھر لیا۔ یوں پورا دن گزر گیا۔ سر شام لوگوں نے واپسی شروع کر دی۔ کچھ گھبراہٹ سی پائی جاتی تھی۔ غالباً اسی روایت کا نتیجہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسان غائب ہوگئے، سورج چھپ گیا۔ ہم نے پرانا ٹھکانہ سنبھال لیا۔ خانقاہ کا دروازہ بند ہوگیا، چراغ روشن ہوگیا۔ اب اکرام بھی اس ماحول سے پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ رات کو اچانک وہ دونوں آگئے۔ پورے احاطے کا چکر لگا کر ہماری طرف آئے تھے۔

"ارے تم...... تم ابھی تک یہاں موجود ہو؟"

"ہاں بھائی، ابھی کچھ وقت یہاں گزاریں گے۔"

"اور ہم نے جو کچھ کہا تھا۔"

"اللہ مالک ہے۔"

دونوں کچھ سوچتے رہے، پھر واپس پلٹ گئے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وہ پھر آئے ایک کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے۔

"خانقاہ کے مہمان بنے ہو تو لو کھانا کھاؤ۔"

"جزاک اللہ۔" میں نے انحراف نہ کیا۔ وہ کھانا رکھ کر چلے گئے اور ہم کھانے میں مصروف ہوگئے۔ پانی کے برتن بھی تھے، عمدہ کھانا تھا خوب ڈٹ کر کھایا، پھر پانی پیا۔ لیکن اچانک۔ پانی پیتے ہی بُری طرح چکرانے لگا۔ عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ اکرام لمبا

ہوگیا۔ میں نے اسے آواز دینا چاہی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی اور پھر میں بھی دنیا و مافیہا سے بےنیاز ہوگیا۔

غالباً صبح ہوگئی تھی۔ کچھ رخنوں سے دھوپ کی لکیریں زمین کرید رہی تھیں اور دن کی وجہ سے اردگرد کا ماحول خوب روشن ہوگیا تھا۔ میری نگاہوں نے اطراف کا جائزہ لیا: بدن کے نیچے کھردرا سنگی زمین، بھورے رنگ کی ناہموار دیواریں تھیں جن رخنوں سے روشنی کی لکیریں جھانک رہی تھیں وہ بے ترتیب تھیں یعنی روشندان نہیں تھے، بلکہ باریک باریک درزیں پڑی ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر ہوجاتا تھا کہ کوئی پہاڑی غار ہے۔ نگاہوں نے اپنا کام پورا کیا تو دوسرے احساسات جاگے۔ اور ان میں پہلا احساس یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں نہایت مضبوطی سے کس کر باندھ دیئے گئے ہیں اور اس طرح کہ یہ بندشیں کھولی نہ جاسکیں۔ فوراً ہی اکرام کا خیال آیا۔ دیواریں اور چھت تو دیکھ لی تھی۔ فرش پر اکرام کے تصور سے نظر دوڑائی تو وہ ایک دیوار ہی سے لگا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ مجھ سے پہلے جاگ گیا تھا مگر جاگنے کی بات کہاں؟ اسے تو بیہوشی کے بعد ہوش کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اکرام کی صورت دیکھتے ہوئے میں نے گزرے لمحات پر نظر دوڑائی اور صاف ظاہر ہوگیا کہ جو کھانا ہمیں دیا گیا تھا اس میں کوئی خواب آور شے ملی ہوئی تھی۔ کچھ اور پیچھے ذہن دوڑایا تو وہ لوگ یاد آئے جنہوں نے کھانا دیا تھا۔ ہمارے بارے میں ان کے سوالات کرنے کا انداز مشکوک تھا اور اس کے بعد غالباً انہوں نے ہمارے بارے میں فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کے تحت ہمیں خانقاہ کا مہمان بنایا گیا تھا۔ لیکن کیوں، آخر کیوں؟ اکرام بھی یقیناً بیہوش زمین پر پڑا ہوا ہوگا اور کھسک کھسک کر اس نے دیوار کی پشت پناہی حاصل کی ہوگی۔ میں نے بھی اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دے کر دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ میں بھی کھسک کر اکرام کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ سو میں نے اس پر عمل کر ڈالا اور چند لمحات کے بعد اس دیوار سے جالگا۔ اکرام ساکت بیٹھا ہوا تھا اس کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی اور وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"بس یہی تمام سب کچھ اور ایک اور بات بھی سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"مسعود بھائی اگر انسان کو زندگی میں کوئی ایسا دکھ نہ مل جائے جو اس کے دل کو داغدار کرتا ہے تو پھر بات یہ ہے کہ یہ زندگی جو میں گزار رہا ہوں یا اگر آپ مجھ سے اتفاق کریں تو ہم گزار رہے ہیں، بری نہیں ہے۔"

"ارے انوکھی بات کہی تم نے اکرام۔ یعنی یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں، تمہیں پسند ہے؟"

"ہاں اب پسند آگئی ہے کم از کم اس میں لمحہ لمحہ تبدیلیاں تو ہیں، تجسس تو ہے، انفرادیت ہے، خطرہ ہے، بلکہ میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ جو لوگ ایک لگی بندھی زندگی گزارتے ہیں، گھر سے دفتر یا پھر دکان یا کھیت یا کسی بھی جگہ جہاں سے انہیں رزق حاصل ہوتا ہے اور اس کے بعد واپس گھر، یکسانیت ہوتی ہے اس زندگی میں۔ اور یہ زندگی جس میں کچھ وقت میں نے گزارا ہے توقع کے برعکس ہے۔ اس

میں یہ نہیں ہوتا کہ دکان پر جانا ہے، سامان بیچنا ہے، واپس آجانا ہے، دفتر جانا ہے، فائلوں میں وقت گزاری کرنی ہے، گھر کا رخ کرنا ہے۔ بلکہ اس میں پتہ نہیں ہوتا کہ آگے کیا ہوگا؟ اور جب کچھ ہو جاتا ہے تو وہ لطف دیتا ہے۔"

"بڑے فلسفی بنے ہوئے ہو، اس وقت۔ ہاتھ پاؤں نہیں دیکھ رہے۔"

"دیکھ رہے ہیں، لیکن لطف آرہا ہے یہ سوچ کر کہ ہوا کیا ہے، اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے؟" اکرام کے لہجے میں درحقیقت ذرا بھی خوف کا نشان نہیں تھا اور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں نے ایک سمت کچھ آہٹیں سن کر کہا، "لو بتانے والے آگئے۔"

بتانے والے دو افراد تھے، دراز قامت، گیروا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، بہترین جسامت کے حامل اور کرخت چہروں والے ایک دروازے سے اندر آئے تھے اور ہمارے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ دونوں کڑوی نگاہوں سے ہمیں گھورنے لگے۔ میں نے کہا۔

"بھائی باقی تو جو کچھ ہے وہ آپ بہتر جانتے ہیں البتہ ایک زیادتی ضرور ہوئی ہے ہمارے ساتھ۔ فجر کی نماز قضا کرادی آپ نے اور اب تو سورج اتنا نکل آیا ہے کہ، کہ۔"

"زیادہ شریف بننے کی کوشش مت کرو۔ جو کچھ تم سے پوچھا جائے اس کا جواب دو ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی بھر کیلئے اپاہج ہوجاؤ گے۔ سڑکوں پر گھسٹتے پھروگے دوستانہ مشورہ ہے تمہارے لئے کہ تم سے جو کچھ پوچھا جائے بالکل سچ اور صاف بیان کردو۔"

"ٹھیک ہے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لیکن آپ لوگ بھی وعدہ کریں کہ ہمارے کہے کو سچ سمجھیں گے۔"

"اس کا تو پتہ چل جائے گا زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔"

"چلئے یہ بھی وعدہ ہے کہ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

"تو پھر یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو؟"

"خدا کے فضل سے انسان ہیں، مسلمان ہیں، مسافر ہیں، بس نہ اس کے کچھ آگے نہ کچھ پیچھے۔"

"ایک جملہ بھول گئے۔" ان میں سے ایک نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھلا وہ کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"سی آئی ڈی والے ہیں۔" وہ شخص بولا اور مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا، "ارے نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس مسافر ہیں اور یہ جانے بغیر اس طرف نکل آئے تھے کہ یہ کون سا شہر ہے، ہمیں پتہ نہیں چلا۔ جنگل کی جانب سے ادھر پہنچے تھے، خانقاہ کا پہلا چراغ نظر آیا سو اسی جانب چل پڑے۔ اس سے پہلے کبھی نہ اس شہر میں آئے نا بھورے شاہ کے مزار پر۔"

"بکواس مت کرو۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔"

"ہم نے تو وعدہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولیں گے، تو جھوٹ نہیں بولے۔ لیکن آپ اپنے وعدے پورے نہیں اتر سکے۔ اب اس کے بعد آپ کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہیں ہمارے بارے میں فیصلہ کریں۔ جھوٹ نکلے تو قابل سزا ہوں گے ہم اور سچ نکلے تو ہمیں رہائی دے دیجئے۔"

"رہائی کی بات کر رہے ہو، یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے تم سمجھے!"

"تقدیر موت کیلئے وقت اور جگہ متعین کرتی ہے اگر باری تعالیٰ نے یہی جگہ ہماری موت کیلئے تجویز فرمائی ہے تو آپ بھی ہمیں معاف کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں گے۔ موت برحق ہے بھائی بھلا اس سے کیا خوفزدہ ہونا!"

"دیکھو ابھی تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی جا رہی، تمہارا فیصلہ بابا بھورے شاہ کریں گے وہ موجود نہیں ہیں، آجائیں گے تو تمہارے بارے میں انہیں بتا دیا جائے گا۔ البتہ ایک بات ہم ضرور بتا دیتے ہیں۔ ہمیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ تمہارا تعلق سی آئی ڈی پولیس سے ہے یا نہیں اور بابا بھورے شاہ کا ایک اصول ہے کہ اگر وہ کسی کے ساتھ مہربانی کرنا چاہیں اور اس کے باوجود وہ ان سے جھوٹ بولے تو پھر وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ اپاہج کر دیتے ہیں تمہاری زبان کاٹ دی جائے گی یا ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں اور اس کے بعد تمہیں مزار سے دور پھنکوا دیا جائے گا۔ تم یہ نہیں کہہ پاؤ گے کسی سے کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑیئے۔ لیکن کیا آپ یہ بات بتائیں گے ہمیں کہ مزار پر سی آئی ڈی والوں کا کیا کام ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ آپ کو یہ شبہ کیسے ہوا ہم پر کہ ہم سی آئی ڈی والے ہیں یہاں بھلا کون کیا کھوج کرنے آسکتا ہے؟ یہ تو روحانیت کا معاملہ ہے۔ یہاں لوگ نیکیوں کے لئے تو آسکتے ہیں بھلا سی آئی ڈی والے یہاں کیا پتہ چلانے آئے ہیں؟"

"میں نے کہا نا چالاک بننے کی کوشش نہ کرو سمجھے تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے، حالانکہ اصولی طور پر کھولے نہیں جانے چاہئیں۔ پیر بندھے رہیں گے تاکہ تم بھاگ نہ سکو، یہ بھی ایک حماقت کی بات ہوگی کیونکہ پیر تم اپنے ہاتھوں سے کھول سکتے ہو، لیکن یہاں تمہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی، پیروں کی رسی کھلی پائی گئی تو تمہارے ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے سمجھے۔ جب تک بابا بھورے شاہ تمہارے بارے میں فیصلہ نہ کر دے اسی جگہ بندھے رہو گے، ہاتھ اس لئے کھولے جا رہے ہیں کہ اپنے چھوٹے موٹے کام کر سکو، ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے لئے ناشتہ پہنچ جائے گا، کھانا پینا اور یہیں لوٹیں لگانا۔ خبردار یہاں سے باہر نکلنے کا وہی ایک دروازہ ہے، دروازے کے آگے ایک چھوٹی سی سرنگ ہے اور اس سرنگ کے دوسرے حصے پر زبردست پہرہ موجود ہے، پہریدار یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم سرنگ کے دہانے تک کیسے پہنچے انہیں جو ہدایت ملی ہے اس پر عمل کریں گے۔ بس اتنی ہی بات کرنی تھی تم سے، چلو رسیاں کھول دو۔"

ہمارے ہاتھوں کی رسیاں کھول دی گئیں۔ میں نے گردن خم کر کے کہا بہت بہت شکریہ بھائی۔ ہم

آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"کیا کیا نام ہیں تمہارے؟"

"میرا نام مسعود احمد ہے اور یہ اکرام علی ہے۔"

"اور تمہارا تعلق جوالا پور سے ہے۔"

"ہاں جوالا پور سے بھی ہے۔" ان دونوں نے میرے اس "بھی" پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ہوشی سے کھولی ہوئی رسیاں اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔ میں اور اکرام اپنی کلائیاں مسل رہے تھے جن پر بندھے ہونے کی وجہ سے خاصے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ اکرام کے بارے میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کے اندر بے حد پختگی پیدا ہو گئی ہے اور وہ کسی بھی قسم کے حالات سے گھبراتا نہیں ہے۔ کلائیوں کی سوزش جب ختم ہو گئی تو اکرام نے مجھ سے کہا، "کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں، مسعود بھائی؟"

"ابھی اس پر غور ہی نہیں کیا، اکرام۔"

"مجھے تو کچھ اور لگتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ خانقاہ ڈھونگ ہے اور ہو سکتا ہے یہ قبر بھی جھوٹی قبر ہو، ایسی داستانیں اکثر سنی ہیں اس قسم کے جعلی مزارات بنا لئے جاتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر بہت سی برائیاں کی جاتی ہیں۔ معصوم اور سادہ لوح انسانوں کو جال میں پھانس کر ان سے چڑھاوے وصول کئے جاتے ہیں۔ آپ یقین کیجئے مجھے تو اسی وقت شبہ ہوا تھا جب ہمیں شیر کی کہانی سنائی گئی تھی۔ بلاشبہ بزرگان دین کا ایک مرتبہ ہوتا ہے اور وہاں نجانے کیا کیا ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح اس کی پبلسٹی نہیں ہوتی اور پھر آپ ان لوگوں کو بھی نہیں بھول سکے ہوں گے جنہیں ہم نے رات کی تاریکی میں سامان اٹھا کر آتے ہوئے دیکھا تھا، کچھ چکر ضرور چل رہا ہے، یہاں کوئی جرم ہو رہا ہے۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے اگر ہمارے سپرد اس جرم کی بیخ کنی کی گئی ہے تو ہم اپنا فرض ضرور پورا کریں گے۔"

"آئندہ ارادہ کیا ہے؟" اکرام نے پوچھا اور میں مسکرایا۔ میں نے کہا، "ارادہ یہ ہے کہ پاؤں کی رسی کھولنے کی کوشش نہیں کریں گے، دیکھتے ہیں کہ یہ بھورے شاہ صاحب، ارے ہاں ایک بات تو بتاؤ، مزار بھورے شاہ ہی کا تو ہے اور وہ کہہ گئے ہیں کہ بھورے شاہ آ کر فیصلہ کریں گے۔ گویا صاحب مزار زندہ ہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جلد بازی میں کہہ گئے ہیں، شاید۔ ویسے اب ہم ان کے قبضے میں ہیں ہم سے انہیں خطرہ بھی تو نہیں ہوگا۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے، پھر ہمیں ناشتہ دے دیا گیا۔ مکئی کے آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں اور ان پر مکھن کے لوندے رکھے ہوئے ساتھ ہی چھاچھ کے دو بڑے بڑے گلاس، ناشتہ تو واقعی بہت عمدہ تھا لطف دے گیا۔ بڑے عرصے کے بعد ایسی کوئی چیز کھائی تھی اکرام بھی پوری طرح

لطف اندوز ہوا البتہ اس نے کہا، "ناشتہ بہترین ہے لیکن اسے ہضم کرنے کیلئے تھوڑی سی چہل قدمی ہونی چاہیئے تھی۔ "

"نہیں ایسے ہی سب ٹھک ہو جائے گا۔ "

غالباً وہاں دوپہر کے کھانے کا رواج نہیں تھا یا پھر میزبانوں نے زحمت اٹھانے کی کوشش نہیں کی تو چنانچہ دوپہر یونہی گزر گئی ویسے بھی ناشتہ دیر ہضم تھا شام کو پانچ بجے کے قریب ہی بھوک لگی تھی۔ ساڑھے چھ بجے غار میں کوئی روشنی لے کر پہنچ گیا، دیئے تھے جو شاید سرسوں کے تیل سے جلائے گئے تھے۔ دیئے غاروں کے ابھرے ہوئے پتھروں پر رکھ دیئے گئے اوپر سے روشنی بخشنے والے چراغ نایاب ہوگئے تھے اور اب یہ سرسوں کے تیل کی روشنی والے چراغ، غار کی دیواروں کو مدھم سی پیلاہٹوں کا شکار کر چکے تھے آنے والے وہیں کھڑے ہوگئے اور کچھ دیر کے بعد ایک شخص اسی دروازے کے اندر داخل ہوا یہ بھی اچھے تن و توش کا مالک تھا اس کے ساتھ آنے والے مشعلیں اٹھائے ہوئے تھے۔

سیاہ لمبے لبادے میں ملبوس شخص جس کے بال شانوں سے نیچے تک بکھرے ہوئے تھے ہمارے سامنے پہنچ گیا۔ دو آدمیوں نے ہماری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کر دیا تھا غار میں چھ سات افراد موجود تھے۔ آنے والے نے مشعل، مشعل بردار کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لی اور ہمارے چہرے کے قریب کرکے ہمیں غور سے دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

"اور تم کہتے ہو تمہارا تعلق سی آئی ڈی سے نہیں ہے۔ "

"نہیں پیر صاحب ہم تو غریب مسافر ہیں جو ادھر سے گزرتے ہوئے اس مزار کو پناہ گاہ سمجھتے ہوئے ادھر آ گئے۔ "

"میں پیر نہیں ہوں، خبردار جو اس کے بعد تم نے مجھے پیر کہا۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں، بدترین کردار کا مالک ایک ذلیل ترین انسان ...... اس کے بعد مجھے پیر یا بزرگ کہہ کر مخاطب مت کرنا یہ لوگ مجھے بابا بھورے شاہ کہتے ہیں میں وہ بھی نہیں ہوں یہ نام میں نے مجبوراً قبول کیا ہے مگر چھوڑو...... تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے تم سے کہا گیا تھا کہ رات کو مزار پر رکنے کی کوشش مت کرنا تم نے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟"

"ہمارا یہاں اس شہر میں کوئی شناسا ہے نہ کوئی ٹھکانہ۔ کچھ وقت یہاں گزارتے، اپنا کھاتے پیتے، پھر یہاں سے آگے بڑھ جاتے بلکہ کسی مزار پر قیام تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا محبوب مشغلہ ہے بس یونہی آوارہ گرد پھرتے ہیں کبھی کہیں جا پڑتے ہیں کبھی کہیں، نہ کوئی گھر ہے نہ بار ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کہا تھا کہ اگر جھوٹ نکلے تو آپ اپنے اصولوں کے مطابق عمل کیجئے ہم اسے اپنی تقدیر سمجھ لیں گے۔ "

"عجب لیچڑ آدمی ہو تم لوگ، پڑھے لکھے ہو......؟"

"جی تھوڑے بہت ...... "

"شامی اگر یہ پڑھے لکھے ہیں تو کیوں نہ انہیں عرضیاں لکھنے پر لگا لیں بھاگ تو سکیں گے نہیں، اندازہ

ہو جائیں گے کہ ان کے بارے میں غلط لوگ نکلے تو ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ عرضی لکھنے والوں کی بڑی پریشانی ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مشکل مجھے اسی کام میں پیش آتی ہے۔ "

"جو حکم بڑے بابا، جیسا آپ کہو۔ " جس شخص کو شامی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، اس نے

"ٹھیک ہے، سنو! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو خاموشی سے یہاں بیٹھ کر عرضیاں لکھا کرو، یہ لوگ تمہیں بتا دیں گے کہ عرضیاں کیسے لکھی جاتی ہیں بعد میں بھروسے کے آدمی ثابت ہوئے تو بڑا مقام دیا جائے گا دوسری صورت میں ہم تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ تمہارے بارے میں تصدیق نہ ہو جائے کہ تم سی آئی ڈی کے آدمی نہیں ہو بھوکے پیاسے مرو گے یہاں پر۔ تم اگر انسان بن کر رہنا چاہتے ہو تو یہاں تمہیں جو کام بتایا جائے اسے سرانجام دو، تین وقت کا کھانا، چائے ناشتہ سب ملے گا اور تمہارا کام پسند آ گیا تو نوکری مستقل بھی ہو سکتی ہے، معاوضہ جو مانگو گے مل جائے گا اس کی فکر نہیں ہے۔ " میں نے سنجیدہ نگاہوں سے اس بڑے بابا کو دیکھا جو بھورے شاہ کہلاتا تھا فی الحال اس سے تعاون کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا چنانچہ میں نے گردن خم کرکے کہا، "آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ "

"بس، بس شامی تم اس کے انچارج ہو، ان دونوں کا خیال رکھو گے اور سنو میرے اصول جانتے ہو، گہری نظر رکھنا ان پر ...... لیکن کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ ہو اور جو آسانیاں کسی انسان کو دی جا سکتی ہیں وہ انہیں دی جائیں اور یہ اگر ان آسانیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو جس چیز کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کریں اس سے ان کو محروم کر دینا میرا مطلب ہاتھ پاؤں اور آنکھیں ہیں۔ " وہ شخص یہ کہہ کر تیزی سے واپس مڑا۔ بڑا پھرتیلا معلوم ہوتا تھا باقی لوگوں کو اس کے پیچھے دوڑنا پڑتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد غار پھر خالی ہو گیا۔

پیلی روشنی میں غار کا ماحول بیحد پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ اکرام بھی بالکل خاموش تھا مگر جب یہ خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے اسے توڑا۔

"کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو اکرام؟"

"بڑے بابا...... " اکرام نے کہا اور ہنس پڑا۔

"تمہیں اس کے وہ الفاظ یاد ہیں؟"

"کون سے؟"

"جب میں نے اسے پیر کہا تھا۔ "

"ہاں یاد ہیں ساری باتیں انوکھی ہیں اور مسعود بھائی یہ عرضیاں کیا ہیں؟"

"وہی لوگ بتائیں گے تو پتہ چلے گا۔ "

"چلئے کیا فرق پڑتا ہے تین وقت کے کھانے کا تو وعدہ کیا ہے۔ " اکرام ہنستا ہوا بولا۔

میں سوچ میں ڈوبا رہا ایک یقین دل کو تھا جہاں میرے قدم پہنچتے تھے، بے مقصد نہیں ہوتے تھے، روانہ

ہونے سے قبل ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جانا ہے اس بار بھی ہدایات ملی تھیں اور جو کچھ کہا گیا تھا مجھے یاد تو چنانچہ اب یہاں آیا تھا گو نئی اور انوکھی دنیا تھی مگر دلچسپی سے خالی نہیں تھی نماز کے اوقات کی پریشانی کے علاوہ اور کوئی پریشانی نہیں تھی۔

دوسرے دن ان عرضیوں کے بارے میں معلوم ہوا شامی کو ہمارا انچارج بنایا گیا تھا وہی ہمیں لے کر ایک اور غار میں پہنچا تھا یہاں ایک موٹا قالین بچھا ہوا تھا جس پر دو ڈیسک رکھے ہوئے تھے کاغذ قلم کا معقول انتظام تھا سامنے دیوار میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا ہمیں قالین پر بٹھا دیا گیا شامی بولا۔

"دیکھو........ شام چار بجے سے چھ بجے تک تمہیں اس لاؤڈ اسپیکر سے آوازیں سنائی دیں گی، عورتوں کی آوازیں بھی ہوں گی مردوں کی بھی...... وہ اپنا نام پتہ بتائیں گے پھر منت مانیں گے دل کی مرادیں بتائیں گے جو کچھ وہ کہیں گے تمہیں اس میں سنائی دے گا تم دونوں ان کے نام پتے اور جو کچھ بھی وہ کہیں کاغذ پر لکھ لینا۔ ہر عرضی کو الگ الگ سنبھال کر رکھنا "بڑا بابا" انہیں دیکھے گا۔"

"ایک کام کرنا ہے تمہیں، شامی۔"

"ہاں بولو.........." اس نے کہا۔

"کسی بھی قسم کی ایک گھڑی ہمیں چاہئے۔"

"کیوں..........؟"

"نماز کے وقت کیلئے پریشانی ہوتی ہے۔ غار میں پتہ نہیں چلتا۔"

"مل جائے گی۔ اور کچھ.........."

"وضو وغیرہ کیلئے پانی بھی درکار ہوگا۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"بس تمہارا شکریہ.........." میں نے کہا، ہمارا کام اسی دن سے شروع ہو گیا تھا بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی اکرام نے کہا، "کچھ سمجھے مسعود بھائی؟"

"ہاں اکرام، وہی تمامتر انسانی کمزوریاں اور ان سے فائدہ اٹھانے والے ان لوگوں نے بھورے شاہ کے نام پر ایک جعلی مزار بنا لیا ہے، لوگ منتیں مرادیں مانگتے ہوں گے اور ان لوگوں کا کاروبار چل رہا ہوگا۔"

"ویسے بڑے ظلم کا کام ہے، مسعود بھائی.......... انسان اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر ایسی باتوں کا سہارا لیتا ہے اور جھوٹے دلاسوں میں کھو جاتا ہے اب ظاہر ہے یہ لوگ انہیں بلانے تو نہیں جاتے ہوں گے، خود ہی یہاں یہ سب آتے ہیں اور ان چالاک انسانوں نے انہیں احمق بنانے کیلئے یہ سارا کھیل رچا رکھا ہے۔ کیا کہا جائے، غلطی کس کی ہے لیکن کیا آپ کا ضمیر اس چیز کو قبول کر لے گا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجبوریوں کے بارے میں تم کیا کہہ سکتے ہو اکرام.......... اگر ہم یہ نہ کریں تو تمہارا کیا خیال ہے یہ لوگ ہمیں آسانی سے چھوڑ دیں گے؟" اکرام ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دل

میں سوچا کہ لازمی امر ہے جو لوگ یہاں آتے ہوں گے وہ مصیبتوں کے شکار ہوتے ہوں گے مصیبتوں کا حل وہ انہی ذرائع سے چاہتے ہیں یہ بھی ایمان کی کمزوری ہے۔ بزرگان دین صرف دعائیں کر سکتے ہیں اللہ سے ان کیلئے، اور ہر دعا پوری کرنیوالا اللہ تعالیٰ ہے اگر ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا کسی طرح اگر میرے علم میں آ جائے تو میں اس چالاک شخص ہی کو سہی، یہ بتا دوں کہ انہیں کیا کرنا ہے کیا اچھا ہو کہ اگر کسی طرح مشکل میں گھرے انسانوں کو ان کی مشکل کا حل مل سکے بس ایک احساس سا آیا تھا۔

وقت ہو گیا۔ شامی نے مجھے گھڑی لا کر دے دی تھی اور ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر ان لوگوں سے تعاون کیا جائے تو ان کا رویہ ہمارے ساتھ بہتر ہی رہے گا۔ وقت مقررہ پر شامی نے ہی آکر مجھے ہوشیار کیا، کہنے لگا...... "بس اب سے چند لمحات کے بعد آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ خبردار ہوشیاری سے اپنا کام سرانجام دینا۔"

میں نے اکرام کو بھی ہوشیار کر دیا دونوں آدمیوں کو اس لئے متعین کر دیا گیا تھا کہ اگر ایک سے سننے میں کچھ غلطی ہو جائے تو دوسرا اس غلطی کا ازالہ کر لے۔ لاؤڈ اسپیکر پر کھڑکھڑاہٹیں سنائی دینے لگیں پھر رونے کی آواز ابھری، کوئی مرد ہی تھا زارو قطار رو رہا تھا میں اور اکرام اس آواز کو سننے لگے پھر اس شخص کی روندھی ہوئی آواز ابھری۔

"یا درویش، یا ولی اکیلا بیٹا ہے میرا، بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا بچا لو اسے ولی، بچا لو میرے بچے کو ولی...... وہ ڈائن کھا گئی اسے...... وہ ڈائن اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی بچا لو اسے ولی بچا لو اسے میرا نام شاکر علی ہے اور میں یہیں اسی بستی میں رہتا ہوں۔ اکیلا بیٹا ہے میرا، شادی کر دی تھی میں نے اس کی، وہ پاپی عورت جو اس کی بیوی بن کر آئی تھی اسے کھا گئی، کہیں کا نہ چھوڑا اسے نجانے کیا کیا تعویذ گنڈے کرا دیئے ہیں اس کیلئے، سوکھتا جا رہا ہے اور اب پلنگ سے لگ گیا ہے میرے بیٹے کا نام ناصر ہے، ولی رحم کر دو...... وہ جادو کے زیر اثر ہے یہ جادو توڑ دو اس کا...... میں...... میں کسی کی دشمنی نہیں چاہتا بس میرے بیٹے کی زندگی مجھے مل جائے ولی اسے معاف کر دو اسے بچا لو۔" وہ شخص زارو قطار روتا رہا پھر ایک اور آواز سنائی دی۔ "چلو وقت ختم ہو گیا، وقت ختم ہو گیا ہے تمہیں فوراً باہر نکل جانا ہے۔"

"میرا خیال رکھنا ولی اگر میرا کام ہو گیا تو چادر چڑھاؤں گا، لنگر کروں گا، مزار کیلئے دس ہزار روپے دوں گا ولی میرا یہ کام کرا دو۔"

"جاؤ بھائی جاؤ...... اب دوسرے کی باری ہے۔" میں نے اور اکرام نے شاکر علی کا نام اور اس کی شکایت لکھ لی تھی اور دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ اکرام نے مجھے دیکھا تھا شانے ہلائے تھے، پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہمارا نام پاروتی ہے، بھورے مہاراج، بستی چنار پور کے رہنے والے ہیں ہم۔ کیتھو رام نے کہا تھا ہندو مسلمان سب کے کام آؤ ہو، ہمارا پتی بھوگندر ناتھ مایا جال میں پھنس گیا ہے۔ ایک سسری بیسوا

اس کے پیچھے لگ گئی ہے. جان کو اٹک گئی ہے وہ اس کے۔ اس نے پتی چھین لیا ہے ہمارا. بھگوان سوگند بڑا پریم کرتا تھا ہم سے، پریم کر کے ہی شادی کی تھی، اس نے ہم سے۔ مگر وہ زکھنی اب اسے ہمارے پاس نہ آنے دیوے ہے، ہم ہتھیا کرلیں گے مہاراج۔ نا چاہئے ہمیں دھن دولت ٹکڑے کھا کر گزار کرلیں گے، ہم کو ہمارا پتی ہمیں دلوا دو...... ہمارا پتی ہمیں دلوا دو...... منہ مانگا دیں گے جو مانگو دیں گے، دیا کرو ہم پر مہاراج، دیا کرو۔ ”

”چلو بہن، اب دوسرے کی باری ہے۔“ آواز آئی۔

”دیا کرو ہم پر مہاراج ...... دیا کرو...... ”

بے بس لوگ، دکھ بھری کہانیاں، دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے سب مشکل کا شکار، کسی کی کوئی مشکل کسی کی کوئی مشکل، کوئی بیس عرضیاں لکھی تھیں کام ختم ہوگیا، وقت ختم ہوگیا تھا۔ میں نے اکرام سے پوچھا۔

”اکرام تم نے سب کے دکھ لکھ لئے؟“

”ہاں مسعود بھیا...... ”

”اگر تم سے یہ عرضیاں مانگی نہ جائیں تو انہیں محفوظ رکھنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

ہم وہاں سے نکل کر اپنی رہائشگاہ آگئے پھر رات کے کھانے سے فراغت ہوئی تھی کہ بھورے شاہ آگیا۔ شامی اور دو اور آدمی اس کے ساتھ تھے، مٹی کے تیل کے کچھ لیمپ بھی ساتھ لائے تھے جنہیں روشن کر کے رکھ دیا گیا۔ بھورے شاہ کا موڈ بہت اچھا تھا مجھے دیکھ کر بولا، ”کہئے دولہا میاں عرضیاں لکھیں؟“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی ہے۔“ میں نے ادب سے کہا اور عرضیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا۔

”واہ ...... یہ خوب رہی...... ”

”کیا مطلب...... ؟ میں سمجھا نہیں۔“

”ارے بھائی، ہم پڑھ لکھ سکتے تو لکھ بھی لیتے، تمہیں کیوں تکلیف دیتے، پڑھ کر سناؤ!“ اس نے کہا اور میں اسے عرضیاں پڑھ کر سنانے لگا اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور خاموشی سے ساری عرضیاں سننے لگا تھا میں نے آخری عرضی بھی پڑھ کر سنا دی وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا، ”شامی! او شامی...... ”

”جی بڑے بابا...... ”

”آدمی تو کام کے لگتے ہیں۔“

”اچھے لوگ ہیں بابا، نمازی پرہیز گار بھی ہیں۔“

”خیال رکھنا ان کا کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔“

”جی بڑے بابا۔“ شامی نے کہا اور پھر وہ عرضیاں لے کر چلا گیا۔ میں نے یا اکرام نے اس وقت کچھ

پوچھا تھا لیکن دوسرے دن جب شامی ملا تو میں نے اسے پوچھ لیا۔ ”آج کس وقت عرضیاں لکھنی ہیں شامی؟“

”دو دن کے بعد...... آج منگل ہے ...... اب جمعرات کو لکھنا ہوں گی پیر کو فیصلے سنائے جاتے ہیں۔“

”فیصلے...... !“

”ہاں بڑے بابا فیصلے لکھواتا ہے، یہ کام بھی تمہیں کرنا ہوگا اتوار کو۔“ میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ اکرام صابر انسان تھا، میرے ساتھ ہر حال میں خوش رہتا تھا اس دوران میں نے تہجد میں اضافہ بھی کیا اور اپنے لئے حل مانگا مگر خاموشی رہی تھی۔ جمعرات کو پھر بیس عرضیاں لکھیں اور ہر اتوار کو بھورے شاہ صبح صبح میرے پاس آبیٹھتا۔

”مسعود نام ہے تیرا رے بھائی؟“

”ہاں...... !“

”چل بیٹھ جا...... منگل کی عرضیوں کے جواب لکھنے ہیں۔“

”جی شاہ صاحب۔“

”نا بھائی نا...... اللہ کے واسطے ایسی کوئی بات مت کہہ میاں سب ہمیں بڑے بابا کہتے ہیں تو بھی بڑے بابا کہہ...... یہ شاہ، ولی اور درویش تو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں تو ہم جیسے شیطان کو ان سے کہاں ملا رہا ہے، بس بڑا بابا کہہ کر کام چلا لیا کر۔“

میں نے ایک بار حیران نگاہوں سے بھورے شاہ کو دیکھا۔ یہ آدمی واقعی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک لمحے اس نے آنکھیں بند رکھیں اور اس کے بعد بولا، ”ہاں پہلی عرضی کیا ہے؟“

پہلی عرضی شاکر علی کی تھی، جس کا بیٹا ناصر علی مصیبت کا شکار تھا اور بقول شاکر علی کے اس کی بیوی نے اس پر جادو کرا دیا تھا، بھورے شاہ ہنس پڑا۔

”عورت کا جادو تو ویسے بھی سر چڑھ کر بولتا ہے، بڑے میاں کو اپنی بہو سے اختلاف ہوگا یہ کہانی تو ہر گھر میں چل رہی ہے۔ چلو ٹھیک ہے لکھ دو اس کے آگے کہ، سات تعویذ دیئے جائیں گے اور ساتھ فیتے دیئے جلانے کیلئے، پڑیا بنا کر رکھنی ہے۔“ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اس عرضی پر نوٹ لکھ دیا۔

”پڑھ کر سناؤ۔“ وہ بولا...... اور میں نے عرضی پر لکھی ہوئی تفصیلات اسے پڑھ کر سنا دیں۔ دفعتہً اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

”ارے ہاں، اے مسعود بھائی، یہ کام بھی یار تو ہی کر لیجیو، دیکھ سال چھ مہینے یہاں کام کر لے تو سمجھ جائے گا ہم تجھے سمجھ جائیں گے پھر ایک لمبی رقم ہم سے لے لیجیو اور یہاں سے دو سو کوس دور چلے جائیو، وعدہ کرتے ہیں، خطرہ مول لے لیں گے اور تجھے آزادی دے دیں گے، ٹھیک ہے۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا اور میں گردن ہلانے لگا۔

"جیسا آپ کا حکم بڑے بابا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوئی نہ بات .... اچھا چل آگے کی عرضی پڑھ۔"

یہ دوسری عرضی پاروتی کی تھی جس کا پتی بھوگندر ناتھ کسی بیسوا کے چکر میں پڑ گیا تھا عرضی پڑھ کر بھورے شاہ ہنس پڑا۔

"بس بس اس کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں. لال پنسل سے نشان مار دے اس کا کام ہو گیا" میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے دوسرا قہقہہ لگایا اور بولا "ڈاکو سنتو خان نے اس کے گھر کا پورا صفایا کرلیا ہے، بیچاری کو دھن دولت نہیں چاہئے تھی، پتی چاہئے تھا سو بھیا پتی اب کہاں جائے گا؟ بیسوا کا کام تو یہی ہے کہ مال لے اور چھوڑ دے۔ سنتو خان نے بیچاری کی مشکل حل کر دی اب اس بیسوا کو دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو گیا ہے چھٹی ہوئی، من کی مراد پوری ہو گئی اس عورت کی، چل اب آگے کی عرضی پڑھ۔"

اور اس کے بعد دوسری عرضیاں پڑھنے لگا اور وہ ان پر اپنے تبصرے اور ہدایات لکھواتا رہا یہ کام ختم ہوگیا تو وہ اٹھ گیا، شامی پاس ہی موجود تھا اس نے کہا۔

"شامی مسعود کو ہر طرح کی آسائشیں ملنی چاہئیں کوئی تکلیف نہ ہو اسے خیال رکھنا...... بہت سے لوگوں کو تعویذ دیئے تھے کچھ لوگوں کیلئے اس نے الٹی سیدھی جڑی بوٹیاں تجویز کی تھیں حکمت کی کچھ دوائیں بھی لکھی تھیں۔ غرض سارے کا سارا کھیل دھوکا دہی پر مبنی تھا لیکن سنتو خان والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ سنتو خان نے پاروتی کے گھر ڈاکہ ڈالا اور اس کے سارے گھر کا صفایا کر دیا۔ اس طرح اس کا مسئلہ حل ہو گیا بہرحال ابھی اس بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کا وقت نہیں آیا تھا لیکن جب ان سب سے تعویذ اور جڑی بوٹیاں لکھنے کیلئے بیٹھا تو میرے ہاتھ پر سحر طاری ہو گیا جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ نہ لکھا تعویذوں پر بسم اللہ لکھا اور فلیتوں میں شیطان پر لعنت کے الفاظ میرے قلم سے خود بخود درج ہوگئے اور انہی چیزوں کو میں نے پڑیوں کی شکل میں ہر عرضی کے ساتھ رکھ دیا۔ ایک انوکھا لیکن دلچسپ کام تھا اور اکرام میرے ساتھ ان کاموں میں شریک تھا۔

دس دن پندرہ دن تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ صبر و سکون سے ہم نے سارا وقت گزارا تھا۔ عبادت الٰہی سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے، ہمارا تمام وقت اسی طرح گزر جاتا تھا۔ اکرام کے چہرے پر شکن بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے بھی اس ماحول کو قبول کرلیا تھا۔ ان لوگوں کو ہم پر مکمل اعتماد ہو گیا تھا اس لئے اب کبھی کبھی ہمیں غار سے باہر بھی لے آیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سورج ڈھلنے کے بعد ہوتا تھا۔ پہلی بار جب شامی کھلے آسمان کے نیچے لایا تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"کیا آج کل شیر یہاں جھاڑو دینے نہیں آرہے؟" میری بات سن کر شامی ہنس پڑا۔

"کیوں۔ ملنا چاہتے ہو شیروں سے۔"

"کیا مطلب۔"

"یہاں بیٹھو۔ ملائے دیتا ہوں۔" وہ ہمیں بٹھا کر ایک طرف چلا گیا۔ اور پھر چند ہی لمحات کے بعد

ہم نے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنی۔ اکرام تو اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں بھی حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ شیر تو کہیں نظر نہیں آیا مگر اس کے دھاڑنے کی آواز کئی بار سنائی دی۔ پھر شامی واپس آگیا اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ملے شیر سے۔"

"تو یہ ہے خانقاہ کا شیر۔"

"سارا کھیل ایک جیسا ہے۔ مگر۔ تم اس دنیا کو دیکھو۔ کیسی انوکھی ہے یہ دنیا۔ کسی بیوپاری کے پاس چلے جاؤ۔ تمہارے بدن کی کھال اتار لے گا وہ وہ چکر دے گا تمہیں کہ گھن چکر بن جاؤ گے۔ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ انسانی ہمدردی سے ہٹ کر وہ تمہاری مالی حیثیت کا جائزہ لے گا تمہاری بیماری کو آسمان پر پہنچا دے گا وکیل، سرکاری افسر، ہر شعبے کا انسان اپنے دولت کے دروازے کھولے رکھتا ہے۔ اسے اپنے فن میں مہارت حاصل ہے وہ ذہین ہے، چالاک ہے، دوسروں کو احمق بنانا جانتا ہے لیکن اتنی ہی خوشی سے وہ یہاں احمق بننے آجاتا ہے۔ منتیں مرادیں مانگتا ہے۔ کسی کو تکا لگ جاتا ہے جس کا کام نہیں ہوتا وہ اسے تقدیر سمجھتا ہے۔ اس کی عقیدت کم نہیں ہوتی جس طرح وہ اپنا کام کرتا ہے اسی طرح ہم بھی اپنا کام کرتے ہیں آج کل ہر چیز پبلسٹی سے ہوتی ہے۔ ہمارا پبلسٹی کا شعبہ بھی سرگرم رہتا ہے اور ہم اپنے پروڈکٹ کی پوری پبلسٹی کرتے ہیں۔"

"پبلسٹی کا شعبہ۔"

"ہاں۔ ہمارے ملازم۔ ہمارے نمائندے اسی شہر میں نہیں، آس پاس کی متعدد بستیوں میں بکھرے ہوئے ہیں سب کو تنخواہیں ملتی ہیں وہ بھورے شاہ کی کرامتوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ شعبدہ گری کرتے ہیں۔ مختلف طریقے ہوتے ہیں اس کے کوئی اچانک پاگل ہو جاتا ہے۔ ننگ دھڑنگ سڑکوں پر پھرتا ہے۔ لوگوں کو پتھر مارتا ہے ہمارے چند نمائندے اسے پکڑ کر یہاں لے آتے ہیں۔ یہاں اسے دعائیں دی جاتی ہیں تعویذ دیئے جاتے ہیں اور اس کا علاج ہوتا ہے۔ کچھ دن میں وہ بھلا چنگا ہو کر چلا جاتا ہے۔ اور لوگ بھورے شاہ پر عقیدت کے پھول برساتے ہیں۔ کاروبار حیات کے رنگ ایسے ہی بدل گئے ہیں دوست۔ !اسی طرح خانقاہ کا شیر ہے۔ شیروں کی اقسام میں اس کا اضافہ بھی کرلو، جنگل کا شیر، قالین کا شیر، خانقاہ کا شیر۔" شامی قہقہے لگانے لگا۔

"شامی۔ یہ بھورے بابا کیا ہے۔"

"آدمی ہے۔ مکمل آدمی ہے اپنے فن کا استاد۔"

"وہ کس قسم کا آدمی ہے۔"

"میرے خیال میں اس دور کا ایک کامیاب آدمی۔"

"تمہاری تعلیم کیا ہے۔" میں نے اچانک پوچھا۔

"ارے۔ یہ بھورے شاہ سے اچانک مجھ پر کیوں آگئے۔"

"تمہاری باتیں سن کر۔"

"کیا مطلب۔ "

"تمہاری گفتگو بتاتی ہے کہ تم کافی پڑھے لکھے آدمی ہو۔ مگر عرضیاں تم مجھ سے لکھواتے ہو۔"

"کیوں۔ ؟"

شامی ہنس پڑا پھر بولا۔ "کہاں کی باتیں کررہے ہو دوست جو تعلیم اسکولوں میں دی جاتی ہے وہ کس کے پاس ہوتی ہے۔ اصل معلم وقت ہے وہی سب کچھ سکھاتا ہے۔ وہی میرا استاد ہے۔ اسی کی سکھائی ہوئی باتیں دہرا رہا ہوں میں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا۔ "

" بھورے بابا بھی عجیب سا انسان ہے۔ "

"کس لحاظ ہے۔ "

"وہ جو کچھ کررہا ہے۔ خود ہی شدت سے اس کی نفی کرتا ہے۔ میں نے اسے جب بھی شاہ یا درویش کہا وہ جیسے تڑپ سا گیا اس نے شدت سے مجھے اس کیلئے منع کیا۔ "

"ضمیر تو ہر شخص کا ہوتا ہے نا۔ اور ضمیر اگر زندہ ہوتا ہے تو سچ بولتا ہے۔ سچ سنتا ہے۔ "

"مگر ضمیر کے خلاف عمل تو ضمیر کو قتل کردیتا ہے۔ "

"بعض اوقات ایسے دوراہے آجاتے ہیں جہاں انسان کو کسی ایک کے قتل کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ بھورے بابا کے سامنے بھی ایسا ہی ایک دوراہا آگیا تھا۔ اگر وہ ضمیر کو قتل نہ کرتا تو اسے خود قتل ہونا پڑتا۔ مگر اسے زندہ رہنا تھا اپنے لئے نہیں کسی اور کیلئے۔ "

"کیا مطلب۔ " میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اب تم مجھے قتل کروانا چاہتے ہو۔ بھورے بابا کے بارے میں اتنی بات بھی تم سے ہوگئی ہے جبکہ برسوں سے یہاں رہنے والے بھی اس کے بارے میں اتنا نہیں جانتے۔ " شامی نے کہا۔

"لیکن شامی۔ "

"بس بس بابا بس۔ مجھے زندہ رہنے دو۔ " شامی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر بولا۔ "چلو۔ چلو۔ زیادہ وقت ہوگیا ہے۔ کہیں شیر نہ آجائے۔ " وہ ہنس پڑا۔

ہم غار میں آئے۔ اکرام نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بہت ہی پُراسرار کہانی چل رہی ہے مسعود بھائی۔ بڑا انوکھا کردار ہے اس بھورے شاہ کا۔"

" ہاں۔ ! " میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

مزید کچھ دن گزر گئے۔ معمولات جاری تھے۔ ایک رات اچانک بھورے شاہ عجیب سی کیفیت میں ہمارے غار میں گھس آیا۔ وہ تنہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ بہت منتشر معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں خاموشی سے گھورتا رہا۔ پھر اس کی آواز سانپ کی پھنکار کی مانند سنائی دی۔

"تم کون ہو۔ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ کون ہو تم۔ اور سچ نہ بولے تو۔ تو۔ تو۔ !" اس کے دانت بھینچ گئے۔ اور آنکھیں خون اگلنے لگیں۔

میں نے پریشان نظروں سے بھورے شاہ کو دیکھا۔ اس کی اس کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر میں نے حلیمی سے کہا۔

"کوئی غلطی ہوگئی بڑے بابا۔ " میرے اس سوال پر وہ سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ بڑے اضطراب کا اظہار ہورہا تھا اس کی کیفیت سے اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا میں نے خود ہی دوبارہ نرم لہجے میں پوچھا۔

"ہم جس دن سے یہاں آئے ہیں بڑے بابا آپ ہی کا نمک کھایا ہے اور یہی کوشش کرتے رہے ہیں کہ کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ اگر کہیں سے ہمارے بارے میں آپ کو کوئی غلط اطلاع ملی ہے تو ہم آج بھی آپ سے وہی سب کچھ کہیں گے جو پہلے کہہ چکے ہیں یعنی مسافر ہیں اور آوارہ گردی کرتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے اور اس کے بعد سے یہیں موجود ہیں ہمارا تعلق کسی سے نہیں ہے بڑے بابا جہاں سے بھی آپ کو کوئی غلط اطلاع ملی ہے آپ یقین کرلیں کہ وہ غلط ہے۔ "

"ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں، تمہارے قدموں میں سر رکھتا ہوں خدا کیلئے، ایک بے چین روح کو اور زیادہ بے چین مت کرو۔ دیکھو اگر خدا نے تمہیں عزت سے نوازا ہے، اگر اس نے تمہیں اپنی پناہ میں لے رکھا ہے تو کسی انسان کے ساتھ بدسلوکی مت کرو۔ ایک ایسا جلتا سلگتا انسان تمہارے سامنے ہے جس کے اندر آگ دہک رہی ہے جو زندگی ہی میں جہنم پا گیا ہے جو جہنم سے گزر رہا ہے اسے اور جہنمی نہ بناؤ، خدا کیلئے تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے قدموں میں سر رکھتا ہوں مجھے اپنے بارے میں بتادو دیکھو انسان ہوں، ساری برائیوں کے باوجود انسان ہوں، اپنے آپ کو گناہوں کے دلدل میں اس قدر ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس کائنات میں خود سے زیادہ گنہگار اور کوئی نظر نہیں آتا خدا کیلئے مجھے اور گناہوں کی دلدل میں نہ دھکیلو، مجھ میں اب قوت برداشت نہیں ہے۔ " اس کی آواز لرز گئی اور آخر میں سسکیوں میں تبدیل ہوگئی اکرام نے حیرت سے مجھے دیکھا، میں خود ہی ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"نہیں بڑے بابا۔ میں، میں تمہارا نمک خوار ہوں یہ سب کچھ نہیں چاہتا میں، مجھے بس وہ بات بتادو جس کی بنا پر تمہیں مجھ پر شک ہوا ہے۔ "

"بات بتادوں میں نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی ہے حالانکہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ مجھے یقین آگیا ہے کہ تم بہت کچھ ہو، میں نے تمہیں جاگتی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن سوتی آنکھوں نے مجھے تمہاری تفصیل بتادی ہے۔ آہ کیا بتاؤں تمہیں کن لمحات سے گزر رہا ہوں میں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے زندگی بھر گناہ کرنے کیلئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی ایک تو نیک کام کرلیتا جو روح کی تاریکیوں میں کسی سفید نقطے کی طرح روشن ہوجاتا۔ بڑی بے حرمتی ہوئی ہے میرے ہاتھوں تمہاری۔ قید رکھا ہے میں نے تمہیں، دھمکیاں دی ہیں اور، اور، کیا کروں مزاج ہی ایسا بن گیا ہے، اپنی اس بے چینی کو بھی صحیح الفاظ نہیں دے سکتا۔ جاہل مطلق ہوں میں، چنانچہ جو کچھ کہتا ہوں اپنی دیوانگی میں کہتا ہوں جس دن سے تم یہاں آئے ہو نہ جانے کیا ہو رہا ہے، نہ جانے کیا ہوگیا ہے میں تو لوگوں کے ساتھ فریب کرتا تھا،

انہیں غلط دلاسے دیتا تھا الٹی سیدھی جڑی بوٹیاں بتا دیا کرتا تھا لیکن جب سے تم نے جواب لکھنے شروع کئے ہیں جسے دیکھو فائدہ ہو رہا ہے۔ سب کی مرادیں پوری ہو رہی ہیں۔ سارے کام سیدھے ہو رہے ہیں اور وہ سب اتنی نذریں لے کر آ رہے ہیں میرے پاس کہ میں خود حیران رہ گیا ہوں اور جو خواب میں نے دیکھے ہیں ان خوابوں نے مجھے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ آہ میں پاگل ہو گیا ہوں اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ مجھ سے ہو گیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ بابا دیکھو، خدا کیلئے بڑا بابا میں نہیں ہوں، بڑا بابا تم ہو، جو اس طرح یہاں اجنبیوں کی طرح آئے ہیں، اس خانقاہ میں آ کر ٹھہر گئے اور اس کے بعد تم نے لوگوں کو فائدے پہنچانا شروع کر دیئے۔ میرے نام سے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔ اللہ کے واسطے مجھے اپنی حقیقت سے آشنا کر دو دن رات تمہارے قدموں میں پڑا رہوں گا جب تک سر نہیں اٹھاؤں گا تمہارے پیروں سے، جب تک تم اپنے منہ سے یہ نہ کہو گے کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ ان تمام گستاخیوں پر جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہیں۔ آہ مجھ گنہگار کو اور کتنے گناہوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں بابا صاحب، میں ایک مضطرب دل کا مالک ہوں، وہ دل جس سے سکون کا گزر نہیں ہے جو کچھ دل میں آتا ہے کر ڈالتا ہوں سمجھے۔ ڈاکے بھی ڈالتا ہوں میں، ڈاکو سنتو خان کی حیثیت سے میرا نام ان علاقوں میں گونج رہا ہے۔ راتوں کو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خانقاہ سے نکلتا ہوں بستیوں میں لوٹ مار کرتا ہوں، خونریزی نہیں کرتا میں کیونکہ انسانی زندگی کو لینے کا حق مجھے نہیں ہے لیکن لوگوں کو قلاش ضرور کر دیتا ہوں اور یہاں بھی میں ڈاکہ زنی کرتا ہوں لوگوں کی جیبوں پر ان کی معصوم آرزوؤں کو جھوٹے دلاسے دے کر انہیں حسرتوں کا شکار کر دیتا ہوں جس کا کام نہیں بنتا وہ اسے اپنی تقدیر سمجھ لیتا ہے اور جس کا کام بن جاتا ہے وہ چڑھاوے چڑھاتا ہے اس جعلی خانقاہ پر۔ اس جھوٹی قبر پر جس میں کچھ نہیں ہے، سوائے اس مشینی عمل کے جو ان کی آرزوئیں تم تک پہنچاتا ہے۔ بابا صاحب میں یہ گناہ کرتا ہوں اور بابا صاحب میں یہ سب کچھ کر کے خوش نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں میرے ماضی نے مجھے یہ صورت دی ہے بابا صاحب، میری یہ صورت اسی دنیا نے بنائی ہے۔ میرا قصور نہیں ہے، میں جب بھی تنہائی میں بیٹھتا ہوں اپنا حساب کرتا ہوں تو اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا ہوں لیکن بابا صاحب پھر وہ سکون کہاں ہے جو انسانوں کے دلوں کو میسر ہوتا ہے۔ یہ سب جو میرے ساتھی ہیں، یہ سب سکون سے کھاتے ہیں، پیتے ہیں آرام کی نیند سو جاتے ہیں لیکن میں نیندوں سے محروم ہوں۔ میرے کانوں میں وہ معصوم آہیں اور سسکیاں گونجتی رہتی ہیں جو میرے ذریعے مصیبت کا شکار ہونے والوں کی ہوتی ہیں بابا صاحب۔ میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے لئے کیا کروں، آہ مجھے سہارا دیجئے، مجھے مدد چاہئے، مجھے مدد چاہئے۔" وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ اس طرح رو رہا تھا وہ کہ میرا دل موم ہوا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص ہے کیا چیز، جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی شخصیت اس سے بالکل مختلف ہے لیکن انداز بتاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ٹکڑے ٹکڑے ہے، کیوں آخر کیوں، اس کے علاوہ اس نے جو انکشاف کیا تھا اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا وہ رات مجھے یاد آ گئی تھی جب ہم یہاں پہلی بار آئے تھے اور رات کی تاریکی میں ہم نے کچھ لوگوں کو

ے لدھے پھندے یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ڈاکو سنتو خان، گویا گویا یہ جگہ باقاعدہ جرائم کا اڈہ اور اس کا سربراہ یہ شخص ہے، لیکن یہ بلکتا ہوا آدمی قابل رحم تھا۔ اس کے اندر احساس گناہ تھا، ایک کو سزا دینا اللہ کا کام ہے لیکن ایک بلکتے ہوئے انسان کو دلاسہ دینا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اس کے سامنے موجود ہو اور اگر ایک برا انسان کسی کی کوششوں سے اچھے راستے پر آ سکے تو پھر یہ ایک فرض بن جاتا ہے۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر اکرام سے کہا۔

"اکرام پانی لاؤ۔" اکرام نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی، اب میرا دل اس شخص کی جانب راغب تھا اور جو کچھ میرے بس میں تھا وہ میں اس کیلئے کرنا چاہتا تھا، اکرام کا لایا ہوا پانی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے پلایا اور اس کی پشت پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"دوست دنیا میں کوئی کچھ نہیں ہوتا، بس یوں سمجھ لو ہر شخص کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، تم نے اپنا دکھ مجھے کہا میں اسے سن کر تمہیں دلاسہ دینا چاہتا ہوں، بہت سی باتیں ہوں گی اس دوران، لیکن اس وقت جب تم اپنے دل کی ساری بھڑاس میرے سامنے نکال دو گے، مجھے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے سے آگاہ کرو گے، میں اس کے بعد تمہارے لئے دعائیں ہی کر سکتا ہو کہ اللہ تمہیں ان نیک راستوں پر لے آئے جن سے تم دور ہو گئے ہو، توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس کیلئے ہمیں صاف الفاظ میں ہدایت کر دی گئی ہے کہ کبھی رحمت ایزدی سے ناامید نہ ہوا جائے چنانچہ تم جو کوئی بھی ہو اگر تمہارا دل گوارا کرے تو اپنے دل کو میرے سامنے خالی کر دو، میں خلوص دل سے تمہارے لئے دعائیں کروں گا حالانکہ مجھ ناچیز کی حیثیت ہی کیا لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے ان بندوں کی سن لیتا ہے جو خلوص سے مانگتے ہیں، مجھے بتاؤ کون ہو تم تمہاری کہانی کیا ہے۔ کوئی بات راز نہ رکھنا۔ اب تو میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ تمہیں کس نام سے پکاروں، بھورے شاہ کہوں، سنتو خان کہوں یا بڑے بابا کہوں؟"

"نہ میں بھورے شاہ ہوں، نہ سنتو خان ہوں نہ بڑا بابا ہوں، میرا نام نادر ہے نادر حسین۔ یہ میرا نام ہے بابا صاحب میں کسی زمانے میں صرف نادر حسین تھا، ایک معصوم دیہاتی، ایک ایسے گھرانے کا فرد جس کے بارے میں لوگ کچھ نہیں کہتے تھے کیونکہ وہ گھرانہ قابل ذکر ہی نہیں تھا۔ میرا باپ کسان تھا، ماں تھی، دو بہنیں تھیں ایک چھوٹی ایک بڑی، یہ کنبہ تھا ہمارا، میرا باپ اس کنبے کی پرورش کرتا تھا، میں حسب توفیق اس کا ہاتھ بٹاتا تھا، پھر یوں ہوا کہ میرے باپ کو سانپ نے کاٹ لیا، کھیتوں پر کام کر رہا تھا کہ سانپ نے اس کی پنڈلی میں کاٹ لیا۔ زہر چڑھ گیا، اس کی پنڈلی پر بند باندھ کر زہر کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا لیکن اس کی ٹانگ کا علاج نہیں ہو سکا۔

ہمارے پاس نہ تو پیسے تھے نہ وہ ذرائع کہ ہم کسی اچھی جگہ باپ کا علاج کرا سکتے۔ بس میونسپلٹی کے ہسپتال نے میرے باپ کی ٹانگ کاٹ دی اور اس طرح ہمارے ہاں ان مصائب کا آغاز ہو گیا جو انسانی زندگی کو کہاں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ فاقے شروع ہو گئے ہمارے گھر میں، میرا باپ چوہدری کے کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ مگر چوہدری نے مجھے اس کی جگہ نوکر نہیں رکھا۔ اس کے دل میں برائی آ گئی تھی۔ میری بہن کو دیکھ لیا تھا اس نے۔ نوجوان تھی خوبصورت تھی، میری ماں فریاد لے کر گئی تھی اس کے پاس، بد نگاہ

چوہدری نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری نے اسے شیشے میں اتار لیا۔ وہ بانجھ تھی اولاد نہیں ہوتی تھی اس کے ہاں، ایک دن وہ ہمارے ہاں آ گئی۔ میری ماں سے اس نے کہا۔

"تمہاری پریشانی دیکھی نہیں جاتی ایک خیال لے کر آئی ہوں تمہارے پاس۔"

"حکم دیں بیگم صاحبہ۔" میری ماں نے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔"

"اللہ کرم کرے گا بیگم صاحبہ۔"

"میں نے چوہدری صاحب کو بڑی مشکل سے تیار کیا ہے۔ ایک راستہ ہے میرے سامنے تمہاری بڑی بیٹی شمو ہے نا۔"

"ہاں۔" میری ماں نے لرز کر کہا۔

"اس کا نکاح چوہدری صاحب سے کر دو........ حق مہر میں ہم ایک باغ اور دس بیگھے زمین دیں گے۔ تمہارے بھی دلدر دور ہو جائیں گے، یہ کام بالکل خاموشی سے ہو گا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ شمو میرے پاس رہے گی۔ بولو کیا کہتی ہو۔"

"نکاح........" میری ماں نے وحشت سے کہا۔

"ایک اولاد پیدا ہو جائے اس سے تو چوہدری صاحب خاموشی سے اسے طلاق دے دیں گے جو اسے دیا ہو گا سب تمہارا، بچہ میرا کہلائے گا بعد میں تم شمو کا بیاہ کر دینا کس کو پتہ چلے گا........"

"کیا کہہ رہی ہو بیگم صاحبہ........؟" میری ماں بمشکل بولی۔

میں نے بھی سن لیا تھا خون کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا میرے وجود میں، پاگل ہو گیا تھا میں۔ آگے بڑھ کر میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

"فوراً گھر سے نکل جاؤ بیگم صاحبہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے آدمی تمہاری لاش لینے آئیں۔"

"تو ایسی کونسی بری بات کہہ دی میں نے۔ آئے ہائے ایک تو احسان کر رہے ہیں چلو ٹھیک ہے بھوکے مرو گے تو خود آؤ گے........!"

خون کے سارے گھونٹ سینے میں اتار لئے میں نے۔ اپنا لہو خود چاٹ لیا معذور باپ، بے کس ماں جوان بہنوں کا میرے سوا کوئی سہارا نہیں تھا۔ ان کیلئے مجھے زندہ رہنا تھا صبر کرنا تھا، میں نے صبر کر لیا۔ ہم نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ پیٹ بھرنے کا سہارا چاہئے تھا سب کو پالنا تھا سب کچھ بھلا دینا تھا۔ کوشش کی کچھ کامیابی حاصل ہو گئی۔ راجہ خان لوہار کے ہاں نوکری مل گئی بھٹی کا پنکھا چلانے کی۔ گھن چلانے کی۔ روٹیوں کا سہارا ہو گیا۔ راجہ خان بہت برا آدمی تھا۔ جوا کھیلتا تھا تاڑی پیتا تھا۔ چار چھ دن کام کر کے کما لیا۔ چار چھ دن بیٹھ کے کھا لیا۔ مجھے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے گھر میں بھی آنا جانا تھا اس کی

بیوی رشیدہ بڑی نیک عورت تھی۔ نمازی پرہیزگار، شوہر کی برائیوں کو چھپانے والی۔ بے اولاد تھی مجھے بھائی کی حیثیت دینے لگی وہ میری مدد بھی کرتی تھی۔ خود اچھے گھر کی تھی ماں باپ بھی لیتے دیتے رہتے تھے۔ برے وقت کیلئے پیسے بچاتی تھی کیونکہ شوہر ناقابل بھروسہ تھا۔ ان پیسوں میں سے وہ میری مدد کرتی تھی۔ میری مجبوریوں نے مجھے اس کی مدد لینے پر آمادہ کر دیا تھا مگر بدکار راجہ نے ان باتوں کو دوسری نگاہوں سے دیکھا۔ اور ایک دن تاڑی کے نشے میں اس نے اپنی بیوی کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ میں معمول کے مطابق بھٹی پر پہنچا تھا راجہ تو موجود نہیں تھا مگر رشیدہ کے پورے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ زخموں پر پٹی کسی ہوئی تھی۔

"ارے۔ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، تو جا اپنا کام کر........؟"

"مارا ہے راجہ بھیا نے؟"

"نادر........ تو اپنا کام کر........ تجھے کیا ان باتوں سے جا بھٹی سلگا، نہیں تو راجہ بگڑے گا۔"

"کیوں مارا ہے اس نے تجھے؟" میں نے دلسوزی سے کہا۔

"شوہر ہے وہ میرا۔ میں جانوں، وہ جانے........ تو بلاوجہ بیچ میں آ رہا ہے۔" میں نے افسردگی سے گردن جھکا لی پھر آہستہ سے کہا۔

"بھائی بھی کہتی ہے تو مجھے رشیدہ۔ مگر........ میں غیرت مند بھائی کہاں ہوں۔ میں تو خود تجھ سے پیسے لیتا ہوں۔" میرے ان الفاظ پر وہ تڑپ گئی، آگے بڑھی اور میرا سر سینے سے لگا لیا۔

"یہ پیسوں کا ذکر تو بیچ میں کیوں لے آیا ہے۔ ایسی بیکار باتیں مت کیا کر۔" اور پھر اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ وہ سہمی ہوئی آنکھوں سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے سنبھل کر گردن گھمائی تو راجہ دروازے پر نظر آیا وہ خاموشی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں اس کیلئے نفرت ابھر آئی۔ کم بخت نشے باز........ ایسی نیک عورت پر ظلم کرتا ہے۔

"آج بھٹی نہیں جلے گی کیا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ میں اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بھٹی جلی........ کام ہوا، میں نے گھن بھی چلایا راجہ نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ شام کو میں نے کہا۔

"راجہ بھیا۔ ایک بات کہوں۔"

"کیا بات ہے؟"

"تم نشہ مت کیا کرو!"

"کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"تم نے رشیدہ بھابھی کو مارا ہے۔"

"تو پھر........ نکاح میں تو میرے ہی ہے وہ۔"

"عورت پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے راجہ بھیا۔ میں اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"جا نادر اپنے گھر جا .... میرے منہ مت لگ .... جا .... چلا جا۔" اس نے کہا۔ یہ ان داتا تھا وہ۔ اس سے زیادہ اور کیا کہتا۔ گردن لٹکا کر واپس آ گیا۔ رشیدہ کیلئے دل دکھ رہا تھا لیکن بات ہے میاں بیوی تھے وہ میں کیا کر سکتا تھا۔ خود کو سمجھالیا۔ دوسرے دن اپنا کام کر رہا تھا۔ سرخ لوہے پر گھن چلا رہا تھا کہ راجہ نے بیٹھے بیٹھے ایک بہت بری بات کر دی۔ اتنی بری کہ سارا وجود لوہے کی طرح سرخ ہو گیا۔ میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بہن ہے وہ میری۔ بھابھی کہتا ہوں میں اسے۔ ماں کے برابر ہے وہ میرے لئے۔ آج تم ضرورت سے زیادہ نشے میں ہو راجہ بھیا۔" مگر وہ نا مانا۔ اس نے میری روح پر ایسی ضربیں لگائیں کہ مجھے جواب ضرب لگانی پڑی مگر یہ ضرب ساڑھے چار سیر وزنی گھن کی تھی جو میرے ہاتھ میں تھا اور سر سے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ راجہ بھیا کا سر غائب ہو گیا شاید گردن میں گھس گیا تھا۔ اس کا سفید سفید مغز خون کے ساتھ سرخ دہکتی ہوئی بھٹی میں گر رہا تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں وہ بھی بھٹی ہی پر گر پڑا .... اور گوشت کی چراند دور دور تک پھیل گئی۔ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے خون کی چادر تنی ہوئی تھی میری آنکھوں پر .... آج تک معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ ہوش اس وقت آیا جب میں چوہدری صاحب کے سامنے تھا۔

"حواس ٹھیک ہو گئے تیرے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"چوہدری صاحب میں .... یہ .... یہاں ...." میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھانسی کا پھندہ تیار ہو رہا ہے تیرے لئے بیٹے۔ اسی میں گردن پھنسے گی تختہ ہٹا دیا جائے گا۔ آنکھیں اور زبان باہر نکل آئے گی۔ اوئے جوانی زیادہ چڑھ رہی تھی تجھ پر۔ بیچارے لوہار کو مار ڈالا!"

"راجہ بھیا خود شیطان بن گیا تھا چوہدری صاحب۔"

"اوئے ہم سے بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ سیدھا پولیس کے ہاتھوں میں جاتا ہم یہاں لے آئے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا چوہدری صاحب۔ اور اس کے بعد جو ہو گا وہ میری تقدیر ہے۔"

"اتنا بڑا مان دیا تجھے۔ سارے گھر والے عیش کرتے۔ اب بھی سوچ لے ہم بچا لیں گے تجھے۔ تو قبول کر کے نہ دینا۔ کہہ دینا بھٹی میں گر گیا تھا تو اس وقت پاس نہیں تھا۔ نشہ تو کرتا ہی تھا سسرا ہم گواہی دیدیں گے۔ پھر کس کی مجال ہے کہ بولے۔ مگر ایسے نہیں۔"

"چوہدری صاحب ....!"

"سوچ لے اچھی طرح .... فیصلہ تجھے کرنا ہے۔"

"پولیس نہیں آئی چوہدری صاحب۔"

"...تھی، ٹال دیا ہم نے۔ تجھے لے آئے اپنے ساتھ اور یہاں بند کر دیا۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں ...لے گئی ہے تجھے۔ پولیس والے اپنے یار ہیں جب تک ہم نہیں کہیں گے وہ دوبارہ نہیں آئیں ...مگر فیصلہ تجھے کرنا ہے تیرا باپ تیرے سامنے نہیں بول سکتا یہ ہمیں معلوم ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟ ...ابھی اسی وقت اور پھر یہ سب کچھ کسی کو پتہ تھوڑی چلے گا۔ ہم خود بھی تو اس بات کو چھپا کر رکھیں ..."

"فیصلہ اسی وقت کرنا ہو گا چوہدری صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"...سولہ آنے کھرا سودا ہو گا .... تو تیار ہو گا .... ہم نکاح کریں گے اور بس .... اس کے بعد ہم تجھے سامنے لے آئیں گے۔ لوگوں سے کہیں گے کہ پولیس نے تجھے بے گناہ قرار ..."

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ ہو گیا فیصلہ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چوہدری بھی ...اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر مسکراتا ہوا مجھ سے گلے ملنے کیلئے آگے بڑھا۔

"اسے کہتے ہیں عقلمندی سالے صاحب، یہ ہوئی بات اب تم دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔" وہ میرے قریب آ گیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گردن دبوچ لی۔ میری انگلیاں اس کی گردن پر شکنجے ...کس گئیں۔

"...فیصلہ پسند آیا چوہدری صاحب۔ کیسا رہا میرا فیصلہ؟" وہ میری گرفت میں تڑپنے لگا۔ اس کی ...اور زبان باہر نکل آئیں یہی منظر اس نے میرے سامنے پیش کیا تھا۔ جب اس کی جان نہ رہی تو میں ...اسے چھوڑ دیا۔ اس کی تلاشی لی۔ بہت سے روپے تھے اس کے پاس سونے کی چین، ہیرے کی ...پہنے ہوئے تھا وہ۔ یہی نہیں اس کے اس کمرے میں تجوری بھی تھی جسے میں نے خالی کر دیا۔ ...عقلمند ہو گیا تھا۔ چھپتا چھپاتا گھر واپس آیا۔ ماں باپ اور بہنوں کو تیار ہونے کیلئے کہا۔ بدر چاچا ...کھولے گاڑی جوتی اور سب کو اس میں بٹھا کر چل پڑا۔ صبح پانچ بجے میں ہردوار جنکشن پہنچا۔ ...کانپور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور کانپور آ گیا ماں باپ بہنوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ ...ہو رہا ہے، مگر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اپنے ساتھ اتنا لایا تھا کہ ساری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ ...اپنا نام بدلا اور رہنے لگا۔ سب پرسکون تھے، میں مضطرب تھا۔ پھر ایک دن میں نے اخبار میں ...دیکھی۔ پولیس کو دہرے قتل کے مجرم کی تلاش تھی۔ سارے ہندوستان کی پولیس کو چوکس ...تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ بات ایسے نہ ٹل جائے گی شمو کیلئے ایک شریف نوجوان تلاش کیا اسے ...دے کر اس کی شادی کر دی۔ باقی رقم باپ کو دے کر کہا کہ چھوٹی بڑی ہو جائے تو اسے بھی ...دیا جائے۔ اور پھر وہاں سے بھاگ آیا۔ ایک روپوش مجرم کیلئے جائے پناہ کہیں نہ تھی۔ زندہ ...مجرم تنہا تھا چنانچہ میں سنتو خان بن گیا۔ گروہ بنایا .... یہ خانقاہ بنائی اور یہاں جعلی پیر بن ...باقی سب کچھ تمہارے سامنے ہے بابا صاحب۔ خوب کھیل کھیلے مگر سکون نہیں ملا۔ احساس

گناہ .... گناہ پر گناہ کرائے جا رہا ہے میری منزل کہاں ہے بابا صاحب ؟ کوئی منزل ہے میری؟"

میں سکتے کے عالم میں اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اکرام بھی پتھرایا ہوا تھا بہت دیر کے بعد میں نے کہا۔

"ڈاکے کیوں ڈالتے ہو ....؟"

"دولت کیلئے۔"

"اتنی دولت کا کیا کرو گے ....؟"

"خرچ کر دیتا ہوں۔"

"کہاں ....؟"

"عرضیاں لانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں بیٹیاں بیاہنی ہوتی ہیں۔ بیماروں کا علاج کرانا ہوتا ہے۔ ان کی دعائیں پوری ہوجاتی ہیں۔ رات کی تاریکی میں کوئی منہ پر رومال لپیٹے ان کے دروازے پر جاتا ہے اور ان کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں پیر بھورے شاہ آئے تھے اور سب کچھ ہوگیا تھا۔ پھر وہ انہیں پیسوں میں سے پھولوں کی چادر چڑھانے آتے ہیں، گھی کے چراغ جلانے آتے ہیں۔"

"اوہ .... تم یہ کرتے ہو ....؟"

"ہاں بابا صاحب۔"

"پھر بھی سکون نہیں ملتا۔"

"نہیں بابا صاحب .... بے سکون ہوں .... دل کو قرار نہیں ملتا۔"

"ماں باپ، بہنوں سے دوبارہ ملے ....؟"

"کبھی نہیں مگر ان کی خبر رکھتا ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔ دوسری بہن کی شادی بھی ہو گئی ہے دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں باپ کے پاس کافی رقم موجود ہے اور وہ خوشی کی زندگی گزار رہا ہے میں صرف اس لئے ان کے پاس نہیں جاتا کہ کہیں میری شناخت نہ ہوجائے اور سب کچھ بگڑ جائے۔ بہت دور ہوں میں ان سے لیکن بس یہ اطمینان ہے کہ وہ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر بابا صاحب میرا سکھ چین کہاں ہے، میرا سکون کہاں ہے؟ مجھے سکون چاہئے بابا صاحب مجھے سکون چاہئے۔"

بڑی حیران کن کہانی تھی۔ بڑا عجیب احساس تھا میرے دل میں اس شخص کیلئے، اکرام کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کیسا عجیب کردار ہے۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ بھلا میں کیا اور میری اوقات کیا کہ میں ایسے کسی کردار کو، کوئی سہارا یا سنبھالا دے سکوں۔ بہت دیر تک خاموشی رہی پھر اس نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا بابا صاحب، میں نے سب کچھ بتا دیا۔ آپ مجھے اپنے بارے میں

نہیں بتائیں گے ....؟"

"اب میں تمہیں نادر حسین کہہ کر ہی پکاروں گا۔ نادر حسین یقین کرو جھوٹ نہیں بول رہا میں، جو میں نے روز اول کہا وہ آج کہہ رہا ہوں۔ ایک مسافر ہوں آوارہ گردی کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا ہوں اور اس کے بعد سے تمہارا مہمان ہوں۔ تم نے جس حال میں بھی رکھا خوش ہوں۔ اللہ کے کلام میں برکت ہے۔ کون بھلا اس سے منحرف ہے کہ کلام الٰہی سے بڑھ کر اور بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ اگر لوگوں کو اس کلام سے فائدہ ہو جاتا ہے اگر ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، بس یہ کلام الٰہی کی برکت ہے۔"

"آہ کیا مجھ پر یہ بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا، میرے لئے بھی تو دعا کرو بابا صاحب، مجھے بھی تو سکون کی دولت عطا کرو۔ میں جل رہا ہوں۔ اندر ہی اندر سلگ رہا ہوں۔ مدھم مدھم دھواں دے رہا ہوں میں .... کم از کم اتنی ہی دعا کر دو میرے لئے کہ میرا یہ وجود جلدی بھسم ہو جائے، میں جل کر راکھ ہو جاؤں۔ آہستہ آہستہ جلنا میرے لئے اب ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔" میں نے ہمدردی کی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔

"دیکھو نادر حسین، ضمیر کی عدالت میں جو فیصلے ہوتے ہیں وہ دنیا کے تمام فیصلوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں سچ کی حکمرانی ہے اور تم نے جو کچھ کیا ہے، ضمیر کی عدالت اسے قبول نہیں کرتی تم بے شک نیک راستوں کے مسافر ہو، جو کچھ تم کرتے ہو وہاں شاید توازن متاثر ہو جاتا ہے، توازن نہیں ہے نادر حسین یہی توازن قائم کرنا ہے تمہیں، جب تم لوٹ مار کرتے ہوگے سنتو خان کی حیثیت سے تو ظاہر ہے دلوں سے آہیں نکلتی ہوں گی، بددعائیں دیتے ہوں گے لوگ تمہیں اپنی بربادی پر، جس کے نتیجے میں بے سکونی تمہاری روح میں جا بسی ہے اگر مجھ سے مشورہ چاہتے ہو تو میرے چند مشورے قبول کرو۔ سب سے پہلے ڈاکہ زنی کا یہ سلسلہ ترک کر دو .... یہ سب سے بری چیز ہے اس کے بعد اور بھی کچھ مشورے دوں گا میں تمہیں، ذرا غور کر لو اس بات پر .... اکرام پانی لاؤ۔" ایک بار پھر اکرام نے پانی کا ایک پیالہ میرے سامنے پیش کر دیا میں نے اس پر درود پاک سات بار پڑھ کر دم کیا اور نادر حسین سے کہا۔

"لو یہ پانی پی لو۔" نادر حسین نے پانی کا یہ پیالہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ لے کر منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اگر طبیعت قبول کرتی ہے تو نماز کا آغاز کر دو۔ تمہاری یہ بے سکونی تو چٹکیوں میں ہوا ہو جائے گی۔ اس کے بعد نادر حسین میں تم سے اور بھی بہت سی باتیں کروں گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"مجھے سکون چاہئے، سکون دے دیجئے مجھے بابا صاحب جو آپ کہیں گے سو کر دوں گا۔"

"پھر ٹھیک ہے جاؤ آرام کرو، یہ سارے کام یونہی چلنے دو سوائے اس کے جو میں نے تم سے کہا۔"

نادر حسین اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اکرام ابھی تک اس داستان کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں بھی

خاموشی سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا, کچھ دیر کے بعد اکرام نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر

"مسعود بھیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہے جسے کوئی دکھ نہ ہو, کیا کوئی ایسا شخص مل جائے گا جو ہمیشہ زندگی کے مسائل سے دور رہا ہے اور اس کی ذات میں غم کا کوئی پہلو نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا اکرام۔ کائنات بنانے والے نے اپنی کائنات میں کیا کچھ رکھا ہے بھلا کون کہہ سکتا ہے، وہی جانے جس کا یہ گورکھ دھندا ہے۔" اکرام عجیب سے تاثر میں ڈوبا رہا پھر اس نے کہا

"اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنے دکھ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے میرے دل میں ایک بہن بس رہی ہے، آپ کے دل میں ایک پورا گھرانہ، نجانے کس کس دل میں کیا کیا دکھ پل رہا ہوگا۔ ویسے مسعود بھیا آپ یقین کیجئے کچھ دکھی ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو دکھ کا احساس ہلکا لگنے لگتا ہے۔

خیر آپ کے ساتھ یہ وقت گزار کر میری تو کایا ہی پلٹ گئی ہے اور جو سوچیں آپ کی قربت سے ملی ہیں اور ان میں سب سے نمایاں سوچ یہ ہے کہ جہاں انسان اپنی تمام تر جدوجہد کر کے تھک جاتا ہے وہاں پھر اسے اپنی الجھنیں اس کائنات کے خالق کے سپرد کر دینی چاہئیں، جو تمام مشکلات کا حل رکھتا ہے اور اس طرح اس پر تکیہ کر کے کم از کم یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ جب فیصلہ ہو گا تو بات بن جائے گی۔ مسعود بھیا مجھے اتنا سکون مل گیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا آپ کو۔ ثریا جب بھی یاد آتی ہے ہاتھ اٹھا کر اس کیلئے دعا کرتا ہوں کہ مالک اسے اپنی پناہ میں رکھنا کہ تو سب سے بڑا رکھوالا ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے مسعود بھائی جیسے زبردست طاقتور ہاتھوں نے میری ثریا کے سر پر اپنا سایہ ڈال دیا ہو مگر نادر حسین کی کہانی نے دل پر عجیب سا اثر ڈالا ہے، کتنا دکھی ہے یہ شخص۔ آپ کے خیال میں کیا اسکا یہ عمل جو اس نے آج تک کیا کیا مناسب ہے؟" اکرام نے پوچھا اور گردن ہلانے لگا, پھر میں نے کہا۔

"کیا ہے کیا نہیں ہے یہ جانے دو, بس جو کچھ ہمارے علم میں ہے اسے بتا دیں گے۔ باقی وہ جانے اور اللہ۔" اکرام نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی تھی۔

نادر حسین اب زیادہ تر ہمارے پاس بیٹھنے لگا تھا اس کی کیفیت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ پہلے جیسی شان و شوکت اب اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی اداس خاموش آکر دو زانوں بیٹھ جاتا تھا میں نے اسے نماز سکھانا شروع کر دی تھی۔ اس نے بڑی پابندی سے ہمارے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔ درود پاک کا پھونکا ہوا پانی وہ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ پیتا تھا پھر ایک دن اس نے کہا۔

"بابا صاحب یہ باقی لوگ سرکشی کر رہے ہیں میں اتنے دن سے خاموش بیٹھا ہوں تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے ہیں، میرا خیال ہے یہ سرکشی کریں گے کیونکہ بہت دن سے انہوں نے کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے اور صرف انہی چڑھاووں کی روٹیوں پر گزر بسر ہو رہی ہے۔ ویسے تو ہمارے پاس بہت کچھ موجود ہے بھنڈار بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ایک عادت جو ہے، مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ مجھ سے بغاوت نہ کر دیں ان کی بغاوت اچھی نہیں ہوگی۔" میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور کہا۔

"ان کے پینے کا پانی کہاں ہے نادر حسین؟" وہ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ لیکن پھر سمجھ کر جلدی سے بولا۔

"میں سمجھ گیا بابا صاحب۔ آپ مجھے پانی پڑھ کر دے دیجئے۔" چھ سات دن تک ان لوگوں کو درود پاک کی برکتوں میں ڈوبا ہوا پانی پلایا گیا اور نادر حسین نے مسکرا کر کہا اب ان کی سرکشی ختم ہو گئی ہے اور وہ معتدل نظر آنے لگے ہیں۔ کچھ دن کے بعد نادر حسین نے خوشخبری سنائی کہ اسے نماز پڑھتے دیکھ کر ان میں سے کچھ نے نماز پڑھنا شروع کر دی ہے۔ ایک دن اکرام نے کہا۔

"ایک خیال میرے دل میں بار بار آتا ہے مسعود بھائی لوگ اس خالی قبر کو کسی بزرگ کی قبر سمجھ کر یہاں منتیں مرادیں مانگتے ہیں اور مجرمانہ طور پر ان کی باتیں سنتے ہیں اس طرح وہ فریب کھاتے ہیں کیا ہم یہ فریب انہیں دیتے رہیں؟"

"بیشک یہ غلط ہے، قبر پرستی بت پرستی کے مترادف ہے۔ لیکن میں بہت کچھ سوچ کر بھی اس کا حل نہیں تلاش کر سکا ہوں۔ بس اتنی سوچ ہے میری کہ مخلوق خدا کے مسائل علم میں آ جاتے ہیں اور ہم بساط بھر ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ نادر حسین سے مشورہ کریں گے ہو سکتا ہے کہ کوئی اور حل نکل آئے۔"

معمولات جاری تھے۔ نہ مجھے اور نہ اکرام کو کوئی پریشانی تھی مجھے تو فوراً ہی پتہ چل جاتا تھا کہ میری کیا ڈیوٹی لگائی گئی۔ افسر اعلیٰ فیصلہ کرتے تھے کہ میری پوسٹنگ کہاں کی جائے اور جب تک کہیں اور تبادلہ نہ ہو مجھے وہیں اپنے فرائض سرانجام دینا ہوتے تھے۔ یہاں بھی میری ضرورت تھی۔ مشکلات میں گھرے لوگ تھے۔ اپنے دکھ درد بیان کرتے آسمانی رہنمائی میں جو کچھ ذہن میں آتا انہیں بتا دیتا اس میں میرا کوئی دخل نہ ہوتا۔ کئی بار مراقبے کر کے اکرام کے اعتراض کا حل مانگا مگر خاموشی رہی تو میں بھی خاموش ہو گیا۔

خانقاہ کا ماحول بے حد پروقار ہو گیا تھا۔ ہم پر اب کوئی قید نہیں تھی۔ راتوں کو باہر نکل آتے تھے کھلی فضا میں عبادت کرتے تھے۔ ایک رات میں تنہا باہر نکلا اور تاروں کی چھاؤں میں دور دور تک کے پرسکون ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ فاصلے پر میں نے ایک ٹیلے پر کچھ تحریک دیکھی۔ غور کیا تو پہچان گیا۔ یہ نادر حسین تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دکھ ہوا۔ نہ جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمدردی ابھر آئی اور میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرے قدموں کی چاپ پر بھی اس نے گردن نہیں گھمائی اور اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔

"نادر حسین کیا بات ہے، کیا سوچ رہے ہو؟" مگر میری آواز پر بھی اُس نے جنبش نہ کی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں خوف کا احساس ابھر آیا میں نے اسے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن وہ سکتے کے عالم میں تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور میرے منہ سے ہلکی سے آواز نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں۔ پوری آنکھوں میں سفید ڈھیلے چھائے ہوئے تھے۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ایک عجیب سا خوف مجھ پر مسلط ہو گیا اور میں اسے اسی طرح چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

دوسری صبح فجر کی نماز کے بعد اکرام سے رات کے اس واقعے کا تذکرہ ہی کرنا چاہتا تھا کہ اکرام نے کہا۔ "نادر حسین سے کتنے دن سے ملاقات نہیں ہوئی، مسعود بھائی۔"

"بہت دن سے ہمارے پاس نہیں آیا لیکن۔"

"کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے اس کی۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اکثر چلچلاتی دھوپ میں، اسے سورج کی طرف منہ اٹھائے کھڑے دیکھا ہے۔ کئی بار راتوں کو جاگا ہوں کبھی اسے کھڑے ہوئے پایا۔ کبھی ساکت بیٹھا ہوتا ہے۔ دو تین دن پہلے کی بات ہے میں رات کو باہر نکلا آیا تو وہ کچھ فاصلے پر ٹیلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نظرانداز کر کے آ گیا۔ صبح کو نماز کے بعد بھی اسے کھڑے ہوئے پایا اور پھر ساری دوپہر وہ اسی طرح کھڑا رہا۔"

"مجھے نہیں بتایا تم نے۔"

"بس بھول گیا۔"

"اللہ نہ کرے اس کا ذہنی توازن متاثر نہ ہو گیا ہو۔"

"کیا کیا جائے؟"

"تلاش کرو اسے۔ وہ بہت دکھی انسان ہے۔" میں نے کہا۔ اکرام کو رات کا واقعہ سنانے کا خیال یکسر ذہن سے نکل گیا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ پوری خانقاہ میں نادر حسین کو تلاش کیا وہ نہ ملا۔ تب مجھے اس ٹیلے کا خیال آیا اور اکرام کو ساتھ لے کر میں اس ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ نادر حسین وہاں نہیں ملا میں نے یہاں آ کر اکرام کو گزری رات کا واقعہ بتایا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ تعجب سے بولا۔

"تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں بھیا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دیوانگی دوسری بات ہے مگر آنکھوں کا بدل جانا۔ مسعود بھائی میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی اور معاملہ نہ ہو۔"

"اور معاملہ۔"

"یہ خانقاہ مصنوعی ہے اور یہاں کسی بزرگ کا دخل نہیں ہے کوئی یہاں اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ہمیں نگاہ رکھنی پڑے گی خاص طور سے یہ دیکھنا پڑے گا کہ نادر حسین کی کیا کیفیت ہے؟"

میں اکرام کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ لیکن نہ جانے دل اس سے اتفاق کیوں نہیں کر رہا تھا۔ نادر حسین کہیں بھی نہیں ملا۔ اور ہم واپس آ گئے۔ آج عرضیاں لکھنے کا دن تھا۔ حسب معمول اس کام پر بیٹھ گئے۔ یہ بھی باقاعدہ کام ہوتا تھا۔ حاجت مند انہی روایات کے ساتھ آتے تھے اور سورج ڈھلے خانقاہ خالی ہو جاتی تھی۔ ہم نے ان روایات کی تردید نہیں کی تھی اور انہی پر عمل کر رہے تھے۔ خانقاہ خالی ہو چکی تھی۔ اکرام تمام عرضیاں ترتیب دے چکا تھا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے کہ اچانک شامی بدحواس ہمارے پاس دوڑا چلا آیا۔ اس کی کیفیت بے حد خراب تھی۔ سفید دھونکنی بنا ہوا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بات

منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

"مم .... مسعود بھائی .... مسعود بھائی۔"

"کیا ہوا .... کیا بات ہے شامی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بڑا بابا .... بڑا بابا قتل کر دیا گیا۔ کسی نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس کی لاش .... اس کی لاش قبر پر پڑی ہوئی ہے۔ سر الگ کر دیا گیا ہے ہاتھ پاؤں الگ الگ پڑے ہوئے ہیں۔ ساری قبر خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بڑا بابا مار دیا گیا ہے مسعود بھائی .... بڑا بابا مار دیا گیا ہے۔ میں چراغ جلانے گیا تھا میں نے .... میں نے۔" شامی کی آواز رندھ گئی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اکرام بھی سکتے میں رہ گیا تھا۔ بمشکل تمام میں نے شامی سے کہا۔

"آؤ ...." ہم تینوں لڑکھڑاتے قدموں سے خانقاہ کے اس حصے کی طرف بڑھ گئے جہاں قبر تھی۔ باہر کا ماحول سنسان تھا۔ بیرونی لوگ تو سرشام چلے جاتے تھے۔ خانقاہ کے باسی بھی اپنی کمین گاہوں میں گھس جاتے تھے۔ یہ لوگ اب کیا کرتے ہیں اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن سنا یہ گیا تھا کہ زیادہ تر لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ باقی ان کے معمولات کیا ہیں یہ تفصیل سے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ چراغ جل رہا تھا۔ اس کی پیلی روشنی میں نادر حسین عرف بڑے بابا ایک دیوار کی طرف پشت کئے دوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بدن ساکت تھا اور ہمارے قدموں کی آہٹ پر بھی اس کے اندر کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ میں نے حیران نظروں سے شامی کو دیکھا جو کچھ اس نے کہا تھا وہ تو نہیں تھا مگر شامی کی آنکھیں حیرت سے چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ چکرا رہا تھا۔ اکرام بھی تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شامی نے بمشکل کہا۔

"خدا کی قسم میں نے جھوٹ نہیں بولا۔"

"کیا مطلب؟ گویا اب بھی ...." میں نے کہا۔

"میں اندھا تو نہیں ہوں میں نے خود دیکھا تھا۔ ارے میرے مالک .... خون .... خون بھی نہیں ہے مگر اس وقت، گردن یہاں پڑی تھی، ہاتھ وہاں اور پاؤں .... اور دھڑ .... قسم کھا رہا ہوں مگر .... بڑا بابا، بڑا بابا ...." میں اندھا دھند آگے بڑھا اور نادر حسین کے قریب پہنچ گیا۔

"بڑے بابا تم ٹھیک ہو ....؟" وہ نادر حسین کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر ہم پر آ رہا۔ اکرام نے اسے گرنے سے بچایا تھا۔ "آنکھیں، آنکھیں .... اوہو، ہو، ہو آنکھیں .... ہوہوہو۔" شامی کا بدن کانپنے لگا۔ وہ جھومنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اکرام کو ہی اسے سنبھالنا پڑا تھا۔ وہ آنکھیں آنکھیں بڑبڑاتا ہوا بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم دونوں پریشان ہو گئے۔

"اب کیا کروں؟" اکرام نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ میں آگے بڑھ کر اکرام کے پاس پہنچا اور شامی کو سنبھال لیا۔

"باہر لے چلو ...." میں نے کہا۔

"اور وہ، وہ ...." اکرام نے نادر حسین کے بارے میں کہا۔

"اسے فی الحال چھوڑو، آؤ.........!" میں نے شامی کو سنبھال کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں باہر آ گئے۔ کچھ دور چل کر شامی کو پتھر کی سل پر لٹا دیا گیا۔ اس میں ہوش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر ہر احساس سے عاری رہا۔ پھر چونک پڑا ہمیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر اس نے ماحول کا جائزہ لیا پھر بولا۔

"خدا کی قسم میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں ہوش و حواس میں تھا......... لاش خون میں ڈوبی ہوئی تھی اور بڑے بابا کے اعضاء الگ الگ پڑے ہوئے تھے۔ میں تو دہشت کھا کر بھاگا تھا۔ مگر بعد میں .... اور پھر......... پھر مسعود بھائی خدا کی قسم میں نے بڑے بابا کی آنکھیں دیکھیں۔ اف میرے خدا کیسی بھیانک آنکھیں تھیں۔ ان میں پتلیوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بس سفید سفید ڈھلے، چمکتے ہوئے ویران ویران ....!" شامی نے جھرجھری لے کر کہا۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو شامی ....!"

"مگر یہ کیا ہو رہا ہے، کچھ سمجھ میں تو آئے۔ اب آپ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے مسعود بھائی۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے بڑے بابا میں ایک دم تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے اس نے نماز شروع کی پھر تہجد پڑھنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بیشتر دیکھا اس نے سونا چھوڑ دیا، راتوں کو نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز نہیں پڑھ رہا تو چاند پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ دن میں دوسروں سے چھپ چھپ کر یہ عمل کرتا ہے۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا ہے، صحت خراب بھی ہو رہی ہے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور اب......... میرا خیال ہے مسعود بھائی، میرا خیال ہے ...." شامی رک گیا۔

"ہاں کیا خیال ہے تمہارا شامی ....؟"

"اس پر اثرات ہو گئے ہیں۔ کسی جن کا سایہ یا کسی اور ارواح ...."

"پھر بولو کیا کریں ....؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو بہت چھوٹی عقل کا آدمی ہوں مسعود بھائی۔ بس دعا کر سکتا ہوں اس کے لئے اور اب تو مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے بھی خوف آئے گا۔"

"اللہ مالک ہے شامی۔ میرے خیال میں اسے پریشان نہ کیا جائے۔ دیکھو اللہ کی کیا مرضی ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ اب اس کی ٹوہ میں نہ رہنا۔ اسے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

شامی نے جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ میں اور اکرام خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اکرام نے کہا۔ "اسے اتنی بڑی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے، آؤ چلیں۔" میں نے کہا اکرام سمجھ گیا کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ آرام گاہ پہنچ کر بھی اس نے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا مگر میں اب مطمئن نہیں تھا۔ کچھ معلوم ہونا چاہئے مجھے اس بارے میں۔ میری رہنمائی تو مجھے بخش دی گئی تھی درود پاک کا ورد کیا اور

آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں یہ خواہش کی کہ مجھے نادر حسین کی کیفیت کے بارے میں علم ہو جائے۔ رات بھر کوشش کرتا رہا۔ لیکن دماغ سادہ رہا۔ روشنی کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو اٹھ گیا۔ اب کوئی تردد نہیں تھا۔ میرا ان حالات سے لاعلم رہنا مناسب تھا۔ اس سے یہی احساس ہوا تھا، اور اب مجھ پر لازم تھا کہ ان معاملات کی کرید نہ کروں۔ جو کام مجھے سونپا گیا ہے خاموشی سے اسے سرانجام دوں۔ حالانکہ بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن اب جو کچھ بھی تھا معمولات سے فراغت کے بعد عرضیوں کے حل دریافت کرنے بیٹھ گیا۔ یہ سلسلہ اسی انداز میں چل رہا تھا۔ اس میں تبدیلی کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ہاں جو تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ وہ دلخوش کن تھیں۔ مثلاً اب لوگوں کو فریب دے کر ان کی جیبیں نہیں خالی کرائی جاتی تھیں۔ کوئی اپنی خوشی سے کچھ لے آتا تو مال خانے میں جمع کر لیا جاتا یہاں جو لوگ موجود تھے ان کی ضرورتیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سنتو خان کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس کے گروہ کے جو افراد تھے وہ عبادت الٰہی میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کے گھربار مختلف بستیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی ضرورتیں بے شک پوری ہوتی تھیں لیکن اس کے لئے مال خانہ بہت وسیع تھا۔

شامی پورے دن نظر نہیں آیا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی وہ نہ دکھا تو میں نے ایک دوسرے آدمی سے پوچھا۔

"شامی کہاں ہے؟"

"بیمار ہے۔"

"ارے کیا ہو گیا؟"

"چوتھا دن ہے۔ بخار سے پھنک رہا ہے۔ بستی کے ڈاکٹر صاحب سے روز دوا آ رہی ہے مگر اسے تو سرسام ہو گیا ہے۔"

"مجھے بتایا بھی نہیں کسی نے۔ بڑے بابا کہاں ہیں؟"

"وہ بھی بالکل غائب ہے۔ چار دن سے نظر نہیں آیا۔"

میں حیران رہ گیا۔ شامی کا بخار تو سمجھ میں آ گیا۔ اس کے دل پر دہشت بیٹھ گئی تھی۔ مگر یہ نادر حسین کہاں غائب ہو گیا؟ شامی کو دیکھنے چل پڑا۔ لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ سرخ تھا۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ پانی دم کر کے پلایا۔ آیات الٰہی پڑھ کر پھونکیں۔ تسلیاں دیں اور پرسکون رہنے کی تلقین کر کے واپس آ گیا۔ دوسرے دن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شامی دو ایک دن میں بالکل تندرست ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "بڑے بابا کا کوئی پتہ نہیں ہے مسعود بھائی۔"

"ہاں، نظر نہیں آیا۔"

"آپ اجازت دیں تو اسے تلاش کروں؟"

"تمہاری خوشی ہے۔" میں نے کہا۔ شامی چلا گیا۔ میرے معمولات اطمینان بخش تھے۔ خلق اللہ کو فائدے پہنچ رہے تھے۔ دکھی دل والے اپنے مسائل لے کر آتے۔ میں حسب توفیق مخصوص انداز میں انہیں مشورے دیتا اور اللہ کے فضل سے انہیں فائدے پہنچے۔ اب بھورے شاہ کی اس خانقاہ کا شہرہ

دور دور تک پھیل گیا تھا۔ آنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ چار پانچ دن مزید گزر گئے۔ پھر ایک شام سورج ڈھلے شامی نادر حسین کو تلاش کر کے لے آیا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں اس سے ملنے چلا پڑا لیکن نادر حسین کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی اس کے بدن پر، سر کے بالوں میں کیچڑاٹی ہوئی تھی۔ داہنے رخسار پر زخم کا نشان تھا۔ آنکھوں میں نیم غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ اس کے جسم کو رسیوں کے ذریعے ایک چٹان سے کس دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ اسے دیکھ کر رو رہے تھے۔

"ارے یہ کیا؟"

"بڑا بابا، پاگل ہوگیا مسعود بھائی۔ بڑا بابا پاگل ہوگیا۔"

"مجھے راجن پور کے بازار میں ملا، بچے پتھر مار رہے تھے اور یہ دونوں ہاتھ سر پر رکھے بیٹھا تھا۔ کپڑے نہیں تھے اس کے بدن پر، ہم بڑی مشکل سے اسے باندھ کر لائے ہیں۔" وہ لوگ مجھے بتانے لگے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ نہیں جانتا تھا میں اس کے بارے میں اور شاید جستجو کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

"اب کیا کریں مسعود بھائی ....؟" شامی نے پوچھا۔

"میری سمجھ میں خود نہیں آرہا۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اگر ہم نے اسے باندھے نہ رکھا تو یہ پھر بھاگ جائے گا۔ بڑی مشکل سے ملا ہے۔ کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اسے۔" ایک اور شخص نے کہا۔ وہ سب اس کے لئے مضطرب تھے۔ افسردہ تھے رو رہے تھے۔ شامی نے کہا۔

"میں معلومات کروں گا۔ ہم بڑے بابا کا علاج کرائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ اس وقت تک ہمیں اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ تم سب اپنی رائے دو۔ میں اکیلا ہی بولے جا رہا ہوں۔"

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو ٹھیک کہہ رہے ہو شامی۔ ہم سب اس کی نگرانی کریں گے۔ اس کی خدمت کریں گے۔ جس طرح بھی بن پڑا اس کا علاج کریں گے۔" ان لوگوں نے خود ہی سارے معاملات طے کر لئے۔ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔ رہائش گاہ میں آکر اکرام نے کہا۔

"مسعود بھائی۔ ایک بات بار بار ذہن میں آرہی ہے۔ اجازت ہو تو پوچھ لوں۔"

"کہو............!"

"آپ اس سے کچھ غیر فطری بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ آپ ہر شخص کے لئے مضطرب ہوجاتے ہیں اور اس مشکل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ پھر نادر حسین تو وہ ہے جس نے آپ کے حکم پر سارے برے کام چھوڑ دیئے۔ وہ سنتو خان کے نام سے ڈاکے ڈالتا تھا، بھورے شاہ کے نام سے ...." اکرام نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بارہا میں نے تمہیں بتایا ہے اکرام۔ میں نہ درویش ہوں، نہ عامل نہ ولی۔ ایک گناہ گار ہوں۔ اتنا

بے بس ہوں کہ خود اپنے درد کا درماں نہیں پا سکا۔ بس رہنمائی ہوجاتی ہے۔ سمجھا دیا جاتا ہے اور میں عمل ہوجاتا ہوں اس بارے میں کچھ سمجھایا نہیں گیا میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"معافی چاہتا ہوں مسعود بھائی۔" اکرام نے شاید میرے لہجے کی تلخی محسوس کر لی تھی۔

نادر حسین کو روز ہی دیکھنے جاتا تھا۔ وہ رسیوں سے بندھا رہتا تھا بہت کم کھاتا پیتا تھا۔ شامی واقعی اسے بہت چاہتا تھا۔ وہی اس کے لئے سب سے زیادہ مرتا تھا۔ اس کی گندگی صاف کرتا، چہرہ دھلاتا، دو تین بار اس نے اسے لباس پہنایا مگر وہ ہمیشہ لباس پھاڑ دیا کرتا تھا۔ اس دوران خانقاہ کے معاملات بدستور چل رہے تھے۔ میں نے یہ شعبہ سنبھالا ہوا تھا اور اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ کچھ لوگ جو سنتو خان کے ساتھی تھے خاموشی سے چلے گئے تھے کیونکہ اب یہاں رہنے میں انہیں مالی فائدہ نہیں تھا۔ لیکن خانقاہ کی شہرت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ بہت دور دور سے لوگ آنے لگے تھے۔ تقریباً سب ہی کو فائدہ پہنچ جاتا تھا۔ رنج و غم اور مشکلات سے نڈھال انسان اپنی مشکل کا حل چاہتے تو احترام و عقیدت میں ڈوبے ہوئے آتے۔ تحفے تحائف اور نذرانے لاتے، انہی سے خانقاہ کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ پھر ایک دن شیخ مغیث الدین آئے پریشان حال، برے احوال، اپنی بیوی اور والد کو ساتھ لائے تھے۔ بیوی دماغی مریضہ تھی اس کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ خانقاہ کے خصوصی نظام پر ان کی آواز سنائی دی۔

"یا ولی، یا بزرگ، میری مشکل دور کر دیں۔ بہت پریشان ہوچکا ہوں۔ زندگی عذاب ہو گئی ہے میری۔ بے بسی کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میری بیوی دماغی مریضہ ہوگئی ہے۔ نظام حیات درہم برہم ہوگیا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں علاج کر چکا ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ کے قدموں میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے میری مشکل کا حل بتا دیں ولی۔ آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔ اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک مشکل دور نہیں ہوجائے گی۔"

بڑی پردرد آواز تھی۔ میں نے عرضی لکھ لی۔ پھر شاید کسی دوسرے شخص کو بلا لیا گیا تھا۔ اسی رات شامی میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ "ایک مشورہ چاہتا ہوں مسعود بھائی۔"

"کیا؟"

"خانقاہ کے انداز بدل چکے ہیں۔ اب یہاں وہ نہیں ہوتا جو کبھی ہوتا تھا۔ ہم تو دوسری ہی وجہ سے لوگوں کو یہاں سے دور رکھتے تھے۔ پریشان لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل چاہتے ہیں۔ ان کے پاس قیام کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اگر اب انہیں خانقاہ کے احاطے میں پڑا رہنے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ دراصل یہ بات میں ایک خاندان کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

"کون ہے؟"

"ان کا نام شیخ مغیث الدین ہے۔ بوڑھے باپ اور پاگل بیوی کے ساتھ آئے ہیں۔ بہت دور سے آئے ہیں اور قیام کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے خانقاہ میں قیام کی اجازت مانگی تو ہم نے منع کر دیا۔ سب بے چارے خانقاہ سے دور ایک درخت کے نیچے جا پڑے ہیں۔ کہتے ہیں مجبوری ہے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ان کا ....!"

"ایسی کسی مشکل کے شکار شخص کو اگر اجازت دے دو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کسی گوشے میں پڑے رہیں گے۔"

"آپ کی اجازت ہے؟"

"میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ شامی چلا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں اور اکرام ٹہلنے نکلے تو ہم نے تین افراد پر مشتمل اس خاندان کو ایک گوشے میں فروکش پایا۔ پھر دریافت حال کے لئے ہم دونوں ان کی طرف بڑھ گئے۔ ہمارے قریب پہنچنے سے قبل شیخ صاحب اٹھ کر ہمارے قریب آگئے اور عاجزی سے بولے۔ "میاں صاحب تھوڑا سا پانی عنایت ہو سکتا ہے۔ اس کی ضرورت ہے ورنہ تکلیف نہ دیتا۔"

"کیوں نہیں، برتن ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں، مجھے جگہ بتا دیجئے۔ میں لے آؤں گا.........!"

"آپ برتن دے دیں۔" میں نے کہا اور پھر اکرام کو پانی لینے کے لئے بھیج دیا۔

"اگر ضرورت ہو تو کچھ دیر کیلئے تشریف رکھئے۔ بڑا بے بس انسان ہوں میں، دل میں شدید گھٹن ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔

"آپ کی اہلیہ کو شاید کچھ تکلیف ہے۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ دورے پڑتے ہیں۔ کیا کیا علاج نہ کرالیا۔ مگر اس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ اس درگاہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ شاید یہیں سے ہمیں شفا مل جائے۔"

"ان دوروں کی کچھ نوعیت پتہ چل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"نوعیت........." شیخ صاحب کے لہجے میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوگئی۔ اسی وقت پیچھے سے آواز سنائی دی "سن۔ اگر کچھ بتانا ہے تو سچ سچ بتائیو ورنہ زبان بند رکھیو۔ جھوٹ بولے گا تو اور مصیبت میں پڑ جائے گا۔ ساری دنیا کے سامنے جھوٹ بول کر تو گزارہ کرلیا تو نے، اب یہاں بابا کے دربار میں جھوٹ مت بولیو۔ نہیں تو زبان بند رکھ........."

"یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے والد ہیں مگر ٹھیک کہہ رہے ہیں میاں صاحب۔ ہم نے گناہ کیا ہے۔ سزا تو کاٹنی ہی ہوگی۔" شیخ صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ اسی وقت اکرام پانی لے آیا جسے شیخ صاحب کے والد نے لے لیا۔ شیخ صاحب بولے۔ "پہلا گناہ گار تو میں ہوں۔ میں نے بے لوث محبت کرنے والوں کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ بچپن میں میری والدہ مرگئی تھیں۔ والد صاحب نے مجھے میرے ننھیال سے دور کرلیا۔ بارہ سال کے بعد مجھے اپنے ننھیالی خاندان کا پتہ چلا تو میں ان سے ملا۔ محبت کرنے والی بوڑھی نانی، ماموں اور خالہ نے مجھے سینے سے لگالیا۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہا۔ ماموں نے مجھے بیٹوں کی طرح سمجھا۔ نانی نے اپنی اولاد کی نشانی سمجھ کر اپنی چھاتی کھول دی۔ گیارہ سال تک میں ان کے ساتھ رہا اور میرے ماموں زاد بہن بھائی، نانی اور تمام لوگ مجھے اپنا سمجھتے رہے۔ پھر انہوں نے میری شادی کر دی۔ بیوی نے

مجھے زندگی کا نیا دور دیا اور سب سے پہلے میں ان پیار کرنے والوں سے دور ہوگیا۔ میں نے ان سے اجتناب برتا اور انہیں اپنی محبت سے بے دخل کر دیا۔ میں ان سے بس ایک شناسا کی طرح ملنے لگا۔ اپنی بیوی اور اس کے خاندان کو ہی میں نے اپنا سمجھ لیا اور وہ جو میری ماں کی نشانی تھے دل مسوس کر رہ گئے۔ شاید اسی عمل کا ردعمل تھا کہ قدرت نے مجھے اولاد سے محروم رکھا۔ بوڑھی نانی میرے لئے اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ مجھے کسی سے الفت نہ رہی اولاد سے محرومی میرے لئے اور میری بیوی کے لئے بڑا دکھ تھی۔ علاج معالجے ہوئے۔ ہر طرح کے جتن ہوئے مگر ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ پھر ہماری ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جو گندے علوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ میری بیوی نے ان سے رابطہ قائم کرلیا اور اولاد کے حصول کے لئے کالے جادو کا سہارا لیا۔ کالے جادو کے ایک ماہر نے اسے بتایا کہ اولاد حاصل کرنے کے لئے اسے ایک جان کی قربانی دینی ہوگی۔ ایک گیارہ سالہ بچہ درکار ہوگا جسے قتل کر کے اس پر کالا علم کرنا ہوگا۔ اس جادوگر نے بچے کے حصول کا ذریعہ بتاتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ ایسے کام کرتے ہیں انہیں معاوضہ دے کر کسی بچے کو اغواء کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میری بیوی نے یہ کام اس شخص کو سونپ دیا اور اغواء کرنے والوں کا معاوضہ ادا کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد کالے علم کے ماہر نے اسے انسانی گوشت کے کچھ ٹکڑے دے کر کہا کہ انہیں مٹی کی ہانڈی چڑھا کر چولہے پر پکاتی رہے اور جب یہ ہانڈی میں راکھ کی شکل اختیار کر جائیں تو ایک مخصوص طریقے سے وہ اس راکھ کو استعمال کرے۔ میری بیوی کالے علم کے اس ماہر کی ہدایات پر عمل کرتی رہی اور پھر......... پھر ہم ایک بیٹے کے ماں باپ بن گئے۔ ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ بچے کی خوشی میں ہم دیوانے ہوگئے تھے۔ ہم اس کی صورت دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ بچہ تین سال کا ہوگیا۔ وہ باتیں کرنے لگا تھا۔ لیکن......... نہ جانے کیوں میری بیوی اب کچھ خوفزدہ سی رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ کبھی وہ راتوں کو جاگ جاتی تھی۔ وہ سہم سہم کر بچے سے لپٹ جاتی تھی۔ اکثر وہ خوف بھری نظروں سے بچے کو دیکھنے لگتی تھی۔ میں نے کئی بار یہ بات محسوس کی اور ایک دن اس سے پوچھ بیٹھا۔

"تم کچھ عجیب سی نہیں ہوتی جا رہی ہو؟"

"کیسی؟" اس نے کہا۔

"بظاہر بیمار نہیں ہو......... لیکن رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ چہرہ اتر گیا ہے کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے تمہاری۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔"

"مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"نہیں......... کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"نہ بتاؤ وہ دوسری بات ہے لیکن کچھ ہے ضرور.........!"

"آپ سے کہوں گی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔"

"کوشش کروں گا۔" میں نے کہا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔ "آپ نے کبھی کوئی

خاص بات محسوس کی ہے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"اپنے بیٹے کے بارے میں۔"

"کیسی خاص بات .... ؟"

"دوسرے بچوں کو آپ دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس عمر میں بچے ماں باپ پر جان دیتے ہیں۔ ماں ان کی تمام محبتوں کا محور ہوتی ہے۔ وہ ماں کے سینے سے چمٹ کر سکون پاتے ہیں۔ ماں کی آغوش میں انہیں کائنات مل جاتی ہے لیکن ہمارا بچہ .... ہمارا شانی۔"

"ہاں۔ آگے کہو ...."

"بات آج کی نہیں ہے۔ تین سال کا ہوگیا ہے وہ .... مگر .... وہ کبھی میرے سینے سے نہیں چمٹا۔ وہ مجھ سے گھبراتا ہے۔ اب غور کرتی ہوں تو یہ پورے تین سال میری آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔ جھولے میں وہ پر سکون رہتا تھا۔ میں گود میں لیتی تھی تو رونے لگتا تھا اور خاموش نہیں ہوتا تھا۔ ایسے تاثرات ہوتے تھے اس کے چہرے پر کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے مجھ سے الجھتا ہے۔ میری گود میں نہیں آنا چاہتا۔ مجھے احساس تو ہوتا تھا لیکن میں توجہ نہیں دیتی تھی۔ غور نہیں کرتی تھی۔ مگر اب۔ اب تو ...." میری بیوی رونے لگی۔

"عجیب بے وقوف عورت ہو۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میری کیفیت نہیں سمجھ سکتے۔ رات کو وہ میرے پاس سوتا ہے مگر کبھی مجھ سے لپٹتا نہیں ہے۔ میں اسے لپٹاتی ہوں تو رونے لگتا ہے۔ مجھ سے دور ہٹ جاتا ہے۔ ایک رات میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اسے محبت سے دیکھا مگر .... مگر ...."

"مگر کیا؟"

"وہ جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ وہ شدید نفرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے کروٹ بدل لی۔ اور اب اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں راتوں کو اس سے ڈر جاتی ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو۔ اپنے بچے کے بارے میں تم ایسا سوچ رہی ہو"

"آہ۔ میں کیا کروں؟ اتنا خود کو سمجھاتی ہوں مگر نہ جانے کیوں یہ سب کچھ دماغ میں آتا رہتا ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں وہ سب سے بولتا ہے سب سے باتیں کرتا ہے مگر...... ہم سے کتنا کم بولتا ہے وہ۔"

"بس اب اس پاگل پن کے خیال کو دل سے نکال دو۔ بارہ سال کے بعد ہماری مراد پوری ہوئی ہے اور تم ...."

وہ خاموش ہوگئی مگر میاں صاحب اس دن سے میں نے بھی اپنے بیٹے کی حرکات نوٹ کرنا شروع کر دیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بیوی سچ کہتی ہے شانی ایسا ہی تھا۔ وہ کسی بات پر ہنس رہا ہوتا تو ہمیں دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔ وہ یقیناً ہمیں ناپسند کرتا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ ناقابل یقین، ناقابل سمجھ۔

...اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ بظاہر وہ نارمل تھا بس ہمارے ساتھ اس کا رویہ ایسا تھا پانچ سال کا ہوگیا ... میری بیوی بدستور اسی کیفیت کا شکار تھی۔ کوئی ایک سال کی بات ہے۔ میرے ایک دوست کی بہن ... شادی تھی۔ اندرون ملک کے ایک دیہی علاقے میں رہتے تھے اس کے والدین۔ میرا دوست شہر میں ... بہت کرتا ہے۔ اس نے بہت پیچھے پڑ کر مجھے اور میری بیوی کو بہن کی شادی میں شرکت کے لئے آمادہ ... اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ اچھا ہے میری بیوی بہل جائے گی۔ ہم وہاں جاکر خوش ... تھے۔ ہمارا بیٹا بھی ہمارے ساتھ تھا وہ وہاں بچوں میں گھل مل گیا تھا۔ شادی کے ہنگامے ہو رہے ... تھے۔ ایک دن چودہ پندرہ سال کی ایک ہندو لڑکی میرے بیٹے کے ساتھ آگئی۔ وہ اسے گھر چھوڑنے آئی ... تھی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"جمنا داس کی بیٹی ہے۔ جمنا داس پیچھے رہتے ہیں ہمارے۔" میرے دوست نے جواب دیا۔

"بھگوتی ہمارے گھر تھا چاچا۔ آپ کہو تو ہم اسے ساتھ لے جاویں۔ رات کو پہنچا دیں گے۔" ...لڑکی نے کہا۔

"کون بھگوتی .... ؟" میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ .... اور کون؟" لڑکی بولی۔

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ یہ تو میرا بھتیجا ہے شانی ہے اس کا نام ....!"

"تو ہم کب منع کر رہے ہیں چاچا۔ لے جائیں اسے ساتھ ...." لڑکی بولی۔

"نہیں .... جاؤ .... بھاگ جاؤ۔" میرا دوست غصے میں بولا۔

"جانے دو چاچا۔ ماسی سدھاوتی اسے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہے۔ جانے دو نا۔" لڑکی ضد ...کرنے لگی۔

"نہیں پریما۔ پھر آجائے گا۔ اب تم جاؤ .... جاؤ شاباش .... یہ مہمان ہے یہاں کے ...راستے نہیں جانتا۔"

"مجھے سارے راستے آتے ہیں۔" شانی نے غصے سے کہا۔

"نہیں بیٹے ضد نہیں کرتے۔ جاؤ لڑکی۔ پھر آجائے گا یہ تمہارے پاس۔" میں نے کہا اور لڑکی ...زردہ ہو کر واپس چلی گئی۔

"یہ کیا نام لے رہی تھی اس کا؟" میں نے کہا۔

"پتہ نہیں کیا قصہ ہے؟ میرے دوست کو گھر میں بلا لیا گیا اس لئے بات ختم ہوگئی میں نے محسوس کیا ...شانی کا بھی موڈ خراب ہو گیا ہے۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ دوسرا دن شادی کا تھا۔ میں ...اپنے دوست کے ساتھ تیاریوں میں مصروف تھا۔ بارات آنے والی تھی۔ کوئی چار بجے شام میری ...باہر نکل آئی۔ اس نے کہا۔

"شانی نے کھانا کھایا۔ صبح سے کھیلتا پھر رہا ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"کیا ......؟" میں اچھل پڑا۔ میں نے خود اسے صبح سے نہیں دیکھا تھا۔ "کیا وہ اندر ... ہے؟"

"صبح سے اندر نہیں آیا۔"

"ٹھیک ہے آجائے گا۔ ابھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔ حالانکہ میرا دل خود ہول گیا تھا۔ ... گھبرایا ہوا اپنے دوست کے پاس گیا اور اسے یہ ماجرا سنایا۔ وہ بے چارا خود شامیانے وغیرہ لگوا رہا تھا ... میرے ساتھ بھاگا۔

"فکر مت کرو۔ مل جائے گا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ شادی میں آیا ہے جو اسے دیکھے گا وہ اسے یہاں پہنچا دے گا۔ اوہ آؤ ذرا میرے ساتھ۔" میرے دوست کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ گھوم کر پیچھے ... علاقے میں آ گیا۔ ایک میدان سا تھا جس کے دوسرے سرے پر مکانات نظر آ رہے تھے۔ ایک مکان کے سامنے رک کر میرے دوست نے دروازے کی زنجیر بجائی اور ایک آدمی باہر نکل آیا۔

"کیا بات ہے بھیا، سب ٹھیک ہے نا .... ! کوئی ضرورت ہے ہماری؟"

"بس تیار ہو جائیں جمنا داس جی۔ بارات ٹھیک وقت پر آ جائے گی۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں آیا یہاں۔ کل پریما کے ساتھ تھا......... ؟"

"بھگ ...." جمنا داس کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں اور میرا دوست چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے بولا۔ "پریما کے ساتھ تھا صبح سے۔ سدھاوتی کے پاس بیٹھا ہے۔ میں بلا کر لاؤں کس کا چھورا ہے وہ؟"

"میرا بھتیجا ہے۔"

"بھگوان کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" جمنا داس آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جمنا داس بھی شانی کو بھگوتی کہتے کہتے رک گیا ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تین گھر چھوڑ کر وہ ایک بوسیدہ سے مکان میں داخل ہو گیا اور کوئی تیس سیکنڈ کے بعد ہی شانی کو ساتھ لئے باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے پریما بھی تھی اور ان تینوں کے پیچھے ایک عورت باہر نکلی تھی۔ میلی کچیلی ساڑھی میں ملبوس، بال بکھرے ہوئے چہرے پر وحشت، رنگ پیلا پڑا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر شانی کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، تم صبح سے غائب ہو۔" شانی نے ایک نگاہ مجھے دیکھا۔ وہی نفرت بھرا انداز ... اس نے منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں اسے ساتھ لئے آگے بڑھا تو وہ دیوانی عورت بھی ہمارے پیچھے چل پڑی۔ جمنا داس نے آگے بڑھ کر عورت کا بازو پکڑ لیا۔

"نہ سدھو نہ، مہمان ہیں، جانے دے اپنے گھر جائیں گے۔"

"وہ .... وہ ...." میلی کچیلی عورت نے انگلی شانی کی طرف اٹھائے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں بڑی بے بسی، بڑا پیار، بڑی حسرت تھی، میں اپنے دوست کے ساتھ شانی کو لئے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرا دوست بھی خاموش تھا اور میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شانی کو ...

... اپنی بیوی کے پاس پہنچا دیا۔ وہ راستے بھر کچھ نہیں بولا، نہ ضد کی تھی نہ مچلا تھا لیکن اس کے انداز سے نفرت کا اظہار بدستور ہو رہا تھا جو اس کی فطرت کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ بارات کے ہنگامے تھے اور میں ... عمل نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یہاں کسی اور قسم کا احساس پیدا ہو چنانچہ میں نے خاموشی ہی اختیار ... جہاں تک ہو سکا اپنے آپ کو بارات کے سلسلے میں ضروری کاموں میں مصروف رکھا، البتہ اپنی ... کو میں نے ہدایت کر دی کہ شانی کو اپنی نگرانی میں رکھے اور باہر نہ نکلنے دے لیکن میرا دماغ تجسّس سے ... جا رہا تھا۔ کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو .... بالآخر بارات آ گئی۔ نکاح کا وقت قریب آ گیا۔ یہ ... یہاں کے قدیم رہنے والے تھے۔ ہندو اور مسلمان سب ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہوتے تھے۔ میں نے جمنا داس کو دیکھا! دھوتی اور کرتے میں ملبوس محفل میں موجود تھا اور مہمانوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ جمنا داس سے اس بارے میں بات کی جائے۔ خاموشی سے معلومات حاصل کروں ہو سکتا ہے کچھ پتہ چل جائے۔ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سارے کام خوش اسلوبی سے چل رہے تھے چنانچہ میں جمنا داس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اس وقت تو آپ سے بات ہی نہ ہو سکی جمنا داس جی میرے دوست نے بتایا ہے کہ آپ تو ان کے بڑے پرانے پڑوسی ہیں۔"

"ہاں بھیا جی .... جیون مرن کا ساتھ ہی رہا ہے ہمارا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے ہیں بڑے اچھے لوگ ہیں یہ بھی اور پھر بیٹی کی شادی تو یوں سمجھو پوری بستی کی بیٹی کی شادی ہوتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس شادی میں کچھ بھی نہیں کیا........."

"آپ جیسے اچھے لوگ بڑے خوش نصیبوں کو ملتے ہیں سب لوگ تعریف کر رہے تھے آپ کی جمنا داس جی۔"

"ارے بھیا ہم کیا اور ہماری اوقات کیا، بس جو خود اچھے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو اچھا کہتے ہیں........."

"جمنا داس جی، پریما آپ کی بیٹی ہے۔ میں نے یہاں سے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا.........؟"

"آپ ہی کی ہے بھیا جی ...."

"بڑی اچھی بچی ہے۔ میرا بیٹا تو اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا ہے۔ ویسے جمنا داس جی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ نے میرے بیٹے کو بھگوتی کہہ کر کیسے پکارا .... ؟ یہ بڑی عجیب بات ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا........."

جمنا داس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بے ڈھنگے انداز میں ہنسنے لگا۔

"وہ بھیا جی بس ایک ذرا سا کھیل ہے بھگوان کا کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

"مجھے اس بارے میں بتائیں گے نہیں جمنا داس جی .... ؟"

"ارے ہاں ہاں۔ کا ہے ناں۔ وہ دراصل بھیا جی تمہارا چھورا سدھاوتی کے چھورے بھگوتی داس ... کا ہے بالکل ویسا بے چاری سدھاوتی ودھوا تھی۔ برسوں سے یہاں رہتی ہے اس کا پتی کارخانے

میں کام کرتا تھا. بھٹی میں گر پڑا اور جیتے جی بھسم ہوگیا۔ ایک ہی چھورا تھا سدھاوتی کا. جس کے ساتھ جیون بتا رہی تھی. گھروں کے کام دھندے کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال رہی تھی کہ بے چاری کے ساتھ ایک عجیب و غریب حادثہ ہوگیا۔ ویسے بھی بھیا جی بے چارہ بھگوتی داس ہماری بٹیا پریما کی عمر کا تھا۔ ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے وہ اور پریما۔ اور پھر پڑوسی ہونے کے ناتے دونوں نے ساتھ ساتھ جیون شروع کیا اور دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑی محبت کرنے لگے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بھگوتی داس کھیتوں پہ گیا ہوا تھا کہ غائب ہوگیا۔ پھر بھیا وہ ملا نہیں. بے چاری سدھاوتی پاگل ہوگئی اپنے چھورے کے غم میں۔ پولیس میں رپٹ درج کروائی. آدمیوں نے جگہ جگہ اسے تلاش کیا۔ پر بھگوتی داس کہیں نہیں ملا۔ کوئی پانچ چھ سال پرانی بات ہے بس یوں سمجھ لو کے اس کے بعد بے چارے بھگوتی کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ یہ تمہارا چھورا جو ہے نا بھیا یہ بالکل بھگوتی کی صورت کا ہے۔ پریما اسے دیکھ کر پاگل ہوگئی تھی اور بھگوتی بھگوتی کہتی چڑھ دوڑی تھی۔ مگر وہ بھگوتی کہاں. وہ پانچ سال کا ہوگا زیادہ سے زیادہ۔ جبکہ بھگوتی اگر ہوتا تو اب پندرہ سولہ سال کا ہوتا گیارہ سال کی عمر میں غائب ہوا تھا بے چارہ بھگوتی۔ بھگوان جانے کون لے گیا اسے. کہاں چلا گیا؟ یہ ہے بھیا تمہارے چھورا کو بھگوتی کہنے کی کہانی اور یہ ہے بے چاری سدھاوتی کے پاگل پن کی داستان۔" جمنا داس نے بتایا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ ایک انوکھا خوف میرے رگ و پے میں جاگزیں ہوگیا تھا۔ بارات کے ہنگامے جاری تھے۔ مگر میرا بدن ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوڑ رہا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے بھگوتی غائب ہوا تھا۔ کالے جادو کے ماہر نے ایک گیارہ سالہ بچے کے اغوا کی کہانی سنائی تھی. جس کی قربانی دے کر ہمارے ہاں بچے کی پیدائش ہو سکتی تھی۔ ہم نے اسے رقم ادا کی تھی اور اس نے ہمارا کام کر دیا تھا۔ شانی بھگوتی کی صورت تھا۔ پانچ سال کا ہے وہ۔ چھ سال پہلے بھگوتی اغوا ہوا تھا۔ خدا کی پناہ. خدا کی پناہ. واقعات کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔ وہ کالے جادو کا کھیل جس کی بنا پر شانی وجود میں آیا اب اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ کالا جادو صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں اولاد پیدا ہو جائے۔ اس کے اثرات اب ہم پر نمودار ہو رہے تھے۔ شانی ہمارا اکلوتا بچہ. منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا بھگوتی کی شکل کا تھا۔ میرے خدا میرا بدن شدید دہشت کا شکار تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا بھگوتی کی روح شانی میں حلول کر گئی ہے یا شانی بھگوتی کا نیا روپ ہے؟ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سب کچھ میرا دل قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن جو کچھ تھا ہمارے سامنے تھا اور میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ بارات رخصت ہوئی. مہمان چلے گئے. رسمی طور پر مجھے بھی وداعی میں حصہ لینا پڑا۔ دوست کی بہن کا معاملہ تھا. خود کو الگ کیسے رکھ سکتا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح میری بیوی نے واپس چلنے کی رٹ لگا دی۔ حالانکہ میرا دوست ابھی یہاں کئی دن قیام کرنا چاہتا تھا۔ یہ وعدہ کر کے لایا تھا مجھے کہ میں کئی دن تک اس کے ساتھ رہوں گا۔ شادی کے بعد کے ہنگاموں میں بھی حصہ لوں گا۔ لیکن اب اس کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔

میرا دل تو خوف و دہشت کا شکار تھا۔ ادھر میری بیوی بھی بری طرح واپس چلنے کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ سب ہی نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ مانی اور بحالت مجبوری میرے دوست نے بھی

اجازت دے دی۔ میں خود بھی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی میرا دل ہی جانتا تھا. پھر ہم اپنے شہر واپس آگئے۔ شانی ہمارے ساتھ تھا۔ میری بیوی تو اس سے خوفزدہ رہتی ہی تھی۔ لیکن میری بھی کیفیت اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں چور نگاہوں سے شانی کو دیکھتا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی گمبھیرتا ایک عجیب سی نفرت رچی ہوئی پاتا جیسے وہ ہمارے عمل سے شدید نفرت کرتا ہو۔ پھر ایک دن وہاں سے واپسی کے کوئی ایک ہفتے کے بعد کی بات ہے میری بیوی نے مجھ سے کہا۔

"ایک بات کہنا چاہتی ہوں میں آپ سے۔"

"ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟"

"وہاں۔ جہاں ہم شادی میں گئے تھے میں نے ایک عجیب بات سنی ہے آپ کو خدا کا واسطہ اس بات کو مذاق میں نہ ٹالئے. میری تو حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے. کچھ کیجئے. کچھ کرنا پڑے گا ہمیں. سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں؟"

"بات کیا ہے؟"

"وہاں شانی کے بارے میں تبصرے ہو رہے تھے سدھاوتی نامی کوئی عورت رہتی ہے وہاں اس کا بچہ جس کی عمر گیارہ سال تھی پانچ چھ سال پہلے وہاں سے اغوا ہوگیا تھا۔ اس کا نام بھگوتی تھا اور وہ۔ وہ بالکل شانی کی صورت تھا بالکل شانی کی صورت۔" میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرا خیال تھا یہ کہانی میرے ہی ذہن میں محفوظ ہے۔ لیکن عورتیں بھلا کہاں چوکتیں۔ اسے بھی یہ کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ پھر میں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"گویا اب تم ایک نئی کہانی کا سہارا لے کر مجھے پریشان کرو گی۔" میری بیوی زار و قطار رونے لگی۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھ سے پریشان ہوگئے ہیں؟"

"ہاں ہو گیا ہوں بالکل ہو گیا ہوں. پہلے تمہیں بچے کی خواہش نے دیوانہ کر دیا تھا اور تم سب کچھ کرنے پر آمادہ ہوگئی تھیں اور اب اس نئی کہانی سے تم نہ صرف خود پاگل ہوئی جا رہی ہو بلکہ مجھے بھی پاگل کئے دے رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں. میں کیا کر سکتا ہوں مجھے جواب دو؟"

"خدا کیلئے کچھ کیجئے اس کالے جادو کے ماہر سے ملئے اس سے کہئے کہ اب ہم کیا کریں اور یہ سب کیا ہے؟ کیا کچھ ہو سکتا ہے ہم تو کالے جادو کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے کالے جادو کے ماہر سے ملوں اور اس کے بعد کوئی نیا جادو کرا کے لے آؤں۔ یہی چاہتی ہو نا تم؟"

"تو پھر کیا ہو گا. شانی ہم سے نفرت کرتا رہے گا ہمارا اکلوتا بچہ اس کے سوا ہمارا کوئی اور ہے بھی تو نہیں"

میری بیوی زار و قطار روتی رہی۔ میرے پاس ان آنسوؤں کا کوئی حل نہیں تھا۔

وقت آگے بڑھتا گیا۔ شانی کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب وہ اپنی ماں کے پاس سوتا بھی نہ تھا۔ اس کی بیزاری اس کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک رات جب ہم اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے اچانک میری بیوی دہشت بھرے انداز میں چیخ پڑی۔ اس کی بھیانک چیخوں نے مجھے بھی دہشت کا

شکار کر دیا۔ شانی اپنے الگ بستر پر سو رہا تھا۔ ان چیخوں نے اسے نہیں جگایا تھا۔ بڑی مشکل سے بیوی معتدل ہوئی خوف بھری نظروں سے شانی کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ۔ یہ جاگ رہا ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں یہ جاگ رہا ہے۔ مکر کئے پڑا ہے۔ ابھی یہ میرے قریب تھا۔ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یہ۔ یہ مجھے مارے گا۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ بتاؤ کیا کروں میں، اسے گھر سے نکال دوں، اور کیا کروں؟"

"نہیں نہیں۔ وہ میرا بچہ ہے۔ وہ میری اولاد ہے۔" میری بیوی سسکیاں بھرنے لگی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے کہا اور میاں صاحب مختصر یہ کہ میری بیوی آہستہ آہستہ ذہنی توازن کھونے لگی۔ اس پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ اور آج یہ اس حال کو پہنچ گئی ہے یہ اپنے بچے کو چاہتی بھی ہے اور اس سے دہشت زدہ بھی ہے۔ نہ جانے کیا کیا جتن کئے ہیں میں نے ڈاکٹروں کے پاس بھلا اس کا کیا علاج ہے۔ میں تو اتنا بد نصیب ہوں کہ کسی کو اصلیت بتا بھی نہیں سکتا۔ کس سے کہوں، ایک بچے کو قتل کر کے، ایک ماں کی گود اجاڑ کر ہم نے اپنی سونی گود بھری ہے اس خانقاہ کی شہرت میاں سنی ہے، بڑی دور سے آس لے کر آیا ہوں۔ خدا کیلئے ہماری مشکل کا حل بتا دیں خدا کے لئے۔"

میں دہشت سے گنگ تھا۔ اکرام پتھر بنا ہوا بیٹھا تھا۔ بڑی بھیانک بڑی دہشت ناک داستان تھی یہ۔

"بچہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نانی نانا کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شیخ مغیث الدین۔"

"سب سے پہلے اپنا نام بدل دو۔" میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ اور وہ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔!

تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ ساری برائیاں کرلی تھیں کم بختوں نے۔ اپنی ناپاک آرزو کے ہاتھوں نڈھال ہو کر ایمان بیچ دیا تھا اور پھر بہتری کے خواہاں تھے۔ شدید گھن آ رہی تھی مجھے ان دونوں سے، وہ مشرک تھے۔

وہ بولا۔ "سمجھا نہیں میاں صاحب!"

"تمہیں اس نام کو اپنائے رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اسلامی نام ہے متبرک اور قابل احترام۔"

"میں مسلمان ہوں۔" وہ بولا۔

"شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے۔ غور نہیں کیا اپنے کالے کرتوتوں پر۔ عورت تو ناقص العقل ہے۔ تم لوگ اسے سنبھال نہیں سکتے۔ اس طرح کٹھ پتلی بن جاتے ہو تم اس کے ہاتھوں۔ اس کائنات کا ہر ذرہ مالک کائنات کے اشارے سے جنبش کرتا ہے۔ تمہاری تقدیر میں اولاد ہوتی تو تمہیں ضرور ملتی ہو سکتا ہے اس کا وقت مقرر کر دیا گیا ہو۔ تم نے اپنی ہوس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اس مردود کا سہارا لیا

جسے شیطان کہا جاتا ہے۔ تمہاری عقل نے تمہیں ہوشیار نہ کیا کہ تم شیطنت کی طرف بڑھ رہے ہو۔ معلوم نہیں کہ جادو کفر ہے۔ اس شیطان زادے نے تم سے کہا کہ تمہیں اولاد کے حصول کے لئے ایک انسانی جان کی قربانی دینا ہوگی۔ اس کے بجائے کہ تم اسے سنگسار کر دیتے تم نے اسے اس عمل کا موقع دیا۔ وہ شیطان زادی اپنی گود بھرنے کے لئے ایک اور ماں کی گود اجاڑنے پر آمادہ ہو گئی اور تم اس کے ہمنوا بنے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے اس ماں کو دیکھ لیا جو اولاد کے کھو جانے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔ قدرت تمہارے کالے کرتوت تمہارے سامنے لائی مگر تم نے غور نہ کیا اور اب تم اس عورت کے لئے بہتری چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم بے دین ہو۔ تمہارا اس پاک مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"رحم میاں صاحب رحم ...." وہ بولا۔

"تم مردود ہو .... قابل سزا ہو لیکن جزا و سزا کا مالک وہ ہے جس کے ہم بندے ہیں۔ تمہارا فیصلہ وہی کرے گا۔ اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔"

"کیا میاں صاحب؟"

"یہ جگہ فوراً چھوڑ دو۔ یہ غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ میں دوسروں کو اس پر آمادہ کروں تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں تو بڑی آس لے کر آیا تھا میاں صاحب۔"

"تمہاری بینائی چھن چکی ہے۔ وہ جنہوں نے تمہیں بے لوث محبت دی تمہیں تمہارے برے وقت میں اپنایا تمہارے لئے کچھ نہ رہے، اور وہ قابل نفرت عورت جس نے بالآخر تم سے تمہارا ایمان چھین لیا تمہارے لئے آسمان ہو گئی۔ سنو اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اگر تمہیں لمحاتی عیش و عشرت مل گئے ہیں تو انہیں دھوکا جانو، آنے والا وقت تم پر کٹھن ہے۔ گیارہ سال پورے ہو جانے دو۔ وہی بچہ جس کے لئے تم نے ایمان کھویا تمہاری موت کا سامان بنے گا۔ اسے تمہارے اعمال کی سزا کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ جاؤ اس سے زیادہ تمہارے ساتھ رعایت نہیں کی جائے گی۔"

"ہمارے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے میاں صاحب؟"

"خدا کی لعنت ہو تم پر ...." میں نے نفرت سے کہا۔

"سنئے تو سہی میاں صاحب ...."

"جو کچھ سنا دیا ہے تو نے اس سے زیادہ نہ سنا۔ تیرے حق میں بہتر ہے۔ اکرام انہیں یہاں سے نکال ...." میں ان کے پاس سے اٹھ کر واپس چل پڑا۔ اکرام نے انہیں وہاں نہ رہنے دیا۔ اسی وقت انہیں خانقاہ سے دور جانا پڑا تھا۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ دل لرز رہا تھا اس کہانی پر .... کیسے کیسے مردود انسان ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اکرام میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ مگر یہ خاموشی قائم نہ رہی۔ شانی نظر آیا تھا اس کے ساتھ نادر حسین بھی تھا۔ لباس پہنے ہوئے نہایت بہتر حالت میں۔ ہم دونوں حیرت سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"بڑا بابا ٹھیک ہو گیا مسعود بھائی۔ ہمارا بڑا بابا ٹھیک ہو گیا........" شامی خوشی سے بولا۔

"واقعی خوشی کی بات ہے۔ نادر حسین کیسے ہو تم؟"

"میں تو جیسا تھا ویسا ہوں۔ بس تم لوگوں کی بینائی متاثر ہو گئی ہے۔" نادر حسین نے جواب دیا۔ پ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ تاہم میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا اور شامی بولا۔

"چلو شامی، تمہاری محنت بار آور ہوئی۔ ہاں نادر حسین اب ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک مخصوص وقت گزارنے کے بعد ہمیں اجازت دے دو گے۔"

"مخصوص وقت گزرا کہاں ہے، جلد بازی کیوں کر رہے ہو؟ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔" اس نے پھر شامی سے بولا۔ "جاؤ، تم آرام کرو۔ آرام کا وقت ہے۔"

"جی بڑے بابا۔" شامی نے کہا۔ پھر مجھے ہلکا سا اشارہ کیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ باتیں تو ٹھیک کر رہا ہے مگر میں اس کا خیال رکھوں کہیں بھاگ نہ جائے۔ شامی چلا گیا مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ مجھے خود ہی کہنا پڑا۔

"شامی کو بھیج کر تم کوئی خاص بات کہنا چاہتے تھے؟"

"ہاں .... رکو........ ابھی رکو۔ کہیں سے بلاوا تو نہیں آیا ہے؟"

"کیسا بلاوا؟" میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بلاوے الگ الگ ہوتے ہیں۔ کیا سمجھے۔ سارے بلاوے الگ الگ ہوتے ہیں۔ تمہارا کوئی بلاوا نہیں ہے ابھی رکو۔ نہ جانے کسے کسے تمہاری ضرورت پڑے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ نادر حسین کے بولنے کا یہ انداز نہیں تھا۔ وہ تو میرا بہت احترام کرتا تھا۔ لیکن اس کا یہ انداز بالکل مختلف تھا۔ اس کے بعد اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ وہ رخ بدل کر بیٹھ گیا تھا۔ اکرام نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"آپ بیٹھیں گے مسعود بھائی؟"

"نہیں۔ چلو آرام کریں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ شامی مجھے اشارہ کر کے گیا تھا لیکن میں رات بھر چوکیداری نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب وہ بہتر بھی نظر آ رہا تھا چنانچہ میں نے اپنی آرام گاہ کا رخ کیا۔ اکرام نے بھی نادر حسین کے انداز کو محسوس کیا تھا۔ آرام گاہ میں آ کر میں نے پر خیال لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کہیں مسعود بھیا تو میں شامی کو ہوشیار کر آؤں ...."

"کس سلسلے میں؟"

"یہی کہ ہم وہاں سے اٹھ گئے ہیں اب وہ نادر حسین کا خیال رکھے۔ میرے خیال میں وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کے بات کرنے کا انداز بتاتا ہے۔ وہ آپ سے اس لہجے میں تو بات نہیں کرتا تھا۔" میں نے

اَرام کی بات کا جواب نہیں دیا۔ چنانچہ اکرام بھی خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں آرام کرنے لیٹ گئے تھے مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ شیخ مغیث اور اس کی بیوی کا خیال بار بار آ رہا تھا۔ دونوں بدبختوں سے مجھے شدید کراہت محسوس ہوئی تھی۔ یہ نہ معصومیت تھی نہ لاپروائی۔ اتنا بڑا کام انہوں نے نہایت آسانی سے کر ڈالا تھا۔ کچھ تو سوچنا چاہئے تھا۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ شیخ مغیث پہلے ہی ایک بدانسان تھا۔ اس کے خون میں وفا نہیں تھی۔ وہ شقی القلب تھا ورنہ اپنے محسنوں کے احسان کو کبھی نہ بھولتا جنہوں نے اس کا مستقبل بنایا انہیں اس نے تسلیم نہ کیا۔ باقی بات رہی اس کی بیوی کی تو یقیناً وہ بدکردار عورت تھی اور اس سے وفا ممکن نہیں تھی۔ جو کچھ میں نے شدید کراہت کے عالم میں کہا تھا اس پر مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔

رات کافی گزر گئی۔ اکرام بھی کروٹیں بدل رہا تھا میں نے اسے پکار لیا۔ "نیند نہیں آ رہی؟"

"ہاں بھیا، باہر چلیں؟"

"میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ باہر کھلی فضا ہو گی۔"

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ عبادت سے بہتر اور کیا مشغلہ ہو سکتا تھا۔ وضو کیا اور آگے بڑھ گئے۔ تبھی نادر حسین نظر آیا۔ جہاں چھوڑ گئے تھے وہیں گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کرنے کو دل نہ چاہا۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے اس کی طرف سے ذہن ہٹا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میں نے درود شریف کا ورد کیا۔ ابھی پہلی بار ... درود شریف ... نادر حسین کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ مار کر کھڑا ہو گیا میں اور اکرام چونک کر اسے دیکھنے لگے........!

"احمق ہو تم .... دیوانے ہو گئے ہو۔ بالکل پاگل ہو گئے ہو۔" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا نادر حسین؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"پاک کلمات کسی کی پشت پر نہیں پڑھے جاتے۔ آئندہ خیال رکھنا۔" اس نے کہا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس نے کہا۔ "بلاوا آ گیا ہے میرا۔ جب تک تمہارا بلاوا نہ آئے یہاں سے نہ جانا ایک حاجت مند کی حاجت روائی ضروری ہے۔ حق.........!" اس نے زور سے نعرہ لگایا اور اچانک اس کے لباس میں آگ لگ گئی۔ مجھے اور اکرام کو نہیں معلوم تھا کہ شامی کچھ لوگوں کے ساتھ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ابھی ہم دونوں ششدر کھڑے غور کر رہے تھے کیا کریں کہ عقب سے شامی کے چیخنے کی آواز ابھری اور وہ دو تین افراد کے ساتھ دوڑ پڑا۔

"آگ ..... آگ ..... پانی ..... پانی ....." وہ ناچتا ہوا بولا مگر اتنی دیر میں نادر حسین کا لباس خاکستر ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرا نعرہ لگایا اور اس کے ساتھ خانقاہ کی بلندیوں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ شامی کے حلق سے دلخراش آواز نکلی۔

"بڑے بابا....." وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا کنارے تک آ گیا میں اور اکرام نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ لیکن ہم سکڑ کر رہ گئے تھے۔ حالانکہ جتنی بلندی سے وہ نیچے کودا تھا اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے چاہئے تھے۔ لیکن نیچے وہ تاروں کی چھاؤں میں بے تکان دوڑتا نظر آ رہا تھا۔ لباس سے عاری ہر تکلیف سے بے

نیاز۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے بدن میں شدید سنسنی دوڑ رہی تھی۔

"اس پر پھر دورہ پڑ گیا مسعود بھائی۔ آہ......... اب کیا ہوگا؟ وہ پھر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔" شامی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں شامی......... وہ ٹھیک ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے؟" شامی سسکی سی لے کر بولا۔

"ہاں۔ ہم سب سے زیادہ ہوشمند۔"

"نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟" شامی جھلا کر بولا اور میں شامی کو تسلیاں دینے لگا۔

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی درست ہے شامی۔ اب وہ اس جھوٹی خانقاہ کا بزرگ نہیں ہے۔"

"اب کیا ہوگا مسعود بھائی؟ ہمیں پھر اس کے پیچھے نکلنا ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جائے وہ۔ ہمیں بتاؤ اب کیا کریں؟"

"جو کچھ کرو گے بیکار ہوگا۔ ویسے تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ آؤ اکرام۔" میں نے کہا اور اکرام کو ساتھ لے کر اپنی آرام گاہ میں آ گیا۔ خانقاہ میں جتنے لوگ تھے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔

"سچ سچ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوں مسعود بھائی۔ برداشت نہیں ہو رہا ورنہ آپ سے نہیں کہتا۔" اکرام بے بسی سے بولا۔

"کیا بات ہے اکرام؟"

"نادر حسین کو کیا ہو گیا؟"

"وہ جو مصرع ہے نا کہ خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال۔ وہ صادق آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"عہدہ مل گیا ہے اسے۔ مجذوب ہو گیا ہے ویسے بھی اکرام، تمہیں یاد ہوگا وہ ڈاکو تھا۔ جعلی خانقاہ میں وہ لوگوں کو جھوٹے دلاسے دیتا تھا لیکن خود کو پیر کہلوانے سے لرزتا تھا۔ وہ خود کو دنیا کا بدترین انسان سمجھتا تھا۔ اسے اپنے گناہوں کا شدید احساس تھا۔ اللہ کو اس کی کوئی ادا بھا گئی اسے بہت بڑا مقام مل گیا۔"

"سبحان اللہ۔ تو یہ بات ہے۔"

"ایک آدھ بار شبہ ہوا تھا۔ یقین نہیں کر سکا تھا۔"

"پھر یہ اندازہ کیسے ہوا.........؟"

"اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے درود شریف پڑھ لیا تھا وہ تڑپ گیا کلام الٰہی کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکا۔ اب واقعی وہ اس خانقاہ کا انسان نہیں ہے۔"

اکرام خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں ہی تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نادر حسین کی خوش بختی پر رشک کر رہا تھا۔ بہرحال یہ رمز تھے جو انسانی عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ کچھ دیر کے بعد اکرام نے کہا۔

"یہاں رکو گے مسعود بھائی؟"

"تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔ ویسے بھی ہم یہاں رک گئے ہیں کوئی کام نہیں ہو رہا۔" اکرام نے اس طرح کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ معصوم نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"ہم کام ہی کیا کرتے ہیں اکرام۔ بس یہاں، وہاں۔ ویسے ابھی کچھ دن یہاں گزاریں گے۔ ابھی یہاں سے جانے کا وقت نہیں آیا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

رات گزر گئی۔ نہ جانے کب تک نادر حسین کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور ان حالات پر غور کرتا رہا تھا۔ نادر حسین بے شک خوش نصیب تھا کہ اس نے اتنا بڑا مقام پا لیا تھا۔ دوسرا دن منگل کا تھا آج عرضیاں لکھی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا۔ عرضیاں لکھی جاتیں۔ حاجت مندوں کی درد بھری آوازیں ہمیں مائیکروفون پر سنائی دیتیں اور ہم انہیں لکھ لیا کرتے۔ پھر جو کچھ میرے دماغ میں آتا اس کے مطابق مشورے دے دیا کرتا۔ مشورے جمعرات کو دیئے جاتے تھے۔

معمول کے مطابق ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ اکرام بھی کاغذ قلم لئے بیٹھا تھا۔ دردمند اپنی اپنی کہانیاں سناتے رہے۔ بعض کہانیاں آنکھیں بھگو دیا کرتی تھیں۔ دعائیں اور دوائیں چل رہی تھی۔ اچانک مجھے ایک آواز سنائی دی۔

"دکھیاری ہوں سائیں بابا۔ میری کہانی سنو گے۔ سن لو سائیں بابا۔ سن لو تو اچھا ہے۔ نہ سنو گے تو سمجھوں گی کہ تم بھی سب کی طرح ہو سب کچھ کھو گیا ہے میرا سائیں بابا۔ کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ شمسہ ہے میرا نام۔ دو کڑیل بھائی تھے۔ ماں تھی باپ تھے میرے۔ ایک ماموں تھے۔ بھرا گھر اجڑ گیا سائیں جی۔ بھائی بچھڑے۔ ماں باپ جوان بیٹوں کے دکھ میں پاگل ہو گئے۔ در در پھرے ہم۔ پھر سائیں نحوست ہماری طرف بڑھی رشتہ آیا میرے ماں باپ اس حالت میں نہیں تھے کہ شادی کریں۔ منع کر دیا انہوں نے۔ وہ لوگ چڑ گئے۔ مجھے چھین لیا انہوں نے میرے ماں باپ سے۔ جبری نکاح پڑھا یا میرا میاں مجھے ٹھوکر مارا مارا پھرتا رہا۔ دل برا تھا اس کا میری طرف سے۔ کبھی عزت نہیں دی اس نے مجھے۔ چار چوٹ کی مار مارتا ہے ذرا سی غلطی پر۔ تین بچے ہو گئے ہیں میرے۔ کوئی سہارا نہیں ہے ان کا جی۔ وہ بری عورتوں کے پھیر میں رہتا ہے سائیں۔ ماں باپ کا پتہ نہیں ہے میرے۔ بھائی نہیں ملتے سائیں جی۔ میری مشکل دور کر دو سائیں۔ میری منزل مجھے دے دو۔ مر بھی نہیں سکتی سائیں بابا۔ تین جانیں اکیلی رہ جائیں گی جی۔ کیا کروں ان کا۔ مشکل حل کرو سائیں جی.........!"

دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ خون کی روانی رک گئی۔ سانس تھم گیا۔ یہ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ عرصہ ہو گیا تھا صدیاں بیت گئی تھی لیکن یہ آواز کیسے بھول سکتا تھا۔ ہر لفظ زخم تھا۔ آہ، شمسہ میری بہن۔ میری بہن مجھ سے کچھ گز دور تھی۔ وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ مجھے میری کہانی سنا رہی تھی۔ پھر شامی کی آواز ابھری۔

"چلو بہن .... دوسرے کو آنا ہے۔"

"جاتی ہوں بھیا۔ جاتی ہوں۔ سائیں۔ سائیں...... میرے سائیں۔ سن لو، مجھ پر غور کر لو۔ کوئی سہارا نہیں ہے۔"

"چلو بہن، اٹھو جلدی کرو۔"

"اٹھتی ہوں بھیا۔ جاتی ہوں سائیں بڑی آس لے کر آئی ہوں سائیں...... جاتی ہوں بھائی۔ ابھی جاتی ہوں۔ جمعرات کو آؤں گی سائیں بابا............ جمعرات کو............ ہاں ہاں جاتی ہوں............"

درد و کرب میں ڈوبی چیخ کو نہیں روک سکا تھا اور اس آواز پر اکرام بری طرح اچھل پڑا تھا۔ ہچکیاں بندھ گئی تھیں میری۔ اکرام سب کچھ چھوڑ کر مجھ سے آلپٹا تھا۔

"مسعود بھائی........ مسعود بھائی۔ کیا ہو گیا، مسعود بھائی۔ کیا بات ہے؟ ارے یہ کیا حالت ہو گئی۔ مسعود بھائی...... مسعود بھائی۔" اکرام بے چین ہو کر مجھے جھنجھوڑنے لگا لیکن کچھ ایسا بے اختیار ہوا تھا کہ خود پر قابو ہی نہیں رہا تھا۔ اکرام نے پانی پلایا۔ اس کے بعد کوئی عرضی نہ لکھی جا سکی تھی۔ زمین پر لیٹ گیا۔ دل قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اکرام اوپر جا کر شامی اور دوسرے لوگوں کو بلا لایا۔ بے وقوف کوئی بھی نہیں تھا۔ اب سب ہی میری حیثیت سے آشنا ہو چکے تھے۔ جانتے تھے کہ جب سے میں خانقاہ میں داخل ہوا ہوں کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ نقلی خانقاہ اصلی ہو گئی ہے جو آتا ہے یہی کہتا ہوا آتا ہے کہ اس کا کام بن گیا۔ یہاں تک کہ ان کا بڑا بابا بھی میرا معتقد نظر آیا تھا سب کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اب خانقاہ میرے ہی دم سے چل رہی ہے اور ان لوگوں کی دال روٹی کا بندوبست ہے چنانچہ سب ہی مجھ سے مانوس ہو گئے تھے، خصوصاً شامی۔ میری یہ حالت دیکھ کر وہ سب سخت پریشان ہو گئے اور طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کوئی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مشورہ دینے لگا تو کوئی دوائیں تجویز کرنے لگا۔ سب ایک ہی سوال کر رہے تھے کہ کیا ہو گیا، اچانک یہ کیا ہو گیا...... اور اکرام گھبرا گھبرا کر انہیں بتا رہا تھا کہ بس بیٹھے بیٹھے ہی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جو سمجھ میں آسکے سب کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، مجھے اپنی اس کیفیت پر شرمندگی بھی تھی لیکن کچھ ایسا بے بس ہوا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ شمسہ کی درد بھری باتیں کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر رہی تھیں کیسی بے بسی تھی اس کی آواز میں...... میری بہن...... آہ میری بہن...... اس کے تصور سے آنکھوں سے آنسو ابلتے چلے آرہے تھے روکنا چاہتا تھا ان آنسوؤں کو لیکن کچھ ایسے بے اختیار ہوئے تھے کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا پانی پلایا گیا، سہارے دیئے گئے، نجانے کیسے کیسے جتن کر کے اپنی حالت پہ تھوڑا سا قابو پایا۔ بھرآئی ہوئی آواز میں ان لوگوں سے کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے بس اندر سے شدید گرمی کی ایک لہر اٹھی ہے اور کچھ نہیں ہے، ٹھیک ہوں ہمدرد اور محبت کرنے والے یہ سن کر سہارا دیئے ہوئے زبردستی باہر لائے۔ خانقاہ کے عقبی حصے میں ایک صاف ستھری جگہ مجھے لٹا دیا گیا۔ ہر شخص ہی کسی نہ کسی چیز سے مجھے پنکھا جھل رہا تھا۔ ابھی خانقاہ کے دوسرے حصے میں زائرین موجود تھے۔ چنانچہ یہ عقبی حصہ منتخب کیا گیا تھا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوششیں شروع کر دیں، ہر خیال کو ذہن سے مٹا دیا۔ زخم تو دل پر بیٹھے

موجود تھے، بس ان پر ایک ہلکی سی تہہ چڑھالی تھی لیکن کھرنڈ نہیں بن پائے تھے زخم درست نہیں ہوئے تھے ایک آواز سے ایک زخم کی جھلی اتر گئی تھی خون تو بہنا ہی تھا برسوں سے رکا ہوا تھا۔ بہتا رہا لیکن کب تک۔ جب خون ہی ختم ہو جائے جسم میں تو کیا بہے گا؟ آنسوؤں کی روانی رک گئی۔ سہارا دیا خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ان لوگوں کو سمجھانا بھی ضروری تھا جو بے چین تھے، افسردہ تھے، مضطرب تھے میرے لئے۔ مدھم سے لہجے میں........... میں نے ان سے کہا...........

"بہت معذرت خواہ ہوں آپ سب سے، خواہ مخواہ ایک ذرا سی گرمی سے کیفیت بگڑ گئی تو آپ لوگوں کو پریشان ہونا پڑا۔ بس دل پر ایک بوجھ سا آ پڑا تھا نجانے کیوں آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اب ٹھیک ہوں۔"

"آپ ہمارے لئے بہت بڑی چیز ہیں مسعود بھائی۔ خدا کے لئے خود کو سنبھالئے۔ ہم بے خانماں لوگ جو پہلے بہت برے تھے اور اب ہم میں سے ہر ایک یہ بات کہہ سکتا ہے کہ آپ کے آنے کے بعد ہماری کایا پلٹ ہو گئی۔ احمق نہیں ہیں ہم لوگ، غور کرتے ہیں۔ ہم برے راستوں کے راہی تھے۔ یہ خانقاہ دھوکے کا گھر تھی۔ آپ کے آنے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ یہاں تک کہ ہم بھی بدل گئے۔ مسعود بھائی خود کو سنبھالئے خدا کے لئے۔ آپ ہماری زندگی کا سہارا ہیں۔ آپ کو اگر کوئی نقصان پہنچ گیا تو بے موت مارے جائیں گے ہم سب۔" میں نے انہیں تسلیاں دی تھیں کہا تھا کہ انسان ہوں اور انسان کی کیفیت کبھی نہ کبھی خراب ہو ہی جاتی ہے۔ بہرطور اس طرح ان لوگوں کی عیادت میں رات ہو گئی تھی، زائرین جا چکے تھے ادر خانقاہ پر پھر وہی ہو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ باہر ہی رہا اور ٹھنڈی ہواؤں نے کیفیت کافی بہتر کر دی، ویسے بھی تمام لوگوں کا ساتھ تھا، سوچ کے دروازے عارضی طور پر بند ہو گئے تھے، چنانچہ سنبھل گیا قوت ارادی سے بھی کام لیا تھا۔ پھر واپسی کا فیصلہ کیا اور کچھ دیر کے بعد اکرام کے ساتھ تنہارہ گیا۔ اکرام کے چہرے پر ایک عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے بعد مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے میرے لئے پریشان تھا مگر میں کیا کرتا؟ ایسا ہی موڑ آگیا تھا کہ میری اپنی قوت بلکہ جواب دے گئی تھی، کتنے عرصے کے بعد شمسہ کی آواز سنائی دی تھی۔ محبت کرتا تھا میں اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا وہ ابتدائی دور یاد تھا جب ہم سب ساتھ رہتے تھے شمسہ کی شرارتیں، ماموں ریاض کا گھر ڈانٹنا، ہر چیز مجھے یاد آگئی تھی...... لیکن...... لیکن یہ کیسی قید تھی، یہ کیسی پابندیاں تھیں کہ میں اپنی بہن تک نہیں جا سکتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ صبر کروں۔ کیا انسانی قوت برداشت اس حد تک ہو سکتی ہے؟ ذہن بھٹکنے لگا، تو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سونا چاہتا تھا اور اس میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی یہ سہارا مجھے دے دیا گیا تھا اور نیند کے اس سہارے نے رات گزار دی ایسا بے خبر سویا کہ فجر کے وقت ہی آنکھ کھلی تھی۔ وضو کیا، نماز پڑھی۔ اکرام میرے ساتھ تھا اور اس طرح سنجیدہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ دل کو کچھ سکون سا ملی تھی۔ لیکن نماز کے بعد اکرام نے پھر پیمانۂ ضبط توڑ دیا اس نے عرضی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا...........

"مسعود بھائی وہ شمسہ تھی نا آپ کی بہن؟" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی...........

میں نے چونک کر اکرام کو دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، کہنے لگا...... "بتایئے نا مسعود بھائی وہ شمسہ ہی تھی نا ....؟"

"ہاں .... " میں نے اس سے جھوٹ نہیں بولا۔

"میں سمجھ نہیں پایا تھا اس وقت لیکن رات کو میں نے بہت غور کیا اور اس کے بعد یہ عرضی پڑھی۔ جو صرف میں نے لکھی تھی آپ نے نہیں لکھی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب اسی کا ردعمل ہے جو کچھ آپ مجھے سنا چکے ہیں مسعود بھائی اس سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ ہماری بہن شمسہ تھی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہاں اکرام وہی تھی اور میری یہ کیفیت اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔"

اکرام نے عرضی نکال لی اور کہنے لگا۔ "دوبارہ پڑھیئے اسے مسعود بھائی دوبارہ پڑھیئے......"

"نہیں اکرام خدا کے لئے میں اسے دوبارہ نہیں پڑھ سکوں گا میں تو اسے لکھ بھی نہیں سکا تھا۔"

"حقیقتوں سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے، مسعود بھائی آپ دنیا کے مسائل حل کرتے رہتے ہیں اس وقت اگر آپ اسے اپنی بہن نہ بھی تصور کریں، تب بھی آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی مشکل کا حل تلاش کریں۔ آپ نے سن لیا ہے وہ سب کے دکھوں میں ڈوبی ہوئی ہے اور...... اور اس کے بعد بھی اس کی زندگی کو کوئی بہتر راستہ نہیں ملا۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا شوہر اسے لے کر مارا مارا پھرتا رہا وہ اس کی عزت نہیں کرتا، مارتا ہے اسے، تین بچے ہیں اس کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ کیا ہم اسے نظرانداز کر دیں گے مسعود بھائی ....؟"

"خدا کے لئے اکرام .... خدا کے لئے اکرام ...."

"نہیں مسعود بھائی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات پر سر جھکایا ہے یہاں میں وفاداریوں کا حق نہیں ادا کر رہا بلکہ پہلی بار میرے دل نے آپ سے بغاوت کی ہے میرا دل کہتا ہے کہ شمسہ پوری توجہ کی مستحق ہے ہمیں اس پر خاص توجہ دینا ہوگی ...."

میں نے بے بسی سے اکرام کو دیکھا، کیا بتاتا اسے کیسے کہتا کہ مجھے اجازت نہیں ہے۔ اکرام نے کہا۔

"وہ جمعرات کو آئے گی مسعود بھائی۔ وہ جمعرات کو آئے گی آپ کو اس سے ملنا ہوگا.........."

"نہیں اکرام کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

"میں ٹھیک کہتا ہوں مسعود بھائی، ہم اسے بھرپور سہارا دیں گے.........."

"اکرام ہماری دنیا ہی بدل جائے گی۔"

"تو بدل جائے .... کیا کر سکتے ہیں ہم، بے بس ہیں کمزور ہیں۔"

"بکومت یہ نہیں ہو سکتا۔ عمر بھر کی محنت اکارت جائے گی۔ اکرام یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے۔" اکرام خاموش ہو گیا اس نے گردن جھکا لی تھی۔ ویسے بھی بہت زیادہ نہیں بولتا تھا مجھ سے۔ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ دن بھر خاموش خاموش رہا۔ معمولات جاری رہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ تعاون کرنے والوں میں سے ہے۔ نجانے کتنی بار ہوک اٹھی۔ لیکن پھر

دل کو سوس کر خاموش ہو گیا۔ البتہ دوسرے دن میں نے اکرام سے کہا۔

"وہ شام کو آئے گی اکرام۔ تم اسے تھوڑی سی رقم دے دینا۔ یہ کچھ پیسے ہیں میرے پاس۔ یہ اس کے حوالے کر دینا اور اسے تسلیاں دینا۔ یہ کام تم کر لینا۔ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔"

"آپ نہیں ملیں گے اس سے مسعود بھائی ....؟"

"نہیں...... سب کچھ ختم ہو جائے گا اکرام میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد کیا ہو جائے۔ خدا کے لئے یہ سب کچھ نہ کرنا، مجھے اس کے لئے مجبور مت کرنا۔" اکرام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گیا۔ شام ہوئی عرضیاں تیار ہو چکی تھیں، یعنی جن جن لوگوں نے اپنی مشکلات کا اظہار کیا تھا انہیں ان کا حل بتا دیا گیا تھا۔ اکرام کو میں نے ہدایات دے دیں تھیں لیکن دل تھا کہ قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اکرام شمسہ سے ملے گا، جو کچھ بھی کہے گا۔ اس سے وہ الگ بات ہے، لیکن میں، میں اپنی بہن کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ آہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود ہے، کتنے برسوں سے بچھڑی ہوئی ہے، کتنے دکھ سے اس نے کہا تھا کہ پورا خاندان منتشر ہو گیا ہے۔ بھائی بچھڑ گئے ہی، کچھ بھی نہیں رہا ہے اس کے پاس۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کچھ فاصلے پر موجود ہے، لیکن میں...... میں روتا رہا۔ اندر ہی اندر روتا رہا اور وقت گزر گیا اکرام واپس میرے پاس نہیں آیا تھا، انتظار کر رہا تھا میں اس کا، آئے، مجھے بتائے کہ شمسہ سے کیا بات ہوئی، کیا کیا اس نے، کیا کہا اس نے......؟ لیکن اکرام کو ضرورت سے زیادہ دیر ہو گئی وقت اتنا ہو گیا تھا کہ تمام زائرین واپس جا چکے تھے۔ اب ذرا بے چین ہو گیا۔ اکرام واپس کیوں نہیں آیا؟ پھر میں خود بھی باہر نکل آیا شامی اور دوسرے لوگ اپنے معمولات میں مصروف تھے میں نے اکرام کے بارے میں کسی سے پوچھا نہیں، بے کار ہی تھا لگ رہا تھا کہ یہاں موجود ہی نہیں ہے، کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، یہ اکرام کو کیا ہو گیا کہاں چلا گیا وہ۔ ذہن طرح طرح کے خیالات میں ڈوبا رہا۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر اکرام کا انتظار کرنے لگا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جذباتی ہو گیا ہے، کہیں وہ شمسہ کے پیچھے ہی نہ نکل گیا ہو۔ ہو سکتا ہے، بہر حال انسان ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسا کیا ہے تو حد سے تجاوز کرنے والی بات ہے۔ میں نے اس کو اس کی اجازت نہیں دی تھی پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھا بھی لیا۔ اکرام بس میرا ساتھی ہے محکوم تو نہیں ہے وہ میرا۔ اگر اس نے اپنے طور پر کوئی عمل کیا ہے تو ایسی بری بات بھی نہیں ہے کہ میں اس پر بگڑنے لگوں اپنی مرضی کا مالک ہے وہ، کسی بھی لمحے میرے پاس سے جا سکتا ہے، ویسے یہ تصور ذرا عجیب سا لگا تھا۔ اب تو اکرام کی کچھ اس طرح عادت ہو گئی تھی کہ اسے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ سمجھنے لگا تھا۔ پگلا کہیں کا وہ کام کر رہا ہے جو میں نہیں کر سکتا لیکن اچھا تو ہے، کم از کم شمسہ کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ خدا کرے وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی گیا ہو کچھ معلومات حاصل کر کے آئے گا ہو سکتا ہے ماں باپ کا کچھ پتہ چل جائے۔ انہی خیالات میں بیٹھا رہا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ اکرام واپس آ گیا تھا اس نے فوراً ہی مجھے تلاش کر لیا تھا۔ میرے قریب شرمندہ شرمندہ سا پہنچا کہنے لگا۔

"مجھے یقین تھا مسعود بھیا کہ آپ یہیں موجود ہوں گے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج پہلی بار میں نے خانقاہ سے باہر جا کر اس شہر کو دیکھا ہے۔ یہ تو خاصا بڑا شہر ہے...... بڑی گھنی آبادی ہے اس کی۔

بھیا میں شمسہ کے پیچھے گیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی سی رقم دے دی تھی جو آپ نے مجھے دی تھی اور میں نے اسے تسلیاں بھی دی تھیں کہ اللہ نے چاہا تو اس کی مشکلات آسان بھی ہو جائیں گی، بھیا پھر میں اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکا اسکے پیچھے پیچھے وہاں تک پہنچا جہاں وہ رہتی ہے ایک چھوٹا سا گھر ہے جو حسین خان نامی ایک شخص کا ہے، حسین خان شمسہ کے شوہر کا دوست ہے۔ شمسہ کے شوہر کا نام فیضان ہے۔ فیضان عالم۔ بہت اوباش طبع آدمی ہے صورت ہی سے برا لگتا ہے اور اسکا دوست بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، کہیں باہر سے آکر یہاں قیام کیا ہے اور دونوں ملکر کچھ کر رہے ہیں، شمسہ اکیلی اس گھر میں رہتی ہے کیونکہ اس کے دوست کی بیوی نہیں ہے۔ تین بچے ہیں شمسہ کے۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ اور مسعود بھیا شمسہ کا ایک بیٹا جو پانچ سال کا ہے بالکل آپ کا ہم شکل ہے۔ بالکل آپ جیسا۔ " میں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ دل بے قابو ہونے لگا تھا۔

"بھیا وہ بڑی غیر محفوظ ہے۔ اس کا شوہر درحقیقت ایک درندہ صفت آدمی ہے لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ شمسہ کو اپنی بیوی سمجھتا ہے اس کا دوست شمسہ کو گندے فقرے کستا ہے لیکن وہ خاموشی سے بیٹھا ہنستا رہتا ہے، شمسہ اس گھر کے سارے کام کاج کرتی ہے اپنے بچوں کو سنبھالتی ہے۔ بہت دکھی ہے وہ بھیا بہت دکھی ہے۔ "

"تو میں کیا کروں ؟ " میرے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

"نہیں مسعود بھائی یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ آپ کیا کریں۔ بھائی ہیں آپ اس کے، ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے، میں تو کر سکتا ہوں۔ "

"کیا کرو گے، مجھے بتاؤ کیا کرو گے؟ "

"مجھے اس بات کا جواب چاہئے مسعود بھائی کہ اگر آپ کی بہن آپ کے سامنے آگئی ہے، آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ آپ جانتے ہیں لیکن اس بہن سے جو آپ کی سگی بہن ہے اور مصیبتوں میں گرفتار ہے اس سے یہ اجتناب کیسا؟ "

"مجھے اجازت نہیں ہے کیا سمجھے اکرام مجھے اجازت نہیں ہے۔ "

"میں نہیں سمجھتا بھیا انسانی رشتے اگر اتنی آسانی ہی سے چھین لئے جاتے تو ان رشتوں کا وجود نہیں ہونا چاہئے تھا۔ "

"مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے" میں نے غرا کر کہا۔

"سزا آپ کو مل رہی ہے شمسہ کو تو نہیں ملنی چاہئے؟ "

"اکرام کیا کہنا چاہتے ہو، اکرام کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔ "

"شمسہ سے مل لیجئے۔ اسے تحفظ دیجئے اور کوئی نہیں ہے اس کا آپ ہیں، میں ہوں، میں اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ "

"تو جاؤ اس کی خبر گیری کرو، اس کے ساتھ رہو۔ "

"انتہائی غمزدہ ہوں مسعود بھیا۔ انتہائی غمزدہ ہوں سوچا تھا زندگی کے کسی حصے میں آپ کا ساتھ نہیں

...وڑوں گا. چاہے دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ مروں گا بھی آپ کے قدموں میں لیکن معاف کیجئے گا ...سعود بھائی، آپ سے شدید اختلاف کر رہا ہوں یہاں اور اس اختلاف کی بنیاد پر آپ سے علیٰحدہ ہو رہا ...ں۔ "

میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اکرام کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اس نے ...

"آپ ہی کے حوالے سے میں اس سے روشناس ہوا ہوں لیکن ایک ایسی بے بس ایک ایسی تنہا لڑکی ...ں کا کوئی سرپرست نہیں جس کے سر پر کوئی سایہ نہیں ہے اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کا ماضی کیا ...ے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں اس خانقاہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر عیش و آرام کی زندگی ...زار رہا ہوں اور وہ اسی طرح زندگی کے جال میں الجھی ہوئی مصیبتیں اٹھاتی رہے۔ آپ ہی کے حوالے ...ے مسعود بھیا اس کا بھائی ہوں اور میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے کہ بہن کے سر پر ہاتھ رکھوں جس قابل ...ہوں میں اس کی خبر گیری کرونگا، دیکھوں گا فیضان اسے کیا نقصان پہنچاتا ہے، بس بھیا میرا اور آپ کا ...ساتھ یہیں تک تھا، ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہوں گا لیکن یہ بات بھی آپ یاد رکھئے گا کہ جب آپ کی یاد ...یرے دل میں آئے گی تو میں سوچوں گا کہ آپ نے اپنی ذات کی بہتری کیلئے رشتوں کو ذبح کر دیا ہے میں ...متفق نہیں ہوں آپ سے بھیا۔ "

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اکرام کو دیکھ رہا تھا میرے اندر گڑگڑاہٹیں ہو رہی تھیں اور میں کوئی فیصلہ ...نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں؟ دل چاہ رہا تھا کہ اکرام کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دوں، کیوں میری زندگی کو ایک بار ...تاریکیوں کی جانب دھکیل رہا ہے، کیوں ایسا کر رہا ہے وہ .... لیکن جو جذبے اس کے سینے میں ...موجزن ہو گئے تھے ان سے منحرف تو میں بھی نہیں ہو سکتا تھا، اکرام سنجیدہ چہرہ بنائے کھڑا تھا کہنے لگا۔

"میری خواہش ہے، مسعود بھیا میری خواہش ہے کہ آپ شمسہ سے مل لیں، فیضان عالم کا قبلہ ...درست کریں کہ وہ ایک باعزت زندگی گزارے۔ میں اس کے بعد اور کچھ نہیں چاہوں گا۔ لیکن اگر ہم ...اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو یہ بہت بڑا گناہ ہو گا آپ اس سے مل لیں، آپ اس سے ...ضرور مل لیں۔ "

"اگر میں اس سے مل لیا تو .... تو .... "

"ہاں تو آگے کہئے۔ "

"تو گنہگاروں میں شمار کیا جاؤں گا نافرمان تصور کیا جاؤں گا۔ "

"اور اس نافرمانی کی سزا ملے گی آپ کو یہی نا! "

"اکرام اکرام۔ حد سے بڑھ رہے ہو۔ "

"بڑھ رہا ہوں بھیا۔ جب رشتے اتنے ہی بے معنی ہوتے ہیں تو پھر میرا اور آپ کا کیا رشتہ، اپنی سزا ...سے ڈر رہے ہیں آپ، اور وہ سزا جو چار افراد کو مل رہی ہے اور اس سے آگے بہت سے دوسروں کو مل ...سکتی ہے اس پر کیا کہیں گے آپ، جانتے ہیں آپ کا چھوٹا بھائی محمود سمندر پار ہے۔ وہ سب یعنی ماں

باپ ماموں ریاض زندگی کے عذاب میں گرفتار ہیں اور آپ۔ آپ صرف اپنی ذات کیلئے جی رہے ہیں، ان سب کو بھول کر۔

سارے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ دماغ میں شدید سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، دانت بھینچ لئے، اور اپنے آپ کو ان آوازوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا، عجیب لمحہ آیا تھا ایک طرف شدید خوف دامن گیر تھا جب بھی کبھی انحراف کی منزل میں داخل ہوا ایسے ایسے عذابوں سے گزرا کہ زندگی لرز گئی اور اس کے بعد جو کچھ بیتی۔ وہ ایک الگ داستان تھی، میں منحرف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ محبتیں دل پر عجیب سا اثر کر رہی تھیں جو فطرت کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اکرام کے الفاظ نے دیوانگی طاری کر دی تھی۔ کیا کروں کیا نہ کروں کیا کرنا چاہئے مجھے؟ آہ کیا کروں؟ میں آنکھیں بھینچے ہوئے بیٹھا رہا۔ اکرام میرے سامنے ساکت تھا، گڑگڑاہٹیں آہستہ آہستہ رک گئیں اور مطلع صاف ہو گیا، میں مغلوب ہو گیا تھا بالکل مغلوب ہو گیا تھا۔ واقعی بڑا عجیب و غریب تاثر تھا میرے ذہن پر، شمسہ کی کربناک آوازیں ابھر رہی تھیں۔

”رحم کرو سائیں رحم کر دو سائیں، چار چوٹ کی مار مارتا ہے وہ مجھے، تین بچے ہیں میرے کوئی سہارا نہیں ہے رحم کر دو سائیں رحم کر دو۔“

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کہاں رہتی ہے شمسہ؟“ میں نے سوال کیا اور اکرام خوشی سے اچھل پڑا۔

”میں اس کے گھر کا پورا پتہ یاد کر کے آیا ہوں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں...... لے جا سکتا ہوں۔“

”چلو اکرام۔ چلنا ہے مجھے، جانا ہے مجھے، میں شمسہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ تین بچے ہیں نا اس کے، چلو اکرام چلو، ٹھیک ہے یہ بھی تقدیر ہی کا ایک حصہ ہے آزمالوں اپنی تقدیر کو بھی۔ آہ چلو اکرام جلدی چلو کہیں میرے پیروں میں لغزش نہ آجائے۔“

”چلئے مسعود بھیا۔“ اکرام نے کہا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ماضی کی تیز و تند ہوائیں ذہن سے گزر رہی تھیں، شمسہ کا بچپن یاد آرہا تھا، کیا دردناک لہجہ تھا اس کا اس وقت جب وہ اپنی بپتا سنا رہی تھی اور ایک اس کا بچپن تھا شوخی اور شرارت سے بھرپور۔ میرے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ اکرام کو میرے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طویل فاصلہ تو ہمیں ایسے ہی طے کرنا پڑا کیونکہ آبادی ذرا دور تھی لیکن اس کے بعد اکرام نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

”رفتار سست کر لیجئے مسعود بھیا۔ اس طرح دوڑ دوڑ کر چلیں گے تو لوگ ہماری جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔“ میں نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پایا۔ اکرام پہلی بار اس آبادی میں آیا تھا لیکن شمسہ کے گھر کے پتے کو اس نے پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور اب وہ آہستہ آہستہ اسی جانب بڑھ رہا تھا۔

”تمہیں پتہ ٹھیک سے یاد ہے نا؟“

”ہاں ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھئے وہ چبوترہ اور اس پر پیپل کا درخت۔ یہاں شاید بند پوجا کرتے ہیں۔ وہ چونے کے نشانات۔“

”کتنی دور ہے یہاں سے۔“

”بس وہ چھوٹا میدان عبور کر کے ہم ان گھروں کے سلسلے تک پہنچ جائیں گے۔“

”جلدی کرو، تمہارے قدموں کی رفتار سست کیوں ہے۔“ میں نے کہا تو اکرام مسکرا دیا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں نے اس کی مسکراہٹ محسوس کر لی تھی۔ آنکھوں میں روشنی کی طرح پیاری تھی وہ مجھے مگر کیا کرتا، کیا کرتا۔ میں نے سوچا اکرام اب بھی خاموش تھا۔ وہ میرے دل کی کیفیت کیا سمجھتا کیا کیا وسوسے تھے میرے دل میں کیسے کیسے خوف پنہاں تھے۔ میں ہی جانتا تھا ملعون بھوریا چرن نے اس سے پہلے بھی تو مجھ پر ایسے کئی وار کئے تھے۔ مختلف شکلیں لایا تھا وہ میرے سامنے۔ کون جانے یہ بھی کوئی دھوکہ یا پھر۔

میدان عبور کر لیا مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر اکرام ایک مکان کے دروازے پر رک گیا۔

”یہ ہے۔“ اس نے کہا۔ آگے بھی وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن ایک دلدوز نسوانی چیخ نے اس کی آواز بند کر دی۔ چیخ کی آواز اندر سے ہی ابھری تھی۔

ہم دونوں ٹھٹک گئے، چیخ شمسہ کی تھی۔ میں نے مضطرب نگاہوں سے اکرام کو دیکھا۔ اس بار بھی کچھ نہیں بول پایا تھا کہ قدموں کی بھاری آواز سنائی دی۔ کوئی دروازے کے پاس آگیا تھا۔ پھر نسوانی آواز ابھری۔

”بے آبرو نہیں ہوں۔ سمجھا کیا ہے تو نے مجھے۔ دو بھائیوں کی بہن ہوں۔ دو کڑیل بھائیوں کی تیری اور تیرے بے غیرت دوست کی جاگیر نہیں ہوں۔ ہاں۔“

دوسری آواز سنائی دی۔ ”دروازے کو ہاتھ مت لگائیو۔ سوچ لے تیرے بچے اندر سو رہے ہیں تینوں کی گردنیں مار دوں گا۔“ یہ ایک بھاری مردانہ آواز تھی لیکن اس دوران دروازے کی زنجیر نیچے گر چکی تھی۔

”خدا کیلئے۔ تجھے خدا کا واسطہ۔ ہاتھ جوڑتی ہوں تیرے۔ مان لے میری بات۔“ لجاجت بھری، آنسوؤں میں ڈوبی آواز ابھری۔ یہ آواز میری شمسہ کی تھی۔

”نکل گئی ساری اکڑ۔ آجا۔ شاباش۔ اندر آجا، تیرے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ یہ زنجیر چڑھا دے۔ کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا۔ تیرے کڑیل بھائی کہیں مزے سے سو رہے ہوں گے۔ آچل زنجیر چڑھا کر اندر آجا۔“

میرا پورا بدن لرزنے لگا۔ اکرام کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی اس نے دروازے کو لات ماری اور دروازہ کھل گیا۔ شمسہ کھڑی ہوئی تھی اس سے دو گز کے فاصلے پر ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہی اچھل پڑے تھے۔

شمسہ کے حلق سے پھر چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر اکرام کے قریب آگئی۔ ”بچا لے مجھے میرے بھائی۔ تجھے اللہ کا واسطہ۔ بچا لے مجھے میرے بھیا۔ میرے بھائی میرے۔ بچے اندر ہیں یہ مار دے گا انہیں۔ یہ

.... انہیں۔"

پیچھے کھڑا شخص آگے بڑھ آیا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم دونوں اندر کیسے آئے۔ میں پوچھتا ہوں تم میرے گھر میں کیسے گھسے۔ ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو، ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں تمہیں۔"

اکرام نے شمسہ کو پیچھے ہٹایا اور پھرائے ہوئے انداز میں آگے بڑھا لیکن اس سے پہلے میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ میں نے ہاتھ سیدھا کر کے اکرام کے سامنے کر دیا اور وہ رک گیا میں اس بدکار شخص کو گھورتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اکرام نے کہا۔

"نہیں مسعود بھائی۔ تم شمسہ بہن کو سنبھالو، میں اسے دیکھتا ہوں۔" میں نے اکرام کو دوبارہ ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا میری خونی نظریں سامنے کھڑے شخص کو گھور رہی تھیں۔

"کون ہے تو۔ شوہر ہے اس کا؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھائی، میرے شوہر کا دوست ہے یہ۔ اسے نشہ کرا کے باندھ دیا ہے اس نے زخمی کر دیا ہے اسے۔ اور .... اور اب یہ بے عزت کرنا چاہتا ہے۔" پیچھے سے شمسہ کی آواز ابھری۔ حالانکہ اکرام نے مجھے مسعود کہہ کر پکارا تھا مگر شمسہ کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ میں ہو سکتا ہوں اس کا اپنا بھائی۔

صورتحال سمجھ میں آ گئی تھی میرا اٹھا ہاتھ اس شخص کے منہ پر پڑا اور وہ اچھل کر کوئی پانچ فٹ دور جا گرا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار پھوٹ پڑی تھی۔ میں آگے بڑھا اور میں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑا تھوڑا سا اٹھا کر میں نے ایک لات اس کے سینے پر رسید کی اور اس کے منہ سے ہائے نکل گئی۔ وہ کہنیوں کے بل پیچھے کھسکنے لگا۔ چیخنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ خود مجرم تھا۔ شاید نہیں چاہتا تھا کہ باہر آواز جائے۔ میں نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر رسید کر دی اور وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ کمر، سینے اور پنڈلیوں پر لاتعداد ٹھوکروں سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اکرام نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔

"مرجائے گا بدبخت۔ چھوڑ دو بھیا، بس چھوڑ دو۔ بس بھیا۔ بس کرو۔ مسعود بھائی رک جاؤ۔"

اکرام اس طرح سامنے آیا کہ اب اگر میں اس شخص کو مارتا تو اکرام نشانہ بن جاتا۔ چنانچہ رکنا پڑا۔

شمسہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔ "مظلوم ہوں۔ دکھیاری ہوں میرے بھائی، تھوڑی سی مدد اور کر دو میرا مرد اندر بندھا پڑا ہے۔ نشے میں تھا، اس نے دھوکا دیا اسے بھی مارو۔ اسے ذرا ہوش میں لے آؤ، اللہ تمہیں اجر دے گا۔ تم نے ایک بے آسرا کی مدد کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا صلہ دے گا۔ بس تھوڑی سی مدد اور کر دو!"

بے ہوش شخص کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چل پڑے۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ فرش پر ایک شخص بندھا پڑا تھا۔ یہی شمسہ کا شوہر تھا ہم نے اسے سیدھا کیا، سر کے بال خون سے چپچپا رہے تھے اس کا مطلب ہے سر زخمی ہے شمسہ کراہتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"جیسا بھی ہے میرے سر کا سائبان ہے، میرا چھپر ہے، بچوں کا باپ ہے، میرا تو کوئی پوچھنے والا نہیں

ہے اللہ تمہیں عزت دے۔ میرے بھائیو۔ سگے بھائی بن کر آئے ہو میرے۔ ہائے تم نے میری آبرو بچالی۔ اللہ تمہاری بہنوں کی آبرو بچائے۔ میرے بھی بھائی تھے، چھین لئے تقدیر نے، ہائے یہ ہوش میں آجائے تو اس سے پوچھوں کہ اب کیا کرے گا، نشے کا بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ سارے رشتے بھول جاتے ہیں یہ سسرے۔ بھابی بھابی کہہ کر دھوکہ دیا اس نے۔ فیضان ارے فیضان اب تو اٹھ جاؤ۔ اب تو جاگ جاؤ، فیضان۔"

"ایک کپڑا چاہئے بہن، ان کا سر زخمی ہے۔" اکرام نے کہا میرے بدن میں اب بھی لرزش تھی۔ شمسہ کی آواز کا کرب۔ اس کی باتیں دل چھید رہی تھیں لیکن صبر کرنا آتا ہے مجھے۔ صبر کرنا جانتا تھا خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ شمسہ نے اپنی اوڑھنی سے ہی ایک ٹکڑا پھاڑ دیا۔

"کتنا خون بہہ گیا ہے، زخم گہرا تو نہیں ہے، لوہے کا کڑا مارا تھا سر میں، زیادہ زخم آیا ہے کیا؟"

"نہیں فکر مت کرو، بچے کہاں ہیں؟"

"دوسرے کمرے میں ہیں، وہیں سو رہی تھی میں۔ ان دونوں کے لڑنے کی آواز سن کر ادھر آئی۔ دیکھا تو فیضان زخمی ہو گیا تھا۔ یہ اسے باندھ چکا تھا۔ اور پھر......... اور پھر .... خدا تمہیں خوش رکھے تمہاری بہنوں کی آبرو بچائے۔"

فیضان کو بستر پر لٹانے کے بعد میں نے اکرام سے کہا۔

"اسے بھی اندر گھسیٹ لاؤ، دیکھو مر تو نہیں گیا۔ فیضان ہوش میں آجائے تو اس سے پوچھیں گے کہ اب وہ کیا چاہتا ہے۔"

"آپ بھی آیئے بھیا، آیئے۔" اکرام نے کچھ اس طرح کہا کہ میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"کچھ بات بھی کرنی تھی آپ سے۔"

"کہو!" میری آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔

"شکر ہے نشے میں ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ چیخا چلایا نہیں۔ اس طرح باہر والے متوجہ نہیں ہوسکے۔ ہمیں سوچنے کا وقت مل گیا ہے۔ اس مردود کو باندھ کر ڈالے دیتے ہیں اور پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے ویسے آپ نے کمال ضبط کا ثبوت دیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔"

"میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اکرام۔ میرا وجود چکنا چور ہو گیا ہے۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا میں نہیں جانتا۔ لیکن مسعود بھائی، شمسہ بہن آپ کو بالکل نہیں پہچانیں۔"

"میرے گھر والے مجھے زندہ نہیں سمجھتے اکرام۔ شمسہ کو تو میری زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ ماموں ریاض نے مجھے بدنصیب شمسہ کی کہانی سنائی تھی اس وقت وہ اس ظالم شخص کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" اکرام بولا۔

"کیوں۔ یہ اندازہ کیسے ہوا۔"

"اس نے کئی بار اپنے بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔"

"اللہ جانے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"مگر وہ آپ کو بالکل نہیں پہچان سکی۔ اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آرہی ہے۔ وہ شاید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ میں نے آپ کو مسعود بھائی اور اسے شمسہ بہن کہہ کر پکارا ہے۔ مگر وہ اس بات پر بھی نہیں چونکی کہ میں نے اس کا نام کیسے لے لیا۔"

"ہاں۔ شاید تمہارا خیال درست ہے۔"

"عارضی طور پر میرے دل میں ایک خیال آیا تھا بھیا۔"

"بتاؤ اکرام۔ میرا دماغ تو ماؤف ہے، بتاؤ کیا کروں؟"

"شمسہ بہن اس دوران خود آپ کو پہچان لیں تو دوسری بات ہے، آپ خود انہیں کچھ نہ بتائیں۔ ہوسکتا ہے ان پر کچھ جذباتی اثرات مرتب ہوجائیں۔ اب ان حالات میں انہیں یہاں چھوڑنا تو مناسب نہیں ہوگا۔ ہم انہیں خانقاہ لئے چلتے ہیں وہاں اطمینان سے سوچیں گے کہ اب کیا کریں۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو اکرام۔"

"آپ کو اختلاف تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔ اب مجھے کسی بات سے اختلاف نہیں ہے۔" میں نے کہا اور اکرام مطمئن ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے سارے کام کئے تھے۔ اس منحوس شخص کو باندھ کر ڈال دیا گیا جس نے دوستی کا بھرم کھویا تھا۔ شمسہ کا شوہر بھی آہستہ آہستہ ہوش میں آرہا تھا۔ اس کا نشہ تو ویسے ہی اتر چکا تھا۔ ہوش میں آکر اس نے وحشت زدہ نظروں سے ماحول کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کہاں۔ کہاں گیا وہ؟"

"سب ٹھیک ہے فیضان۔ ہوش کرو، سب ٹھیک ہے۔ اللہ نے مدد بھیج دی فیضان۔ میرے بھائیوں نے مجھے بچالیا۔ ہائے فیضان تم نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ میں کہتی تھی کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے اس پر بھروسہ نہ کرو۔ مگر نہ مانے تم۔ ہائے فیضان مجھے اللہ نے بچالیا۔" شمسہ روتے ہوئے بولی۔

"بچے .... بچے۔" فیضان گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔

"اللہ کا کرم ہے سو رہے ہیں۔ ایک نظر دیکھ آؤں انہیں۔ بھیا ابھی آئی۔" شمسہ کمرے کے دروازے سے نکل گئی۔ فیضان نے لالٹین کی روشنی میں ماحول کو دیکھا پھر اس کی نظر اپنے دوست پر پڑی اور وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ چند قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچا اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"مارا ہے ہم نے۔" اکرام بولا۔

"مر گیا؟"

"نہیں زندہ ہے۔"

"کم اصل ہے، ایسے کہاں مرے گا۔" فیضان نے کہا اور اسے ایک ٹھوکر رسید کردی۔ پھر وہ ہری طرف مڑکر بولا۔ "تمہارا شکریہ ادا کرنا بیکار ہے۔ شکریہ کوئی عزت دار کسی عزت دار کے احسان کا رتا ہے۔ مجھ جیسے بے غیرت آدمی نے اگر تمہارا شکریہ ادا کر بھی دیا تو اس لفظ کی بھی توہین ہوگی۔ وہ مدار ہوجاتی تو اور مشکلات میں ڈوب جاتی میں ہی اسے نہ جینے دیتا۔ اتنا ہی ذلیل انسان ہوں یں۔"

اکرام نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں خاموش رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد فیضان نے کہا۔ "مگر تم دونوں رحمت کے فرشتے بن کر اس وقت یہاں کیسے آئے اور تمہیں کیسے معلوم ہوا ...."

"ہم ادھر سے گزر رہے تھے کہ ہمیں بہن کے چیخنے کی آواز سنائی دی وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگنا ہتی تھی۔ ہم نے اس شخص کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا کہ اگر باہر نکلی تو وہ بچوں کو گردن دبا کر مار دے گا۔ ں ہم اندر گھس آئے۔"

"کمینہ، کتا، میرے بچوں کو .... میرے بچوں کو!" فیضان بے قابو ہوکر پھر اپنے دوست کی طرف دوڑا لیکن اکرام نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔

"وہ بے ہوش ہے۔ جذباتی ہونا بیکار ہے اب یہ بتاؤ بھائی کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"یہ میرا بہت پرانا دوست تھا بڑا مان تھا مجھے اس پر۔" فیضان نے کہا۔

"اس کی اصلیت معلوم ہوگئی۔ افسوس کرنا بیکار ہے تم دونوں جن راستوں کے راہی تھی وہ اچھے تو نہیں تھے۔"

"ہاں۔ احساس ہوگیا۔ آخر احساس ہو ہی گیا۔ مگر ...." وہ خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں۔" اکرام نے جواب دیا۔

"کچھ اور رحم کرو گے ہم پر، تین معصوم بچوں اور ایک مظلوم عورت پر!" اس کی آواز میں عجیب سی پشیمانی تھی۔

"مظلوم عورت پر۔ تو کیا وہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟"

"ہے تو سہی۔ اللہ کے سامنے تو میں نے یہی اقرار کیا تھا کہ اس کا محافظ بنوں گا۔ مگر وعدہ پورا نہیں کیا مُں نے۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا ہے کیا کر سکتا ہوں۔ ظلم کئے ہیں میں نے اس پر۔ کاش آنکھ نہ کھلتی۔ اس سے بھی معافی نہیں مانگوں گا۔ جھوٹ سمجھے گی۔ کبھی یقین نہیں کرے گی۔ کوئی فائدہ بھی نہیں کر کیا سکوں گا اس کیلئے۔ بیکار ہے۔ ارے ہاں اپنی بات لے بیٹھا تم سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا، اپنی کہانی سنانے لگا۔"

"بولو کیا چاہتے ہو؟"

"اس سے تو دشمنی ہو گئی۔ اب اس کے ساتھ تو رہا نہیں جاسکتا تھوڑی سی مدد کر دو۔ عارضی طور پر سر چھپانے کی جگہ دے دو۔ کچھ کمانے کی کوشش کروں گا پھر یہاں سے کہیں اور نکل لوں گا۔ یہ مت سمجھنا کہ نیکی گلے پڑ گئی۔ مجبوری ہے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے ورنہ کہیں اور نکل لیتا۔ بن سکتی ہے کوئی بات۔"

"کسی سرائے وغیرہ میں رہو گے؟" اکرام نے پوچھا۔

"پیسے نہیں ہیں۔" فیضان نے جواب دیا۔ اسی وقت شمسہ واپس آ گئی۔ فیضان کو دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"چھوٹا جاگ گیا تھا سلانے میں دیر ہو گئی۔" فیضان نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔ شمسہ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "درد ہو رہا ہے سر میں؟ گھاؤ گہرا ہے کیا؟"

"نہیں ٹھیک ہوں۔"

"چلو فیضان، کچھ سامان ہو تو اٹھا لو۔" اکرام نے کہا۔ اس بات پر میں نے بھی چونک کر اکرام کو دیکھا تھا۔ اکرام نے سب کچھ خود سنبھال لیا تھا میری ذہنی کیفیت جانتا تھا اور اس لئے پورے اعتماد کے ساتھ عمل کر رہا تھا ویسے بھی وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا شمسہ کے سلسلے میں اور اس کی وجہ بھی میں جانتا تھا خود بھی تو گھائل تھا۔

فیضان نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ٹین کا ایک صندوق اور کپڑوں کی پوٹلی۔ یہ اثاث تھی ان کی۔ شمسہ نے پوٹلی شانے سے لٹکائی اور فیضان سے بولی۔ "ایک بچے کو اٹھا لو گے؟" فیضان خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے پیچھے اکرام اور پھر میں۔ فیضان نے ایک بچے کو اٹھایا تو اکرام نے فوراً اپنی گود میں لے لیا۔ شمسہ نے دوسرے بچے کو اٹھایا تو میں نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ نرم ننھا سا وجود میری آغوش میں آیا تو محبت کے سوتے کھل گئے۔ بھانجہ تھا میرا، ماموں تھا میں اس کا۔ اپنی خوشبو آ رہی تھی اس کے بدن سے۔ میں نے اسے بھینچ لیا۔ تیسرے بچے کو فیضان نے اٹھا لیا۔ اکرام نے صندوق بھی ہاتھ میں لٹکا لیا تھا اسی طرح ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ میں جانتا تھا کہ اکرام نے انہیں خانقاہ لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے عمدہ جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ خانقاہ کا رخ کرتے ہوئے شمسہ چونکی تھی اور پھر میں نے اسے آنکھیں پھاڑ کر اکرام کو اور خود کو دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اکرام نے اس کی مالی مدد بھی کی ہے۔ ہو سکتا ہے شمسہ اسے پہچانتی ہو لیکن اول تو رات اور پھر اس حادثے کی بدحواسی نے اسے اکرام پر غور نہ کرنے دیا ہو۔ مگر اب راستہ طے کرتے ہوئے وہ بار بار ہمیں دیکھ رہی تھی۔

ہم خانقاہ پہنچ گئے۔ میں انہیں اپنی رہائشگاہ میں لے گیا تھا۔ اکرام نے کہا۔ "فیضان بھائی۔ آپ اور بہن یہاں آرام سے رہیں۔ اطمینان رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ۔ یہ مزار ہے کسی بزرگ کا؟" فیضان نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے۔ آپ کو یہاں تکلیف نہیں ہوگی۔" ہم دونوں انہیں چھوڑ کر باہر نکل آئے ایک کھلی جگہ پتھر پر بیٹھ گئے۔ تاحد نگاہ پُراسرار رات بکھری ہوئی تھی۔ انوکھی کہانیوں کی امین۔ اکرام نے کہا۔

"کیسی عجیب کہانی ہے اب آپ کیا سوچ رہے ہیں مسعود بھائی۔"

"پتہ نہیں اکرام!"

"میری کسی بات کو فریب نہ سمجھیں مسعود بھائی۔ میری زندگی کا مقصد، میرا مسلک ثریا کی تلاش ی۔ وہ مجھے شمسہ کی شکل میں مل گئی ہے۔ اگر وہ ثریا نہیں ہے تو شمسہ تو ہے۔ بلکہ شمسہ کا مل جانا میرے ئے بڑی ڈھارس کا باعث ہے جس طرح تقدیر نے مجھے شمسہ دے دی اسی طرح ثریا بھی ضرور مل جائے ں میرا ایمان ہے اسے تلاش کرنے کیلئے میں کوئی جدوجہد نہیں کروں گا۔ ہاں انتظار ضرور کروں گا کسی ے لمحے کا جو ثریا کو میرے سامنے لے آئے۔ آپ کا مشن الگ ہے۔ اور میں اس میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا آپ جس طرح چاہیں اپنا مشن جاری رکھ سکتے ہیں مگر میں اب شمسہ کی خدمت کروں گا۔ ں کی محرومیاں دور کروں گا۔" اکرام سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کچھ بولیں گے نہیں مسعود بھائی۔"

"کیا کہوں اکرام؟"

"میں نے آج پہلی بار کئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کر ڈالے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ سے پوچھے بغیر۔"

"میں نے تمہیں اپنا محکوم کبھی نہیں سمجھا۔"

"اس عمل سے آپ ناراض تو نہیں ہیں۔"

"وہ میری بہن ہے اکرام۔ اسے سہارا دیا ہے تم نے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شکریہ بھیا، میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ میں اس کے لئے سب کچھ کروں گا، جو بن پڑے گا کروں گا۔"

"میں ایک درخواست کروں گا تم سے اکرام۔"

"حکم دیں مسعود بھائی۔"

"اسے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

"اوہ۔" اکرام آہستہ سے بولا، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا "ٹھیک ہے حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ .... کہ .... خیر آپ جو بہتر سمجھیں۔ ٹھیک ہے میں نہیں بتاؤں گا۔"

"جاؤ، آرام کرو۔ کہیں بھی پڑ رہنا خانقاہ وسیع ہے۔"

اکرام کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔ میرے دل و دماغ پر شدید بوجھ تھا۔ سخت ہیجان کا شکار ہو رہا تھا شمسہ کو کلیجے میں بھر لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ رُواں رُواں چیخ رہا تھا، سارے بدن میں جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے۔ مگر خوف کا شکار تھا۔ پتہ نہیں میرا یہ عمل مجھے کیا سزا دے۔ ابھی اجازت نہیں تھی ابھی صبر کرنا تھا۔ اکرام کے الفاظ نے جذباتی کر دیا تھا اور میں شمسہ کے پاس پہنچ گیا تھا مگر یہ ضروری تھا بروقت پہنچے تھے ہم لوگ۔ نہ جانے کیا ہو جاتا نہ جانے وہ منحوس شخص میری بہن کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ بے چینی عروج پر پہنچی تو آنکھیں بند کر کے مراقبہ کرنے لگا اس وقت مجھے ان کے لئے رہنمائی درکار تھی۔ آہ میں انہی کی محبت سے مغلوب ہو رہا تھا۔ مگر کوئی اشارہ نہیں ملا۔ کچھ نہ ہوا۔ ایسا ہوتا تھا۔ بعض اوقات چھوٹی سی بات کیلئے اشارے مل جاتے تھے اور بعض اوقات کچھ نہیں

پتہ چلتا تھا۔ گویا معاملہ میری صوابدید پر ہے۔ تاہم اس فیصلے پر اٹل تھا کہ شمسہ پر خود کو ظاہر نہیں کروں گا۔ باقی رات بھی سوچتے ہوئے گزری تھی۔ فیضان اب بہتری کی طرف مائل ہے۔ اس بارے میں کسی حد تک معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ انہیں ایک نامعلوم مستقبل کے سپرد نہیں کیا جاسکتا تھا کچھ کرنا ہوگا ان کیلئے مگر کیا!

دوسری صبح شامی میرے پاس آگیا۔ ”وہ مسعود بھائی۔ آپ کے کچھ مہمان آئے ہیں۔“

”ہاں شامی؟“

”میں آپ سے ملنے گیا تھا مگر وہاں ایک خاتون اور چند بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔“

”وہ کچھ دن یہاں رہیں گے شامی۔“

”ٹھیک ہے مجھے ان کیلئے ہدایات دیدیں۔“

”ان کی ضرورتیں پوری کرنی ہیں۔ میرے اوپر تمہارا احسان ہوگا۔“ میں نے ساجت سے کہا۔

”کیسی باتیں کررہے ہیں مسعود بھائی۔ اندھے تو نہیں ہیں سب لوگ ہم جانتے ہیں کہ یہاں تمہارے دم کا ظہور ہے۔ بڑا بابا تو نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔ اسے تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی ہے۔ تم نے بس یہ کہہ دیا کہ وہ تمہارے مہمان ہیں، تو سب ٹھیک ہوگیا۔ ہمارا فرض ہے ان کی دیکھ بھال کرنا۔ تم اطمینان رکھو۔“

”شکریہ شامی۔“ وہاں سے اٹھ کر خانقاہ میں جا بیٹھا ناشتہ وغیرہ وہیں کرلیا تھا۔ پھر اکرام آگیا۔

”شمسہ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ مسعود بھائی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ...... آپ نے کچھ پیسے دیئے تھے۔ نا مجھے میں نے خود اسے دیئے تھے۔ صبح کو مجھے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ بہت معصوم ہے وہ.......... فیضان کے سامنے ہی بول پڑی کہ بھیا تم وہی ہو جس نے مجھے پیسے دیئے تھے۔“

”مجھے تو نہیں پوچھا تھا؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”پوچھا تھا۔“

”کیا کہا تھا۔“

”کہنے لگی دوسرے بھیا کہاں ہیں۔“

”تم نے کیا جواب دیا۔“

”میں نے کہا وہ کہیں گئے ہیں کسی بھی وقت واپس آجائیں گے۔“

”فیضان کا کیا حال ہے؟“

”سخت شرمندہ نظر آتا ہے۔ بالکل خاموش ہے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا اس نے میرے سامنے۔“

”شمسہ سے کہنا پردہ نشین لڑکیوں کی طرح اندر رہے۔ کسی کے سامنے نہ آئے۔“

”ٹھیک ہے کہہ دوں گا۔“

”اس کے بچوں کے کیا نام ہیں۔“ میں نے پوچھا اور اکرام مجھے ان کے نام بتانے لگا۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آرہا تھا۔ بہرصورت میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ شمسہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ اسے ایک لمحہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔ مگر رات کے بعد میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔

شام کو فیضان باہر نکل آیا میں نے اسے مغرب کی نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اور مجھے خوشی ہوئی تھی۔ انسان اللہ کے حضور سربسجود ہوجائے تو برائیاں مرجھا جاتی ہیں۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ وہ سر جھکا کر اسے اپنی برائیوں کا کیا جواب دے گا۔ میں اس کے پاس تو نہیں گیا مگر جب شمسہ کے بچے باہر نکل آئے تو میں خود کو باز نہ رکھ سکا۔ یہ میری بہن کے بچے تھے۔ میں ان کا ماموں تھا۔ سگا ماموں.......... میں بے اختیار ہوکر ان کے پاس پہنچ گیا۔ فیضان نے مجھے پہچان لیا۔

”آپ آگئے شاہ صاحب۔“

”کہو کیا حال ہے فیضان میاں؟“

”حضور سخت زخمی ہوں۔ اپنے زخموں کیلئے مرہم چاہتا ہوں۔“ فیضان نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اللہ تمہیں سکون عطا فرمائے۔“ میں نے بچوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”دل و دماغ میں سخت ہیجان برپا ہے۔ نہ جانے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں مگر کس سے کہوں کیسے دل ہلکا کروں۔ کوئی ہے جو مجھ پر یقین کرلے۔“

”شمسہ تمہاری بیوی ہے۔“ میں نے کہا۔

”نظر ملانے کے قابل نہیں ہوں اس سے، جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا ہے اللہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”اگر تم شمسہ کے مجرم ہو تو اس سے معافی مانگ لو، اس نے تمہیں معاف کردیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور معاف کردے گا۔“

”بہت شرمندہ ہوں میں اس سے اس کی شخصیت تباہ کردی ہے میں نے بہت ذہین بہت سمجھ دار بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔ اتنا ستایا میں نے اسے کہ اپنی اہلیت کھو بیٹھی۔ تیسرے درجے کی عورت بن گئی وہ۔ سب کچھ اسکے دل میں ہے۔ مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے اسے۔“ فیضان کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

”وہ کیا کہتی ہے۔“

”اب کچھ نہیں کہتی۔ بہت کچھ کہہ چکی ہے مگر.......... اس وقت میں نے سنا نہیں تھا شاہ صاحب۔ میرے کان بند تھے۔“

“مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتاؤ گے فیضان۔”

“آپ سن لیں گے شاہ صاحب۔ وعدہ کریں آپ سن لیں گے۔ آپ مجھے ذلیل کریں گے. خوب ذلیل کریں گے۔ شاہ صاحب. آپ لوگوں نے. آپ نے اور اکرام بھائی نے میری بیوی کی عزت بچائی۔ وہ پاکباز عورت ہے۔ ایک شرابی ایک بدکار انسان ہونے کے باوجود. اس کے باوجود کہ میں اس پر ہر الزام لگانا چاہتا تھا. ہر طرح اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ میں اس پر کبھی بدکاری کا الزام نہیں لگا سکا اتنی ہی پاکیزہ ہے وہ۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ایسے نیک انسان کا خون ہے کہ ..... کہ اسکی بے حرمتی پر اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔”

“شکریہ فیضان۔” میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ مگر فیضان جذبات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اس نے میرے ان جملوں پر غور نہیں کیا۔ وہ بولا۔

“برے لوگوں کا ساتھ رہا میرا۔ اچھائی پہ نظر ہی نہ گئی۔ یہ بڑا دربار ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجھے یہاں جگہ بلاوجہ نہیں ملی ہے۔ شاید میرے گناہوں کا کفارا ادا ہو جائے۔” فیضان ڈرتے ہوئے بولا۔

“ابا کیوں رو رہے ہیں؟” شمسہ کے بڑے بچے نے منہ بسورتے ہوئے پوچھا۔

“کچھ نہیں بیٹے۔ اب یہ ہمیشہ ہنسیں گے۔ اکرام۔” میں نے دور سے گزرتے ہوئے اکرام کو آواز دی۔

“جی بھائی۔” اکرام قریب آ گیا۔ اس نے جان بوجھ کر میرا نام لینے سے گریز کیا تھا ورنہ وہ مجھے خالی بھائی کبھی نہ کہتا تھا۔

“بچوں کو ان کی ماں کے پاس پہنچا دو۔”

“جی۔” اکرام بچوں کو لیکر چلا گیا۔ فیضان نے پھر گردن خم کر لی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر بولا۔

“میں سہارنپور میں رہتا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ چار بھائی تھے ہم لوگ۔ تین شادی شدہ تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ بھائیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ بھائی مجھ سے بے نیاز تھے۔ احساس محرومی نے مجھے میرے دوستوں کا راہی بنا دیا تھا۔ برائی کی طرف قدم بڑھاؤ تو دوستوں کی کمی نہیں ہوتی۔ بہت سے برے دوست مل گئے تھے مجھے۔ بھاوجیں ہر طرح ذلیل کرتی رہتی تھیں۔ میں نے ایک دن بڑی بھابی سے کہا۔ “بھابی میری شادی کر دیں۔”

“خوب .... بیوی کو کہاں رکھو گے۔”

“یہ گھر میرا نہیں ہے کیا۔”

“آئینہ دیکھا ہے کبھی۔”

“کیوں۔”

“صاف صاف سنو گے۔” بھابی بہت تیز طرار تھیں۔

“اب تو سننا بہت ضروری ہے۔” میں نے بھی بھاری لہجے میں کہا۔

“کتنے عرصہ سے کھا رہے ہو ہمارے سر پر .... کیا خرچ ہے تمہارا۔”

“میرا خرچ تو بڑے بھیا اٹھاتے ہیں۔”

“کچھ شرم آئی ہے کبھی۔”

“آخر کیوں۔”

“سنو فیضان غور سے سنو۔ تمہارے تینوں بھائیوں میں سے کوئی تمہارا خرچ اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہے اور کیوں اٹھائیں وہ تمہارا خرچ جوان ہو. تندرست ہو. یہ بات ہم سب کے درمیان ہو چکی ہے۔ اس مکان میں تمہارا حصہ تھا۔ آج تک تمہارا خرچ اس میں سے اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ حساب بھی برابر ہو چکا ہے سمجھ میں آ گیا۔”

بھابی کی بات مجھے بہت بری لگی۔ مگر میں اس بات پر ناراض نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے سنجیدگی سے سوچا۔ واقعی میں بہت پست ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک دم خود کو بدل دیا۔ نوکری کی، دوسرے کام کرنے لگا۔ کافی چالاک تھا میں۔ پیسے کمانا مشکل نہ ہوا۔ میں نے اپنی حیثیت بدل لی۔ بھائی بھی خوش تھے۔ بھاوجیں بھی انہیں بھی بہت کچھ دیتا تھا۔ پرانے دوستوں کو چھوڑ کر، ہر بری عادت چھوڑ کر مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ ایک اچھا انسان بننا چاہتا تھا میں۔ پھر میں نے شمسہ کو دیکھا۔ یہ لوگ نئے نئے ہمارے محلے میں آ کر رہے تھے۔ شمسہ مجھے بھا گئی۔ اس کے والد صاحب کا نام محفوظ احمد تھا۔ ایک اور صاحب ان کے ساتھ رہتے تھے جن کا نام ریاض احمد تھا۔ کس قدر پریشان حال تھے وہ لوگ مگر شریف تھے۔ بڑی آرزوؤں کے ساتھ میں نے اپنی بھابیوں کو شمسہ کے گھر رشتہ لیکر بھیجا۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک بار پھر میں نے بھابیوں سے کہا تو میری منجھلی بھابی نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

“بے کار ہے فیضان، تمہاری شہرت دور دور تک ہے کون جان بوجھ کر مکھی نگلے گا۔”

“اب میں ٹھیک ہو چکا ہوں بھابی۔”

“ہونہہ..... ٹھیک ہو چکے ہو دیکھ لینا جو جواب ملے گا دیکھ لینا۔”

“اگر ایسا ہوا تو اچھا نہیں ہو گا بھابی۔”

“کہا نا خود دیکھ لینا۔”

میری بھابی دوبارہ محفوظ احمد صاحب کے گھر گئیں مگر جواب واقعی منجھلی بھابی کے خیال کے مطابق تھا۔ محفوظ احمد صاحب نے کہا کہ تصدیق کرنے سے پتہ چلا ہے کہ لڑکے کا چال چلن اچھا نہیں ہے اس لئے ہم معذرت خواہ ہیں بھابیوں نے میرا خوب مذاق اڑایا۔ اور میں جل کر کباب ہو گیا۔ میں خود ان لوگوں سے ملا۔ اپنا نام بتا کر میں نے کہا کہ بیشک میں نے کچھ وقت غلط لوگوں کے ساتھ گزارا ہے لیکن اب میں محنت کر کے روزی کما رہا ہوں میری ذات سے انہیں یا ان کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ مگر شمسہ کے ماموں نے صاف انکار کر دیا۔ میری منت سماجت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اور میرا دماغ پھر الٹ گیا۔ میں نے شمسہ کو اپنے چند دوستوں کی مدد سے اغوا کر لیا اور اسے لیکر سہارنپور سے دہلی آ گیا۔ پھر الٰہ آباد پہنچا

اور وہاں اس سے نکاح کر لیا مگر ان لوگوں کی ضد نے مجھے پھر انہی راستوں پر لا ڈالا تھا۔ اس کے بعد میں شمسہ سے انصاف نہیں کر سکا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن شمسہ۔"

فیضان خاموش ہو گیا۔ یہ میرے گھر کی کہانی تھی۔ ان سب کی کہانی بھی جن کیلئے میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

بہت دیر تک خاموشی طاری رہی پھر تجسس نے سر ابھارا میں نے کہا "شمسہ کے والدین پھر تو نہیں ملے فیضان۔"

"میں تو اپنے بھائیوں سے بھی نہیں ملا۔ ان بیچاروں سے بھلا کیا ملتا۔"

"تمہارا خاندان سہارنپور ہی میں آباد ہے۔"

"ہاں۔ وہیں پیدا ہوئے ہم لوگ۔ دادا پردادا بھی وہیں کے ہیں۔"

"اور شمسہ کے اہل خاندان۔"

"وہ کہیں اور سے آ کر آباد ہوئے تھے۔" فیضان نے جواب دیا۔ فیضان کو کرید کرید کر میں اس دور کا تعین کرنے لگا جب ماموں ریاض مجھے تھانے میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے شمسہ کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ پتہ چلانا چاہتا تھا کہ کیا وہ لوگ اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ فیضان اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکا البتہ میں نے اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیا تھا۔

دوسرا دن عرضیوں کا دن تھا۔ دو دنوں کیلئے تیاریاں ہوتی تھیں خاص خیال رکھا جاتا تھا باقی دن عام ہوتے تھے حالانکہ خانقاہ کے عقیدت مند عام دنوں میں بھی آ جاتے تھے ان پر روک ٹوک نہیں تھی۔ لیکن وہ عام دنوں میں اس جھوٹی قبر پر نہیں جا سکتے تھے۔ بس منگل کو عرضیوں کیلئے اور جمعرات کو ان کے جواب کیلئے وہ اندر جاتے تھے۔ اس ڈھونگ پر میرا دل لرزتا تھا۔ مگر یہ میں نے نہیں رچایا تھا۔ اس کا سلسلہ تو بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جس نے اس سلسلے کا آغاز کیا تھا وہ مرتبہ پا چکا تھا۔ اور بڑائی حاصل کر کے نہ جانے کہاں چلا گیا تھا ہم لکیر پیٹ رہے تھے۔ ایک بار اکرام سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔

"یہ سب کچھ جو ہم کر رہے ہیں اکرام ...... کیا یہ بہتر ہے؟"

"کیا مسعود بھیا۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ یہ سب فریب ہے نہ یہ کسی کا مزار ہے نہ اس کی کوئی اور اہمیت ہے۔ لوگ اس کے بارے میں توقعات لیکر آتے ہیں اور ہم انہیں جھوٹے سہارے دیتے ہیں۔"

"وہ سہارے جھوٹے تو نہیں ہوتے بھیا۔ انہیں فائدہ پہنچتا ہے جو کچھ آپ جانتے ہیں انہیں بتا دیتے ہیں سب ہی کہہ رہے ہیں کہ جب سے آپ خانقاہ میں آئے ہیں ضرورت مندوں کو سب کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ آپ کے یہاں آنے سے تو فریب کا سلسلہ ختم ہوا ہے۔ اور حاجت مندوں کی اصل ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ بھیا یہ کم ہے کہ لوگوں کو ڈاکو سنتو خان سے نجات مل گئی ہے۔ آپ خود بتائیے کیا یہ گناہ ہے۔"

"مگر وہ ایک جھوٹی آس لیکر آتے ہیں اس کے برعکس اگر وہ ...... عام حیثیت سے آتے تو۔"

"یہ ایک دکان حکمت ہے بھیا۔ آپ کسی بھی جگہ یہ دکان کھول لیتے اس کی حیثیت اس سے الگ نہ ہوتی۔ وہاں پھر لوگ کھل کر دل کی وہ بات نہ بتاتے۔ روحانی تعلق کچھ اور ہوتا ہے اور کسی اپنے جیسے سے دل کی بات کر لینے کا مسئلہ کچھ اور۔"

"ہمیں اس فریب سے روزی حاصل ہوتی ہے۔"

"یہاں وہی کچھ لیکر آتا ہے جسے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آپ خود سوچیں اس طرح بہت سوں کو رزق حاصل ہو رہا ہے۔ پہلے یہ لوگ ڈاکہ زنی کرتے تھے۔"

میں ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہو گیا۔

عرضیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں انہیں لکھتا رہا۔ معمول میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن بدھ کی رات میرے لئے بڑی کٹھن تھی۔ اس رات مجھے شدید کرب سے گزرنا پڑا۔ عموماً میں ہر عرضی کیلئے مراقبہ کرتا تھا اور میری رہنمائی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس رات ...... اس رات کچھ نہ ہوا۔ سپاٹ اور سنسان رات۔ میرے تمام رابطے ٹوٹ گئے تھے مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ اور میرا دل پنکھے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ آہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ خاموشی کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ نافرمانی کا مجرم قرار دیا جا رہا ہے مجھے۔ وہی ہوا جسکا خدشہ تھا۔ آخر وہی ہو گیا۔ میں بار بار کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دل و دماغ سن ہو گئے تھے۔ ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ معمولات جاری ہو گئے۔ شمسہ کے بچے میرے پاس آ گئے ان میں ایک واقعی میرا ہم شکل تھا۔ میرا بچپن بالکل ایسا ہی تھا۔ اور کیا کروں۔ اور کیا کر سکتا ہوں وہ میرے پاس ہے۔ میری رہائش گاہ میں ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ اس کا برسوں کا بچھڑا ہوا بھائی اس کے اتنا قریب ہے اور میں نے دوبارہ اس کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ کہیں محبت عود کر نہ آئے کہیں سب کچھ کھو نہ بیٹھوں۔ اور کیا کروں ...... اور کیا کروں؟"

معمول جاری رکھنا تھا۔ عرضیوں کے جواب لکھے۔ جو سمجھ میں آیا لکھتا رہا۔ شام کو یہ سارے جواب ضرورت مندوں کو پہنچائے۔ طریقہ وہی تھا جو نادر حسین نے ایجاد کیا تھا۔ پھر شمسہ کی آواز سنائی دی۔

"سائیں بابا۔ ولی تیرے صدقے واری۔ بگڑی بن گئی میری تیری دعا سے۔ میرا گھر والا ٹھیک ہو گیا۔ تیرے خزانے وسیع ہیں ولی۔ تیرے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔ ہم ہوس کے بندے ہیں مانگنا ہمارا کام ہے۔ دینا تیرا ...... گھر بچھڑ گیا ہے میرا۔ ماں باپ بھائی۔ سب ہیں ولی۔ دل تڑپتا ہے ان کیلئے۔ بگڑی بنا دے سائیں۔ ایک بار ملا دے سب سے۔ ایک بار صورت دکھا دے۔ تیرے واری ولی۔ تیرے صدقے سائیں۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں شمسہ کا کرب محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دل کی چیخیں سن رہا تھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ میرا ذہنی سکوت ختم نہیں ہوا تھا۔

ملاقاتیوں کا وقت ختم ہوگیا۔ شام کو باہر نکلا تو فیضان سے ملاقات ہوگئی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر آیا تھا۔ میرے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے فیضان؟"

"کچھ نہیں شاہ صاحب۔ میں یونہی قدموں میں بیٹھنے چلا آیا کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔"

"کہو۔" میں نے کہا۔

"شاہ صاحب بہت دن ہوگئے مزار کی روٹیاں کھاتے ہوئے۔"

"کوئی تکلیف ہے۔"

"ہاں!"

"بتاؤ۔"

"شاہ صاحب۔ یہاں مجھے غیرت کا درس ملا ہے۔ یہاں میری کھوئی ہوئی انسانیت مجھے واپس ملی ہے۔ شاہ صاحب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر نہیں بیٹھنا چاہتا۔"

"مجھے بتاؤ. میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں سے جانے کے خواہشمند ہو۔"

"یہاں جو سکون حاصل ہوا ہے مجھے شاید دنیا میں کہیں اور نہ ملے۔ میرا کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ دراصل باہر محنت کیلئے نکلنا چاہتا تھا۔ اتنا کرلوں کہ بیوی بچوں کو لیکر اس شہر سے چلا جاؤں۔ اس وقت تک ہمیں یہاں رہنے کی اجازت مل جائے میں یہی چاہتا ہوں۔"

"تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں شاہ صاحب میرے دل میں خود یہ خیال آیا ہے۔"

"اور تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں شاہ صاحب۔"

"تو پھر اس وقت تک یہاں رہو جب تک میں تمہیں جانے کی اجازت نہ دے دوں۔ تمہارے یہاں رہنے سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کوئی احساس ذہن پر طاری نہ ہونے دو۔ ہاں ممکن ہوسکے تو پانچوں وقت نماز پڑھ لیا کرو۔"

"بہتر ہے شاہ صاحب۔"

"یہ میری درخواست ہے تم سے۔" میں نے کہا۔ فیضان نے گردن جھکالی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے دل و دماغ پر وہی سحر طاری تھا۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن کوئی گیارہ بجے کے وقت میں نے اکرام کو بلا کر کہا۔ "اکرام میں تمہیں کہیں بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں مسعود بھائی۔"

"سہارنپور...... ایک پتہ دے رہا ہوں۔ وہاں جاکر معلوم کرو کہ محفوظ احمد. ریاض احمد وغیرہ یہاں رہتے ہیں یا نہیں۔ بس یہ معلومات کر کے آنا ہے۔" اکرام اچھل پڑا۔ پھر کسی قدر مسرور لہجے میں بولا۔

"محفوظ احمد تو آپ کے والد کا نام ہے۔"

"ہاں...... فیضان سے پتہ چلا ہے۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"آج ہی چلا جاتا ہوں۔"

"تیاریاں کرلو۔ واپسی بھی جلدی ہونی چاہئے اور سنو صرف معلومات کر کے آنا ہے کسی کو ساتھ نہ لے آنا سختی سے تاکید کر رہا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اکرام نے کہا۔ مجھ سے زیادہ وہ بے چین ہوگیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ چلا گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اعصاب جیسے اینٹھ کر رہ گئے تھے۔ سکرات کا سا عالم طاری تھا لیکن شام کو یہ جمود ٹوٹ گیا۔ شامی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے ایک نہایت خوبصورت مخمل کی ڈبیہ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے دیکھئے مسعود بھائی۔"

"کیا ہے یہ؟"

"ایک عجیب واقعہ ہوا ہے پچھلی شام عقیدت مندوں میں ایک دبلا پتلا سوکھا سا آدمی بھی آیا تھا۔ اس نے خانقاہ میں یہ ڈبیہ نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسے قبول کیا جائے۔ لوگ ایسی چیزیں بھی دے جاتے ہیں میں نے یہ ڈبیہ طاق میں رکھی اور بھول گیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اندر گیا تو یہ مجھے نظر آئی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اچھل پڑا۔ اس میں پیلے رنگ کی ایک بہت خوفناک مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈبیہ میرے ہاتھ سے گر گئی اور مکڑی برق رفتاری سے لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی قبر کے پتھروں میں گھس گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے مسعود بھائی کہ جس آدمی نے یہ ڈبیہ دی تھی اس کی آنکھیں بالکل اس مکڑی جیسی تھیں۔"

"پیلی مکڑی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کہاں ہے، کہاں گئی۔"

"مکڑی؟" شامی نے پوچھا۔

"ہاں. آؤ جلدی آؤ۔" میں نے تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ شامی حیران حیران سا میرے پیچھے دوڑا۔ ظاہر ہے وہ میری بدحواسی کیا سمجھتا۔ مگر میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ پیلی مکڑی کے نام سے میرا دل لرز گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ اس بارے میں کون جان سکتا تھا۔ شامی نے میرے ساتھ دوڑتے ہوئے کچھ کہا تھا مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

اندر اندھیرا تھا۔ بس وہ مدھم چراغ روشن تھا جو عموماً وہاں روشن رہتا تھا۔ اس مدھم روشنی میں بھلا کیا نظر آتا۔ پھر بھی میں جعلی قبر کے پاس بیٹھ کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ شامی میرے قریب موجود تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے اوپر رکھا چراغ اتارا اور میرے قریب کر دیا۔

"بیکار ہے شامی۔ وہ...... وہ...... اب یہاں کہاں ہوگا۔" میرے منہ سے نکلا۔

"کون؟" شامی نے پوچھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا۔ شامی نے ہی مجھے آواز دی۔ "مسعود بھائی، مسعود بھائی۔"

"ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ہو گیا آپ کو۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔"

"آؤ شامی، باہر چلیں۔" میں نے کہا۔ شامی نے چراغ واپس اس کی جگہ رکھا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

"مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے مسعود بھائی۔"

"کیا بتاؤں شامی!"

"وہ سب کچھ تھا تو عجیب، مگر میں نے غور کیا تھا۔ لوگ چڑھاوے چڑھاتے ہی ہیں۔ بہت سے عقیدت مند سونے کے چھلے زنجیریں چادر میں پرو کر قبر پر ڈال جاتے ہیں۔ وہ ڈبیہ بھی میں نے ایسی ہی سمجھی تھی مگر اس کے بعد اس میں سے مکڑی نکلی۔ اس سے زیادہ آپ کی یہ کیفیت پریشان کن ہے۔ ایسی کیا خاص بات تھی اس مکڑی میں جس نے آپ کو اتنا پریشان کر دیا۔"

"پیلی مکڑی نحوست کا نشان ہوتی ہے شامی، سخت نحوست کا نشان اور...... وہ نحوست یہاں آچکی ہے۔"

"تو پھر۔ اب کیا ہو گا؟" شامی کی آواز میں بھی خوف بیدار ہو گیا۔

"پیلی مکڑی جہاں کہیں نظر آئے اسے فوراً مار دینا۔ صرف پیلی مکڑی کو۔"

"ٹھیک ہے کل دن کی روشنی میں ہم سب اسے تلاش کریں گے۔ مگر وہ آدمی کون تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں۔ بالکل اُسی مکڑی کی مانند!"

"پتہ نہیں کون تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ شامی دیر تک میرے پاس بیٹھا نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ مگر میری حالت بہتر نہ تھی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بات پھر بگڑ گئی ہے۔ میرے قدموں میں لغزش آگئی ہے۔ مجھے ایک بار پھر تنہائیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اکرام بھی موجود نہیں ہے جو کچھ سہارا ہو۔ یہ بے چارے لوگ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ان سے کیا کہوں کیسے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔

"آرام نہیں کریں گے مسعود بھائی۔"

"ہاں۔ بس یہیں رہوں گا۔ تم جاؤ۔" شامی چلا گیا۔ اس نے اداس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہوں میں۔ کیا کروں انسان تو ہوں ہوش و حواس میں ہوں۔ مجھ سے میرے حواس کیوں نہیں چھین لئے جاتے۔ کتنا جبر کروں دل پر کیسے اس پیار کو کھرچ کر پھینک دوں جو خون میں رچا ہوا ہے بہن وہ میری ماں جائی ہے۔ فریاد کرتی ہوئی آئی تھی۔ نیم دیوانی ہو رہی تھی۔ ایک انسان کی قسم سے کیسے باز رہ جاتا۔ کتنا تو روکا تھا خود کو۔ خون جوش مار گیا۔ اور پھر اگر اس کی مدد کو نہ جاتا تو وہ کس طرح تباہ ہو جاتی۔ کون تھا اس کا پرسان حال۔ اس کے بعد سے مسلسل جبر کر رہا ہوں۔ دوبارہ اس کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کے بچے سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک میرا بچپن بنا ہوا ہے۔ ہو بہو میرا نقش ہے وہ، میں اس کا ماموں ہوں۔ اور کتنا جبر کروں خود پر، اور کتنا جبر کروں۔

انسان ہوں مجھ سے میرے ہوش کیوں نہیں چھین لئے جاتے۔ مجھے وہ مقام کیوں نہیں دے دیا جاتا جو نادر حسین کو مل گیا۔ آہ...... آہ...... آہ۔ میں تڑپنے لگا۔ پورا وجود انگارہ بن گیا۔ صدیاں بیت گئیں خوشیوں سے دور ہوئے خوف بس ایک خوف، رہنمائی کرو، میری رہنمائی کرو!

آج آنکھوں سے آنسو نہیں بہے تھے۔ سنا گیا ہے کہ آنسو توبہ کی قبولیت کا پتہ دیتے ہیں۔ دل کا گداز رہنما ہوتا ہے۔ مگر آنکھیں خشک تھیں۔ سینہ جل رہا تھا۔ رات گزر گئی۔ کوئی خیال دل سے نہ گزرا، کوئی ہدایت نہ ملی۔ صبح کو سینہ پتھرا گیا۔ سوچوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اس کے بعد کے معمول وہی ہے۔ دوسرا دن اور کئی دن گزر گئے۔ اکرام کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ایک بات پر حیرت ہوئی عرضیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے نتائج بھی سامنے آتے رہتے تھے۔ اس عالم میں بھی جو ہدایات دی تھیں ان کے نتائج اچھے نکلے تھے ایک حاجت مند آیا۔

"شاہ بابا۔ اللہ مرتبہ بڑھائے۔ شاہ بابا، مقدمہ جیت گیا۔ میرا سب کچھ مل گیا مجھے۔ شاہ بابا ہمیں نئی زندگی مل گئی ورنہ پورے گھرانے کو مرنا پڑتا۔ ہمیں نئی زندگی ملی ہے شاہ بابا۔ یہ نذرانہ ہے جو بھی ضرورت مند آئے اسے دے دیں۔" اس نے پچاس ہزار روپے شامی کو دیئے تھے۔

یہ رقم تقسیم ہو گئی۔ مگر اس دن میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ شمسہ کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ فیضان اب درست ہو گیا تھا۔ وہ نماز پڑھتا تھا۔ باقی وقت بچوں پر صرف کرتا تھا۔ محنت کر کے زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ ہو، جہاں کہ وہ ایک بہتر زندگی حاصل کر لے کوئی دولت مند شخص اس کے لئے کچھ کر دے تو! یہ ہو سکتا تھا۔ ایسے کسی شخص کو تلاش کیا جا سکتا تھا۔ بہت غور کیا تھا میں نے اس بات پر۔ پھر ایک شام اکرام آگیا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ مگر اکرام کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی۔

"کیا ہوا اکرام؟"

"کچھ ہوا نہیں مسعود بھائی۔"

"پہیلیاں نہ بجھاؤ!" میں نے زور سے کہا۔

"دونوں پتے درست تھے۔ فیضان عالم کا خاندان وہیں آباد ہے۔ اس کے ہاں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مگر محفوظ احمد کو تو اب لوگ بھول گئے ہیں۔ ان کی بیٹی کا اغوا ہوا تھا۔ اس کے کوئی سات ماہ کے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے۔ کہاں یہ کوئی نہیں جانتا۔"

"فیضان کے خاندان والوں سے ملے تھے؟" میں نے صبر و سکون سے کہا۔ "کیا کہتے ہیں وہ اس بارے میں۔"

"فیضان ہی کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اسے بدکردار اوباش اور آوارہ کہہ رہے تھے۔ اغوا کے واقعے سے خود کو لاتعلق ظاہر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اب ان کا اپنے بھائی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔"

"کوئی نشاندہی نہیں کر سکے محفوظ احمد کی۔"

"نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، یہی بہتر ہوگا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ کام وقت پر ہوتا ہے مسعود بھائی۔ جس طرح ہمیں شمسہ ملی ہے اسی طرح وہ لوگ بھی مل جائیں گے۔"

"ہاں۔ شاید۔"

"شاید نہیں۔ یقیناً اسی طرح مسعود بھائی جیسے مجھے ثریا کے مل جانے کا یقین ہے۔"

میں نے چونک کر اکرام کو دیکھا، اس کے چہرے پر آفاقی سکون تھا۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ اکرام بھی عظمت کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس نے صبروشکر کرلیا ہے وہ ثریا کا نام بھی نہیں لیتا۔ وہ ان تمام مسائل میں خود کو ضم کرلیتا ہے جو سامنے آتے ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ باظرف ہے۔ شاید نادر حسین کا عقیدہ بھی مجھ سے زیادہ پختہ تھا۔ وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا جس کے تحت اسے جذب کا مقام مل گیا۔ اور اب اکرام کے چہرے پر اس لمحے جو کچھ نظر آیا تھا اس نے نجانے کیوں ذہن میں یہ تصور پیدا کردیا تھا کہ اس معصوم شخص کو بھی کچھ ملنے والا ہے اس کے عقیدے کی پختگی اس کا نیک عمل یہی ظاہر کرتا تھا۔ کیا ہی دلچسپ بات ہے ادھر سے اُدھر دوڑتے رہو۔ سارا جہان کھنگال مارو، جو تلاش کررہے ہو وہ صرف تمہاری آنکھوں کے تل کی اوٹ ہے، اس تل کے عقب میں اگر کچھ نظر آجائے تو ہاتھ بڑھا کر اٹھایا جاسکتا ہے لیکن تل کے سامنے سے ہٹنا ضروری ہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ اکرام نے چونک کر مجھے دیکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ پھر سہمی سہمی آواز میں بولا۔ "مسعود بھائی۔"

میں نے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا اور دوبارہ ہنس پڑا۔ وہ پھر اسی انداز میں بولا۔ "مسعود بھائی خدا کیلئے ذہن کو قابو میں رکھئے دیکھئے اللہ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ رکھئے، کیا آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ شمسہ اس طرح آپ کے سامنے آجائے گی، ناصرف آپ کے سامنے آجائے گی بلکہ آپ صحیح وقت پر اس کا ہاتھ پکڑیں گے اسے سہارا دیں گے، کہاں تھی وہ کچھ معلوم تھا آپ کو۔ یہ تو امی اور ابو بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں ہے، لیکن اللہ نے ذریعہ بنایا۔ اب کم از کم وہ آپ کے سامنے تو ہے، تو آپ اس بات سے مایوس کیوں ہیں۔ امی اور ابو محمود یا ماموں ریاض آپ کو ضرور ملیں گے آپ یقین رکھیں، آپ اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھئے۔"

"نہیں میرے دوست نہیں میرے بھائی. کیا اس ہنسی کو تو میری ذہنی خرابی سمجھ رہا ہے، نہیں اکرام ایسا نہیں ہے بس کچھ خیالات ذہن میں آئے تھے کہ ہنسی نکل گئی۔"

"مجھے تو ڈرا ہی دیا آپ نے۔ دراصل میں خود بھی سہما ہوا واپس آیا تھا، سوچ رہا تھا کہ نجانے اس انکشاف سے آپ کے دل پر کیا بیتے گی۔ لیکن اب بھی یہی کہوں گا کہ اللہ کے حکم کا انتظار کیجئے. سب کچھ معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں اکرام تم ٹھیک کہتے ہو. میں تو طویل عرصے سے صبر کررہا ہوں اور اب بھی صبر کرتا رہوں گا۔ دیکھ لو شمسہ کے سامنے آج تک نہیں گیا۔ وہ پردے میں رہتی ہے کس کس طرح دل نہیں

تڑپتا اس کے لئے۔ لیکن جاؤں گا نہیں اس کے سامنے۔ بے کار ہے۔ ملیں گے تو سب ہی ملیں گے ورنہ کیا فائدہ۔ غم کی کچھ اور تحریریں رقم ہوجائیں گی سینہ پھٹ جائے گا اس سے مل کر جب وہ سب کے بارے میں پوچھے گی۔ میرے بارے میں پوچھے گی۔ ہمت نہیں کرپاتا اکرام یقین کرو ہمت نہیں کر پاتا۔"

اکرام نے گردن جھکالی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بہت دیر تک وہ غم میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"اسی لئے تو آپ سے ضد بھی نہیں کرتا، حالانکہ ایک بہن کو اگر یہ پتہ چل جائے کہ بچھڑا ہوا بھائی سامنے ہے تو کم از کم ایک سہارا تو اسے حاصل ہوجائے گا۔"

"نہیں اکرام میں اپنی تقدیر کے دروازے خود نہیں کھولنا چاہتا، بقول تمہارے جب یہ دروازے خود بخود کھلیں گے تب میں ان کے دوسری جانب جھانکوں گا۔ ورنہ نہیں نا سہی۔" اکرام پھر خاموش ہوگیا تھا۔ بہت دیر تک یہ خاموشی طاری رہی اب اکرام کو تقریباً ساری ہی باتیں معلوم ہوچکی تھیں چنانچہ موضوع بدلنے کے لئے میں نے اس سے کہا۔ "ایک اور دلچسپ صورتحال سامنے آئی ہے اکرام۔ بھوریا چرن یہاں داخل ہوگیا ہے۔"

"کیا۔" اکرام دہشت سے اچھل پڑا۔

"ہاں۔"

"مم...... مگر کیسے...... آپ کو کیسے پتہ چلا مسعود بھائی؟" اس نے سوال کیا اور میں نے اسے شامی کی ساری کہانی سنادی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ "اور یہ جگہ ایسی ہے کہ اس کا راستہ نہیں رک سکتا میرا مطلب ہے یہ ایک جعلی خانقاہ ہے اور یہاں ہر ایک آجاسکتا ہے کوئی روحانی تصور تو وابستہ ہے نہیں اس سے یہ بات ہم جانتے ہیں مسعود بھائی۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ وہ کم بخت اس جگہ آگیا ہے ہمارے راستے ضرور کاٹے گا۔"

"سامنا تو ہوا اس بدبخت سے، اب تو وہ سامنے ٹکتا ہی نہیں ہے اکرام۔ بہرحال میں نے بطور تذکرہ تم سے کہہ دیا ہے تم بھی ذرا ہوشیار رہنا۔ تمہاری طرف سے پریشان تھا واپس آگئے جی خوش ہوگیا ہے اور اطمینان بھی۔"

"مگر مجھے کوئی خوشی نہیں ہے مسعود بھائی۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ ذرا شمسہ بہن سے مل لوں، بچے تو ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں بالکل۔ مگر ذرہ برابر تذکرہ مت کرنا کسی بات کا، کیا سمجھے؟"

"ہاں یہ تو سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے تذکرے کا کیا امکان ہے اور کہوں گا بھی تو کیا؟"

کچھ دیر کے بعد اکرام میرے پاس سے چلا گیا اور میں آنکھیں بند کرکے سوچوں میں گم ہوگیا۔ وقت گزر تا رہا بس اس بات پر حیرت تھی کہ اب عرضیوں کے جواب کے لئے مراقبہ کرتا تھا تو کوئی جواب نہیں ملتا تھا، کوئی راہنمائی نہیں ہوتی تھی. کوئی ایسی نشاندہی نہیں کی جاتی تھی جس کے تحت میں ان عرضیوں کا

جواب لکھوں جب کہ اس سے پہلے ایسا ہوتا تھا اور مجھے بڑی آسانی ہوجاتی تھی لیکن اب سچی بات یہ ہے کہ ذہنی اختراع سے کام لے رہا تھا۔ عرضیاں لکھی جاتی تھیں ان کے جو جواب سمجھ میں آتے تھے دے دیتا تھا۔ ٹالنے والی بات ہوتی تھی۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ معیار وہی چل رہا تھا حاجت مند جب آتے تو ان کے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ ہوتا اور چہروں پر خوشی کے آثار۔ ایک بھی ایسا نہیں آیا تھا جس نے کہا ہو کہ اس کی مراد پوری نہیں ہوئی بلکہ اب تو رش بڑھتا ہی جارہا تھا دور دراز کے لوگ آنے لگے تھے اور خانقاہ کے معاملات بہت بہتر انداز میں چل رہے تھے۔ فیضان کو چونکہ میں نے منع کردیا تھا کہ ابھی وہ کہیں آنے جانے کی بات نہ کرے خاموشی سے وقت گزار رہا ہے۔ شرمندہ شرمندہ سا ضرور نظر آتا تھا لیکن اس کے بعد اس نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ بے چارہ نہایت عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی وغیرہ بھی کرتا تھا اور عبادت گزاری بھی۔ اب کسی کو کیا بتایا جاتا کہ اس خانقاہ کی کہانی کیا ہے۔ بھوریا چرن کا شبہ بے شک ہوا تھا لیکن خاصا وقت گزر جانے کے باوجود کوئی ایسا عمل نہیں ہوا تھا جو تردد کا شکار کردے۔ البتہ دل کو اس بات کا یقین تھا کہ کچھ ہوا ضرور ہے بھوریا چرن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس نے کوئی نہ کوئی چکر چلایا ہوگا اور نجانے اس کے کیا نتائج سامنے آئیں کیا کہا جاسکتا ہے۔ فیصلہ کرنا ناممکن ہی تھا۔ اس دن بھی منگل تھا اور منگل کو مرادیں مانگنے والے آیا کرتے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کی بڑی سی گاڑی آئی تھی اور اس سے ایک بھاری بھرکم جسم کے مالک، شیروانی پائجامے میں ملبوس، وارنش کا پمپ پہنے ہوئے، صاحب حیثیت آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں انگشتریاں پڑی ہوئی تھیں ساتھ میں تین چار ملازم قسم کے آدمی تھے، عقیدت سے خانقاہ پر پہنچے۔ ابھی وہ وقت نہیں ہوا تھا جب خانقاہ کے دروازے کھلتے تھے، شامی سے ملاقات کی اور کچھ معلومات حاصل کرنے لگے، اکرام معمول کے مطابق میرے پاس موجود تھا اس نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔“

”ہاں۔“

”ویسے مسعود بھائی انسان کو زندگی میں کوئی نہ کوئی سہارا درکار ہوتا ہے وہ جو دولت میں کھیل کر بہت سے احساسات سے بے نیاز ہوجاتے ہیں کسی نہ کسی لمحے روحانیت کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔“

میں نے اکرام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر عرضیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہم دونوں اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ مختلف لوگ مختلف باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پھر ایک آواز سنائی دی۔

”میں ایک گناہ گار انسان ہوں یہ نہیں جانتا بابا صاحب کہ ایسی جگہوں کا طریقۂ کار کیا ہوتا ہے لیکن بس ایک مشکل ہے میری بہت بڑی مشکل ہے اسے حل کردیجئے۔ پریشان ہوں، نام ہے میرا عزت بیگ اور دھام پور نگینہ میں رہتا ہوں، کاروبار بہت اچھا چل رہا ہے میرا دولت کی ریل پیل ہے۔ مگر وہ حویلی جس میں، میں رہتا ہوں آسیب زدہ ہے۔ حویلی کے آسیب مجھے بہت پریشان کرتے ہیں، بیوی اور بچے زندگی سے عاجز ہیں کئی بار حویلی چھوڑ چھوڑ کر مختلف جگہوں پر جاکر رہا، لیکن جب کہیں اور جاتا ہوں تو گھر کا گھر بری طرح بیمار ہوجاتا ہے اور مجھے واپس اسی حویلی میں آنا پڑتا ہے۔ کچھ اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں

کہ میری بیوی مجھے واپس حویلی میں لانے پر مجبور ہوجاتی ہے، یہاں آکر پریشانیاں تو بے شک ہوتی ہیں مگر بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں، کچھ دن پہلے ایک اور بابا صاحب نے نشاندہی کی تھی کہ میری حویلی آسیب زدہ ہے اور مجھے اس کے لئے انتظام کرنا چاہئے۔ بابا صاحب میں جو کچھ کہہ رہا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ اسے کون سن رہا ہے۔ لیکن اگر میری مدد ہوسکتی ہے تو آپ میری مدد کیجئے۔ میرا کام بن گیا مجھے سکون مل گیا تو میں اس خانقاہ کو سونے کا بنادوں گا، چاروں طرف سے اس کی عمارت پختہ کرادوں گا۔ یہاں سینکڑوں آدمیوں کی رہائش کا بندوبست کروں گا تاکہ جب عقیدت مند آئیں تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ میری مدد کیجئے، میں بہت دور سے آیا ہوں آپ کے قدموں میں ہی رہوں گا۔ جب تک کہ مجھے کوئی اشارہ نہ مل جائے۔“

میں نے اس کا نام لکھ لیا۔ یونہی دل میں خیال آیا تھا کہ یہ وہی شخص ہوسکتا ہے جسے ہم نے سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اور تصور بھی میرے ذہن میں ابھر آیا تھا اور میں اس پر غور کرنے لگا تھا۔ اگر یہ شخص اتنا دولت مند ہے، اور اگر اس کا کام ہوجائے تو اس جعلی خانقاہ کو پختہ کروانے سے بھلا کسی کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر اس کے ذریعے شمسہ اور فیضان عالم کو کوئی فائدہ حاصل ہوجائے۔ اگر ان لوگوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی آجائے تو کیا یہ اس سے بہتر نہیں رہے گا بس یہ خیال دل میں پختہ ہوگیا یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شخص جمعرات تک یہیں قیام کرے گا، لوگوں نے اسے تفصیلات بتادی ہوں گی چنانچہ وقت باقی ہے اس سے ملاقات کرکے معاملات طے کئے جاسکتے ہیں، یہ احساس میں نے ابھی اپنے دل ہی میں رکھا تھا۔

عرضیاں نمٹ گئیں، کام ختم ہوگیا، میں اور اکرام باہر نکل آئے۔ اکرام نے کہا۔ ”شمسہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔“ میں ٹھٹھک گیا۔

”کیوں؟“

”کوئی وجہ نہیں ہے۔ خوش ہے، مطمئن ہے۔ کہہ رہی تھی کہ وہ دوسرے بھیا کبھی نہیں آئے، ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔“

”تم نے کیا کہا؟“

”میرے بجائے فیضان بول پڑا۔“

”کیا؟“

”اس نے کہا وہ درویش منش ہیں۔ یاد اللہ میں کھوئے رہتے ہیں انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”خاموش ہوگئی۔“

”یہی بہتر ہے۔“

”کب تک؟“ اکرام نے پوچھا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا کر سکتے ہیں؟"

"کچھ تو کرنا ہو گا۔ یہ جھوٹ کا گھر ہے کب کیا ہو جائے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کچھ نہ بھی ہو تو کیا اسے ہمیشہ یہاں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ بچے ہیں اس کے ان کا مستقبل ہے۔ اس طرح خانقاہ کی روٹیاں توڑ کر فیضان بھی نکما ہو جائے گا۔ ابھی لوہا گرم ہے۔ صحیح چوٹ لگ جائے تو صحیح شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جتنی دیر ہو گی اتنے ہی نقصان کا اندیشہ ہے۔"

"سوچنا پڑے گا۔"

"میں نے سوچا ہے۔"

"کیا؟"

"پہلے تم اس سے مل لو۔ ایک خوشی تو حاصل ہو اسے۔ نہ جانے کب سے خوشیوں سے محروم ہے اس کے بعد کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔"

"اس کے بعد یہ کبھی نہ کہنا۔ سمجھے اکرام۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اکرام مجھے دیکھنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" مجھے اس کے لہجے میں نرمی نہیں محسوس ہوئی تھی کچھ عجیب سا لہجہ تھا۔ دور سے میں نے سیاہ گاڑی والے صاحب کو دیکھا۔ ملازموں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

"وہ عزت بیگ ہیں؟"

"شاید۔"

"آؤ۔" میں نے کہا اور اکرام خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا۔ خانقاہ کی گہرائیوں میں انہوں نے ڈیرہ لگایا تھا۔ گاڑی بھی قریب کھڑی ہوئی تھی ہر طرح کا انتظام کر کے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"حضور اگر ہمارے دستر خوان کو رونق بخشیں تو نوازش ہو گی۔"

"شکریہ۔ کھانا کھا چکے بلکہ اب افسوس ہو رہا ہے کہ جلدی آ گئے آپ براہ کرم کھانا کھائیے۔"

"یقین کیجئے کھانا کھا چکا ہوں، میں ان لوگوں کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ آپ تشریف رکھیے۔ درویشوں کی چھت تقدیر والوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ہم بیٹھ گئے۔

"آپ کا اسم شریف؟" میں نے پوچھا۔

"خاکسار کو عزت بیگ کہتے ہیں۔"

"کتنے عرصہ سے آپ اس مشکل کا شکار ہیں۔"

"جی؟" مرزا صاحب چونک پڑے۔ اب وہ مجھے گھور رہے تھے۔ اکرام کے انداز میں ایک لمحے کے لئے بے چینی پیدا ہوئی تھی پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ یقیناً وہ میرے اس سوال پر حیران ہوا ہو گا کیونکہ یہ خلاف دستور بلکہ ایک طرح سے خطرناک تھا۔ مرزا صاحب بولے۔ "کوئی سات آٹھ ماہ ہو گئے۔"

"انہوں نے کوئی نقصان پہنچایا آپ کو؟" میں نے سوال کیا سارے نوکر کھانا ختم کر کے ہماری

طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

میں نے پھر پوچھا۔ "میرا مطلب ہے آپ کو ان کی موجودگی کا احساس کس طرح ہوا یا انہوں نے آپ کے اہل خاندان کو کوئی تکلیف پہنچائی جبکہ آپ ان کی وجہ سے حویلی چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے اور وہاں بیماریوں کا شکار ہو گئے اور پھر حویلی پہنچے تو بیماریاں ختم ہو گئیں لیکن اس کے باوجود آپ ان سے خوف زدہ ہیں اس خوف کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔" اچانک ہی مرزا عزت بیگ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

"سمجھ گیا حضور سمجھ گیا، مجھے میرا گوہر مقصود مل گیا۔ حضور میری مدد کر دیجئے۔ بڑی آس لیکر آیا ہوں آپ کے پاس آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا ہاں حویلی میں میری بیوی اور میرے بچوں کو طرح طرح سے ستایا جاتا ہے وہ خوف سے دیوانے ہو جاتے ہیں مختلف حرکات کرتے ہیں وہ اور میرے بچے دہشت سے سوکھتے جا رہے ہیں دو نوجوان بیٹیاں ہیں میری ایک بیٹا ہے بیوی ہے چاروں کے چاروں ان کی شرارتوں کا شکار رہتے ہیں عجیب و غریب شرارتیں ہوا کرتی ہیں میں خود بھی اپنے آپ کو لاکھ سنبھالے رکھوں مگر انسان ہوں جب ایسے بعید از عقل واقعات ہوں گے تو بھلا بہادری کیسے دکھا سکوں گا۔ حضور جب آپ نے اس قدر کرم فرمائی کی ہے تو میری مشکل کو دور فرمایئے گا آپ کا بے حد احسان ہو گا۔"

"عزت بیگ صاحب آپ کا یہ دھام پور نگینہ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟"

"حضور کوئی ایک سو بیس کوس ہے۔"

مجھے وہاں جانا ہو گا یہی حکم ملا ہے مجھے۔ میں نے کہا۔ اکرام نے ایک بار پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن اس طرح نہیں کہ کسی پر اظہار ہو جائے عزت بیگ صاحب نے گردن خم کر کے کہا۔

"بسروچشم بسروچشم اس کا مقصد ہے کہ میری تمنا پوری ہو گئی حضور آپ تشریف لے چلئے جو بھی خدمت ہو گی کروں گا جس طرح بھی حکم فرمائیں گے جان و مال سے حاضر ہوں آپ بس حکم کر دیجئے۔"

"ہاں عزت بیگ بہت کچھ قربان کرنا ہو گا آپ کو زندگی کا صدقہ مال ہے خاصے اخراجات کرنے پڑ جائیں گے آپ کو۔"

"بہت کچھ ہے میرے پاس بچوں ہی کے لئے ہے۔ اگر ان کی مشکل حل ہو جائے تو بھلا مال و دولت کی کیا فکر لیکن آپ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ آپ نے میری مشکل اپنی زبان سے ادا فرما دی۔ میرے دل کو یقین ہے کہ جیسے ہی آپ کے قدم مبارک وہاں پہنچیں گے شریر شیطان وہ جگہ چھوڑ بھاگیں گے بس اب میں آپ کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا حضور. آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"آج توقف فرمایئے کل ہم آپ کے ساتھ روانہ ہو جائیں گے۔ آپ مطمئن رہیں ہر طرح کے آسیبوں کو وہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔"

"مجھے تو گویا نئی زندگی عطا فرما رہے ہیں آپ، آہ جیسا سنا تھا ویسے ہی پایا اس عظیم جگہ کو حضور اب تو بیتاب ہوں کہ آپ کب میرے ساتھ چلیں ویسے حضور کا اسم شریف معلوم کر سکتا ہے۔"

"مسعود ہے میرا نام۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ میرے لئے ساعت مسعود ہے کہ مجھے اس طرح آپ کی قدم بوسی حاصل ہوئی۔ کب تشریف لے چلیں گے وقت بتا دیجئے؟"

"آج تو یہیں قیام فرمائیے جیسا کہ میں نے کہا کل دن کو دس بجے ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے آپ کے پاس انتظام تو ہے۔"

"یہ سب میرے دوست احباب ہیں یہ صاحب گاڑی چلاتے ہیں۔ یہ دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں آپ اطمینان فرمائیے گا۔ سفر میں آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے اب اجازت دیجئے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"حضور اگر کچھ ...."

"نہیں عزت بیگ صاحب اس وقت کوئی حاجت نہیں ہے آپ آرام کیجئے۔" میں واپسی کے لئے پلٹا اکرام بھی میرے ساتھ ساتھ چل پڑا تھا لیکن اس کی بے چینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اوپر پہنچتے ہی اس نے کہا۔

"تو آپ اس کے ساتھ جا رہے ہیں مسعود بھائی مگر آپ نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"جانا ہے اکرام مجھے اس کے ساتھ، ابھی تم نے شمسہ کے بارے میں مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں اس سے ملوں گا اکرام تو دل کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ کلیجہ پھٹ جائے گا اور اس کے بعد سارے کام ادھورے رہ جائیں گے وہ بہن ہے میری انسان ہوں خود پر قابو نہیں پا سکوں گا بھلا میں اس کے آنسو دیکھ کر کیسے یہ بات برداشت کر سکتا ہوں کہ ماں باپ کی تلاش کے بجائے کوئی اور کام کروں۔ تم خود سوچو اکرام کیا ہوگا سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ میں اس کے لئے آسائشیں حاصل کرنے کی کوشش کروں میں نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے اکرام۔ بہت نقصان کر لیا ہے میں نے اپنا اس کے نتیجے میں میری بہن کو ایک بہتر زندگی تو مل جائے تم نے دیکھا میں نے اس سے خرچ کی بات کی ہے یہ میں اپنی بہن کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہوں صرف محبتیں ضرورتیں نہیں پوری کر سکتیں کچھ نہ کچھ عملی طور پر بھی کرنا ہوگا۔" اکرام نے حیرت سے میری صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے مسعود بھائی کہ آپ عزت بیگ کا کام کر کے جو کچھ حاصل کریں گے وہ شمسہ کے لئے ہوگا؟"

"ہاں" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا دل میں ایک اداس سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی میں جو کچھ کر رہا تھا اس کے نتائج مجھے معلوم تھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ عزت بیگ کے گھر میں جو شیطانی قوتیں رہائش پذیر ہیں ان کے خلاف میں کوئی مؤثر عمل کر بھی سکوں گا یا نہیں پہلے کی بات اور تھی رہنمائی ہوتی تھی اور اقدامات کئے جاتے تھے لیکن اب تنہا بھگت رہا تھا سب کچھ نہیں سمجھتا تھا میری پہنچ کہاں تک ہو سکتی ہے؟

اکرام نے البتہ مطمئن لہجے میں کہا "آپ یقین کیجئے آپ نے میرے دل میں بغاوت پیدا کر دی تھی مسعود بھائی میں سوچنے لگا تھا کہ شاید میں آئندہ آپ کا ساتھ نہ دے سکوں شمسہ بہن کو میری ضرورت ہے لیکن آپ نے مجھے مشکل سے نکال لیا اب میں بے حد پرسکون ہوں آپ تنہا ہی جائیں گے یا مجھے ساتھ چلنا ہوگا؟"

"نہیں بھلا تمہارا ساتھ کس طرح ممکن ہے۔ یہاں شمسہ فیضان اور بچے تنہا رہ جائیں گے ہاں ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں اکرام وہ یہ کہ ان سب کا پورا پورا خیال رکھنا ہو سکتا ہے مجھے کچھ زیادہ وقت لگ جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے، ایک بات اور تمہارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں بھوریا چرن کے آثار یہاں ملے ہیں لیکن اتنے عرصے میں نہ تو اس نے کچھ کیا اور نہ ہی کہیں دوبارہ کسی مکڑی کا وجود ظاہر ہوا میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خانقاہ جعلی ہے اس لئے بھوریا چرن جیسی ناپاک روحیں یہاں آسکتی ہیں تمہیں اس کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔"

اکرام نے سنسنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا، میں مرزا عزت بیگ کے ساتھ جانے کے منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا، نجانے کیسے کیسے وسوسے، نجانے کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں جاگزیں تھے، لیکن یہ فیصلہ اٹل تھا کہ مجھے عزت بیگ کے ساتھ دھام پور نگینہ جانا ہے۔ اور بالآخر دوسرے دن میں عزت بیگ کے ساتھ چل پڑا، وہ بڑے احترام کے ساتھ مجھے اپنی قیمتی گاڑی میں بٹھا کر لے چلا۔ راستے طویل تھے لیکن خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ اچھا خاصا شہر تھا۔ شام کے کوئی ساڑھے چار بجے تھے جب ہم مرزا عزت بیگ کی حویلی میں داخل ہوئے۔ وسیع و عریض عمارت تھی لیکن بڑے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ اس کی ویرانی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ یہاں غیر انسانی مخلوق کا قبضہ ہے۔ احاطے میں بے شمار درخت تھے لیکن ان کے پتے سوکھے ہوئے تھے۔ گھاس کے لان تھے لیکن پیلی اور جلی ہوئی گھاس کے، حویلی کا بیرونی حصہ بھی بدنما تھا۔ سامنے ایک اور کار کھڑی نظر آ رہی تھی۔ کار کی آواز سن کر ایک ملازم اندر سے نکل آیا۔ کار رکتے ہی ڈرائیور اور دوسرے ملازم آ گئے۔ عزت بیگ نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے ایک نگاہ پھر حویلی کے بیرونی حصے پر ڈالی۔

"آپ کے ہاں کتنے ملازم ہیں مرزا صاحب۔"

"کافی ہیں۔ میرا مطلب ہے چھ سات مرد اور چار پانچ خواتین۔ ہر ایک کے سپرد مختلف ذمے داریاں ہیں۔"

"مالی نہیں ہے۔"

"ہے۔ شاید آپ یہ اجڑے ہوئے درخت اور سوکھی ہوئی گھاس دیکھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔"

"جی!"

"کچھ عرصہ قبل یہ درخت سرسبز تھے، یہ گھاس آنکھوں کو بہار دیتی تھی۔ لیکن سات آٹھ ماہ سے اس پر بھی خزاں آ گئی۔ درخت سوکھ گئے۔ گھاس جھلس گئی حالانکہ مالی نے اس پر جان توڑ کوشش

کی۔"

"یہ سلسلہ کتنے عرصہ قبل شروع ہوا ہے۔"

"آپ اسے دس ماہ کے عرصے کی بات سمجھ لیں، تشریف لائیے، آپ عمارت کا یہ بیرونی حصہ دیکھ رہے ہیں؟"

"جی!"

"اس پر کوئی تین ماہ قبل رنگ کرایا ہے میں نے، تین ماہ میں یہ پھر ایسا ہو گیا ہے۔"

"اور اندر کی کیا کیفیت ہے؟"

"تشریف لائیے۔" مرزا صاحب نے کہا اور میں صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ مگر بڑے ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ انتہائی نرم سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ وکٹورین طرز کے قدیم اسٹائل کے مگر بالکل نئے جیسے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پردے لٹکے ہوئے تھے۔ رنگ و روغن بالکل درست تھا۔

"گویا اندر کا ماحول ٹھیک ہے؟"

"آپ خود دیکھ لیجئے۔ یہ بیرونی حصہ ہے۔ اندر سے تمام حویلی بالکل درست ہے۔ شاہ بابا آپ اندر تشریف لے چلئے۔ بے شمار آراستہ کمرے ہیں یہاں آپ جہاں پسند کریں قیام کریں۔"

"کوئی بھی جگہ دے دیجئے۔ چند روز کا قیام ہے۔ اس میں کیا تکلف؟" میں نے جواب دیا بڑے ہال کے دروازے کے دوسری طرف ایک چوڑی راہداری تھی جس میں دو رویہ کمروں کی قطار تھی۔ میں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ مرزا صاحب نے خود دروازہ کھولا تھا۔ نہایت نفیس خواب گاہ تھی۔ تمام ضروریات سے آراستہ۔ "یہ کسی کے استعمال میں ہے؟"

"قطعی نہیں۔ خاصے کمرے ہیں اس حویلی میں۔ پانچ میں ملازم رہتے ہیں۔ دو میں ہم، باقی خالی ہیں۔"

"بہت بہتر، جائزہ لے لیجئے کسی شے کی کمی ہو تو فرما دیجئے گا۔"

"ملازم بھی اندر ہی رہتے ہیں؟" میں نے کمرے میں داخل ہو کر سوال کیا۔

"کیا بتائیں شاہ صاحب۔ سارا نظام ہی الٹ پلٹ گیا ہے۔ ملازموں کی رہائش گاہیں عقبی حصے میں ہیں لیکن ہم نے ان سے ساتھ ہی رہنے کی درخواست کی ہے۔ یہ لوگ ہمارے سب سے وفادار ساتھی ہیں یوں سمجھ لیں پشتینی پہلے ملازموں کی تعداد زیادہ تھی لیکن جو نئے تھے وہ سب بھاگ گئے۔"

"خوفزدہ ہو کر؟"

"جی ہاں۔ ہم سب نے اپنے کمرے برابر، برابر رکھے ہیں اور سب ایک دوسرے کی خبر گیری رکھتے ہیں۔"

"جی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ زندگی گزار رہے ہیں ہم لوگ۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اچھا شاہ صاحب سفر کی تھکن

ہو گئی ہوگی۔ آرام کیجئے گا۔ چائے کس وقت پئیں گے۔"

"ایک گھنٹے کے بعد بھجوا دیجئے گا۔"

"مناسب، اجازت۔ ذرا اہل خانہ کو آپ کی آمد کی خوشخبری سنا دوں۔" مرزا صاحب باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ انتہائی موٹے گدے کی مسہری تھی۔ دیوار پر تصویر لگی ہوئی تھی۔ جس میں ایک معمر شخص تلوار لئے کھڑا ہوا تھا۔ ایک گوشے میں مصنوعی درخت رکھا تھا جس میں شاخیں نکلی ہوئی تھیں اور ان شاخوں پر خوش رنگ مصنوعی پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ غرض نفیس ماحول تھا۔ دروازے کے عقب میں ایک کھڑکی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن میں بے شمار خیالات آنے لگے۔ اس بار میں لالچ کے تحت یہاں آیا ہوں۔ ماحول کا جائزہ ظاہر کر رہا ہے کہ بات کافی ٹیڑھی ہے۔ کامیاب ہو سکوں گا یا نہیں۔ میرے یہاں رہنے کا انداز وہی تھا جس طرح جادو ٹونوں کے عامل کاروباری دوروں پر نکلتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

دیر تک سوچوں میں گم رہا۔ پھر کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ اور چٹخنی کھول دی۔ کھڑکی کا پٹ کھولا ہی تھا کہ عقب سے شی شی کی آواز ابھری۔ پھر جملہ سنائی دیا۔

"اے اے۔ ہش ہش۔ کھڑکی مت کھولو۔ پرندے اڑ جائیں گے۔" میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ کوئی موجود نہیں تھا، دروازہ بند تھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ ابھی اسی تجسس میں تھا کہ اچانک پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اور میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر دیکھا مصنوعی درخت کے نقلی پرندے تمام شاخوں سے پھڑپھڑا کے بلند ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے کھڑکی کی سیدھ اختیار کی اور ایک دوسرے کے پیچھے کھلی کھڑکی سے باہر نکل گئے۔ ابھی حیرت سے منہ کھولے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا کہ تلوار بردار بوڑھے شخص کی تصویر کے فریم سے پیچ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ فریم خالی ہو گیا تھا اور اس میں نظر آنے والا بوڑھا تلوار سمیت نیچے کھڑا تھا۔

"منع کیا تھا کہ کھڑکی مت کھولو، اڑا دیئے سارے پرندے۔ اب مشکل سے ہاتھ آئیں گے۔" اس کی منمناتی آواز سنائی دی۔ اور دوسرے لمحے اس نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر وہ لمبی لمبی چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ نگاہوں کے سامنے خالی درخت خالی فریم اور کھلی کھڑکی تھی۔ چند لمحات حیران کھڑا رہا۔ پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر خاموش اور سنسان رات پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر کھڑکی بند کر دی۔ یہ عمل کسی انسان کے دل کی حرکت بند کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے نتیجے میں دیکھنے والے کی حالت خراب ہو سکتی تھی لیکن میری نہیں۔ یہ سب کچھ میرے لئے ایک لمحے کی حیرت تو بن سکتا تھا۔ خوف نہیں۔ چنانچہ میں واپس آ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ مرزا عزت بیگ

کی بات کا یقین تو حویلی میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ تصدیق اب ہو گئی تھی۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ مجھے ان ناپاک روحوں کے خلاف کیا عمل کرنا چاہئے۔ ذہن پر ایک طرح کا جنون سوار تھا۔ یہ احساس بھی تھا کہ میں زیر عتاب نہ سہی کم از کم ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے اس حویلی میں کامیابی حاصل نہ ہو لیکن اس کے باوجود میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ دل میں ایک سکون تھا۔ ایک فریاد تھی جو نہ الفاظ بن سکتی تھی نہ جامع سوچ بس ایک رویا رویا سا احساس تھا جیسے کسی اپنے نے بے اعتنائی کی ہو۔ جیسے کسی من چاہے نے ناکردہ گناہ کی سزا دی ہو۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر مسہری پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جو کچھ ہو چکا تھا وہ کچھ نہیں تھا میرے لئے۔ میں بھلا اس سے کیا خوفزدہ ہوتا۔ بند آنکھوں میں نیند نے بسیرا کر لیا۔ شاید سفر کی تھکن نے نڈھال کر دیا تھا پھر دروازے پر دستک ہوئی اور میں چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کون ہے، آجاؤ۔" ملازم چائے لایا تھا۔ اس نے برتن میرے سامنے رکھ دیئے۔

"مرزا صاحب کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کون مرزا؟" ملازم حیرت سے بولا۔

"مرزا عزت بیگ؟" میں نے اس سے زیادہ حیرت سے کہا۔

"کون مرزا عزت بیگ۔" ملازم نے اسی انداز میں کہا اور میں چونک پڑا۔ میں نے غور کر اسے دیکھا تو اچانک ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ ملازم کی صورت جانی پہچانی تھی۔ وہ نادر حسین کی ہو بہو تصویر تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"نن۔ نادر حسین۔ تم......"

"کون نادر حسین۔ نہ جانے کس کس کا نام لے رہے ہو۔ بات ہی الٹی ہو رہی ہے ہم تو چلے......!" ملازم دروازے کی طرف بڑھا تو میں اس کی طرف لپکا۔

"سنو تو نادر حسین۔ سنو تو۔" مگر ملازم نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں برق رفتاری سے دروازے سے باہر نکلا اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ تاحد نگاہ خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کچھ دیر حیران کھڑا رہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر واپس اندر آ گیا۔ بہت عجیب، بہت پر اسرار واقعات تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ نادر حسین ہی تھا۔ آواز تک وہی تھی۔ اب احساس ہو رہا تھا مگر بالکل بدلا ہوا۔ پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ چائے کے برتنوں پر نظر ڈالی تو پھر ششدر رہ گیا۔ چائے دانی، شکر دانی اور دودھ کا برتن تھا۔ لیکن چائے نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ البتہ برتنوں کے درمیان ایک چمکدار خنجر رکھا ہوا تھا۔ کوئی دس انچ کا پھل تھا اس کا اور اس پر نہایت خوبصورتی سے درود پاک کندہ کیا گیا تھا۔ دل کو ایک دھکا سا لگا۔ ہاتھ بے اختیار آگے بڑھے۔ اور بڑی عقیدت سے وہ خنجر میں نے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ درود پاک پڑھا۔ دل روشن ہو گیا۔ ایک دم سے سارے بوجھ دل سے ہٹ گئے۔ سب کچھ غلط ہو سکتا ہے ہر چیز فریب ہو سکتی ہے لیکن یہ کسی طور دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اچانک تنہائی دور ہو گئی۔ اچانک بے کسی کا احساس ختم ہو گیا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ اور میں نے جلدی سے اس

متاع بے بہا کو سینے کے قریب چھپا لیا۔

"آ سکتا ہوں۔" دروازے سے عزت بیگ کی آواز سنائی دی۔

"تشریف لائیے!"

"نور چشمی قدسیہ بانو بھی ساتھ ہیں۔ آؤ بیٹی......!" ایک پیکر شباب اندر آ گئی۔ سادہ لباس مگر حسن سادہ بھی نہایت پر کار...... "قدسیہ نام ہے اس کا...... بڑی بیٹی ہے میری شاہ بابا۔ آپ کے قدموں میں آئی ہے۔" عزت بیگ نے کہا۔ پھر چائے کے برتنوں کو دیکھ کر بولے۔ "چائے پی لی کیا۔ مگر وہ احمق تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا......!"

"کون؟" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ نگاہ قدسیہ پر پڑی۔ وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"شرفو ہے اس کا نام۔ کہہ رہا تھا کہ چائے لے کر جا رہا تھا کہ کسی نے برتن ہاتھ سے چھین لئے۔ ابھی ابھی تو خبر دی ہے اس نے ادھر ہی آ رہا تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہا تھا۔ برتن آئے تو ہیں مگر چائے سے خالی ہیں۔" میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دیکھ لیا آپ نے یہ ہوتا ہے یہاں دن رات اور تو کوئی واقعہ نہیں پیش آیا؟" مرزا صاحب نے کہا۔

"کوئی خاص نہیں۔ بس اس پیڑ کے پرندے اڑ گئے۔ اس فریم میں جو تھا وہ ان پرندوں کو پکڑنے نکل گیا۔" میں نے کہا اور مرزا عزت بیگ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"چلئے اچھا ہوا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہی ہوتا ہے ان بچوں کے ساتھ۔ آپ تو دل کے مضبوط ہیں۔ ایسے واقعات بہت دیکھے ہوں گے آپ نے مگر یہ بچے۔ یہ تو ڈرتے ہی ہیں۔ کیوں قدسیہ......" مرزا صاحب نے بیٹی کی طرف دیکھا اور میری نظر دوبارہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز صرف مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس کا چہرہ۔ اس کا چہرہ بھی جانا پہچانا لگا۔ کہاں دیکھا ہے یہ چہرہ۔ پھر مجھے وہ پورنیاں یاد آ گئیں جو بھوریا چرن کے ایک عمل کے تحت مجھ پر مسلط ہو گئی تھیں۔ یہ چہرہ ان جیسا تھا۔ میں چونک سا پڑا تھا۔

"میں خود چائے لے کر آتا ہوں۔" مرزا عزت بیگ اپنی جگہ سے اٹھے تو میں نے انہیں روک دیا۔

"نہیں مرزا صاحب۔ اب ضرورت نہیں محسوس ہو رہی۔"

"شاہ صاحب۔ ناراض ہو گئے ہیں کیا۔"

"ارے بالکل نہیں۔ اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ آپ نے چند لمحے یہاں گزارے ہیں مجھے دیکھئے۔ مسلسل ان حالات

سے گزر رہا ہوں۔ میری بیوی، میری بچیاں ہر لمحہ خوف کا شکار رہتی ہیں۔ میں یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ زندگی مسلسل عذاب بن کر گزر رہی ہے۔" مرزا عزت بیگ کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ اٹھ گیا۔

"چائے لاتا ہوں" اب میں اسے نہیں روک سکا تھا۔ وہ باہر نکل گیا۔ اس کی بیٹی بیٹھی رہ گئی تھی۔ میری نگاہ اس پر پڑی تو وہ پہلے کی مانند مجھے دیکھ رہی تھی۔

"آپ لوگ، بہت خوفزدہ رہتے ہیں اس گھر سے؟"

"نہیں تو......" وہ جیسے میرے سوال کی منتظر تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا۔

"مطلب...... مطلب تو کچھ بھی نہیں۔" اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ "مگر آپ کے والد تو یہی کہہ رہے تھے آپ کے سامنے......!"

"والد...... کون والد؟" اس نے پھر اسی انداز میں کہا اور میں بوکھلا گیا۔

"مرزا صاحب کی بات کر رہا ہوں۔"

"اپنی بات نہیں کرو گے۔" وہ دلآویز انداز میں بولی۔

"آپ کا مطلب کیا ہے قدسیہ؟"

"قدسیہ، کون قدسیہ۔ سنو، ایک بات بتاؤں تمہیں۔ میرا کمرہ اس کمرے کی آخری قطار کے دوسری طرف ہے۔ تمہیں اس سے سرخ روشنی جلتی نظر آئے گی۔ جب رات ڈھلے، جب چاند آدھے آسمان پر آجائے تم میرے پاس آجانا۔ باٹ تکوں گی۔ دروازہ کھلا رکھوں گی...... آنا ضرور......" وہ اٹھ گئی۔ میں اسے نہ روک سکا تھا۔ دروازے پر رک کر اس نے گردن گھمائی مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ روشنی چمک رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی یہ مسکراہٹ ہوش چھین لینے والی تھی۔ پھر وہ باہر نکل گئی۔

میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگا تھا۔ نہ جانے کیوں اس میں مایوسی کا احساس بیدار ہونے لگا تھا۔ میں دولت کے لالچ میں عزت بیگ کے ساتھ آ گیا تھا۔ یہ سوچ کر آگیا تھا کہ اگر اس کا کام ہو جائے تو جو کچھ اس سے ملے گا اسے شمسہ کے حوالے کر دوں گا۔ فیضان اس سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور میرے دل کو یہ سکون ہو جائے گا کہ میری بہن اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن...... یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا، جو میں چاہتا ہوں۔ گناہ بے لذت سا ہوتا جا رہا تھا، حالانکہ مرزا عزت بیگ بتا چکا تھا کہ آسیب یہاں ہنگامہ آرائیاں کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ ان کے تابع ہے، مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا، اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن بس مایوسی کا ایک احساس خود بخود میرے دل میں پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد عزت بیگ واپس آگیا۔ چائے کے برتن وہ اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے وہ برتن میرے سامنے رکھے اور پھر ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔ "ارے یہ قدسیہ کہاں چلی گئی؟"

"پتہ نہیں، بس اٹھ کر چلی گئیں۔" میں نے کہا۔ مرزا عزت بیگ نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

"وہ سب آسیب زدہ ہیں، یہ گھر مکمل طور پر آسیب زدہ ہے، ہم یہاں سے کہیں جاتے ہیں تو بیماریاں شروع ہو جاتی ہیں جسمانی طور پر ہم اسی گھر میں تندرست رہتے ہیں لیکن ذہنی طور پر۔ آپ کو خود اندازہ ہو گیا ہو گا شاہ صاحب، سب کی یہی کیفیت ہے اور میرا دماغ چٹختا رہتا ہے، آپ چائے پیجئے۔"

"نہیں مرزا صاحب آپ یقین کیجئے بالکل حاجت نہیں ہے میں تو منع کر رہا تھا آپ کو۔ آپ نے خود ہی زحمت کر ڈالی۔ بہرحال مرزا صاحب میں اس پورے گھر کا جائزہ لوں گا، رات ہو چکی ہے آپ اپنے مشاغل جاری رکھئے۔ آپ کے اہل خاندان سے بھی ملاقات کروں گا اور ان سے بھی جو یہاں آپ کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔"

"شاہ صاحب بات اتنی ہی نہیں ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ چند انسانی زندگیاں اس وقت آپ کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ کی کاوشیں انہیں نئی زندگی سے روشناس کرا سکتی ہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نیم جان ہو گئے ہیں۔ آپ چائے پی لیتے تو اچھا تھا۔ حالانکہ وقت واقعی کافی ہو گیا ہے رات کے کھانے میں بھی دیر نہیں رہ گئی۔ شاہ صاحب آپ یہ فرمائیے کب سے کام شروع کریں گے؟"

"آج ہی رات سے مرزا صاحب.........."

"میرے لائق خدمت بتائیے؟"

"نہیں آپ اپنے کمروں میں محدود ہو جائیں، ہاں ذرا ملازمین کو بھی ہدایت کر دیجئے گا کہ میری کارروائیوں میں روک ٹوک نہ کریں۔"

"کہاں شاہ صاحب، بس رات کا کھانا تو جلدی کھا لیا جاتا ہے ہمارے ہاں اور اس کے بعد یہ بے چارے بچے کھچے ملازم جو بس روایتی طور پر اپنی وفاداریاں نبھا رہے ہیں اپنے اپنے کمروں میں جا گھسیں گے۔ سب ہی خوفزدہ ہیں۔ میں نے انہیں نجانے کن کن الفاظ میں تسلیاں دی ہیں اور کہا ہے کہ یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ آپ اطمینان سے اپنا کام کیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے آپ مطمئن رہیں۔"

مرزا عزت بیگ خود ہی چائے کے برتن لے کر چلا گیا تھا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر گہری سوچوں میں گم ہو گیا تھا، بہت دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا اور اس کے بعد ذہن اس خنجر کی جانب متوجہ ہو گیا جو میرے لباس میں محفوظ تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر خنجر اپنے لباس سے نکالا اور اس پر کندہ درود پاک کا جائزہ لینے لگا بہت حسین خنجر تھا اور اس کے بارے میں ایک لمحہ بھی یہ سوچنا کہ اس میں کوئی ایسی ویسی بات ہے میرے لئے گناہ عظیم تھا۔ درود پاک اس کا مکمل ضامن تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور ضمانت مجھے جیتے جی درکار نہیں تھی۔ پہلے دل کی جو کیفیت تھی اب نہیں رہی تھی۔ اب تو بڑا اعتماد ہو گیا تھا

اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ مقصد جو میرے دل میں ہے پورا ہو یا نہ ہو، لیکن کم از کم یہاں میری زبردست معرکہ آرائی رہے گی اور اس کا نتیجہ بہتر ہی نکلے گا۔

پھر خوب رات ہوگئی۔ وقت کا صحیح اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چونک کر دیکھا۔ مرزا عزت بیگ ایک ملازم کے ساتھ آیا تھا۔ ملازم نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی اور مرزا صاحب ہاتھوں میں پانی کا جگ اور گلاس لئے ہوئے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کیوں زحمت کر رہے ہیں مرزا صاحب............؟"

"رہنے دیجئے شاہ صاحب، شرمندگی کی آخری حد کو پہنچا ہوا ہوں، اگر اس گھر کا ماحول اتنا غیر یقینی نہ ہوتا تو کیا ایک معزز مہمان کے ساتھ یکجا بیٹھ کر کھانا نہ کھایا جاتا مگر کیا کروں، میرے بس کی بات ہی نہیں ہے، براہ کرم جو دال دلیہ مہیا کر سکا ہوں حاضر خدمت ہے قبول فرمایئے میں شکر گزار ہوں گا......"

"بہتر ہے رکھ دیجئے......" ملازم نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ مرزا صاحب بولے۔

"تو پھر اجازت میں چلتا ہوں۔ ہاں اگر کسی اور شے کی حاجت ہو تو براہ کرام باہر تشریف لا کر کسی کو آواز دے لیجئے گا۔ اچھا......" مرزا صاحب نے ملازم کو اشارہ کیا اور باہر نکل گئے۔ میں نے ایک نظر اس خوان پر ڈالی جس پر خوان پوش ڈھکا ہوا تھا جگ کے پانی سے ہاتھ دھوئے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بھوک تو لگ رہی تھی، کھانا بھی کھانا تھا، چنانچہ خوان سے خوان پوش ہٹایا۔ بہت عمدہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس قاب سے جس میں سالن تھا۔ برابر میں تین خمیری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں سلاد بھی تھا، سادہ کھانا فیرنی کے دو پیالوں کے ساتھ ٹرے میں سجا ہوا تھا، ساتھ ہی پلیٹ اور چمچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے سامنے بیٹھ کر بسم اللہ پڑھی اور قاب کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ بھنا ہوا گوشت تھا۔ خاصی مقدار میں تھا لیکن ابھی میں چمچہ ہاتھ میں لے کر سالن نکالنے ہی والا تھا کہ بوٹیوں میں ہلچل سی محسوس ہوئی اور میرا ہاتھ رک گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سالن کے اس قاب کو دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بوٹیوں کے نیچے سے کوئی شے پھڑپھڑا کر اوپر آنا چاہتی ہو...... اور پھر میں نے بحالت ہوش میں آلو کے سر کو سالن میں سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ بار بار پھڑپھڑا رہا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دوسرے لمحے اُلو کا یہ سر قاب سے پھدک کر ٹرے میں آگرا اور اس کے بعد ٹرے سے نیچے زمین پر۔ اس کے ساتھ چھینٹیں سی بلند ہو رہی تھیں اور یہ چھینٹیں دھبے لگاتی ہوئی ایک سمت کو جا رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی اُلو کا یہ سر کئی فٹ اونچا بلند ہوا اور اس کھلی کھڑکی سے باہر نکل گیا جس سے پرندے اور تصویر والا آدمی باہر نکل بھاگا تھا...... میں پہلے ہی کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور یہ منظر عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سر کے غائب ہو جانے کے بعد سکون چھا گیا۔ سالن کی لذیذ ترین خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا. یہ رمز میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا وہی آسیب وہی انداز...... اس حویلی کے مکینوں نے میرا زبردست استقبال کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد تو اور بھی لطف آگیا تھا۔ بھلا اب اس بات کی کیا گنجائش تھی کہ میں ایک لقمہ بھی توڑ

سکوں۔ مرزا عزت بیگ کو اگر آواز دے کر اس بارے میں بتاتا تو وہ بے چارہ کیا کرتا۔ سوائے اپنے دکھوں کا رونا رونے کے لیکن یہ ساری چیزیں واقعی قابل غور تھیں اور اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں سے عمل کرنا چاہئے۔ بھوک بے شک لگ رہی تھی لیکن اب اس واقعہ کے بعد وہ کافی حد تک کم ہوگئی تھی اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کھائے پئے بغیر گزار سکتا ہوں۔ کام شروع کر دینا چاہئے، مرزا عزت بیگ کو اس سلسلے میں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قاب کا ڈھکنا واپس اس کی جگہ پر رکھا اور خوان پوش اس پر ڈال دیا۔ ٹرے اسی جگہ رہنے دی تھی اور میں اس سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا تھا۔ اس واقعہ کو بھی میں نے ان واقعات سے ہی منسلک سمجھا تھا جو یہاں چند گھنٹے قیام کے دوران پیش آ چکے تھے۔ پے در پے شرارتیں ہو رہی تھیں اور ان شرارتوں میں بڑی ہیبت ناک کیفیت تھی لیکن میرے لئے نہیں۔

کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ مرزا عزت بیگ اب دوبارہ میرے پاس آئے گا یا جیسا کہ اس نے مجھے بتایا وہ بھی دوسرے لوگوں کی مانند اپنی خوابگاہ میں جا چھپے گا۔ درحقیقت اس بھیانک ماحول میں جہاں اتنی سی دیر میں اتنے سارے محیر العقول واقعات پیش آ چکے تھے ذہنی توازن برقرار رکھنا ایک مشکل کام تھا بڑی بات تھی کہ وہ لوگ ہوش و حواس کے عالم میں یہاں رہ رہے تھے۔ بہت دیر گزر گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کھلی کھڑکی بند کی اور پھر دروازے سے باہر نکل آیا۔ حویلی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی۔ کہیں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی سناٹے چیخ رہے تھے، دل کی دھمک کنپٹیوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ پیچ در پیچ راہداریوں اور کمروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، بند دروازوں کی قطاریں مدھم روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ میں ان کے درمیان کسی آوارہ روح کی مانند بھٹکنے لگا۔ اُدھر سے اِدھر، اُدھر سے اِدھر کسی بھی کمرے میں روشنی نہیں جل رہی تھی۔ غالباً مرزا عزت بیگ کے اہل خاندان بھی روشنی بجھا کر سونے کے عادی تھے۔ واقعی اس ماحول میں کیا بیت رہی ہوگی ان پر، زندگی یہیں گزار رہے تھے۔ یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ عام دل گردے والوں کا کام نہیں تھا۔ یہ لوگ اگر اس ماحول کے عادی نہ ہوگئے ہوتے تو کلیجہ پھٹ جاتا ان کا یہاں رہ کر، لیکن انسان میں یہی تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ وقت سے لڑنا سیکھ لیتا ہے اور حالات کیسے ہی بھیانک کیوں نہ ہوں بالآخر اسے ان میں گزارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کوئی پندرہ سے لے کر بیس منٹ تک میں اس حویلی کے مختلف گوشوں میں چکراتا رہا، ہر لمحہ اس بات کا منتظر تھا کہ اب کچھ ہوگا لیکن کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر میری یہ توقع بھی پوری ہوگئی۔ اچانک ہی میرے عقب میں ایک کمرہ روشن ہوا اور ساتھ ہی سناٹے میں دروازہ کھلنے کی آواز کسی بم کے دھماکے ہی کی مانند محسوس ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا...... دروازے سے روشنی باہر پھوٹ آئی تھی اور اس روشنی میں ایک سایہ ابھر رہا تھا۔ پھر وہ سایہ باہر نکل آیا۔ مرزا عزت بیگ تھا، دروازے ہی میں رک کر وہ مجھے دیکھنے لگا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"اندر آ جایئے شاہ صاحب یہ میرا کمرہ ہے، غالباً آپ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔" میں خاموشی

سے واپس پلٹا اور مرزا عزت بیگ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دروازے سے واپس اندر داخل ہو گیا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو عزت بیگ نے جلدی سے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور اس سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں ننگا فرش تھا، کوئی ایسی چیز نہیں تھی وہاں جو کسی کے بیٹھنے یا آرام کرنے کے لئے ہو، دیواریں بھدی اور بغیر پلاستر کی تھیں، فرش کا پلاستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے متحیرانہ نگاہوں سے عزت بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کا کمرہ ہے مرزا صاحب؟"

"آپ ہی کا ہے مہاراج،" مرزا عزت بیگ کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور پھر میں چونک پڑا۔

"مم...... مہاراج......"

"پدم پردھائی مہاراج، گیانی دیانی آکاش کے رہنے والے۔" مرزا عزت بیگ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"مرزا صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا اور مرزا کے حلق سے ایک بھیانک قہقہہ نکل گیا۔

"اب بالکل ٹھیک ہے مہاراج پران پردھانی۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کہہ نہیں رہے مہاراج سمجھا رہے ہیں آپ کو، حویلی کے بھوت پکڑنے نکلے ہیں۔ مہان پران پردھانی، کیوں یہی بات ہے ناں؟" میں سہمی ہوئی سی نگاہوں سے مرزا عزت بیگ کو دیکھنے لگا، ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا تھا اور مرزا عزت بیگ نے دوبارہ قہقہہ لگایا تھا۔

"بہت چالاک ہیں آپ مہاراج، بہت بڑے دیوتا ہیں، مہان ہیں، مگر شری شنکھا کے سامنے آ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ مہان شنکھا اگر کھنڈولا بن جاتا تو آپ کا کیا جاتا مہاراج، آپ کی چالاکی اسے جگہ جگہ روکتی رہی ہے اور آپ نے اسے اپنا اتنا بڑا دشمن بنا لیا ہے، حالانکہ شری شنکھا کے داس جیون میں مزے ہی مزے کرتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کیسے انسان ہیں، ایک لکیر پکڑے بیٹھے ہوئے ہیں جس نے آپ کو کچھ نہیں دیا، پری پردھان پرن تھاری مہاراج۔"

"تت...... تم، تم کون ہو......؟" میں نے اب عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"شری شنکھا کا داس، ان کا معمولی سا سیوک۔"

"تم عزت بیگ نہیں ہو؟"

"جو عزت ہمیں چاہئے مہاراج، وہ شری شنکھا کا داس بننے سے حاصل ہو گئی ہے اور کوئی عزت درکار نہیں ہے ہمیں، پرنت آپ کی کم بختی آ گئی، جھوٹی خانقاہ میں رہ کر آپ نے جو جال پھیلا لیا تھا مہاراج آپ کے خیال میں شری شنکھا اس سے بے خبر رہ سکتے تھے، آپ...... اپنے دین دھرم کے ساتھ جو ناٹک رچائے ہوئے تھے وہ صرف ناٹک تھے اور شری شنکھا کا پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کھوج تو ہوتی ہی ہے ناں دو دشمنوں کو ایک دوسرے کی اور شری شنکھا جی آپ کی کھوج میں بھی

تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اب آپ نے ناٹک رچایا ہے اور لوگوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر دولت بٹور رہے ہیں تو شری شنکھا کو موقع مل گیا، پہنچ گئے وہ آپ کی اس جھوٹی خانقاہ میں اور وہاں پہنچ کر آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ پتہ چلا کہ مہاراج کو دولت چاہئے دولت۔ سو انہوں نے ہمیں عزت بیگ بنا کر بھیج دیا۔ آپ کی عزت لوٹنے کو مہاراج اور ہمارا کام تو یہ تھا ہی کہ آپ کو دھوکے سے ادھر لے آئیں۔ سو لے آئے ہم اور اب تو شری شنکھا کو موقع ملا ہے آپ سے سارے حساب کتاب چکانے کا مہاراج کیا سمجھے، اب تو ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی، ہم شری شنکھا کے داس ہیں جے شری شنکھا ......"

"ہوں، تو ناٹک رچایا ہے اس بار بھوریا چرن نے۔" میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"پکا ناٹک مہاراج پکا ناٹک، دراصل یہ دھن دولت سسری چیز ہی ایسی ہے کہ آدمی کو پھیر میں لاتی ہی رہتی ہے۔ آپ نے بہت بچنا چاہا اس سے مہاراج مگر دیکھ لیجئے دھن کے لالچ نے آپ کو نہیں چھوڑا اور اسی کے ہاتھوں مارے گئے آپ، ارے ہم نے تو سنا ہے کہ شری شنکھا نے آپ کو سب کچھ دے دیا تھا۔ پورنیاں دے دی تھیں آپ کو، پورنیوں کو آپ سے بڑی شکایت تھی مہاراج، بڑا انیائے کیا آپ نے ان کے ساتھ، ایک پورنی آپ کے سامنے آئی تھی، آپ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا مہاراج، خیر یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے، اب یہ بتائیے کہ ہم آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں؟"

اس بار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، میں نے اس سے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اب تو میں تمہیں عزت بیگ کے نام سے بھی مخاطب نہیں کر سکتا تو پھر تمہارا کیا خیال ہے شنکھا کے داس بھوریا چرن کو کیا اب کوئی ایسی قوت حاصل ہو گئی ہے میرے خلاف جس سے وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر سکے۔"

"اوش مہاراج اوش، اصل میں شری شنکھا مہاراج کو تو بہت ساری قوتیں ہمیں سے حاصل تھیں، پر آپ بچتے رہے ان سے اپنے دین دھرم کے ہاتھوں، سنا ہے شنکھا مہاراج نے آپ کا گیان دیان بھی پورا کر دیا تھا اور پورن بن گئے تھے آپ، پورنا بن کر آپ نے پورنیوں کو دھوکا دیا اور ان کے جال سے اپنے آپ کو نکال لیا۔ پر مہاراج اس سمے آپ نے جو بھوجن کھایا ہے ناں، وہ ہمارے شنکھا پر مہاراج ہی کی سوغات تھی۔ اُلّو کا گوشت تھا مہاراج وہ مردہ اُلّو جسے شنکھا مہاراج نے منتر کے ذریعے جیتا کیا تھا، پھر اس کا گوشت پکوا کر آپ کو بھیجا اور ہمیں بنا دیا مرزا عزت بیگ، کیونکہ مرزا عزت بیگ ہی آپ کو وہ بھوجن کھلا سکتا تھا مہاراج جو آپ کے شریر کو ایک بار نشٹ کر دے اور اب آپ نشٹ ہو گئے، نشٹ ہو گئے آپ کا دھرم ایک بار پھر آپ سے چھن گیا چونکہ آپ نے جس اُلّو کا گوشت کھایا ہے وہ بھیروں کے ہاتھوں جگایا گیا تھا۔ ایک مردہ اُلّو، سڑا ہوا گوشت، پر اسے وہ شکتی دے دی گئی تھی کہ وہ آپ کے پورے شریر کو نشٹ کر دے نجس کر دے اور اس ناپاک شریر سے وہ ساری طاقتیں نکل گئیں مہاراج جن پر آپ پھولتے تھے، جے شری شنکھا، جے شری شنکھا، جے شری شنکھا۔"

وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا اور میری آنکھوں میں خون کی سرخی لہرانے لگی۔ میں جانتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ایک بار پھر، ایک بار پھر مجھے سرخروئی حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اُلو کا گوشت نہیں کھایا تھا۔ وہ غلط فہمی کا شکار تھے اور اپنی اسی غلط فہمی میں وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا ایمان مجھ سے چھن چکا ہے لیکن میرے ایمان کا تحفظ کیا گیا تھا ہمیشہ کی طرح اور اس بات پر میرا کلیجہ ہاتھ بھر کا نہ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ میرے سینے میں بے پناہ قوت ابھر آئی اور میرا ایک زور دار قہقہہ اس کا چہرہ اتارنے کے لئے کافی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناپاک روح کے ناپاک پجاری۔ اتنی آسانی سے تم لوگوں کو میرے خلاف کامیابی نہیں حاصل ہوگی کیا سمجھے۔ وہ کتا، وہ تمہارا بھوریا چرن پھر ناکام ہو گیا۔"

"ناکام ہو گیا......" وہ بولا۔

"ہاں۔ جاگا ہوا اُلو اڑ گیا۔ کھڑکی سے باہر پرواز کر گیا۔"

"جھوٹ مت بولو مہاراج۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیا تم نے بھوجن نہیں کیا؟"

"مجھے میرے اللہ نے بچا لیا۔"

"کیسے؟"

"میں نے وہ کھانا ہی نہیں کھایا۔ میرے کھانا شروع کرنے سے پہلے تمہارا بھیروں جاگا اور بھاگ گیا۔"

"جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہے۔ اگر تم نشٹ نہیں ہوئے ہو تو اپنا کوئی چمتکار دکھاؤ۔ دکھاؤ اپنا دھرم چمتکار!"

"وہ تو مجھے دکھانا ہے۔ کہاں ہے تمہارا بھوریا چرن؟ آخاہ بھوریا چرن آ گئے تم۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مقصد عزت بیگ کو دھوکا دینا تھا۔ جونہی اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا میرے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے حلقوم میں پیوست ہو گئیں۔ میں نے پوری قوت صرف کر دی اور مرزا عزت بیگ کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ منہ بھیانک انداز میں کھل گیا زبان بالشت بھر آگے لٹک آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں تشنجی انداز میں ہلتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ بے جان ہو گیا۔ میرے بدن میں شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی موت کا اندازہ لگانے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ پٹ سے زمین پر گر پڑا۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر میں نے حقارت سے اس کے مُردہ جسم کو زور دار ٹھوکر رسید کی اور نفرت سے اس پر تھوک کر واپس پلٹا۔ میرا رخ تبدیل ہوا تھا کہ اچانک میری پنڈلی کسی ہاتھ کے شکنجے میں آ گئی۔ میں بری طرح اوندھے منہ گرا تھا سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا عزت بیگ پھرتی سے اٹھ کر میرے اوپر آلدا۔

"ایسے بچ کر نہیں جاؤ گے پران پردھانی۔ شنکھا کے بھی جیون مرن کا سوال ہے۔" اس کی منمناتی آواز سنائی دی اور اس نے اپنے ہاتھ میری گردن میں ڈال دیئے۔ میں نے پوری قوت صرف

کر کے اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا اور پھر کندھے سے گزار کر زمین پر پٹخ دیا۔ جونہی وہ نیچے گرا میں نے پاؤں اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سینے پر مارا۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور پھر پاؤں اس کے سینے کے خول میں پھنس گیا۔ کالے خون کی پھواریں بلند ہونے لگیں اور میں نے دانت کچکچا کر اپنا پاؤں کھینچ لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ڈکراتا ہوا اوندھا ہو گیا۔ پھر شدید تکلیف کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا۔

"جے...... اے...... اے...... شنکھا...... جے شنکھا......" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوفناک ہو گئیں اور چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن اچانک لمبے ہونے لگے اور کوئی چھ چھ انچ لمبے ہو گئے۔ اسی طرح دانت بھی دہانے سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت مجھے اپنے لباس میں چھپے ہوئے خنجر کا خیال آ گیا اور دوسرے لمحے میں نے اسے نکال لیا۔ عین اسی وقت وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے مجھے خنجر نکالتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس کی آنکھیں ایک دم چڑھ گئیں۔ چہرہ بے رونق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں لٹک گئے اور پھر وہ نیچے گر پڑا۔ میں خنجر کھینچ کر پیچھے ہٹ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ دوبارہ اٹھے لیکن اب وہ نہیں اٹھ سکا تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ پھر وہ لڑکی یاد آئی جسے اس ملعون نے ایک پاکیزہ نام سے متعارف کرایا تھا اور اپنی بیٹی بتایا تھا مگر وہ پورنی تھی اور اب تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بلایا تھا سوچا اس سے بھی مل لوں۔ بھوریا چرن کے بارے میں پوچھوں ہو سکتا ہے اس کا ٹھکانہ معلوم ہو سکے۔ جس سمت کے بارے میں اس نے بتایا تھا اس طرف چل پڑا اور میں نے اس کمرے میں روشنی دیکھی۔ میں نے خنجر اپنے لباس میں پوشیدہ کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں اس دروازے پر تھا۔ پھر میں نے آہستہ سے اس پر دستک دی اور پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ اسی نے کھولا تھا مگر کم بخت سولہ سنگھار کئے ہوئے تھی۔ اسے شاید بدلے ہوئے حالات کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ مجھے بڑی چاہ سے اندر آنے کا راستہ دیا اور میں اندر آ گیا۔ تیز روشنی میں وہ شعلۂ جوالا بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔

"بالی سی عمر کو کیا روگ لگا بیٹھے، یہ سنیاس لینے کی عمر ہے شاہ جی؟" اس نے لبھانے والے انداز میں کہا۔

"کیا تم اس حویلی کے آسیبوں سے نجات نہیں چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا اور وہ ہنس پڑی۔

"آسیب۔ وہ تو ہم خود ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"سب سے بڑا آسیب انسان کے اپنے من میں چھپا ہوتا ہے۔ اسے مار لو سارے آسیب مر جائیں گے۔ چھوڑو شاہ جی۔ آؤ اپنی بات کریں۔" وہ مسہری کی طرف بڑھ کر بولی۔ پھر وہ مسہری پر نیم دراز ہو گئی اور چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب پہنچ کر جھک گیا۔

"تو تم پورنی ہو...... مجھے بھوریا چرن کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بدبخت کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے

کہا اور وہ تڑپ گئی۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بھڑک کر بولی۔

"یہ کیا نام لے دیا تم نے، یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ہٹو ہٹو یہاں سے۔ میرے مالک، میرے دیوتا کا نام لیا جائے اور میں....." اس نے ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا اور خود تڑپ کر اٹھ گئی، غالباً وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اسے پکڑنے کی کوشش کی اور اس کے لمبے لمبے بال میرے ہاتھوں میں آ گئے اور میں نے انہیں مٹھی میں جکڑ لیا۔

"ایسے نہیں جاسکے گی تو شیطان کی بچی، مجھے بتا۔ وہ کتا کہاں چھپا ہوا ہے جس نے میری پوری زندگی کو مسلسل روگ بنا دیا ہے۔ جواب دے وہ کہاں ہے؟" میں نے زور سے اسے دھکا دیا اور اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ مجھ پر بھی دیوانگی طاری ہو گئی تھی، ان الفاظ کے ساتھ مجھے بھوریا چرن پوری طرح یاد آ گیا تھا۔ میرے دل میں نفرت کی ایسی شدید لہر اٹھی تھی کہ میں خاکستر ہو گیا تھا اپنے آپ کو نجانے کب سے سُلا رکھا تھا میں نے اور صدمے پر صدمہ برداشت کر رہا تھا اس سے زیادہ دلدوز بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ میری بہن مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھی اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا نہیں چاہئے مجھے ایسی زندگی۔ میں تو ایک دنیا دار انسان تھا، اور میری آرزو صرف اتنی سی تھی کہ میں اس دنیا میں ایک بہتر زندگی گزار سکوں۔ یہ ملعون بھوریا چرن ہی تھا جس نے مجھے دربدر کر دیا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑے ہوئے تھے، دوسرے ہاتھ سے خنجر نکال لیا تھا، اسے بھی ہلاک کر دینا چاہتا تھا میں۔ ایک جھٹکے سے میں نے اس کا رخ تبدیل کیا اور اسے اپنے سامنے لانا چاہا لیکن اس نے بدن کی پوری قوت سے اپنے آپ کو اچھال کر میرے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کی اور میں نے دیوانگی کے عالم میں خنجر اس کے بالوں پر ہی پھیر دیا۔ گردن پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بال زد میں آ گئے اور بالوں کا پورا گچھا میری مٹھی میں دوبارہ آ گیا۔ وہ دھڑام سے زمین پر گری تھی اور اس کے فوراً بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اب میں اسے پتھرایا پتھرایا سا محسوس کر رہا تھا اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی اور وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور کہنے لگی۔

"پرم پر دھانی آزاد ہو گئی ہوں بھوریا چرن کے جال سے اور اب تمہارے چرنوں کی دھول ہوں تمہارے چرنوں کی دھول ہوں میں۔ حکم دو کیا پوچھنا چاہتے ہو.....؟"

"بھوریا چرن کہاں ہے۔" میں نے سوال کیا.....

"سوار سندھو کا میں سات استھان ہیں اس کے۔ انہیں میں سے کسی میں ہو گا۔ تم ہی سے تو چھپا ہوا ہے۔ ایک بار پھر تمہیں بھینٹ کرنا چاہتا تھا اگر تم بھیروں مجند کھا لیتے تو وہ سیدھا سیدھا مار دیتا تمہیں اب وہ صرف تمہاری جان کا لاگو ہے۔"

"تو اسے تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتی ہے؟"

"سات استھان دکھادوں گی تمہیں مگر اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھے بھسم کر دے گا۔"

"چل اسے میرے ساتھ تلاش کر۔" میں نے کہا اور وہ تیار ہو گئی۔ میں نے سب کچھ نظر انداز کر

دیا۔ سب کچھ بھول گیا، اب میں مجسم انتقام تھا۔ اچانک ہی میرا دماغ پلٹ گیا تھا۔ پورنی کے ساتھ میں بے حواسی کے عالم میں اس حویلی سے نکل آیا۔ ہم نے پہلا سفر دہلی کا کیا۔ دہلی کے ایک نواحی علاقے میں کالی کا ایک مندر تھا جو ایک ویرانے میں بنا ہوا تھا۔ یہ مندر بھوریا چرن کا استھان تھا لیکن جب ہم شام کے جھٹپٹوں میں اس میں داخل ہوئے تو مندر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کالی کا ایک عظیم الشان بت ٹکڑے ٹکڑے پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی۔ پورنی نے کہا۔

"اس نے استھان جلا دیا۔ اسے تمہارا پتہ چل گیا۔"

"دوسرا ٹھکانہ کہاں ہے؟"

"متھرا چلنا ہو گا۔" پورنی نے کہا۔ ہم دونوں ویران مندر میں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک آہٹ ہوئی اور میں چونک پڑا۔ ایک پتھریلا مجسمہ تھا جو ایک اندرونی حصے سے نکل آیا تھا۔ مجسمے سے آواز بلند ہوئی جو بھوریا چرن کی تھی۔

"اتنا آسان نہیں ہے میاں جی مجھے مارنا۔ لاکھوں کی بلی دینا ہو گی مجھے مارنے میں۔ لاکھوں مارے جائیں گے۔ کیا سمجھے۔"

"خدا اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا بھوریا کتے۔ سامنے آ کر بات کر تو شنکھا ہے۔ مہان شنکھا..... سامنے کیوں نہیں آتا۔"

"آ جاتا پاپی۔ اگر میرا آخری کام ہو جاتا۔" مجسمے سے آواز ابھری اور پھر وہ راکھ بن کر ڈھے گیا۔ اب یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پورنی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب وہ اپنے کسی استھان پر نہیں ملے گا مہاراج اسے پتہ چل گیا ہے کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں اور وہ اپنے سارے استھان تباہ کر دے گا۔"

"پھر بھی میں اسے تلاش کروں گا۔ اس کے ساتوں ٹھکانے تباہ ہو جائیں گے تو پھر کہاں پناہ لے گا وہ؟"

"میں تو تمہاری داسی ہوں مہاراج جو حکم دو گے اس پر عمل کروں گی۔"

میں نے سارے خیالات ترک کر دیئے تھے، اب تو بس ایک ہی آرزو تھی بھوریا چرن کو فنا کر دوں اور خود بھی موت کے گھاٹ اتر جاؤں جینا بے مقصد ہو گیا ہے میرا، شمسہ کے لئے دولت کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ بھی نہ کر سکا، کس کام کا یہ سب کچھ، جس میں کچھ بھی میرا نہیں ہے جو کرنا چاہتا ہوں وہ میرے لئے ممکن نہیں۔ کیا فائدہ دوسروں کو بے وقوف بناتے رہنے سے، سب کچھ فضول ہے۔ نجانے کیا کیا کرتا رہا ہوں، لیکن کوئی بھی صلہ نہیں ملا مجھے..... اپنی بہن کو ایک اچھا مستقبل تک نہیں دے سکا تو پھر جینے کا کیا فائدہ، ہاں اگر بھوریا چرن میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائے تو بس اسے ہی اپنے آخری لمحات میں سکون کا درجہ دے سکتا ہوں باقی سب کچھ بے کار ہے، کچھ نہیں ملا مجھے.....

وہاں سے چل پڑے، شہر دہلی پہنچے تو دہلی جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف آگ، شعلے، چیخ پکار..... معلومات کیں تو پتہ چلا کہ زبردست ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ پاکستان بن چکا تھا اور

ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو اپنے درمیان نہیں دیکھنا چاہتے تھے وہ آٹھ سو سال کی بھڑاس نکال رہے تھے، پورے آٹھ سو سال انہوں نے محکوم رہ کر گزارے تھے اور اب وہ اپنے برسوں کے ساتھیوں کو موت کی نیند سلا رہے تھے۔ چاروں طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ اور پورا ہندوستان آگ میں جل رہا تھا۔ مسلمانوں کے قافلے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ متھرا، بندرا بن، بنارس، اور نہ جانے کہاں کہاں۔ ساتوں ٹھکانے دیکھ لئے میں نے اور انہیں دیکھتے ہوئے اور بھی نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہر جگہ موت کا بازار گرم تھا۔ انسان موت سے چھپتے پھر رہے تھے۔ میری محبت بھی جاگ اٹھی۔ ٹرین کے ایک سفر میں مسلمانوں پر حملہ ہوا تو میں بھی بے قابو ہو گیا۔ سولہ ناپاک ہندو ہلاک کئے میں نے۔ پورنی میری محکوم تھی۔ اس سے کئی کام لئے میں نے۔ مسلمانوں کے ایک قافلے پر ہندوؤں نے حملہ کیا تو میں نے پورنی سے کہا۔

"تیرے پاس جادو کی قوت ہے۔ انہیں اندھا کر دے۔" پورنی نے بے چارگی سے راکھ اٹھائی اور اس کو حملہ آوروں کی طرف اڑا دیا۔ وہ اندھے ہو گئے اور اپنے ہتھیاروں کو ایک دوسرے پر استعمال کر کے خود فنا ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس قافلے کو میں نے بحفاظت یہاں سے روانہ کر دیا...... ! لاکھوں مسلمان مریں گے تو اب لاکھوں ہندو بھی مریں گے بھوریا چرن۔ یہ بھی تجھ سے انتقام ہے۔ میں اس کام میں مصروف ہو گیا۔ یہ بھی دل کو سکون بخش رہا تھا۔ اب کسی جگہ کی تخصیص نہیں تھی، جدھر منہ اٹھتا نکل جاتا۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی مدد کرتا۔ ان پر ظلم کرنے والوں کو چن چن کر ہلاک کرتا۔ اپنی محکوم پورنی سے مدد لیتا۔ انہیں اس کے ذریعہ دولت اناج اور لباس فراہم کرتا۔ میرے اس خنجر نے بے حساب ہندوؤں کو قتل کیا۔ مظلوم مسلمان مجھے درویش کا سا درجہ دیتے مگر میں خود پر ہنستا تھا۔ میں کیا تھا۔ یہ میں خود ہی جانتا تھا۔

پھر ایک دن شمسہ کا خیال آ گیا اور میں نے رخ بدل لیا۔ سیکڑوں واقعات سے گزرتا ہوا خانقاہ تک پہنچا۔ لیکن خانقاہ کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ حلق فرط غم سے بند ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ خانقاہ مسمار کر دی گئی تھی۔ چاروں طرف جسم بکھرے ہوئے تھے۔ لاشوں کے سڑنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آگ کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرف چیخ پڑا۔ "شمسہ...... شمسہ، میری بہن...... شمسہ...... میری بہن...... شمسہ میں آ گیا ہوں۔ شمسہ میں مسعود ہوں تیرا بھائی۔ تیرا بدنصیب بھائی۔ شمسہ...... شمسہ...... فیضان...... شمسہ......"

خانقاہ کی بلندیاں کس طرح طے ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم، بس میرے حلق سے دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔ "شمسہ میری بہن، شمسہ، میں آ گیا ہوں میں تیرا بھائی مسعود ہوں۔ میری بہن، کہاں ہے شمسہ، میں آہ، میں دیوانہ تھا۔ پاگل ہو گیا تھا میں، شمسہ میں تیرے پاس رہ کر تجھ سے دور رہا۔ اپنے خوف کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تجھ سے دور رہا، شمسہ تجھ سے باتیں بھی نہیں کیں میں نے۔ آہ شمسہ...... شمسہ" میں زار و قطار روتا ہوا خانقاہ میں پڑی لاشوں میں اپنی بہن کی لاش تلاش کرنے لگا۔ یہ

لاشیں یہاں کے لوگوں کی تھیں۔ سب کے سب جانے پہچانے۔

دفعتۂ چھٹی حس نے کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس دلایا۔ دیوانوں کی طرح چونک کر پلٹا۔ سامنے کھڑی شمسہ کو دیکھا پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا وہ پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔

میں بے قابو ہو کر اس کی طرف جھپٹا۔ پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ میرے حلق سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں خود بخود الفاظ میں ڈھل کر شمسہ کو میری المناک داستان سنا رہی تھیں میری قوت ارادی کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ شمسہ نے مجھے پہچان لیا سب کچھ جان لیا ایسی بلک بلک کر روئی وہ کہ کلیجہ پانی ہو گیا۔

"مجھ سے دور کیوں رہا بھیا۔ ہائے مجھ بدنصیب کی قسمت میں یہ روشنی کہاں سے آ گئی۔ میں نے تو تاریکیوں ہی کو زندگی سمجھ لیا تھا۔"

طوفان گڑگڑاتا رہا، برسوں کی جدائی تھی۔ دل اتنی آسانی سے کیسے بھرتا؟ بالآخر سکون ہوا۔

"شمسہ فیضان؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"فیضان، شامی، اکرام بھیا، بچے نیچے تہہ خانے میں موجود ہیں۔ ہندو بیس بار آ چکے ہیں۔ خوب تباہی مچائی انہوں نے سب کو مار دیا۔ ہم تہہ خانوں میں جا چھپے اس لئے بچ گئے کچھ لوگ بھاگ گئے ہم کئی دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ باہر خطرہ تھا کوئی باہر نہیں آتا بچے پیاس سے تڑپ رہے تھے مجھ سے ان کا بلکنا دیکھا نہیں گیا۔ پانی کی تلاش میں نکل آئی تھی تو تمہاری آواز سنی۔"

"فیضان، شامی، اکرام زندہ ہیں۔" میں نے مسرور لہجے میں پوچھا۔

"ہاں!"

"پانی کہاں ہے؟"

"وہاں ایک مٹکے میں موجود ہے اسی سے یہ گلاس بھرا ہے۔"

"آؤ مجھے بتاؤ مٹکا کہاں ہے؟" میں نے کہا پھر شمسہ کی نشاندہی پر مٹکے کے پاس آیا اور اسے اٹھا کر تہہ خانے میں لے گیا سب کی حالت ابتر تھی۔ پہلے بچوں کو پھر انہیں پانی پلایا۔ اور ان میں زندگی جھلکنے لگی۔ فیضان یہ سن کر ششدر رہ گیا تھا کہ میں شمسہ کا سگا بھائی ہوں۔ اکرام نے وعدے کا پاس کرتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مختصر الفاظ میں انہوں نے خانقاہ کی تباہی کی داستان سنائی، پھر فیضان نے کہا۔

"اب کیا کریں مسعود بھائی؟"

"میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد سوچیں گے۔"

"کہاں جاؤ گے بھیا؟" شمسہ نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔

"بس ابھی تھوڑی دیر میں آیا۔"

"نہیں بھیا، کہیں پھر نہ کھو جاؤ۔ ابھی تو دل کو یقین بھی نہیں آیا ہے۔"

"نہیں شمسہ بس ابھی آتا ہوں۔"

"ہم بھی ساتھ چلیں گے۔" فیضان بولا۔

"ہرگز نہیں، اکرام انہیں سنبھالو مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے باہر آنے کی اجازت دی تھی، دیوار کی اوٹ میں ہو کر میں نے پورنی کو آواز دی وہ جاتی ہی کہاں تھی حاضر ہو گئی۔ "پھل درکار ہیں۔ درختوں سے ٹوٹے ہوئے جادو کے نہ ہوں۔"

"جو آگیا سوامی۔" اس نے گردن جھکا دی اور پھر چشم زدن میں پھلوں کا ٹوکرا میرے سامنے لا رکھا۔ اپنے لئے ساری زندگی کالے جادو کا احسان نہیں لیا مگر اب مجبوریاں آڑے آ گئی تھیں۔ پھل لے کر تہہ خانے پہنچا تو سب جیسے جی اٹھے طرح طرح کے سوالات کئے گئے مگر خاموشی ہی جواب تھی۔ پوچھنے والے تھک گئے پھر آگے کے منصوبے زیر غور آئے۔ شمسہ نے حسرت سے کہا۔

"بھیا، امی، ابو، محمود ماموں ریاض کا کوئی پتہ نہیں چل سکا کہاں ہیں یہ لوگ، صدیاں بیت گئیں انہیں دیکھے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"نہیں شمسہ وہ سہارن پور میں بھی نہیں ہیں میں نے انہیں تلاش کیا ہے۔ نہیں مل سکے البتہ محمود کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ زندہ سلامت ہے اسے میں نے خود ملک سے باہر بھیج دیا تھا اس وقت اس کیلئے یہی ضروری تھا کیونکہ مقامی پولیس اس کی تلاش میں تھی میں نے تو اپنے آپ کو چھپا لیا تھا مگر محمود کو ملک سے باہر نہ بھیجتا تو وہ خطرے میں پڑ جاتا۔"

"کہاں ہے، یہ نہیں معلوم ....؟"

"نہیں شمسہ کچھ نہیں پتہ" فیضان نے کہا۔

"اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ مسعود بھائی کہ ہم بھی پاکستان نکل چلیں، سارے ہندوستان میں فسادات کی آگ پھیلی ہوئی ہے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں ہمارے لئے زندگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔" اکرام اور شامی بھی اس بات کے حق میں تھے چنانچہ تیاریاں کی گئیں۔ بھلا تیاریاں کیا تھیں، بس جو کچھ ہاتھ لگا ساتھ لے لیا اور پھر ایک دن آدھی رات کے وقت ہم خانقاہ کی بلندیوں سے نیچے اتر آئے۔ ایک طویل سفر کا آغاز کیا تھا، دل کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔ نجانے کیا کیا تصورات ذہن میں تھے رات بھر سفر کر کے جب دن کی روشنی ہوئی تو ایک ایسی جگہ ویرانے میں پناہ لی جہاں انسانی نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں پھر یہی ہوا راتوں کو سفر کرتے اور دن میں کسی پوشیدہ جگہ کو اپنا لیتے پھر ایک بستی نظر آئی اور یہاں سے ہم نے ایک گاڑی حاصل کی۔ فیضان اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ خالی گاڑی کس کی تھی کچھ نہیں معلوم تھا بس اس میں بیٹھ کر کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑے جہاں سے پاکستان جانے کے راستے دریافت ہو سکیں۔ لیکن گاڑی کا یہ سفر بھی ہم نے رات ہی میں کیا تھا۔ صبح کو البتہ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے وہاں ہمیں ایک زبردست خطرہ پیش آ گیا۔ کوئی پچاس ساٹھ افراد تھے لاٹھیوں، بھالوں اور تلواروں سے مسلح۔ گاڑی کا راستہ روکے کھڑے ہوئے تھے اور ان سب سے آگے

بھوریا چرن تھا۔ کمینہ صفت بھوریا چرن جو یقیناً ان لوگوں کو ہماری راہ پر لے آیا تھا اس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا میں گاڑی سے نیچے اتر آیا اور میں نے سرگوشی کے انداز میں پورنی سے پوچھا۔

"اس کے ساتھ جو افراد ہیں کیا وہ اس کے جادو کے زیر اثر ہیں؟"

"نہیں سوامی، نہیں پرم پردھانی. یہ سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہیں جنہیں بھوریا چرن آپ کے سامنے لے آیا ہے۔"

"تو پھر ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کر جو تو نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔"

"پرم پردھانی، شنکھا ان کا ساتھی ہے۔" پورنی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسے میں دیکھے لیتا ہوں۔" میں نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس پر کلام الٰہی کی آیات پڑھ کر اسے پوری قوت سے بھوریا چرن کے سر پر دے مارا۔ پتھر اس کی پیشانی پر پڑا اور اس کی پیشانی پھٹ گئی وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر چکرانے لگا اور میں اس کی جانب جھپٹا میں نے عقب سے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر گردن پر جما دیئے اور اسے پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ ادھر وہ جو بھوریا چرن کے ساتھ آئے تھے، اچانک ہی اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے اور اس بات سے ہکا بکا رہ گئے تھے ان میں سے ایک نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یونہی اپنی جگہ کھڑے آنکھیں پھاڑتے رہے، میں نے بھوریا چرن کو بری طرح زمین سے رگڑ دیا تھا اور اس کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں لیکن پھر اچانک ہی وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں تحلیل ہو گیا اور ایک دم سے اس کا بدن چھوٹا ہوا اور میری گرفت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ پھر میں نے ایک پیلی مکڑی کو برق رفتاری سے ایک سمت بھاگتے ہوئے دیکھا، ظاہری بات ہے بھوریا چرن تھا، میں نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھائے اور مکڑی کا نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن اس وقت موقع نہیں مل سکا تھا کہ ان پر آیات الٰہی پڑھتا۔ بھوریا چرن کو ایک جگہ چھپنے کا موقع مل گیا، ایک دراڑ میں گھس کر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن زمین پر میں نے ننھے ننھے خون کے دھبے دیکھے تھے وہ زخمی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو اندھے ہو گئے تھے، ایک دوسرے کو ٹٹول رہے تھے اور ان کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے فیضان کو اشارہ کیا، یہ انوکھی لڑائی فیضان کیلئے بھی باعث حیرت تھی۔ بہرحال وہ راستہ کاٹ کر گاڑی آگے نکال لے گیا اور ہم اس خطرے سے بھی دور ہو گئے۔ دن اور رات ایک عجیب زندگی تھی، خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی۔ راتوں کو اگر آبادیوں کے قریب ہوتے تو آبادیوں کے سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اللہ اکبر کے نعرے گونجتے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے۔ کہیں جے جے کار ہوتی اور کہیں اللہ کا نام لیا جاتا لیکن پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی فسادات کی آگ کو بھلا مجھ جیسا آدمی کیا روک سکتا تھا ہم تو صرف اپنی جان بچانے کیلئے بھاگ رہے تھے۔ راستے میں طرح طرح کے کام ہوتے رہے۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی حاصل ہو گئیں اور تھوڑا بہت پیٹرول بھی جو گاڑی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہا تھا اور اس کے بعد اچانک ہی جب میں نے صورتحال کا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ میں اپنے آبائی شہر سے بالکل قریب ہوں. قدم رک گئے تھے. بدن کی

قوتیں ساتھ چھوڑ گئی تھیں، دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، تھوڑے ہی فاصلے پر ہاں تھوڑے ہی فاصلے پر پیر پھاگن کا مزار پاک تھا۔ میری بچپن کی کہانی پھر سے میری آنکھوں میں تازہ ہو گئی تھی نجانے کتنے عرصے کے بعد اس سمت آیا تھا۔ یہ راستے حالانکہ کبھی اس طرح جانے پہچانے تھے کہ آنکھیں بند کر کے چھوڑ دیا جائے تو میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں لیکن اب سیکڑوں تبدیلیاں ہو چکی تھیں یہاں بھی فسادات ہو رہے تھے پیر پھاگن سے بچپن سے عقیدت تھی۔ میں نے شمسہ سے کہا۔ ”شمسہ پہچانیں اس جگہ کو............؟“

”نہیں بھیا، کون سی جگہ ہے؟“

”ہمارا گھر ہے شمسہ ہمارا شہر ہے، وہ دیکھو بلندی پر تمہیں پیر پھاگن کا جھنڈا نظر آ رہا ہے؟“ شمسہ سکتے میں رہ گئی، آنسو تو اس کی آنکھوں سے نکل پڑنے کیلئے بے قرار رہتے تھے میرے مل جانے کے بعد ماں، باپ اور بھائی کی یاد ایسی تازہ ہوئی تھی کہ جب بھی اس پر نظر پڑتی اسے روتے ہوئے پاتا۔ شمسہ کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا، کہنے لگی۔ ”بھیا اپنے گھر میں جھانک لیں ہو سکتا ہے امی اور ابو وہیں رہتے ہوں۔“

”نہیں اب بھلا ان کے یہاں رہنے کے لئے کیا امکانات ہو سکتے ہیں، ہاں اگر تیرا جی چاہے تو آ پیر پھاگن کے مزار پر چلتے ہیں فاتحہ خوانی کریں گے اور ان سے مدد کی درخواست کریں گے۔“ شمسہ تیار ہو گئی، فیضان اور اکرام کو بھی میں نے یہ بتا دیا تھا کہ یہ میرا آبائی شہر ہے اور وہ لوگ بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ پیر پھاگن کا مزار پاک اسی طرح سبز رنگ، سینہ تانے پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ ہم لوگ آگے بڑھنے لگے اور پھر اس وقت جب میں بڑی عقیدت کے عالم میں شمسہ کے ساتھ پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیوں کی جانب جا رہا تھا کہ میں نے ایک سمت بھوریا چرن کو دھونی رمائے دیکھا، سامنے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں سلگ رہی تھیں ان میں کوئی خوشبو ڈال رہا تھا کم بخت جوگی۔ سر گھٹا ہوا تھا، پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپنی مکروہ شخصیت کو وہ پیر پھاگن سے زیادہ دور نہیں کر سکا تھا اور یقینی طور پر کسی ایسے عمل کے چکر میں تھا جس سے اسے کھنڈولا بننے کا موقع مل جائے اسے دیکھ کر ایک بار پھر میرے بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ میں نے خلوص دل سے اللہ سے دعا کی کہ اس موذی مخلوق کے خاتمے میں میری مدد کی جائے۔ پیر پھاگن سے کہا کہ وہ اللہ سے دعا کریں جس شخص نے میری زندگی کا رخ اس طرح تبدیل کیا ہے جہاں سے آغاز ہوا ہے وہیں اس کا انجام بھی ہو، یہ تمام احساسات دل میں لئے میں آہستہ آہستہ بھوریا چرن کے سامنے پہنچ گیا۔ اسے شاید میری آمد کا علم نہیں ہو سکا تھا، پھر میں نے اس کے سامنے پڑی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک جلتی لکڑی اٹھائی اور اسی وقت وہ بری طرح چونک پڑا مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل چکی تھیں۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹا تو چت گر پڑا، لیکن پھر اس نے الٹی قلابازی کھائی اور میں نے جلتی ہوئی لکڑی اس کے چہرے پر دے ماری۔ بھوریا چرن کی دلدوز چیخ ابھری تھی اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”تو آ گئے تم میاں جی، یاد ہے یہ جگہ، یہیں سے ہماری تمہاری جنگ شروع ہوئی تھی اور آج یہیں تمہارے پیر پھگنوا کے چرنوں میں تمہارا انت ہو جائے گا۔ آج نہیں چھوڑوں گا میاں جی آج نہیں چھوڑوں گا میاں جی آج نہیں چھوڑوں گا دفعتہً سینے کے پاس ایک وزن سا محسوس ہوا اور یہ وزن اس خنجر کا تھا جو مجھے عطا کیا گیا تھا میں نے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا بھوریا چرن نے گہری نگاہوں سے خنجر کو دیکھا اور دفعتہً ہی اس کے چہرے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ غالباً اسے کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔

اس نے ایک دم الٹی چھلانگ لگائی لیکن یہ چھلانگ پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیوں کی جانب تھی۔ راستہ بھول گیا تھا وہ صحیح راستے کا انتخاب نہیں کر سکا تھا۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے اس پر جھپٹا باقی لوگ حیران نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، بھوریا چرن زور سے چیخا۔

”ارے بچاؤ، ارے بچاؤ یہ مُسلّہ مجھے مار رہا ہے، ہندو ہوں، میں ہندوں ہوں، ارے ہندو جاتی کے لوگو! مجھے بچاؤ۔“ لیکن شاید یہاں کوئی ہندو موجود نہیں تھا یا پھر اس کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا اور دفعتہً ہی اسے عقب سے ٹھوکر لگی، سیڑھیاں اس کے راستے میں مزاحم ہو گئی تھیں وہ نیچے گر پڑا اور اسی لمحے میں اس پر چھا گیا، میں نے خنجر بلند کر کے اس کے پہلو میں بھونک دیا اور اس کی زبان کوئی ڈیڑھ فٹ باہر نکل آئی۔ اس نے زبان سے میرے چہرے کو چاٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے پیچھے ہٹ کر دوسرا وار پھر اس کے سینے پر کیا۔ اس بار اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے کوئی دو یا تین فٹ باہر نکلیں اور ربر کی طرح کھنچ کر واپس اپنی جگہ پہنچ گئیں۔ میں دیوانہ وار اس پر حملے کر رہا تھا اور میرا خنجر بار بار بلند ہو کر اس کے جسم کے مختلف حصوں میں پیوست ہو رہا تھا۔ قرب و جوار میں کچھ لوگ موجود تھے جو دوڑ دوڑ کر ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے لیکن میں سب سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا اور میں نے بھوریا چرن کی گردن اس کے شانوں سے علیحدہ کر دی۔ اس کی چوٹی پکڑ کر میں نے گردن کاٹی اور ایک طرف اچھال دی۔ پھر اس کی بغل کے پاس سے ایک بازو کاٹا۔ خنجر انتہائی شاندار طریقے سے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا، کچھ لوگ تو یہ ہولناک منظر دیکھ کر وہاں سے فرار ہی ہو گئے تھے بھوریا چرن کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے انہیں قرب و جوار میں پھینک دیا پھر اچانک ہی ایک گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی اور میں نے دیکھا کہ جہاں جہاں اس کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے وہاں زمین میں گڑھا ہوتا جا رہا تھا، پتھر چیخ رہے تھے، اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر ایک بڑا سا گڑھا وہاں نمودار ہوا اور بھوریا چرن کا مردہ جسم اس گڑھے میں اترتا چلا گیا۔ میرے دانت بھنچے ہوئے تھے، آنکھیں شدت غضب سے سرخ ہو رہی تھیں، میں نے اس گڑھے کے قریب پہنچ کر اس میں جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، اتنا گہرا گڑھا ہو گیا تھا کہ زمین نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم میں نے اپنی معلومات کیلئے پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اس گڑھے میں اُچھال دیا، پتھر کے زمین پر گرنے کی آواز تک نہیں آئی تھی۔ بھوریا چرن انتہائی گہرائیوں میں دفن ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر صاف کر کے اپنے لباس میں واپس رکھا اور اس کے بعد میرے حواس کسی قدر کام کرنے لگے۔ فیضان، شامی، اکرام، شمسہ وغیرہ بھی

پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ قرب وجوار کے لوگ بھی حیران حیران سے کھڑے ہوئے تھے۔ میں اپنے اس کام سے فارغ ہوگیا بظاہر بھوریا چرن کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ آگے اللہ جانتا تھا۔ پیر پھاگن کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ ماں باپ کے مل جانے کی دعا مانگی۔ شہر جاکر اپنا گھر تلاش کیا مگر وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ آنسو پی کر واپس چل پڑے اور اب عزم پاکستان تھا۔ ٹرین آگرہ سے روانہ ہوئی۔ چار ڈبے بارڈر کے لگائے گئے تھے۔ سکھ رجمنٹ کے سولہ سپاہی ان کی حفاظت پر مقرر کئے گئے تھے لیکن میں نے ان کے چہروں پر خباثت دیکھی تھی۔ ایک نگاہ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے فرض سے مخلص نہیں ہیں۔ کٹے پھٹے زخمی مسلمان مرد، عورتیں، بچے زندگی کی تلاش میں سرگرداں ٹرین کے ان ڈبوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے اور غم دیکھے نہیں جاتے تھے۔ اکرام، فیضان اور شامی بھی اب بالکل بدل گئے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے مگر ہمارا عزم ہتھیار تھا اور ہم ہر لمحہ کسی واقعہ کے منتظر تھے۔ شمسہ سہمی ہوئی ایک گوشے میں اپنے بچوں کے ساتھ سمٹی ہوئی تھی۔ اس وقت سارے خیالات سو گئے تھے۔ پورنی سے میں نے بڑے کار آمد کام لئے تھے اور حقیقتاً اس کی افادیت کا قائل ہوگیا تھا۔ ٹرین کے سفر کے چند گھنٹے کے بعد ہی میں نے اسے سرگوشی میں پکارا اور کہا۔

"تو میرے پاس ہے تو ظاہر نہ ہو بلکہ سرگوشی میں مجھ سے بات کر.........."

"میں ہوں پردھانی۔"

"کیا تو ان لوگوں کی نیت کے بارے میں بتا سکتی ہے جو ہمارے محافظوں کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہیں؟"

"آپ آگیا دیں مہاراج، میں ان کے من کھول لوں گی تھوڑا سمے لگے گا۔"

"مجھے معلوم کرکے بتا۔" کوئی دس منٹ کے بعد پورنی نے مجھے اطلاع دی۔

"ہری سنگھ اس رجمنٹ کا سردار ہے ہندوؤں کا پالا ہوا اس نے انجن چلانے والے کو حکم دیا ہے کہ چھتناری اسٹیشن سے آگے نکل کر باندی پورہ اور چھتناری کے بیچ ریل روک دے وہاں ہندو حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

"پورنی.......... ریل نہیں رکنی چاہئے۔"

"نہیں رکے گی مہاراج۔" پورنی نے جواب دیا۔ دن گزر گیا، رات ہوگئی ریل کے ڈبوں میں روشنی اور ہوا کا کوئی انتظام نہیں تھا بچے ریں ریں کر رہے تھے، مسافر عالم سکرات میں تھے۔ کوئی دس بجے چھتناری کا اسٹیشن آیا باہر اسٹیشن پر ہم نے ہندو انتہا پسندوں کو دیکھا تھا مگر فوج کی وجہ سے کوئی عمل نہیں ہوا تھا۔ البتہ چھتناری کے بعد ٹرین آگے بڑھی تو میں نے درود پاک کا ورد شروع کر دیا تھا۔ میرا دم آنکھوں میں آگیا تھا ایک بیک میں نے ٹرین کی رفتار تیز ہوتی دیکھی ہر ایک کو احساس ہوگیا تھا مسافر چونک پڑے تھے۔ ٹرین تھی کہ گولی بن گئی تھی اس طوفانی رفتار سے گزرتی ہوئی وہ باندی پورہ سے گزر گئی باندی پورہ کے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے بس روشنی کی لکیریں نظر آئی تھیں اور سائن بورڈ پر بس نام کا

شائبہ ہوا تھا مزید ایک گھنٹہ گزر گیا پھر ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر بہت سست ہوگئی۔ پورنی نے میرے کان میں کہا۔

"پرم پردھانی۔ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیا؟"

"سکھ افسر نے انجن چلانے والے کو گولی مار دی ہے اس نے باندی پورہ کے ہندوؤں سے پیسے لئے ہوئے تھے انجن چلانے والے نے گاڑی نہیں روکی اس لئے افسر نے اسے مار دیا۔ اب افسر بلاری اسٹیشن پر گاڑی رکوائے گا۔ آپ بلاری پر دوسری طرف اتر جایئے۔ وہاں خون خرابہ ضرور ہوگا۔"

"تو کچھ نہیں کر سکتی؟"

"جو بن پڑے گا ضرور کروں گی مہاراج۔ مگر بہت بڑا جماؤ ہے۔ آپ کو ہوشیار رہنا ہوگا۔"

میں پریشان ہوگیا میرے کمپارٹمنٹ میں جو لوگ نظر آرہے تھے وہ بیچارے زخموں سے چُور تھے یہ کسی سے کیا مقابلہ کر سکتے تھے تاہم کچھ دیر کے بعد میں نے انہیں ہوشیار کر دیا۔

"آگے حملے کا خدشہ ہے آپ سب لوگ ہوشیار ہوجائیں۔" کہرام مچ گیا سہمے ہوئے لوگ طرح طرح کے سوالات کرنے لگے میرے لئے جواب دینا مشکل ہوگیا مجھے احساس ہوا کہ میں نے وقت سے پہلے انہیں موت کے خوف سے دوچار کر دیا ہے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا تھا کچھ لوگوں نے مجھے گالیاں بھی دیں اور کہا کہ خوف و ہراس پھیلا رہا ہوں میں نے خاموشی سے سب کچھ سنا البتہ اپنے ساتھیوں کو میں نے ہوشیار کر دیا اور پورنی کی ہدایت کے مطابق انہیں دونوں سمت کے دروازوں پر تعینات کر دیا کہ جس سمت اسٹیشن آئے اس کے دوسری سمت کا دروازہ کھول دیا جائے۔ بچوں کو میں نے فیضان اور اکرام کی گود میں دیدیا تھا۔ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی بلاری کا اسٹیشن تاریکی میں ڈوبا پڑا تھا مگر دور ہی سے وہاں چہل پہل محسوس ہو رہی تھی ہمیں سمت کا اندازہ ہوگیا اور میں نے شمسہ وغیرہ کو اس طرف پہنچا کر درود پاک کا ورد شروع کر دیا۔ ٹرین کو کئی جھٹکے لگے اور اس کے ساتھ ہی جے بھوانی، جے ہند اور ست سری اکال کے نعرے لگنے لگے۔

"پورنی۔" میں نے پورنی کو پکارا۔ مگر اس کی آواز سنائی نہیں دی کئی آوازوں پر بھی میں نے اس کی آواز نہ سنی، اگلے ڈبوں پر حملہ ہوچکا تھا چیخ و پکار کی دلدوز آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ دل رو رہا تھا ان سب کو مصیبت میں چھوڑتے ہوئے مگر کیا کرتا انہیں سپرد خدا کر کے شمسہ، بچوں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے کود گیا۔ دوسری طرف گہرائیاں اور لمبے لمبے کھیت کھڑے تھے سب کے سب لڑھکتے ہوئے نیچے جاگرے بچے بری طرح رونے لگے ان کے منہ بھینچ کر انہیں چپ کیا اور سب سنبھل کر کھیتوں میں دوڑنے لگے۔ نعروں اور چیخوں کی مہیب آوازیں تعاقب کر رہی تھیں۔ کھیتوں کا سلسلہ کچھ دور چل کر ختم ہوگیا۔ کچھ فاصلے پر روشنیاں سی دکھتی ہوئی نظر آئیں۔ عجیب سی روشنیاں تھیں جیسے بھٹیاں دہک رہی ہوں۔ رخ اسی سمت ہوگیا چکنی مٹی سے بنی ہوئی ایک قلعہ نما عمارت تھی جس

کی فصیلوں پر یہ بھٹیاں روشن تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہم قلعے کے دروازے کے پاس پہنچ گئے اچانک بڑے دروازے سے ایک ذیلی کھڑکی کھلی۔

"السلام علیکم۔" کسی نے کہا۔

وعلیکم السلام............ آپ کون ہیں؟"

"اندر آجاؤ.......... جلدی کرو.........." ہم سے کہا گیا اور ہم عجلت میں اندر داخل ہوگئے۔ دس بارہ افراد تھے ذیلی کھڑکی بند کر کے اس کے ساتھ بہت سا کاٹھ کباڑ لگا دیا گیا پھر مشعل کی روشنی میں ہمیں دیکھا گیا اور کسی نے گونج دار آواز میں کہا۔

"جو ریل کٹ گئی.......... اسی کے مسافر ہو..........؟"

"جی ہاں۔"

"اندر آجاؤ ہمیں ان کتوں کا منصوبہ معلوم تھا مگر افسوس وقت بدل گیا مجبوری تھی ہم کچھ نہیں کر سکے۔ آؤ...... اندر آجاؤ......" وسیع عمارت تھی، ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں، راؤ تجمل حسین کو دیکھا تعارف بعد میں ہوا تھا، ہمیں چائے پیش کی گئی بہت تھکن سے نڈھال تھے چائے کے بعد راؤ صاحب نے کہا۔

"آپ لوگ آرام کریں، ہاں مرد ہوشیار رہیں اگر حویلی پر حملہ ہوا تو آپ کو جگا دیا جائے گا۔"

"نہیں راؤ صاحب، ہم آپ کے ساتھ جاگیں گے۔"

"ابھی ضرورت نہیں ہے اچھا ہے کچھ دیر آرام کر کے چاق و چوبند ہو جائیں۔" راؤ صاحب چلے گئے کسی کے پاس بولنے کیلئے کچھ نہیں تھا ایک خوف سب پر طاری تھا۔ بچے البتہ سو گئے۔ میں نے سرگوشی میں پورنی کو پکارا۔

"پرم پردھانی۔" اس کا جواب ملا۔

"پرم پردھانی کی بچی کہاں مر گئی تھی؟"

"جے پرم پردھانی.......... آپ پوتر اشلوک پڑھ رہے تھے ان کے سامنے گندی نہیں آسکتی تھی میں مجبور تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا ریل کے سارے مسافر مارے گئے؟"

"کچھ جیتے ہیں دھنی۔ کچھ مارے گئے۔"

اور کیا پوچھتا اس سے خاموش ہو گیا رات بھی بہت سی راتوں کا مجموعہ بن گئی تھی نہ جانے کیسے صبح ہوئی ناشتہ ملا، دوپہر کو راؤ صاحب سے ملاقات ہوئی بلاری کے مسلمان رئیس تھے۔ ہندوؤں" ں گھرے ہوئے تھے مگر بڑے کلے ٹھلے کے آدمی تھے ہندوؤں کا مسلسل مقابلہ کر رہے تھے۔ بتانے لگے۔

"بڑی مشکل سے بچاؤ کر رکھا ہے۔ بستی کے سارے مسلمان بھاگ گئے ہم پھنس گئے ہیں۔ دس

بندوقیں ہیں ہندو ملازموں کے سامنے انہیں سوتا کر پیش کیا ان کے خوف سے ابھی حویلی پر حملہ نہیں ہوا ہے ورنہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ مگر کب تک؟ ہاں اللہ کرے شمس اللہ آجائے۔ بھتیجا ہے ہمارا انگریزی فوج کا افسر ہے ایک منصوبہ بنا کر گیا ہے دیکھو اللہ کرے ہماری موت سے پہلے پہنچ جائے۔" بعد میں شمس اللہ کے بارے میں معلوم ہوا وہ کچھ انتظامات کرنے گیا تھا اور یہاں اس کا انتظار ہو رہا تھا تاکہ پاکستان کی طرف کوچ کیا جائے۔ راؤ صاحب نے بعد میں فصیلوں پر جلتی ہوئی بھٹیاں دکھائیں جن پر بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے اور ان میں تیل ابل رہا تھا۔ قریب ہی لمبی لمبی سینکوں کی جھاڑوئیں انبار تھیں۔

"یہ ہمارے ٹینک ہیں۔ سسرے ایک بار ہمت کر لیں دوبارہ رخ نہیں کریں گے۔" راؤ صاحب نے بتایا۔

"یہ کیا ہے..........؟" میں نے پوچھا۔

"اسلحہ.......... تیل میں گڑ پک رہا ہے۔ حویلی پر حملہ ہوا تو ان جھاڑوؤں کو اس میں ڈبو کر تیل اچھالیں گے کسی پر اس کی ایک بوند بھی پڑ گئی تو سمجھ لو عمر بھر جلتا رہے گا۔ ساری تیاریاں پوری ہیں۔"

میں اس تدبیر پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ پھر اسی رات حملہ ہو گیا۔ کوئی ڈیڑھ سو ہندو رات کی تاریکی میں حویلی کے پاس آگئے۔ ہم لوگ جاگ رہے تھے۔ فوراً بلاوا آگیا۔ فصیلوں پر سب دم سادھے ہندوؤں کے زد پر آجانے کا انتظار کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد تیار تھے۔ پھر جونہی وہ لوگ زد میں آئے اوپر سے ان پر تیل میں جلے ہوئے گڑ کی بارش ہو گئی۔

خدا کی پناہ.......... جس طرح وہ بلبلائے جس طرح زمین پر لوٹیں لگائیں، دیکھنے کا منظر تھا۔ کئی دن کا پکتا ہوا گڑ تیل کے ساتھ مل کر جس کے جسم پر پڑا اندر تک اترتا چلا گیا۔ تین منٹ بھی نہ لگے صفایا ہو گیا۔ ایسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ حملہ ناکام ہو گیا۔ راؤ صاحب پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔ دوسری صبح دو جیپیں آئیں جن میں پولیس بھری ہوئی تھی۔ نیچے ہی مذاکرات ہوئے.......... راؤ صاحب نے کہا۔

"بھیا.......... گارڈ لیکر آجاؤ۔ مالک کی قسم ٹینکوں توپوں سے مارو گے تب بھی سو پچاس کو لے مریں گے۔ اب جلدی سے پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو ہم شروع کر رہے ہیں۔"

"جیپیں مڑ کر واپس چلی گئی تھیں راؤ تجمل حسین بیشک عظیم انسان تھے ان حالات میں بھی بات بات پر قہقہہ لگانے والے۔ دو دن خاموشی طاری رہی تیسری رات کوئی نو بجے ہوں گے کہ تین گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اطلاع مل گئی اور اسلحہ تیار ہو گیا۔ گاڑیاں بالکل نیچے آگئیں پھر کسی نے چیخ کر

کہا۔

"چچا ابا۔ میں شمس اللہ ہوں۔ کوئی کارروائی نہ کریں۔" اس نام میں بڑا سحر تھا۔ حویلی کے دروازے کھل گئے۔ شمس اللہ اندر آ گیا۔ ایک بس اور دو جیپیں تھیں۔ جیپوں میں مسلح فوجی بھرے ہوئے تھے۔ افراتفری مچ گئی۔ سامان کی گٹھریاں بس میں بھری گئیں۔ بارہ ملازم پانچ عورتیں جن میں شمسہ بھی تھی اور بس شمسہ کے بچے۔ یہ سب بس میں بیٹھے اور بس چل پڑی راؤ صاحب بھی بس میں تھے۔ دونوں جیپیں بس کو حفاظت میں لے کر چل پڑیں۔ ایک بار پھر موت کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ رات بھر نہ جانے کتنا فاصلہ طے کر لیا گیا۔ جوالا پور کے قریب ایک گروہ بس کی طرف لپکا مگر فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے باقی بھاگ گئے۔ پھر صبح ہو گئی۔

خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سفر کے بغیر جاری رہا۔ روشنی پوری طرح ہو گئی تو اچانک برقع میں لپٹی ایک عورت کے حلق سے عجیب سی چیخ نکلی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اکرام پر جھپٹی۔ اکرام ہونق ہو گیا تھا۔ عورت برقع میں چھپی چھپی اکرام سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے سینے سے منہ رگڑ رہی تھی۔ میں خود ہکا بکا ہو گیا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سب ہی حیران تھے۔ اچانک راؤ صاحب بولے۔

"ارے اکرام میاں.......... اس کی صورت تو دیکھو.......... تمہاری کوئی نہ ہو...... بیچاری گونگی ہے۔" اب اکرام کو ہوش آیا۔ اس نے عورت کے چہرے سے برقع ہٹایا۔ میری آنکھیں بھی اسی طرف نگراں تھیں اور پھر میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو الفاظ میں نہیں بیان کر سکتا۔ ثریا تھی۔ اکرام کی بہن.......... اور.......... اور..........

میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اکرام بھی اس کا چہرہ دیکھ کر چند لمحات کیلئے پتھرا گیا تھا۔ پھر اس نے ثریا کو اپنے سینے میں سمو لیا۔ اس کی مدھم مدھم سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

"شکر ہے مالک کا.......... کون ہے یہ اس کی..........؟" راؤ صاحب نے پوچھا۔

"بہن.........." میں نے جواب دیا۔

"ماری باندھی آ گئی تھی اکیلی تھی سلام کیا تھا مجھے اشارے سے آنکھوں میں شرم و حیا تھی، گو زبان نہیں تھی بیچاری کی مگر سمجھ میں آ گیا کہ مسلمان ہے۔ ساتھ رکھ لیا اللہ کا شکر ہے کہ اس کا بھائی مل گیا اور ایک فرض سے سبکدوشی ہو گئی۔"

شمسہ مل گئی تھی، ثریا مل گئی تھی۔ اللہ کے احسان سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ سارے وسوسے دل سے نکلتے جا رہے تھے۔ کھیل کیسے شروع ہو گا کیسے ختم، انسان کیا جانے؟ یہ سب کچھ کسی اور ہی کا کام ہے۔

ثریا اکرام کے سینے سے لگی رہی۔ نڈھال ہو گئی تھی۔ مونا باؤ پہنچ گئے شمس اللہ کے ساتھ آئے ہوئے

فوجی واپس چلے گئے۔ اللہ نے ہمیں سلامتی کے ساتھ پاک وطن پہنچا دیا تھا۔ پناہ گزینوں کے مجمع لگے ہوئے تھے۔ لٹے پٹے قافلے درد کی لاکھوں کہانیاں سمیٹے آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔ وطن نوزائیدہ تھا وسائل ناکافی تھے۔ جس طرح بن پڑ رہا تھا آنے والوں کو سہولتیں مہیا کی جا رہی تھیں۔ ہم نے بھی ایک گوشہ اپنا لیا۔ بوریاں، ٹرنک، گٹھریاں دیوار بنے ہوئے تھے۔ بس انہی کی پردہ پوشی تھی۔ یہی چار دیواری تھی۔ راؤ تجمل حسین پر بھی وہی بیت رہی تھی۔ جو کچھ چھوڑ دیا تھا پاکستان کے لئے وہ اس عمر میں دوبارہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ ثریا نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا اور ایک عجیب احساس جھلکنے لگا تھا اس کی آنکھوں سے۔

مخیر حضرات مصروف عمل تھے۔ جسے دیکھو دل کھولے دے رہا ہے آنے والوں کے لئے۔ اتنا کچھ کھانے پینے کو آ رہا تھا کہ منع کرنا پڑتا تھا معذرت کرنی پڑ رہی تھی کہ بھائی کھا چکے ہیں۔ اللہ کا دیا موجود ہے۔ دو دن یہاں گزر گئے۔ میرپور خاص کے لئے ریل چکر لگا رہی تھی۔ سب کی پرچیاں کٹ چکی تھیں نمبر سے باری آ رہی تھی۔ تیسرے دن کی بات ہے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہوا تھا۔ یونہی سوچ میں بیٹھا ہوا تھا کہ نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ صندوق رکھے تھے ان کے درمیان رخنے بھی بنے ہوئے تھے میری نظر سامنے والے رخنے کی دوسری سمت اٹھ گئی ایک پرُنور چہرہ نگاہوں کے سامنے تھا اور یہ چہرہ...... بھلا آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں، بھلا وہ لگن جس نے ایک طویل عرصے سے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی بینائی کو متاثر کر سکتی ہے، ماں تھی میری امی تھیں میری یقینی طور پر وہی تھیں۔ بدن میں بجلیاں بھر گئیں، دیوانوں کی مانند اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور ٹین کی دیوار کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ نماز پڑھ رہی تھیں سر جھکا ہوا تھا۔ اللہ کے حضور سر بسجود تھیں۔ جانتا تھا کہ ان کے دل میں کیا دعا ہو گی۔ ماموں ریاض اور ابو بھی بیٹھے ہوئے تھے...... لاغر...... لاچار...... مفلوک الحال...... بے بسی کا شکار...... میرے کلیجے کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا۔ آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ بدن میں ایسا تشنج پیدا ہو گیا تھا کہ پیروں پر قابو نہیں پا سکا۔ ایک عجیب سا انداز طاری ہو گیا تھا مجھ پر۔ دو قدم آگے بڑھا اور دھڑام سے ان کے سامنے گر پڑا۔ قوت گویائی تو مفلوج تھی ہی بدن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ابو اور ماموں ریاض چونک پڑے تھے۔

انہوں نے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھا اور آگے سہارا دینے کے لئے بڑھے لیکن باپ کی نگاہ تھی وہی دل کے تار جنہیں کوئی شے غیر مرئی طور پر آپس میں جوڑے رکھتی ہے بھلا ان تاروں میں لرزش کیوں نہ ہوتی۔ تار جھنجھنائے...... ابو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر ایک دلدوز چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئے۔

"مسعود، میرے بچے مسعود۔" اور یہ الفاظ ایسے تھے کہ امی بھی خود پر قابو نہ پا سکیں۔ ماموں ریاض پاگلوں کی طرح چیخے۔

"ہاں مسعود ہمارا مسعود ہی ہے۔" ایسے مناظر یہاں عام تھے۔ ایسے واقعات گوشے گوشے میں ہو رہے تھے۔ ہر لحہ کہیں نہ کہیں سے آوازیں ابھر آتی تھیں۔ بھلا ان آوازوں کی جانب کون متوجہ ہوتا۔ لیکن اس گوشے میں جو کچھ ہوا تھا وہ عام واقعات میں سے نہیں تھا۔ یہاں تو کہانی ہی انوکھی تھی۔ یہ تو ملاپ ہی غیر یقینی تھا۔ صدیوں کے بچھڑے ملے تھے۔ کسے یقین آتا۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے کٹھ پتلیاں نچانے والا کھیل ختم کر چکا ہو۔ سارے دھاگے قریب لائے جا رہے ہوں۔ سب کو پتہ چل گیا کہ میرے ماں باپ مل گئے ہیں۔ شمسہ ماں کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ابو نے مجھے کلیجے میں بھینچ رکھا تھا۔ محمود باقی رہ گیا تھا۔ میں نے انہیں خوشخبری سنائی کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ وہ ضرور ہم سے آملے گا۔ مبارک ہے یہ وطن پاک جس نے صدیوں کا طلسم توڑ دیا۔ مبارک ہے پاکستان جس نے بچھڑوں کو ملا کر دل کے زخم سی دیئے۔

اکرام نے کہا...... "مسعود بھائی میں نہ کہتا تھا کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟" گزرتے وقت کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنائی گئیں۔ ماموں ریاض خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے کہنے لگے۔

"وطن پاک نے ہمیں نئی زندگی سے نوازا ہے...... ہم باہمت ہیں ایک بار پھر وہی گھر بنالیں گے ہم ...... ایک بار پھر اسی زندگی کا آغاز کریں گے۔"

ہماری روانگی کا وقت آگیا۔ میرپور خاص، حیدر آباد اور پھر کراچی۔ کراچی میں ہمیں پرانی نمائش کے کیمپ میں جگہ ملی تھی۔ رفتہ رفتہ زندگی آگے سفر کر رہی تھی۔ یہاں کیمپ میں ہم نے اپنا انتظام کیا۔ امی کو بخار ہو گیا۔ شمسہ اور ثریا نے انہیں ہاتھوں میں سنبھالا ہوا تھا۔ میرے دل میں ایک خیال سر ابھارنے لگا۔ پورنی میرے قبضے میں ہے۔ سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں اس کے ذریعے عالیشان رہائش گاہ، زر و جواہر کے انبار۔ اتنے عرصہ کے بعد یہ لوگ ملے ہیں۔ کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

"غلط......!" عقب سے آواز آئی...... اور میری گردن گھوم گئی۔ دن کی روشنی میں بھی اس گدڑی پوش کو دیکھ چکا تھا جو پیوند لگی گدڑی میں سر سے پاؤں تک چھپا بیٹھا تھا۔ اب شام کے دھندلکوں میں بھی وہ وہیں موجود تھا۔ اس نے یہ جملہ کہا تھا۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا......؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں شاہ جی...... غلط سوچ رہے ہو۔" گدڑی پوش نے چہرے سے گدڑی ہٹا کر کہا۔ میں اسے دیکھ کر اچھل پڑا نادر حسین تھا میرے کچھ کہنے سے قبل وہ بول اٹھا "برے بھلے کی تمیز دی گئی ہے۔ رزق حلال ہر طرح افضل ہے۔ کالی طاقت زہر کا تریاق بنے تو ٹھیک ہے۔ زہر کو زہر سے مارو لوہے کو لوہے سے کاٹو...... خلق خدا کی مدد کرنے میں حرج نہیں۔ مگر گندگی سر پر نہیں اوڑھنی چاہئے۔ بازو دیئے ہیں اللہ نے، محنت سے کماؤ...... ہمت سے جیو......! دنیا داری ترک دنیا سے بہتر ہے۔"

اس نے دوبارہ گٹھڑی میں منہ چھپالیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے بے اختیار کہا۔

"نادر حسین...... تم بھی یہاں آگئے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "منہ تو کھولو نادر حسین، میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی گدڑی کھینچی...... لیکن گدڑی زمین پر پھسل گئی۔ نادر حسین اس میں نہیں تھا۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ لیکن مجھے علم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نادر حسین کو بہت کچھ دیدیا تھا۔ وہ فنا فی اللہ ہو گیا تھا۔

میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ مجھے پورنی کے بارے میں ہدایت دی گئی تھی۔ اس کی کالی قوت کالے علم کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ اس سے اپنے لئے کچھ نہیں لے سکتا تھا۔ اس ہدایت سے میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب صرف محنت کی کمائی پر گزارہ کرنا ہے۔ وقت کا انتظار کروں تو سب سے بہتر ہے...... ورنہ...... سزا بھگت چکا تھا۔

اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کیمپ میں محبت و اخوت بھائی چارے کے ایسے مظاہرے ہو رہے تھے کہ آنسو نکل آتے تھے۔ جسے دیکھو پناہ گزینوں کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ۔ امدادی اشیاء کے انبار کے انبار چلے آرہے ہیں۔ حکومت الگ آسانیاں فراہم کر رہی تھی۔ ایک سہ پہر ایک رئیس پھل اور مٹھائیاں لے کر آیا۔ چار ملازم یہ اشیاء تقسیم کر رہے تھے۔ وہ خود نگرانی کر رہا تھا۔ نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ ماموں ریاض نے اسے سب سے پہلے دیکھا، بیتابی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قریب پہنچے اور آہستہ سے بولے۔

"میاں آپ کا نام محمود احمد تو نہیں ہے؟" نوجوان نے چونک کر انہیں دیکھا...... پھلوں کا تھیلا اس کے ہاتھ سے گر پڑا...... اس نے ایک چیخ ماری۔

"ماموں ریاض......" اور ان سے لپٹ گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا بساط کا آخری مہرہ بھی مل گیا تھا۔ آشیانے کا آخری پرندہ بھی واپس آشیانے میں آگیا۔ محمود نے تو صرف ماموں ریاض کو پایا تھا سب کو دیکھ کر مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔ امی کا بخار شاید اسی لئے تھا۔ ایسی خوش ہوئیں کہ بخار کا نام و نشان نہیں رہا۔ محمود کراچی میں رہتا تھا۔ جمشید روڈ پر اس کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلہ میں ہمیں لا کر اس نے اپنی کہانی سنائی۔ کئی سال سے وہ ملک سے باہر رہا اور اس نے خوب دولت کمائی پھر ماں باپ کے لئے بے چین ہو کر واپس آگیا۔ اور احتیاطاً اس نے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ خفیہ طور پر ماں باپ کو تلاش کرے گا اسی اثنا میں پاکستان بن گیا اور اسے یہاں رکنا پڑا محمود کی اس حیثیت نے کایا ہی پلٹ دی۔ کوئی مشکل نہ رہی۔ اس نے اپنا کاروبار بھی تقسیم سے پہلے یہاں مستحکم کر لیا تھا۔ اکرام، فیضان اور شامی بھی اب غیر نہیں تھے۔ یہاں سب کی کھپت تھی چنانچہ سب تعمیر وطن میں مصروف ہو گئے۔ ہم وطن ہی کے فرد تھے۔ نیک راہوں پر چل کر اپنے گھر کے لئے ہی باعزت روزی حاصل کر لی جائے تو خدمت وطن ہوتی ہے۔ اب اس بارے میں کیا عرض کروں۔ شرم محسوس ہوتی ہے کہ میری خواہش پر ثریا سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ یہ میری دلی آرزو تھی۔ معصوم و مظلوم ثریا میری زندگی میں شامل

ہوگئی۔ پورنی سے میں نے بھوریا چرن کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

پرم پردھانی وہ شنکھا ہے۔ شنکھا تین بار کالے جنم لیتا ہے۔ ہاں اگر وہ کھنڈولا بن جائے تو پھر اسے امر شکتی حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی سمے وہ مر گیا تھا مگر کون جانے وہ کب نیا جنم لے لے۔ ہر جنم میں کھنڈولا بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اگر اس کے تینوں جنم ختم ہوجائیں تو پھر نہیں جیتا گویا بھوریا چرن کے دوبارہ سامنے آنے کے امکانات ہیں۔

لیکن ...... چالیس سال گزر چکے ہیں خدا کا احسان ہے کہ ان چالیس سالوں میں مجھے وہ کبھی نہیں نظر آیا۔ ہمارا باغ ہرا بھرا ہے میرے، محمود کے، شامی اور شمسہ کے بہت سے بچے ہیں۔ میں نے زندگی گزارنے کے لئے کاروبار کرلیا تھا۔ اللہ کا احسان ہے دیانت سے خوب چل رہا ہے۔ خلق خدا کی جس طرح مدد ہوتی ہے کرتا ہوں۔ اتنے پُراسرار اور پیچیدہ واقعات پیش آئے ہیں ان چالیس سالوں میں سنانے بیٹھوں تو پھر اتنی طویل ایک داستان کا آغاز ہوجائے۔ چلئے یار زندہ صحبت باقی۔ ہاں اگر کہیں گھر کی دیواروں پر یا کسی درخت پر کوئی پیلی مکڑی نظر آجاتی ہے تو اپنے بدن کی لرزشوں پر قابو نہیں پا سکتا۔ خدا سب کو محفوظ رکھے ...... آمین ...... آپ کا مسعود احمد (ختم شد)